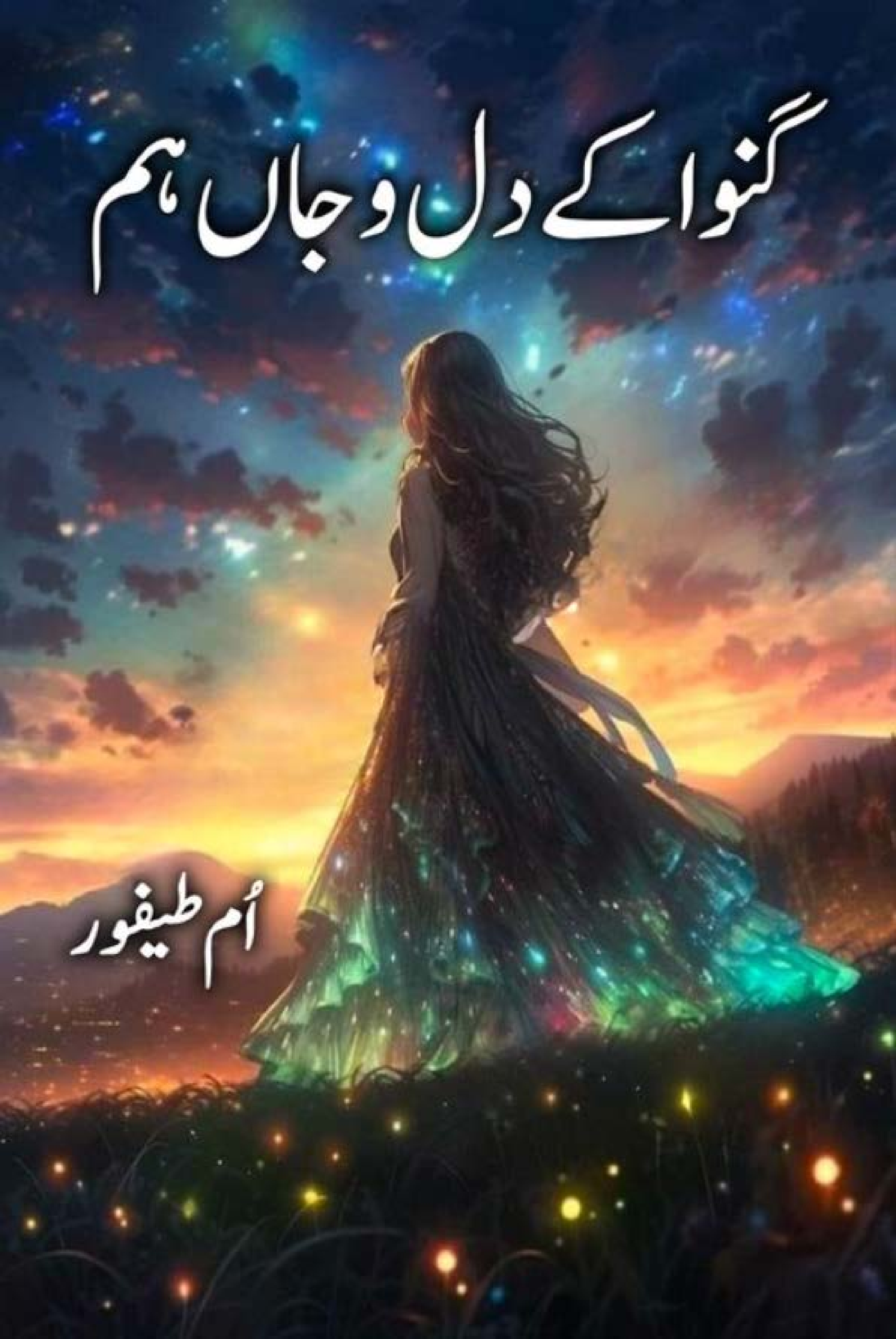

گنوا کے دل و جاں ہم
اُم طیفور

گنوا کے دل و جاں ہم

اُم طیفور

قسط نمبر 1

آدھی رات کا سماں تھا۔۔۔پورا گاؤں تاریک اور خاموش تھا۔۔۔فضا میں جھینگر بولتے تھے اور کچی پگڈنڈیوں پر گیدڑ شور مچا رہے تھے۔۔۔کہیں کہیں کسی دکان کے کچے تھڑے کے چھجے پر مدقوق سے بلب کی روشنی کے گرد پروانوں کی ٹولی جھوم رہی تھی۔۔۔سناٹے میں دور سے پکی سڑک سے گزرتی بس کا ہارن فضا کا کلیجہ چیرتا ہوا کانوں میں بھالے کی مانند اترتا تھا۔۔۔!

تبھی اونچے چوباروں اور چوڑے دالانوں والی حویلی میں ایک ساتھ کئی چیخیں گونج اٹھی تھیں۔۔۔خوبصورت کھڑے نقوش اور گوری رنگت والی سات ماہ کی حاملہ عورت ننگے پیر، رلتی چادر کو سنبھالتی برآمدے پار کرتی حویلی کے گیٹ کا رخ کر رہی تھی۔۔۔اس کے راہ میں آتی حویلی کی ملازمائیں بھی چیخیں دباتی ادھر ادھر دبک رہی تھیں۔۔۔کچھ کے حلق سے خوف کے مارے آواز بلند ہو کر اس عورت کی چیخوں کے ساتھ مدغم ہو گئی تھی۔۔۔اب تک حویلی میں چوہدری صاحب کی بندوق کا ایک فائر گونج چکا تھا۔۔۔کوئی بھی بندوق کی نال کے سامنے نہی آنا چاہتا تھا کیونکہ اس سمے جو خناس بڑے چوہدری کے دماغ پر سوار تھا اس نے اپنے پرائے کی پہچان بھلا دی تھی۔۔۔حویلی کے زنان خانے کے ایک کمرے میں دردزہ میں مبتلا ایک دوسری عورت بے بسی سے سب سن رہی تھی لیکن کر کچھ نہی سکتی تھی۔۔۔حویلی کے بچے خوف سے مردانے کے کسی کمرے میں بند ہو چکے تھے۔۔۔!

وہ عورت حاملہ تھی۔۔۔سراسیمگی نے اس کی شادابی نچوڑ کے رکھ دی تھی۔۔۔آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ کے وہ کشمکش و پنج میں مبتلا رک گئی تھی۔۔۔باہر کا گھور سناٹا اور پراسراریت اسے قدم باہر نکالنے سے روک رہی تھی۔۔۔تھوک نگلتی وہ رخ موڑتی گیٹ کی جانب پشت کیے کھڑی ہو گئی۔۔۔اپنے انجام کی دردناکی نے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں کر دیے۔۔۔اسی پل ایک اور فائر گونجا اور بڑے

چوہدری عین اس کی ناک کی سیدھ میں بندوق کی نال اس کی جانب کیے آن کھڑے ہوئے۔۔۔ایسا دکھ بھرا منظر دیکھ کر کونے کھدروں میں دم سادھے دبکی ملازمائیں سسک اٹھیں۔۔۔اس عورت نے بے بسی سے دونوں بازو نیچے گرا دیے تھے جیسے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔۔۔بڑے چوہدری نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھا اور نشانہ لیا۔۔۔عورت نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ملازماؤں نے چادروں کے پلو آنکھوں پر ڈال لیے۔۔۔ابھی فائر ہوا اور کام تمام۔۔۔بڑے چوہدری کی انگلی ٹریگر دبانے کو بے تاب تھی کہ ایک بچی کہیں سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس عورت کے آگے دیوار بن کے دونوں بازو پھیلائے شرر بار نگاہوں سے فائر کرنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھنے لگی۔۔۔بڑے چوہدری جی نے نفرت سے اس بچی اور پھر عورت کو دیکھا۔۔۔ان کی انگلی پل بھر کو ڈگمگائی۔۔۔عورت نے ہراساں ہو کر بچی کو پرے دھکیلنا چاہا لیکن بچی جم کے کھڑی رہی۔۔۔یہ عمل چند بار دہرایا جاتا رہا حتی کہ ایک آخری فائر داغ دیا گیا۔۔۔حویلی کے زنان خانے اور صحن میں ایک ساتھ چیخیں گونج کر خاموش ہو گئیں۔۔۔!

☆......☆......☆

چڑھتے سورج کی روشنی نے چھوٹے سے دو کمروں کے گھر کے نیم اندھیرے کو نگل لیا تھا۔۔۔برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی باجرہ نے تسبیح چوم کر جائے نماز پر رکھی اور اٹھ کر چپلیں پہنتی دیوار کے قریب آئیں جہاں پرندوں کے لیے آب خورے رکھے ہوئے تھے۔۔۔چھوٹے سے صحن کے کھرے کے نل کے گرد لپٹے پائپ کو لیے وہ نل کھولتی آب خوروں کے قریب لے آئیں اور انہیں دھو کر تازہ پانی بھرنے لگیں۔۔۔چڑیاں دیوار پر پھدک کر شکریے کا اظہار کر رہی تھیں۔۔۔وہ مسکرا دیں۔۔۔پانی بھرنے کے بعد انہوں نے پائپ واپس لے جا کر نل بند کیا اور اینٹوں کی دیوار میں ٹھونکے گئے ایک بڑے سے کیل سے لٹکے شاپر میں ہاتھ ڈال کر باجرے سے بھری مٹھی باہر نکالی اور کٹوروں میں خالی کر دی۔۔۔دیکھتے ہی دیکھتے چڑیوں کی فوج صحن میں اتر آئی۔۔۔روز کے اس معمول سے فارغ ہو کر وہ ہاتھ مسلتی آسمان پر نگاہ ڈال کر اندر کی جانب بڑھیں۔۔۔فجر کی نماز کے بعد سے لے کر سورج نکلنے تک وہ

اسی تخت پر بیٹھی تسبیحات پڑھا کرتی تھیں اور پھر روز مرہ کے معمولات میں مشغول ہو جاتی تھیں۔۔۔اندر آنے کے بعد وہ پہلے کچن میں گئی تھیں جہاں زمن نے چائے دم پر دے رکھی تھی اور دوسرا پراٹھا بیل کر توے پر ڈال رہی ت×ی۔۔۔ہاجرہ مسکرائیں اور بولیں۔۔۔

”رہنے دیتی بچی۔۔۔میں کر لیتی۔۔۔تمہیں تو آج ویسے بھی جلدی سکول پہنچنا تھا نا۔۔۔جاؤ جا کر تیار ہو۔۔۔میں دیکھتی ہوں اسے۔۔۔!“

”بلکل بھی نہیں۔۔۔میں نے شروع کیا ہے ناشتہ بنانا میں ہی ختم کروں گی۔۔۔آپ کو پتا ہے نا مجھے اپنا شروع کیا کام ادھورا چھوڑنا پسند نہیں اور کسی اور کے شروع کیے میں ہاتھ ڈالنا بھی پسند نہیں۔۔۔!“

زمن نے پورے دھیان سے پراٹھا پلٹتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

”اچھا جی۔۔۔پتا ہے مجھے، اچھے سے پتا ہے۔۔۔تمہارے لیے ہی کہہ رہی تھی کہ لیٹ ہو جاؤ گی۔۔۔تم تیار رہنا زمن۔۔۔پرنسپل سے بھی کہہ دینا پہلے ہی کہ تمہیں جلدی آف دے دیں۔۔۔ہو سکتا ہے زوہا کو آج ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے۔۔۔!“ آخری فقرے کو ادا کرتے ان کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی اتر آئی جسے محسوس کر کے زمن نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔۔۔

”لے جاؤں گی امی۔۔۔اور ان شاء اللہ مثبت نتیجہ ہی نکلے گا۔۔۔آنٹی رباب ہیں نا ساتھ۔ پھر کیوں فکر کرتی ہیں۔۔۔ان کی جان پہچان کا ڈاکٹر ہے آخر، تو وہ اچھے سے چیک اپ بھی کرے گا اور آگے کیا پراسس ہو گا سب گائیڈ کر دے گا۔۔۔!“

وہ پراٹھے کچن میں پڑی چھوٹی سی میز پر رکھتی ہوئی بولی۔۔۔ساتھ ہی اچار اور رات کے سالن کی کٹوری رکھ کر وہ مڑی اور دم کیے قہوے میں دودھ ڈالنے لگی۔۔۔

”ہاں یہ تو ہے۔۔۔رباب کہہ رہی ہے تو تسلی بخش ہی ہو گا۔۔۔ہو سکا تو میں بھی چلی چلوں گی آج ساتھ۔۔۔!“

”آج نہیں جانا۔۔۔کل یا پرسوں کا کہہ رہی تھیں آنٹی۔۔۔وہ ڈاکٹر شہر میں نہیں ہے۔۔۔آ جائے گا تو لے چلیں گی۔۔۔حوصلہ رکھیں۔۔۔اللہ بہتر ہی کرے گا۔۔۔!“

چائے سے بھرے مگ لیے وہ پیڑھی پر آ بیٹھی۔۔۔ایک مگ ہاجرہ کے آگے رکھ کر اس نے پراٹھا اپنے آگے کیا اور اس پر اچار کی پھانک رکھے رغبت سے کھانے کا دکھاوا کرنے لگی ورنہ کن اکھیوں سے وہ ماں کو ہی دیکھ رہی تھی جن کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے تاثرات تھے۔۔۔وہ اندر ہی اندر اداس ہوتی، بہتری کی دعا مانگتی چائے کا مگ اٹھا کر چہرہ چھپا گئی۔۔۔!

☆......☆......☆

یہ جو دور تک دورویہ سڑک کے اطراف میں بڑے بڑے اور اونچے چوباروں، روشن بالکونیوں والے مکان بنے ہوئے ہیں، دیکھنے میں نہایت دیدہ زیب لگتے ہیں۔۔۔پوش کالونی کے رہائشی ایسے مکانات کی دیکھ ریکھ کرنا خوب اچھے سے جانتے ہیں۔۔۔ظاہری رنگ وروغن سے لے کر پچھلے حصے میں بنے سرونٹ واشروم کی سینٹری تک سب کچھ اپ ٹو ڈیٹ رہتا ہے۔۔۔ان کالونیوں کے رہائشی وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا خوب جانتے ہیں۔۔۔یہاں اکثر گھروں کے مالکان ادب کر سال کے سال باہری روغن کا رنگ بدل دیتے ہیں۔۔۔تبدیلی کا یہ عمل اتنی تیزی سے جاری رہتا ہے کہ پچھلے سال کوٹھی کے مالک کی ٹنڈ تھی تو اگلے سال کی شروعات میں وہ ٹرانسپلانٹ کروا کے جب گیٹ سے نمودار ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا بیٹا سالوں بعد فارن سے آیا ہو۔۔۔چھے مہینے جرمن شیفرڈ پالنے کے بعد اگلے چھے ماہ خوبصورت فر والی ایرانی بلی بیگم صاحبہ گودی میں اٹھا کر نزدیکی پارک میں ٹہلتی دکھائی دیں گی۔۔۔کبھی بیرونی دیواروں پر ہری بھری بیلیں لپٹتی دکھائی دیں گی تو کبھی باؤنڈری وال سے متصل آرائشی باڑھ بھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔۔۔یہ تنوع اس کالونی میں رہنے والے بیشتر افراد کے مزاج کا خاصہ ہے۔۔۔اسی لمبی سی سڑک کے اختتام پر کارنر پلاٹ پر بنا بہترین بنگلہ اپنی ظاہری تزئین و آرائش کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔۔۔خوبصورت پھولدار بیلوں سے لدی بالکونیاں۔۔۔ایک ترتیب سے لگے درخت، ٹف ٹائلز اور امپورٹڈ گھاس سے مزین لان جس کے ایک کونے میں خوبصورت مصنوعی آبشار بہتی ہے۔۔۔مالی کا کمال ہے سارا ورنہ مکین تو خود کی ناک پونچھنے میں بھی آلکس دکھانے کے ماہر ہیں۔۔۔باہر سے دیکھنے میں یہ بنگلہ جتنا عمدہ منظر پیش کرتا ہے ذرا اندر چلے چلیں تو

معلوم ہوگا کہ غدر کسے کہتے ہیں۔۔۔!

☆......☆......☆

بڑے سے لاؤنج کے پردے گرے ہوئے تھے اور سارے میں بڑا مزیدار سا نیم اندھیرا چھایا تھا۔۔۔ ہلکے ہلکے چلتے پنکھوں کی خنکی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی کہ جاگتے بندے کو بھی نیند کے ہلکورے دلا دے۔۔۔ لاؤنج کا فرنیچر بے حد شاندار تھا۔۔۔ مہنگا اور نفیس۔۔۔ اب جب یہاں بے سدھ پڑے افراد کا جائزہ لیں تو یہ سب سے پہلے تھری سیٹر صوفے پر نانی پیاری پڑی ہیں جن کا تقریباً دانتوں سے خالی منہ اتنا کھلا ہوا کہ جب وہ سانس لیتی اور خارج کرتی ہیں تو بڑی سریلی خراٹے نما آواز نکلتی ہے۔۔۔ ان کے صوفے کے بالکل ساتھ جڑ کر قالین پر زارون سو رہا ہے۔ جس کی ایک ٹانگ نانی پیاری کے صوفے پر اٹکی ہے اور دوسری خود سے ذرا فاصلے پر سوئے پڑے داور کے پیٹ پر ٹکی ہوئی ہے۔۔۔ داور سے سر سے سر جوڑ کر سویا ہوا یاور ہے۔ جس کے ادھ کھلے منہ کا رخ روشن داور کے ناک کے اوپر فٹ ہے۔۔۔ اور ان سے قریب ترین ٹو سیٹر پر آدھا لٹکا آدھا ٹنگا شہریار سو رہا ہے۔۔۔ لاؤنج کے صوفوں کا کوئی کشن ٹھکانے پر نہیں ہے۔۔۔ کئی داخلی دروازے پر لڑھکے پڑے ہیں اور کئی سروں اور کولہوں کے نیچے دبے سسک رہے ہیں۔۔۔ کارزرواز جو کہ کم از کم تین ساڑھے تین فٹ قد رکھتا ہوگا، وہ مسکین فرش پر چت یوں لٹایا گیا ہے جیسے اسے بھی آرام کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ نانی پیاری کے سونے کے بعد ان کی کمزور بینائی کا فائدہ اٹھا کر چاروں نے سگریٹ پیے تھے، وہی سگریٹ کے ٹوٹے ایش ٹرے سے باہر ٹیبل کے شیشے پر خمار زدہ سے پڑے ہیں۔۔۔ تین چار گلاس اور چائے کے سوکھے مگ بھی کارپٹ پر بہار دکھا رہے ہیں۔۔۔ صوفوں پر گندے اور صاف کپڑے مدغم ہوئے پڑے ہیں۔۔۔ آدھے پونے کھیس چادریں تانے سب کے سب آنے والی آفت سے بے خبر نیند کے مزے لے رہے ہیں۔۔۔ تبھی اچانک اور بالکل اچانک گاڑی کا زوردار ہارن سب سے پہلے زارون کے کانوں میں پڑا تھا جس کی نظر تو خاصی کمزور تھی لیکن سماعت خوب کمال تھی۔۔۔ دو تین سیکنڈ تو وہ مندی مندی آنکھیں کھولے ہارن کی پیچ اور فاصلے کا تعین کرتا رہا لیکن جیسے ہی حواس بحال ہوئے پوری شدت سے چلایا۔۔۔

"مہر یار لالہ آگئے۔۔۔اوئے اٹھو۔۔۔مہر لالہ۔۔۔اوئے بیڑہ غرق۔۔۔اٹھ جاؤ۔۔۔"

زارون نے اٹھتے ہوئے داور کے پیٹ پر رکھے اپنے پیر کی ایڑی مار کر اسے جگایا تھا۔۔۔ نانی پیاری بھی ہڑبڑا کر جاگیں۔۔۔ان کے جاگنے سے ان کا نیچے لٹکتا ہاتھ زارون کے منہ پر پڑا، جو چلا بھی رہا تھا اور ٹٹول ٹٹول کر اپنی عینک بھی ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔

"نانی پیاری۔۔۔میرا منہ ہے یہ۔۔۔ہاتھ ہولا رکھیں۔۔۔اوپرسے میری عینک بھی نہی مل رہی۔۔۔"

اس نے ایک ہاتھ ناک پر رکھ کر دوسرے سے کارپٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔۔۔نانی پیاری اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور وہ بھی اپنی عینک تلاش کر رہی تھیں۔۔۔داور آنکھ کھلتے ہی اپنے ناک کے قریب ماسک کی طرح فٹ یاور کا کھلا منہ "دیکھ کم سونگھ" کر ابکائی روکتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔رکھ کر ایک ہائی کلاس چپیڑ اس کے فلیٹ گال پر دھری۔۔۔

"یا خدا۔۔۔دہانہ ہے یا کووڈ کی وبا۔۔۔" وہ ناک بند کر کے ناک میں بولا۔۔۔تھپڑ کھا کر یاور گال مسلتا ہوا سیدھا ہوا اور ہوش میں آتے ہوئے بڑبڑایا۔

"مجھے چپیڑ کس نے ماری ہے۔۔۔!"

"خواب دیکھ رہا تھا تُو۔۔۔!" داور نے بہلایا

"ایسی چپیڑ خواب میں۔۔۔؟ گال تو ابھی تک تازہ جل رہا ہے۔۔۔"

داور بند ناک سے دوبارہ بولا۔۔"مہر یار لالہ آگئے ہیں غلیظ۔۔۔ان حالوں میں دیکھ لیا سب کو تو وہ حشر ہوگا کہ حشر یاد آجائے گا۔۔۔"

"او تیری۔۔۔! پہلے کیوں نہیں بولا۔۔۔" یاور کھیس اتار کر گولا بنا کر پھینکتے ہوئے بولا لیکن بھاگنے کے چکر میں اسی میں پھنس کر پورے قد سے داور کی گود میں جا گرا۔۔۔

"اووووووو۔۔۔مر گیا۔۔۔" یاور نے گھٹنا پکڑ کر دہائی دی اور داور کے ڈیلے ابل گئے۔۔۔

"پرے مر۔۔۔" اس نے یاور کو زوردار دھکا دیا۔۔۔

زارون کو چشمہ مل گیا اور وہ اسے آنکھوں پر فٹ کرتا شہر یار کے اوپر تقریباً چڑھ کر اسے نیند سے

اٹھانے لگا۔۔۔

"شہری۔۔۔شہری مہر لالہ آ گئے۔۔۔اٹھ۔۔۔ہم نے تو یونی سے بھی چھٹی مار لی۔۔۔گولی مار دیں گے لالہ۔۔۔"

شہریار نے بمشکل آنکھیں کھولیں تو زارون کا چہرہ اتنے قریب دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اسے دھکا دیتا اٹھ بیٹھا۔۔۔زارون الٹ کر نانی پیاری پر جا گرا جو بیچاری ابھی بھی اپنا چشمہ ڈھونڈ رہی تھیں۔۔۔شہریار نے چادر خود سے اتار کر سینٹرل ٹیبل پر اچھالی اور نتیجتاً ایش ٹرے اپنی ساری ایش اور سگریٹ کے ٹکڑوں سمیت کارپٹ پر بکھر گئی۔۔۔زارون چڑتے ہوئے شہریار پہ بگڑا۔۔۔

"مشلاً۔۔۔مجھے کس کھاتے میں دھکا دیا ہے۔۔۔ایک تو احسان کر رہا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اوپر سے سر پر چڑھا آ رہا ہے۔۔۔"

"میں چڑھا آ رہا ہوں یا تو میرے منہ پر چڑھا ہوا تھا۔۔۔صبح صبح دھڑکنیں ڈوب گئیں میری، تیرا ابتھاڑ (منہ) اتنے نزدیک دیکھ کر۔۔۔" شہریار سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔۔۔

"لیکن مجھے تو تم بہت دور دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ابھی بھی کتنے پچھو پچھو سے دکھ رہے ہو۔۔۔"

زارون اپنی عینک درست کرتا بڑبڑایا۔۔۔

داور اٹھا اور لاؤنج کی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا بولا۔۔۔

"اینٹری ہونے والی ہے۔۔۔بھاگو۔۔۔سب کے سب۔۔۔بھاگو۔۔۔"

اور وہ چاروں یوں سرپٹ اندر کمروں کی جانب بھاگے کہ ثابت ہو جائے کہ یہاں بس نانی پیاری اکیلے ہی دھمال ڈالتی رہی ہیں۔۔۔زارون راستے میں ہر دوسری چیز سے ٹکرا کر اسے ڈھیر کرتا ہوا گیا تھا کیونکہ جلد بازی میں وہ چشمہ نانی پیاری کا لگا چکا تھا جو ہنوز آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنائے اپنا چشمہ ڈھونڈ رہی تھیں۔۔۔

"آئے ہائے۔۔۔اللہ ماری نا جانے کدھر غرق ہو گئی میری عینک۔۔۔اس مہر نے مجھ غریب کی پتلی گردن پکڑنی ہے۔۔۔ان سب کی کرتوتیں میرے کھاتے ڈل جانی ہیں۔۔۔چل مائی۔۔۔چادر

تان اور سوتی بن جا۔۔۔اسی میں بچت ہے۔۔۔"

نانی پیاری نے چشمے کی طرف سے مایوس ہو کر دوبارہ لیٹ کر چادر تان لی تھی۔۔۔لاؤنج میں تباہی سی تباہی مچی ہوئی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

ایک چمکتی دمکتی برانڈ نیو گاڑی پورچ میں آ کر رکی تھی۔۔۔چوکیدار گیٹ بند کر کے بھاگ کر دروازہ کھولنے کے لیے آیا مگر تب تک اندر سے ایک چھے فٹ دو انچ کا خوبصورت مرد باہر نکل آیا تھا۔۔۔

"سلام صاب۔۔۔!" چوکیدار نے مؤدب ہو کر سلام عرض کیا۔۔۔جواب میں سر کے اشارے اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا گیا۔۔۔چوکیدار راستہ دیتے ہوئے پیچھے ہٹا۔۔۔نوجوان اونچی چمکتی پیشانی نکھری گندمی رنگت، خوبصورتی سے تراشی مونچھوں اور بلکل ہلکی بڑھی شیو لیے انتہائی پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔۔۔گاڑی کا دروازہ بند کر کے اس نے اپنا کوٹ اتارا اور بازو پر ڈال کر گاڑی کی چابی چوکیدار کو پکڑاتے ہوئے کہا۔۔۔

"خان ڈگی میں سے سامان نکال کر میرے کمرے میں پہنچا دو۔۔۔فضلو آئے تو اسے کہنا کپڑے لانڈری بھجوا دے اور باقی سامان وارڈروب میں سیٹ کر دے۔۔۔میں اب ریسٹ کروں گا۔۔۔"

"جی صاب۔۔۔جو اُکم (حکم)۔۔۔ویسے آپ بنا بتائے ای آ گیا۔۔۔بتا دیتا تو کش تیاری شیاری ای کر لیتے صاب۔۔۔"

"کیوں۔۔۔پھول بچھانے تھے کیا۔۔۔میرا تھن جیت کر آ رہا ہوں۔۔۔؟ اوٹ پٹانگ مت ہانکا کرو خان۔۔۔جاؤ جا کر کام کرو جو کہا ہے۔۔۔"

چوکیدار دبک گیا۔۔۔نوجوان اندر کی جانب بڑھا تو چوکیدار بڑبڑایا۔۔۔

"اندر جا کر دیکھے گا صاب تو خود ہی منہ سے بولے گا کاش بتا کر آیا اوتا۔۔۔"

چوکیدار ڈگی کی جانب بڑھا اور نوجوان گھر کا داخلی دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔۔۔نیم اندھیرے لاؤنج کی خنکی نے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا۔۔۔تیز روشنی سے آنے کی وجہ سے منظر واضح نہی

تھا۔۔۔دو قدم آگے بڑھا تو پاؤں خدا جانے کس چیز سے اٹکا، وہ پورے قد کے ساتھ دھڑام سے سجدہ ریز ہوگیا۔۔۔ماتھا کسی لڑھکے ہوئے گلاس کے ساتھ ٹکرایا تو منہ سے زوردار کراہ نکل گئی۔۔۔گھٹنے کے نیچے بھی پتھر کی ایش ٹرے آگئی تھی۔۔۔وہ بلبلا اٹھا۔۔۔نانی پیاری نے چادر کی جھری میں سے جھانکنے کی پوری کوشش کی مگر ہائے ری عینک۔۔۔بس ہیولا سا ہی چلبلاتا دکھا۔۔۔نوجوان ایک ہاتھ گھٹنے پر دھرے اور دوسرا ماتھے پر رکھے کھڑا ہوا تو نظریں سارا منظر دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔۔۔یہ اس کا گھر نہیں ہوسکتا۔۔۔نہی۔۔۔نہی۔۔۔شائد وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔۔۔وہ خود کو یقین دلاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لاؤنج کا حشر دیکھ رہا تھا۔۔۔اسے لگا کہ وہ کسی سستے ترین ہوٹل کے کمرے یا بوائز ہاسٹل کے سب سے نکمے ترین لڑکوں کے روم میں چلا آیا ہے۔۔۔سارا لاؤنج ادھڑا پڑا تھا۔۔۔اس نے ایک سنگل سیٹر صوفہ پر اپنا قیمتی اور جان سے پیارا لیپ ٹاپ اوندھا پڑا دیکھا تو صدمے اور جلال سے اس کا رواں رواں لرز اٹھا۔۔۔

"شہر رررریاااار۔۔۔!" وہ دانتوں میں چھوٹے بھائی کو پیستا ہوا آگے بڑھا تو بس آخری ہونی ہو کر رہی۔۔۔گچھا بنی چادر اور کھیس میں دوبارہ پاؤں اٹک گیا اور اب کے وہ اوندھا گرا تو بے بسی سے اور طیش کنٹرول کرنے کی خاطر زور زور سے کارپٹ پر مکے برساتا رہا۔۔۔نانی پیاری نے ایک بار پھر جھری میں سے جھانکا تو ان کا نواسا کم پوتا یا پوتا کم نواسا "مہریار راؤ" فل فارم میں آیا ہی چاہتا تھا۔۔۔باقی لڑکوں کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کرتے وہ دوبارہ چادر میں گم ہوگئیں۔۔۔!

☆......☆......☆

کمرے میں پن ڈراپ سائیلینس تھا۔۔۔یوں جیسے کوئی ذی نفس وہاں سانس بھی نہی لے رہا تھا۔۔۔ماسٹر بیڈ پر مہریار شرٹ کے کف فولڈ کیے، کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے ایک ہاتھ میں پکڑے رومال سے ماتھے کی ٹکور کر رہا تھا اور دوسرے کی مٹھی شدت جذبات سے کبھی کھل رہی تو کبھی بند ہو کر مکے کی شکل میں تبدیل ہو رہی تھی۔۔۔ایسے میں سامنے لائن حاضر ہوئے چست کھڑے چاروں لڑکے اس بھاری بھر کم مکے کو دیکھ کر باری باری تھوک نگلتے تھے۔۔۔ایک کرسی پر نانی پیاری بھی بیٹھی تھیں اور اپنی عینک کا چشمہ

صاف کرتے ہوئے چندی نگاہوں سے اور چھیڑتی مسکراہٹ لیے چاروں کو دیکھتی تھیں اور پھر دوبارہ قمیض کے دامن سے شیشے رگڑنے لگتی تھیں۔۔۔مہریار نے سب سے پہلے خود سے چھوٹے شہریار کو لپیٹا۔۔۔

"کیا کہہ کر گیا تھا میں شہری۔۔۔؟"

"بڑوں کا ادب کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، غریبوں پر رحم کرنا اور ضرورتمندوں کے کام آنا۔۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔۔۔یہ کب کہا تھا میں نے۔۔۔؟"

"لالہ آپ نے کہا تھا شہری تم نے اچھے شہری کی تمام خوبیاں یاد رکھنی ہیں اور انہی کو بروئے کار لانا ہے۔۔۔"

"گھامڑ۔۔۔یہ کب کہا تھا کہ اردو کا مضمون یاد کرلو۔۔۔تمہاری ذاتی خوبیاں استعمال میں لانے کو کہا تھا۔۔۔اور شہری سے مراد میری تم خود تھے بیوقوف، کم عقل۔۔۔" مہریار نے زچ ہو کر اپنی ہی پیشانی پر ہاتھ دے مارا تو منہ سے سسکی نکل گئی۔۔۔

"تو لالہ کھل کر کہنا چاہیے تھا نا۔۔۔میں نے خوامخواہ پرچھتی سے پرانا ٹرنک اتار کر اس میں سے آٹھویں جماعت کی کتاب نکالی اور پتا نہی کیسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ سب یاد کیا۔۔۔"

باقی تینوں نے جھکے سروں کے ساتھ گردنوں کا رخ شہریار کی طرف موڑ کر اسے داد دیتی نظروں سے دیکھا۔۔تینوں کی نگاہوں کا مفہوم ایک ہی تھا۔۔۔"بلے وئی بلے"!

"اتنی تابعداری کی ہی تھی تو اس میں کہیں یہ بھی لکھا ہو گا کہ گھر کو کباڑ خانہ مت بنائیں۔۔۔صفائی کا خیال رکھیں۔۔۔لان کی دیکھ بھال کریں۔۔۔کچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر مت لگائیں۔۔۔غلیظ کپڑے جگہ جگہ نا پھینکیں۔۔۔" مہریار نے تیوریاں چڑھا کے کہا۔۔۔

"لکھا ہو گا لالہ۔۔۔وہ والا صفحہ پھٹ گیا ہوا تھا۔۔۔"

مہریار غصے سے کھڑا ہوا تھا۔۔۔"بہت بکواس کر لی تم نے شہری۔۔۔پاگل نہی ہوں میں۔۔۔میں تم چاروں کو وارن کر کے گیا تھا کہ میرے پیچھے دنگل نا کھیلنا۔۔۔لیکن نہی۔۔۔کبھی ہو ہی نہی سکتا کہ تم لوگ انسان کے بچے بن کر رہو۔۔۔"

" میری عینک کی لَت بھی تروڑ دی اس داور نے۔۔۔" نانی پیاری عینک ناک پر رکھ کر منمنائیں جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔۔۔

" میں نے کب۔۔۔ مجھے تو پتا بھی نہی نانی پیاری۔۔۔" داور اس الزام پر ہکا بکا سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔۔۔ نانی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔۔۔

" اوئے میرے پاس کون لیٹا ہوا تھا تم میں سے۔۔۔؟"

" زارون تھا نانی پیاری۔۔۔" داور نے یاد دلایا۔۔۔ زارون اپنی عینک ناک پر ٹھیک سے جماتے ہوئے بولا۔۔۔

" پہلے تھا۔۔۔ بعد میں تم نے جگہ ایکسچینج کر لی تھی۔۔۔ نانی پیاری اب اتنی بھی بھولی نہی۔۔۔"

" بس کرو تم دونوں۔۔۔" مہریار نے شرر بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے ٹوکا اور یاور کی جانب دیکھا۔۔" اور تم۔۔۔ تم نے تو بڑا سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا مجھے کہ لالہ میں سب کا دھیان رکھوں گا۔۔۔ جب آپ واپس آئیں گے تو سارا گھر آپ کو ٹپ ٹاپ حالت میں ملے گا۔۔۔ یہ ملا ہے مجھے۔۔۔ گھٹنے پر گومڑ اور ماتھے پر۔۔۔"

" جھومر۔۔۔" داور کی زبان پھسلی۔۔۔ مہریار کے نتھنے پھول کر پچکے۔۔۔ داور نے سہمتے ہوئے تصحیح کی۔۔۔" میرے کہنے کا مطلب تھا لالہ کہ ماتھے پر گومڑ بنا ہے اور گھٹنا ٹوٹتے ٹوٹتے بچ بچا گیا ہے۔۔۔ ورنہ بیساکھی لینی پڑتی۔۔۔!"

" نہی۔۔۔ وہیل چیئر۔۔۔ میرے دوست کے دادا کا گھٹنا ٹوٹا تھا وہ وہیل چیئر پر آگئے تھے۔۔۔" زارون نے معصومیت سے عینک درست کر کے اطلاع دی۔۔۔

" چل شکر کر مہر پتر۔۔۔ وہیل چیئر بھی ماڑی نہی۔۔۔ لَت ٹٹنے سے بچ گئی۔۔۔ دیکھ جیسے میری عینک کی ٹُٹ گئی۔۔۔" نانی پیاری نے حوصلہ دلا کر اپنی عینک دیکھتے ہوئے ہوکا بھرا۔۔۔ شہریار اور یاور سر جھکائے ہونٹ بھینچے ہنسی کا گلا گھونٹ رہے تھے۔۔۔ مہریار کا میٹر آؤٹ ہو رہا تھا۔۔۔ اس نے جھک کر اپنا سلیپر اٹھایا۔۔۔ چاروں نے ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھا اور دو دو قدم پیچھے کو لیے۔۔۔ اس

سے پہلے کہ وہ کسی ایک پر برسا دیتا، کل وقتی ملازم فضلو، مہریار کا سامان لے کر اندر داخل ہوا۔۔۔ مہریار کے ہاتھ میں جوتا دیکھ کر بوکھلا کر بولا۔۔۔

"یہ یہ۔۔۔ سامان لایا تھا۔۔۔ کہاں رکھوں صاب۔۔۔؟"

"سر پر رکھ دو۔۔۔" مہریار دھاڑا۔۔۔

"اچھا جی۔۔۔!" فضلو نے ایک بیگ اٹھایا اور اپنے سر پر رکھا۔۔۔ چاروں لڑکوں کے منہ سے ہنسی پھٹے بانس میں سے نکلی آواز کی طرح پھوٹی۔۔۔ فضلو بیچارہ پریشان صاب کے منہ دیکھنے لگا۔۔۔ نانی پیاری نے فضلو کو اپنی چھڑی سے ٹہوکا دیا۔۔۔

"او ڈنگر۔۔۔ اپنے سر پر رکھنے کا نہی کہا۔۔۔ مہر کے سر پر رکھ جا ہلا۔۔۔!"

فضلو باچھیں چیرتا بیگ لیے آگے بڑھا۔۔۔ مہریار کے حلق سے چنگھاڑ نکلی اور اگلے پانچ سیکنڈ میں چاروں لڑکے اور فضلو بیگ سمیت لڑکھڑاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے باہر نکل رہے تھے۔۔۔ نانی پیاری سب سے پیچھے ہولے ہولے چلتی باہر آئیں۔۔۔

"باؤلا ہو گیا لڑکا۔۔۔ یہ سب چھڑے رہنے کی وجہ سے ہے۔۔۔ سنگل ڈلا ہو تو سکون سے بیٹھے۔۔۔ لے بتا ایسے چیخ رہا ہے جیسے اس کی پونچھ پر پیر رکھ دیا ہو۔۔۔ اب چار دن سب کو کاٹتا پھرے گا۔۔۔"

نانی کے نکلتے ہی دروازہ دھاڑ سے بند ہوا تھا اور وہ بھی چادر کی بغل میں ہنسی چھپاتی باقی چاروں لڑکوں کے پاس محفل جمانے چل دی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

یہ کل وقتی تماشا گاہ "حیات مینشن" کہلاتی ہے۔۔۔ چار جوان جہان بھائی اور پانچواں ان کی پھوپھی کا لڑکا کل ملا کر پانچ۔۔۔ پوری کالونی کے کنواری بچیوں کے والدین کی ٹوہ کا مرکز تھا۔۔۔ نانی پیاری نا تو سگی نانی ہیں نا سگی دادی۔۔۔ مہریار حیات کے ابا کی دور کے رشتے کی پھوپھی اور اماں کی سگی خالہ تھیں۔۔۔ اس لیے قریبی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے لڑکے انہیں نانی بلاتے تھے۔۔۔ بیاہ ہوا تھا مگر دو سال بعد بیوہ ہو کر میکے چلی آئیں۔۔۔ پھر ساری عمر بیاہ نہی کیا۔۔۔ بہن بھائی مر مرا گئے تو بھتیجوں

بھانجوں نے علاقہ ختم کر لیا۔۔۔اولڈ ایج ہوم کا رخ کرنے والی تھیں جب مہر یار کی اماں خود مہر یار کے ساتھ جا کر انہیں لے آئیں۔۔۔پہلے گاؤں میں بھانجی کے پاس رہیں پھر جب سب لڑکے باری باری پڑھائی کی غرض سے شہر شفٹ ہوئے تو اماں نے نانی پیاری کو بھی ہمراہ کر دیا۔۔۔ان کا اپنا دل بھی چلبلے پن میں زیادہ لگتا تھا۔۔۔مہر یار نے بھی اعتراض نہیں کیا کہ اسے بھی اپنے بھائیوں کی دیکھ ریکھ کے لیے بزرگ کی ضرورت تھی۔۔۔تب سے نانی پیاری یہیں تھیں اور ایسی تھیں جیسے کہیں کی نہیں تھیں۔۔۔ان کا دل لڑکوں کی اوٹ پٹانگ شرارتوں میں خوب لگا کرتا تھا۔۔۔مہر یار بے حد خوبرو لیکن بلا کا سنجیدہ مزاج تھا۔۔۔ہر وقت ماتھے پر تیوریاں لیے وہ سنجیدہ لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا۔۔۔گزرے وقت نے اسے آدم بیزار اور چڑچڑا کر ڈالا تھا، کچھ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔۔۔نفاست پسند اور کم گو ہونے کی وجہ سے وہ فارغ وقت زیادہ کمرے میں گزارنا پسند کرتا تھا۔۔۔بھائیوں کی ہر حرکت پر البتہ پوری نگاہ تھی۔۔۔ان کی پڑھائی سے لے کر روزمرہ روٹین سے مکمل باخبر رہتا۔۔۔وہ ایک سخت گیر بھائی تھا۔۔۔بے ترتیبی اور کام چوری سے نفرت کرتا تھا لیکن تینوں بھائی اس کی ضد تھے۔۔۔گھر کے جامد ماحول سے اکتا کر وہ ہلا گلا کرتے لیکن مہر یار کے گھر آتے ہی سب خول میں بند ہو جاتے۔۔۔نانی پیاری کے آنے سے یہ فرق پڑا کہ اکثر وہ ان بھائیوں کی کرتوتیں چھپا جاتیں اور مہر یار ان کے لحاظ کی وجہ سے خاموش ہو جاتا۔۔۔رہی سہی کسر ان کی اکلوتی پھپھو کے سب سے چھوٹے فرزند نے یو کے سے آ کر پوری کر دی۔۔۔زارون کو نمرہ پھوپھو نے خاص بھتیجوں کی فرمائش پر پاکستان بھیج دیا تھا لیکن مہر یار کو اس کی وجہ سے اشک شوئی زیادہ کرنا پڑی۔۔۔باقی تینوں لڑکوں کے ساتھ مل کر وہ بھی ہو بہو ویسا ہی ہو چکا تھا۔۔۔مہر یار شام میں دیر سے لوٹتا تھا اور یونیورسٹی، کالج سے آ کر ان چاروں کی اس کی واپسی تک دھما چوکڑی ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔۔۔نانی پیاری بھی پورا حصہ ڈالتی تھیں۔۔۔کبھی گاؤں سے ابا سوغاتیں لے کر آ جاتے تو وارے نیارے ہو جاتے۔۔۔گاؤں میں ابا کی بہت لمبی چوڑی زمینداری تھی جس سے انہیں فرصت کم ہی ملا کرتی۔۔۔بیٹوں میں سے کوئی بھی اس طرف آنے کو تیار نہیں تھا اور ابا کو اپنی زمینوں سے محبت تھی۔۔۔حویلی کی رونقیں چھوڑ کر اماں بھی شہر آنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔۔۔اور اب جب سے وہ بیمار

رہنے لگی تھیں ان پر مہریار کی شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا مگر مہریار پروں پر پانی نہی پڑنے دیتا تھا ۔۔۔اس معاملے میں وہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو جاتا تھا۔۔۔ابا اس کے ہمنوا تھے لیکن اماں انہیں اکساتی تھیں کہ وہ اسے بیاہ پر مجبور کریں۔۔۔وہاں گاؤں میں انہوں نے ایک سو ایک لڑکی دیکھ رکھی تھی مگر مہریار نے اس روز روز کی چخ چخ کی وجہ سے گاؤں جانا بہت کم کر دیا تھا۔۔۔نانی پیاری کو بھی اماں نے اسی مہم پر لگا رکھا تھا پر انہیں بھی یہ بیل منڈے چڑھتی نہی دکھتی تھی۔۔۔اوپر سے چاروں لڑکے چار دن سے زیادہ کوئی کام والی ٹکنے نہی دیتے تھے۔۔۔فضلو کا آسرا تھا جو کام چل رہا تھا ورنہ کباڑ خانہ سے بدتر حالت ہوتی گھر کی۔۔۔نانی پیاری اور اماں اس لیے بھی پوری شد و مد سے پیچھے پڑی تھیں کہ مہریار شادی کرلے تاکہ گھر میں عورت کے وجود سے رونق آئے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔باقی چاروں کہتے تھے کہ یہ نیک کام انہیں آفر کیا جائے تو وہ یقیناً مایوس نہی کریں گے۔۔۔شہریار کا آخری سمیسٹر تھا اس کے بعد اس کا ارادہ جاب کرنے کا تھا۔۔۔اس کی شادی مہریار نے تب تک ہونے نہی دینی تھی جب تک وہ مکمل سیٹ نا ہو جاتا۔۔۔باقی دونوں ابھی چھوٹے تھے اور کالج جاتے تھے۔۔۔زارون بھی شہریار کا ہم عمر تھا اور دونوں ایک ہی یونی میں تھے۔۔۔چاروں گھر واپس آتے تو شرارتوں کا طوفان سنگ آتا۔۔۔زارون گو کہ ان تینوں کی نسبت خاصا سیدھا تھا لیکن ساتھ مل جاتا تو ویسا ہی ہو جاتا۔۔۔شہریار ان سب کے گرو کی حیثیت رکھتا تھا۔۔۔جو سکون سے انہیں دھندے سے لگا کر خود سر دھنتا تھا۔۔۔مہریار ان کی حرکتوں سے خفا ہوتا تو نانی پیاری اس کے سامنے اس ساری صورتحال کا واحد حل اس کی شادی پیش کرتیں۔۔۔دلہن آجاتی تو ان بے نتھے بیلوں کو نکیل ڈالتی۔۔۔لیکن مہریار کان لپیٹ کے یوں ہٹ جاتا جیسے شادی کا ذکر سننا بھی اس کے لیے حرام ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن سکول سے جلدی گھر کے لیے نکلنا چاہتی تھی مگر عین وقت پر پرنسپل نے میٹنگ بلا لی۔۔۔ اسے سکول میں ہی رباب آنٹی کی کال آئی تھی کہ وہ جلدی گھر پہنچ جائے کیونکہ جس ڈاکٹر کو زوہا کو دکھانا تھا اس سے انہوں نے وقت لے لیا تھا۔۔۔زمن نے سن کر سکون کا سانس لیا تھا کہ وہ خود بھی مزید ایک دن

کی تاخیر نہیں چاہتی تھی لیکن اب جب کہ پرنسپل نے میٹنگ کال کر لی تھی تو وہ اٹینڈ کیے بنا جا نہی سکتی تھی۔۔۔اسی میں اسے مزید ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔۔۔اور جس وقت وہ گھر پہنچی تو ہاجرہ بیزار اور نیم غصے سے صحن میں ہی چکر لگا رہی تھیں۔۔۔اس نے بیگ کندھے سے اتار کر سلام کیا اور سیدھی تخت پر جا بیٹھی۔۔۔

”تم نے کہا تھا نا کہ جلدی آؤ گی۔۔۔رباب تمہارا انتظار کر کر کے پندرہ منٹ پہلے ہی گئی ہے۔۔۔ اب پھر کسی اور دن پر پڑ گیا ہے چیک اپ۔۔۔ایک کال ہی کر دیتی نا تم۔۔۔!“

ہاجرہ تھکے تھکے قدموں سے اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔۔۔ان کے لہجے میں بے حد اداسی تھی۔۔۔زمن نے دیکھا ان کے پیر ٹخنوں کے پاس سے سوج رہے ہیں۔۔۔دن اور رات کے بیشتر اوقات میں پریشانی سے ٹہلنے کا نتیجہ تھے یہ۔۔۔زمن نے تھکن سے آنکھیں موند کر سر ہاتھوں پر گراتے ہوئے کہا۔۔۔

”بس امی۔۔۔نکلنے والی تھی لیکن میٹنگ کے لیے بلا لیا پرنسپل نے۔۔۔آنٹی رباب کا مجھے سکول میں ہی فون آ گیا تھا کہ ڈاکٹر اویل ایبل ہے آج مگر کیا کرتی، اگر میٹنگ اٹینڈ نا کرتی تو بھی مناسب نہی تھا۔۔۔پہلے ہی اس کوشش میں ہوں کہ مجھے سینئر کلاسز دے دی جائیں ایسے میں چھوٹی سی لاپرواہی بھی کاؤنٹ ہو جاتی ہے امی۔۔۔!“ اس نے ہاجرہ کے دونوں ہاتھ تھامے اور بولی ”سوسوری امی۔۔۔میں آنٹی رباب کو فون کر لوں گی اور اگلا اپوائنٹمنٹ جتنی جلدی مل سکا لے لیں گے ہم۔۔۔آپ پریشان نا ہوں بس۔۔۔ہماری زوہا بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور بہت جلد ہمارے ساتھ اس تخت پر بیٹھی پہلے کی طرح قہقہے مارے گی۔۔۔دیکھ لینا آپ۔۔۔!“

ہاجرہ نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر پیشانی چومی اور بولیں۔۔۔

”ان شاءاللہ۔۔۔ایسا ہی ہو گا۔۔۔چلو تم اندر چلو۔۔۔منہ ہاتھ دھو لو۔۔۔میں کھانا لے کر آتی ہوں۔۔۔!“

”اپنے کمرے میں ہی لائیے گا۔۔۔میں زوہا کے پاس ہوں۔۔۔اس کے ساتھ مل کر کھاؤں

گی۔۔۔!" زمن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور بیگ اٹھائے اندر کا رخ کیا۔۔۔اس کی پشت کو محبت سے دیکھتی ہاجرہ بھی اٹھ کر کچن کی جانب چل دیں۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ اپنے کمرے سے فریش ہو کر آئی اور ہاجرہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔چھوٹا سا کمرا جس میں دو سنگل بیڈ ڈالے گئے تھے۔۔۔ایک دیوار سے جڑا تھا اور دوسرا اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر برابر میں تھا۔۔۔چونا پھری دیواریں اور ان پر لگے قرآنی قطعات اور نقلی آرائشی پھول جو زوہا بناتی تھی ،جب وہ صحتمند تھی۔۔۔ہاجرہ نے اس کے ہاتھوں کی بنی ہر چیز کو کہیں نا کہیں سجا رکھا تھا۔۔۔صاف ستھرا سیمنٹ کے پلستر والا فرش اور اس کے درمیان میں چھوٹا سا پرانا لیکن صاف رگ بچھا تھا۔۔۔کمرے میں اتنی لطیف سی خنکی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی زمن کو سرور سا آگیا۔۔۔جی کیا یہیں ڈھیر ہو جائے اور سارے دن کی تھکن اتار لے لیکن وہ چہرے پر خوبصورت مسکان سجاتی زوہا کے بستر کی جانب بڑھی جو چت لیٹی چھت کو بے تاثر نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔۔۔چار ماہ دس دن ہو چکے تھے اسے یوں دنیا سے کٹ کر بستر سے لگے۔۔۔اور اب وہ اس قدر ناامید ہو چکی تھی کہ روتی تک نا تھی۔۔۔وہ جیسے اس زندگی کی عادی ہو چکی تھی ورنہ شروع میں جب اس کے ساتھ وہ حادثہ ہوا تھا تو وہ ہر وقت ہسٹیرک ہو کر چلاتی رہتی تھی۔۔۔آنکھوں سے جیسے سیل رواں جاری رہتا۔۔۔وہ کسی طرح نہیں بہلتی تھی۔۔۔ہل وہ سکتی نہیں تھی سو چلا چلا کر اپنی گھٹن اور دکھ کا اظہار کرتی۔۔۔خود کو بد دعائیں دیتی۔۔۔کبھی زیادہ زود رنج ہوتی تو زمن اور ہاجرہ کو بھی برا بھلا کہہ جاتی۔۔۔وہ دونوں اس کی حالت کے پیش نظر اس سے مزید نرمی سے پیش آتی تھیں۔۔۔اس حادثے کے اثرات ان تینوں کی زندگیوں میں جیسے ثبت ہو گئے تھے۔۔۔لیکن گزشتہ کئی دن سے زوہا نے خاموشی اوڑھ لی تھی۔۔۔وہ جیسے ہار گئی تھی اور زمن کو یہی بات پریشان کرتی تھی۔۔۔ڈاکٹرز کو دکھا دکھا کر وہ تھک گئے تھے۔۔۔زیادہ تر نے مایوسی کا اظہار کیا تھا۔۔۔اور جو علاج کر سکتے تھے وہ رقم مانگتے تھے۔۔۔یہاں آ کر زمن بے بس ہو جاتی تھی۔۔۔وہ دن رات کولہو کا بیل بن جاتی تب بھی دس لاکھ روپے جمع نہی کر سکتی تھی۔۔۔اور یہ تو ابھی فیس تھی۔۔۔اس کے علاوہ جو اخراجات ہوتے وہ

الگ تھے۔۔۔وہ لوگ اب مایوس ہونے لگے تھے تبھی آنٹی رباب نے نئے سرے سے ان میں امید جگا دی تھی۔۔۔بس اب زوہا کو اس ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔۔۔!

زمن چلتی ہوئی سیدھی زوہا کے پاس آئی اور نرمی سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔۔۔گوری رنگت اور کھڑے نقوش والی زوہا حسب معمول چہرہ موڑ کر دیوار کو تکنے لگی۔۔۔زمن نے پیار سے اس کی پیشانی پر پھیلے بال سمیٹے تو زوہا کے چہرے کے زاویے کچھ نرم ہوئے۔۔۔اس کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔وہ زمن کی جانب دیکھنے لگی۔۔۔یوں لگتا تھا کسی بھی وقت رو دے گی۔۔۔زمن نے فوراً سے پیشتر اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔۔۔

"شش۔۔۔خبردار۔۔۔رونا نہیں۔۔۔دیکھو اللہ نے سبب بنا دیا ہے نا۔۔۔ان شاء اللہ رستے آسان ہو جائیں گے۔۔۔منزل پر پہنچ جائیں گے۔۔۔تم ٹینشن مت لو۔۔۔تمہاری آپی پہلی والی زوہا کو بہت مس کرتی ہے۔۔۔اور تم جلد وہی والی زوہا بن جاؤ گی۔۔۔ہماری چڑیا۔۔۔ہماری بلبل۔۔۔چہکتی مینا۔۔۔گاتی کوئل۔۔۔!"

"اور بھی کوئی پرندہ رہ گیا ہے تو وہ نام بھی دے لیں مجھے۔۔۔!" زوہا کھل کر مسکراتے ہوئے بولی تو زمن کی آنکھوں میں خوشی نمی بن کر تیر گئی۔۔۔کتنے دن بعد وہ آج یوں بات کر رہی تھی۔۔۔اس نے زوہا کا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔۔۔زوہا اس سے سکول کا پوچھنے لگی تو وہ بخوشی اسے ہر چھوٹی چھوٹی بات بتانے لگی۔۔۔جب تک ہاجرہ کھانا لے کر آ نہیں گئیں تب تک وہ دونوں مسلسل باتیں کرتی رہی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

مہریار نے مصروف انداز میں اپنے موبائل کی اسکرین کو ایک نظر دیکھا اور بالوں میں آخری بار برش پھیرتا کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا۔۔۔ایک اچٹتی نگاہ سارے کمرے میں ڈال کر ہر شے کے سلیقے سے جگہ پر ہونے کی یقین دہانی کرتا باہر نکل آیا اور کچن کا رخ کیا۔۔۔جہاں سے آنے والے بے تحاشا شور نے اس کے ماتھے پر تیوریاں ڈال دی تھیں۔۔۔فضلو ناشتا بنا رہا تھا اور چاروں کی پسند ایک دم جدا گانہ۔۔۔وہ وہیں رک کر ان کی بکواسیات سننے لگا۔۔۔شہریار کی آواز آئی۔۔۔

"فجلو۔۔۔میرے دو فرائی آنڈے بنا کا کا۔۔۔یہ گول گول۔۔۔جیسے چودھویں کے چاند کے عین وسط میں سورج پھسکڑا مار کر بیٹھ جائے۔۔۔اور پراٹھا پر اتنے بل ہوں جتنے مہر لالہ کے ماتھے پر پڑتے ہیں۔۔۔ہر بل سے میرے پیٹ میں بل پڑے اور۔۔۔"

فضلو بات کاٹتے ہوئے۔۔۔

"اگر پیٹ میں بل پڑے تو ادھر بیٹھ کر بل دار پراٹھا نہی کھا سکتے آپ صاب۔۔۔ہاں پھکی کھائیں گے اور میرا نام فجلو نہی ہے صاب۔۔۔ایک دم فضول لگتا ہے۔۔۔"

"زیادہ چپڑ چپڑ نا کرو اور پراٹھا چوپڑو۔۔۔دیر ہو رہی ہے۔۔۔" شہریار نے گھور کر کہا اور جماہی لینے لگا۔۔۔

داور اور یاور ایک ساتھ آرڈر لکھوانے لگے۔۔۔

"ہمیں تو فرنچ ٹوسٹ بنا دو۔۔۔ساتھ بنانا سمودی۔۔۔"

فضلو بے چارگی سے بازو ڈھیلے چھوڑتا سیدھا کھڑا ہو گیا۔۔۔موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زارون نے عینک درست کرتے ہوئے فرمائش کی۔۔۔

"مجھے زیادہ ہیوی نہ دینا فضلو۔۔۔بس ایک کریپس بنا دو اور اسٹابری ملک شیک۔۔۔ہلکا پھلکا سا۔۔۔بس۔۔۔"

نانی پیاری نے ان چاروں کو عینک کے اوپر سے بغور دیکھا اور فضلو کی غیر ہوتی حالت پر ترس کھاتے ہوئے بولیں۔۔۔

"او فضلو پتر تو رونا۔۔۔گل سن میری کیتلی بھر کر چائے کی چڑھا اور یہ ریک کھول، رسوں کا شاپر پڑا ہے وہ نکال اور یہ جو" دادے کا ہوٹل "سمجھ کرون سوئنے ناشتے بتا رہے ہیں نا ان کے آگے چائے کے مگ رکھ، اس میں یہ رس ڈبو کر کھائیں اور دفع ہوں کالج یونیورسٹی کو۔۔۔" نانی پیاری نے سارے مینیو پر ہل چلا دیا تھا۔۔۔

"شکلیں دیکھ ان کی اور فرمائشیں دیکھ۔۔۔ایسے ہی چاچڑھے ہوتے ہیں نا ولایتی ناشتوں کے

تو اٹھا مرا کرو فجر کے وقت۔۔۔ پندرہ منٹ تک ویسے ہی جانے کا وقت ہو جانا ہے تم لوگوں کے اور یہ ناشتے کرے گا کون۔۔۔ تمہاری نانی۔۔۔؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں نانی پیاری۔۔۔" مہریار اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔۔۔ سب کے سب الرٹ پوزیشن میں آگئے۔۔۔ زارون کی عینک جو ناک کی نوک پر ٹکی تھی، مہریار کی آواز سن کر جھٹکے سے نیچے جا گری۔۔۔ سب نے ایک ساتھ بھائی کو سلام جھاڑا۔۔۔ داور نے فضلو سے کہا۔۔۔

"وہ اپنا فجلو بھیا۔۔۔ میرا مطلب ہے فضلو بھیا ہم دونوں کو تو صرف دودھ دے دو ہم اسی پر راضی ہیں۔۔۔ آج ماں یہاں ہوتی تو کس کی مجال تھی خالی پیٹ کالج جاتے۔۔۔"

مہریار نے ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور ہونٹ بھینچے۔۔۔ یاور نے مہریار کی جانب دیکھتے ہوئے بقیہ جذباتی مکالمہ پورا کیا۔۔۔

"نہی نہی لالہ۔۔۔ آپ شرمندہ نا ہوں۔۔۔ آپ جتنا کر سکتے تھے آپ نے کیا۔۔۔ کیا ہوا جو امی نا بن سکے۔۔۔ باقی تو مفت کی نانی بننے میں آپ نے کون سا کسر اٹھا رکھی۔۔۔ فکر مت کریں۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" کھڑے ہو کر جیب ٹٹولی۔۔۔" میرے پاس پچاس ساٹھ روپے ہیں، میں کینٹین سے کھالوں گا کچھ۔۔۔"

یاور احتیاط سے جیب ٹٹول رہا تھا کہ پچاس کا نوٹ ہی نکلے مگر ہزار کا بے شرمی سے فرش پر جا گرا۔۔۔

"نوٹ اٹھالو ورنہ واقعی یہ لے کر پچاس کا دے دوں گا۔۔۔!" مہریار نے دونوں ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھ کر کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے کہا۔۔۔ یاور نے کھسیا کر جھکتے ہوئے داور کو آنکھ ماری۔۔۔ اس نے فوراً مہریار سے مدعا بیان کیا۔۔۔

"وہ لالہ۔۔۔ آج کالج کے بعد کمبائین اسٹڈی کا پروگرام ہے اگر آج ہم بائیک پر چلے جائیں تو۔۔۔ وہ ہم دونوں کو آسانی ہو جائے گی۔۔۔"

"خبردار۔۔۔ بائیک تو میں لے کر جا رہا ہوں۔۔۔!" شہریار نے آنکھیں دکھائیں۔۔۔

"تم اور زارون میرے ساتھ چلے چلو۔۔۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔۔۔ لے کے جانے دو بائیک ان دونوں کو۔۔۔!" مہریار نے لاپرواہی سے کہہ کر گلاس میں پانی انڈیلا۔۔۔ شہریار نے کھا جانے

والی نظروں سے چھوٹے بھائیوں کو دیکھا۔۔۔دونوں فوراً دودھ کے گلاس چڑھا کے اللہ حافظ کہتے وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔۔۔شیک پیتے زارون کو شہریار نے گھورا لیکن وہاں راوی چین لکھ رہا تھا۔۔۔شہریار بے بسی سے مہریار کو دیکھ رہا تھا جو فضلو سے چیز آملیٹ کی فرمائش کرنے کے بعد اخبار کھول کر دیکھ رہا تھا۔۔۔فضلو جو محض چائے کی کیتلی چڑھا کر ہی خوش ہو رہا تھا دوبارہ سے منہ بناتا چولہے میں سر دے کر بڑبڑانے لگا۔۔۔!

☆......☆......☆

شہر کے نواحی گاؤں میں پرانی طرز پر بنی حویلی کی چھب آج بھی نرالی تھی۔۔۔سرخ اینٹوں سے بنی چار کنال پر پھیلی اس حویلی کو اردگرد سے درختوں کے جھنڈ نے گھیر رکھا تھا۔۔۔سکھ چین، نیم، پیپتے، بکائین، بیر کے درخت ایک ترتیب سے لگے حویلی کو چاروں اور سے گھیرے ہوئے تھے۔۔۔اسی طرح حویلی کے اندر بنے بڑے سے باغ میں بھی ہر نوع کا پودا اور پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔۔۔دیواریں الگ بیلوں سے ڈھکی تھیں۔سبزے کی اتنی کثرت کی وجہ سے اس حویلی کو ہری حویلی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔۔۔بڑے سے آہنی گیٹ کو ہر گھڑی کھلا رکھا جاتا تھا۔۔۔وہاں سے اندر داخل ہوتے ہی طویل صحن تھا جس کے وسط میں موٹے موٹے پایوں والی تین سے چار بڑی بڑی چارپائیوں ہمہ وقت بچھی رہتی تھیں۔۔۔موتیے رنگ کی چادریں اور ہم رنگ غلاف چڑھے گاؤ تکیے رکھے رہتے تھے۔۔۔ہر چارپائی کے قریب تپائی اور حقے تازہ کر کے رکھے جاتے تھے۔۔۔کچھ دیر پہلے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا سو کچی مٹی کی سوندھی مہک اڑتی پھر رہی تھی۔۔۔یہ سب اہتمام روزانہ کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔۔۔گاؤں کے معززین تمام دن آتے جاتے رہتے اور محفلیں جمی رہتیں۔۔۔یہیں بیٹھ کر تمام مسئلے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کر لیا جاتا اور پھر ضروری احکامات نافذ کر کے عملدرآمد کیا جاتا۔۔۔گاؤں کے کس گھر میں شادی ہے اور کس گھر کی بچی کا جہیز بنایا جانا ہے یہ امور بھی حویلی والوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔۔۔کوئی مکان تعمیر کروا رہا ہوتا تب بھی سب مل کر خاطر خواہ مالی امداد کرتے تھے۔۔۔دکھ سکھ سانجھے تھے اس گاؤں کے باسیوں کے۔۔۔!

یہ حویلی چوہدری شہاب الدین راؤ کی تھی۔۔۔جن کا کسی زمانے میں طوطی بولتا تھا۔۔۔اپنے گاؤں کے علاوہ ارد گرد کے علاقے میں بھی ان کی دھاک تھی۔۔۔ایس ایچ او سے لے کر ایم این اے تک ہاتھ باندھے حاضر ہوا کرتے۔۔۔وہ نہایت سخت گیر مشہور تھے لیکن اصول پرست اور زبان کے پکے شخص تھے۔۔۔پھر وقت پلٹا اور انہیں گردش دوراں نے بستر سے لگا ڈالا۔۔۔دل کے دورے سے جانبر ہوئے مگر فالج کے شدید حملے نے عضو معطل کی طرح خانگی اور بیرونی معاملات سے کاٹ کر رکھ دیا۔۔۔ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے چوہدری حیات راؤ نے سنبھال لی تھی۔۔۔وہ اب تمام سیاہ وسفید کے والی تھے۔۔۔ان کی بیوی کشور بی بی اچھی خصلت کی خاتون تھیں۔۔۔وہ ایک طویل مدت سے حویلی کے تمام اندرونی معاملات بخیر وخوبی نمٹاتی آرہی تھیں۔۔۔شوہر کا ساتھ دینے والی روایتی عورت تھیں اس لیے بحث تکرار کی عادی نہیں تھیں۔۔۔ساس کی زندگی میں ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور جب تک سسر صحت مند تھے ان کی جی حضوری ہی کی۔۔۔اس لیے بھی وہ پسندیدہ بہو رہیں۔۔۔چار بیٹے تھے۔۔۔مہریار راؤ ان کی پہلوٹی کی اولاد تھا۔۔۔اس کے آٹھ سال بعد اللہ نے شہریار کی صورت دکھائی تھی۔۔۔کشور بی بی کو بیٹی کی شدید خواہش تھی لیکن اللہ نے جڑواں بیٹوں داور اور یاور سے نواز دیا تو یہ خواہش خود بخود دب گئی۔۔۔مہریار کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔وہ پروفیشنل لائف گزارنا چاہتا تھا اور اب وہ اپنی فیلڈ کا جانا مانا نام تھا۔۔۔شہریار بھی بھائی کی دیکھا دیکھی پڑھائی کی غرض سے شہر گیا تھا اور اس کا ارادہ بھی وہیں نوکری کرنے کا تھا۔۔۔یاور اور داور کو بھی بہتر مستقبل کی خاطر پڑھنے کے لیے حیات راؤ نے شہر بھیج دیا تھا۔۔۔مہریار بھی ان کی تعلیم کو لے کر بہت سنجیدہ تھا اس لیے اسے بھی یہی بہتر لگا کہ چھوٹے بھائی اس کی دیکھ ریکھ میں رہیں۔۔۔حیات راؤ کی اکلوتی بہن نمرہ راؤ انگلینڈ میں سیٹل تھیں۔۔۔انہوں نے اپنے بیٹے زارون کو یہاں بھیج رکھا تھا۔۔۔ان کے خیال میں زارون میں خود اعتمادی کی شدید قلت تھی اور کچھ وہ فطرتاً سیدھا تھا۔۔۔یہاں کزنز کے بیچ رہے گا تو اس کی شخصیت میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی۔۔۔سو وہ بھی شہر میں مہریار کے پاس ہی تھا۔۔۔کئی سال پہلے نانی پیاری اکیلی رہ گئیں تو کشور بی بی انہیں حویلی لے آئیں۔۔۔وہ ان کی سگی خالہ تھیں۔۔۔نانی پیاری چھوٹے دونوں

بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔۔۔وہ اداس رہنے لگی تھیں اس لیے کشور بی بی نے انہیں بھی مہریار کے پاس بھیج دیا۔۔۔اس طرح وہ خود بھی کافی مطمئن ہو گئی تھیں ورنہ بیٹوں کے کھانے پینے کی الگ فکر ہلکان کیے رکھتی تھی۔۔۔اب پیچھے اتنی بڑی حویلی میں چوہدری حیات راؤ اپنی بیوی، بیمار والد اور ملازمین کی کھیپ کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔۔۔اس لیے بھی حویلی کے صحن میں رات عشاء تک لگنے والی رونقیں بڑی بھلی لگا کرتیں۔۔۔کبھی شہر سے چاروں بھائی آ جاتے تو درو دیوار جاگ اٹھتے۔۔۔کشور بی بی بیٹوں کی نظریں اتارا تار نا تھکتیں۔۔۔بیمار اور مفلوج دادا کے چہرے پر بھی زندگی کی رمق جاگ اٹھتی۔۔۔کشور کچھ عرصے سے مہریار کے مزاج کو نظر انداز کیے پیچھے پڑی تھیں کہ وہ بیاہ کرلے۔۔۔ان کی طبیعت ٹھیک نہی رہتی تھی۔۔۔وہ اپنی زندگی میں بیٹے کا گھر بسا دیکھنا چاہتی تھیں لیکن مہریار اس حوالے سے ایک لفظ سننے کا روادار نہی تھا۔۔۔سنتا بھی کیسے۔۔۔وہ ماضی کے گرداب سے کبھی نکل ہی نا پایا تھا۔۔۔اور شائد نکلنا چاہتا بھی نہی تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

لاؤنج میں گھمبیر خاموشی تھی۔۔۔حالانکہ چنڈال چوکڑی وہیں براجمان تھی۔۔۔شہریار صوفے پر نیم دراز تھا۔۔۔زارون سامنے متفکر بنا بیٹھا اپنی عینک کو ٹی شرٹ کے دامن سے صاف کر رہا تھا۔۔۔داور اور یاور صوفے پر نیم دراز ہونے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔۔۔ٹو سیٹر صوفہ تھا جس پر دونوں پھنسے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ لیٹنے کو بھی جگہ مل جائے۔۔۔ایک دوسرے پر ٹانگیں برسا برسا کر ادھ موئے ہو رہے تھے۔۔۔شہریار کو غصہ آ گیا۔۔۔

"ایک اس صوفے پر مر جائے نا اٹھ کے۔۔۔لازم ہے کہ ایک ہی نیام میں بند ہونا ہے تم دونوں نے۔۔۔"

"ہم جڑواں ہیں شہری۔۔۔ہمیں منظور نہیں کہ کسی بھی وقت الگ الگ ہوں۔۔۔بس جیسے بھی ہے گزار لیں گے ایسے ہی۔۔۔" یاور نے زوردار لات مار کر داور کو نیچے گراتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہا۔۔۔ہا۔۔۔" زارون عینک کے شیشوں پر منہ سے سانس چھوڑ کر صاف کرتے ہوئے بولا

"لیکن واش روم تو الگ الگ ہی جاتے ہو۔۔۔!" وہ فخریہ دور کی کوڑی لایا تھا۔۔۔شہریار نے داور اور یاور کے چہرے پر اس بات کو لے کر تفکر دیکھا تو چڑتے ہوئے زارون سے کہا۔۔۔

"ہاں تم گھسا لو انہیں وہاں بھی ایک ساتھ۔۔۔کبھی کوئی ڈھنگ کی بات نا کرنا۔۔۔ایک تو سوچ سوچ کر میری کنپٹی پھٹنے کو آگئی ہے اور یہاں تم تینوں بولیاں مارو۔۔۔!"

"رکو۔۔۔" زارون عینک ٹھیک کرتا اٹھا۔۔۔" میں سوئی دھاگہ لایا۔۔۔!"

شہریار نے دونوں ہاتھ استفسارانہ انداز میں اٹھا کر اسے دیکھا تو زارون معصومیت سے بولا۔۔۔

"تمہاری کنپٹی سینے کے لیے۔۔۔میں تھوڑا بہت سلائی کا ہنر جانتا ہوں۔۔۔!"

شہریار کو وہ سخت زہر لگا۔۔۔جھک کر اپنا جوتا اٹھاتے ہوئے بولا۔۔۔

"جوتی سے نا تیرا سر کھول دینا ہے میں نے۔۔۔اس کو لگتے رہنا تروپے۔۔۔پتا نہی پھپھو نے کب کا بدلہ لیا ہے تجھے یہاں بھیج کے۔۔۔تین پاگل سنبھالے نہی جاتے تھے چوتھا بھی بھیج دیا۔۔۔!"

"لالہ کو آلینے دو پکا بتاؤں گا کہ تم انہیں سنکی، بیوقوف، سائیکو، ایبنارمل اور پاگل سمجھتے ہو۔۔۔!" داور نے پاس سے القابات کا اضافہ کیا اور سر کھجاتے ہوئے یاور کی گود میں رکھا جسے اس نے نخوت سے واپس دھکیلا۔۔۔

"کبھی نہا بھی لیا کر۔۔۔عید کے عید شیمپو کرتا ہے تو۔۔۔اس بار گاؤں چل بچے، تیری گامے نائی کو کہہ کر روغنی ٹنڈ کروا دینی ہے۔۔۔!"

"اکیلا تو میں نہی کرواؤں گا۔۔۔ساتھ تمہاری بھی ہو گی۔۔۔پھر ہم دونوں ہی ہو برال لگیں گے۔۔۔!" داور نے بڑے لاڈ سے اپنے بالوں سے بھرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جیسے سچ میں ٹنڈ کا مزہ لے رہا ہو۔۔۔

"اچھا اگر تم لوگ کراؤ گے تو میری بھی کروا دینا۔۔۔میں بال رکھ کر کیا کروں گا۔۔۔!" زارون نے شوق سے اپنے بالوں کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔۔۔

شہریار تینوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میزبان، مہمان کے بدتمیز بچے کو بے بسی سے دیکھتا ہے۔۔۔اور پھر جھرجھری لیتا ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا۔۔۔

"تم لوگ اپنی بکواس بند کرو اور سوچو لالہ کی گاڑی کیسے چرائی جائے۔۔۔؟"

"کیا مطلب۔۔۔تم نے تو چابی کہا تھا۔۔۔اب گاڑی پر آ گئے۔۔۔یہ تو بہت غلط ہو جائے گا۔۔۔!" زارون مدبر سا ٹیک لگاتے ہوئے بولا تو وہ تینوں کورس میں اس کے لیے سلو موشن تالیاں بجانے لگے۔۔۔زارون کا سینہ چوڑا ہو گیا۔۔۔یاور نے دونوں ہاتھوں سے زارون کی بلائیں لیں اور شہریار کو مخاطب کیا۔۔۔

"رات کو لالہ جس وقت آتے ہیں۔۔۔ان کے کمرے میں صرف فجلو جاتا ہے۔۔۔اگر چار پیسے اسے لگائے جائیں تو وہ چابیاں کیا مہر لالہ کو بھی اٹھا لائے گا۔۔۔!"

"مہربانی۔۔۔!" شہریار نے ہاتھ جوڑے۔۔۔"ایسا مسکا فجلو کو نا مار دینا ورنہ وہ شوخا ہو کر مہر لالہ کو اٹھا بھی لائے گا۔۔۔کچھ اور سوچنا ہو گا چابی کے لیے۔۔۔زیادہ دیر ہو گئی تو آدھا مزہ بھی گیا۔۔۔حمزہ کہہ رہا تھا دس بجے تک سب اکٹھے ہو جائیں گے۔۔۔ایک بار میچ اسٹارٹ ہو گیا تو پھر کوئی آیا بھی تو بیل کی آواز اندر نہی آنی کیونکہ والیوم فل ہو گا۔۔۔اور حمزہ کی فیملی بھی گھر نہی۔۔۔اس لیے کچھ سوچو۔۔۔!"

باقی سب کے مارے شوق کے منہ آدھے کھلے تھے۔۔۔شہریار بالوں میں ہاتھ چلاتا پر سوچ نگاہیں سینٹرل ٹیبل پر جمائے بولا۔۔۔

"فجلو کو نا ہی ڈالو اس معاملے میں۔۔۔پلان یہ ہو گا کہ میں پھپھو کو ملاؤں گا کال، جیسے ہی مہر لالہ گھر آئیں گے۔۔۔پھپھو اپنی راگنی شروع کریں گی۔۔۔ساتھ نانی پیاری بھی ہاتھ بٹائیں گی۔۔۔اس دوران فجلو، مہر لالہ کا بیگ، چابیاں اور موبائل رکھ کر آئے گا کمرے میں۔۔۔بس۔۔۔بس اسی وقت۔۔۔" وہ زوردار تالی مار کر سیدھا ہوا تو باقی تینوں انہماک سے سنتے یکدم سہمے۔۔۔شہریار اصل بات چھوڑ کر ان کی سہمنے کی ایکٹنگ بغور دیکھتا ہوا بولا۔۔۔

"نہی مثلاً۔۔۔میں نے پینٹوں میں پٹاخے چھوڑ دیے یا تمہارے موبائلز مہر لالہ کے حوالے کرنے کی بات کر دی جو اتنا اور رہے ہو تینوں۔۔۔اب جو کہا ہے سمجھو اور کرو۔۔۔لالہ کے آتے ہی میں انہیں پھپھو کے حوالے کروں گا مطلب ان کی کال کے اور تم دونوں میں سے ایک جا کر چابی لے

آئے۔۔۔!" اس نے یاور اور داور کو کہا تو زارون ہونق سا پوچھنے لگا۔۔۔

"اور میں مہر لالہ کے آنے سے پہلے ہی باہر پورچ میں نا چلا جاؤں، وقت بچے گا۔۔۔!"

"ہاں تم نے تو چولستان سے آنا ہے نا جو وقت بچانا ہے۔۔۔بے وقوف۔۔۔پہلے سے موجود رہ کر مہر لالہ کو شک ڈالنا ہے کیا۔۔۔ہم سب مہر لالہ کے کمرے میں جانے کے بعد نکلیں گے۔۔۔بلکہ سونے کے بعد۔۔۔!"

"اور آج اگر وہ ساری رات نا سوئے تو۔۔۔؟" داور دور کی کوڑی لایا۔۔۔

"تو میں انہیں جا کر کہہ آؤں گا کہ سو جائیں۔۔۔صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا اتنی دیر جاگنا۔۔۔!" زارون نے سنجیدگی سے ارشاد فرمایا تو ان تینوں بھائیوں نے ایک بار پھر سلوموشن میں تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کیا۔۔۔

"تم یہ بھی بتا آنا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں اور واپسی کب ہوگی۔۔۔ٹھیک۔۔۔؟ تا کہ تمہارے اندر کسی قسم کا ملال نا رہے۔۔۔او کے۔۔۔؟" شہریار لاپرواہی سے کہتا کچن کی جانب چلا گیا یہ دیکھے بغیر کہ ہینڈ زفری کانوں میں لگاتے زارون کے تاثرات کتنے تابعدارانہ تھے۔۔۔!

☆......☆......☆

حویلی کے وسیع و عریض اور بہترین آراستہ و پیراستہ کمرے جہازی سائز روایتی طرز کے پلنگ پر چوہدری شہاب الدین راؤ لیٹے ہوئے تھے۔۔۔وہ ایک بارعب اور دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔۔۔لاچاری کے عالم میں بھی ان کے چہرے کے تنے نقوش مقابل کا دل جکڑ لیتے تھے۔۔۔وہ مکمل نہیں بول نہیں سکتے تھے لیکن توڑ توڑ کر لفظ ادا کر لیتے تھے۔۔۔ان کی آواز میں اب بھی محسوس کی جانے والی گرج تھی۔۔۔ان کا آدھا دھڑ مفلوج تھا اور وہ وہیل چیئر کے سہارے باہر لائے جاتے تھے لیکن زیادہ وقت وہ کمرے میں رہنا پسند کرتے تھے۔۔۔ایک وقت تھا جب ان کی ایک پکار پر حویلی کا بڑے سے لے کر چھوٹا فرد بھی ہاتھ باندھے آ کھڑا ہوتا تھا اور وہ اس کیفیت سے حظ اٹھایا کرتے مگر اب انہیں لگتا جیسے لوگ مارے باندھے ان کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان کا سرخ و سفید چہرہ تمتمانے لگتا۔۔۔

وہ پل بھر میں یا خود سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا چاہتے یا پھر سب کو ایک پھونک سے ہوا میں اڑا دینا چاہتے۔۔۔حالانکہ ایسا محض انہیں محسوس ہوتا تھا لیکن عرصہ دراز سے وہ جو سوچتے تھے اسی کو سچ مانتے تھے۔۔۔ان کی خدمت میں کل وقتی دو ملازم رہا کرتے جوان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا کرتے اس کے باوجود حیات راؤ اور کشور ہر تھوڑی دیر بعد کمرے کا چکر لگاتے رہتے تاکہ چوہدری شہاب خود کو تنہا محسوس نا کریں۔۔۔ابھی بھی ان کے سامنے ساگوان کی لکڑی سے بنے کاؤچ پر حیات راؤ اور کشور بیٹھے تھے اور ان کی بات کرنے کے منتظر تھے۔۔۔پرانا ملازم شریف کچھ دیر پہلے ان کی مالش سے فراغت کے بعد اب ان کی گردن اور سینے کے گرد صاف کپڑا پھیلائے پوری احتیاط سے ان کی داڑھی کا خط بنا رہا تھا۔۔۔اس کام کے کرنے کے بعد اس نے سامان سمیٹا اور باہر نکل گیا۔۔۔حیات راؤ نے سکون کا سانس لیا، انہیں دیر ہو رہی تھی مگر وہ پورے صبر سے بیٹھے تھے۔۔۔باپ کے مزاج کو جانتے تھے، مقابل کا ضبط آخری حد تک آزماتے تھے۔۔۔ہر وقت امتحان میں ڈالے رکھنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔۔۔کوئی بعید نہیں تھا کہ اتنی دیر بٹھائے رکھنے کے بعد چوہدری شہاب کہہ دیتے کہ" جاؤ، کوئی کام نہیں۔۔۔" اور ایسا ہوتا تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔۔۔حیات راؤ اٹھے اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر باپ کو سہارے سے پلانے لگے۔۔۔تھوڑا پی کر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔۔۔اب حیات راؤ قریبی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔۔۔وہ اور کشور پوری طرح ہمہ تن گوش تھے۔۔۔چوہدری شہاب نے بیٹے اور بہو کو اچھے سے جانچا اور ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے منہ سے لفظ نکلنے لگے۔۔۔

"م۔۔۔میں۔۔۔م۔۔۔مہر۔۔۔یار۔۔۔کی۔۔۔شاادی ککلکر انا۔۔۔چاہ۔۔۔تا۔۔۔ہوں۔۔۔!"

"ہم بھی چاہتے ہیں ابا جی لیکن مہر نہیں مانتا۔۔۔!" حیات راؤ نے بنا لگی لپٹی کے صاف کہہ ڈالا۔۔۔کشور بی بی نے اپنی جگہ پہلو بدلا۔۔۔چوہدری شہاب کی رنگت تمتمائی۔۔۔وہ دوبارہ بولے

"م۔۔۔میں۔۔۔نے۔۔۔یہ۔۔۔ن۔۔۔نہیں۔۔۔پو۔۔۔چھا۔۔۔کہ۔۔۔مہر۔۔۔ک۔۔۔کیا۔۔۔چاہ۔۔۔تا۔۔۔ہے۔۔۔میں۔۔۔نے۔۔۔بتا۔۔۔یا۔۔۔ہے۔۔۔کہ۔۔۔میں۔۔۔ک۔۔۔کیا۔۔۔چاہ۔۔۔تا۔۔۔ہو۔۔۔ں۔۔۔!"

حیات راؤ نے ایک طویل سانس خارج کیا۔۔۔وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے باپ اور اولاد کے بیچ رسہ کشی شروع ہونے والی ہے اور رسے کا کردار انہی کو نبھانا تھا۔۔۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں اباجی۔۔۔کب تک مہر پرانی یادیں سینے سے لگائے بیٹھا رہے گا۔۔۔اور اب میں بھی تھک گئی ہوں چوہدری صاحب۔۔۔!" کشور کی دھیمی لیکن التجائیہ آواز پر حیات راؤ نے انہیں نگاہوں سے تنبیہہ کرتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔۔۔

"اباجی۔۔۔!" وہ باپ کی جانب متوجہ ہوئے۔۔۔"مہر بچہ نہی ہے۔۔۔وہ اب اپنی من مرضی والا ہے۔۔۔اسے منانا اتنا آسان نہی ہے۔۔۔اور پھر کچھ وقت گزر لینے دیں ہو سکتا ہے کہ وہ راضی ہو جائے۔۔۔دیر ہونے میں اللہ جانے کیا بہتری ہے۔۔۔ویسے بھی اس کی کون سا عمر نکل رہی ہے۔۔۔!"

"اس سال اگست میں تیس کا ہو جائے گا چوہدری جی۔۔۔!" کشور نے انہیں یاد دہانی کروائی۔۔۔ بس اس معاملے میں وہ شوہر کی ہمنوا نہی تھیں۔۔۔وہ چاہتی تھیں کہ حیات راؤ بیٹے کو راضی کریں۔۔۔لیکن حیات راؤ مہریار پر کسی قسم کی زبردستی نہی کرنا چاہتے تھے۔۔۔

"چ۔۔۔چوہد۔۔۔ری حا۔۔۔تم کو پیغا۔۔۔ام بھیجو کہ م۔م۔مجھ سے آ ککر ممِلے۔۔۔اس کی بیبیٹی اب ججوان ہے۔۔۔میں اس س۔س۔ سے مہر کے ررشتے کی ب۔ب۔بات کروں۔۔۔!"

چوہدری شہاب الدین نے درشت لہجے میں بات مکمل کی۔۔۔ان کے تیور دوٹوک تھے۔۔۔ حیات راؤ نے ایک طویل سانس خارج کی اور انہیں دیکھ کر تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔۔۔وہ باپ کا لحاظ اب بھی ویسے ہی کرتے تھے جیسے ان کی صحت مندی میں کیا کرتے تھے۔۔۔لیکن معاملہ ان کے بیٹے کا تھا جس نے ان سے وعدہ لے رکھا تھا اور حیات راؤ زبان کے پکے انسان تھے۔۔۔وہ لہجے میں نرمی بھر کے باپ سے مخاطب ہوئے۔۔۔

"اباجی۔۔۔فی الحال اس معاملے کو رہنے دیں۔۔۔اگر مہر دو تین ماہ بعد گاؤں کا چکر لگا لیتا ہے نا تو اس سے بھی باز آجاۓ گا۔۔۔وہ بچہ نہی جس کو زبردستی کھونٹے سے باندھ دیں۔۔۔نا میں اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے کر کچھ بھی کروا سکتا ہوں۔۔۔" اس بات پر چوہدری شہاب الدین

نے چبھتی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا تھا۔۔۔حیات راؤ نے بات جاری رکھی۔۔۔"وہ لاکھوں کمانے والا ایک خودمختار مرد ہے۔۔۔اسے کچھ وقت دیں۔۔۔مان جائے گا شادی کے لیے بھی۔۔۔شہری کو سیٹ ہو لینے دیں،اس کی جلد ہی کر دیں گے۔۔۔فکر نا کریں آپ لوگ۔۔۔!"

وہ باپ اور بیوی دونوں پہ نگاہ ڈالتے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔کشور تو ہر بار کی طرح خاموش ہو گئیں لیکن چوہدری شہاب کی رنگت تمتمانے لگی تھی۔۔۔حیات راؤ نے مصلحتاً نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"باہر صحن میں لوگ آئے بیٹھیں ہیں،میں ذرا انہیں دیکھ لوں۔۔۔پھر بات ہو گی۔۔۔!"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔۔۔کشور،سسر کا طیش ملاحظہ کر رہی تھیں۔۔۔ڈرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔۔۔

"اباجی آپ کے لیے سوپ بنواؤں۔۔۔یا دیسی مرغے کی یخنی بھی اچھی رہے گی۔۔۔کیا دل کر رہا ہے آپ کا۔۔۔!"

"ززز ہر للا دے مجھے۔۔۔دفع ہو جاؤ سب۔۔۔نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔کچھ نہیں چاہیئے مجھے۔۔۔جاؤ۔۔۔!"

اور کشور بی بی ایک لمحہ ضائع کیے بنا وہاں سے نکل آئیں۔۔۔آج بھی وہ ان سے اتنا ہی ڈرتی تھیں جتنا جوانی میں ڈرا کرتی تھیں۔۔۔کچھ لوگوں کی ہیبت ان کی حالت کی محتاج نہیں ہوتی۔۔۔شیر مردہ بھی ہو تو کہلاتا شیر ہی ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

نانی پیاری چپ گم سی ایک ہاتھ گال کے نیچے دبائے اور دوسرے میں چھڑی تھامے لاؤنج میں بیزاری سے آنکھیں موندے ہوئے بیٹھی تھیں۔۔۔ٹی وی پر کوئی ڈرامہ اونچی آواز میں چل رہا تھا۔۔۔داور کچن سے ہاتھ میں کوئلہ لے کر نکلا اور انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔۔۔

"نانی پیاری۔۔۔"اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی۔۔۔نانی ٹس سے مس نا ہوئیں نا کوئی ردعمل ظاہر ہوا۔۔۔داور گڑبڑا کے ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔۔۔دو پل گھورتا رہا اور پھر

جذباتی ہو کر دہائی دی۔۔۔

"نانی پیاری۔۔۔نانی پیاری بولتی کیوں نہیں۔۔۔نہیں نانی پیاری نہیں۔۔۔آپ ہمیں چھوڑ کرنا جائیں۔۔۔ابھی تو آپ کے کھانے کھیلنے کے دن تھے۔۔۔آپ کیسے اس بھری جوانی میں نکل لیں نانی پیاری۔۔۔آپ کو اللہ کا واسطہ نانی۔۔۔واپس آجائیں۔۔۔!"

داور نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔۔۔جواباً ایک زوردار چپیڑ اس کے منہ پر نانی کی جانب سے پڑی۔۔۔وہ گال پر ہاتھ رکھے ساکت سا انہیں دیکھنے لگا۔۔۔

"ایک تو پہلے ہی میری داڑھ میں شدید درد ہے۔۔۔بات کرنے کو تو دور منہ تک کھولنے کو جی نہی۔۔۔اوپر سے ہلا ہلا کے میرے جوڑ بھی سرکا دیے منحوس۔۔۔ہٹ جا پرے۔۔۔بات نا کر۔۔۔بہت درد ہے۔۔۔ہائے۔۔۔!" نانی پیاری نے واپس گال کے نیچے ہاتھ جمایا تو داور اپنے گال پہ ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

"تو کب سے آپ کو کہا ہے کہ چلیں ڈاکٹر کے پاس لیکن آپ کا ڈر ہی نہی جاتا۔۔۔"

"ہاں تو اس ڈاکٹر کا کیا ہے۔۔۔میری اچھی بھلی داڑھ نکال دے گا باہر۔۔۔!"

"اچھی بھلی نہی گلی سڑی نانی پیاری۔۔۔اچھی بھلی ہوتی تو ایسے بلبلا رہی ہوتیں آپ۔۔۔؟"

نانی نے بمشکل کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن اسی وقت مہریار اندر داخل ہوا۔۔۔سلام لیتا وہ ہاتھ میں تھاما بیگ، کچن سے برآمد ہوتے فضلو کو دیتا وہیں ان کے پاس آگیا۔۔۔دونوں کو یوں بیٹھا دیکھ کر اس نے پر تجسس نگاہوں سے داور کو گھورا اور ٹائی کی ناٹ کھول کر صوفے پر دھپ سے گرا۔۔۔

"کیا ہوا نانی۔۔۔خیریت۔۔۔لگتا ہے دانت کا درد پھر زوروں سے اٹھا ہے۔۔۔!"

"کون کون سا درد گنواؤں مہر۔۔۔کل کو تمہارے ماں باپ کو منہ دکھانا ہے اور یہاں میں ابھی تک تمہیں شادی کے لیے راضی نا کر سکی۔۔۔آج بہو آچکی ہوتی تو میری بھی سیوا کرتی۔۔۔میں یوں بے حال نا پڑی ہوتی۔۔۔!" نانی پیاری نے جبڑا دبا کر شکوہ کر ڈالا۔۔۔داور بھی خوش ہوا۔۔۔یہ موضوع اس کا بھی پسندیدہ تھا۔۔۔مہریار سنجیدہ ہوتے ہوئے آگے کو ہو بیٹھا۔۔۔

"میری بیوی جب آنی ہو گی آجائے گی نانی۔۔۔فی الحال مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، وہی پوری کرنے دیں۔۔۔اور کل آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں شہری کے ساتھ۔۔۔بات ختم۔۔۔!"

وہ اٹھنے لگا تو نانی پیاری اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بولیں۔۔۔

"ہونہہ۔۔۔بات ختم۔۔۔بات ختم نہی ہو سکتی مہر۔۔۔کشور کا فون آئے تو اسی سے بات کروں گی اب۔۔۔مجھ سے نہی ہوتی اب پانچ پانچ مشٹنڈوں کی راکھی۔۔۔بس بہت ہوا۔۔۔!"

مشٹنڈا کہنے پر مہریار نے حیرت سے خود کو پھر نانی پیاری کو دیکھا۔۔۔اتنے میں دگڑ دگڑ سیڑھیاں اترتا شہریار موبائل فون ہاتھ میں لیے آیا اور سانس پھولنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔۔۔

"یہ فون ہے۔۔۔نمرہ پھپھو کا۔۔۔آپ سے بات کرنی ہے لالہ۔۔۔یہ لیں۔۔۔!"

مہریار کا موڈ نہی تھا اس لیے بدمزہ ہو گیا۔۔۔لیکن فون تھامنا پڑا۔۔۔نانی بھی تکلیف بھلائے پر شوق ہو کر سننے لگیں۔۔۔شہریار نے پلان بدل دیا تھا اس لیے داور کو اوپر جانے کا اشارہ کیا اور خود مہریار کی نظروں سے بچتا بچاتا اس کے کمرے میں چلا گیا جہاں کنسول پر اس کے بیگ کے ساتھ گاڑی کی چابی رکھی تھی۔۔۔وہ پھرتی سے چابی لیے دروازہ بند کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔اب انہیں بس گھر سے نکلنا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

نانی پیاری اور مہریار اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔۔۔گھر کی تقریباً آدھی لائٹس معمول کے مطابق بجھ چکی تھیں۔۔۔شہریار تیار ہو کر واش روم سے نکلا تو یاور، زارون کو کرسی پر بٹھائے اس کے چہرے پر کوئلے سے کالی لکیریں کھینچ رہا تھا اور داور اس کے سر پر کھڑا منہ سے آوازیں نکال رہا تھا۔۔۔

"ڈھنن ڈھنن۔۔۔ڈھنن ڈھنن ڈھنن۔۔۔ڈھنننننننا!!!!۔۔۔"

ان دونوں کی اپنی شکلوں پر بھی ایسی ہی لکیریں تھیں۔۔۔شہریار نے سر پیٹ لیا۔۔۔

"منہ کیوں کالے کر رہو ہو تم لوگ۔۔۔ہم حمزہ کے گھر جا رہے ہیں کسی مشن پر نہی۔۔۔!"

"میں نے بھی یہی کہا ان سے۔۔۔لیکن زبردستی کر دی میرے ساتھ۔۔۔!" زارون ہونٹ دبا کے منمنایا۔۔۔

" بکواس بند کر کے بیٹھو۔۔۔ پہلے ہی کوئلہ ختم ہو گیا لیکن تمہارا منہ ختم نہیں ہوا۔۔۔ اتنا وڈا منہ رکھا ہوا ہے تھوڑا بانٹ ہی دو۔۔۔ اور یہ ہم نے ایڈونچر کے طور پر کیا ہے۔۔۔ مزہ آ رہا ہے۔۔۔!" داور نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جانچتے ہوئے کہا۔۔۔ یاور نے زارون سے فراغت کے بعد اپنی شکل آئینے میں دیکھی اور وفورِ شوق سے بولا۔۔۔

" مجھے تو سچ میں ایسی فیلنگز آ رہی ہیں جیسے سرحد پر جا رہا ہوں۔۔۔ جی کر رہا ہے جان کی بازی لڑا دوں۔۔۔ یہ ہستی مٹا دوں۔۔۔!"

" بکواس بند کر لو اب اپنی۔۔۔ نکلو جلدی۔۔۔ ساڑھے نو ہو چکے ہیں۔۔۔ واپسی بھی کرنی ہے۔۔۔ لالہ کے کمرے میں چابی واپس کون رکھے گا یہ ہم آ کر ڈیسائیڈ کریں گے۔۔۔!"

وہ چاروں خاموشی سے کمرے سے نکلے اور دبے پاؤں نکل کر پورچ میں پہنچے۔۔۔ چوکیدار خان کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ان کے آتے ہی گیٹ کھول دے۔۔۔ شہریار ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور پسنجر سیٹ پر زارون۔۔۔ پیچھے داور اور یاور بیٹھ چکے تھے۔۔۔ سینے میں لمبا سانس بھر کے شہریار نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔۔۔ گھرررر کی آواز کے ساتھ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور اس نے سانس خارج کیا۔۔۔ ہیڈ لائٹس آن کر کے اس نے تسلی سے سی ڈی پلیئر میں سی ڈی گھسائی اور پلے کر دیا۔۔۔

" میں گاڑی باہر نکالنے لگا ہوں۔۔۔ تیار ہو نا سب۔۔۔؟" اس نے جوش سے باقی تینوں سے استفسار کیا جو اچانک سے بلکل چپ گم ہو گئے تھے۔۔۔ جواب نا ملا تو شہریار نے باری باری تینوں کے چہرے دیکھے۔۔۔ زارون کے تاثرات اس کے چہرے پہ بنی کالی لکیروں کے باعث دکھائی ہی نہیں دیے تھے۔۔۔ اس نے پلٹ کے داور اور یاور کو دیکھا جنہوں نے موٹی موٹی کھلی آنکھوں سے اپنی اپنی انگشت شہادت کو سامنے کے رخ کھڑا کر رکھا تھا۔۔۔

" یہ کیا ہے۔۔۔ اوور ایکٹنگ۔۔۔ زہر لگتی ہیں مجھے تم دونوں کی یہ حرکتیں۔۔۔ ایک تو رات، اوپر سے منہ تم لوگوں نے کالے کر رکھے ہیں۔۔۔ چپ ایسے ہو گئے ہو جیسے بھوت دیکھ مر لیا ہے۔۔۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔۔۔!"

سبھی جانتے تھے شہریار بھوت پریت سے خوف کھاتا تھا۔۔۔اندھیرے کمرے میں نہی بیٹھتا تھا۔۔۔ان تینوں کی پراسرار حرکتوں کی وجہ سے اس کی ہارٹ بیٹ تیز ہوگئ تھی۔۔۔

"سامنے دیکھ شہری۔۔۔ ہماری موت کھڑی ہے۔۔۔!" زارون نے سرسراتے لہجے میں کہا۔۔۔شہریار جو اسٹیئرنگ سے رخ پھیرے ان کی جانب مڑا ہوا تھا۔۔۔منہ میں بدبدایا۔۔۔

"جل تو جلال تو۔۔۔آئی بلا کو ٹال تو۔۔۔نکل آیا بھوت امی جی۔۔۔ یا اللہ بچالے۔۔۔آخری باری نکلا ہوں۔۔۔آئیندہ سے میری سات نسلوں کی توبہ۔۔۔بس اس بار بچالے۔۔۔!"

فق رنگت سے اس نے سیدھے ہو کر سامنے دیکھا تو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پلر سے کندھے کی ٹیک لگائے مہریار کھڑا تھا۔۔۔کالی شلوار قمیض میں اس کا شاندار وجود تیز روشنی کی وجہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔۔۔ ماتھے پہ پڑے بل اور چڑھی ہوئی ناک بتا رہی تھی کہ غصہ دماغ کو چڑھ چکا ہے۔۔۔وہ چاروں بت بنے سامنے دیکھ رہے تھے۔۔۔

"یہ کیا ہوگیا۔۔۔کیسے ہوگیا۔۔۔مہر لالہ کہاں سے آگ پڑے۔۔۔ یہ بندہ سوتا کیوں نہی۔۔۔ انسان ہے کہ گھڑی، بس ٹک ٹک کیے جاتا ہے۔۔۔سیل بھی نہی بدلتا یہ شخص۔۔۔!"

یاور فرنٹ سیٹ کے شولڈر پہ ٹھوڑی ٹکائے ایک سانس میں شہریار کے کان میں کہہ رہا تھا۔۔۔ آواز حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔۔۔

"بند کرلو بکواس۔۔۔ زلیل انسان۔۔۔!" شہریار کو غصہ آگیا۔۔۔"اب اترو باری باری۔۔۔دیکھ کیا رہے ہو۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ ہٹلر آ کر اتارے۔۔۔!"

"سمجھ نہی آتا ہٹلر جانی کو بتایا کس نے۔۔۔؟" داور نے ہونٹ بھینچ کر اور آنکھیں ذرا سی میچ کر کہا تو آگے بیٹھے زارون نے پہلو بدلا۔۔۔تینوں نے ایک ساتھ اس کی جانب دیکھا۔۔۔زارون کھسک کے دروازے کو جالگا۔۔۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ جا کر مہر لالہ کو بتا دینا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں اور واپسی کب ہوگی۔۔۔" وہ دونوں ہاتھ بچاؤ کے انداز میں سامنے کرتا ہوا تیزی سے بولا۔۔۔"لیکن میں نے تو انہیں یہ بھی کہا تھا کہ

آپ ذرا جلدی سو جائیے گا تا کہ ہم جلدی نکل سکیں۔۔۔اس بات پر تو انہوں نے عمل کیا نہی۔۔۔یہ پہلی والی کتنی جلدی مان گئے۔۔۔لو بتاؤ۔۔۔ہونہہ۔۔۔!" وہ سارا قصور مہریار کے کھاتے ڈال کر بری ہوتے ہوئے بولا۔۔۔

"اتر کے تو جو ہو گا سو ہو گا۔۔۔پہلے ذرا اس بھائی صاحب کے لیے سلوموشن تالیاں ہو جائیں۔۔۔!" شہریار نے دونوں ہاتھ تالی کے انداز میں ملاتے ہوئے کہا۔۔۔

"بہت شکریہ یارو۔۔۔میرا حوصلہ بڑھانے کا۔۔۔میں کبھی تم لوگوں کو مایوس نہی کروں گا۔۔۔تم لوگ قدر دان ہو!"

شہریار کی بات کو تمغے کی طرح وصولتے ہوئے زارون کے کالی لکیروں سے بھرے چہرے میں سے دانت نمایاں ہوئے۔۔۔ان تینوں نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا اور باہر نگاہ ڈالی جہاں مہریار لالہ سلوموشن میں ان کی جانب بڑھ رہے تھے۔۔۔تینوں ایک ساتھ نظر سے نظر ملا کر باہم بولے

"مارو۔۔۔اس کوڑے دان کو۔۔۔!"

جب تک مہریار ان کے سروں پر پہنچ نہی گیا، تینوں نے مل کر زارون کی آتما رول دی تھی۔۔۔زارون کے چہرے پہ کوئلے سے کھینچی لکیروں میں مکوں سے پڑے نیلوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

"چہار باغ" حویلی کا بڑا سا اونچی چھت والا ہال روایتی فرنیچر سے سجا تھا۔۔۔منقش چھت پر بہت بڑے مرکزی جھومر کے گرد سات چھوٹے جھومر جھومتے تھے۔۔۔ان سب کی روشنی نے ہال کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔۔۔چاروں کونوں میں ٹھنڈک کے لیے چلرز رکھے گئے تھے۔۔۔بھاری ویلوٹ کے سرمئی اور سنہرے پردے چھت کو چھوتی کھڑکیوں پہ گرے ہوئے تھے۔۔۔دائیں دیوار کے ساتھ دیوان سجا تھا جو حویلی کے سربراہ کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ تھی۔۔۔تین طرح کے جہازی سائز صوفہ سیٹ تین مختلف کونوں پر سیٹ تھے اور سب کے سامنے خوبصورت شیشے کے بھاری لکڑی کے سینٹرل ٹیبل رکھے گئے تھے۔۔۔فرش لکڑی کا تھا لیکن ہر سینٹرل ٹیبل کے نیچے قیمتی اور دبیز قالین بچھے تھے۔۔۔قیمتی کرسٹل

کے ڈیکوریشن پیسز اور نفیس گلدانوں میں سجے خوبصورت مصنوعی پھول اور پودے نگاہوں کو بے حد بھلے لگ رہے تھے۔۔۔سارا کمرا اپنے مکینوں کی خوش ذوقی اور دکھاوے کا مظہر تھا۔۔۔اس بہترین آراستہ ہال کمرے میں چوہدری قاسم راؤ شدید طیش کے عالم میں چکر کاٹ رہے تھے۔۔۔قریب ہی دیوان پہ سنہری بیگم ٹانگیں پسارے چھالیہ کلے میں دبائے، پاندان کو ٹٹول رہی تھیں۔۔۔دزدیدہ نگاہوں سے شوہر کے تنے عضلات والے چہرے کو دیکھتیں اور جی ہی جی میں بلا ٹلنے کی دعائیں کر رہی تھیں۔۔۔ چوہدری قاسم ایک جھٹکے سے رکے اور ان کی جانب انگلی تانتے ہوئے بولے۔۔۔

”دیکھ لیا نتیجہ۔۔۔اپنی نکمی اولاد کی طرفداریاں کرنے کا۔۔۔زلیل کروا کے رکھ دیا آج اس نے باپ کو۔۔۔پورے چار۔۔۔“ انہوں نے ہاتھ کی چار انگلیاں سنہری بیگم کو دکھائیں” چار پنڈ تھے جن کے وڈے وڈیرے اکھٹے ہوئے تھے آج۔۔۔سب کے سب مجھ سے سوال کر رہے تھے۔۔۔مجھ سے۔۔۔ چوہدری قاسم راؤ سے جس سے آنکھ ملانے کی ہمت کبھی کسی کو نا ہوئی۔۔۔میں پوچھتا ہوں ضرورت کیا ہے اس خبیث کو پنگے لینے کی۔۔۔کبھی کسی کا پانی کاٹ دیتا ہے تو کبھی کسی کی کھڑی فصل میں ڈنگر چھوڑ دیتا ہے۔۔۔کب تک لحاظ کرے گا کوئی۔۔۔وہ زمانے لد گئے جب گردنیں جھکی اور نگاہیں نیچی رہا کرتی تھیں۔۔۔اب تو ان چھوٹے چھوٹے چوہدریوں کی گردنوں میں بھی سریا آچکا ہے۔۔۔“

سنہری بیگم نے تسلی سے سب سنا اور پاندان میں سے چھالیہ کی چٹکی بھر کے منہ میں دبائی اور کھٹ سے ڈھکن بند کر کے بولیں۔۔۔

”سریا آئے گردنوں میں بھلے گردنیں آسمانوں کو جا لگیں۔۔۔حیثیت اور مرتبہ آپ جیسا تو نہی ہو سکتا نا چوہدری جی۔۔۔اگلے پانچ پنڈوں کے آپ والی مختار ہیں۔۔۔زمینیں آپ کی کوئی صبح چلنا شروع کرے تو شام ڈھلے تک ختم نہیں ہوتیں۔۔۔یہ کل کے نکے نکے چوہدری آج آپ کے منہ آنے لگے۔۔۔دو دو مربعے زمینوں کے مالک کیا بن گئے ہلکے ہی ہو گئے۔۔۔واہ چوہدری جی واہ۔۔۔آپ دب کے کیسے اٹھ گئے۔۔۔!“

”بس بک بک کرا لو۔۔۔جاہل عورت۔۔۔دب کے نہی اٹھا۔۔۔مان کے اٹھا ہوں۔۔۔چار

چار مربعے والے اب وہ اباجی کے ویلوں والے نہی رہے۔۔۔اولادیں شہروں سے پڑھ کر آ گئی ہیں ان کی ادھر۔۔۔کسی کا پتر وکیل بن گیا ہے تو کسی کا ڈی سی لگ گیا ہے۔۔۔پھر بھی عزت کرتے ہیں تو اباجی کی وجہ سے ورنہ تیرے لاڈلے نے کسر نہی چھوڑی۔۔۔نقصان کیا ہے ان کی فصلوں کا۔۔۔شکایت تو کریں گے نا۔۔۔کس بات کا ترٹھ (غصہ) ہے تیرے پتر کو جو یوں اتارتا پھر رہا ہے۔۔۔باز کر لے سنہری اسے۔۔۔ورنہ میں نے اپنے طریقے سے سمجھایا تو نا تجھے اچھا لگے گا نا اسے۔۔۔ہونہہ زلیل کروا دیا بے حیا نے۔۔۔!"

"جیسے آپ کو تو پتا نہی چوہدری جی کہ کس بات کا ترٹھ چڑھا ہوا ہے اسے۔۔۔ڈھول ڈ کے دم لے گا وہ۔۔۔"

"جو ملنا ہوتا تو کھوتا ہی کیوں۔۔۔اپنا مطلب ہے شہزور کا بس۔۔۔میں تجھے آخری بار کہہ رہا ہوں سمجھا دے اسے۔۔۔ورنہ اگلی باری میں لحاظ نہی کروں گا۔۔۔!"

چوہدری قاسم کندھوں پہ ڈالی چادر کا پلو درست کرتے وہاں سے چلے گئے تو سنہری بیگم نے نخوت سے سر مارا اور پاندان گھسیٹ کے نزدیک کرنے کے بعد پاٹ دار آواز میں ملازمہ کو آوازیں دینے لگیں۔۔۔!

☆......☆......☆

سارے دن کے بعد شہزور راوٴ حویلی میں داخل ہوا تھا۔۔۔سنہری بیگم انتظار میں ابھی تک سوکھ رہی تھیں۔۔۔شوہر کے تیوروں سے اندر ہی اندر پریشان بھی تھیں اور بیٹے کے لیے بھی فکرمند تھیں۔۔۔شہزور اندر آ کر ہال کمرے سے ہوتا سیدھا اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا تو نیم اندھیرے میں ٹی وی کی ہلکی آتی آواز سن کر ٹھٹھک کر رک گیا۔۔۔ماں کو وہیں کاوٴچ پر نیم دراز نیند سے بے حال زبردستی جاگتا دیکھ کر کندھوں پہ ڈالی چادر کے دونوں پلو ایک ساتھ جھٹکتا، گردن اکڑاتا وہیں چلا آیا۔۔۔

"سلام اماں۔۔۔سوئی کیوں نہی ابھی تک۔۔۔یہ کوئی وقت ہے ٹی وی دیکھنے کا۔۔۔وہ بھی اکیلے۔۔۔!"

سنہری بیگم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئیں اور بیٹے کو دیکھ کر یک گونہ سکون سا اتر آیا۔۔۔

"کہاں تھا سارے دن کا تو۔۔۔فکر سے جان سلگ رہی تھی میری۔۔۔ایک تیرے باپ نے ستا رکھا ہے اور ایک تو نے۔۔۔کیوں اس عمر میں باپ کو زلیل کروا رہا ہے۔۔۔تیری وجہ سے کل کے کمی کمین

تیرے باپ کے منہ کو آ رہے ہیں۔۔۔کیوں خلق خدا کو ذلیل کرتا ہے شہزور پتر۔۔۔!"

شہزور نے استہزائیہ ماں کو سر سے پیر تک دیکھا اور ہنسا۔۔۔

"اے اماں۔۔۔یہ تجھے کب سے خلق خدا کی فکر ہوگئی۔۔۔پتا بھی ہے کہ خلق خدا میں کون کون آتا ہے۔۔۔یہ جو تیری حویلی میں ملازمائیں ہیں نا جو باندی بنا کر ڈال رکھی ہیں۔۔۔نا بیاہ ہونے دیتی ہے ان کا نا ماں باپ سے ملنے دیتی ہے۔۔۔وہ بھی رب کی مخلوق ہی ہیں۔۔۔ان کو آزاد کر پہلے پھر مجھے لامے دینا۔۔۔اور ہاں کاٹا ہے پانی میں نے ارشاد تیلی کا۔۔۔کہہ دینا اباجی سے۔۔۔اس نے ہمارے چار کامے ہتھیا لیے ہیں۔۔۔پتر پڑھ لکھ کے نوکری سے کیا لگ گیا سمجھتا ہے ہمارا سردار ہوگیا وہ۔۔۔مغرور رہے گا تو تیلی ہی نا۔۔۔اور تیلی کا تیل نکالنا ضروری ہوگیا تھا اماں۔۔۔اباجی کو فخر ہونا چاہیے مجھ پر کہ ان کا پتر بدلہ لینا جانتا ہے۔۔۔سر جھکانا نہیں۔۔۔ہونہہ۔۔۔ہمارا جوٹھا کھانے والے آج سروں پہ چڑھ آئے۔۔۔جا رہا ہوں سونے۔۔۔تڑکے نکلنا ہے میں نے۔۔۔!"

چوہدری شہزور چادر کا پلو جھٹکتا پلٹنے لگا تو سنہری بیگم نے فوراً آواز دی۔۔۔

"رک جا۔۔۔رک جا۔۔۔گل سنتا جا میری۔۔۔!"

ان کی آواز دھیمی ہوئی۔۔۔

"کچھ پتا چلا اس کا۔۔۔جس کے پیچھے کھچل ہوتا پھر رہا ہے۔۔۔؟"

"لگ جائے گا پتا اماں۔۔۔فکر نا کر۔۔۔" شہزور نے مونچھوں کو تاؤ دے کر ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا۔۔۔"اور جب پتا لگ گیا نا تو اسی دن حویلی لا پٹخوں گا۔۔۔ساری عمر زنجیروں سے باندھ کے ماروں گا۔۔۔دیکھ لینا۔۔۔!"

"او جا۔۔۔ایڈا اتّو۔۔۔بوتیاں بھڑکاں نا مارا کر۔۔۔میں تو کہتی ہوں چھوڑ کھیڑا (پیچھا)، ہورے کس گند میں ملے، کیا پتا۔۔۔!"

"گند میں ملے یا محل میں۔۔۔جو شے میری سو میری۔۔۔گل مک گئی اماں۔۔۔چلا ہوں سونے۔۔۔اب پیچھے سے آواز نا دینا۔۔۔اتکال (الجھن) آتی ہے مجھے۔۔۔!"

شہزور کہہ کر چلا گیا۔۔۔سنہری بیگم نے ہاتھ اور سر ایک ساتھ جھٹکا۔۔۔

"ہالا جا دفع ہو۔۔۔ماں سے تو بات کرتے پیڑی پڑ جاتی ہے۔۔۔کیا پیو تو کیا پتر۔۔۔ایک سی خصلت کے۔۔۔ہونہہ۔۔۔!"

سنہری بیگم بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور چادر درست کرتی کمرے کی جانب چل دی۔۔۔حویلی کی دیواروں نے سال ہا سال سے راز جذب کر رکھے تھے۔۔۔اس گفتگو کو بھی سینت کے کسی باریک درز میں سمو لیا۔۔۔!

☆......☆......☆

کمرے میں زوہا کے پاس ہاجرہ اور رباب خان بیٹھی تھیں۔۔۔دونوں مدھم آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔۔۔زوہا دوائی کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھی۔۔۔تبھی زمن بنا آواز دروازہ کھولے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔۔۔ چائے کے ساتھ گھر کے بنے سموسے اور پکوڑے بھی تھے۔۔۔اس نے ٹرے ہاجرہ اور رباب خان کے درمیان پڑی درمیانے سائز کی میز پر رکھ دی۔۔۔

"سچ پوچھو نا تو تمہارے ہاتھ کے پکوڑے سموسے ہی تو کھانے آتی ہوں میں زمن۔۔۔!"

رباب آنٹی نے بے تکلفی سے کہا تو زمن اور ہاجرہ مسکرا دیں۔۔۔

"آپ کو تو کہا ہے آنٹی کہ سموسے میں نے فریز کر رکھے ہوتے ہیں لے جایا کریں ساتھ۔۔۔لیکن آپ تکلف دکھاتی ہیں۔۔۔!" زمن نے خالی پلیٹ رباب آنٹی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔وہ پلیٹ تھام کر آگے کو جھکیں اور ایک ساتھ چند پکوڑے اور دو سموسے اس میں رکھتی ہوئی بولیں۔۔۔

"جی نہی۔۔۔جو مزہ بنوا کے کھانے میں ہے وہ خود بنا کے کھانے میں کہاں۔۔۔تمہیں اتنا نہی پتا لڑکی۔۔۔تمہاری آنٹی کو تو کچن کے کاموں سے جوانی سے بیزاری ہے۔۔۔اب اس عمر میں تو سوال ہی پیدا نہی ہوتا۔۔۔!"

ان کے جواب پر زمن ہونٹوں پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں رکھ کے آواز دباتی ہنس دی۔۔۔ہاجرہ نے بھی محبت سے سر ہلایا۔۔۔

"تمہارے انکل نے ساری عمر میرے ساتھ ایسے ہی گزارہ کیا اور اب تو انہیں بھی عادت سی ہو گئی ہے۔۔۔ کچن میں دیکھ لیں تو میرا ماتھا چھو کے دیکھتے ہیں کہ کہیں بخار دماغ کو تو نہیں چڑھ گیا۔۔۔ خانساماں کی سختی لے آتے ہیں کہ بی بی کو بیمار کرنا ہے کیا۔۔۔!"

وہ ایسی ہی تھیں۔۔۔ ہلکا پھلکا مزاج لیکن بلا کا حساس اور درد مند دل رکھنے والی۔۔۔ دو اولادیں تھیں۔۔۔ دونوں باہر سیٹل تھیں۔۔۔ اور ان کا ایک پیر ملک میں ہوتا تو دوسرا ملک سے باہر۔۔۔ یہاں دونوں میاں بیوی نوکروں کی فوج کے ساتھ مزے سے رہتے تھے۔۔۔ شوہر ڈاکٹر تھے لیکن اب پریکٹس چھوڑ چکے تھے۔۔۔ حلقہ احباب دونوں کا وسیع تھا اس لیے وقت مزے سے کٹ جاتا تھا۔۔۔ زوہا کے معاملے کو لے کر بھی وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ مدد کر رہی تھیں۔۔۔

"رباب۔۔۔! اب کس دن چلنا ہے زوہا کو لے کر۔۔۔ مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔۔۔ میری بچی ذہنی مریض بن چکی ہے۔۔۔ اب بس لے چلو ڈاکٹر کے پاس۔۔۔!"

ہاجرہ نے ہاتھ میں تھامے چائے کے مگ کو بھرائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے رباب آنٹی التجا کی۔۔۔ جواباً انہوں نے ایک نگاہ ہاجرہ کے عقب میں نظر آتے بیڈ پر لیٹی زوہا پر ڈالی اور پھر ان کے ہاتھ پہ نرمی سے اپنا ہاتھ دھرا۔۔۔

"بس پرسوں۔۔۔ میں نے اپوائنٹمنٹ لے رکھا ہے۔۔۔ فکر مت کرو۔۔۔ مجھے خود زوہا کی فکر ہے ہاجرہ۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش مجھے تم نے بروقت اطلاع دی ہوتی تو شاید زوہا کی حالت میں سدھار آچکا ہوتا۔۔۔ مجھے اس وقت کا افسوس نہیں جاتا۔۔۔ یقین مانو۔۔۔!"

رباب آنٹی کے افسردگی سے کہنے پہ ہاجرہ نے تکلیف سے آنکھیں میچ لیں۔۔۔ زمن نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے بازو کو تسلی آمیز انداز میں مسلا۔۔۔ اس وقت کی اذیت ان دونوں سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا جب زوہا کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ کوما میں چلی گئی تھی۔۔۔ رباب آنٹی اپنی بیٹی کی ڈلیوری کے سلسلے میں یو کے میں تھیں۔۔۔ زمن کے چاہنے کے باوجود ہاجرہ نے انہیں اطلاع دینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ رباب آنٹی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس آجائیں گی اور ہاجرہ ایسا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔ وہ

پورے دو سال بعد اپنی بیٹی سے ملی تھیں۔۔۔اس کو اس حالت میں چھوڑ کر آجاتیں تو ان کے دل سے ساری عمر اس بات کا قلق نا جاتا۔۔۔رباب آنٹی وہاں چار ماہ رہیں تھیں اور اس دوران ان کا فون آتا تو ہاجرہ سب اچھا ہے کہہ کر تسلی دے دیتیں۔۔۔جبکہ یہاں زوہا کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئ۔۔۔ رباب آنٹی کی واپسی تک وہ کومہ سے باہر تو آچکی تھی لیکن حرام مغز اور ریڑھ کی ہڈی میں لگنے والی شدید چوٹ کے باعث وہ کسی بھی طرح کی حرکت کرنے سے قاصر تھی۔۔۔ڈاکٹرز نے آپریشن کا کہا تھا جس کا خرچ لاکھوں میں تھا اور ہاجرہ اس معاملے میں بے بس تھیں۔۔۔ڈاکٹروں کے دھکے کھاتے کسی طرح چار ماہ گزرے تو رباب آنٹی کی واپسی ہوئی لیکن تب تک زوہا کی کنڈیشن طرح طرح کے ٹوٹکوں اور وقتی علاج معالجے کے باعث قابل رحم ہو چکی تھی۔۔۔رباب آنٹی کا کتنی دیر سکتہ ہی نا ٹوٹا تھا۔۔۔وہ یہ یقین کرنے سے قاصر تھیں کہ جس چہکتی مینا سی لڑکی کو وہ ہنستا کھیلتا چھوڑ کے گئ ہیں وہ اس حال میں انہیں ملے گی۔۔۔انہیں ہاجرہ اور زمن سے بے حد شکوہ تھا لیکن وہ دونوں اپنی جگہ حق بجانب تھیں۔۔۔تب سے رباب آنٹی نے کمر کس لی تھی زوہا کے علاج کے لیے۔۔۔انہیں دو ہفتے ہی ہوئے تھے واپس آئے اور اب وہ زوہا کو بہترین نیورو سرجن کو دکھانے والی تھیں۔۔۔ڈاکٹر ان کے شوہر کا سٹوڈنٹ رہ چکا تھا لہذا کسی قسم کا مسئلہ نہی تھا۔۔۔بس جو دیر ہو رہی تھی وہ محض اتفاقیہ تھی۔۔۔اور اتفاقات کی پرت تلے حادثے چھپے ہوتے ہیں۔۔۔جب یہ پرت کھلتی ہے تو کوئی حادثہ زندگی کا رخ موڑ کر رکھ دیتا ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

شہریار لیپ ٹاپ گود میں رکھے کام کر رہا تھا۔۔۔زارون ہاتھ میں مہریار کی پرسنل کلیکشن سے کوئی ناول نکال لایا تھا اور بڑا افلاسفر بنا بیٹھا تھا۔۔۔یاور سر صوفے کی پشت سے ٹکائے آنکھیں موندے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔۔۔داور ان سب کی شکلیں باری باری دیکھتا بور ہو رہا تھا۔۔۔اسے بد ہضمی ہوئی اور یکدم اونچی آواز میں سُر نکالا۔۔۔

"میرے دل کے تار بجیں بار بار۔۔۔ٹرنگ ٹرنگ۔۔۔" بے سری آواز میں گا کر آخر میں یاور کا نچلا ہونٹ کھینچ کر انگلی سے گٹار کے تار کی طرح دو بار "ٹرنگ ٹرنگ" کیا۔۔۔یاور بیچارہ تڑپ کے سیدھا ہوا۔۔۔

"پرے مر جا کر۔۔۔کھینچ دے اور کھینچ دے۔۔۔چوتھے محلے لے جا میرے ہونٹ۔۔۔بُلی کتا بنا دو مجھے۔۔۔!" یاور ہونٹ دونوں ہاتھوں میں دبائے بلکا۔۔۔

"کتے سے یاد آیا۔۔۔ایک کتا ہمارے پاس بھی ہونا چاہیے۔۔۔!" زارون نے کتاب سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے تدبر سے کہا۔۔۔

"لو۔۔۔زارون بابا کے لُچ تلنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔۔۔!" شہریار لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتا بولا۔۔۔"پہلے ہی پرسوں رات سے صرف تیری وجہ سے ہم سب کی کتوں والی ہی ہو رہی ہے۔۔۔کتا پال کے کیا کرے گا تو۔۔۔!"

"بس کر دو طعنے دینا۔۔۔" زارون نے جذباتی ہو کر کتاب بند کی اور اپنے چہرے پہ سجے نیلوں کو سہلایا۔۔۔

"مجھے تم نے خود کہا تھا کہ مہر لالہ کو سارا پلان بتا دوں۔۔۔نا بتاتا تب بھی شکوہ کرتے۔۔۔اب بتا دیا تب بھی جینا محال۔۔۔میں تو نیکی کیا ہی نا کروں۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ایسی تو نا ہی کیا کر پیارے۔۔۔" شہریار نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔۔۔"دوسرا دن ہے گھر بٹھا رکھا ہے انہوں نے کہ کالج یونی جا کر آوارگیاں اور دھوکہ بازیاں ہی سیکھ رہے ہو نا تو گھر بیٹھو اور آن لائن لیکچر لو۔۔۔دماغ بونتر گیا ہے میرا اس لیپ ٹاپ پہ لیکچر لے کر۔۔۔پلے بھی ککھ نہی پڑتا اور لگتا ہے سارا زمانہ جمائیاں لے رہا ہے۔۔۔!"

مہر یار نے ان چاروں کو گھر بند کر دیا تھا۔۔۔آدھی رات کو کی جانے والی آوارگی کے پیش نظر اس کا خیال تھا کہ یہی کچھ کرنا ہے تو گھر بیٹھو۔۔۔شہریار اس سزا پہ بے حد اکتایا ہوا تھا۔۔۔دو دن ہو گئے تھے ان چاروں کا باہر نکلنا بلکل بند ہوا پڑا تھا۔۔۔مہر یار نے چوکیدار اور فضلو کو سختی سے ان پہ نگاہ رکھنے کا کہا تھا اور وہ دونوں شیر کی نگاہیں رکھے بیٹھے تھے۔۔۔فضلو کی جھولی میں پکے پھل کی طرح موقع گرا تھا اور وہ پل پل سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔۔۔

"اوپر سے یہ فضلو۔۔۔میں تو حیران ہوں کہ یہ پہلے ضرور کہیں نا کہیں جاسوسی کرتا رہا ہے ورنہ ایگسیکٹ ٹائمنگز پر سر پہ ایویں نہی پہنچ جاتا بندہ۔۔۔جدھر جاؤ وہاں خوشبو۔۔۔نہی نہی بدبو کی طرح پہنچ جاتا

ہے۔۔۔!" شہریار آرام دہ حالت میں آتے اپنی ٹانگ سیدھی کر کے پیر کے انگوٹھے پہ غور کرتا بولا۔۔۔

"ہی ہی ہی۔۔۔تو بُرا کیوں مناتے ہو۔۔۔آنے دیا کرو جہاں بھی آتا ہے۔۔۔کل میرے پیچھے واشروم تک آگیا تھا۔۔۔بولا باہر کھڑا رہوں گا جب تک اندر ہو۔۔۔میں نے بھی جو کچھ اندر کیا وہ سب اسے باہر تک سنگھوایا۔۔۔دوبارہ مجھے تو نظر نہی آیا۔۔۔" یاور کو باقی تینوں نے متاثر ہو کر دیکھا اور اس بار سلو موشن تالی یاور کے لیے بجائی گئی تھی۔۔۔جسے اس نے سر کو دھیرے دھیرے کھجاتے اور مندی آنکھوں سے وصول کیا تھا۔۔۔

"بہتر ہے مہر لالہ سے معافی مانگ لیتے ہیں اور آئیندہ کے لیے غائبانہ توبہ کر لیتے ہیں۔۔۔!" داور نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ حتمی انداز میں کہا تو باقیوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔

"غائبانہ سے مراد میری وہی ہے جو ہوتی ہی نہی۔۔۔ہم نے کون سا باز آجانا ہے بس ابھی کے لیے تو خلاصی ہو جائے۔۔۔میں تو کالونی کی سڑکیں بھی بھولنے لگا ہوں۔۔۔!"

داور نے بے چارگی سے کہہ کر بھرپور انگڑائی لینے کے لیے بازو وا کیے جو بایاں والا یاور کے منہ پہ جا لگا۔۔۔یاور نے غصے میں داور پہ دونوں ٹانگیں چلا چلا کے اسے صوفے سے نیچے دھکیلنے کی جدو جہد شروع کی۔۔۔

"ایک ہی بار مار دے مجھے۔۔۔لے مار۔۔۔مار نا۔۔۔!" کہتے ہوئے یاور نے بلآخر داور کو صوفے سے نیچے گرا ہی دیا تھا اور اب پورے صوفے پہ پھیل کے لیٹ گیا تھا۔۔" ادھر نا آنے کی کوشش کرنا، جوتیوں سے سینک دوں گا تجھے۔۔۔پُھٹ لے اب۔۔۔!"

داور بے چاری سی شکل بنائے باقی دونوں کو دیکھنے لگا تو شہریار اور زارون نے جھٹ سے اپنے اپنے صوفوں کی خالی جگہ کو پُر کیا۔۔۔داور ہاتھ کے اشارے سے فٹے منہ کہتا وہیں کارپٹ پہ کہنی کے بل نیم دراز ہو گیا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے نگاہیں چھت پر گاڑ کر کراہا۔۔۔

"نا کوئی امنگ ہے نا کوئی ترنگ ہے۔۔۔لوگوں کی زندگی میں مُنی ہوتی ہے، شیلا ہوتی ہے ......ہماری زندگی میں تو کوئی پپیتا تک نہی۔۔۔بس لائف نیلا اور پیلا ہو کے رہ گئی ہے۔۔۔دو جھانپڑ مہر

لالہ سے پڑ جائیں تو منہ نیلا اور کچھ دن بعد وہ نیل پرانا ہو کے پیلا۔۔۔بس۔۔۔نا کوئی نچی گھاس ڈالتی ہے نا اماں ابا کو خیال آتا ہے کہ بگڑنے سے پہلے بیاہ کر دیں لڑکے کا۔۔۔آج میری شادی کروائیں تو دیکھو کیسی رونقیں لگاتا گھر میں۔۔۔سب کی بوریت دور ہو جائے گی، کسی کو گھر سے فرار کا منصوبہ بنانے کی نوبت ہی نہی آئے گی۔۔۔!"

"ناک پونچھنا تو سیکھ لے بیٹا پہلے۔۔۔اوقات ٹکے کی نہی اور خواب سہرے سجانے کے۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔کوئی مہر لالہ کو تمہارے خیالات بتائے نا تو چار پھول تمہاری پیشانی پہ دستی ٹانک دیں گے۔۔۔" شہریار نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے ہاتھ دکھایا۔۔۔داور نے ایک نظر اسے اچھی طرح دیکھا اور پھر شاہ رگ کھجاتا کچھ سوچنے لگا۔۔۔

"ایک آئیڈیا ہے ویسے میرے پاس۔۔۔" زارون نے عینک درست کی اور بھنویں اچکا کر باری باری سب کو گھورا۔۔۔

"نانی پیاری ہمیں گھر سے باہر لے کر جا سکتی ہیں اور سزا بھی ختم کروا دیں گی۔۔۔!"

"کیسے جی۔۔۔نانی پیاری رات کی داڑھ پکڑ کے بیٹھی ہیں۔۔۔گھر سے باہر جانے کا تو نام ہی نہی لیں گی۔۔۔لونگ رکھ رکھ کے منہ میں ہنڈیا تیار کر لینی ہے انہوں نے۔۔۔!" شہریار کی بات پہ تینوں کا قہقہہ ایک ساتھ لاؤنج میں گونجا تھا۔۔۔کچن کے دروازے سے فضلو نے سر نکال کر سب کو جانچتی نگاہوں سے گھورا اور واپس اندر گم ہو گیا۔۔۔

"ایک اس کی تھتنی غائب نہی ہوتی۔۔۔کسی دن اس فضلو کو میں نے چھان ٹکر والے کو بیچ آنا ہے۔۔۔!" شہریار غرایا۔۔۔

"بدلے میں میرے لیے ککھر پورا لے لینا۔۔۔وہ تو مل ہی جائے گا کم از کم۔۔۔!" یاور نے فورا فرمائش نوٹ کروائی۔۔۔

"اچھا اب خاموشی سے میری بات سن لو۔۔۔ورنہ مجھے بھول جائے گا کہ کیا کہنا تھا۔۔۔!"

زارون کو دماغ سے آئیڈیا حذف ہونے کا ڈر تھا۔۔۔وہ اکثر باتیں بھول جایا کرتا تھا۔۔۔باقی

تینوں ایک دم اٹھے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی جانب رخ کر کے مکمل انہماک سے قریب آ بیٹھے۔۔۔زارون کو ایسے عالم شوق کی توقع نہی تھی۔۔۔چند پل بعد اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔۔۔

"بھلا کیا کہہ رہا تھا میں۔۔۔!"

شہریار نے قریب پڑا کشن اٹھایا اور اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے اس پر پل پڑا۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن بہت تیزی سے پبلک لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔۔۔کان سے موبائل لگا رکھا تھا۔۔۔وہ ہاجرہ سے بات کر رہی تھی۔۔۔

"صرف آدھا گھنٹہ امی۔۔۔صرف آدھا گھنٹہ۔۔۔پرنسپل نے کتابیں لانے کو نا کہا ہوتا تو کبھی بھی نا آتی۔۔۔مجبوری تھی۔۔۔بس کاؤنٹر سے پک کرنی ہیں، میں لائبریرین کو بتا چکی ہوئی ہوں۔۔۔آپ چادر لے کر تیار رہیں، میں جس رکشے میں آؤں گی اسی میں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔۔۔نہی نہی۔۔۔پہلے آپ کو دکھانا لازمی ہے۔۔۔زوہا کو تو شام میں لے کر جانا ہے۔۔۔آپ کو کام ضرری ہے امی۔۔۔آ رہی ہوں۔۔۔بس۔۔۔!"

وہ آخری سیڑھی پر تھی اور آخری لفظ ٹھیک سے ادا بھی نا ہوا تھا کہ سامنے سے آتے، اپنے دھیان میں موبائل پہ بات کرتے مہریار سے جا ٹکرائی۔۔۔ٹکر اتنی زوردار تھی کہ دونوں کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کے گر گئے تھے۔۔۔مہریار نے بچاؤ کے انداز میں فوراً اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اونچے کیے اور پھر پنجوں کے بل فرش پہ بیٹھ گیا۔۔۔اس کے ایک ہاتھ میں لیپ ٹاپ بیگ تھا۔۔۔زمن پیشانی تھامے حواس درست کر رہی تھی۔۔۔

"اندھا، بدتمیز۔۔۔بے ہودہ۔۔۔" وہ پیشانی مسلتی بڑبڑائی۔۔۔مہریار کے کان کون سا کمزور تھے فوراً جواب دیا۔۔۔

"سبھی کچھ مجھے کہہ دیا محترمہ، تھوڑا خود کے لیے بھی بچا کر رکھتیں۔۔۔!"

"آپ دیکھ کر نہی اتر سکتے تھے۔۔۔ہوش کہاں تھے آپ کے۔۔۔؟" وہ غرائی۔۔۔

" آپ دیکھ کر چڑھ لیتیں۔۔۔ہوش تو پاس ہی لگتے ہیں آپ کے۔۔۔!" مہریار نے دوبدو جواب دیا۔۔۔زمن نے لاجواب ہوتے ہوئے اسے غصے سے مسلسل گھورتے جھک کر اپنا سیل اٹھایا اور اسی تند نگاہی سے دیکھتی بیگ میں ٹھونس کر آگے بڑھ گئی۔۔۔مہریار نے تنفر سے اس کی پشت کو دیکھا اور اپنا موبائل اٹھا کر سڑھیاں اترتا چلا گیا۔۔۔پارکنگ میں پہنچ کر اس نے جیب سے گاڑی کی چابی نکالی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پہ نمبر ڈائل کرنے کے لیے اسے اپنے سامنے کیا تو جھٹکا سا لگا۔۔۔یہ اس کا موبائل نہی تھا۔۔۔سلور باڈی اس کے سیل فون کی بھی تھی لیکن یہ والا بہت معمولی سا موبائل تھا۔۔۔اس نے چند ثانیے اسے آگے پیچھے سے پلٹ کے دیکھا اور پھر یکدم کچھ خیال آنے پر فوراً تیز قدموں سے واپس لائبریری کی سیڑھیوں کی جانب گیا۔۔۔موبائل بدلے گئے تھے اور وہ ٹکرانے والی لڑکی اس کا موبائل لے کر اڑن چھو ہو گئی تھی۔۔۔اس کا کوفت سے برا حال تھا۔۔۔تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے وہ دانت بھینچے غصہ ضبط کر رہا تھا۔۔۔یہ جانے بنا کہ زمن نیچے کھڑے رکشے میں ابھی ابھی سوار ہو کے نکل چکی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

یہ ایک جانے مانے ڈینٹل کلینک کا اندرونی منظر تھا۔۔۔ویٹنگ میں مریضوں کی کافی تعداد موجود تھی جس میں سے بیشتر کے ہاتھ ان کے گالوں پہ دھرے تھے۔۔۔ہر کوئی ہر چند سیکنڈ بعد تمام مریضوں پر باری باری نگاہ ڈالتا خدا جانے کس بات کی تسلی کرتا تھا۔۔۔ویٹنگ لاؤنج اور ٹریٹمنٹ روم کے درمیان بلر ڈ شیشے کی دیوار تھی جس کے پار محض ہیولے دکھتے تھے۔۔۔اور اس وقت تقریباً چار سر پورے کمرے میں متحرک دکھائی دے رہے تھے اور ان چاروں کو ملا کر مریض سمیت پانچ افراد اندر تھے جنہوں نے ڈاکٹر کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔۔۔ذرا اندر چلے چلتے ہیں۔۔۔

" وے ڈاکٹر۔۔۔پتر داڑھ نہیں کڈانی (نکالنی) میں۔۔۔کچھ ایسا کر کہ درد آپو آپ ہی مر جائے۔۔۔!" نانی پیاری پیشنٹ سیٹ پہ نیم دراز گال پہ ہاتھ رکھے سہمی ہوئی دانتوں کے اوزار دیکھتے ہوئے بولیں۔۔۔ڈاکٹر مبین، مہریار راؤ کا بہترین دوست تھا اور مہریار نے ہی نانی پیاری کو یہاں بھجوایا

تھا۔۔۔ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے نانی پیاری کو حوصلہ دیا۔۔۔

" فکر نا کریں اماں جی۔۔۔ پتا بھی نہی چلے گا آپکو۔۔۔درد نہی ہوگا۔۔۔آپ کی داڑھ کھائی گئ ہے اسے نکالنے کی ضرورت ہے۔۔۔!"

شہریار اور زارون ارد گرد ٹہلتے ہوئے ہر شے کا جائزہ لے رہے تھے جبکہ داور اور یاور نے نانی پیاری کا ایک ایک پیر پکڑ رکھا تھا۔۔۔ڈاکٹر مبین نے تعجب سے دیکھتے ہوئے ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن ان دونوں کا ایک ہی جواب تھا۔۔۔

" نہی نہی۔۔۔ہم نہی چھوڑ سکتے۔۔۔نانی کو جب انجیکشن لگے گا تو وہ اچھل سکتی ہیں۔۔۔لات مار سکتی ہیں۔۔۔!"

اور نانی پیاری بری طرح بدکیں۔۔۔

" ہیں موئے۔۔۔ٹیکا لگائے گا کیا۔۔۔کوئی منہ میں بھی لگاتا ہے کیا۔۔۔!"

ڈاکٹر مبین اس طرز تخاطب پر چیں بہ چیں ضرور ہوا لیکن مروتا مسکراتا رہا۔۔۔وہ پہلے ہی ان چاروں کے مریض کے ساتھ اندر آنے کے حق میں نہی تھا لیکن وہ زبردستی مہریار کے حوالے کا فائدہ اٹھاتے اندر داخل ہوئے تھے۔۔۔

" ذرا سی چبھن ہوگی بس اماں جی۔۔۔پھر منہ سن ہو جائے گا تو داڑھ نکلنے کا پتا نہی چلے گا۔۔۔!"

" جی۔۔۔جی نانی پیاری۔۔۔آپ کو اپنا منہ ایسے لگے گا جیسے اونٹ جگالی کر رہا ہو۔۔۔نا ہونٹوں میں جان رہے گی نا زبان کو پہچان رہے گی۔۔۔دونوں کا دم خم نکل جائے گا۔۔۔!"

یاور نے مدبرانہ انداز میں اپنی معلومات سے نانی پیاری کو مستفید کیا تو ڈاکٹر مبین کو مجبورا ان چاروں کو کہنا پڑا۔۔۔

" پلیز آپ لوگ باہر چلے جائیں۔۔۔اس طرح مریض کمفرٹیبل فیل نہی کرتا۔۔۔میں فری ہو کے آپ کو بلوا لیتا ہوں۔۔۔!"

" نا وے اڑیا۔۔" نانی فورا نیم دراز سے اٹھ بیٹھیں۔۔۔" ان کو رہنے دے یہیں پتر۔۔۔میرا

حوصلہ بنا رہے گا۔۔۔چل میرا پُت ۔۔۔نا بھیج باہر۔۔۔!" نانی پیاری نے ڈاکٹر کو یوں پچکارا جیسے گیٹ پہ کھڑی عورت راہ چلتے بچے کی منت کرتی ہے کہ اسے دکان سے سودا لا دے۔۔۔ڈاکٹر مبین کے چہرے کا جغرافیہ بگڑنے کو تھا۔۔۔وہ لمبا سانس بھر کے ان سب کو دیکھتے ہوئے دوبارہ نانی کی جانب متوجہ ہوا۔۔۔سرنج لیے وہ نانی کو منہ کھولنے کا کہہ رہا تھا تبھی شہریار اور زارون بھی مکمل جائزے سے فارغ ہو کے نانی کے سر پہ پہنچ گئے تھے۔۔۔اب صورتحال یہ تھی کہ نانی پیاری کے سر کے بائیں جانب ڈاکٹر بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ہی نانی کی ایک ٹانگ پکڑے یاور اور داور کھڑے تھے جبکہ دائیں ٹانگ کو زارون اور شہریار نے پکڑ لیا تھا۔۔۔ڈاکٹر مبین سر بیزاری سے جھٹک کر نانی پہ جھکا اور احتیاط سے انجیکشن کی سوئی تالو میں گھبو دی۔۔۔نانی پیاری کی آنکھیں ابلیں اور داور اور یاور نے یکدم ڈاکٹر کے کان کے قریب چیخ ماردی۔۔۔

"ماردیا نانی پیاری کو۔۔۔ماردیا۔۔۔دم گھٹ گیا نانی کا۔۔۔نانی اٹھیں۔۔۔نانی پیاری۔۔۔!"

اس اچانک چیخ پکار سے ڈاکٹر مبین کے ہاتھ سے انجیکشن چھوٹ کر نیچے جا گرا جسے زارون نے دیکھ لیا۔۔۔انگلی کی مدد سے ناک سے پھسلتی عینک سیٹ کرتا نیچے جھکا اور پیروں کے بل بیٹھ گیا۔۔۔پیشنٹ سیٹ کے نیچے خلا تھا جہاں وہ انجیکشن گرا پڑا تھا۔۔۔زارون نے انجیکشن تھاما، اسے ناک کی سیدھ میں رکھ کے جانچا اور ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پہ یاور کی ٹانگ کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے انجیکشن سیدھا اس کی ران میں گھبو دیا۔۔۔ایک بار پھر چلانے کی آواز کمرے میں گونجی اور ڈاکٹر مبین سر پیٹتا جگہ سے کھڑا ہو گیا۔۔۔یاور اپنی ٹانگ مسلتا چکرا رہا تھا۔۔۔زارون نیچے سے سرنج ہاتھ میں پکڑے کمینی مسکراہٹ لیے نمودار ہوا تو ڈاکٹر مبین کو معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔۔۔مارے طیش کے اس نے چاروں کو دھکیل دھکیل کے کمرے سے باہر ویٹنگ میں نکال دیا۔۔۔تمام مریض انہیں حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔۔۔کچھ اپنی جگہ سے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر کھڑے ہو چکے تھے۔۔۔لیکن وہ چاروں اس بے عزتی پر نارمل پوز کرتے ٹہلتے ہوئے خالی کرسیوں پر آ بیٹھے۔۔۔سوائے یاور کے جس کی ران سن ہو گئی تھی۔۔۔اس نے بیٹھتے ساتھ ہی زارون کی گردن دبوچی اور غرایا۔۔۔

"زلیل کیوں آخر۔۔۔کیا بگاڑا تھا میں نے۔۔۔میں ہی کیوں۔۔۔!"

"تمہاری ٹانگ قریب تھی۔۔۔بچپن سے شوق تھا کسی کو کبھی ٹیکا لگاؤں۔۔۔آج موقع ملا تو ضائع نہی کیا۔۔۔مزہ بہت ایا مجھے۔۔۔!"

زارون کے جواب پر شہریار اور داور نے بمشکل قہقہہ روکا۔۔۔یاور نے مزید اس کی گردن گھمانے کی کوشش کی لیکن سامنے بیٹھی نہایت سوبرسی خاتون اور ایک جواں سالہ لڑکی کی خشمگیں نگاہیں دیکھ کر رک گیا۔۔۔وہ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔۔۔وہ چاروں بلاارادہ ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔۔۔شہریار کی نگاہیں بے اختیار ان خاتون کی جانب اٹھیں تھیں۔۔۔اسے ان کا چہرہ شناسا لگ رہا تھا جیسے بہت اپنا اپنا۔۔۔کسی سے ملتا تھا۔۔۔کس سے۔۔۔وہ ذہن پہ زور دیتا ابھی بھی کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن اور ہاجرہ پچھلے پونے گھنٹے سے ڈاکٹر کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔۔۔ہاجرہ کے دانت میں کئی دنوں سے تکلیف تھی لیکن وہ ٹال رہی تھیں۔۔۔زرہا کو ڈاکٹر کو دکھانا ان کی اولین ترجیح تھی لیکن جب تکلیف حد سے بڑھی اور سوجن گال پہ واضح ہو گئی تو زمن پہلے انہیں ڈینٹسٹ کے پاس لے آئی۔۔۔اب پچھلے پون گھنٹے سے وہ لوگ ادھر بیٹھے باقی مریضوں کی طرح اندر چلتی فلم دیکھ رہی تھیں۔۔۔سمجھ نہی آتا تھا اندر ہو کیا رہا ہے۔۔۔کسی وقت ڈاکٹر کی بے بسی سے بھرپور آواز باہر سنائی دیتی تو کبھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا بے تحاشا شور ابھرتا اور کچھ سمجھ نا آتا اندر ہو کیا رہا ہے۔۔۔مریض اچک اچک کے دیکھتے۔۔۔کچھ ہنس رہے تھے کچھ ہنسی دبا رہے تھے اور باقی اکتا رہے تھے۔۔۔تبھی کافی شور و غل کے بعد دروازہ دھاڑ سے کھلا اور چار ڈشکرے دھکم پیل کرتے باہر نکلے۔۔۔پیچھے ڈاکٹر نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا تھا۔۔۔سبھی کو اندازہ ہو گیا تھا اندر کیا ہوا ہے۔۔۔وہ چاروں زمن اور ہاجرہ کے بلکل سامنے قدرے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔۔۔یہ الگ بات کہ اب وہ تمام مریضوں کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے۔۔۔زمن ان کی شرافت کی دل ہی دل میں قائل ہو گئی کیونکہ ان میں سے کسی نے ایک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ اس پر نہی ڈالی تھی۔۔۔بس سب سے بائیں جانب بیٹھا ایک لڑکا ہاجرہ کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔۔۔

اس کی نگاہوں اور چہرے پر کچھ یاد کرنے کا تاثر واضح تھا۔۔۔زمن نظر انداز کر گئی۔۔۔کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور نانی پیاری گال پہ ہاتھ رکھے باہر آتی دکھائی دیں۔۔۔اگلا نام ہاجرہ کا تھا سو وہ فوراً اندر کی جانب بڑھیں۔۔۔زمن بھی ان کے پیچھے تھی لیکن نانی کو دیکھتے ہی ان چاروں نے انہیں گھیر لیا تھا۔۔۔ہاجرہ سائیڈ سے گزر کر اندر جا چکی تھیں لیکن زمن ان سب کی وجہ سے رک گئی کیونکہ وہ سب ابھی درمیان میں کھڑے تھے۔۔۔نانی پیاری ہاتھ کے اشاروں سے انہیں پرے پرے ہونے کا کہہ رہی تھیں۔۔۔جب کہ ان چاروں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک بار یہاں بھی نانی کا منہ کھلوا کر اچھے سے جائزہ لے لیں۔۔۔زمن کو الجھن محسوس ہوئی اور مجبوراً پکارا۔۔۔

"ایکسکیوز می۔۔۔راستہ دے دیجیے۔۔۔مجھے اندر جانا ہے۔۔۔!"

وہ چاروں ایک ساتھ پرے ہوئے تھے۔۔۔نانی پیاری کی نگاہ زمن پر جم کر رہ گئی تھی۔۔۔وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔۔۔زمن نے انہیں اس طرح گھورتا پایا تو سلام جھاڑتی اندر چلی گئی جبکہ نانی پیاری سکتہ زدہ سی اپنی تکلیف بھلائے کچھ سوچتی وہیں کھڑی رہ گئیں تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

نوابی طرز پر سجا خوبصورت کمرا نیم اندھیرے میں ڈوبا تھا۔۔۔کمرے کے چہار اطراف کھڑکیاں تھیں لیکن بس ایک کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے جس سے روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔۔۔چوہدری شہزور راؤ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی جمائے ہاتھ کو مٹھی بنائے ہونٹوں پہ دھرے کھڑا تھا۔۔۔دوسرا بازو پیچھے کمر پر رکھا ہوا تھا۔۔۔اونچا لمبا شہزور راؤ ایک خوبصورت لیکن مغرور مرد تھا۔۔۔اس کی اونچی ناک اور تنے ابرو شاہانہ مزاج کا پتا دیتے تھے۔۔۔سفید رنگت میں گھلی سرخی اس کی خوبروئی میں اضافہ کرتی تھی۔۔۔اس کے بالوں اور چہرے پہ سجی ہلکی ہلکی داڑھی کی رنگت میں سنہرہ پن تھا۔۔۔جو دھوپ میں سونے کے تاروں کی مانند چمکتا۔۔۔مجموعی طور پر وہ ایک مکمل اور خوبصورت مرد تھا لیکن وہ بے حد تند تھا اور بچپن سے ضدی اور گھمنڈی۔۔۔موڈ ہوتا تو خزانے لٹا ڈالتا اور بگڑ جاتا تو کچھ بھی کسی سے بھی اچک لیتا۔۔۔اپنی چیز کسی کے حوالے کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔۔۔وہ بچپن سے بانٹنے کا عادی نہیں تھا۔۔۔اکلوتا ہونے کی وجہ سے دنیا جہاں کی آسائشات اسے مہیا تھیں اور اسی بات نے اس کا دماغ شروع سے ساتویں آسمان پر رکھا

تھا۔۔۔وہ کبھی کسی بچے کے ساتھ مل کر نہی کھیلا تھا۔۔۔اسے کبھی دوسراہٹ کی حاجت نہی ہوئی تھی۔۔۔وہ اکیلا اپنی راجدھانی میں خوش رہا تھا اور یہی چیز اس کی شخصیت کو غیر متوازن بناتی تھی۔۔۔

محرومیاں ہماری سب سے بڑی رہبر و محسن ہوتی ہیں یہ ہمیں درد آشنا کرتی ہیں، عزت سکھاتی ہیں، جھکنا سکھاتی ہیں، اچھا انسان بناتی ہیں اور شہزور راؤ کبھی محروم نہی رہا تھا۔۔۔!

کھڑکی سے باہر یک ٹک جھانکتے اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔۔۔سوچ کی پرواز کسی کے گرد چک پھیریاں کھا رہی تھی۔۔۔ایک طویل سانس لے کر اس نے ہونٹوں پہ جمی مٹھی کھولی اور زوردار جھٹکے سے کھڑکی کے پٹ وا کر دیے۔۔۔ٹھنڈی اور لطیف ہوا کا جھونکا اس کے جسم میں سرور بن کر اترا لیکن اندر لگی آگ جیسے مزید بھڑک کے جلنے لگی۔۔۔

”کچھ بھی ہو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔۔۔زمین نگل چکی ہو یا آسمان اچک لے جا چکا ہو۔۔۔شہزور راؤ کی شے اس کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے بنا نیست و نابود نہی ہوتی۔۔۔“

کس کے مکا دیوار کو مارتے سارا غصہ اس پر اتارا۔۔۔

”جلد یا بدیر میں تمہیں ملوں گا۔۔۔ضرور ملوں گا۔۔۔بھلے قبر سے کھینچ لاؤں یا سمندر کی گہرائیوں سے نکال لاؤں۔۔۔!“

وہ مڑا اور راستے میں رکھی خوبصورت چھوٹی سی میز کو ٹھوکر سے گراتے ہوئے واشروم میں جا گھسا۔۔۔جہازی سائز کمرے میں میز کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز پھیلی اور سرائیت کر گئی۔۔۔آج کا سارا دن پھر چوہدری شہزور راؤ کا شہر کی خاک چھانتے گزرنے والا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

رباب آنٹی کتنی بار زمن کے موبائل پر کال کر چکی تھیں لیکن وہ تھی کہ کال پک ہی نہی کر رہی تھی۔۔۔زوہا کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا اور وہ اسی سلسلے میں اس سے مسلسل رابطہ کر رہی تھیں۔۔۔زمن کو ڈینٹسٹ کے پاس کافی وقت لگ گیا تھا۔۔۔ہاجرہ کی ٹریٹمنٹ کروا کے جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو رباب آنٹی پہلے سے موجود تھیں۔۔۔زوہا کے پاس وہ لوگ ہمسائے میں موجود دو بہنوں کو چھوڑ جایا کرتیں تھیں۔۔۔میٹرک کی سٹوڈنٹ تھیں خوب باتیں کرتی رہتیں تھیں۔۔۔زوہا کا دل لگا رہتا تھا۔۔۔محلہ

بھی ہر دم پُر رونق رہا کرتا تھا اور سبھی ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے لہذا اس طرف سے زمن اور ہاجرہ کو کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔۔۔رباب آنٹی نے آتے ہی ان دونوں لڑکیوں کو شکریے کے ساتھ ان کے گھر روانہ کر دیا تھا اور اس وقت وہ زوہا کے سرہانے بیٹھیں زمن کی لائی کتاب میں سے اسے کچھ پڑھ کے سنا رہی تھیں۔۔۔ہاجرہ اور زمن کو اندر آتا دیکھ انہوں نے شاکی نگاہوں سے زمن کو دیکھا۔۔۔

”حد ہوگئی لڑکی۔۔۔جانا تھا تو بتا کے تو جاتی۔۔۔کم از کم میرا فون تو پک کرتی نا۔۔۔!“

ہاجرہ نے گال پہ ہاتھ دھر رکھا تھا۔۔۔چادر اتارتی وہیں زوہا کے قریب پیر اوپر کر کے بیٹھ گئیں۔۔۔

”کہاں سے کرتی۔۔۔سیل گم گیا ہے میرا۔۔۔اللہ جانے کہاں گیا ہے۔۔۔اوپر سے جس کے بھی پاس ہے اس نے آف بھی نہیں کیا اور نا کال اٹھاتا ہے۔۔۔خود بھی بیسیوں کالز کر چکی ہوں۔۔۔کل صبح سم بلاک کرواؤں گی۔۔۔ اتنی مصروفیت میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔۔۔ خیر اب بتائیں کیا کرنا ہے۔۔۔؟“

اس نے چادر نہیں اتاری تھی۔۔۔وہ بلکل تیار کھڑی تھی کہ بس ابھی دوبارہ نکل پڑے گی۔۔۔رباب آنٹی فوراً کھڑی ہو گئیں۔۔۔

”چلو پھر۔۔۔رپورٹس پکڑو۔۔۔آج ڈاکٹر کو سب رپورٹس دکھانی ہیں پھر جس دن بلائے گا اس دن زوہا کو لے چلیں گے۔۔۔کم از کم بسم اللہ تو ہو۔۔۔“کھڑے ہو کر ان کو یکدم ہاجرہ کا خیال آیا۔۔۔اب تک انہوں نے ان کا حال چال نہیں پوچھا تھا۔۔۔

”اور تمہیں بھی کب سے کہہ رہی تھی دانت دکھا لو۔۔۔تم بھی ماننے والی ہو ہی نہیں۔۔۔اب دیکھو نکلوانا پڑ گیا نا۔۔۔!“

ہاجرہ بیزار تھیں۔۔۔جواب دینے کی بجائے ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کا کہا اور خود وہیں نیم دراز ہو گئیں۔۔۔رباب آنٹی ہنس پڑیں۔۔۔وہ زمن کو رپورٹس لے کر آنے کا کہہ کر گاڑی کی چابیاں اٹھاتی باہر چلی گئیں۔۔۔زمن نے بھی جلدی جلدی الماری میں سے رپورٹس اور دیگر ضروری چیزیں نکالیں امی کو ہدایات دیں اور رباب آنٹی کے پیچھے نکلتی چلی گئی۔۔۔!

☆......☆......☆

ابھی شام کے چھے نہی بجے تھے۔۔۔ وہ دونوں ایک پرائیویٹ ہاسپٹل کے ریسپشن پر کھڑی تھی۔۔۔ رباب آنٹی کو ریسپشنسٹ پہلے سے جانتی تھی لہٰذا اچھے انداز میں خیر مقدم کیا۔۔۔ وہ ریسپشن ٹیبل پہ دونوں کہنیاں ٹکائے اس سے بات کرنے لگیں۔۔۔ اس اثناء میں زمن کچھ فاصلے پر ہو کے اپنا بیگ ٹٹولنے لگی۔۔۔ اس نے ایک ہاتھ میں رپورٹس تھام رکھی تھیں۔۔۔ اپنے بیگ میں موجود ایک قیمتی سیل فون پہ نگاہ پڑی تو اسے دوپہر کے وقت پیش آنے والا واقعہ یاد آگیا۔۔۔ یہ سیل فون اسی شخص کا تھا جس سے وہ لائبریری کی سیڑھیوں پہ ٹکرائی تھی۔۔۔ گھر آنے تک اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا سیل فون اس اجنبی کے سیل سے بدلا گیا تھا لیکن اب واپس ہو لینے کا کوئی فائدہ نہی تھا۔۔۔ وہ کون سا اس کے انتظار میں وہیں کھڑا ہوتا۔۔۔ وہ اپنے نمبر پہ کتنی ہی بار کال کر چکی تھی لیکن کوئی پک ہی نہی کرتا تھا۔۔۔ تھک کے اس نے کوشش چھوڑ دی تھی۔۔۔ سوچا تھا کل سم بلاک کروا کے نئی نکلوا لے گی لیکن یہ جو نیا نکور انتہائی قیمتی موبائل اس کے ہاتھ میں تھا، اس کی واپسی بھی ضروری تھی۔۔۔ وہ شعوری طور پہ اس انتظار میں تھی کہ کسی بھی وقت اس اجنبی کی کال آجائے تو وہ اس کی واپسی کرے اور اپنا موبائل واپس مانگ لے لیکن شائد اس بندے کو یہ واپس چاہیے ہی نہی تھا۔۔۔!

"زمن۔۔۔!" رباب آنٹی نے اسے آواز دی تو وہ چونک کے پلٹی۔۔۔ وہ اس کے قریب آ گئیں۔۔۔" چلو چلیں۔۔۔ ڈاکٹر موجود ہے۔۔۔ آج نا ہوتا نا تو تمہارے انکل سے ایسی کی تیسی کروا دیتی اس کی۔۔۔ بہت عزت کرتا ہے ان کی۔۔۔ شام کو بلوایا بھی اسی لیے تھا اس نے کہ اس وقت بلکل اطمینان سے زوہا کا کیس ریڈ کر سکے گا۔۔۔ چلو اب جلدی۔۔۔ اس کے روم میں چلیں۔۔۔!"

وہ خفیف سے کندھے اچکاتی کوئی جواب دیے بنا ان کے ساتھ ہو لی۔۔۔ کاریڈورز سے گزرتے ہوئے ہر چند سیکنڈز بعد آنٹی رباب ٹھہر جاتی تھیں کیونکہ یہاں کا بیشتر اسٹاف انہیں نا صرف جانتا تھا بلکہ ان کی سب سے اچھی سلام دعا تھی۔۔۔ زمن ان کی عادت کو جانتی تھی اس لیے تحمل سے ان کے ساتھ چل رہی تھی۔۔۔ رباب آنٹی نے ایک کاریڈور مڑتے ہی اسے کہا۔۔۔

"یہ جو لیفٹ پہ سیکنڈ روم ہے نا وہیں جانا ہے۔۔۔ تم چلو میں ایک منٹ میں آئی۔۔۔!" اسے کہہ کر

وہ خود وہیں رک کر کسی سے ملنے لگی تھیں۔۔۔ان کی اس قدر پی آر سے متاثر ہوتی وہ دھیمے قدموں سے چلتی اس کمرے کے باہر آ کھڑی ہوئی۔۔۔جلی حروف میں آویزاں نیورو سرجن کا نام پڑھنے کے بعد اس نے رپورٹس کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کیا اور دروازے کے ناب پہ ہاتھ رکھ کر اندر داخل بھی نہی ہوئی تھی کہ دوسری جانب سے کوئی پوری تیزی سے باہر نکلا تھا۔۔۔ٹکراؤ شدید تھا۔۔۔رپورٹس ہاتھ سے گری تو نہیں تھیں لیکن فائل سے باہر ضرور آ گئی تھیں۔۔۔زمن نے الجھن کے بھرپور احساس کو بمشکل دباتے ہوئے رپورٹس سیدھی کیں اور سر اٹھا کے سامنے دیکھا۔۔۔

"تم۔۔۔" وہ ہلکا سا چلائی۔۔۔مقابل بھی اسے کچھ حیرانی اور کچھ لاپرواہی کے تاثرات سجائے دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں بھی۔۔۔اور ٹکر بھی مار دی۔۔۔سارا دن کچھ اور بھی کرتے ہو یا نہی۔۔۔" زمن نے ایک ہاتھ پہلو میں لٹکے بیگ پر جماتے ہوئے کڑے تیوروں سے پوچھا۔۔۔وہ اجنبی اب سینے پہ دونوں بازو لپیٹے اسے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بغور دیکھ رہا تھا۔۔۔زمن کو عین وقت پہ اپنا موبائل یاد آ گیا۔۔۔

"اب ادھر سے رفو چکر ہونے سے پہلے میرا موبائل دے دو۔۔۔اور۔۔۔اور" اس نے فوراً اپنا بیگ کھنگال کر اس اجنبی کا سیل نکالا۔۔۔"یہ لو اپنا موبائل۔۔۔لیکن پہلے میرا واپس دو۔۔۔جلدی۔۔۔!"

زمن موبائل والا ہاتھ کچھ پیچھے کرتے ہوئے خالی ہاتھ کو آگے بڑھائے اپنا سیل واپس مانگ رہی تھی۔۔۔پیچھے نیورو سرجن کے کمرے میں سجی جہازی سائز ٹیبل دکھائی دے رہی تھی۔۔۔اجنبی پلٹا اور اس ٹیبل سے زمن کا موبائل اٹھا کر واپس اس تک آیا اور اس کی خالی ہتھیلی پہ رکھ کے اپنا چپ چاپ پکڑ لیا۔۔۔زمن نے بنا حیل وحجت اپنا سیل فون فوراً بیگ میں ڈالا اور اس سے مخاطب ہوئی۔

"چلو۔۔۔اب ہٹو راستے سے۔۔۔ضروری اپوائنٹ منٹ ہے ہماری۔۔۔چلو شاباش۔۔۔راستہ ناپو!"

وہ دیوار کی طرح ایستادہ اس اونچے لمبے شخص کو سامنے سے ہٹا رہی تھی لیکن وہ تھا کہ ٹس سے مس نہی ہوا۔۔۔زمن نے اسے گھورا لیکن کچھ مزید بولنے سے پہلے ہی رباب آنٹی کی آواز اس کے کانوں پہ ہتھوڑے کی مانند پڑی۔۔۔

"ارے مہریار۔۔۔بیٹا یہاں کیوں نکل کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ہمیں باہر سے ٹرخانا ہے کیا۔۔۔؟

تمہیں تو پتا ہے نا اپنی آنٹی کا ہر دوسرا بندہ واقف کار نکل آتا ہے۔۔۔"

اب وہ بن کھڑی زمن سے مخاطب تھیں۔۔۔

"تم مل لیں زمن ان سے۔۔۔ یہ ہیں نیورو سرجن ڈاکٹر مہر یار راؤ۔۔۔ یہی زوہا کا ٹریٹمنٹ کریں گے۔۔۔ اور مہر۔۔۔ بیٹا یہ پیشنٹ کی بڑی سسٹر ہے۔۔۔!"

رباب آنٹی تعارفی مراحل سے گزر کر اندر بڑھ گئی تھیں جب کہ زمن کاٹو تو لہو نہیں والی کیفیت میں شرمندہ سی مہر یار کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ جس کے ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ سجی تھی لیکن اس نے زمن پہ دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔۔۔!

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 2

ایک تفصیلی سٹنگ کے بعد رباب آنٹی اور زمن نیورو سرجن ڈاکٹر مہریار راؤ کے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔۔۔دونوں کے چہروں پہ بے حد اطمینان تھا۔۔۔زمن کو اتنے عرصے میں پہلی بار یقین ہوا تھا کہ زوہا ٹھیک ہو سکتی تھی۔۔۔اب تک کی خجل خواری نے اسے اندر ہی اندر مایوس کر دیا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر مہریار نے انہیں نا صرف تسلی دی تھی بلکہ زوہا کے ٹھیک ہو جانے کے اسی فیصد چانسز بتائے تھے۔۔۔زمن کے لیے یہی بہت تھے کیونکہ اب تک وہ جس بھی ڈاکٹر کے پاس گئیں تھیں سبھی نے پانچ سے دس فیصد کی امید دلا کے رخصت کیا تھا۔۔۔زمن ہاتھ میں رپورٹس والی فائل کھولے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ رباب آنٹی اور مہریار آپس میں بات کر رہے تھے۔۔۔

”نیکسٹ ویک آپ پیشنٹ کو لے آئیے گا۔۔۔میں تھارولی چیک اپ کر کے اسی ماہ کے اندر آپریشن کی تاریخ دے دوں گا۔۔۔اس سے زیادہ ڈیلے نا کرنا مناسب ہوگا، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔۔۔!“

وہ رباب آنٹی کو بتا رہا تھا۔۔۔زمن نے چونک کے اسے دیکھا۔۔۔اس نے رباب آنٹی کو پیسوں کا پوچھنے کا اشارہ کیا۔۔۔وہ مہریار کی قدرے بائیں جانب کھڑی انہیں انگوٹھے اور انگشت شہادت کو مسل کے اشارہ دے رہی تھی۔۔۔رباب آنٹی نے تو دیکھا سو دیکھا خود مہریار نے بھی دیکھ لیا۔۔۔

”ان سے کہیے کہ پیسوں کی فکر مت کریں۔۔۔بس آپ تیاری پکڑیں۔۔۔!“

زمن کو کہنے کی بجائے اس نے رباب آنٹی کو جواب دیا تھا۔۔۔زمن کو برا لگا، وہ دل میں اونہہ کہتی دوبارہ فائل کی جانب متوجہ ہوئی۔۔۔

”زمن۔۔۔“ رباب آنٹی نے گاڑی کی چابی اس کی جانب بڑھائی۔۔۔”تم پارکنگ میں چلو۔۔۔

میں دس منٹ میں وہیں پہنچتی ہوں۔۔۔بیشک گاڑی کھول کے اندر بیٹھ جانا۔۔۔!"

زمن نے گومگوں کی کیفیت میں چابی تھام تو لی لیکن وہ اکیلی جانا نہیں چاہ رہی تھی۔۔۔

"میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں نا آنٹی۔۔۔اکیلی کیسے جاؤں گی وہاں تک۔۔۔!"

"میری جان یہ تو پارکنگ ہے۔۔۔اچھا ایسا کرو مہریار کے آفس میں ہی بیٹھو، میں بس ابھی آئی۔۔۔!"

وہ بنا اس کا جواب اور مرضی جانے کاریڈور کی جانب چل دی تھیں۔۔۔زمن ان کو پکارنے اور نا پکارنے کی کیفیت میں کھڑی تھی جب مہریار نے اسے اندر چل کے بیٹھنے کا کہا۔۔۔

"بیٹھ جائیے کچھ دیر۔۔۔رباب آنٹی کی اس ہاسپٹل میں ان گنت دوستیاں ہیں۔۔۔اور دوستی نبھانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں۔۔۔آئیے بیٹھ جائیے۔۔۔!"

مہریار نے اسے قدرے نرمی سے آفر کی تھی۔۔۔وہ اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔۔۔زمن کو اچھا نہیں لگا بے مروت ہونا۔۔۔اس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔۔۔مہریار بھی اس کے پیچھے تھا۔۔۔رباب آنٹی نے کاریڈور کے اختتام پر ایک بار پلٹ کر اس جانب دیکھا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

نانی پیاری کب سے آئس کریم کا باؤل ہاتھ میں تھامے چمچ گھمائے جا رہی تھیں اور آئسکریم تھی کہ شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔۔۔داڑھ نکلوانے کے بعد ڈاکٹر نے آئسکریم کھانے کا کہا تھا۔۔۔زارون ناک کی نوک پہ عینک جماتا انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔۔۔داور کو نجانے کیا اشارہ کیا کہ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتا ان کے قریب ہوا اور پہلے منہ اٹھا کے نانی پیاری کا منہ دیکھا اور پھر ان کے باؤل کو۔۔۔منہ سے رال ٹپکنے سے پہلے بولنا لازم تھا۔۔۔

"نانی۔۔۔او نانی بی۔۔۔" وہ سن نہیں رہی تھیں بس چمچ چلا رہی تھیں۔۔۔سوچیں نا جانے کہاں بھاگی پڑی تھیں۔۔۔داور کو آئسکریم کی پتلی ہوتی حالت پہ ترس آ رہا تھا۔۔۔

"نانی بی۔۔۔اللہ کا واسطہ ہے کھا لیں۔۔۔کوئی آئسکریم کے ساتھ بھی یہ ظلم کرتا ہے۔۔۔اگر دہی

کھانا تھا تو وہ اندر فریج میں بھی تھا۔۔۔لیکن اس کے اندر تو بلینڈر پھیرنا بند کریں۔۔۔!"

نانی پیاری ہنوز اسی پوزیشن میں رہیں تو داور نے زارون کو ساتھ دینے کا اشارہ کیا۔۔۔دونوں ایک ساتھ چلائے۔۔۔

"نانی پیاری۔۔۔" اور ان کے ہاتھ سے باؤل چھوٹتے چھوٹتے بچا۔۔۔ہڑبڑا کے نیچے جھکیں اور جوتا اٹھا کے داور کو کھینچ مارا جو جھکائی دے گیا۔۔۔جوتا سیدھا ناک کی پھننگ پہ عینک سیٹ کرتے زارون کے چہرے کو جا لگا۔۔۔عینک پھسل کے فرش پہ۔۔۔اس ہفتے میں دوسری عینک تھی جس کی شامت آ گئی تھی۔۔۔وہ بیچارہ بلبلا کے رہ گیا۔۔۔

"کیا نانی۔۔۔میں نے کیا کہا تھا۔۔۔پہلے ہی میرے چہرے کے نیل نہیں گئے اب تک۔۔۔آپ اور ستارے لگا دیں۔۔۔یونی میں لڑکیاں نیل گائے کہنے لگ گئی ہیں مجھے۔۔۔!"

"غلط کہتی ہیں۔۔۔انہیں تمہیں مدہوش گائے کہنا چاہیے۔۔۔جس کو یہ ہی پتا چلتا کہ ایک پیر میں جوگر بلیک پہن کے جاتا ہے اور دوسرے پاؤں میں بلو۔۔۔" داور نے ٹھٹھا لگا کے اس کا موڈ مزید خراب کیا۔۔۔

"۔۔۔بکواس بند کرو تم دونوں۔۔۔جان ہولا کے میری رکھ دی۔۔۔کیسی ضروری بات سوچ رہی تھی تمہیں کیا پتا۔۔۔آج تو ویسے ہی دل بیزار سا ہوا پڑا ہے جب سے موئے ڈاکٹر کے پاس سے آئی ہوں دل ہی نہی لگ رہا۔۔۔!"

داور نے زوردار تالی بجائی۔۔۔نانی کے ہاتھ سے باؤل ایک بار پھر پھسلتا پھسلتا بچا لیکن وہ برداشت کر گئیں۔۔۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا نانی بی کہ وہ ہمیں ایویں ہی باہر نہی بھیج رہا۔۔۔اس نے آپ کے دانت کے ساتھ دل بھی نکال لیا ہونا ہے۔۔۔لکھوا لیں مجھ سے۔۔۔آج کل تو انسان کا پرزہ پرزہ بک جاتا ہے۔۔۔آپ کا دانت بھی بیچے گا اور دل بھی۔۔۔!"

"کم بخت۔۔۔بے غیرت۔۔۔" نانی پیاری کا یہ نشانہ درست لگا تھا۔۔۔داور کمر دہری کرتا پرے کھسک گیا۔۔۔" سانس کیسے لے رہی ہوں جو دل نکال لیا ہے تو۔۔۔بک بک کرا لو بس۔۔۔مجھے تو اس

بچی کا چہرہ نہی بھولتا جو میرے باہر آنے پہ اندر گئ تھی۔۔۔کیسی پیاری صورت تھی لیکن دیکھی بھالی سی۔۔۔!" نانی بی سوچنے والے انداز میں باؤل کو منہ سے لگاتے ہوئے بولیں۔۔۔آئسکریم سوپ بن چکی تھی اب اسے ایسے ہی پیا جا سکتا تھا۔۔۔داور اور زارون نے آئسکریم کی ایسی بے حرمتی پہ صبر کا گھونٹ بھرا۔۔۔نانی کی بات پہ داور کی زبان پھر چلی۔۔۔

"مجھے معلوم تھا وہ آپ کو پسند آئے گی نانی بی۔۔۔مجھے بھی ائی تھی۔۔۔آپ کہیں گی تو کل ہی سارا اتا پتا آپ کو لا دوں گا بس امی اور ابا کو آپ نے منانا ہے۔۔۔!" داور شرمانے اور کھسیانے کی اوور ایکٹنگ کرتا بولا تو زارون کی آنکھیں پھٹنے کو ہو گئیں۔۔۔

"اوئے تو۔۔۔آگ تو لے۔۔۔ادرک جتنا ہے تو اور شادی کا سوچ رہا ہے۔۔۔نانی بی کو تیرے لیے نہی میرے لیے پسند آئی ہو گی۔۔۔کیوں نانی بی۔۔۔!"

لو جی زارون کی اپنی گاڑی پٹری توڑتی آ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔داور غصے سے سیدھا ہوا۔۔۔

"بک مت۔۔۔بھابھی ہے تیری۔۔۔!"

"میری نہیں تیری۔۔۔سمجھا۔۔۔آنکھیں نکال دوں گا جو بری نگاہ ڈالی۔۔۔!" زارون نے سینہ تانا۔۔۔

"اپنی آنکھیں تو سیٹ کرا لے پہلے جو عینک کے بنا دیکھ بھی نہی سکتیں۔۔۔لڑکی خاک دیکھے گا تو۔۔۔!"

"لڑکی دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہے داور۔۔۔دل کی۔۔۔" زارون سینے پہ دو ہتڑ مارتا ہوا بولا تو نانی پیاری نے آئسکریم پیتے ہوئے اسے ترحم سے دیکھا۔۔۔

"تیرا دل تو ہر لڑکی دیکھ کے ڈیلے باہر نکال لیتا ہے۔۔۔مہر لالہ سے کہہ کے سلائیاں پھرا دوں گا۔۔۔سمجھا۔۔۔!"

"او بند کرو تم دونوں اپنی ٹرٹر۔۔۔میرے پچھلوں کی توبہ جو تم جیسے نیشوں کے آگے کبھی کوئی بات کروں۔۔۔اور تو زارون۔۔۔تو تو واقعی اپنی ماں کی سب سے وڈی نیش اولاد ہے جو اس نے اپنے

مغروں اتار کے یہاں انی ڈالنے بھیج دی ہے۔۔۔دفع دور ہو تم لوگ۔۔۔!"

نانی پیاری دونوں کے لتے لیتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔۔۔چپل میں پیر گھسیٹ کے دونوں کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتیں، ایک ہاتھ گال پہ رکھتی دوسرے میں آئسکریم کا خالی باؤل لیے لاؤنج سے نکل گئیں۔۔۔پیچھے زارون اور داور نے سکون سے نیم دراز ہوتے اپنی اپنی ہینڈ فریز جیبوں سے نکالیں۔۔۔

"یار داور یہ نیش کون سی اولاد ہوتی ہے بھلا۔۔۔؟" زارون نے ہینڈ فری کان میں گھساتے ہوئے موبائل سیدھا کیا اور تدبر سے پوچھا۔۔۔

"سب سے بابرکت بچہ۔۔۔اسے کہتے ہیں نیش جنیا۔۔۔!" جواب میں داور نے بھی اسی معصومیت سے جواب دے کر اپنی ہینڈ فری کانوں میں لگالی تھی۔۔۔اب دونوں ٹھنڈے ہو کے موبائل میں گم ہو چکے تھے۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن ساکت سی سانس بھی تھم تھم کے لیتی ڈاکٹر مہریار کے بلکل سامنے ریوالونگ چیئر پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔۔۔وہ دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی پر اتنی بولڈ بھی نہیں تھی کہ بلاوجہ ماحول میں ڈھلنے کی خاطر کھی کرتی پھرتی۔۔۔وہ ادھر ادھر دیواروں پہ لگی پینٹنگز دیکھ دیکھ کے حظ کر رہی تھی۔۔۔کبھی نگاہ گلاس ٹاپ والے ٹیبل پہ رکھی نقلی کھوپڑی پہ جا پڑتی جس کا منہ اسی کی جانب تھا تو ایک بار پہلو لازمی بدلتی۔۔۔کیسی بدہیئت سی تھی۔۔۔وہ سوچتی اور دوبارہ دیواریں تاڑنے لگتی۔۔۔دل میں آنٹی رباب کی دہائی جاری تھی کہ کہیں سے بس وہ واپس آئیں تو یہاں سے جان چھوٹے۔۔۔سامنے ڈاکٹر مہریار حیات سکون سے اپنے سامنے پھیلے کاغذات میں گم تھا۔۔۔ایک فسوں تھا جو کمرے میں طاری تھا۔۔۔زمن کو یہی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر کون سی چیز تھی جو اس کے اعصاب پہ سوار ہو رہی تھی۔۔۔اس نے بغور ڈاکٹر مہریار کو دیکھا۔۔۔روشن کشادہ پیشانی۔۔۔لمبی پلکوں والی ہلکی بھوری آنکھیں۔۔۔ابرو درمیان سے ملتے تھے۔۔۔اونچی ناک اور بڑھی ہوئی شیو۔۔۔بالوں کا فلفی سا ہیئر کٹ ڈاکٹر جیسے معتبر بندے کے لیے عجیب تو تھا لیکن اسے بے حد جچ رہا تھا۔۔۔گھنی مونچھوں کے ساتھ بڑھی ہوئی شیو۔۔۔وہ ایک مکمل پیکج

تھا۔۔۔یہ خیال ذہن میں آتے ہی زمن کو ہنسی آئی جسے اس نے اپنے بیگ میں منہ دے کر روکا۔۔۔

"میرا جائزہ تو آپ ایسے لے رہی ہیں جیسے رشتہ کروانا ہے۔۔۔!"

ڈاکٹر مہریار کی آواز پہ اس کے ہاتھ تھرا سے گئے۔۔۔شرمندگی کا شدید احساس حواسوں پہ حاوی ہوا۔۔۔وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔۔۔

"ک۔۔۔کون بھلا۔۔۔میں۔۔۔میں جائزہ لے رہی ہوں۔۔۔میں۔۔۔" وہ استہزائیہ اپنے سینے پہ انگلی رکھتے ہوئے بولی۔۔۔

"کیا آپ کے علاوہ یہاں کوئی ہے جسے کہوں گا۔۔۔آپ ہی ہیں جو مسلسل دیکھ رہی ہیں۔۔۔!" اسی مصروف انداز میں جواب فوراً آیا۔۔۔زمن نے چہرہ دوسری جانب گھما لی اور بولی۔۔۔

"پاگل نہیں ہوں میں۔۔۔ویسے بھی صبح کے ٹکراؤ کے بعد کوئی اچھا امپریشن نہیں چھوڑا آپ نے مجھ پہ۔۔۔وہی سوچ رہی تھی کہ دن کو دکھائی دینے والے شام میں کیا ہو جاتے ہیں۔۔۔!"

مہریار نے ایک اچٹتی نگاہ اس کی پشت پہ ڈالی اور مسکرا کے سر جھٹکتا واپس کام کرنے لگا۔۔۔

"اچھی بات ہے۔۔۔سوچ کا کیا ہے جیسی بھی آجائے آنے دینا چاہیے ورنہ دماغ کو پراگندہ کرتی ہے۔۔۔اب آپ کو مجھے ایسا کہہ کے سکون تو مل ہی گیا ہوگا۔۔۔رائٹ۔۔۔"

زمن ایک جھٹکے سے واپس گھومی اور بولی۔۔۔

"میرا دماغ کبھی گندا نہیں ہوا۔۔۔میری بہن کا علاج کر کے احسان ضرور کر رہے ہیں لیکن باتیں سنا کے ضائع تو نا کریں۔۔۔میں ذرا آنٹی رباب کو دیکھ لوں۔۔۔!"

اس سے پہلے کہ مہریار حیات اس پہ دوبارہ کوئی جملہ اچھالتا، وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔مہریار کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی لیکن وہ ہنوز کاغذات پہ قلم چلانے میں مصروف تھا۔۔۔اس نے زمن کو روکا نہیں تھا۔۔۔

باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہی زمن کو لگا جیسے وہ کسی قید سے آزاد ہوئی ہے۔۔۔دو چار لمبی سانسیں کھینچ کے اس نے دل میں اعتراف کیا کہ اندر کمرے میں موجود شخص کا سحر جیسے ہر شے پہ حاوی

تھا۔۔۔وہ سر جھٹک کے، ہونٹوں کو گول کر کے لمبا سانس چھوڑتی اس جانب چل دی جدھر آنٹی رباب گئی تھیں۔۔۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ پارکنگ میں ان کا ویٹ کر لے گی لیکن واپس ڈاکٹر مہر یار حیات کے آفس میں نہی آئے گی۔۔۔!

☆......☆......☆

گھر آتے آتے دونوں کو کافی وقت ہو گیا تھا۔۔۔ہاجرہ بے چینی سے ان کی منتظر تھیں۔۔۔رباب آنٹی اسے ڈراپ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اندر آئی تھیں اور ہاجرہ کو مکمل تسلی دلاسہ دینے کے بعد گئی تھیں۔۔۔وہ مطمئن تو ہو گئیں تھیں لیکن دل کے وہم نہی جاتے تھے۔۔۔

زوہا کے سونے کے بعد زمن چائے کے مگ لیے لاؤنج میں آ گئی تھی۔۔۔ہاجرہ کو مگ پکڑاتے ہوئے اس نے ٹوکا۔۔۔

"اب کیا ہے امی۔۔۔کیوں سوچ سوچ کے ٹینشن لے رہی ہیں۔۔۔رباب آنٹی نے کہا ہے نا سب اچھا ہو گا۔۔۔بس اب فکر نا کریں اور آپریشن کی تیاری کریں۔۔۔ایک بار آپریشن ہو گیا تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا زوہا کو ریکور ہونے میں زیادہ وقت نہی لگے گا۔۔۔ابھی بھی اگر دیر نا کی گئی ہوتی تو زوہا کب کی چل پھر رہی ہوتی لیکن جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔۔۔اس کا آپریشن لیٹ ہونے میں کوئی تو بہتری ہو گی نا۔۔۔آپ یہ سوچیں کہ نا ہمارے پاس رقم ہے نا کوئی زیور جو بیچ کے زوہا کا علاج کرواتے، تو ایسے میں رباب آنٹی کے ذریعے آپ سمجھیں کہ بس کوئی غیبی مدد ہوئی ہے ہماری۔۔۔!"

صوفے سے کمر ٹیکے، پلکیں موند کے چائے کے سپ لیتی اور باتیں کرتی وہ ہاجرہ کو بے حد تھکی ہوئی لگی تھی۔۔۔محض ان کے ساتھ بیٹھ کے کچھ وقت تسلی دینے کی خاطر وہ چائے بھی بنا لائی تھی حالانکہ داڑھ نکلوانے کے بعد ڈاکٹر نے ہاجرہ کو گرم اشیاء سے پرہیز کا کہا تھا۔۔۔لیکن انہوں نے زمن کو یاد دہانی نہی کروائی تھی۔۔۔وہ مسلسل انہیں باتوں سے مطمئن کر رہی تھی جبکہ اس کی آنکھیں نیند سے اس قدر بوجھل تھیں کہ وہ زبردستی انہیں کھولے ہوئے تھی۔۔۔ہاجرہ نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا، بارہ بجنے والے تھے۔۔۔انہیں زمن پہ بے طرح ترس آیا۔۔۔صبح پانچ بجے کی اٹھی وہ آج سارا دن بھاگ دوڑ میں لگی رہی

تھی۔۔۔چھوٹی سی عمر میں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی تھی اسے۔۔۔اس سوچ نے ان کی آنکھیں نم کر دیں۔۔۔زمن کی نیند کی سرخی لیے خوبصورت مڑی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھ کے وہ ہمیشہ نگاہ چرالیا کرتی تھیں۔۔۔دل میں چٹکی لیتی یاد درد بھرالاوابن کے ابلنے لگتی تھی۔۔۔!

"اچھا اٹھواور جاؤ سو جاؤ۔۔۔چائے مت پیو پوری۔۔۔نیند چلی جائے گی۔۔۔اٹھو شاباش باقی سب صبح دیکھیں گے اب۔۔۔!"

اور وہ جیسے اسی انتظار میں تھی۔۔۔آدھا چائے سے بھرا مگ ٹیبل پہ رکھ کے وہ کھڑی ہو گئی۔۔۔ماں کا جھک کے گال چوما اور جوتی میں پیر پھنساتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔۔۔ہاجرہ نے ترحم سے اسے دیکھا اور پھر ٹیبل پر رکھے چائے کے مگوں پہ نگاہ مرکوز کی۔۔۔انہوں نے اپنے مگ سے گھونٹ بھی نہی بھرا تھا۔۔۔سوچیں اور فکریں بس بھنور کی طرح ان کے دماغ میں چکراتی تھیں۔۔۔کیسے کیسے وقت وہ گزار آئی تھیں لیکن آزمائشیں تمام ہونے کا نام ہی نہی لیتی تھیں۔۔۔ایک طویل مدت سے انہیں رات کو چین کی نیند سونا نصیب ہی نہی ہو سکا تھا کیونکہ راتیں انہیں ہولاتی تھیں۔۔۔رات کے سناٹے میں انہیں کسی کی چیخیں سنائی دیا کرتی تھیں اور وہ بیالیس سالہ خاتون ہو کے بچوں جیسا ڈر محسوس کرتی تھیں لیکن کہہ نہی پاتی تھیں۔۔۔کوئی کندھا ڈھونڈا کرتی تھیں جس پر سر رکھ کے وہ اپنے تمام خوف اور درد بھلا دیں۔۔۔لیکن اس کندھے کا خیال آتے ہی اذیتوں کے نئے در وا ہو جاتے تھے جن سے چھٹکارا پانے کو کوئی راہ فرار نا ملتا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن کمرے میں داخل ہوئی تو بیڈ دیکھ کے اس کا جوڑ جوڑ دہائیاں دینے لگا۔۔۔وہ اوندھی دھپ سے بیڈ پہ لیٹ گئی۔۔۔لیٹے لیٹے اس نے اپنی چپلیں ہلکے جھٹکے سے اتاریں اور پیر اوپر کر کے کروٹ لے لی۔۔۔بند ہوتی نگاہوں کے سامنے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہینڈ بیگ آگیا۔۔۔یکدم موبائل کا خیال آیا تو لیٹے لیٹے ہی ہاتھ گھسا کے اسے ٹٹولا اور نکال کے سوئچ آن کیا۔۔۔اگلے ہی پل اس کی نیند بھک سے اڑی تھی۔۔۔وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔۔۔یہ اس کا موبائل نہی تھا بلکہ سیم اسی ماڈل کا بلکل نیا

نکو ریل فون تھا جس میں اس کی سم ڈالی گئی تھی۔۔۔

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔۔۔ میرا تو سائیڈ سے کریک تھا۔۔۔" اس نے سوچا اور اپنے کانٹیکٹس دیکھنے لگی۔۔۔ سبھی موجود تھے۔۔۔ میسجز چیک کیے۔۔۔ واٹس ایپ دیکھا تو کئی چیٹس اپیئر نہیں ہو رہی تھیں۔۔۔ اس لمحے کسی انجان نمبر سے ایک میسج اس کی سکرین پہ نمودار ہوا۔۔۔ اس نے فوراً اسے اوپن کیا اور جلدی جلدی پڑھنے لگی۔۔۔

"آپ کا سیل مجھ سے گر کے ٹوٹ گیا تھا۔۔۔ مجبوراً نیا لینا پڑا۔۔۔ اسی ماڈل کا ہے۔۔۔ کچھ ڈیٹا اگر مسنگ ہو تو اس کے لیے معذرت لیکن اس میں میرا قصور نہیں۔۔۔ آپ کا پرانا موبائل بیکار ہو چکا تھا، واپسی کی حالت میں نہیں تھا۔۔۔ اگلی دفعہ احتیاط سے سیڑھیاں چڑھیے گا۔۔۔ ضروری نہیں ہر بار آپ کا ڈیٹا محفوظ ہاتھوں میں جائے۔۔۔ بائے۔۔۔ ڈاکٹر مہریار حیات"

اور زمن کی نیند اڑی سو اڑی ہاتھوں کے توتے بھی اڑ گئے تھے۔۔۔ وہ فوراً چوکڑی مار کے بیٹھی اور ہاتھ میں تھاما موبائل الٹ پلٹ کے دیکھنے لگی۔۔۔ اپنی عقل پہ ماتم کرنے لگی کہ موبائل لیتے وقت اسے اندازہ کیوں نا ہو سکا تھا کہ یہ اس کا نہیں ہے۔۔۔ اففففف! اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا اور یاد کرنے لگی کہ اس کے موبائل میں کیا کچھ سیو تھا۔۔۔ اس کی اور زوہا کی تصویریں۔۔۔ امی کی تصویریں۔۔۔ اس کے سکول فنکشنز کی پکچرز۔۔۔ اس کے سکول لیسن پلانز کی اپ ڈیٹس۔۔۔ اس کی واٹس ایپ چیٹس میں پرنسپل کے ساتھ ہوئی اس کی وہ چیٹ بھی موجود تھی جس میں وہ ان سے درخواست کر رہی تھی کہ اسے سینئر سیکشنز دے دیے جائیں اور اس کی سیلری بھی امپروو کی جائے۔۔۔ جواب میں پرنسپل کی آئیں بائیں شائیں۔۔۔ سبھی کچھ اس میں موجود تھا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔ کیا سوچتا ہو گا وہ ڈاکٹر کہ کیسے ترلے منتیں کر رہی ہے یہ پرنسپل کے۔۔۔ بے بسی، دکھ اور پھر طیش حواس ساتھ دینے لگے تو اسی لمحے اس نے اس میسج والے نمبر پہ کال بیک کر ڈالی۔۔۔ ایک بیل۔۔۔ دوسری اور پھر تیسری۔۔۔ مسلسل بیلوں کے باوجود کسی نے کال پک نہیں کی تھی۔۔۔ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔۔۔ کس سے بات کرے۔۔۔؟ کیا آنٹی رباب کو بتانا ٹھیک ہو گا۔۔۔؟ وہ کیا سوچیں گی کہ اس

نے پہلے کیوں نا انہی بتایا کہ وہ ڈاکٹر مہریار کو جانتی ہے بھلے ٹکراؤ ہی ہوا تھا۔۔۔کیا جواب دے گی وہ انہیں۔۔۔اور کیا پتا آنٹی، ڈاکٹر مہریار سے پوچھ گچھ کر ڈالیں تو وہ آگے سے بھتے سے اکھڑ جائے۔۔۔زوہا کا علاج سر پر کھڑا تھا۔۔۔وہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔۔۔اسے اپنا پرانا سیل فون ہر صورت واپس چاہیے تھا۔۔۔وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی سیل فون ایسے ہی پھینک نہی دیا کرتا بھلے سے وہ ٹوٹ ہی کیوں نا جائے۔۔۔تو ڈاکٹر مہریار نے پاس رکھ کے کرنا کیا تھا۔۔۔؟

"مجھے ہر صورت اپنا سیل واپس لینا ہے۔۔۔دیکھتی ہوں کیسے نہی دیتا ڈاکٹر کا بچہ۔۔۔آیا بڑا۔۔۔!"

وہ بڑبڑاتی رہی۔۔۔اس نے دوبارہ کال ملائی لیکن کسی نے پک نہی کی تو ہاتھ میں تھامے سیل کو تنفر سے دیکھا اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔۔۔اسی کروٹ کے بل لیٹ کے اسے دیکھے گئی۔۔۔عین اسی وقت دوبارہ سکرین بلنک ہوئی تو اس نے فوراً جھپٹ کے موبائل پکڑا۔۔۔ایک اور میسج آیا ہوا تھا۔۔۔

"بیکار میں کالز کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نا کریں۔۔۔میں انجان کالز اٹینڈ نہی کرتا۔۔۔شکریہ"

زمن کے جسم کا سارا خون سمٹ کے چہرے پہ آ گیا۔۔۔اسے شدید ہتک کا احساس ہوا تھا۔۔۔ایک پل کو دل کیا کہ اس سیل فون کو دیوار پہ دے مارے۔۔۔دو تین لمبے لمبے سانس لے کے خود کو پرسکون کیا اور لیٹ گئی۔۔۔

"میں بھی جب تک اپنا سیل تم سے واپس نہی لے لیتی تمہاری جان نہی چھوڑنے والی۔۔۔بھلے مجھے اس کا سرمہ بنا ہوا ہی کیوں نا ملے۔۔۔!"

وہ تصور میں ڈاکٹر مہریار حیات سے مخاطب ہوئی۔۔۔نیند میں جانے تک وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ کل کا سارا دن وہ کتنی بار اور کب کب ڈاکٹر مہریار کے نمبر پہ کال کرے گی۔۔۔!

☆......☆......☆

بائیں ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے مہریار کے ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ تھی لیکن چہرے کے تاثرات جامد اور سرد تھے۔۔۔اس نے ایک نظر قریب پڑے اپنے موبائل پہ ڈالی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے زمن کی کالز نے ادھم مچایا ہوا تھا۔۔۔وہ سکون

سے اپنے موبائل کی رنگ ٹون سنتا رہا تھا۔۔لیکن کال پک نہی کی تھی۔۔۔اسے کرنی بھی نہی تھی۔۔۔وہ لاابالی نوجوان تو تھا نہی کہ کسی کے بچگانہ سوالوں کے جواب دیتا۔۔۔

”میرا ایپل کہاں ہے۔۔۔آپ نے کیوں واپس نہی کیا۔۔ٹوٹا ہوا ہی دے دیں۔۔۔مجھے کیسے یقین ہو کہ ٹوٹ گیا ہے۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔“

ایسے ہی سوال ہوتے جو زمن اسے کال پک کرنے پہ پوچھتی۔۔۔اور ان سب کا جواب اس کے پاس تھا لیکن وہ زمن کو دینے کے لیے نہی تھا۔۔۔لہذا اس نے کالز پک نہی کی تھیں اور زمن کو دو ٹوک سا مسیج کر کے اس کا دماغ یقیناً تپا ڈالا تھا۔۔۔

اس نے مگ سے آخری چند گھونٹ ایک سانس میں ختم کیے اور اسے ٹیبل پہ رکھ کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسا کے سر کے پیچھے رکھیں اور کرسی سے کمر ٹیک کے سیدھا ہو بیٹھا۔۔۔نگاہیں لیپ ٹاپ کی روشن سکرین پہ جمی تھیں لیکن دماغ ماضی کی بلیک اینڈ وائٹ فلم چلا رہا تھا۔۔۔اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔۔۔سر میں ہلکی ہلکی درد کی ٹیسیں اب شدت اختیار کرنے لگی تھیں۔۔۔وہ جانتا تھا کہ اسے فوری طور پہ اپنا دھیان بٹانا ہو گا ورنہ رات بہت بھاری گزرنے والی تھی اس کے لیے۔۔۔اس نے ہاتھ بڑھا کے ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں سے زمن کا پرانا سیل فون نکالا۔۔۔اس کے اندر اب اس کی اپنی دوسری سم پڑی ہوئی تھی لیکن زمن کا وہ ڈیٹا جو فون کی میموری میں محفوظ تھا جوں کا توں موجود تھا۔۔۔اس نے گیلری اوپن کی۔۔۔تصویروں کا جہان وہاں آباد تھا۔۔۔زمن کی ایک تصویر اوپن کی۔۔۔کچھ پل اسے بغور دیکھا۔۔۔اسکی سفید اجلی رنگت اور کھڑی ناک اور مڑی پلکوں والی آنکھیں دیکھ کے اس کے ماتھے پہ نامحسوس سے بل پڑ گئے۔۔۔آنکھوں کے کنارے سکڑ گئے۔۔۔اس نے اسے زوم کیا تو تیکھی ناک میں موجود چھوٹے سے کالے نگ والی لونگ پہ نگاہ جم گئی۔۔۔چہرہ پہلے سے زیادہ سپاٹ ہو گیا۔۔۔اس نے اس پکچر کو کلوز کیا اور گیلری کو سکرول کرتا گیا۔۔۔ایک اور تصویر پہ اس کا انگوٹھا رکا اور اسے اوپن کر دیا۔۔۔اس تصویر میں درمیان میں ہاجرہ تھیں اور دونوں پہلوؤں میں زمن اور زوہا موجود تھیں۔۔۔وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھتا چلا گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

صبح سے "حیات مینشن" میں تر فلاٹ آیا ہوا تھا۔۔۔نانی پیاری نے سارے لڑکوں کی مت ماری ہوئی تھی۔۔۔گھر کے پنکھے دیواریں صاف کروا رہی تھیں وہ بھی گھوڑی پہ چڑھا کے۔۔۔زارون نے سب سے پہلے جالے اتارنے والا ڈنڈا اٹھایا تھا اور بنا کہے شروع ہو گیا تھا۔۔۔یہ نسبتا آسان کام تھا۔۔۔داور نے دیوراریں صاف کرنی تھیں۔۔۔یاور اس کی مدد کو موجود تھا کیونکہ وہ داور کو کبھی اکیلا چھوڑ ہی نہی سکتا تھا۔۔۔رہ گیا شہریار تو وہ نانی پیاری کے ہاتھ آیا تھا اور انہوں نے اسے گھوڑی پہ چڑھا کے پنکھے صاف کرنے پہ لگا دیا تھا۔۔۔ستر بار تو چڑھتے ہوئے ڈولا تھا۔۔۔جب چڑھ گیا تو سر ڈولنا شروع ہو گیا اور اب متلی کی شکایت ہو رہی تھی۔۔۔

"نانی پیاری مجھے اگر الٹی ہو گئی نا تو فجلو سے کہنا فضل ※ صاف کر دے پلیز۔۔۔!" شہریار گھوڑی پہ پیروں کے بل بیٹھا سینہ مسل رہا تھا۔۔۔نیچے گھوڑی کو تھامے فضلو نے نا سمجھی سے سر پہ خارش کی اور منہ اوپر کیے بولا

"لیکن آپ نے تو جی الٹی کا کہا۔۔۔آپ کا فضلہ منہ سے۔۔۔"

"بکواس بند کر فجلو۔۔۔ورنہ یہ سرف سے بھرا باؤل اوپر سے تیرے حلق میں انڈیلوں گا۔۔۔سارا دن منہ سے بلبلے نکلیں گے۔۔۔!" شہریار کو ویسے ہی اس پہ غصہ چڑھا ہوا تھا، فضلو نے مزید ہوا دے دی تھی۔۔۔

"نانی پیاری آپ اس سے کیوں نہی کرواتیں پنکھے صاف۔۔۔یہ کیا گھاس کھانے کے لیے رکھا ہوا ہے ہم نے۔۔۔نیچے کھڑا میری گھوڑی کو ہچکے (جھٹکے) دے رہا ہے بس۔۔۔"

"وزن تک (دیکھ) اس کا۔۔۔" نانی پیاری نے فضلو کو گھورتے شہریار کو گھر کا۔۔۔"اس سانڈ کو اوپر چڑھا دوں تا کہ نا گھوڑی بچے نا یہ کھوتا۔۔۔تو تو چھال مار کے صوفے پہ کود جائے گا، یہ اگر کودا تو صوفہ فرش میں وڑ (گھس) جائے گا۔۔۔اس لیے چپ کر کے پنکھے صاف کر۔۔۔ابھی اس ہٹلر کے کمرے کا بھی کرنا ہے۔۔۔!"

"نا با با نا۔۔۔" شہریار نے گیلا کپڑا سرف سے بھرے باؤل میں پھینکا۔۔۔اس کے چھینٹے نیچے کھڑے فضلو کے منہ پہ گرے۔۔۔"مہر لالہ کا پنکھا صاف کرنے سے بہتر ہے میں اسی سے لٹک کے جان

دے دوں۔۔۔ پچھلی بار کیا تھا نا تو اس فضلو نے پنکھا چلا دیا تھا۔۔۔ میں کسی مسکین تھڑے کے بلب کی طرح جھولتا رہ گیا تھا نانی پیاری۔۔۔ سوچیں گول گول گھومتا کیسا لگا ہوں گا۔۔۔!"

وہ مسلسل پنکھے کو ایک ہی جگہ سے صاف کرتا مبالغے سے کام لے رہا تھا۔۔۔ فضلو نے گھوڑی چھوڑ کے دونوں ہاتھ کمر پہ دھرے اور لڑنے کے انداز میں بولا۔۔۔

"ناشہری بھائی۔۔۔ میں نے کب پنکھا چلایا تھا۔۔۔ میں تو اندر تھا ہی نہی آپ کے ساتھ۔۔۔ مجھ غریب کی ہی پتلی گردن دکھتی ہے۔۔۔ جو چاہے الزام لگا دیتے ہیں۔۔۔!"

"کس نے کہا تیری گردن پتلی ہے فجلو۔۔۔ میرے جیسی چار نکل آئیں گی تیری ایک گردن سے۔۔۔" شہریار اپنے دھیان میں پنکھا صاف کر رہا تھا۔۔۔ وہ نہی جانتا تھا کہ فضلو نے گھوڑی چھوڑ رکھی ہے۔۔۔ جیسے ہی کپڑا سرف میں بھگونے کے لیے سر نیچے کیا، فضلو کو بے رحمی سے ایک فٹ کے فاصلے پہ کینہ توزی سے خود کو دیکھتا پایا۔۔۔ شہریار کے آگے سارا پنکھا چھت سمیت گھوم گیا۔۔۔

"فجلو گھوڑی پکڑ۔۔۔ پکڑ گرنے لگا ہوں میں۔۔۔ او فجلو۔۔۔ مروائے گا تو۔۔۔ پکڑ۔۔۔ میرا ایگزام ہے پرسوں ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ جاؤں گا کیا۔۔۔ پکڑ فجلو۔۔۔ کمینے۔۔۔ حیا کر۔۔۔!"

جب پتا نہی تھا تو سکون سے پنکھا صاف کر ڈالا تھا اب جب دیکھ لیا تھا کہ فضلو گھوڑی چھوڑ چکا ہے تو ٹانگیں خود بخود کانپ گئیں تھیں نتیجتاً گھوڑی بھی تھر تھرانے لگی۔۔۔ شہریار پیروں کے بل بیٹھ گیا۔۔۔ ہاتھ سرف کے باؤل کو لگا وہ لڑھک کے فضلو کے اوپر آ گرا۔۔۔ نانی پیاری اس افتاد کو دیکھ کے اونچی اونچی باقی تینوں کو آوازیں لگانے لگیں۔۔۔

"او یاسر، داور۔۔۔ او زارون۔۔۔ اندر آؤ منڈیو۔۔۔ شہری نوں پھڑو۔۔۔ ڈگن لگا جے تھلے۔۔۔!"

تینوں بوتل کے جن کی طرح ایک ساتھ ایک دوسرے کو پچھاڑتے اندر داخل ہوئے تھے اور سیدھا گھوڑی کے قریب فرش پہ گرے سرف والے پانی پہ بریک لگایا تھا اور تینوں ایک ساتھ فرش بوس ہو چکے تھے۔۔۔ ایک کی ٹانگیں آنکھیں ملتے فضلو کو لگیں اور وہ منہ کے بل انہی تینوں پہ آ رہا۔۔۔ باقی سب جھٹکے گھوڑی کو برداشت کرنے پڑے جس کے نتیجے میں وہ الٹ کے جا پڑی تھی۔۔۔ نانی پیاری حیران

پریشان سی سارے لاؤنج کی ابتر صورتحال دیکھ رہی تھیں۔۔۔ان کو ملال نہی جا رہا تھا کہ وہ کن کو شہریار کی مدد کے لیے آوازیں دے بیٹھیں۔۔۔وہ تینوں تو ملبے کی طرح فرش پہ بکھرے پڑے تھے جب کہ شہریار کب کا گھوڑی سے سیدھا صوفے پہ چھلانگ لگا کے خود کو محفوظ کر چکا تھا۔۔۔اب صوفے پہ ہی پیروں کے بل بیٹھا ان تینوں کو تاسف سے تک رہا تھا۔۔۔داور اور یاور کے چہرے کے تاثرات خاصے تکلیف دہ تھے کیونکہ ان دونوں کے اوپر فضلو جیسا تومند گرا ہوا تھا۔۔۔اور سب سے زیادہ بیچاری صورت زاردن کی تھی جو ایک ہاتھ میں عینک تھامے تھا اور دوسرے میں اس کی ٹوٹی ٹانگ۔۔۔نانی پیاری کا یہ پہلا تجربہ نہی تھا۔۔۔جب بھی ان چاروں کو کوئی کام کہا تھا آفتیں ایک ساتھ اتر آتی تھیں لیکن ایسی ابتری دیکھ کے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ تجربہ آخری تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

سنہری بیگم کا سنہری پاندان چھالیہ سے بھرا ہوا تھا پھر بھی وہ سروتے سے مزید کاٹ کاٹ کے دھرے جا رہی تھیں۔۔۔دھیان مسلسل شہزور اور چوہدری قاسم کی جانب لگا ہوا تھا۔۔۔ایک زمانہ بیت گیا تھا حویلی نے سکون کا ماحول نہی دیکھا تھا۔۔۔ہر وقت جیسے محاذ کھلے رہا کرتے۔۔۔شہزور کے جوان ہونے کے بعد باپ بیٹے میں بھی ٹھنتی چلی گئی۔۔۔کبھی خیال بھی نا آیا کہ دونوں یوں آمنے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔۔۔وہ بھی کس کے لیے۔۔۔ایک بدذات کے لیے۔۔۔وہی بدذات جس کی وجہ سے ان کی شادی شدہ زندگی ایک ان دیکھے جمود کا شکار رہی۔۔۔ہمیشہ وہی ہر طرف چھائی دکھائی دی۔۔۔ان کی راجدھانی میں ہمیشہ سے ایک گھس بیٹھیا رہا تھا اور وہ نا اسے کبھی پکڑ پائی تھیں نا اس پہ تسلط جما پائی تھیں کیونکہ اس کا وجود یہاں موجود نہی تھا لیکن اس کے وجود کی تاثیر ہمیشہ رہی تھی چہار باغ حویلی میں۔۔۔وہ جا کے بھی کبھی نہی گئی تھی۔۔۔سروتے پہ غصہ نکال نکال کے تھک گئیں تو اسے پٹخ ڈالا۔۔۔غصے سے ملازمہ کو آواز دی۔۔۔ایک منحنی سی درمیانی عمر کی عورت وہاں آن موجود ہوئی۔۔۔

"کہاں مری ہوئی ہو۔۔۔ایک سے دوسری آواز بھی کیوں دینی پڑتی ہے تم لوگو کو کم بختو۔۔۔ہزار بار کہا ہے کہ آس پاس رہا کرو۔۔۔پوری کھیپ ہے حویلی میں لیکن وقت پہ ایک بھی سامنے نہی

دکھتی۔۔۔اب سے جب تک میں یہاں بیٹھوں سایہ بنی کھڑی رہا کر۔۔۔آئی سمجھ!"

ملازمہ نے بیچارگی سے سر ہلا دیا۔۔۔ساری الجھن اور کثافت اس غریب پہ نکال کے سنہری بیگم نے چالیہ کے دو دانے منہ میں ڈالے اور اس ملازمہ سے بولیں۔۔۔

"جاؤ ذرا چپ کر کے دیکھ کے آ کہ باہر شہزور کا ڈرائیور موجود ہے یا نہی۔۔۔مجھے لگتا آج پھر نکل گیا صبح صبح یہ دوبارہ۔۔۔!"

ملازمہ سر ہلاتی وہاں سے جانے لگی تو اسی وقت نک سک سے تیار چوہدری شہزور راؤ وہاں داخل ہوا۔۔۔ایک کٹیلی نگاہ ملازمہ پہ ڈالی تو وہ ہوائیاں اڑاتا چہرہ لیے وہاں سے ہوا ہو گئی۔۔۔

"کیوں میری جاسوسی کرواتی ہو اماں۔۔۔کیا کر رہا ہے۔۔۔کدھر جا رہا ہے۔۔۔کس سے مل رہا ہے۔۔۔کیوں پتا کرواتی پھرتی ہو۔۔۔وہ بھی ایک ملازمہ سے۔۔۔!"

شہزور خفا سا ماں کے پاس بیٹھ گیا اور آگے سے پاندان گھسیٹ کے اپنے سامنے کیا۔۔۔دو دانے چھالیہ کے منہ میں ڈالنے کی نیت سے اٹھائے پر پھر واپس چھٹک دیے۔۔۔سنہری بیگم نے بھنویں اچکاتے اس کی حرکت ملاحظہ کی اور نرم لہجے میں گویا ہوئیں۔۔۔

"میرا لعل ہے تو۔۔۔میری جان کا ٹکڑا۔۔۔میرا کلیجہ سڑتا ہے جب سارا سارا دن تو تپتی سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا ہے شہزور۔۔۔نہی ملنے کی وہ تجھے۔۔۔سچ پوچھ تو میں چاہتی ہی نہی کہ وہ تجھے ملے۔۔۔بہت ہوئی خواری۔۔۔بس کر اب۔۔۔سیدھے سیدھے پسند بتا ورنہ کرنے لگی ہوں اپنی مرضی سے تیرا رشتہ۔۔۔!"

"او اماں۔۔۔" شہزور نے ہاتھ اٹھا کے ماں کو مزید بولنے سے روکا۔۔۔"مجھے جس سے جب شادی کروانی ہوگی نا کھڑے کھڑے دو بول پڑھوا کے لے آؤں گا۔۔۔تو مفت میں جان نا کھپا۔۔۔بس ولیمے کی تیاریاں کریں۔۔۔اور رہ گئی میری جاسوسی تو اماں میں جتنا چاہوں گو تجھے پتا لگواؤں گا اپنا ورنہ شہزور راؤ کو کوئی ڈھونڈ نہی سکتا۔۔۔کہاں جاتا ہوں کس سے ملتا ہوں وہ میں خبر دے دیتا ہوں تاکہ تیری تسلی رہے ورنہ تجھے لگتا ہے کہ یہ حویلی کے گرگے میری گرد بھی پا سکتے ہیں۔۔۔!"

"شرم کر جا کچھ شہزور۔۔۔اتنا زور آور نا بن۔۔۔تیرا باپ کوئی نہی سہہ رہا تجھے اور تو ہے کہ دماغ

کو ستویں آسمان تک پہنچا کے بیٹھا ہوا ہے۔۔۔تیری حرکتیں نا سدھریں نا پتر تو اپنے پیو کو جانتا ہے تُو منت نہی لگانا اس نے عاق کرتے۔۔۔!"

شہزور راؤ استہزائیہ ہنسا اور گاڑی کی چابی کو لا پرواہی سے کان میں پھیرنے لگا۔۔۔سنہری بیگم تاؤ کھا گئی۔۔۔

" ماں کا ادب ہی کر لیا کر پتر۔۔۔تیرے ہی کم آنا ہے۔۔۔تجھے کیا لگتا ہے ایسے کرنے سے تیرے پیو نے تیری بات مان لینی ہے۔۔۔اللہ جانے کس ڈھابے پہ بیٹھ کے پڑھا ہے تو نے۔۔۔ولایت بھیجا تھا کہ عقل سیکھ کے آئے گا۔۔۔پر پچھلی بھی گوروں کو دے آیا ہے تُو۔۔۔!"

" ہاہاہاہا!!!" شہزور کھل کے ہنسا کہ اس کے خوبصورت دانت دکھائی دینے لگے۔۔۔" ڈگری لی ہے اماں آئی ٹی کی۔۔۔سچی اور پکی۔۔۔لیکن اندر سے دیسی ہوں نا تو خو بو نہی بدلی۔۔۔اور فطرت تو بدل ہی نہی سکتی نا اماں۔۔۔میری چیز گمی ہے اسے ڈھونڈوں گا تو سہی نا میں، پھر چاہے اپنے ہاتھ سے توڑ کے پھینک دوں۔۔۔!"

آخری جملہ کہتے شہزور راؤ کا لہجہ پتھریلا ہو گیا تھا۔۔۔سنہری بیگم نے تاسف سے اسے دیکھا اور کچھ کہنا چاہا لیکن شہزور نے ہاتھ کھڑا کر کے خاموش کروا دیا۔۔۔

" جا رہا ہوں شہر۔۔۔ایک دو ضروری کام ہیں فیکٹری کے بھی۔۔۔ابا کو بتا دینا۔۔۔صرف سڑکیں نہی چھانتا کام بھی کرتا ہوں۔۔۔شام تک آ جاؤں گا واپس۔۔۔چلتا ہوں۔۔۔رب راکھا۔۔۔!"

بنا کوئی جواب سنے ایک ہاتھ سے چادر کا پلو جھٹکتا اور دوسرے سے مونچھوں کو تاؤ دیتا وہ نکلتا چلا گیا۔۔۔سنہری بیگم نے اس کی چوڑی پشت کو دیکھ کے زیر لب کچھ پڑھ کے اس پہ دم کیا اور واپس پاندان اپنے آگے گھسیٹ کے سروتہ اٹھا لیا۔۔۔کم از کم چھالیہ کترتے وہ تصور میں کسی کا وجود کترنے کا مزہ تو لیتیں تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

مہر یار کسلمندی سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔۔۔ایک ہاتھ سر کے اوپر سے مسلسل

بالوں میں پھر رہا تھا۔۔۔اور دوسرا ہاتھ میں تھامے موبائل کو سکرول کر رہا تھا۔۔۔رات بھی سوئی جاگی کیفیت میں کٹی تھی۔۔۔اب اٹھا تھا تو سر عجیب بھاری ہو رہا تھا۔۔۔کندھوں پہ جیسے بوجھ سا تھا۔۔۔اس نے کبھی سوچا بھی نا تھا کہ وہ کسی انجان لڑکی کی وجہ سے ایسی ٹینشن میں رات گزارے گا۔۔۔زندگی سے عورت ذات کا پنا اس نے کتنے سال ہوئے اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔۔۔اب اچانک سے یہ عورت اینٹری اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔۔۔اس نے زمن کے موبائل کا سارا ڈیٹا سیو کر لیا تھا۔۔۔کیوں کیا تھا اس کی وجہ ابھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔۔۔اتنا ضرور تھا کہ کبھی نا کبھی وہ اس کے کام آسکتا تھا یا شائد کبھی بھی نا آتا۔۔۔منتشر خیالی کے ساتھ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور بنا دیکھے ہاتھ سے ٹٹول کے برانڈڈ سگریٹ کی ڈبی باہر نکالی۔۔۔ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں پھنسایا اور دوبارہ لائٹر نکالنے کے لیے ہاتھ دراز میں گھسایا۔۔۔لائٹر جلا کے اس نے دوسرے ہاتھ کی اوٹ میں کیا اور سگریٹ سلگا لیا۔۔۔وہ سموکر نہیں تھا لیکن کبھی کبھار ذہنی دباؤ کے زیر اثر یا اعصابی تھکان کی وجہ سے ایک آدھ پی لیا کرتا تھا۔۔۔ایک لمبا کش لے کر اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔۔۔فی الحال وہ اپنے دماغ کو پرسکون کرنا چاہتا تھا۔۔۔ابھی اگلے لائحہ عمل کے لیے وہ بلکل تیار نہیں تھا نا ہی کوئی سرا ہاتھ آتا تھا۔۔۔سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اس نے زوہا کے آپریشن کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔۔۔یوں کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔۔۔زوہا کا آپریشن کوئی آسان ٹاسک نہیں تھا جبکہ خاصی تاخیر بھی ہو چکی تھی۔۔۔لیکن اسے ہر صورت اسے انجام دینا تھا۔۔۔اس کے لیے وہ ہر ممکن اقدامات سوچ چکا تھا۔۔۔جیسے بھی ہو اسے اس آپریشن کو کامیاب بنانا تھا۔۔۔زمن کے گھریلو حالات کا اندازہ ایسے ہی ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو جاتا اور قریب ہونے کے لیے اس کے پاس ایک مستند ذریعہ موجود تھا۔۔۔وہ ابھی یہی سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پہ کال ہوئی۔۔۔اسنے ایک ہاتھ سے دوسرے میں سگریٹ منتقل کیا اور نمبر دیکھا۔۔۔زمن کال کر رہی تھی۔۔۔ایک نگاہ دیوار گیر گھڑی پہ ڈالی۔۔۔صبح کے پونے آٹھ ہو رہے تھے۔۔۔طویل سانس بھر کے اس نے کال اٹینڈ کی تو آگے سے زمن کی تیز تیز لہجے میں بولتی آواز سنائی دی۔۔۔

"مجھے میرا موبائل واپس دیں۔۔۔ جیسا بھی ہے جو بھی اس کی حالت ہے مجھے واپس کر دیں۔۔۔آپ کا کوئی حق نہی بنتا کہ میرا موبائل رکھ لیں۔۔۔ واپس کریں۔۔۔ بتائیں کب آؤں لینے۔۔۔!"

"میرے حق کی بات دوبارہ نا کیجیے گا مس زمن کیونکہ میں پرائی چیز پہ استحقاق کبھی نہی جماتا۔۔۔ باقی رہ گئی آپ کے سیل کی واپسی کی بات تو وہ نہی مل سکتا کیونکہ اس کا نام ونشان بھی مٹ چکا سمجھیے۔۔۔ اور جب آپ کا دل کرے آپ آئیے۔۔۔ گپ شپ کیجیے گا سکون سے۔۔۔!" وہ متوازن لہجے اور انداز میں کہتا زمن کا دماغ بھک سے اڑا کر کال بند کر گیا تھا۔۔۔ دوسری طرف زمن کو اس کی گفتگو کا پہلا جملہ کھٹک گیا تھا۔۔۔

"میں پرائی چیز پہ استحقاق کبھی نہی جماتا۔۔۔!

تو کیا یہ میرا سیل فون پرایا نہی تھا کیا؟ عجیب بد دماغ انسان ہے یہ۔۔۔ وہ گومگوں کی کیفیت میں تھی۔۔۔ کچھ سجھائی نہی دے رہا تھا کہ آخر وہ ڈاکٹر مہریار کا کیا حشر کر دے۔۔۔ اسے سمجھنا دشوار تھا کہ اسے ہتک زیادہ محسوس ہو رہی تھی یا بے بسی۔۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری حاکم کی لینڈ کروزر حویلی کے گیٹ کے آگے رکی تھی۔۔۔ ٹائروں کے چرچرانے سے دھول اڑی تھی جس سے ملازم متوجہ ہوتے فوراً بھاگے آئے تھے۔۔۔ چوہدری حیات راؤ صحن میں گاؤں کے مردوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور حالات حاضرہ پہ تبصرے جاری تھے۔۔۔ چوہدری حاکم کو اندر آتے دیکھا تو سبھی مرد حضرات اٹھ کھڑے ہوئے سوائے حیات راؤ کے جو چوہدری حاکم کے بلکل قریب آنے پہ خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔۔۔ چوہدری حاکم کسی زمانے میں ان کے قریبی دوستوں میں شمار ہوا کرتے تھے لیکن حالات نے یا مصلحتوں نے دونوں میں تکلف کی دیوار حائل کر دی تھی۔۔۔ چوہدری حیات راؤ کو چوہدری حاکم کے اصولوں اور طور طریقوں پہ شروع سے اعتراض ہوتا تھا لیکن کبھی بدمزگی نہی ہوئی تھی۔۔۔ پھر حالات نے چکر کھایا اور شہاب الدین راؤ بستر سے جا لگے۔۔۔ تمام

اختیارات حیات راؤ کے ہاتھ میں آئے تو انہوں نے اپنے طریقے وضع کیے۔۔۔اپنے اصول وضوابط کے مطابق انتظام سنبھالا اور اس سے بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہوا اور کئی خیر اندیشوں نے خیر مقدم کیا۔۔۔چوہدری حاکم ان لوگوں میں سے تھے جن کو چوہدری حیات راؤ کے بہت سے اقدامات سے اختلاف پیدا ہوا اور وہ ہوتے ہوتے ایک خلیج کی صورت اختیار کر گیا۔۔۔دونوں کے تعلقات میں وقت کے سرکتے سرد مہری آتی چلی گئی۔۔۔چوہدری شہاب الدین نے شروع سے چاہا تھا کہ مہریار کی شادی چوہدری حاکم کی چھوٹی لڑکی سے ہو لیکن وہ مہریار کے مزاج سے خائف بھی رہا کرتے تھے۔۔۔انہوں نے سوچا تھا وقت آنے پہ یہ معاملہ اٹھالیں گے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔۔۔چوہدری شہاب الدین فالج کے باعث لاچار ہو گئے اور مہریار کی زندگی اس دوران اتار چڑھاؤ کا شکار رہی۔۔۔یوں یہ معاملہ اٹھنے سے پہلے ہی دبتا چلا گیا۔۔۔یہ وہ وقت تھا جب چوہدری شہاب الدین معمولی سی جنبش بھی نہی کر پاتے تھے۔۔۔زبان تک ہلا نہی سکتے تھے۔۔۔لایعنی آوازیں نکالتے تھے۔۔۔سب ان کی بات اندازے سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔لیکن اب وہ بھلے مکمل طور پر صحتیاب نہی ہوئے تھے پر اپنی بات سمجھانے پہ قادر تھے۔۔۔لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے سہی مگر ادا کرتے تھے۔۔۔اس لیے پرانا جوش و دبدبہ اکثر جھلک دکھلا جاتا تھا۔۔۔اسی دبدبے کے زیر اثر انہوں نے نا جانے کس وقت کسی ملازم کے ہاتھوں چوہدری حاکم کو پیغام بجھوا دیا تھا اور چوہدری حاکم نے بنا تاخیر کے عرصے بعد حویلی میں قدم رکھ دیا تھا۔۔۔چوہدری حیات راؤ کو والد کی اس حرکت پہ جی ہی جی میں افسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ اپنی اولاد کو جانتے تھے۔۔۔مہریار کو معلوم ہوتا تو وہ اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔۔۔اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اس معاملے کی بھنک بھی وہ مہریار کے کانوں تک پہنچنے نہی دیں گے۔۔۔چوہدری حاکم کو اپنی معیت میں چوہدری شہاب الدین راؤ کے کمرے تک لے جاتے وہ طے کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

”حیات مینشن“ کے کچن میں تماشا لگا ہوا تھا۔۔۔اتنا بڑا کچن تھا لیکن بقول نانی پیاری کے جب چار ڈشکرے اندر گھس جاتے تھے تو اکھاڑہ بن جایا کرتا تھا۔۔۔فضلو کا دل کرتا تھا چاروں کو باری باری

توے پہ پھینک دے لیکن بس دل کرتا تھا۔۔۔ ورنہ بینڈ کاوہ خود جاتا تھا۔۔۔ اسے کچن سمیٹنا اس قدر مشکل نہی لگا کرتا تھا جتنا ان چاروں کے اندر گھسنے کے بعد انہیں سنبھالنا۔۔۔ جیسے اچانک سے خواتین کے ٹولے میں کوئی کاکروچ اچھال دے تو جو حالت ان کی ہوا کرتی ہے ہو بہو فضلو کی کیفیت وہی ہوتی تھی۔۔۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جیسے بھی ہو چاروں کے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے لوٹنے سے پہلے کھانا تیار کر کے رکھ دے۔۔۔ کیونکہ ذرا سی دیر سویر ہوتی تو وہ چاروں ایک ساتھ دھاوا بولا کرتے تھے اور پھر کچن میں کبڈی ہوا کرتی تھی۔۔۔ کچن کچن نہی رہتا تھا اور فضلو زبردستی کا لال کپڑا تھامے وہ مریل انسان بن جاتا تھا جو بے تحتے بیلوں کے آگے پھینک دیا جائے۔۔۔!

آدھا گھنٹہ پہلے نانی پیاری نے اس سے ڈھیروں مٹر چھلوائے تھے۔۔۔ گوبھی کٹوائی تھی۔۔۔ کریلے چھلوائے تھے اور جب وہ خود باسی دھنیے جیسا ہو گیا تو نانی پیاری کمر سیدھی کرنے لاؤنج میں جا کے لیٹ گئیں اور فضلو کو گھڑی دیکھ کے ہول پڑ گیا۔۔۔ محض آدھا گھنٹہ بچا تھا ان طوفانوں کے آنے میں جن کے بعد فضلو کے چراغ گل ہو جانے تھے۔۔۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا کے اس کوشش میں تھا کہ کیسے بھی ہو سالن تیار ہو جائے۔۔۔ لیکن ابھی آٹا بھی گوندھنا تھا۔۔۔ اس کا دل کیا کہ وہ کچن کو تالا لگائے اور سوٹا لے کے کھڑا ہو جائے۔۔۔ نا کوئی آئے نا کوئی جائے لیکن یہ سب وہ سوچ سکتا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر گزری تو خان ہانپتا ہوا پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔۔۔ فضلو کے ڈوئی چلاتے ہاتھ تھمے اور ہونق انداز میں اسے دیکھا۔۔۔

”آ گیا۔۔۔ چاروں پہنچنے والا بس۔۔۔ یہ نکڑ پہ ام نے ان چاروں کو دیکا اے۔۔۔ آج گاڑی میں نہی آیا تو وہیں سے لڑتا آ رہا سب کا سب۔۔۔ ایک دوسرے کو نیچے سے پتر (پتھر) اٹھا اٹھا کے مار را۔۔۔ گر (گھر) تک جو بگیر سر پھٹے چاروں پہنچ گیا تو گنیمت ہوئے گا۔۔۔!“

اور فضلو کو جیسے پتنگے لگ گئے۔۔۔ پرات میں فٹافٹ آٹا نکالا۔۔۔ چولہا دھیمی آنچ پہ کیا اور سوچا کہ پہلے آٹا گوندھ کے رکھ لے لیکن ابھی کولے سے پانی ٹھیک سے آٹے میں ڈال بھی نا پایا تھا کہ چاروں ایک ساتھ کچن میں شور مچاتے وارد ہوئے۔۔۔ خان نے بلکل کاؤنٹر کے ساتھ جڑ کے جگہ چھوڑی۔۔۔

”فجلو۔۔۔ دماغ بھٹی بنا ہوا۔۔۔ کھانا دے دے ورنہ ان تینوں کا کلیجہ کھا جاؤں گا آج۔۔۔!“

شہریار نے اپنا یونی کا بیگ یاور کے منہ پہ اچھالتے ہوئے کہا جسے اس نے کیچ کر کے آگے خان کو اچھال دیا۔۔۔خان نے فوراً بوجھ کے سہولت سے کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔۔۔

" ہمارا کلیجہ مفت کا ہے کیا جو تم نگل لو گے سستے میں۔۔۔ایک تو سارا رستہ تمہاری بک بک سنی اب کلیجہ بھی ہم ہی کھلائیں۔۔۔کمال نہی ہو گیا۔۔۔!" یاور آستینیں کھول کے اوپر چڑھاتے ہوئے شہریار پہ غرایا اور آٹا گوندھتے فضلو کے بلکل سامنے سٹول پہ ٹک گیا۔۔۔

" کلیجے کی جگہ پھیپھڑا بہتر ہوتا ہے۔۔۔سنا ہے وہ زیادہ نیوٹریشس ہوتا ہے۔۔۔!" زارون نے عینک کو ناک پہ انگلی کی مدد سے ٹکاتے ہوئے کہہ کے ہونٹ سکوڑے۔۔۔

باقی تینوں نے روایتی سلوموشن تالیوں سی خراجِ تحسین پیش کیا۔۔۔اس بار خان کی تالی بھی شامل تھی سو زارون خوش ہو گیا۔۔۔فضلو نے چاروں کو باتوں میں لگا دیکھا تو دوبارہ آٹے کی جانب متوجہ ہوا۔۔۔لیکن داور نے اچانک سے اس کے کندھے کے پیچھے سے اسے پکارا۔۔۔

" فجلو تمہارا تو آٹا بھی گوندھنے والا ہے ابھی۔۔۔!" فضلو بوکھلایا تو ہاتھوں کو جھٹکا لگنے سے آٹا اچھل کے بلکل سامنے بیٹھے یاور کے اوپر گرا۔۔۔اس نے کینہ توز نگاہوں سے ایک بار خود کے گریبان میں جھانکا اور دوسری بار فضلو اور داور کو دیکھا۔۔۔داور اور زارون ہنسنے لگے کیونکہ یاور نے نئی نئی شیو بڑھائی تھی تو آٹا اس کی داڑھی کے بالوں میں لگا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔

" ویسے یاور تیری جوانی تو تجھ پہ آنی نہی تو ایسا کر بوڑھا ہو جا۔۔۔اس حالت میں انسان لگتا ہے۔۔۔!" زارون نے برجستہ کہہ کے اپنے بدلے برابر کرنے کی کوشش کی اور اسے ایسی کوشش مہنگی پڑا کرتی تھی۔۔۔یاور اٹھا اور فضلو کے آگے دھری پرات سے اوک میں آٹا بھرا جو نیم گیلا تھا اور زارون کا نشانہ لیا۔۔۔زارون کی عینک پھسلنے کو تھی، وہ عین وقت پہ جھکا اور آٹا نیم وا آنکھوں سے اکتائے بیٹھے شہریار کے منہ پہ چھپاکے سے لگا۔۔۔اس دوران فضلو بے بسی سے پرات کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔شہریار کی آنکھیں چوپٹ کھلیں اور پھر صرف فضلو کے چراغ ہی نہی بجھ کے گل ہو گئے۔۔۔زیادہ نہی بس پانچ دس منٹ ہی لگے تھے اور ہر شے آٹے سے سنی ہوئی تھی۔۔۔کچن میں کبڈی

کا میدان سج گیا تھا۔۔۔لکاریں گونجنے لگیں۔۔۔باری باری چاروں اپنی رانوں پہ ہاتھ مارتے اور پرات سے آٹا اٹھا اٹھا کے ایک دوسرے کا نشانہ لیتے۔۔۔جس کا لگ جاتا وہ ہاتھ کی مٹھی بنا کے اس کی پشت منہ سے لگاتا اور اونچی آواز میں لکارتا۔۔۔فضلو بے دم ہو کے خود بھی فرش پہ پھسکڑا مارے بیٹھ چکا تھا۔۔۔اسے معلوم تھا کہ اب ان چاروں نے رکنا تو نہی تھا اس لیے جو درگت کچن کی بننی تھی وہ اسے سمیٹنی ہی تھی۔۔۔خان کاؤنٹر کے اوپر چڑھ کے ریفری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔۔۔اسے یہ میچ دیکھنے کا بہت لطف آرہا تھا کیونکہ پہلی بار لائیو دیکھ رہا تھا جسے اب تک فضلو کی زبانی سنتا آیا تھا۔۔۔

"شیری بابا۔۔۔یہ ادرسے پکڑو۔۔۔پیچھے سے آٹھ ڈالو بابا پیچھے سے۔۔۔تم کو تو کیلنا ہی نئ آتا۔۔۔زارون بابا تم امارا ٹانگ کس کے پکڑلو ورنہ تم کو سب سے زادہ گھسیٹ رے یہ۔۔۔توڑی دیر میں تمارا کوئی ہڈی وڈی آتھ میں ہوئے گا ان کے۔۔۔!"

وہ سب ایک پل کو رک کے اسے دیکھتے تھے۔۔۔بات سمجھ میں آتی تو اثبات میں سر ہلا دیتے ورنہ دوبارہ پل پڑتے۔۔۔گھمسان کا رن پڑا تھا جب اچانک زوردار دھاڑ نے ان سب کو ساکت کر دیا۔۔۔مہریار کچن کے دروازے میں کھڑا تھا اور کچن کی حالت اس پر بجلی بن کے گری تھی۔۔۔شہریار ،داور اور یاور تو فورا ایک ساتھ الرٹ ہوئے تھے لیکن زارون جس کی عینک آٹے میں پوری طرح لتھڑی ہوئی تھی اسے ٹھیک سے کچھ دکھائی نہی دے رہا تھا۔۔۔وہ ہاتھ سے آنکھیں ملتا اٹھا تھا۔۔۔اور جب تک کچھ سمجھ آتا۔۔۔ہاتھ سے پرات ٹٹولی اور بچا کھچا آٹا اٹھایا۔۔۔سامنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔۔۔پھر لکار کے بولا۔۔۔

"یہ رہا میرا آخری وار۔۔۔تم لوگو کو کیا لگا زارون ایسے ہی جانے دے گا۔۔۔یہ رہی ایک لوہار کی۔۔۔تم سب سناروں کے مقابلے میں۔۔۔!"

اور وہ لوہار کی چوٹ سیدھی پیچھے کھڑے مہریار کے کندھے اور گردن سے ٹکرائی تھی۔۔۔تینوں کے سانس خشک ہوئے اور زارون فخر سے آنکھیں مسلتا منہ اونچا کیے سامنے دیکھ رہا تھا۔۔۔خان نے ہاتھ جھاڑ کے فضلو کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔۔۔باقی تینوں بھی یکے بعد دیگرے کھسکنے کی کوشش میں تھے

لیکن زوردار دھاڑ نے وہیں کا وہیں جما ڈالا۔۔۔

"تم چاروں ابھی کے ابھی میرے کمرے میں آؤ۔۔۔ابھی۔۔۔!"

اور زارون تب تک تھرتھراتے ہاتھوں سے عینک کو سنک پہ ٹونٹی کے نیچے دھو چکا تھا۔۔۔ آنکھوں پہ لگاتے ہی تارے ناچ گئے۔۔۔سب کچھ سیاق و سباق کے ساتھ واضح ہوگیا۔۔۔وہ تینوں اسے خون آشام نگاہوں سے تکتے کسی بھی وقت اس تک رسائی حاصل کر سکتے تھے لہٰذا زارون نے بے بسی سے عینک واپس اتار کے کاؤنٹر پہ رکھی اور دونوں بازو سر کے گرد لپیٹ کے پیروں کے بل فرش پہ بیٹھ گیا تھا۔۔۔وہ پٹنے کے لیے مکمل تیار تھا۔۔۔مہریار کے کمرے میں ہونے والی "دعوت" کا اسٹارٹر اسے یہیں مل چلا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

یہ ایک بہت بڑا سا آڈیٹوریم ہال تھا۔۔۔جسے خصوصی طور پہ آج کی تقریب کے لیے تیار کروایا گیا تھا۔۔۔اونچے سٹیج پہ ایک ترتیب سے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔۔۔ایکطرف روسٹرم رکھا تھا جہاں دو مائیکس فٹ تھے۔۔۔پورا ہال کرسیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جو فی الحال خالی تھیں۔۔۔محض انتظامیہ کے افراد دکھائی دیتے تھے جو تقریب شروع ہونے سے پہلے کے آخری انتظامات میں مصروف تھے۔۔۔کچھ وقت جاتا تھا کہ ہال میں گہما گہمی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے خالی نشستیں پُر ہونے لگیں۔۔۔یہ ایک سیمینار کی تقریب تھی جس میں سکول کالج اور یونیورسٹیز کے اساتذہ اور طلباء شرکت کر رہے تھے۔۔۔سیمینار کا موضوع بھی تعلیم کے حوالے سے تھا لہٰذا مہمانانِ خصوصی کی نشستوں پہ وہ افراد براجمان ہوتے جن کا تعلق کسی نا کسی طرح سے تعلیم کے شعبے سے جڑا تھا یا پھر ٹرسٹیز کا پینل۔۔۔!

اور جس وقت سٹیج پہ سجی کرسیوں پُر ہوئیں تو انہی میں سے ایک پہ شہزور راؤ تنی ہوئی گردن اور بھنچے جبڑے لیے موجود تھا۔۔۔وہ خوبرو تھا لیکن غضب کا بے نیاز۔۔۔لوگوں کو وہ مغرور لگتا تھا۔۔۔اس وقت بھی سٹیج کی رونق اسی کا چہرہ تھا۔۔۔ہال میں موجود صنفِ نازک کے دلوں کو دھڑکا رہا تھا۔۔۔ایک عجیب سی کشش اور کٹھورپن اس کی شخصیت پہ نصب تھا۔۔۔سبھی کی نگاہوں اور ستائشی اشاروں سے لاپرواہ وہ

کرسی کی ہتھیوں پہ ایک بازو پھیلائے اور دوسرا کھڑا کیے انگوٹھے سے دونوں بھنوں کے بیچ مسلسل نرمی سے لکیر کھینچ رہا تھا۔۔۔ یہ اس کا بے اختیاری عمل تھا۔۔۔ دھیان کی ڈور کھنچ کے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی اور نگاہیں ہال میں بیٹھے حاضرین کے چہروں کو بے دھیانی سے ٹٹول رہی تھیں۔۔۔ روسٹرم پہ موجود ایک ادھیڑ عمر خاتون ایجنڈے پہ بات کر رہی تھیں۔۔۔ یہ تقریب بور ترین تقریب تھی لیکن وہ پھر بھی یہاں تھا کیونکہ اسے کسی کی تلاش کھینچ لاتی تھی۔۔۔ ہر جگہ وہ بصد شوق چلا جایا کرتا تھا کہ شائد وہ اسے دکھائی دے جائے۔۔۔ یہ معمول اس کا عرصے سے تھا اور آج بلآخر قسمت اس پہ مہربان ہو گئی تھی۔۔۔ اس کی نگاہوں کے عین سامنے وہ ہال کی ڈھلان اترتی سر جھکائے آگے کی نشستوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔۔۔ سیاہ سادی قمیض جس پہ محض چاندی کے بٹن لگا کے اسے مزین کیا گیا تھا اور سیاہ ہی چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ کھسہ۔۔۔ اس کے ساتھ سفید دوپٹہ۔۔۔ وہ حسین نہی حسین تر لگ رہی تھی۔۔۔ ہال میں موجود کئی افراد کی نگاہوں نے اس کا پیچھا کیا تھا جن سے بے نیاز وہ اپنی ہی رو میں چلتی آ رہی تھی۔۔۔ شہزور ٹھٹکا۔۔۔ اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔۔۔ کتنے پل آنکھوں کو یقین نہی آیا تھا کہ آیا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا جس کی تلاش میں ایک مدت سے خوار ہو رہا ہے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ جذباتی ہو کے اٹھ کھڑا ہوتا فوری طور پہ خود کو کنٹرول کرتا لمبے لمبے سانس لینے لگا۔۔۔ وہ اس لڑکی کے نشست پہ بیٹھنے کا منتظر تھا کیونکہ اس طرح سے وہ اس تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتا بصورت دیگر ہڑبونگ مچتی اور وہ بھاگ جاتی لیکن قسمت کی یاوری بس یہیں تک تھی۔۔۔ اس لڑکی نے نشست پہ بیٹھنے سے پہلے نگاہ اٹھائی تھی اور جیسے پل بھر کو پتھر ہو گئی تھی۔۔۔ دوسرا پل اس نے برباد نہی کیا تھا بلکہ بنا سانس لیے پلٹ کے ہال کے داخلی دروازے کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔۔۔ شہزور راؤ نے کرسی کی ہتھی پہ مکا مارا اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔ ہال میں ہلچل مچی۔۔۔ لوگ اپنی جگہوں پہ بے چین ہوئے اور کچھ خواتین کی آواز اونچی ہو کے سارے میں پھیل گئی۔۔۔ شہزور کے گارڈز جو دروازے پہ موجود تھے فوراً الرٹ پوزیشن میں آ گئے۔۔۔ خواتین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہوئیں اور کچھ ڈر کے مارے اپنی نشستیں چھوڑتی باہر کی جانب لپکیں تو قدرتی طور پہ شہزور کے رستے میں حائل ہو گئیں۔۔۔ وہ انہیں درشتی سے پیچھے ہٹنے کا کہتا حتی

الامکان تیزی سے باہر کو لپک رہا تھا لیکن اس ہڑبونگ اور ہلچل نے اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔۔۔اور جس وقت وہ ہال سے باہر آیا تو وہاں بس اس کے گارڈز کھڑے تھے۔۔۔اس لڑکی کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہی تھا۔۔۔شہزور راؤ نے مٹھیاں بھینچ لیں اور پوری قوت سے چہرہ اونچا کیے دھاڑا۔۔۔یہاں تک کہ اس کی گردن کی نسیں پھول کے اس کے طیش کا پتا دیتی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری شہاب الدین راؤ کے کشادہ اور وسیع کمرے میں بیزار کن ماحول تھا۔۔۔چوہدری حاکم ان کے داہنی طرف رکھے صوفے پہ ٹانگ چڑھائے پورے کروفر سے بیٹھے تھے۔۔۔جب کہ کاؤچ پہ حیات راؤ اور کشور بی بی بیٹھی تھیں۔۔۔حیات راؤ کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔۔۔وہ والد کی اس حرکت پہ متاسف تھے کیونکہ انہیں اندازہ نہی تھا کہ اگر مہریار کو اس سب کے بارے پتا چلا تو وہ کیا قیامت اٹھائے گا۔۔۔پہلے ہی محض انہی کی وجہ سے وہ گاؤں بہت کم آتا تھا کچھ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔۔۔

"ببیبو ہت وققققت بعد آنا ہوااا اہے تتتتت۔۔۔تمہارا حاکم۔۔۔!"

چوہدری شہاب الدین نے چوہدری حاکم سے استفسار کیا تو چوہدری حاکم کی گردن میں تناؤ بڑھ گیا۔۔۔

"بس جی چوہدری صاحب۔۔۔زمینوں کے رولے ہی نہی مکتے۔۔۔جب سے پتر ساتھ رلے ہیں میرے سمجھیں جیسے زمینوں نے ہمارے کھاتوں کا منہ دیکھ لیا ہے۔۔۔ہر دوسرے دن تو کوئی زمین خرید لیتے ہیں۔۔۔اب تو جی مجھے لگتا ہے سرگی ویلے شروع کروں پھیرا تو اگلی سرگی پہ بھی زمین نا مکے۔۔۔پتر ہوں تو ایسے ہوں نا جی۔۔۔ایسے پتروں کو کہہ گئے ہیں وڈے وڈیرے باواں۔۔۔(بازو)۔۔!" چوہدری حاکم پُرغرور لہجے میں کہہ کر اپنی بات پہ خود ہی ہنسے تھے۔۔۔انہوں نے حیات راؤ پہ چوٹ کی تھی لیکن حیات راؤ مسکراتے رہے تھے۔۔۔کشور بی بی کے چہرے پہ البتہ غصیلے سے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔۔۔چوہدری شہاب الدین نے لیٹے لیٹے چہرہ موڑ کر بیٹے کو استہزائیہ دیکھا اور پھر چوہدری حاکم سے مخاطب ہوئے۔۔۔

"تتتتت۔۔۔تم ٹھٹھٹھ۔۔۔ٹھیک کہتے ہووو۔۔۔پپپپ۔۔۔پتر ہونے کا کیا ففف۔۔۔فائدہ

جب زمین ہی نابیب ۔۔۔ مرڑھے ۔۔۔ میں نے آآآآ ۔۔۔ آج تتتت ۔۔۔ تبھی اس لیے بیب ۔۔۔ بلایا تھا تا کہ مممم ۔۔۔ میں تمسے مممم ۔۔۔ مہریار کے ررررر ۔۔۔ رشتے کی بات ککلک ۔۔۔ کر سکوں ۔۔۔ تتتت ۔۔۔ تمہاری دددد ۔۔۔ دھی رانی سنا ہے بیب ۔۔۔ بارہ پپپپ ۔۔۔ پڑھ بیٹھی ہے ۔۔۔؟" چوہدری شہاب الدین نے بدقت اپنی بات پوری کر کے چوہدری حاکم کو دیکھا جو مزید اکڑ کے ساتھ آگے ہوتے ہوئے جواب دینے لگے ۔۔۔

"جی چوہدری جی ۔۔۔ بارہ کر لی ہیں جی پوری ۔۔۔ اور ہر طرف جی اس کی لائقی کے چرچے ہیں ۔۔۔ بس جی اس سیال (سردی) میں ویاہ کر دینا ہے اس کا ۔۔۔ دھیاں جتنی جلدی گھروں کی ہو جائیں چنگی گل ہوتی ہے جی ۔۔۔!"

"تتتت ۔۔۔ تو پھر مممم ۔۔۔ میں تجھ سے تتتت ۔۔۔ تیری دھی کا ررررر ۔۔۔ رشتہ اپنے پپپپ ۔۔۔ پوتے مہر کے لیے ۔۔۔ مانگتا ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ بلکل نہی اباجی ۔۔۔ مہر کا رشتہ ایسے طے نہی کیا جا سکتا ۔۔۔ نا میں اس کی اجازت دوں گا ۔۔۔!"

چوہدری حیات راؤ اچانک سے بیچ میں بولے تھے ۔۔۔ انہوں نے شہاب الدین راؤ کو بات مکمل نہی کرنے دی تھی ۔۔۔ چوہدری حاکم کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی جبکہ چوہدری شہاب الدین کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا ۔۔۔ بیٹے نے اخیر جرات کا مظاہرہ کیا تھا اور یہ ان کے لیے خاصا اچنبھے کا باعث تھا ۔۔۔ حیات راؤ والد کی بات کو کبھی اسطرح کھل کے اب بھی رد نہی کرتے تھے لیکن آج معاملہ مہریار کا تھا ۔۔۔ وہ مہریار جس کی نگاہوں میں ایک ان دیکھی نفرت ڈیرا ڈالے رکھتی تھی ۔۔۔ ایک ان سنا راز ہلکورے لیا کرتا تھا اور یہ تاثرات تب ابھر کے سامنے آتے تھے جب وہ اپنے دادا کے روبرو ہوا کرتا ۔۔۔

"چوہدری جی ۔۔۔ مجھے بلا کے بے عزت کرنے کا کیا مطلب سمجھوں میں ۔۔۔ آپ نے کامے کے ہتھ پیغام بھیجا تھا مجھے تو ہی میں آیا ۔۔۔ دھی والا ہوں زلیل ہونا منظور نہی مجھے ۔۔۔ آپ کی چلتی نہی تھی تو سنائی کیوں ۔۔۔!"

چوہدری حاکم تنفر اور طیش کی کیفیت چہرے پہ لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اس معاملے کو ہلکے میں نہی لیں گے۔۔۔جیسے وہ دشمنی کی شروعات کا سراڈھونڈ تے ہوں اور انہی مل گیا ہو۔۔۔

"چلتی ہے حاکم۔۔۔اباجی کی ابھی بھی چلتی ہے۔۔۔" حیات راؤ ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوے۔۔۔ان کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔۔۔کشوری بی بھی گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔۔۔نا محسوس انداز میں شوہر کا بازو کہنی سے دبایا لیکن حیات راؤ کو غصہ آچکا تھا اور اس کا اظہار بروقت وہ لازمی سمجھتے تھے۔۔۔"اباجی کی مرضی ہی چلی ہے آج تک اور جب تک وہ حیات ہیں ان کی مرضی کو مقدم سمجھا جاے گا۔۔۔ان کے بیٹے ان کی ہر بات مانتے رہیں گے لیکن یہ میرے بیٹے مہریار کی زندگی کا معاملہ ہے۔۔۔اور میں اپنی اولاد کی مرضی کو مقدم سمجھتا ہوں۔۔۔میں مہریار کی منشاء کے بنا اس کا رشتہ طے نہی کر سکتا جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کس مشکل وقت سے گزر چکا ہے۔۔۔دیکھو حاکم۔۔۔میرا تمہارا تعلق دوستی کا ہے اور میں اسے رشتے داری میں بدلنے کے حق میں نہی ہوں۔۔۔اللہ تمہاری بچی کے نصیب اونچے کرے۔۔۔بیٹی ہے وہ میری لیکن رشتے کے لیے کوئی آس دل میں نالانا کیونکہ اپنے بچوں کے جیون ساتھی چننے کا اختیار میں نے انہی کو دے رکھا ہے۔۔۔امید ہے کہ تم۔دل میں ملال نہی لاؤ گے۔۔۔!"

چوہدری حیات راؤ کے دوٹوک جواب نے جہاں کشوری بی کا سانس خشک کیا تھا وہیں چوہدری شہاب الدین کا فشارخون بلند ہوگیا تھا۔۔۔چوہدری حاکم نے اپنی چادر کا پلو بہت زور سے جھٹکا تھا۔۔۔ان کے تیور اچھے نہی تھے۔۔۔وہ حیات راؤ کو بغور دیکھتے کمرے سے نکل گئے تھے۔۔۔پیچھے خوفناک خاموشی چھاگئی تھی اور جب تک چوہدری حاکم کی پجیرو کے ٹائر چرچرانے کی آواز نہی آگئی تب تک چھائی رہی تھی۔۔۔

"تتتتت۔۔۔تم نکل ججججج۔۔۔جاؤ میرے ککلک۔۔۔کمرے سے۔۔۔مممم۔۔۔میں تمہیں کبھی مممم۔۔۔معاف نہی ککک۔۔۔کروں گا۔۔۔تتتت۔۔۔تممممم نے مممم۔۔۔میری بات ردککلللک۔۔۔کی ہے۔۔۔تتتنن۔۔۔نکل جاؤ۔۔۔ددددد۔۔۔دور ہو جاؤ مممم۔۔۔میری نظروں۔۔۔سسس۔۔۔

سے۔۔۔ددددد۔۔۔دفع ہو جاؤ۔۔۔!"

اور حیات راؤ نے بنا کوئی جواب دیے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے بیوی کو نکلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔۔۔ باہر جا کر انہوں نے چوہدری شہاب الدین کے خاص ملازم شریف کو اندر بھیج دیا تھا تاکہ وہ انہیں سنبھال لے۔۔۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے چیزیں پھینکے جانے کی اور ٹوٹی پھوٹی آواز میں شور مچانے کی آوازیں باہر سنائی دینے لگیں تھیں۔۔۔ کبھی اس حویلی میں یہ آواز قہر بن کے ٹوٹا کرتی تھی اور دل توڑ دیا کرتی تھی۔۔۔ آج اس آواز میں پڑی دراڑیں کسی کی بے بسی کا نوحہ سناتی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

مہریار نے چاروں کو اپنے کمرے میں بلا کر دوبارہ واپس لاؤنج میں بھیج دیا تھا۔۔۔ وہ چاروں اس قدر بھدے لگ رہے تھے کہ وہ اپنے کمرے میں ان کے جسموں سے جھڑتا آٹا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اب وہ سب لاؤنج میں بھوت بنے اس کا صبر آزما رہے تھے۔۔۔ مہریار شرٹ کے کف فولڈ کرتا کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔۔۔ جس کے ایک سرے پہ نانی پیاری ابھی ابھی نیند سے جاگی سوئی کیفیت میں معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔۔۔

"فیر کھول دیا نا کوئی کھاتا تم چاروں نے۔۔۔ جتیاں پین تے ٹھیک رہندے او۔۔۔"

مہریار نے چاروں کو سر سے لے کر پیروں تک یوں دیکھا جیسے لاعلاج مریض کو دیکھتے ہیں۔۔۔ وہ تینوں واقعی لاعلاج تھے، اس کی نظر میں۔۔۔ شہریار ڈھیلے اوپر کیے اپنے بالوں کی نوک پلک سے آٹے کے ذرات نکال رہا تھا اسی کو گھورتے ہوئے مہریار مخاطب ہوا۔۔۔

"کل سے تم چاروں میں سے کوئی بھی مجھے کچن میں دکھائی دیا تو اس کا کھانا پینا بند کر دوں گا۔۔۔ جو فضلو پکائے گا وہی کھانا پڑے گا۔۔۔ اگر اس کے کام میں مداخلت کی یا بکھیڑا کیا تو یقین مانو تم چاروں کو گاؤں بھیج دوں گا اور اس بار مجھ سے لحاظ کی توقع مت کرنا۔۔۔ میں سارا دن ہاسپٹل میں لگ کے آتا ہوں۔۔۔ تھکا ہوا ذہن لیے گھر میں داخل ہوتا ہوں اس لیے نہیں کہ آگے سرکس لگا ہو۔۔۔ جہاں بندر بنے سب ناچ رہے ہو۔۔۔ جا کے دیکھو ذرا شکلیں کیسی دکھ رہی ہیں۔۔۔ گھر کو کباڑ بنا ڈالا ہوا ہے۔۔۔!"

"لالہ آپ فضلو کو بھی تو سمجھائیں نا کبھی کچھ چج کا بنا دیا کرے۔۔۔اول تو یونی سے تھکے ہوئے آؤ تو کھانا انڈر پراسس ہوتا ہے اور پھر جو ٹیبل پہ ہوتا ہے اس کو کھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور جو کھالو تو ہضم کرتے نانی پیاری یاد آجاتیں ہیں۔۔۔پھکی کھانا تو کھانے کے بعد کا لازمی جزو بن چکا ہے۔۔۔پھر بندہ لاسٹ آپشن کے طور پر سلائس میں شامی لگا کے ہی کھانا بہتر سمجھے گا نا۔۔۔!" شہریار بالوں کو مسلسل جھاڑتا بولے جا رہا تھا اور مہریار فرش پہ گرتے آٹے کے ذرات کو دیکھ رہا تھا۔۔۔

"تو کیا یہ سلائس پہ شامی لگ رہا تھا کچن میں۔۔۔ایسے لگتا ہے۔۔۔؟ کچن کی حالت دیکھو جیسے وہاں سفیدی ہو رہی ہو۔۔۔تم لوگو کی وجہ سے کوئی ملازمہ تو ٹکتی نہی ایک یہ فضلو کا آسرا ہے۔۔۔چلا گیا نا تو کرنا سبھی کام خود۔۔۔کیونکہ میں تو تنگ آ گیا ہوں تم لوگو کے ان تماشوں سے۔۔۔!"

"میں تو کہتی ہوں منڈیا ویاہ کراتے وہٹی گھر لیا۔۔۔دیکھ سب کیسے سوتر ہوتے۔۔۔"

نانی پیاری نے اپنا راگ الاپنا لازم سمجھا۔۔۔جسے مہریار کے سوا ان چاروں نے خشوع و خضوع سے سنا تھا۔۔۔

"لالہ یہ تماشا شیری نے شروع کیا تھا اور زارون نے ختم کیا تھا۔۔۔ہم تو بیچ میں ایویں، ایویں، ایویں لُٹ گئے۔۔۔!" داور نے چھریوں ایک ہاتھ کو دوسرے پہ آری چلانے کے انداز میں کہا کہ وہاں موجود سبھی کی ہنسی لبوں کا دہانہ پار کرتی ابلنے کو تھی۔۔۔زارون جو ابھی کچن سے پٹ کے آیا تھا اپنا جبڑا پکڑے ہنستا کم اور روتا زیادہ دکھائی دیا۔۔۔نانی پیاری نے دوپٹے کا پلو منہ پہ ڈال کے ہنسی چھپائی۔۔۔مہریار سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔۔۔پھر آنکھیں مسل کے لمبا سانس کھینچا اور چاروں کو دیکھتے ہوئے تحمل سے بولا۔۔۔

"یہ میری لاسٹ وارننگ ہے۔۔۔کل سے۔۔۔تم چاروں مجھے کچن میں نا دکھائی دو۔۔۔میں آ کے فضلو سے پوری رپورٹ لوں گا۔۔۔اور تم لوگ ذرا یہ اپنی چائے پینے کی بلاوجہ کی عادت کو کم کرو۔۔۔صبح دودھ پی کے جایا کرو۔۔۔چائے اچھی نہی ہوتی صبح کے وقت اور شام کو بھی چائے کی جگہ جوس لیا کرو اور یہ جو رات میں بیماری ہے نا چائے پی کے سونے کی تو اس پہ قابو پاؤ۔۔۔ضرورت کیا ہے بلاوجہ چائے پینے کی۔۔۔اس سے اچھا دودھ لو۔۔۔ختم کرو یہ دن میں دس کپ چائے۔۔۔جب دیکھو چائے چائے چائے۔۔۔!"

وہ چاروں چائے کے رسیا تھے اور فضلوان کی وجہ سے چائے چولہے پہ چڑھائے رکھتا تھا۔۔۔ہر وقت چائے کی پکار پڑتی رہتی تھی اور نانی پیاری بھی اس سب میں شامل تھیں۔۔۔

"سمجھ آیا تم لوگوں کو کہ نہی۔۔۔؟"

"آگیا لالہ۔۔۔بلکل آگیا۔۔۔بس یہ بتا دیں کہ نس کہاں جا کے کاٹیں۔۔۔!" شہریار نے کلائی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تفکر سے پوچھا۔۔۔

"کیا بکواس ہے۔۔۔کیا مطلب اس بات کا۔۔۔!" مہریار نے تیوریاں چڑھائیں۔۔۔

"مطلب یہ کہ لالہ چائے بلکل ہی بند کر دی۔۔۔جینے کی کوئی وجہ تو چھوڑی نہی آپ نے تو مر ہی جائیں نا۔۔۔!"

"نکل جاؤ تم سب۔۔۔دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔۔۔مجھے کوئی ایک بھی کمرے سے باہر دکھائی دیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔۔۔!" مہریار اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ سچ میں جوتا پکڑ لیتا ان چاروں نے اپنے اپنے بلوں میں چھپنے میں ہی عافیت جانی۔۔۔مہریار واپس دھپ سے صوفے پہ بیٹھا تھا۔۔۔اور سر پیچھے گرا کر آنکھیں موندے اپنے اعصاب پرسکون کرنے لگا۔۔۔ابھی اسے واپس ہاسپٹل بھی جانا تھا۔۔۔نانی پیاری بھی اپنی جگہ سے اٹھیں اور دھیمے لہجے میں بولیں۔۔۔" اسی لیے کہتی ہوں وو ہٹی لے آ۔۔۔اپنی جان تو ہلکان نا ہو گی نا۔۔۔دیکھ سب سنبھال لے گی وہ۔۔۔ان مشٹنڈوں کا کھانا پینا چائے پا پڑ سب کچھ دو دنوں میں۔۔۔"

"نانی۔۔۔!" مہریار نے بے بسی سے بال مٹھیوں میں جکڑ کر انہی چپ کروایا۔۔۔نانی پیاری ہنکارا بھرتی وہاں سے چلی گئیں اور مہریار واپس صوفے کی پشت سے سر ٹیک گیا۔۔۔آنکھیں موندتے ہی ایک چہرہ نگاہوں کے پردے پہ ابھرا اور مہریار نے اس تصور کو جھٹکنے کی کوشش نہی کی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

ہاجرہ برآمدے میں بیٹھیں چاول چن رہی تھیں۔۔۔زمن کے آنے سے پہلے وہ سبزی ترکاری بنا لیا کرتی تھیں یا چاول دال چننے والی ہوتی تو صاف کر کے رکھ لیتی تھیں۔۔۔باقی سب کام زمن آ کے دیکھا

کرتی تھی۔۔۔وہ ہاجرہ کو سختی سے کھانا بنانے سے منع کیا کرتی تھی کہ یہ کام اس کے سر رہنے دیں۔۔۔ ویسے بھی ہاجرہ گھر کی صفائی خود کیا کرتی تھیں تو زمن کو ان کا تھکاوٹ کا احساس رہا کرتا تھا۔۔۔زوہا کو سنبھالنا بھی بہت مشکل عمل تھا۔۔۔جو خود کا وزن اٹھانے سے بھی قاصر تھی۔۔۔زمن گھر آتی تو ساتھ ساتھ باتیں کرتی رہتی اور کچن میں کھانا بنانا بھی چلتا رہتا۔۔۔ہاجرہ چاولوں کا تھال گود میں لیے زندگی کے نشیب وفراز میں الجھی ہوئی تھیں۔۔۔زندگی کی کٹھنائیوں نے انہیں بے رنگ کر دیا تھا۔۔۔ان کی خوبصورتی دھندلا چکی تھی۔۔۔وہ کبھی جو بے حد حسین اور دلکش تھیں اب محض اس کا عکس بچی تھیں۔۔۔ان کی آنکھیں ہر پل گیلی رہا کرتی تھیں کیونکہ بھولے بسرے وقت کی گرد اب بھی ان کی پلکوں پہ ڈیرا جمائے ہوئے تھی جو جھڑ جھڑ کے آنکھیں سلگاتی تھی۔۔۔وہ ایک سرد آہ بھرتی اپنی جگہ سے اٹھیں تھیں کہ یکدم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔۔۔ان کا دل اچھل کے حلق میں آگیا تھا۔۔۔زمن کے آنے کا وقت تھا، وہ گھبراہٹ میں تھال رکھ کے تیزی سے دروازے کی اور بڑھیں اور لاک کھولا ہی تھا کہ زمن تیر کی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور لاک لگا کے دروازے کے ساتھ پشت ٹیک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔۔۔اس کی رنگت فق اور ہوش اڑے ہوئے تھے۔۔۔ہاجرہ گھبرا گئیں اور فوراً اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔۔۔

"زمن۔۔۔کیا ہوا ہے بچی۔۔۔کیا ہوا۔۔۔اس طرح سے کیوں ہانپ رہی ہو۔۔۔کہاں سے بھاگتی آرہی ہو۔۔۔بتاؤ زمن۔۔۔کچھ بولو۔۔۔زمن۔۔۔!" وہ پریشانی میں مسلسل پوچھ رہی تھیں اور زمن ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کا کہہ رہی تھی۔۔۔ہاجرہ واپس مڑیں اور جلدی سے کچن سے پانی لیے چلی ائیں۔۔۔تب تک زمن کسی نا کسی طرح برآمدے میں بچھے تخت تک پہنچ گئی تھی۔۔۔ہاجرہ سے پانی کا گلاس لے کر وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔۔۔موسم ابھی اچھا تھا لیکن اس کے ماتھے پہ پسینہ چمک رہا تھا۔۔۔

"زمن اب تو بولو نا کچھ، ہوا کیا ہے۔۔۔کیوں ماں کی جان ہلکان کر رہی ہو۔۔۔؟"

"کچھ نہی۔۔۔بس ایسے ہی۔۔۔!" وہ بمشکل سانس بحال کرتی بولی۔۔۔

"کیا ایسے ہی۔۔۔؟ ایسے ہی سانس پھول گیا تمہارا۔۔۔ مجھے سچ سچ بتاؤ زمن کیا ہوا ہے۔۔۔ رکو میں خود دیکھتی ہوں بیٹھو یہاں۔۔۔!" وہ اٹھنے لگیں تو زمن یکدم ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔۔۔

"کتے۔۔۔ باہر کتے ہیں امی۔۔۔ ساتھ والے محلے سے پیچھا کرنا شروع کیا انہوں نے میرا۔۔۔ اور یہاں تک پہنچایا ہے۔۔۔ ایک منٹ اور گزرتا تو بس ہمارے تھڑے تک آ گئے تھے۔۔۔!"

"اف میرے خدا۔۔۔ زمن۔۔۔ حد کرتی ہو بچی۔۔۔" ہاجرہ یکدم اعصاب ڈھیلے چھوڑتی تخت پہ بیٹھ گئیں۔۔۔ "میری جان نکال دی تم نے۔۔۔ ہزار بار تو کہا ہے کہ یہ نامراد دکھائی دیں تو ساتھ والی گلی میں جو بشیر کریانے والا ہے اس بھلے آدمی کو کہا کرو تمہیں گھر تک چھوڑ جایا کرے۔۔۔ بیٹیوں کی طرح خیال کرتا ہے وہ۔۔۔ یوں بیٹا گلیوں میں جوان بچی بھاگتی اچھی لگتی ہے کیا۔۔۔ کسی نے دیکھا ہوگا تو کیا سوچا ہوگا۔۔۔؟"

"امی چاچا بشیر وہاں ہوتے تو بھلا آنے دیتے مجھے ایسے۔۔۔ نہی تھے نا تبھی تو اکیلی آئی۔۔۔ خیر آپ کچھ کھانے کو دیں مجھے۔۔۔ میں فریش ہو کے زوہا کے پاس جا رہی ہوں۔۔۔ وہیں لا دیجیے۔۔۔ تھوڑا آرام کر کے پھر کچن دیکھوں گی۔۔۔!" زمن نگاہیں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی جلدی کہتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔۔۔ ہاجرہ ناسمجھی سے اس کی پشت تک رہی تھیں۔۔۔ زمن کا رویہ عجیب سا تھا۔۔۔ ان کے دل میں وسوسوں نے سر سرانا شروع کر دیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

حیات راؤ اپنے کشادہ کمرے میں بیڈ کے سامنے آراستہ تھری سیٹر نفیس صوفے پہ براجمان ضروری کاغذات سینٹرل ٹیبل پہ دھرے ان پہ جھکے ہوئے تھے۔۔۔ ان کی پیشانی پہ تفکر کی لکیریں تھیں۔۔۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ذہن کہیں اور الجھا ہوا ہے اور بظاہر وہ کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔۔۔ کشور بی بیڈ پہ بیٹھیں، پھولے منہ سے دھلے کپڑوں کو تہہ لگا رہی تھیں جو ملازمہ رکھ کے گئی تھی۔۔۔ حویلی میں کام کرنے والیوں کی کمی نہی تھی لیکن کشور بی بی کو فالتو میں حکم چلانا کبھی پسند نہی تھا۔۔۔ وہ مل بانٹ کے کام کرتی آئی تھیں۔۔۔ اور حویلی میں تو انہیں جیسے کرنے کو کچھ ملتا ہی نہی تھا۔۔۔ ساری اولاد تو شہر

میں تھی۔۔۔ یہاں دو دن کے لیے آتے تھے تو اتنے کام جمع ہو جاتے کہ کشور بی بی سارا دن مسروری انہیں نبیڑتی رہتیں۔۔۔ جب لڑکے چلے جاتے تو وہی دن رات کی خاموشی اور روٹین انہیں بے زار کیے رکھتی۔۔۔ حیات راؤ کے اپنے معمولات تھے جن میں وہ مشغول رہا کرتے۔۔۔ کشور بی بی اسی لیے شادی کروانا چاہتی تھیں مہریار کی۔۔۔ وہ تو شہریار کی بھی کرنے کو تیار تھیں لیکن مہریار اس کی پڑھائی پوری ہونے سے پہلے ایسا کبھی نا ہونے دیتا۔۔۔!

"کیا تھا جو حاکم کی بات تسلی اور سکون سے سن لیتے۔۔۔ دیکھ رکھی ہے اس کی لڑکی میں نے۔۔۔ اچھی پیاری بچی ہے۔۔۔ مہریار کو میں راضی کر لیتی چوہدری صاحب۔۔۔!"

ہاتھ میں تھام کرتے کو زوردار آواز کے ساتھ جھٹک کے تہہ لگاتے ہوئے کشور بی بی روٹھے لہجے میں شوہر سے مخاطب تھیں۔۔۔ حیات راؤ نے عینک کے اوپر سے انہیں دیکھا اور ان کے بجھے چہرے سے بھانپ گئے کہ موڈ آف تھا۔۔۔ عینک اتار کر رکھتے ہوئے انہوں نے پشت صوفے سے ٹکی اور محبت سے بیوی کو دیکھتے ہوئے بولے۔۔۔

"تم کب سمجھو گی مہر کی تکلیف کو کشور۔۔۔ وہ ہماری بڑی اولاد ہے۔۔۔ آٹھ سال اس اکیلے نے ہماری محبت پہ قبضہ کیے رکھا تھا۔۔۔ وہ بگڑ سکتا تھا۔۔۔ ضدی اور خود سر ہو سکتا تھا۔۔۔ اباجی نے تو اسے بگاڑنے میں کوئی کسر چھوڑی بھی نہیں تھی۔۔۔ لیکن کیا کبھی اس نے ہمیں شکایت کا موقع دیا۔۔۔ آج میں شہر جاتا ہوں تو اس کی عزت اور شہرت دیکھ کے میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔۔۔ لوگوں کی اولاد ان کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے کشور لیکن جب مجھے سب اس کے حوالے سے پہچان دیتے ہیں تو میری چھاتی چوڑی ہو جاتی ہے۔۔۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں پکڑ پکڑ کے سب سے کہوں کہ میں نیورو سرجن مہریار راؤ کا باپ ہوں۔۔۔ تو کیا ایسے بیٹے کی زندگی کو کھلونا بنا دوں۔۔۔ شادی کوئی دو گھنٹوں کی فلم تو ہے نہیں کہ دیکھی اور اٹھ گئے۔۔۔ کم از کم میں اس کی مرضی کے بنا اس کی زندگی کا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دوں گا کشور۔۔۔ اباجی کا غصہ وقتی ہے میں سمجھا لوں گا انہیں۔۔۔ باقی چوہدری حاکم کی طرف سے تھوڑی پریشانی لگ گئی ہے کیونکہ وہ کینہ پرور ہے۔۔۔ اور اسے اباجی نے چھیڑ دیا ہے۔۔۔ اب دیکھو کون سا تماشا لگاتا

ہے۔۔۔سچ پوچھو تو اگر مہریار راضی بھی ہو جائے نا تب بھی میں حاکم سے رشتے داری نا کرتا۔۔مفاد پرست لوگ کسی کے سگے نہی ہوتے۔۔۔اور میں اپنے بیٹے کی زندگی جھمیلوں کی نذر نہی کر سکتا۔۔۔!"

"ہاں جیسے اس نے پہلے تو جھمیلا نہی پالا تھا نا اپنی زندگی میں۔۔۔چوہدری صاحب آپ کے لاڈلے نے اپنی زندگی کا اختیار دیا ہی کب ہے ہمارے ہاتھ میں۔۔۔پہلے بھی اپنی مرضی کر کے دیکھ چکا ہے کیا پا لیا۔۔؟ چلیں جی اس معاملے میں بھی کر لے۔۔ماں جائے بھاڑ میں۔۔۔کسی کو کیا۔۔آپ کو بھی کیا۔۔!"

کشور بی بی پوری ناراضی کے ساتھ مسلسل بولتی ہوئی تیز تیز ہاتھ چلاتی کپڑے پٹخ رہی تھیں۔۔۔وہ اب کافی دیر تک بڑبڑانے والی تھیں اور۔۔۔حیات راؤ نے مسکراتے ہوئے عینک واپس لگائی اور کاغذات پہ جھک گئے۔۔۔پر ذہن پھر بھٹک کے چوہدری حاکم کی جانب چلا گیا۔۔۔چوہدری شہاب راؤ نے ایک نئی مصیبت کو دعوت دے دی تھی۔۔۔وہ دل میں دعا کر رہے تھے کہ چوہدری حاکم اس معاملے کو انا کا مسئلہ نا بنائے۔۔۔!

☆......☆......☆

آج چہار باغ حویلی میں صبح خوب رونقیں بکھیرتی اتری تھی۔۔۔سنہری بیگم کی بھانجی ولایت سے آ رہی تھی اور ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہی تھا۔۔۔سارا دن مردہ بیمار کی طرح پڑی حویلی جاگ اٹھی تھی جیسے۔۔۔شہزور حویلی کی اکلوتی اولاد تھا اور وہی حویلی میں ٹکتا نہی تھا۔۔۔چوہدری قاسم کا بھی ہونا نا ہونا برابر تھا۔۔۔سارا سارا دن مردانے میں گزر جاتا تھا۔۔۔اندر آتے بھی تو شہزور کا کوئی نیا کارنامہ سنہری بیگم کے متھے مارنے کے لیے آتے تھے کیونکہ ان کے بقول شہزور کو بگاڑنے میں سارا کمال سنہری بیگم کا تھا۔۔۔سنہری بیگم باپ بیٹے کے بیچ بری بنی رہتی تھی۔۔۔اور اب جیسے حویلی کا جمود ٹوٹا تھا۔۔۔سنہری بیگم کی بھانجی وریشہ یو کے سے آ رہی تھی۔۔۔وریشہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد نہی تھی لیکن اکلوتی بیٹی ضرور تھی اور بے حد لاڈلی بھی تھی۔۔۔سنہری بیگم کو وہ بچپن سے ہی بے حد پسند تھی۔۔۔ایک وقت تھا جب انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے اپنی بہو بنائیں گی لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کا یہ خواب پورا نہی ہو سکا تھا۔۔۔وریشہ ڈاکٹر تھی اس لیے بھی انہیں شہزور کے لیے بے حد بھاتی تھی لیکن شہزور کون سا پروں پہ

پانی پڑنے دیتا تھا۔۔۔اس کے سر پہ چڑھا جنون اسے کہیں دیکھنے کب دیتا تھا۔۔۔وریشہ کے پاکستان آنے کو سنہری بیگم اچھا شگون مان رہی تھیں ان کا دل کہتا تھا کہ شہزور کو وریشہ ہی قابو میں کر سکتی تھی اور اس بار وہ پوری طرح تیار تھیں کہ شہزور کو وریشہ سے شادی کے لیے منا لیں گی۔۔۔بھلے انہیں کچھ بھی کرنا پڑتا۔۔۔

بڑے سے سجے سجائے ہال کمرے میں چاروں اور ملازمائیں دوڑ رہی تھیں۔۔۔نئے پردے لگ رہے تھے۔۔۔پنکھے جالے صاف ہو رہے تھے۔۔۔سارا فرنیچر چمکایا جا رہا تھا حتی کہ کرسٹل کے نازک چھوٹے چھوٹے ڈیکوریشن پیسز بھی رگڑوا رہی تھی انہری بیگم اور یہ تمام تیاری محض ایک بندے لیے تھی۔۔۔ڈاکٹر وریشہ آفتاب۔۔۔!

"اے کلموہی۔۔۔اندھی ہے کیا۔۔۔ابھی چھوٹتا نا تیرے ہتھ سے تو اس کی قیمت چکاتے تیری پوری نسل گزر جاتی۔۔۔!" ملازمہ کے ہاتھ سے کرسٹل کا واز چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا اور سنہری بیگم نے اسے فوراً سے پیشتر لتاڑ دیا تھا۔۔۔وہ بیچاری پوری جان سے کانپ اٹھی تھی۔۔۔جانتی تھی کہ اگر سنہری بیگم کہہ رہی ہے تو واقعی اس کی پوری نسل اس کانچ کے ٹوٹنے کی قیمت چکاتی۔۔۔

"واہ اماں۔۔۔یہیں سے دیکھ لو کہ کیا دیتی ہو ان لوگوں کو۔۔۔ایک چار ہزار کے واز کا خراج اس کی پوری نسل چکاتی لیکن یہ چار ہزار پورے ہی نا ہوتے۔۔۔واہ۔۔۔اور بھاشن تم ایسے دیتی ہو اماں جیسے بہت بڑی مبلغہ ہو۔۔۔!"

شہزور نک سک سے تیار خوشبوئیں بکھیرتا وہیں آگیا تھا۔۔۔سب کی سب ملازمائیں کام کرتا چھوڑ کر وہاں سے نکل گئیں کیونکہ شہزور کو اپنی موجودگی میں کسی بھی ملازمہ کا آس پاس ہونا نہیں بھاتا تھا۔۔۔

"کبھی تو باز آجایا کر ماں کے منہ لگنے سے شہزور پتر۔۔۔کمی کمینوں کے سامنے بک بک کیے جاتا ہے۔۔۔جیسا پیو ویسا پتر۔۔۔ہونہہ۔۔۔!" سنہری بیگم اپنے کاؤچ پہ بیٹھ کے پاندان گھسیٹتی ہوئی بےزاری سے بولی۔۔۔جواباً شہزور زور سے ہنسا اور سر پیچھے صوفے کی پشت سے ٹکتے ہوئے بولا۔۔۔

"خود ہی میرے ایسا ہونے کی وجہ بتا دی اماں۔۔۔اب بتاؤ میرا قصور کیا ہوا بھلا۔۔۔ابا جی ایسے ہیں تو میری کہاں غلطی نکلتی ہے۔۔۔" کہہ کر سیدھا ہوا اور جیب سے موبائل نکال کے ہاتھ میں

پکڑا۔۔۔" ویسے کس لیے یہ صبح صبح صفائیاں ہو رہی ہیں۔۔۔سوکن لا رہی ہو کیا اپنی۔۔۔؟"

" کبھی تو جچ کی بات نکال لیا کر منہ سے شہزور۔۔۔ماں کا تو دشمن ہی بنا رہتا ہے ہر وقت۔۔۔!"

" اباجی اگر دوسری شادی کر لیتے ہیں تو ان کا شرعی حق ہے۔۔۔اس میں بھلا دشمنی کیسی ہوئی تم سے۔۔۔لوگ یہاں بسے بسائے گھر اجڑوا دیتے ہیں میں تو بس سوکن کا نام لیا تو تمہی تپ چڑھ گئی۔۔۔ کمال ہو اماں تم بھی۔۔۔!"

سنہری بیگم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔۔۔شہزور سے بحث مشکل نہی ناممکن تھی۔۔۔وہ کبھی جواب دینے سے چوکتا نہی تھا۔۔۔

" دیکھ شہزور پردیس سے وریشہ آرہی ہے۔۔۔اسی کے لیے کر رہی ہوں ساری تیاریاں۔۔۔ اور تُو میرا پتر دھیان سے سن لے، جس دھندے سے لگا ہوا ہے نا اس سے باز آجا۔۔۔چوہدری جی کو پتا چلا نا تو مجھ سے مت کہنا کہ شکایت کیوں کر دی۔۔۔میں ویسے بھی تیرے ویاہ کے چکر میں ہوں۔۔۔مجھ سے نہی سنبھالی جاتی حویلی اب۔۔۔تیری بیوی آئے گی تو سکون ملے گا مجھے بھی۔۔۔اس لیے آوارگیاں چھوڑ اور وریشہ کے بارے میں سوچ۔۔۔سمجھا۔۔۔!"

سنہری بیگم نے دو ٹوک معاملہ اس کے آگے رکھ دیا تھا۔۔۔بنا لگی لپٹی۔۔۔لیکن مقابل بھی شہزور تھا۔۔۔

" اماں میری شادی ہے نا تو فکر بھی میں کر لوں گا۔۔۔مجھے مت بتاؤ کہ کون آرہا ہے کون نہی۔۔۔ تمہاری بھانجی ہے سو دفعہ آئے لیکن جو کچھ تم سوچ رہی ہو ویسا کرنے کی مت سوچنا بس ورنہ میں عین وقت پہ رسا تڑوانے والوں میں سے ہوں۔۔۔مفت میں بے عزتی ہو گی۔۔۔!"

" وہ تو دیکھی جائے گی۔۔۔آتو لینے دے وریشہ کو۔۔۔دیکھتی ہوں کیسے رسا تڑا کے جاتا ہے۔۔۔ بدلحاظ تو تُو سدا سے ہے شہزور۔۔۔ماں کی پرواہ کہاں ہوتی ہے جب ادب نہی تو۔۔۔اکو اک اولاد ہے تُو میری لیکن مجال ہے کہ کبھی میرا دکھ درد پوچھا ہو۔۔۔الٹا جب بیٹھے گا پاس ٹنو کنے لگ جائے گا۔۔۔ہونہہ گندی اولاد۔۔۔!"

اور شہزور قہقہہ مار کے زور سے ہنستا تھا۔۔۔اسے ناجانے کون کون سی باتیں یاد آ کے ہنسایا کرتی تھیں اور سنہری بیگم نے کبھی کرید نہیں کی تھی کہ وہ اس طرح بے لاگ قہقہے کیوں لگاتا ہے۔۔۔وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔۔۔ابھی بھی نگاہ چرا کے پاندان ٹٹولنے لگیں تھیں بلا مقصد۔۔۔شہزور اٹھا اور زوردار انگڑائی لے کر بدن چست کیا اور گاڑی کی چابیاں انگلی پہ گھماتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔۔۔دروازے تک پہنچ کے ایک ایڑی کے بل تھوڑا سا مڑا اور ماں کو مخاطب کیا۔۔۔

" اماں۔۔۔او اماں۔۔۔" انداز چھیڑنے والا تھا۔۔۔" رات کو وریشہ کی کال آئی تھی۔۔۔اس کے آنے کا پروگرام ڈیڑھ ماہ آگے ہو گیا ہے۔۔۔دو تین سیمینار ہیں جن کی وجہ سے اسے پوسٹ پون کرنا پڑ رہا ہے۔۔۔سوچا تمہیں بتاتا جاؤں کہیں حلوائی ہی نا بٹھا لو حویلی میں اپنی بھانجی کے آنے کی خوشی میں۔۔۔!"

شہزور کہہ کے چٹخارہ سا بھرتا مزے سے نکل گیا تھا۔۔۔اور سنہری بیگم جو حسب معمول اس پہ آیت الکرسی دم کر کے حصار باندھنے کے قریب تھیں یکدم آواز کے ساتھ زوردار پھونک مارتی ہوئی انتہائی کوفت سے اونچی اونچی بڑبڑانے لگیں۔۔۔

" لے بھلا بتا۔۔۔ایک فون ماسی کو نا ہو سکا اس نکمی سے۔۔۔پندرہ دن ہو گئے تیاریاں کرتے اور یہ نواب کی بچی ادی راتی بتا رہی کہ نہیں آنا۔۔۔ستیاناس جائے تیرا وریشہ۔۔۔لگ ٹٹ گئے تیرے لیے حویلی چمکاتے۔۔۔فٹے منہ۔۔۔!"

سنہری بیگم نے کاؤچ پہ سلیقے سے دھرے کشن نیچے فرش پہ پٹخے۔۔۔ہال کے اونچے روشن دانوں سے آتی ہواؤں میں تھکے ہوئے اور بیتے وقت کی باس اندر آ گھسی تھی۔۔۔اور چمکتی دیواروں نے اسے ہر بار کی طرح چوس لیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

مہریار اس وقت آنٹی رباب کے لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔۔۔ان کے شوہر بھی وہیں موجود تھے اور چونکہ مہریار کے استاد رہ چکے تھے تو ان سے اچھی بات چیت رہا کرتی تھی۔۔۔وہ بے حد شگفتہ مزاج اور ہنسوڑ تھے۔۔۔اور رباب آنٹی کے شوہر کے معیار پہ پورے اترتے تھے۔۔۔دونوں کی

ایک دوسرے سے انڈرسٹینڈنگ غضب کی تھی۔۔۔فکر فاقہ نہیں پالتے تھے نابلاوجہ کی تام جھام کے قائل تھے۔۔۔بیٹے کو بھی الگ سیٹل کیا تھا تاکہ سب اپنی اپنی لائف انجوائے کر سکیں مکمل پرایئویسی کے ساتھ۔۔۔چھوٹا سا خوبصورت ویل فرنشڈ گھر تھا جو بے حد سلیقے اور طریقے سے سیٹ کر رکھا تھا۔۔۔زیادہ بڑے گھر کے دونوں میاں بیوی حق میں نہیں تھے۔۔۔تین مستقل ملازم تھے جو سارا گھر سنبھالتے تھے۔۔۔ایک شیف اور دوسرا چوکیدار اور ایک کل وقتی ملازمہ جو شیف کی بیوی تھی۔۔۔یوں خاصی سہولت سے سب سلسلے چل رہے تھے۔۔۔

"مہریار بیٹا کھانا کھا کے جانا۔۔۔بس پلاؤ دم پہ دیا ہے۔۔۔ابھی تیار ہو جائے گا۔۔۔!"

کچن سے رباب آنٹی کی آواز ابھری تھی۔۔۔ویک اینڈ پہ وہ اکثر کچھ نا کچھ شوقیہ بنایا کرتی تھیں اور اسے محض ان کے میاں ہی کھایا کرتے تھے۔۔۔ابھی بھی تھوڑا آگے جھک کے دھیمی آواز میں بولے۔۔۔

"کھا لینا چپ کر کے۔۔۔نا کھایا تو بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے اور کھا لیا تو تھوڑی سی زیادہ میں لیکن کوئی بات نہیں میں نے دوسری والی سے نجات کے لیے چورن رکھا ہوا ہے پر پہلی والی کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔۔۔!"

کہہ کر ایک زوردار قہقہہ ان کے حلق سے برآمد ہوا تھا اور مہریار بھی بے ساختہ ہنس دیا تھا۔۔۔کچن سے دوبارہ رباب آنٹی کی آواز آئی۔۔۔

"کہہ لیں، کہہ لیں خان صاحب جو بھی کہنا ہے کہہ لیں۔۔۔سب چورن پھکیاں جانتی ہوں آپ کے۔۔۔اور مہریار تم ان کی باتوں میں مت آنا یہ چاہتے ہی نہیں کہ کوئی کچھ ڈھنگ کا کھا سکے۔۔۔!"

"لو دیکھو۔۔۔بس الف سے یے تک زبردستی ہے صاحب۔۔۔آؤ بھی، کھاؤ بھی، اور پھر کھا کے واؤ واؤ بھی کر کے جانا پڑے گا تمہیں۔۔۔مجھے بھی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے نا کروں تو اگلے دو دن اپنے ہاتھ کا کھلاتی ہیں اور اس سے بچنے کے لیے میں اتنی تعریف کرتا ہوں کہ ساتھ ملازموں کو بھی کھلا کے سبھی چٹ کروا دیتا ہوں۔۔۔ورنہ اس پاپی پیٹ کے پاپوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔۔۔!"

اب کے مہریار کو اپنا چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھنا پڑا تھا۔۔۔ہنسی اس قدر بے ساختہ تھی کہ اگر نا رکھتا تو

چھلک جاتا۔۔۔

" آپ بھی کمال ہیں سر۔۔۔کبھی نہی بدلیں گے۔۔۔اتنا تو اچھا پکاتی ہیں آنٹی۔۔۔قدر کیجیے کہ ایسی خاتون خانہ ملیں ہیں آپ کو۔۔۔!"

مہریار کی خاصی بے تکلفی تھی ڈاکٹر خان سے اور وہ اکثر ہلکے پھلکے مذاق بھی کرلیا کرتا تھا۔۔۔ رباب آنٹی ایپرن اتارتی وہیں چلی آئیں اور میاں کے ساتھ بیٹھ کے انہیں تیکھے چتونوں سے گھورتے ہوئے بولیں۔۔۔

" بہت جھوٹے ہیں خان صاحب آپ۔۔۔مجھے تو کہتے ہیں کہ اتنا اچھا پکاتی ہو کہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اور پیٹھ پیچھے بدخوئیاں کررہے ہیں۔۔۔!"

" ہاں تو اسی لیے کہتا ہوں نا ورنہ الٹ بول دوں تو وہی ہاتھ گال پہ چھاپ دو۔۔۔!" پھر قہقہہ۔۔۔رباب آنٹی نے ماتھے پہ ہاتھ لے جاکے جھٹکا جیسے کہتی ہوں" لگے رہیے۔۔۔"

پھر مہریار سے مخاطب ہوئیں۔۔۔

" مہر۔۔۔زوہا کے آپریشن کا کیا کرنا ہے بھئی۔۔۔مزید دیر نا ہونے دو بیٹا۔۔۔ان کی پریشانی معمولی نہی ہے۔۔۔عمر گزرگئی ان ماں بیٹی کی تکلیفیں کاٹتے ہوئے۔۔۔اب کم از کم زوہا کا آپریشن ہوجاے تو کسی طرف سے تو سکون ہوگا انہیں۔۔۔!"

" دیکھو مہریار۔۔۔" ڈاکٹر خان سنجیدگی سے بیچ میں بولے" تم ڈاکٹر قریشی اور ڈاکٹر چیمہ سے کیس ڈسکس کرو۔۔۔میں نے ان سے ذکر کردیا تھا۔۔۔وہ دونوں تمہارے لیے ہیلپ فل ثابت ہوں گے۔۔۔اور پھر اس کے بعد جیسے چاہو ہینڈل کرلو۔۔۔آئی بلیو کہ تم ان شاء اللہ سکسیس فُل رہو گے۔۔۔!"

ڈاکٹر خان کو مہریار کی قابلیت پہ پورا بھروسہ تھا۔۔۔وہ ان کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھا۔۔۔مہریار نے اثبات میں سر ہلایا اور رباب آنٹی کو دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

" آپ بلکل فکر نا کریں۔۔۔اسی ویک کے اینڈ پہ آپ لے آئیے گا زوہا کو۔۔۔ڈاکٹرز کا پینل بیٹھے گا اور سارا کیس ایک بار تھارولی ڈسکس ہوجاے گا اور چند ضروری ٹیسٹ بھی کروانے ہوں گے۔۔۔

جیسے ہی رپورٹس ملیں گی اس کے بعد ان شاء اللہ چار پانچ دن میں آپریشن کی ڈیٹ دے دوں گا۔۔۔ باقی جو اللہ کو منظور۔۔۔!"

"شکریہ بیٹا۔۔۔تم بہترین انسان ہو۔۔۔اپنے ماں باپ کی اچھی تربیت کا ثبوت ہو۔۔۔لیکن ۔۔۔" رباب آنٹی متذبذب انداز میں اسے اور شوہر کو دیکھا۔۔۔" میں چاہتی ہوں ایک بار کسی بہانے سے میں تمہی زمن کے گھر لے جاؤں۔۔۔کیا کہتے ہو۔۔۔؟"

مہریار چند پل کچھ سوچتا رہا اور پھر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔۔۔

"میں تیار ہوں۔۔۔جب آپ لے جانا چاہیں۔۔۔!"

"ٹھیک ہے۔۔۔میں تمہی کال کر دوں گی۔۔۔مجھے پک کر لینا اور چلے چلنا۔۔۔!" رباب آنٹی جوش سے کہتی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔۔۔ڈاکٹر خان نے لقمہ دیا۔۔۔

"بیگم صاحبہ۔۔۔دھیان سے۔۔۔لینے کے دینے نا پڑ جائیں۔۔۔وہ لوگ پہلے ہی مستقل حالات کی ستم ظریفی کا شکار رہے ہیں۔۔۔کہیں ایسا نا ہو کہ بدگمانی پیدا ہو جائے۔۔۔!"

"فکر نا کریں۔۔۔کچھ نہی ہوگا۔۔۔سب ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔۔۔!"

رباب آنٹی نے مہریار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پر امید لہجے میں کہا تو وہ محض تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری حیات راؤ شہر جا رہے تھے۔۔۔بہت دن سے کشور بی بی نے پنڈ کی سوغاتیں جوڑ رکھی تھیں۔۔۔بیٹے بھی دیسی خوراکوں کے شوقین تھے سوائے مہریار کے جو اپنی خوراک میں کولیسٹرول کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔۔۔کشور بی بی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہاں شہر میں ان کی اولاد دیسی گھی اور پنجیریوں حلوؤں کو ترستی نہی۔۔۔نانی پیاری میں اب اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ وہ کچن میں کھڑی ہو کے حلوے پنجیریاں بنا سکیں۔۔۔اس لیے گاؤں سے ان نعمتوں کا آنا ان کے لیے بھی مقام شکر تھا۔۔۔ چوہدری حیات راؤ مہینے میں دو تین بار چکر لگا لیا کرتے تھے لیکن اس بار انہیں دیر ہو گئی تھی۔۔۔اسی لیے

ڈرائیور ساتھ لائے تھے تا کہ حیات مینشن سے ہو کے وہ شہر میں دوسرے کام بھی نمٹا سکیں۔۔۔مہر یار سے وہ اس کے ہسپتال مل لیا کرتے تھے۔۔۔انہی اچھا لگتا تھا جب وہ اس کے ہسپتال جاتے اور وہاں اسے مصروف سا ادھر سے ادھر آتا جاتا دیکھا کرتے۔۔۔مہر یار ان کا فخر تھا، مان تھا، بھروسہ تھا۔۔۔وہ اس کی خاطر سب سے ٹکرا لے سکتے تھے۔۔۔انہی سوچوں میں غلطاں وہ شیشے سے باہر دوڑتی گھما گھمی دیکھ رہے تھے جب اچانک ڈرائیور نے زوردار بریک لگا کے گاڑی روک دی تھی۔۔۔

"او یار اللہ داد کیا ہو گیا تجھے۔۔۔ہولا رکھ ہتھ۔۔۔کیوں لگائی ہے اس طرح بریک۔۔۔؟"

"وہ جی چوہدری جی اگے کڑی آگئی ہے جی۔۔۔اچانک آئی ہے تو بریک بھی اچانک ہی لگنی تھی ناجی۔۔۔!" ڈرائیور اللہ داد نے ذرا سا رخ موڑ کے حیات راؤ سے کہا جو پہلے ہی تشویش سے آگے ہو کے فرنٹ سکرین سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔۔۔ایک سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی ان کی گاڑی کے آگے جھکی نیچے سے کچھ اٹھا رہی تھی۔۔۔جب وہ سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بلی کا چھوٹا سا بھورا اور سفید خوبصورت سا بچہ تھا۔۔۔اسے سہلاتی ہوئی وہ واپس ہونے لگی تو پل بھر کو رک کے کچھ سوچتی وہ حیات راؤ کی طرف والے دروازے کی جانب آئی۔۔۔جو اب اسے مسکراتی نظروں اور نرم تاثرات سے دیکھ رہے تھے۔۔۔اس کے قریب آنے پہ انہوں نے شیشہ فوراً نیچے کیا اور متوجہ ہوئے۔۔۔

"معذرت چاہتی ہوں انکل۔۔۔آپ کو پریشانی ہوئی۔۔۔اصل میں یہ بلی کا بچہ آپ کی گاڑی کے نیچے آجاتا اگر میں فوراً اسے پکڑتی ناتو۔۔۔!"

"تو بیٹا خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔!"

"اگر تقدیر میں ہوتا تو ہو بھی جاتا۔۔۔لیکن بلی کا بچہ تو بچ گیا نا۔۔۔!" اس کے بے ساختہ جواب پہ حیات راؤ مسکرائے اور اثبات میں سر ہلایا۔۔۔وہ لڑکی واپس پلٹ کے جانے لگی تو انہوں نے اسے مخاطب کیا۔۔۔

"کہاں جانا ہے بیٹا آپ کو۔۔۔میں چھوڑ دیتا ہوں۔۔۔!"

"نہیں نہیں۔۔۔کوئی بات نہیں۔۔۔میں رکشہ لوں گی۔۔۔آپ زحمت نا کریں۔۔۔!"

" مجھے زحمت نہی ہو گی۔۔۔آپ کے والد کی عمر کا ہوں بیٹا۔۔۔آپ مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہو۔۔۔آ جاؤ۔۔۔جہاں جانا ہے وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔۔۔اجاؤ۔۔۔اللہ داد دروازہ کھولو۔۔۔!"

حیات راؤ کو نا جانے کیسی انسیت سی محسوس ہو رہی تھی اس سے جو اصرار کے ساتھ اسے گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے۔۔۔وہ لڑکی کشمکش و پنج میں مبتلا چند پل کچھ سوچتی رہی۔۔۔پھر ایک گہری سانس بھرتے ہلکا سا سر ہلاتی دوسری جانب آئی جہاں اللہ داد دروازہ کھولے کھڑا تھا۔۔گاڑی میں بیٹھ کے بلی کا بچہ اس نے گود میں رکھا اور اپنا بیگ پہلو میں رکھ لیا۔۔۔حیات راؤ محویت سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے۔۔۔پھر انہوں نے اللہ داد کو گاڑی چلانے کا کہہ کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

" کہاں رہتی ہو آپ بیٹا۔۔۔؟"

" جی یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔۔۔اس روڈ پہ سیدھا جانا ہے آگے سے میں بتا دیتی ہوں۔۔۔!" وہ متانت سے بولی۔۔۔حیات راؤ اس کی اونچی روشن پیشانی اور کھڑے نقوش دیکھ رہے تھے۔۔۔مڑی ہوئی پلکیں جو انہیں کسی کی یاد دلا رہی تھیں۔۔۔سپید اور گلابی رنگت اور سادہ چہرہ۔۔۔انہوں نے سر جھٹکا اور رخ پھیر کے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔۔۔

" والد کیا کرتے ہیں بیٹا آپ کے۔۔۔؟"

" ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔۔۔بہت چھوٹی تھی میں تب۔۔۔!" وہ سبھاؤ سے جواب دیتی بلی کے بچے کو سہلا رہی تھی۔۔۔

" اوہ۔۔۔افسوس ہوا۔۔۔تو والدہ ہیں۔۔۔؟"

" جی الحمد للہ ہیں۔۔۔اور ایک چھو۔۔۔"

" چوہدری صاب ہسپتال آگیا ہے جی۔۔۔!"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ڈرائیور بول پڑا۔۔۔وہ خاموش ہو کر اچنبھے سے حیات راؤ کو دیکھنے لگی۔۔۔

"بس بیٹا دو منٹ کا کام ہے یہاں۔۔۔آپ کے گھر کے رستے میں پڑتا تھا تو سوچا نمٹا تا جاؤں۔۔۔آؤ آپ بھی اندر چلو میرے ساتھ۔۔۔زیادہ دیر نہی لگے گی۔۔۔بے فکر ہو کر آؤ۔۔۔!"

ہسپتال کی عالیشان عمارت کو دیکھتی وہ سوچ میں پڑی تھی آیا کیا کرے۔۔۔حیات راؤ گاڑی سے اترنے لگے تو پل بھر کو رک کے اس کی جانب شفقت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا نہی بیٹا۔۔۔کیا نام ہے آپ کا۔۔۔؟"

"جی۔۔۔میرا نام زمن ہے۔۔۔!"

"ماشاءاللہ بہت پیارا نام ہے۔۔۔آؤ بیٹا جی اترو پھر۔۔۔پانچ دس منٹ لگیں گے بس۔۔۔آ جاؤ پھر آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں آپ کو۔۔۔!"

چوہدری حیات راؤ تو اتر گئے اور ہاسپٹل کو دیکھتے ہوئے زمن کے تصور میں ڈاکٹر مہریار کا چہرہ اتر آیا۔۔۔

"لو بلا وجہ اس کھڑوس سے سامنا ہو گیا تو۔۔۔میرا موبائل پہلے ہی ہتھیا کے بیٹھ گیا۔۔۔خوامخواہ کوئی بدمزگی نا ہو زوہا کے آپریشن سے پہلے۔۔۔!" وہ دل میں بڑبڑاتی دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی۔۔۔اترتے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں تھاما بلی کا بچہ نیچے رکھا تو وہ جیسے قید سے چھوٹا تھا۔۔۔سرپٹ ایک طرف کو بھاگ گیا۔۔۔وہاں قریب ہی کوڑے کے ڈرم کے پاس ایک دو بلیاں موجود تھیں۔۔۔وہ سیدھا اسی جانب گیا تھا۔۔۔زمن مرے مرے قدموں سے چوہدری حیات راؤ کے پیچھے چلنے لگی۔۔۔!

☆......☆......☆

چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا کمرا اس وقت زوہا کی ہذیانی چیخوں سے گونج رہا تھا۔۔۔ہاجرہ اس کے پاس موجود تھیں اور اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔۔۔وہ بھلے سے ہل جل نہی سکتی تھی لیکن اس کے بازوؤں کی طاقت ہی ہاجرہ کو زیر کر دیا کرتی تھی۔۔۔ایسا دورہ اسے اکثر پڑا کرتا جب وہ اپنی حالت اور معذوری سے بیزار ہو جاتی۔۔۔پہلے وہ سسکنا شروع کرتی اور پھر اپنی مٹھیاں بھینچ کے خود کو پیٹنے لگتی۔۔۔اپنی ٹانگوں اور کمر کے حصوں پہ مکے برساتی۔۔۔ہاجرہ اس کی ذہنی حالت سمجھتی تھیں لیکن بے بس

تھیں۔۔۔زمن گھر ہوتی تو ان سے بہتر وہ زوہا کو سنبھال لیا کرتی تھی۔۔۔لیکن آج چونکہ وہ اکیلی تھیں تو یہ آفت انہی کے سر پڑی تھی۔۔۔زوہا کی چیخیں جب چھت پھاڑنے لگیں تو ہاجرہ فوراً باہری دروازے بند کرنے بھاگیں تاکہ آواز گھر سے باہر نا جائے۔۔۔کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ زوہا کی چیخیں سن کر محلے کی عورتیں چلی آتی تھیں۔۔۔ان کا ترحم اور ترس زوہا کو مزید پاگل کرنے کا سبب بنتے۔۔۔وہ خود بھی زوہا کے لیے ایسی نگاہیں سہہ نہی پاتی تھیں۔۔۔اسی لیے اب فوری طور پر کھڑکیاں دروازے بند کر دیا کرتی تھیں۔۔۔ وہ زوہا کے قریب بیٹھ کے اسے خود میں بھینچے ہوئے تھیں۔۔۔زوہا بے خودسی اب اپنی بجائے ماں کو پیٹ رہی تھی۔۔۔ہاجرہ اس کے مکے سہہ رہی تھیں اور آنسو پی رہی تھیں۔۔۔قسمت نے انہیں کیا دن دکھائے تھے۔۔۔ان کی جوان اور خوبصورت بیٹی محض چھوٹے سے حادثے کے باعث کئی ماہ سے بستر کی نذر ہوئی پڑی تھی۔۔۔"کاش ان کے پاس ڈھیروں روپے ہوتے۔۔۔" ایک بار پھر اس سوچ کے آتے ہی ان کی آنکھوں کے ساتھ دل بھی جلنے لگا۔۔۔انہوں نے اپنی عمر کے کئی سال کسمپرسی میں کاٹ لیے تھے لیکن اب یہ تنگدستی ان کی زوہا کی صحت کے آڑے آچکی تھی۔۔۔اگر ان کے پاس وسائل ہوتے تو زوہا اپنے پیروں پہ کب کی کھڑی ہو چکی ہوتی۔۔۔ایک آپریشن کی دوری پہ زوہا کی ہنستی کھیلتی زندگی تھی لیکن اس دوری کو پاٹنے کے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔۔۔!

زوہا کا ہاتھ سائیڈ ٹیبل پہ رکھے سٹیل کے جگ اور گلاس کو لگا تھا اور زوردار کان پھاڑتی آواز کے ساتھ وہ چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔۔۔ہاجرہ ایک تکلیف دہ سانس اندر کھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور موبائل ڈھونڈنے لگیں۔۔۔اس وقت بس زمن ہی آ کر زوہا کو سنبھال سکتی تھی اور آج اسے روٹین سے کچھ تاخیر بھی ہو چکی تھی۔۔۔کمرے میں موبائل نا پا کر انہوں نے روتی چیختی زوہا پہ ایک افسردہ نگاہ ڈالی۔۔۔موبائل یقیناً لاؤنج میں تھا۔۔۔وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتیں دروازے بھیڑ کر باہر نکل گئیں۔۔۔!

☆......☆......☆

حیات راؤ کے پیچھے پیچھے چلتی زمن نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھ کر وقت دیکھا۔۔۔اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی لیکن وہ حیات راؤ کے پُر شفقت رویے سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ انہیں ٹوکنے کی ہمت

نہی کر پا رہی تھی۔۔۔اب جب دیر ہو ہی گئی تھی تو دس پندرہ منٹ اور سہی۔۔۔حیات راؤ جس جانب جا رہے تھے یہ سب کارِیڈورز اور لابیز اس کی دیکھی بھالی تھیں۔۔۔رباب آنٹی کے ساتھ وہ ڈاکٹر مہریار کو ملنے یہیں تو آئی تھی۔۔۔اس نے ایک پل کو سوچا کہ وہ حیات راؤ سے پوچھے کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں لیکن خاموش رہی۔۔۔اگلے دو منٹ میں اس کی نگاہوں کے سامنے جس آفس کی نیم پلیٹ تھی اس پہ جلی حروف سے "نیورو سرجن ڈاکٹر مہریار راؤ" چمک رہا تھا۔۔۔اس کی نگاہوں کے سامنے جیسا سبھی کچھ گھوم گیا۔۔۔وہ ایک نظر حیات راؤ پہ ڈال رہی تھی تو دوسری نیم پلیٹ پہ۔۔۔ایک دم جیسے جھماکا سا ہوا۔۔۔

"اچھا تو یہ اس سڑیل کے والد ہیں۔۔۔اور یہ کھڑوس تو بلکل ان انکل کی جوانی ہے۔۔۔لو بھلا بتاؤ۔۔۔مجھے راستے میں ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔۔۔!" وہ دل میں اپنی عقل پہ افسوس کرتی خود کو کوس رہی تھی۔۔۔واپس ہو نہیں سکتی تھی کہ وجہ کیا بتاتی اور مہریار کا سامنا کرنا نہی چاہتی تھی فی الحال کہ ابھی موبائل کا غصہ تازہ تھا۔۔۔چوہدری حیات راؤ نے ہلکا سا ناک کر کے استحقاق کے ساتھ دروازہ کھولا اور اسے سر کے اشارے سے اندر آنے کا کہہ کر خود اندر داخل ہو گئے۔۔۔زمن ہونٹ بھینچتی اپنا بیگ مضبوطی سے تھامتی ان کے پیچھے پیچھے چھپتی اندر داخل ہو گئی۔۔۔سامنے مہریار اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ دوسری جانب کیے کچھ رپورٹس دیکھ رہا تھا۔۔۔حیات راؤ نے گلا کھنکھار کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ تیر کی سی تیزی سے سیدھا ہوا اور یکدم جگہ چھوڑتا گرم جوشی سے باپ کی جانب بڑھا۔۔۔

"اباجی۔۔۔واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز۔۔۔ہر بار کی طرح حیران ہی کیا آپ نے۔۔۔!" مہریار راؤ باپ کے گلے لگ گیا۔۔۔حیات راؤ نے محبت اور شفقت سے اسے بھینچ لیا۔۔۔تبھی ان کے کندھے کے اوپر سے مہریار کی نگاہ اس پہ پڑی تو وہ ادھر ادھر دیکھتی خود کو لاتعلق ظاہر کروانے لگی۔۔۔مہریار نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی جس کے اوپر سے وہ اسے اچھے سے جانچ رہا تھا۔۔۔

"بدتمیز۔۔۔کون کہے گا اسے ڈاکٹر۔۔۔ہر چیز کا معائنہ کرنے لگ جاتا ہے۔۔۔آنکھیں دیکھو ذرا اس کی جیسے اندر تک اترتی ہوں۔۔۔عینک کتنی سوٹ کر رہی اسے ویسے۔۔۔اس کے اباجی ناموجود ہوتے تو لگا پتے دیتی اسے۔۔۔!" وہ حسب معمول دل ہی دل میں شیر بنتی اسے لتاڑ رہی تھی۔۔۔مہریار

سیدھا ہوا اور عینک اتار کے ہاتھ میں پکڑتا حیات راؤ سے استفسار کرنے لگا۔۔۔

"ان کو جانتے ہیں کیا آپ اباجی۔۔۔ یہ کیسے آپ کے ساتھ آ گئیں۔۔۔ کہاں ملیں آپ کو۔۔۔؟"

اس کے لہجے کی کرید نے زمن کو ٹھٹکا دیا۔۔۔ ایک عجیب سی ہتک کا احساس اس کے چہرے پہ سرخی بن کے دوڑا لیکن اس نے رخ پھیر کے چھپا لیا۔۔۔ حیات راؤ کرسی پہ بیٹھ گئے اور زمن سے مخاطب ہوئے۔۔۔

"بیٹا آؤ نا بیٹھو۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔۔۔ بس اسی سے ملنے کے لیے رکا ہوں۔۔۔ تسلی سے بیٹھو بس ابھی چلتے ہیں۔۔۔!"

"جی۔۔۔ وہ انکل ایکچوئلی میں خود سے چلی جاتی ہوں۔۔۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔۔۔ پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی ہوں۔۔۔!" وہ بیٹھنے کی بجائے وہاں سے نکلنے کے پر تولنے کو تھی جب مہریار کی سرد اور بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔۔۔

"بیٹھ جائیں۔۔۔ بزرگوں کا کہا نہیں ٹالا کرتے اس میں بہتری ہوتی ہے۔۔۔ بیٹھیں۔۔۔!"

آخر میں اس کا انداز ڈپٹنے والا ہو گیا تھا۔۔۔ زمن بے اختیار بیٹھ گئی۔۔۔ حیات راؤ کو ہنسی آ گئی۔۔۔ وہ اس کی خفت مٹانے کی خاطر بولے۔۔۔

"برا نا ماننا بچی۔۔۔ یہ میرا بیٹا ذرا مزاج کا کڑوا ہے لیکن دل سونے کا ہے اس کا۔۔۔" پھر وہ مہریار کو دیکھتے ہوئے زمن سے ملاقات کا قصہ مختصراً دہرانے لگے۔۔۔

"میں انہیں جانتا ہوں اباجی۔۔۔ ان کی بہن کا کیس ہے میرے پاس۔۔۔ ان شاءاللہ اسی ماہ کے اینڈ تک ان کو آپریشن کی ڈیٹ دے رہے ہیں ہم۔۔۔ دیکھیں اللہ بہتری کرے گا ان شاءاللہ۔۔۔!"

حیات راؤ متعجب سے زمن سے زوہا کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگے۔۔۔ وہ سر جھکائے اس کی حالت اور کیفیت انہیں بتانے لگی۔۔۔ اس دوران مہریار نے ایک پل کو بھی اس کے چہرے سے اپنی سپاٹ نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔۔۔ اس کی نگاہوں کی گرمی یا سرد مہری تھی جس نے زمن کو چونکنے پہ مجبور کیا تھا۔۔۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کے دیکھا تو مہریار کو خود کو دیکھتے پایا۔۔۔ اسے لگا کہ اب وہ اپنی نظریں ہٹا لے گا لیکن وہ یک ٹک بے تاثر نگاہیں اس پہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔۔۔ زمن کو اپنی ہی نظر پھیرنی پڑی تھی۔۔۔

"چول۔۔۔بدتمیز۔۔۔اتنا بڑا ڈاکٹر اور کام دیکھو ذرا اس کے۔۔۔!"

دل میں اسے لتاڑتی وہ حیات راؤ کے کسی سوال کا جواب دینے لگی تھی جب بیگ میں پڑا اس کا موبائل بج اٹھا۔۔۔اس نے معذرتی کلمات کہتے بیگ سے موبائل نکالا اور کال پک کی۔۔۔

"جی۔۔۔کب۔۔۔تو آپ کو چوٹ تو نہی آئی۔۔۔" وہ ایکدم اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔۔۔حیات راؤ سیدھے ہو کے اسے دیکھنے لگے جب کہ مہریار تسلی سے کرسی کے ساتھ پشت ٹیکے ہلکے ہلکے جھولتے کہنی ٹیبل پہ ٹکائے اور ہاتھ ٹھوڑی پہ جمائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔۔۔زمن اب اس کی نگاہوں سے کنفیوز ہو رہی تھی۔۔۔بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں معمولی سی لرزش تھی۔۔۔

"میں بس پہنچ رہی ہوں۔۔۔آپ فکر نا کریں۔۔۔دس منٹ لگیں گے مجھے۔۔۔ابھی آئی بس۔۔۔!"

کال بند کر کے وہ حیات راؤ سے عاجزی کے ساتھ مخاطب ہوئی۔۔۔

"سوری انکل مجھے جانا ہو گا۔۔۔آپ پلیز مجھے چھوڑنے کی زحمت مت کیجیے۔۔۔اصل میں میری امی کی کال تھی۔۔۔میری بہن اکثر اپنی بیماری کی وجہ سے ہسٹیریکل ہو جاتی ہے۔۔۔ابھی بھی اسے دورہ پڑا ہے۔۔۔ایسے میں وہ امی کے قابو میں نہی آتی۔۔۔پلیز مجھے جلدی پہنچنا ہو گا ورنہ وہ خود کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہی کرتی۔۔۔آپ کا بہت شکریہ لیکن میں چلتی ہوں۔۔۔بہت اچھا لگا آپ سے مل کر۔۔۔!"

وہ جلدی جلدی کہتی وہاں سے نکلنے کو تھی جب مہریار نے اسے آواز دے کے روکا۔۔۔

"رکیں مس زمن۔۔۔میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔۔۔آپ کی سسٹر کو بھی دیکھ لوں گا۔۔۔اس وقت اسے آپ سے بھی زیادہ ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔۔۔" پھر وہ حیات راؤ سے مخاطب ہوا۔۔۔

"اباجی آپ گھر چلیں اور چنڈال چوکڑی سے ملیں جا کے۔۔۔ریسٹ کریں تھوڑا۔۔۔تب تک میں انہیں ڈراپ کر کے گھر پہنچتا ہوں۔۔۔!"

زمن حیرت سے اس کا فیصلہ کن انداز دیکھ رہی تھی۔۔۔نا اس سے پوچھا کہ آیا وہ اس کے ساتھ جانا بھی چاہتی ہے یا نہی نا اس کی اجازت لی بس حکم دے دیا تھا۔۔۔کمال ہے۔۔۔!

"چلو ٹھیک ہے۔۔۔جیسے تمہیں مناسب لگے۔۔۔" کہہ کر حیات راؤ بھی کھڑے ہو گئے اور زمن کو دیکھتے ہوئے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔۔۔

"گھبراؤ نہی۔۔۔ان شاء اللہ جلد اچھی ہو جائے گی تمہاری بہن۔۔۔تم بہت پیاری بچی ہو اور اتنی ہی باہمت بھی۔۔۔یہ میرا کارڈ رکھ لو۔۔۔کبھی کیسی بھی ضرورت پڑی تو پورے مان سے مجھ سے رابطہ کر لینا۔۔۔ان شاء اللہ کام آؤں گا۔۔۔!"

پتا نہی کس جذبے کے تحت حیات راؤ اس سے محبت جتا رہے تھے یہ نا انہیں پتا تھا نا زمن کو۔۔۔ لیکن اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔۔۔ان کے ہاتھ سے کارڈ لیتے وہ آنسو پی گئی۔۔۔حیات راؤ نے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔۔۔وہ انہی الوداع کہتی باہر کی جانب قدم بڑھا گئی۔۔۔اس نے اپنے پیچھے مہریار کی آواز سنی تھی جو باپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔وہ رکی نہی اور تیز تیز قدموں سے کاریڈور عبور کرتی ہاسپٹل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ تیز قدموں سے پارکنگ سے باہر نکل رہی تھی جہاں ایک قطار میں رکشہ اور چنگ چی وغیرہ کھڑی تھیں۔۔۔اس کی کوشش تھی کہ وہ مہریار کے باہر آنے سے پہلے یہاں سے نکل لے۔۔۔جہاں تک زوہا کو دیکھنے کی بات تھی تو وہ تو ویسے ہی جلد رباب آنٹی کے ہمراہ اسے ہاسپٹل لانے والی تھی تھارولی چیک اپ کروانے کے لیے۔۔۔لیکن ڈاکٹر مہریار کو گھر تک لے جانے کی کوئی تک نہی تھی۔۔۔وہ ماننا نہی چاہتی تھی لیکن وہ اندر سے مہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔۔۔ایک خالی رکشے میں بیٹھ کے وہ اسے جلدی جلدی پتا سمجھانے لگی۔۔۔رکشے والے نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور ٹرن لے کے سڑک پہ ڈالا ہی تھا جب بلکل سامنے اچانک سے مہریار کی گاڑی نے سائیڈ سے آ کر بریک لگائے تھے۔۔۔رکشے والے کو ایک جھٹکے سے رکشہ روکنا پڑا

۔۔۔زمن ڈاکٹر مہریار کو دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔۔۔اسے امید نہی تھی کہ وہ اس طرح سے اسکے پیچھے آ جائے گا۔۔۔مہریار نے شیشہ نیچے اتار کے اسے دیکھا اور سر کو خفیف سی حرکت دے کر اسے اشارہ کیا

جس کا مطلب تھا کہ وہ رکشے سے اترے اور اس کے ساتھ آ کے بیٹھے۔۔۔زمن بیٹھی رہی۔۔۔ہٹ دھرمی سے نہی بلکہ اسے سمجھ نہی آ رہی تھی کہ وہ کرے کیا۔۔۔!

مہر یار نے ایک ابرو اچکا کے اسے دوبارہ دیکھا اور ہارن دیا۔۔۔وقفے سے وہ مسلسل چھوٹے چھوٹے ہارن دیتا چلا گیا کیونکہ یہ ہسپتال تھا اور یہاں وہ اس طرح شور بھی نہی مچا سکتا تھا۔۔۔زمن کو مجبورا نیچے اترنا پڑا۔۔۔اپنا بیگ کندھے پہ ٹھیک کرتی وہ ڈاکٹر مہر یار کو کوفت زدہ نگاہوں سے دیکھتی ساتھ والی سیٹ پہ آ کے بیٹھ گئی۔۔۔مہر یار نے ایک نظر اس کے گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھا جن کی وہ مسلسل انگلیاں چٹخا رہی تھی اور مسکراہٹ چھپاتے ہوئے گاڑی سیدھی سڑک پہ ڈال دی۔۔۔

مہر یار اس کی ایک ایک جنبش کو نوٹس کر رہا تھا۔۔۔اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی اور وہ مسلسل اپنے ہونٹ گول کر کے سانس چھوڑتی خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔مہر یار نے کچھ کہنا چاہا لیکن لب بھینچ گیا۔۔۔باقی سارا راستہ دونوں میں کوئی بات نہی ہوئی تھی۔۔۔سوائے اس کے کہ اس نے زمن سے گھر کا راستہ پوچھا تھا اور وہ اس نے پتھر پھاڑ لہجے میں بتایا تھا۔۔۔مقابل مہر یار تھا جسے ایسے لہجوں کی عادت ہر گز نہی تھی۔۔۔اس کی پیشانی پہ انگنت بل پڑے تھے اور اس نے قدرے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔۔۔

"خود سے بڑوں کے ساتھ تہذیب اور تمیز کے دائرے میں رہ کے بات کرنی چاہیے پھر چاہے کوئی رشتے میں بڑا ہو یا حیثیت میں۔۔۔!"

وہ زمن کو ان دو فقروں میں جو جو باور کرا گیا تھا اس نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔۔۔یعنی ڈھکے الفاظ میں اس نے اپنی اور اس کی حیثیت کا تعین بھی کر دیا تھا۔۔۔زمن کے حلق میں گولا سا پھنسا۔۔۔وہ تھوک نگلتے بمشکل اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔گھر آنے تک پھر ان دونوں میں دوبارہ کوئی بات نہی ہوئی۔۔۔گاڑی رکتے ہی زمن تیزی سے اتری اور گھر میں داخل ہو گئی۔۔۔مہر یار نے ہونٹ بھینچ کے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا اور تب تک نہی ہٹایا جب تک وہ دوبارہ باہر واپس نہی آئی اور اسے پورے احترام سے اپنے ساتھ اندر نہی لے گئی تھی۔۔۔مہر یار کی مسکراہٹ

اس کے دل کو جلاتی رہی اور اس کا بس نہی چل رہا تھا کہ وہ اسے بے نقط سناتی۔۔۔لیکن مجبوری اسے اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

زوہا سو چکی تھی۔۔۔ڈاکٹر مہریار نے اسے سکون آور انجیکشن دیا تھا۔۔۔اس کی دواؤں میں ایسی کئی دوائیاں موجود تھیں جو محض اس کے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لیے تھیں اور انہی میں انجیکشنز بھی تھے۔۔۔جوں جوں آپریشن میں تاخیر ہوتی چلی گئی تھی زوہا کا ڈپریشن بڑھتا چلا گیا تھا اور مجبوراً اسے ایسی ہی دواؤں پہ رکھنا پڑتا تھا جس سے وہ پرسکون رہے۔۔۔!

جس وقت مہریار زمن کی تقلید میں کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔۔۔ہاجرہ، زوہا کو سنبھالنے میں پوری طرح ہلکان ہو چکی تھیں۔۔۔مہریار کو آتا دیکھ کر وہ چونکیں تھیں لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کہتیں، مہریار نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں فی الوقت روک دیا تھا اور خود آگے بڑھ کر زوہا کو دیکھنے لگا۔۔۔اس کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی دوائیں دیکھ کر اس کے چہرے پہ تاسف کی لکیریں ابھریں لیکن کچھ کہنا عبث تھا۔۔۔فوری طور پر اس نے زوہا کو انہیں دوائیوں میں موجود انجیکشن دے دیا تھا جس سے وہ سو گئی تھی۔۔۔اس کے بعد سٹول کھینچ کے تسلی سے وہیں بیٹھ کے تفصیلاً دوائیوں کا اور زوہا کا معائنہ کرنے لگا۔۔۔تمام رپورٹس تو وہ تبھی دیکھ چکا تھا جب زمن اور رباب آنٹی اس کے پاس آئی تھیں۔۔۔!

”جب تک آپریشن کی حتمی تاریخ نہی دی جاتی ان سب میڈیسنز کا استعمال ترک کر دیں اور جو لکھ کے دے رہا ہوں بس وہی دیں۔۔۔!“

مہریار نے ایک پیپر پہ کچھ دوائیاں لکھ کے زمن کے حوالے کیا۔۔۔ہاجرہ اس دوران خاموشی سے سب دیکھتی رہی تھیں۔۔۔اتنا تو انہیں اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ وہی ڈاکٹر ہے جس کے پاس زمن اور رباب گئی تھیں۔۔۔وہ فارغ ہو گیا تو انہوں نے پُرشفقت لہجے میں بات شروع کی۔۔۔

”بیٹا۔۔۔زمن نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔یقین مانو ہم تمام زندگی آپ کے بے دام غلام رہیں گے بس کسی طرح میری بچی کو اس کے پیروں پہ کھڑا کر دو۔۔۔!“

باجرہ جذباتی ہو گئی تھیں۔۔۔ایک عرصے سے زوہا کی تکلیف دیکھ اور سہہ رہی تھیں۔۔۔مہریار تو مانو ان کے گھر میں فرشتہ بن کر اتر آیا تھا۔۔۔ان کی نگاہوں میں اس کے لیے عقیدت تھی۔۔۔مہریار نے ان کے تاثرات کو بغور دیکھا تو نگاہیں جیسے ان کے نقوش میں الجھ گئیں۔۔۔آنکھیں، پیشانی، ناک اور ٹھوڑی۔۔۔سبھی کو دیکھتے وہ کچھ کہنے کو الفاظ جوڑنے لگا۔۔۔

"آپ فکر نا کریں۔۔۔اس ہفتے ڈاکٹرز کا پینل بیٹھے گا اور بس چند مزید ٹیسٹ ہوں گے۔۔۔اس کے بعد آپریشن کی ڈیٹ دے دی جائے گی۔۔۔ان شاء اللہ امید ہے کہ آپریشن کامیاب ہو گا کیونکہ بہتری کے چانسز زیادہ ہیں۔۔۔اللہ سے اچھے کی امید رکھیں بس۔۔۔!"

وہ جھکی نگاہوں کے ساتھ باجرہ کو تسلی دے رہا تھا اور زمن اس کے اس انداز پہ حیرت زدہ تھی۔۔۔اتنی عزت و احترام تھا اس شخص کی نگاہوں میں کہ وہ مرعوب ہو گئی۔۔۔باجرہ نے مہریار کو زبردستی چائے پہ روک لیا تھا اور وہ بنا عذر کے ٹھہر بھی گیا تھا۔۔۔جب تک زمن چائے لینے گئی، مہریار نے تفصیل سے پورے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔۔۔جو سادہ اور صاف ستھرا تو ضرور تھا لیکن کسی قسم کی آرائش و آسائش سے عاری تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

اپنے دفتر میں لیپ ٹاپ کی سکرین کھولے بیٹھا شہزور راؤ کب سے ایک ہی زاویے پہ نگاہ ٹکائے سوچ میں گم تھا۔۔۔لیپ ٹاپ کی روشنی اس کے چہرے کے کھردرے اور مغرور نقوش کو اجاگر کر رہی تھی۔۔۔اس کے آفس میں نیم اندھیرا تھا۔۔۔بلائینڈز گرے ہوئے تھے۔۔۔ٹنٹڈ گلاس ڈور سے باہر سٹاف چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا لیکن باہر سے اندر کا منظر نہیں دکھتا تھا۔۔۔شہزور بظاہر لیپ ٹاپ پہ بزی تھا لیکن اس دن کا منظر ذہن کے پردے پہ بھاگ رہا تھا۔۔۔اسے دیکھ کے جس تیزی سے وہ بھاگی تھی اس سے کہیں زیادہ پھرتی سے وہ خود اس کی جانب لپکا تھا لیکن بس لمحوں کا فرق تھا اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔۔۔گزشتہ کئی سالوں میں بارہا وہ اس تک پہنچا تھا لیکن ہر بار کوئی نا کوئی ایسا اتفاق رونما ہوتا کہ مٹھی سے ریت کی مانند وہ پھسل جاتی۔۔۔یا اس کی قسمت تیز تھی یا شہزور کی بری۔۔۔لیکن یہ مات شہزور راؤ کو ہضم کرنی مشکل تھی۔۔۔وہ کوئی اس کا زرخرید تھا جو یوں اس کے پیچھے پیچھے

بھاگتا۔۔۔اتنے بڑے شہر میں اب تک وہ اس کے ٹھکانے سے لاعلم تھا تو محض اسی لیے کہ وہ شناخت بدلے ہوئے تھی۔۔۔اس کا نام اور شخصیت تبدیل ہو چکی تھی ورنہ اتنے تو ریسورسز شہزور راؤ کے تھے کہ وہ اسے ڈھنڈوا کے حویلی پہنچا دیتا اور کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔۔۔تھوڑی دیر ایسی ہی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کی سکرین بند کی اور انٹر کام سے اپنی سیکرٹری کو اندر بلایا۔۔۔ایک طرح دار سی لڑکی اندر داخل ہوئی اور چوکس و مؤدب ہو کے اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔۔۔

"مس لائبہ۔۔۔میرے اگلے ایک ہفتے کے جتنے بھی اپوائنٹمنٹس ہیں سبھی کینسل کر دیں۔۔۔مجھے بہت ضروری کام نپٹانا ہے اس ویک میں۔۔۔میرا زیادہ تر وقت آفس سے باہر گزر سکتا ہے تو اس لیے بی کیئر فل۔۔۔کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔۔۔زبیر صاحب کو بھی بلائیں کچھ لازمی انسٹرکشنز انہیں بھی دینی ہیں۔۔۔!"

"جی سر۔۔۔آپ بے فکر رہیں۔۔۔میں سنبھال لوں گی۔۔۔اور سر زبیر کو ابھی بھجواتی ہوں میں۔۔۔جسٹ آمنٹ۔۔۔!" وہ مسکرا کے کہتی واپس ہونے لگی جب شہزور نے اسے روکا۔۔۔

"مس لائبہ۔۔۔نادرہ کے دفتر میں جو کریمی صاحب ہوتے ہیں، ذرا ان سے میرا کانٹیکٹ کروائیے۔۔۔ابھی۔۔۔!"

"جی سر۔۔۔شیور۔۔۔!" وہ کہتی واپس مڑ گئی تھی۔۔۔اور شہزور راؤ دوبارہ لیپ ٹاپ کی سکرین اوپن کیے خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

"حیات مینشن" کے لاؤنج میں چوہدری حیات راؤ کو چنڈال چوکڑی گھیرے بیٹھی تھی۔۔۔داور اور یاور نے ان کے پہلوؤں کو مختص کر رکھا تھا۔۔۔حرام تھا جو وہاں سے جنبش بھی کی ہو اور کسی اور کی باری آنے دی ہو۔۔۔نانی پیاری کا بس نہی چلتا تھا کہ انہیں بالوں سے پکڑ کے نیچے پٹخ دیتیں۔۔۔لو بھلا بتاؤ کتنے مہینے بعد ان کا بھانجا کم بھتیجا گاؤں سے آیا تھا اور ان لڑکوں نے ڈھنگ سے حال احوال بھی دریافت کرنے نہی دیا تھا۔۔۔وہ ناچار دوسرے صوفے پہ بیٹھی باری باری سب کا پوچھ رہی تھیں۔۔۔شہریار نیچے کارپٹ پہ بیٹھا باپ کی پھیلی ٹانگ گود میں رکھے دبا رہا تھا۔۔۔جبکہ دوسری ٹانگ بلکل اسی

پوزیشن میں زارون نے گود میں تو لے رکھی تھی لیکن وہ اپنے ماموں کے پیر کے انگوٹھے پہ غور وفکر کرنے میں مصروف تھا۔۔۔

"آ گئی سمجھ ماموں۔۔۔! اب لگا پتا مجھے۔۔۔!"

وہ خوش ہو کے چہکا اور سب کو داد طلب نظروں سے دیکھا۔۔۔حیات راؤ مسکرائے اور ہاتھ بڑھا کے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"کیا سمجھ آ گئی تمہیں۔۔۔ چلو اچھا ہے کچھ تو آئی۔۔۔تمہاری ماں ناحق پریشان ہوتی ہے کہ میرے زارون کو کچھ پتا نہی۔۔۔اسے کبھی سمجھ نہی آسکتی۔۔۔!"

حیات راؤ کہہ کر ہلکا سا ہنسے تو شہر یار نے منہ نیچے کر کے ہنسی دبائی۔۔۔کیونکہ وہ جانتا تھا زارون اسی بات کا ثبوت دینے جا رہا ہے۔۔۔

"یہ آپ کا انگوٹھا۔۔۔تب سے سوچ رہا تھا کہ کس کیطرح ہے۔۔۔ابھی یاد آیا کہ میری طرح ہے۔۔۔یہ دیکھیں۔۔۔میرا انگوٹھا۔۔۔!"

زارون نے فوراً اپنا پیر اونچا کیا اور فخریہ انگوٹھا لہرایا۔۔۔شہر یار نے" در فٹے منہ" والی نظر اس پہ ڈالی لیکن وہ ابھی بھی اپنا انگوٹھا دیکھ رہا تھا۔۔۔حیات راؤ نے تاسف سے اسے دیکھ کے سر جھٹکا۔۔۔

"یہ لڑکا نمرہ نے پاکستان بھیجا تھا کہ بندے کا پتر بن جائے لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ جو تھوڑی بہت عقل ساتھ لایا تھا وہ بھی۔۔۔"

"یہ تینوں چوس گئے نمانے کی۔۔۔" نانی پیاری نے حیات راؤ کی بات اچک کے نخوت سے لقمہ دیا۔۔۔تینوں کی گردنیں ایک ساتھ نانی پیاری کی جانب اٹھیں پھر باپ کا لحاظ کر کے واپس موڑ لی گئیں۔۔۔ورنہ پانی پت تو وہ نانی سے بھی چھیڑ لیا کرتے تھے۔۔۔

"اور تم تینوں۔۔۔تم لوگ پڑھ رہے ہو ٹھیک سے کہ نہی۔۔۔مہر یار کو تنگ تو نہی کرتے ہو زیادہ۔۔۔اور داور، یاور یہ بال کس لیے اس قدر بڑھا رکھے ہیں۔۔۔غنڈے لگ رہے ہو دونوں۔۔۔!"

حیات راؤ اب ان تینوں کی طرف بھرپور متوجہ تھے۔۔۔داور نے کھسکنے کی کوشش کی وہاں

سے لیکن نانی پیاری نے چھڑی کا ٹہوکا دے کے واپس بٹھا دیا۔۔۔

" ہائے مینو بچھ۔۔۔غنڈے تو بڑا ہولا سا لفظ ہے۔۔۔ست بدمعاش اک پاسے تے یہ دو نیش اک پاسے۔۔۔مہریار پٹ پٹ ہار گیا ان دونوں مشٹنڈوں کو لیکن حرام ہے جو کسی شے کا اثر لیتے ہوں۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے جوئیں بھی پے گئ ہوئی ہیں ان کے سروں میں۔۔۔ہر ویلے تو کھرکتے رہتے ہیں۔۔۔!"

حیات راؤ نے خشمگیں نگاہوں سے دونوں کو گھورا۔۔۔شہریار نے ہاتھ چلا کے اپنے بال سیٹ کیے جو قدرے بہتر تھے۔۔۔

" اور تم۔۔۔تمہاری یونیورسٹی کب ختم ہونی ہے۔۔۔کب سے سن رہا ہوں یہ سمسٹر وہ سمسٹر۔۔۔کس دن فارغ ہو گے تم۔۔۔ماں تمہاری کو چین نہی کہ کسی طرح لڑکوں میں سے کوئ پڑھ کے فارغ ہو اور وہ گھوڑی چڑھا دے۔۔۔مہریار تو نہی مانتا تو کم از کم تم ہی ماں کی خواہش پوری کرو۔۔۔!"

حیات راؤ نیم سنجیدگی سے بولے۔۔۔انہی معلوم تھا کہ مہریار کسی بھی لڑکے کی تعلیم پوری ہونے سے پہلے شادی نہی ہونے دے گا۔۔۔لیکن مزے لینے کو کہہ رہے تھے۔۔۔شہریار تو کیا خوش ہوتا اس سے زیادہ بے چینی داور اور یاور کو لگی تھی۔۔۔

" اباجی۔۔۔اماں کو کہنا کہ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔۔۔اگر کبھی کوئ کسر رہنے دیں تو جو کالے چور کی سزا وہ ہماری۔۔۔بس اس نیک کام میں ہمارا حصہ ڈلوا لیں۔۔۔اب تو اباجی سولہ سولہ سال کے نیانے شادیاں کرا رہے۔۔۔اپنے بال سنوارنے نہی آتے لیکن ہاتھ میں اپنا کالے کے جھنڈ کروا رہے ہوتے ہیں۔۔۔ہم تو پھر چار ماہ بعد انیس کے ہو جائیں گے۔۔۔!"

داور نے بڑی لگاوٹ سے باپ سے لاڈ کیا تھا۔۔۔زارون بھی نچلا ہونٹ لٹکائے شاید تصور میں ہاتھ میں کوئ کا کا پکڑے بیٹھا تھا جس کی وہ جھنڈ کروا رہا تھا۔۔۔تبھی دونوں آنکھیں ذرا سی میچ کے نتھنے پھلا کے ماموں سے مخاطب ہوا تو لہجہ بھی تھوڑا خوابناک تھا۔۔۔

" ماموں۔۔۔آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔۔۔"

" پہلے کھول تو سہی پوری۔۔۔شٹر گرا ہوا ہے۔۔۔" شہریار بڑبڑایا۔۔۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ پڑھائی ہوتی رہے گی۔۔۔یہ وقت ہے فیملی بنانے کا۔۔۔آبادی بڑھانے کا۔۔۔ہم دو ہمارے چار کا نعرہ لگانے کا۔۔۔ویسے میرا دل اس سے زیادہ کا تھا لیکن امی کو اتنے ہی بتایئے گا۔۔۔لیکن مین نے سوچ لیا ہے کہ شادی ٹھیک وقت پہ ہو جانی چاہیے اور وہ ٹھیک وقت یہی ہے۔۔۔!"

"نہی بیٹا یہی وقت ہے ماں سے جوتے کھانے کا۔۔۔جو بچپن میں ہی وقت پہ پڑ گئے ہوتے تو آج یہ دن مجھے نا دیکھنا پڑتا۔۔۔آج سمجھ آگئی برخوردار کہ اس نے تمہیں یہاں کیوں بھیجا تھا، بڑا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے تمہارے جیسی اولاد سنبھالنے کے لیے۔۔۔!"

زاروں کے نادر خیالات جان کے حیات راؤ تاسف سے دونوں ہاتھ جوڑے ان پہ ٹھوڑی ٹکائے بولے تھے۔۔۔انہیں صحیح معنوں میں معلوم ہو رہا تھا کہ مہریار ان چاروں کو سنبھالتے کس طرح عاجز آتا ہوگا۔۔۔شہریار کے ہاتھوں میں سلوموشن تالی بجانے کے لیے کھجلی ہو رہی تھی کیونکہ عام حالات میں اب تک تین سیشن ہو چکے ہوتے۔۔۔نانی پیاری افسوس سے چاروں کو دیکھتی حیات راؤ سے بولیں۔۔۔

"پتر اسی لیے کہتی ہوں کہ مہر کو منا شادی کے لیے۔۔۔بس کرلاؤ دیکھنے۔۔۔پیو ہے اس کا۔۔۔زبردستی کہے گا تو مانے گا کیوں نہی۔۔۔ان ڈنگروں کو اگر سکون سے ڈگریاں دلوانی ہیں نا تو کوئی سیانی بیبی بچی لے آ گھر۔۔۔ورنہ ان ڈنگروں کی ذہنی حالت تو تُو دیکھ ہی رہا ہے۔۔۔!"

حیات راؤ ہنس دیے۔۔۔ان کے لیے کوئی نئی بات نہی تھی ان چاروں کی ایسی بے پر کی سننا۔۔۔لیکن بات کو طول دیتے تھے کیونکہ اتنے دن بعد بچوں سے ملاقات ہوتی تھی اور وہ ان سے اداس بھی ہوا کرتے تھے تو ان چاروں کی ایسی ہی باتیں انہیں گاؤں واپسی پر یاد آ آ کر ہنسایا کرتی تھیں۔۔۔ورنہ وہ جانتے تھے کہ مہریار پوری تندہی سے ان کے مستقبل کے لیے کوشاں ہے۔۔۔ہر ہفتے مکمل رپورٹ انہیں گاؤں میں مہریار کی زبانی ملا کرتی تھی۔۔۔!

وہ نانی پیاری کو ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دیتے بہلانے لگے۔۔۔لیکن دماغ میں پہلی بار مہریار کی شادی کی بات سن کر ایک چہرہ ابھرا تھا۔۔۔اور جیسے اس چہرے کے ساتھ کئی اور چہرے ابھرتے چلے گئے تو انہوں نے فوراً سر جھٹک کے دھیان ہٹایا تھا۔۔۔کڑی در کڑی جڑے واقعات کو ذہن سے ہٹانے

کے لیے وہ ان چاروں کیطرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن جیسے ان چہروں نے شعور سے لاشعور کا رخ کیا تھا ۔۔۔کسی اور گھڑی میں یاد آنے کے لیے ۔۔۔!

وقت کی بساط بہت عجیب ہوا کرتی ہے ۔۔۔اس پہ مہرے پل پل کے حساب سے بدلتے ہیں اور چالیں تقدیر چلا کرتی ہے ۔۔۔شہ مات اپنے ہاتھ میں رکھ کر ۔۔۔! مقدر کا سکندر کوئی بھی نہی ہوا کرتا بس اندھیروں میں چلے تیر ہوتے ہیں جو نشانے پہ لگ جائیں تو بازی مات نہی ہوا کرتی ۔۔۔جو نا لگے تو ساری بساط الٹ جایا کرتی ہے ۔۔۔!

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 3

ریت سے بُت نہ بنا اے میرے اچھے فنکار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لا دوں
میں تیرے سامنے انبار لگا دوں لیکن
کون سے رنگ کا پتھر تیرے کام آئے گا؟
سرخ پتھر جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیّر کے پڑے ہوں ڈورے
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے
اِک وہ پتھر ہے جسے کہتے ہیں تہذیبِ سفید
اس کے مَرمَر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے
ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے
جتنے معیار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر

میرا الہام، تیرا ذہن رَسا بھی پتھر

اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے

ہاتھ پتھر ہیں تیرے، میری زباں پتھر ہے

ریت سے بُت نہ بنا اے میرے اچھے فنکار

(احمد ندیم قاسمی۔۔۔)

چوہدری حیات راؤ کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔۔۔ ہاتھ میں کتاب تھام رکھی تھی اور انہیں عادت تھی جب کوئی بات، کوئی فقرہ یا خوبصورت نظم دل کو چھو جاتی تو اسے باآواز بلند دہرایا کرتے تھے۔۔۔ اور کچھ پل آنکھیں موند کے ان لفظوں کی گہرائی میں اتر جاتے تھے۔۔۔ لکھنے والے کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔۔۔ یہی عادت آگے سے مہریار میں بھی تھی۔۔۔ اسی لیے ابھی جب وہ ہاتھ میں کافی کے دو مگ لیے کمرے میں داخل ہوا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حیات راؤ کچھ پڑھنے کے بعد اب اسے جذب کر رہے ہیں۔۔۔ وہ مسکرا دیا اور خاموشی سے ان کے قریب ایزی چیئر پہ ٹک گیا۔۔۔ وہ محویت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا جس پر کہیں کہیں موجود سو بر باریک جھریوں میں بیتتے وقت کی چھاپ تھی۔۔۔ وہ ان کا ارتکاز نہی توڑنا چاہتا تھا لیکن حیات راؤ کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔۔۔

"کافی کیوں بنا لائے۔۔۔ نیند اڑانی ہے کیا باپ کی۔۔۔؟" وہ بند آنکھوں سے کافی کی مہک کو نتھنوں سے اندر کھینچتے ہوئے بولے۔۔۔ مہریار مسکرا دیا۔۔۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور مہریار کے ہاتھ سے کافی کا مگ تھام لیا۔۔۔ کریم کافی تھی۔۔۔ وہ ان کی پسند کبھی نہی بھولتا تھا حالانکہ خود وہ سادی کافی لیتا تھا بنا دودھ کے۔۔۔ انہوں نے ایک سپ لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن کہتے نہیں۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیا باپ پہ بھروسہ نہی رہا۔۔۔؟"۔۔۔ وہ مسکرائے۔۔۔ مہریار نے افسوس سے انہیں دیکھا۔۔۔

"ایسا ہو سکتا ہے کیا ابا۔۔۔ دنیا میں پہلے اور آخری شخص آپ ہی ہیں جس پہ میں آنکھیں بند کر کے

یقین کرتا ہوں۔۔۔دل کی کہتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔۔۔!"

"تو پھر بتاؤ۔۔۔کیا بات ہے۔۔۔؟"

"بات کچھ بھی نہی۔۔۔بس یونہی کبھی کبھار دل کو بے چینی سی گھیر لیتی ہے۔۔۔سمجھ نہی آتا کہ تدارک کیسے ہو۔۔۔دل کرتا ہے کہ اس کی وحشتیں انسان کسی کنوئیں میں پھینک آئے جہاں سے وہ کبھی نکل نا سکیں۔۔۔!"

"لیکن برخوردار تم نے اپنے دل کو ہی کنواں بنالیا ہو تو کوئی کیا کرے۔۔۔اس میں سے نکالو گے تو نکلیں گی نا۔۔۔!"

"ابا۔۔۔" وہ اپنی ہی سوچوں میں گم بولا۔۔۔"ہم ماضی سے کیوں جڑے رہتے ہیں۔۔۔جب کہ وہ ہمارا پسندیدہ بھی نہی ہوتا۔۔۔ہمیں اس کی یادیں چاہیے بھی نہی ہوتیں۔۔۔تو کیوں ہم اس سے جان نہی چھڑا پاتے۔۔۔ہمارا ذہن اس حصے کو حذف کیوں نہی کر پاتا جو ہم سوچنا بھی نہی چاہتے۔۔۔!"

"کیونکہ ماضی کسی سطح پہ جمی گرد کا نام نہی ہے۔۔۔وہ تمہارے جسم کی رگوں میں دوڑتے خون میں موجود ہے۔۔۔تمہارے دماغ کے خلیوں میں رہتا ہے۔۔۔تمہارے دل کے ایک حصے پہ اس کا قبضہ ہوتا ہے۔۔۔بھلے سے کتنا ہی ناپسندیدہ ہو۔۔۔ناگوار ہو۔۔۔لیکن انسان لاشعوری طور پر اسے بھولنا نہی چاہتا۔۔۔وہ صرف کہتا ہے کہ ماضی سے اس کی وابستگی ختم ہو جائے۔۔۔لیکن درحقیقت ایسا وہ خود نہی ہونے دیتا۔۔۔!"

"لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ بھولوں سب اور موو آن کروں۔۔۔نہی یاد رکھنا چاہتا۔۔۔پھر بھی۔۔۔پھر بھی۔۔۔!" اس نے ہاتھ میں تھاما کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔۔۔

"کیا واقعی۔۔۔" حیات راؤ نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔۔۔جیسے جتا رہے ہوں۔۔۔

"تم بھولنا چاہتے تو گاؤں پلٹتے مہر۔۔۔بھولنا چاہتے تو دادا کو ملتے۔۔۔بھولنا چاہتے تو شادی کرتے۔۔۔بھولنا چاہتے تو آج اس لڑکی زمن کو اس کے گھر چھوڑنے نا جاتے۔۔۔!"

مہریار ہکا بکا سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

"اوئے گھامڑ۔۔۔جا جا کے پتا لگا کہ اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔۔۔جلدی اٹھ۔۔۔!" شہریار نے یاور کو لات مار کے بیڈ سے گرایا جو اس کے بیڈ پہ پوری جگہ گھیرے لیٹا تھا۔۔۔مہریار کے حیات راؤ کے کمرے میں جانے کے بعد سے وہ تینوں شہریار کے کمرے میں آ گھسے تھے۔۔۔انہیں پتا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے راوی نے سکون و آرام لکھنا تھا۔۔۔

"ہائے۔۔۔" یاور نیچے پڑا کراہا۔۔۔" اب تو اُکا (بلکل) ہی نہی جا سکتا۔۔۔لک ٹٹ گیا ہے میرا۔۔۔کسی اور کو بھیجیں اب۔۔۔ہائے۔۔۔" یاور نے ڈرامے بازی کرتے ہوئے مسلسل آہ بکا کی۔۔۔ شہریار نے اسے غصے سے گھورا اور داور پہ نگاہ جمائی۔۔۔داور فوراً سمجھ گیا اور لمحے کی دیر کیے بنا یاور کے ساتھ فرش پہ جا لیٹا۔۔۔

"میرا نگی ساتھی زخمی ہو گیا شہری بھیا۔۔۔اب تو میں اسی کے سنگ اٹھوں گا۔۔۔مجھے اٹھانے کی کوشش نا کرنا ورنہ دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔۔۔!"

شہریار نے جوتا کھینچ کے اس کی کمر پہ مارا۔۔۔وہ کمر پہ ہاتھ رکھے کروٹ بدل کر یاور کی بغل میں گھسا لیکن اٹھا پھر بھی نہی۔۔۔ناچار شہریار نے جمائی لیتے زارون کو دیکھا۔۔۔جس کا پورا کھلا منہ شہریار کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ادھ کھلے پہ واپس آ گیا۔۔۔اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کیے اور کہا

"ہرگز نہی۔۔۔زارون مر تو سکتا ہے لیکن جاسوسی نہی کر سکتا۔۔۔ویسے بھی تم لوگ مجھے آگے لگا کے پھنسوا کے جوتے پڑوا کے، زلیل کروا کے، مٹی پلید کروا کے بعد میں میری خود بینڈ بجاتے ہو۔۔۔اس لیے زارون بابا اب کبھی نکو جائے گا رے۔۔۔!"

شہریار تو اس کی تڑ تڑ چلتی زبان کو رشک سے دیکھتا رہ گیا۔۔۔

"واہ۔۔۔ماموں کیا آ گئے تیرے۔۔۔تُو تو پھر اسانڈ بن گیا رے بھانجے۔۔۔یہ مت بھول کہ تجھے ماموں بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔۔۔سمجھا۔۔۔مر تُو بھی یہیں۔۔۔میں خود دیکھتا ہوں جا کے۔۔۔اب آئے میرے پیچھے ذرا کوئی۔۔۔!"

شہریار تن فن کرتا کمرے سے نکلا اور ان تینوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نگاہوں کا

مفہوم سمجھ کے عقلمندی سے کھڑے ہو گئے۔۔۔

"جیئں گے تو ساتھ۔۔۔مریں گے تو ساتھ۔۔۔!"

زارون سینہ پھلاتا پرجوش سا بولا۔۔۔یاور اور داور کی آنکھیں اس سوکھے جوش پر نم ہو گئیں۔۔۔وہ بلترتیب آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے تھے۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ بنا پلک جھپکائے انہیں دیکھ رہا تھا جبکہ حیات راؤ نے دھیمی مسکان کے ساتھ کتاب بند کر کے دوسرے تکیے پہ رکھی اور اپنی عینک بھی اتار کے اس کے اوپر رکھ دی۔۔۔وہ کب اس کے دل آشنا نہی رہے تھے۔۔۔ایک وہی تو تھے جو اس کے ہمراز اور غمخوار رہے تھے۔۔۔مہریار نے اپنا چہرہ کافی کے کپ کے پیچھے چھپانے کی لاحاصل سعی کی۔۔۔

"میں اس کی بہن کا علاج کر رہا ہوں ابا۔۔۔اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں کہ کچھ اور نہی ہو سکتا پیچھے۔۔۔اندھیرے میں تیر نا چلائیں۔۔۔!" وہ خفا خفا سا بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کپ کے کنارے پہ پھیرتے ہوئے بولا۔۔۔حیات راؤ نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائی۔۔۔

"میں نے کہا کہ کچھ اور ہے۔۔۔؟ یہ تو تم نے کہا۔۔۔!" اب وہ اسے چڑا رہے تھے۔۔۔

"یار ابا نا کریں۔۔۔بات گھومی نا تو میرا میٹر بھی گھوم جائے گا۔۔۔ناراض ہو جاؤں گا میں پھر۔۔۔!"

حیات راؤ اب کھل کے مسکرائے اور بات بدل دی۔۔۔

"اچھا چھوڑو۔۔۔یہ بتاؤ گاؤں کب تک چکر لگا سکتے ہو۔۔۔!"

"ابھی نہی ابا۔۔۔فی الحال تو بہت بزی شیڈول ہے۔۔۔آپ کو چاہیے تھا کہ اماں کو بھی ساتھ لے آتے۔۔۔کم از کم ملاقات تو ہو جاتی نا۔۔۔!"

"تمہاری ماں اکڑی بیٹھی ہے وہاں۔۔۔کہتی ہے شادی کے لیے راضی کرو بیٹے کو۔۔۔اب تم کہو کہ اس بیچاری کو کیا کہوں کیسے سمجھاؤں۔۔۔یا تو تم کچھ لچک دکھا دو یا پھر ماں کو مل جاؤ تا کہ اسے قرار آئے۔۔۔!"

" ابا۔۔۔ بلیک میل کر رہے ہیں اب مجھے آپ۔۔۔ اماں کا نام لے کر وہ بھی۔۔۔!"

" میں وائٹ میل کر رہا ہوں۔۔۔ بلیک کا میں عادی نہیں۔۔۔ تم بلیک اور وائٹ کو مکس کر کے کچھ گرے گرے سی سچویشن پیدا کر لو برخوردار۔۔۔!"

حیات راؤ کی تشبیہہ پہ مہریار دل کھول کے ہنسا تھا۔۔۔ ہاتھ میں ان کا ہاتھ تھام کے محبت سے پشت چوم لی۔۔۔

" کمال ہے ابا۔۔۔ کافی تیز ہو گئے ہیں آپ۔۔۔ لگتا ہے کتابوں کو بہت وقت دینے لگے ہیں۔۔۔ بزلہ سنجی میں اضافہ ہو گیا ہے آپ کی۔۔۔!"

انہوں نے کندھے اچکائے۔۔۔ دو پل مسکراتے رہے پھر بغور مہریار کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔۔۔

" چوہدری حاکم کی بیٹی سے رشتہ کرنے لگے تھے ابا تمہارا۔۔۔!"

" کیا!!!!!۔۔۔" مہریار جیسے غرایا تھا۔۔۔

" ابا۔۔۔ ابا۔۔۔ کیسے۔۔۔ مطلب کیسے کر سکتے ہیں دادا ایسے۔۔۔ کیا جانتے نہیں وہ۔۔۔ بھول گئے ہیں سب کچھ کیا۔۔۔!"

" حوصلہ رکھو بچے۔۔۔ ہو تو نہیں گیا نا۔۔۔ میں ہوں نا۔۔۔ لیکن اب حاکم دشمنی ضرور کرے گا۔۔۔ یہ بات پکی ہے۔۔۔ خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں نے سنبھال لیا ہے سب۔۔۔!"

" اور اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو۔۔۔؟ کیا وہ میرا نقصان نہیں ہو گا۔۔۔ کمال کرتے ہیں ابا آپ۔۔۔!"

" اسی لیے تو کہہ رہا ہوں خود ہی لڑکی بتا دو اور چپ چپاتے شادی کر لو۔۔۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔۔۔!" انہوں نے آخر میں وہی بولا جو وہ ہر بار کہتے تھے۔۔۔ دونوں باپ بیٹا ہنس دیے۔۔۔!

☆......☆......☆

شہریار کب سے اس باریک سی درز سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا جو بے حد کٹھنائیوں کے بعد بنا آواز پیدا کیے اس نے مہارت کے ساتھ دروازہ کھول کے پیدا کی تھی۔۔۔ یہ کمال بھی اسے حاصل

تھا کہ وہ بنا آواز کے دروازہ کھولنے، پن کے ساتھ دروازہ کھولنے یا کچھ نا ملے تو وائر کے ساتھ دروازہ کھولنے میں مہارت رکھتا تھا۔۔۔اور ان کی اکثر و بیشتر کرتوتیں اس کے اسی کارنامے کی مرہون منت ہوا کرتی تھیں۔۔۔لیکن جب بھی اسے خفیہ طور پر دروازہ کھولنا ہوتا تھا تو وہ اپنے پیچھے کسی کو آنے نہی دیتا تھا۔۔۔پر اس وقت اس کے پیچھے ایک قطار میں وہ تینوں کھڑے تھے جن کی اپنے پیچھے موجودگی محسوس کرکے اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔۔۔

"ششش۔۔۔ہم آواز نہی نکالیں گے۔۔۔قسم لے لو بھائی۔۔۔جو آواز نکالے وہ ڈیش ہو گا۔۔۔!" یہ یاور تھا جس نے سرگوشی میں اسے تسلی دی تھی۔۔۔

"ہم بھی جاننا چاہتے ہیں کہ آخر اتنی دیر سے اندر چل کیا رہا ہے۔۔۔!" زارون نے بھنویں اچکا کر ڈیلے گھمائے تو داور پرسوچ انداز میں ٹھوڑی کھجاتا ہوا بولا۔۔۔

"مجھے لگتا ہے فلم چل رہی ہے۔۔۔وہ بھی بنا سنسر۔۔۔!"

شہریار نے پلٹ کے اس کے منہ کو دبایا اور غصے سے غراتے ہوئے بولا۔۔۔

"اپنا تھوبڑا بند رکھ ورنہ توڑ دوں گا۔۔۔ابا ہیں اندر بے غیرت۔۔۔تیری فلم بنا دیں گے وہ۔۔۔!"

وہ واپس مڑا اور درز میں سے کبھی کان اور کبھی آنکھ لگا کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔

"مجھے لگتا ہے شادی کی بات چل رہی اندر۔۔۔چلو اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی جائے اب۔۔۔!"

شہریار نے پلٹ کے اطلاع فراہم کی۔۔۔زارون نے ناسمجھی سے یاور کا کندھا جھنجھوڑا۔۔۔

"اونٹ پہاڑ کے نیچے کیسے آئے گا۔۔۔اور پہاڑ اٹھائے گا کون۔۔۔اور پہاڑ اٹھ بھی گیا تو۔۔۔"

"تو تو دنیا سے اٹھ جائے گا کمینے۔۔۔بند کر لے منہ اپنا۔۔۔مروائے گا سب کو۔۔۔اندر ابا کے ساتھ جو ہٹلر بیٹھا ہے ناوہ تجھے نگل کے پھڑکا دے گا۔۔۔سمجھا۔۔۔!"

زارون منہ بناتا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔۔۔پھر یاور اور داور سے بولا۔۔۔

"سوچو اگر میری شادی کی بات چل رہی ہوئی تو۔۔۔؟" اس کا لہجہ پرشوق تھا۔۔۔داور اور یاور نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر زارون کو سر سے پیر تک دیکھا۔۔۔اور ہنسی دبانے کے لیے منہ دبا

لیے۔۔۔زارون کو برا لگا اور جذباتی ہو کر ایک تھپڑ داور کے منہ پہ جڑ دیا۔۔۔چٹاخ کی آواز گونجی اور شہریار نے پلٹ کے شرربار نگاہوں سے تینوں کو گھورا۔۔۔

"میری شادی کی بات پہ دانت نکال رہے تھے۔۔۔میں وہ دانت ہی نہی رہنے دوں گا۔۔۔!" زارون کو کچھ زیادہ ہی غیرت آئی تھی۔۔۔

"تو کمرے میں چل۔۔۔آج تجھے سہرا پہنا ہی دوں گا بیٹے۔۔۔!" شہریار نے وارن کیا۔۔۔ یاسر کو دوبارہ ہنسی آنے لگی اور زارون نے اسے غصے میں دھکا دے دیا جو الٹ کے شہریار پہ گرا جس نے دھمکی دینے کے بعد واپس سر دروازے کی درز سے جوڑ لیا تھا۔۔۔ایسا دھکا پڑا کہ درز کا دروازہ بن گیا۔۔۔شہریار زمین بوسی کرنے سیدھا فرش پہ گرا تھا اور اس کے عین اوپر یاسر تھا۔۔۔داور کی غیرت نے گوارا نہی کیا تھا کہ اس کا جڑواں بھائی تو گر گیا لیکن وہ وہیں کھڑا ہے۔۔۔پلٹ کے زارون کو پیٹ میں پنچ مارا۔۔۔زارون نے جواباً اسے بھی دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا۔۔۔وہ تامل فلموں کے ہیرو کی طرح انہونی کو ہونی کرتا چھ فٹ دور سے ہوا میں ہاتھ لہراتا اور چلانے کی ایکٹنگ کرتا جیسے ہوا میں اڑتا شہریار اور یاسر کے اوپر آ کر گرا تھا۔۔۔پیچھے زارون نے فخریہ ہاتھ جھاڑے تھے اور اکڑ کے چلتا اندر داخل ہو کر ان تینوں کے اوپر اپنا پیر رکھ دیا تھا۔۔۔نگاہیں اٹھیں تو بائیں جانب بیڈ پہ دراز ماموں اور پاس بیٹھے ماموں زاد پہ جا ٹکیں۔۔۔حیات راؤ تاسف سے نفی میں سر ہلا رہے تھے جب کہ مہریار غصے سے سر جھٹکتا ان کیجانب بڑھا تھا۔۔۔نیچے دبا شہریار سوچ رہا تھا کہ اپنی گوشمالی سے فراغت کے بعد وہ کمرے میں جائے تو زارون کا قیمہ اپنے ہاتھ سے بنائے گا۔۔۔!

☆......☆......☆

ہاجرہ اور زمن بے چین و مضطرب سی زوہا کے کمرے میں تھیں۔۔۔ہاجرہ تو سوتی ہی یہاں تھیں، آج زمن بھی اپنا تکیہ لے کر ماں کے بیڈ پہ ہی دراز ہو گئی تھی۔۔۔دونوں کو نیند نہی آ رہی تھی۔۔۔زوہا دوائی کے زیراثر گہری نیند میں تھی۔۔۔ڈاکٹر مہریار کے گھر آنے سے لے کر ان کا زوہا کو لے کر کنسرن اور آپریشن کی یقین دہانی ان سب باتوں نے ہاجرہ کو جہاں مطمئن کیا تھا وہیں زمن کو عجیب سی بے کلی لاحق ہو گئی تھی۔۔۔

کیفیت ہاجرہ کی بھی عجیب تھی لیکن زوہا کے تندرست ہونے کی خوشی اس کیفیت پہ حاوی تھی۔۔۔ پھر بھی ناجانے مہریار کو دیکھ کر اپنائیت کا جو احساس اجاگر ہوا تھا اس کو نام نہی دے پا رہی تھیں۔۔۔

"امی۔۔۔! کیا سوچ رہی ہیں۔۔۔؟" زمن نے آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی ہوئی ہاجرہ سے پوچھا۔۔۔ کمرے میں زیرو پاور بلب کی نیلگوں روشنی میں ان کے وجود کا اضطراب اس سے چھپا ہوا نہی تھا۔۔۔

"ہممم۔۔۔!" انہوں نے چونک کے بازو ہٹایا اور زمن کو ایک نگاہ دیکھ کے واپس آنکھوں پہ رکھ لیا۔۔۔ "سوئی نہی ابھی تک۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے تم نے۔۔۔!"

"نیند نہی آ رہی امی۔۔۔ ہو سکتا ہے صبح سکول نا جاؤں۔۔۔ کل ایک جگہ انٹرویو کے لیے جاؤں گی۔۔۔ دعا کریں کام بن جائے تو سکول کی ٹف جاب سے جان چھوٹے۔۔۔ نا پے بڑھتی ہے اور نا لوڈ کم ہوتا ہے۔۔۔ تھک گئی ہوں لگی بندھی روٹین سے۔۔۔!"

"مل جائے گی۔۔۔ فکر نا کرو۔۔۔ ان شاء اللہ اچھی ملے گی۔۔۔!"

"امی۔۔۔" چند ساعت بعد اس نے دوبارہ پکارا۔۔۔ ہاجرہ خاموش رہیں۔۔۔

"امی۔۔۔ بابا کی کوئی پکچر ہے کیا آپ کے پاس۔۔۔؟ میرا مطلب ہے کوئی پرانی سی کسی جگہ رکھی ہوئی۔۔۔!"

ہاجرہ اس بری طرح سے ٹھٹکیں کہ اٹھ کے بیٹھ گئیں۔۔۔

"یہ تمہیں آج کہاں سے خیال آ گیا۔۔۔؟" ان کے چہرے پہ پریشانی نیم اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ زمن کو شرمندگی سی ہوئی۔۔۔

"امی پریشان ہونے کی بات نہی ہے۔۔۔ میں نے تو بس ویسے ہی پوچھ لیا۔۔۔ سو جائیں آپ۔۔۔!"

وہ کہہ کر خود بھی کروٹ بدل کے لیٹنے لگی تو ہاجرہ نے پکارا۔۔۔

"زمن۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے۔۔۔ کوئی مسئلہ ہوا ہے کیا۔۔۔ آج اچانک کیوں پوچھا تم نے اپنے بابا کی پکچر کا۔۔۔ پہلے تو کبھی خیال نہی آیا تمہیں۔۔۔!"

زمن ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔۔۔وہ تذبذب کا شکار تھی۔۔۔کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نا جانے کیا سوچ کے بات بدل دی۔۔۔

"بس ویسے ہی۔۔۔یونہی خیال آیا تھا امی۔۔۔نہی پوچھنا چاہیے تھا نا۔۔۔سوری۔۔۔آئیندہ نہی پوچھوں گی۔۔۔آپ سو جائیں۔۔۔!"

زمن کہتے ساتھ ہی دوبارہ کروٹ بدل کے لیٹ گئی تھی۔۔۔ہاجرہ کی آنکھوں میں نمی چمکی لیکن انہوں نے مزید کریدا نہی۔۔۔جانتی تھیں کریدنے سے زبان کو الفاظ کے سرے ملنے لگتے ہیں اور وہ کوئی سرا بیٹی کو پکڑانا نہی چاہتی تھیں۔۔۔کروٹ کے بل وہ گم سم سی لیٹ گئیں۔۔۔آنکھ کی نمی باغی بن کے چھلکتی تکیے میں جا بسی۔۔۔!

زمن کے دماغ کے پردے پر ڈاکٹر مہریار کے ابا چھائے تھے۔۔۔ان کا بولنا۔۔۔ان کا مسکرانا اور محبت و شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھنا اور اپنے ہونے کا یقین دلانا جیسے اس کے ذہن سے چپک گیا تھا۔۔۔وہ بے حد لاچار محسوس کر رہی تھی خود کو۔۔۔آج اس کے بابا ہوتے تو وہ بھی یقیناً سیکیور ہوتی۔۔۔یوں زندگی بھاگ دوڑ کی نذر نا ہو رہی ہوتی۔۔۔ڈاکٹر مہریار کا زوہا کو لے کر کنسرن شو کرنا اس کے لیے معمولی بات نہی تھی۔۔۔وہ ان کی جتنی شکر گزار ہوتی کم تھا۔۔۔اس کے باوجود کہ وہ خوش تھی کہ ڈاکٹر مہریار زوہا کے آپریشن کو لے کر پر امید ہیں پھر بھی وہ ان کی شخصیت سے خائف تھی۔۔۔ان کا سامنا کرتے اس کا دل عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع کر دیتا تھا جسے وہ کوئی نام نہی دے پائی تھی۔۔۔یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی سحر انگیزی میں اسے لپیٹ رہے ہوں۔۔۔وہ ایکدم سے آنکھیں میچ گئی۔۔۔اسے خود کو فوکسڈ رکھنا تھا۔۔۔ایک بار پھر سے وہ زوہا کے علاج کے متعلق سوچنے لگی تو با گیں خود بخود اس حادثے کی جانب مڑ گئیں جس کے باعث زوہا آج اس حالت میں تھی۔۔۔وہ دن ان کی زندگیوں کو عذابوں کی نذر کرنے آیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

چہچہاتی چڑیوں جیسی آواز تھی زوہا کی۔۔۔صبح فجر کے وقت چہکنا شروع ہوتی تھی تو رات سونے تک دوپٹے کے پلو سے منہ دبا دبا کے ہنستی چٹکلے چھوڑتی رہتی تھی۔۔۔ہنس ہنس کے بستر پہ لوٹ پوٹ

ہوتی کبھی زمن پہ گرتی تو کبھی ہاجرہ پہ۔۔۔زمن نیم غنودہ سی دراز اس اچانک افتاد پہ جھنجھلا کے اسے ہاجرہ پہ الٹا دیتی تو وہ ماں سے کسی چھوٹے سے بچے کی مانند چپک کر خوب ہنستی۔۔۔اسی کھلکھلانے میں وہ کب نیند کی وادیوں میں اتر جاتی معلوم بھی نا ہوتا۔۔۔بہت دھکم پیل کے بعد زندگی نے کچھ ٹھہراؤ پکڑا تھا۔۔۔زمن ماسٹرز کے آخری سال میں تھی اور زوہا انٹر کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی۔۔۔یہ وہ وقت تھا جب بہت سی چھوٹی موٹی جابز کرتے رہنے کے بعد زمن کو سکول کی جاب ملی تھی اور وہ پہلے کی نسبت کچھ آسانی محسوس کرنے لگی تھی۔۔۔ہاجرہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں پھر بھی رباب آنٹی کے تعاون سے وہ چھوٹی موٹی جاب کرتی آئی تھیں جس کی وجہ سے گھر کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔۔۔کچھ زمن نے وقتاً فوقتاً پڑھائی کے ساتھ کوئی نا کوئی نوکری کی تھی جو بہر حال فائدہ دیتی رہی۔۔۔سب کچھ ٹھیک تو نہی لیکن ایک ترتیب میں آتا جا رہا تھا کہ اچانک اس حادثے نے ان کی سہمی سہمی سی خوشیوں کو نگل لیا۔۔۔زوہا کو بے حد شوق تھا مال دیکھنے کا۔۔۔ہاجرہ کے پاس کبھی اتنے وسائل ہی نہی رہے تھے کہ وہ اونچی اور مہنگی دکانوں پہ بچیوں کو لے جا سکتیں۔۔۔گروسری کے لیے بھی نہیں گئی تھیں بلکہ محلے کی کریانے کی دکان سے ضرورت کا راشن پرچی پہ لکھ کے منگوایا کرتی تھیں۔۔۔وہ کبھی برانڈڈ شاپس پہ نہی گئی تھیں۔۔۔لنڈے کے کپڑے پہنے بھی تھے اور پہنائے بھی تھے۔۔۔لیکن جب سے زمن کی سکول جاب ہوئی تھی زوہا نے رٹ پکڑ رکھی تھی کہ اسے شاپنگ مال دیکھنا ہے۔۔۔ہاجرہ زچ ہو چکی تھیں مگر اس نے جواباً کہہ دیا تھا کہ اگر اسے نا لے کے جایا گیا تو وہ کالج سے اپنی فرینڈز کے ساتھ چلی جائے گی۔۔۔ہاجرہ کا تو دماغ گرم ہو گیا۔۔۔وہ اسے دو جھانپڑ رسید کر ہی دیتیں لیکن زمن نے تھام لیا۔۔۔

"کیا ہو جائے گا امی۔۔۔کب کوئی ضد کی ہے اس نے بھلا۔۔۔لے چلتے ہیں نا کسی دن۔۔۔ہم بھی تو دیکھیں کہ ہمارے ارد گرد کیسی کیسی دنیا آباد ہے۔۔۔چلے چلیں گے۔۔۔کچھ نہی ہوتا۔۔۔!"

"بس کرو تم ستیاناس اس کا۔۔۔" انہوں نے کمر پہ ہاتھ ٹکا کے الٹا زمن کو گھورا۔ "یہ کوئی ایسی ضد نہی جو پوری کرنی ہے۔۔۔جائیں گے تو پیسے بھی لگائیں گے۔۔۔یہ مہارانی ہر دوسری چیز کو دیکھ کے پھسل پڑیں گی۔۔۔اور وہاں اس کو کنٹرول کرے گا کون۔۔۔ہاں۔۔۔!" وہ تیکھے چتون لیے

دونوں کو گھور رہی تھیں۔۔۔

"قسم سے نہی کرتی۔۔۔کسی بھی چیز کی فرمائش نہی کروں گی۔۔۔ پکا والا وعدہ۔۔۔!" زوہا فورا شہہ رگ پہ دو انگلیاں رکھتی ماں کے پاس آئی اور کندھوں کے گرد بازو حمائل کرتے یقین دلایا۔۔۔ ہاجرہ اس کی جانب رخ کرتے ہوئے مسکرائیں اور کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔۔۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ راضی ہو گئی ہیں۔۔۔زمن بھی کھل کے مسکرا دی۔۔۔

"ہاں لیکن میں کارنز (مسالے دار مکئی) ضرور کھاؤں گی۔۔۔اب کم از کم وہ تو کھلا دینا نا آپ۔۔۔ باقی کسی چیز کی ضد نہی کروں گی بس گھوموں گی۔۔۔!"

اس کی چھوٹی سی فرمائش بھلا زمن کیسے نا پوری کرتی۔۔۔امی کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے اسے انگوٹھا دکھا کے یقین دہانی کرا دی۔۔۔ ہاجرہ بھی اس کی بانہوں پہ اپنے ہاتھ دھرے محبت سے اس کے سر سے سر جوڑ گئیں۔۔۔ایسے ہر موقع پر جب ان کی بیٹیاں مسکراتی تھیں ان کی آنکھیں نمی سے ضرور چمک جاتی تھیں۔۔۔!

☆.......☆.......☆

روشنیوں سے بھرا۔۔۔شیشوں سے مزین۔۔۔چمکتے فرش جن پہ پاؤں رکھتے دل دھڑکتا کہ کہیں پھسل نا جائیں۔۔۔ ہر طرف لوگ، گہما گہمی، ہنسی، چہکار، بے فکریاں۔۔۔اسے لگ رہا تھا جیسے ساری خلقت ایک اسی مال میں جمع ہے۔۔۔لوگ خرید رہے تھے اپنی خواہشات۔۔۔لفافوں میں اپنی خوشیاں اٹھائے پھر رہے تھے۔۔۔اور وہ اپنی بھولی بھالی نگاہوں میں تحیر سمیٹے سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں پھیرتی دیکھ رہی تھی۔۔۔

"آپی کون کہتا ہے ہمارا ملک غریب ہے۔۔۔سوائے ہمارے۔۔۔!" وہ زمن کے کان میں بدبدائی کیونکہ ہاجرہ سن لیتیں تو آخری دو الفاظ پہ ضرور غراتیں۔۔۔زمن نے مسکراہٹ دبائی اور اس کا ہاتھ تھام لیا جس کی ہتھیلی پسیج رہی تھی۔۔۔وہ شکل سے دکھ رہی تھی کہ پہلی بار شاپنگ مال دیکھنا نصیب ہوا تھا۔۔۔

"آپی ہاتھ نا پکڑیں۔۔۔سب مجھے بچہ سمجھیں گے۔۔۔!" اسے فورا فکر لاحق ہوئی۔۔۔اس نے

زمن کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا تھا۔۔۔زمن اسے دیکھتی ایک گہرا سانس بھر کے آگے بڑھی۔۔۔اس نے زوہا کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ آنٹی رباب کے ساتھ کئی بار مال آچکی ہے لیکن ہاجرہ ضرور واقف تھیں اور وہی زوہا کو بتانے سے منع کرتی تھیں کہ بلاوجہ کی ضد شروع کر دے گی۔۔۔حالانکہ کئی بار زمن کا دل چاہا کہ وہ زوہا کو خود بتا دے کہ اس محلے اور اس کے کالج سے باہر کی دنیا بھی ہے جو کچھ اچھی اور کچھ بری سی دل کو لبھاتی ہے۔۔۔جو زبان کو بیک وقت کڑوے اور میٹھے ذائقوں سے روشناس کرواتی ہے۔۔۔جہاں سج سج پیر رکھ کے چلنا پڑتا ہے لیکن دل سرپٹ دوڑنے پہ بھی اکساتا ہے پر وہ کبھی بتا نہیں پاتی تھی کیونکہ وہ زوہا کو جانتی تھی۔۔۔دل میں بے شمار امنگوں اور خواہشوں کا جہان آباد تھا اس کے۔۔۔وہ پر چاہتی تھی لیکن ہاجرہ کے پاس وہ آسمان نہیں تھا جو اسے پرواز کے لیے فراہم کرتیں۔۔۔اس لیے اسے اپنے ہی پروں سے کبھی نہیں نکالا تھا۔۔۔آج جب قدرت نے موقع دیا تھا تو اس کے چہرے پہ مال کی روشنیوں سے زیادہ چمک تھی۔۔۔آنکھیں میں جیسے افشاں بھری تھی جو خوشی سے جگمگا رہی تھیں۔۔۔وہ ہاجرہ اور زمن کے بیچ میں تھی اور وہ دونوں اسے رکھنا بھی درمیان میں چاہتی تھیں۔۔۔سامنے ایسکیلیٹر تھا۔۔۔انہوں اوپر جانا تھا۔۔۔زمن نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما جو اس کی چھڑانے کی کوشش کے باوجود نہیں چھوڑا۔۔۔

"اوپر پہنچ لو نا تو چھوڑ دیتی ہوں۔۔۔پیر دھیان سے جمانا، پہلی بار ہے۔۔۔بس میرے پاؤں کے ساتھ پاؤں رکھنا۔۔۔سمجھی۔۔۔!" زمن کے لہجے میں تنبیہہ تھی، وہ چپکی ہو کے اثبات میں سر ہلا گئی۔۔۔

"امی آپ۔۔۔" زمن نے گردن موڑ کے ماں کو دیکھا تو ہاجرہ نے اشارہ کیا کہ وہ زوہا کو لے کر چڑھے ان کی فکر نا کرے۔۔۔

"لو بھلا۔۔۔آپ کو امی کا ہاتھ پکڑنا چاہیے تھا آپی۔۔۔وہ بھی تو پہلی بار آئی ہیں۔۔۔اگر پیر نا رکھ سکیں ٹھیک سے تو۔۔۔؟"

"ہمیں پیروں چلنا سکھایا ہے انہوں نے۔۔۔ان کی فکر نا کرو۔۔۔بس ادھر دھیان دو تم۔۔۔" زمن مسکراہٹ دباتی ہوئی اسے جتا کے بولی تو وہ منہ بسور کے رہ گئی۔۔۔زمن احتیاط سے ایسکیلیٹر پہ پیر رکھتے ہوئے زوہا کو بھی ساتھ کھڑا کر چکی تھی اور ان کے عین پیچھے ہاجرہ تھیں۔۔۔وہ تینوں سکون سے اوپر

والے فلور پہ پہنچ چکیں تو زوہا نے فوراً ہاتھ چھڑایا تھا۔۔۔

"دیکھا۔۔۔ چڑھی ہوں نا میں آرام سے۔۔۔ کوئی گری کیا۔۔۔؟ نہی نا۔۔۔ اب نا پکڑنا آپی مجھے۔۔۔ پلیز۔۔۔ اچھا نہی لگتا مجھے۔۔۔!" وہ خفا سی ہوتی منہ بسورے کہتی ہوئی اسے بہت پیاری لگی۔۔۔ ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے اس نے سرِ اثبات میں ہلایا لیکن اسے تنبیہ کرنا نہی بھولی۔۔۔

"پھرتیاں نا دکھانا زوہا۔۔۔ ہمارے ساتھ ساتھ چڑھنا اور ساتھ ہی اترنا۔۔۔ سمجھی۔۔۔!"

زوہا لاپرواہی سے سر ہلاتی اب ادھر ادھر دیکھتی ونڈو شاپنگ میں مشغول ہو چکی تھی۔۔۔ یہاں برانڈز کی شاپس تھیں۔۔۔ سب کچھ بہت اعلی و ارفع اور ان کی خرید سے باہر تھا لیکن محض اس کی خوشی کی خاطر ہاجرہ اپنی بچت میں سے کچھ پیسے ساتھ لے کر آئی تھیں کہ اگر زوہا نے کچھ لینے کے لیے اڑی کی تو وہ اس کا دل نہیں توڑیں گی۔۔۔ لیکن وہ بس روشنیوں کے شہر میں شیدائی بنی روشنیاں آنکھوں میں سمو رہی تھی۔۔۔ سبھی فلورز پہ وہ بہت اعتماد کے ساتھ ایسکیلیٹر چڑھی تھی اور یوں پھرتی رہی تھی جیسے سدا یہیں سے خریداری کرتی آئی ہو۔۔۔ زمن نے اسے ایک خوبصورت سا سٹالر دلایا تھا اور سب سے اوپر بنے فوڈ کورٹ سے اسے لوڈڈ فرائز بھی کھلائیں تھیں۔۔۔ وہ خوش تھی بے حد خوش۔۔۔ گلنار چہرہ لیے وہ سبھی کو دیکھتی تھی اور آنکھوں میں رشک بھر لیتی تھی۔۔۔

"بہت دیر ہو گئی۔۔۔ واپس چلنا چاہیے اب۔۔۔؟"

ہاجرہ نے چادر درست کرتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔۔۔ وہ مغرب کی اذانوں سے پہلے گھر پہنچنا چاہتی تھیں۔۔۔

"امی بس دس منٹ اور۔۔۔" زوہا نے منہ بسور کے زمن کو ساتھ دینے کا اشارہ کیا جس نے کندھے اچکا دیے۔۔۔

"دس منٹ میں کون سا تیر مارنا ہے۔۔۔ اب بس نا۔۔۔ کافی ہو گیا۔۔۔ پھر کبھی آئیں گے۔۔۔ اپنی سیونگز سنبھالا کرو نا۔۔۔ اگلی بار ساتھ لانا اور کچھ خرید بھی لینا۔۔۔ ساری تو چاٹ سموسے کھانے میں اجاڑ دیتی ہو۔۔۔!"

"وہ جیسے قارون کا خزانہ جڑ جانا ہے میرے پاس ۔۔۔ چار سال بھی جوڑوں تو چار ہزار نا جڑے ۔۔۔ ایویں بس ۔۔۔!"

اس کے یاسیت سے کہنے پر ہاجرہ کو برا تو لگا لیکن زمن نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا ۔۔۔

"اچھا چلو دل برا نہی کرتے ۔۔۔ اگلی بار آئیں گے تو ایک سوٹ لے کر دوں گی تمہیں تمہاری مرضی کا ۔۔۔ وہ بھی اپنے پاس سے ۔۔۔ تم اپنی سیونگز کے چاٹ سموسے کھاؤ سکون سے ۔۔۔ ٹھیک ۔۔۔ لیکن اب واقعی چلو جلدی ۔۔۔ مجھے گھر جا کے سکول کا پلانر بھی بنانا ہے ۔۔۔ چلو شاباش ۔۔۔!"

زمن نہی چاہتی تھی کہ یہاں آ کے وہ واپسی پہ اپنا موڈ خراب کر کے جائے اس لیے اسے باتوں سے بہلایا تھا اور وہ بہل بھی گئی تھی ۔۔۔ بہت زیادہ اونچی خواہشات تو اس کی بھی نہی تھیں لیکن جو تھیں وہ بھی ہاجرہ کو ستاتی تھیں ۔۔۔ وہ تینوں باتیں کرتی اب واپس گراؤنڈ فلور پہ جانے کے لیے اسکیلیٹر کے پاس آ گئی تھیں ۔۔۔

"آپی ۔۔۔ ٹرسٹ کریں ۔۔۔ میں اتر جاؤں گی ۔۔۔ بُرا لگتا ہے بابا ۔۔۔!" وہ زمن کے ہاتھ پکڑنے سے پہلے ہی مچلتی ہوئی بولی ۔۔۔ اردگرد کے ایک دو لوگ انہیں دیکھنے لگے ۔۔۔ زمن کھسیانی سی ہو کے سر ہلا گئی جبکہ ہاجرہ کا دل کیا یہیں ایک چماٹ مار دیں اسے ۔۔۔ زوہا سکون سے اسکیلیٹر پہ پیر دھرتی بیچ کے فلور پہ اتر چکی تھی ۔۔۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا ۔۔۔ وہ بنا جھجھک کے پورے اعتماد کے ساتھ اتری تھی ۔۔۔ زمن اور ہاجرہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی مسکرا دیں جبکہ ابھی وہ خود مکمل نیچے نہی آئی تھیں ۔۔۔ زوہا نے جب دیکھا کہ ان دونوں کو مطمئن کر دیا ہے تو وہ بنا ان کا انتظار کیے گراؤنڈ فلور پہ جانے کے لیے دوسری سائیڈ پہ چلی گئی تھی ۔۔۔ جہاں قدرے رش تھا اور لوگ ایک قطار میں نیچے جا رہے تھے ۔۔۔ ہاجرہ اور زمن دونوں کو یکدم گھبراہٹ نے گھیرا تھا ۔۔۔ انہوں نے اچک کے زوہا کو تلاشا تو وہ کسی بھی پل اسٹیپ پہ پیر دھرنے والی تھی ۔۔۔ ہاجرہ نے اسے روکنے کے لیے اونچی آواز میں پکارا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے نگاہیں اٹھائیں اور پیر ٹھیک سے نہیں جم سکا تھا ۔۔۔ وہ بیلنس نا رکھ سکی اور ان لوہے کی اونچی نیچی ہوتی سیڑھیوں پہ گر چکی تھی ۔۔۔ کوئی اس کو کھڑا کرنے کے لیے مدد نہی کر سکا تھا ۔۔۔ نا

وہ خود کھڑی ہو سکی تھی۔۔۔دو تین سٹیپس کے بعد وہ لڑھکتی ہوئی کچھ نیچے گری اور پھر اسی حالت میں کمر کے بل جھٹکے کھاتی نیچے جا رہی تھی۔۔۔زمن اور ہاجرہ کی چیخوں نے بلند و بالا چھتوں والے شاپنگ مال کو دہلا دیا تھا۔۔۔سب لوگ ان کی جانب متوجہ تھے۔۔۔نیچے کچھ لوگ زوہا کو پکڑنے کے لیے جمع ہو چکے تھے جو بلکل بے سدھ تھی۔۔۔خدا جانے کس زاویے سے گری تھی کہ بے ہوش ہونے کے بعد بے جان گڑیا کیطرح وہ لڑھکتی نیچے پہنچی تھی۔۔۔زمن نے ہاجرہ کو آرام سے اترنے کی دو بار تنبیہہ کرتے ہوئے خود دوڑ لگا دی تھی۔۔۔جو بلکل بھی اپنے حواسوں میں نہی لگ رہی تھیں۔۔۔جیسے تیسے زمن منہ پہ ہاتھ رکھتی زوہا تک پہنچی تھی۔۔۔لوگوں کی بھیڑ اس کے گرد جمع ہو چکی تھی۔۔۔اسے لگ رہا تھا کہ اس نے منہ سے ہاتھ ہٹایا تو اس کی چیخیں نہی رکیں گی۔۔۔وہ خود پہ قابو نہی پا سکے گی۔۔۔وہ زوہا کے پاس دھپ سے گھٹنوں کے بل بیٹھی اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔۔۔زوہا کی آنکھیں بند تھیں۔۔۔زمن نے اس کے ناک کے آگے اپنے ہاتھ کی پشت رکھی۔۔۔وہ سانس لے رہی تھی لیکن بہت مدھم مدھم۔۔۔

"بیٹا اسے جلدی سے لے جاؤ ہاسپٹل۔۔۔مجھے لگتا ہے حرام مغز پہ چوٹ آئی ہے۔۔۔کیونکہ بچی کی گردن نہی ٹھہر رہی تھی۔۔۔!"

ایک ادھیڑ عمر خاتون نے ایسا کہہ کر زمن کو گویا دہلا دیا تھا۔۔۔وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ماں کو ڈھونڈ رہی تھی جو سامنے سے لڑکھڑاتے قدموں سے ان تک پہنچ رہی تھیں۔۔۔دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو سیل رواں کیطرح بہہ نکلے۔۔۔وہ حادثے سے ڈرتی تھیں اور آج ایک حادثہ ان کی زندگی میں نمودار ہو گیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

ہنستی کھلکھلاتی زوہا لے کر گئے تھے اور واپسی اس کی گھر کی بجائے ہاسپٹل میں ہوئی تھی۔۔۔ڈاکٹر کے مطابق اس کی اسپائنل میرو ڈیمیج ہوئی تھی۔۔۔وہ مسلسل بے ہوش تھی اور اس کی صاف وجہ یہی تھی کہ اس کی گردن کے پچھلے حصے کو شدید نقصان پہنچا تھا۔۔۔جس وقت وہ گری تھی خوف سے پہلے اسٹیپ پہ ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔۔۔اس کے بعد اس کا بے سدھ وجود اپنے حال میں لڑھکتا نیچے تک آیا

تھا۔۔۔حواس سے عاری ہونے کی بنا پہ وہ خود کو کسی اینگل سے سنبھال نہی پائی تھی اور نتیجتاً سر اور گردن کی پشت بری طرح زخمی ہوئی تھی۔۔۔ڈاکٹرز نے ڈھیروں ٹیسٹ لکھ دیے تھے۔۔۔قوی امکان یہی تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچنے کے باعث وہ فی الحال اپنے قدموں پہ کھڑی نہی ہو سکتی تھی اور اس امکان نے ہاجرہ اور زمن کے قدموں سے زمین سرکا دی تھی۔۔۔

"بھلا ایسے بھی ہوتا ہے۔۔۔وہ تو ہنستے بولتے گھر سے نکلے تھے۔۔۔ایسے حادثے تو اوروں کے ساتھ ہوا کرتے ہیں۔۔۔مطلب ایسے حادثے تو بس سننے میں آیا کرتے ہیں۔۔۔خود کے ساتھ تو نہی ہو جایا کرتے نا۔۔۔"

زمن مجسمہ سی بینچ پہ بیٹھی دونوں ہاتھوں سے بینچ کو بھینچے ہوئے تھی۔۔۔وہ مسلسل ایسی ہی سوچوں کے گرداب میں پھنسی تھی۔۔۔سب ایک خواب سا لگ رہا تھا۔۔۔اسے نیند لینی چاہیے تھی۔۔۔یقیناً وہ جب جاگے گی تو سب کچھ خواب کی مانند بھک سے اڑ چکا ہو گا۔۔۔وہ امی اور زوہا گھر کے چھوٹے سے لاؤنج میں بیٹھی گپیں مار رہی ہوں گی۔۔۔زوہا اوٹ پٹانگ ہانکتی کبھی اس کی گود میں لڑھکے گی تو کبھی امی کی۔۔۔تنگ آ کر وہ اسے ایک چپت لگائیں گی اور وہ منہ بسورتی پیر پٹختی منظر سے غائب ہو جائے گی۔۔۔ہاں پیر۔۔۔! پیر ہی تو اس کے ناکارہ ہو گئے تھے۔۔۔ڈاکٹرز کے بقول چانسز بہت کم تھے کہ وہ پہلے جیسی ہو پاتی اور جو چانسز تھے وہ اسی صورت میں اویل کیے جا سکتے تھے جو بروقت علاج ہو جاتا۔۔۔اب یہ ٹیسٹوں کی رپورٹس کے بعد معلوم ہونا تھا کہ آیا آپریشن حل تھا اس کا یا میڈیسنز سے وہ ٹھیک ہو جاتی۔۔۔کچھ بھی، کچھ بھی واضح نہی تھا اور زمن کا سر مسلسل گھومتا رہتا تھا۔۔۔اس نے اس سے زیادہ بے بسی پہلے کبھی نہی محسوس کی تھی۔۔۔اور اس دن بھی اسے اپنے باپ کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔۔۔ایک مرد کی کمی کا۔۔۔ایک مضبوط سہارے کی کمی کا۔۔۔وہ کندھے ڈھلکائے بینچ پہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی اور ارد گرد زندگی تسلسل میں رواں دواں تھی۔۔۔!

اس دن کے بعد سے زمن اور ہاجرہ نے کوئی کسر نہی چھوڑی تھی زوہا کے علاج میں۔۔۔وہ اسے گھر لے ائی تھیں۔۔۔زوہا کو چپ لگ گئی تھی۔۔۔وہ نا بولتی تھی نا روتی تھی بس بستر پہ لاچاری کی کیفیت

میں پڑی رہتی تھی۔۔۔ہاجرہ اور زمن کے پاس جو جمع پونجی تھی سب کی سب لگ چکی تھی۔۔۔اور جمع جتھا تھا ہی کیا۔۔۔لاکھوں تو نہی تھے محض ہزاروں تھے۔۔۔وہ لگا کے دونوں پھر سے صفر کی گنتی پہ آ ٹھہری تھیں۔۔۔اتنا ضرور ہوا تھا کہ ٹیسٹ کروا لیے گئے تھے اور رپورٹس کے مطابق آپریشن ناگزیر تھا۔۔۔جس کی کامیابی کے چانسز محدود تھے۔۔۔کئی بار زمن کا جی چاہا کہ رباب آنٹی کو کال کر دے۔۔۔انہیں بتا دے کہ ان پہ کیا بیت گئی ہے لیکن ہاجرہ نے سختی سے منع کیا تھا۔۔۔وہ ایک عرصے بعد اپنی بیٹی کے پاس گئی تھیں۔۔۔وہاں انہیں پریشان کرنا ان کی نظر میں خود غرضی تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں رباب خان فوراً واپسی کا قصد کریں گی اور ہاجرہ کو یہ منظور نا تھا۔۔۔اسلیے زمن کو سختی سے روک دیا تھا۔۔۔یوں چار ماہ کا عرصہ محض زوہا نے اپاہج بن کے نہی گزارا تھا بلکہ ان دونوں نے بھی خود کو اسی کیفیت میں محسوس کیا تھا جس سے زوہا گزر رہی تھی۔۔۔رفتہ رفتہ زوہا ہسٹیریک ہوتی گئی۔۔۔وہ چلاتی تھی اور خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچاتی تھی۔۔۔اونچا اونچا رونے لگتی تھی اور پھر ایک دم خاموش ہو جاتی جیسے وجود میں جان ہی نا ہو۔۔۔اذیت سی اذیت تھی۔۔۔دکھ ہی دکھ تھا اور سہنے کے لیے ان کے تنہا بے بس وجود۔۔۔زندگی جیسے جبر مسلسل ہو چلی تھی۔۔۔ایک سزا جس کا کوئی کنارا نہی تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

"حیات ولا" میں مہریار کی دھاڑ گونجی تھی۔۔۔کچن میں فضلو کے ساتھ موجود نانی پیاری کے ہاتھ سے تھرماس چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔۔۔انہیں مہریار پہ بے طرح غصہ آیا۔۔۔

"اک تے اس منڈے دے موڈ دا وی پتا نہی لگدا۔۔۔منٹوں پہلاں آپے سے باہر ہوا ہوتا ہے۔۔۔!"

"نانی پیاری صاحب کی شادی کراؤ۔۔۔بس یہی ایک حل ہے۔۔۔!"

فضلو پراٹھا تل رہا تھا۔۔۔دانت نکالتا ہوا بولا۔۔۔نانی پیاری نے اسے گھورتے ہوئے تھرماس کچن ٹیبل پہ رکھی۔۔۔

"تُو چپ کر کے پراٹھے بیل۔۔۔مشورے نا تل۔۔۔سمجھا۔۔۔ذرا یہ چائے ڈال لوں تو دیکوں کیا

تماشا لگنے لگا ہے۔۔۔!"

فضلو کو گھر ک کے وہ بڑبڑاتی ہوئی چائے کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔۔۔ فضلو بھی ڈھیٹ تھا، آنچ دھیمی کرتا کچن کے دروازے سے گردن نکال کر جائزہ لینے لگا۔۔۔

لاؤنج میں بس زارون اور داور تھے۔۔۔ شہریار ابھی اپنے کمرے میں تھا اور ریاور بھی کالج کے لیے تیار ہو رہا تھا۔۔۔

"شہر یییییی۔۔۔!" ایک بار پھر وہی چنگھاڑ مہریار کے کمرے سے سنائی دی اور شہریار ندارد۔۔۔

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ کسی بھی وقت دورہ پڑ جاتا ہے ان ڈاکٹر صاحب۔۔۔!" زارون نے دھیمے سروں میں پھپھولے پھوڑے۔۔۔

"نہیں۔۔۔" داور نے منہ سے پٹاخہ بجایا۔۔۔" دن میں دو بار سنڈے چھوڑ کر۔۔۔!"

"لیکن اب کیا ہوا ہے انہیں۔۔۔ شہری پہ کیوں غصہ ہیں۔۔۔!"

"مہر لالہ کے لیپ ٹاپ کا پاسورڈ چینج کر بیٹھے ہیں کل شہری بھیا اور چینج کر کے خود بھی بھول بیٹھے۔۔۔ اب مہر لالہ نے اوپن کیا ہو گا تو یقینا کرتوت سامنے آ گئی ہوگی۔۔۔ اور لالہ کا لیپ ٹاپ شہری بھیا کے علاوہ کوئی نہیں چھیڑتا۔۔۔ اس لئے سولی اصولاً انہی کا چڑھنا بنتا ہے نا۔۔۔!" داور ٹانگ اونچی کیے جرابیں پہنتا سکون سے بتا رہا تھا۔۔۔ جب خود کی کوئی غلطی نہیں ہوتی تھی تو یہ سب خاصی تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے۔۔۔

"کبھی کبھار مجھے شہری پہ فخر محسوس ہوتا ہے داور۔۔۔ کیسا دلیر مرد ہے نا اپنا شہری۔۔۔ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالتا رہتا ہے۔۔۔ میرا بھی بہت دل کرتا ہے۔۔۔!"

"چڑیا گھر لے چلوں گا وہاں پنجرے میں شیر کے آگے ڈال آؤں گا۔۔۔ ہاتھ چھوڑو پورے ہی منہ میں گھس جانا۔۔۔ ساری دلیری ادھڑ جائے گی پیارے۔۔۔!"

داور سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے زارون کے منہ کے آگے جھک کے بولا۔۔۔ زارون نے

عینک کے اوپر سے اسے اچھے سے تاڑا اور آنکھیں سکوڑیں۔۔۔

" زارون اتنا بھولا نہی جتنا دکھائی دیتا ہے۔۔۔ابھی زارون بابا کے ٹشن دیکھے ہی کب ہیں تم لوگوں نے۔۔۔!"

" واہ۔۔۔واہ۔۔۔واہ۔۔۔" داور نے ستائشی انداز میں کہا اور سلوموشن تالی بجانے کے لیے ہاتھ جوڑے تو رک گیا۔۔۔

" ابھی بجاتا ہوں ٹیم اکھٹی ہولے۔۔۔!"

زارون نے گردن اکڑائی جیسے واقعی تالیوں کا انتظار کرے گا۔۔۔لیکن تالی بجنے سے پہلے زوردار آواز کے ساتھ مہریار کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ تن فن کرتا باہر نکلا۔۔۔اس کا رخ سیدھا شہریار کے کمرے کی جانب تھا۔۔۔اس کا دروازہ بھی دھاڑ سے کھولا...... اسی وقت یاور بھی گھڑی باندھتا وہاں پہنچ چکا تھا اور سکون سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔۔۔

" لگتا ہے شہری بھائی کی آتما رلنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔۔۔!"

" ہاں وہ بیچارہ تو لگتا ہے پیدا ہی پٹنے کے لیے ہوا ہے۔۔۔!" زارون نے افسوس بھرے تدبر سے کہا۔۔۔

" اور تم بولیاں مارنے کے لیے۔۔۔لیکن ایک بھی جچ کی نہی مار پاتے۔۔۔!" یاور نے شہریار کی غائبانہ طرفداری کی تھی جیسے۔۔۔

" سوچ رہا ہوں بولیاں مارنے کی کلاسز لوں۔۔۔ایک دو ماہ کا کورس کر کے کچھ تو مار ہی لیا کروں گا۔۔۔!"

یاور اور داور نے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے داد دے رہے ہوں کہ بچہ ہوشیار ہو رہا ہے اور پھر زارون کو دیکھتے ہوئے سلوموشن تالی بجائی لیکن اس بار زارون نے بھی مکمل ان کا ساتھ دیا تھا۔۔۔یہ سین ابھی جاری رہتا کہ شہریار کے کمرے سے چلانے کی زوردار آوازیں باہر آتی سنائی دیں۔۔۔

" بچاؤ۔۔۔بچاؤ کوئی مجھے۔۔۔نانی پیاری۔۔۔کوئی میری ماں کو بلاؤ۔۔۔ہائے ہائے۔۔۔مار

دے گا یہ ڈاکٹر آج مجھے۔۔۔کوئی بچاؤ۔۔۔!"

"ہائے ماں صدقے، ماں واری۔۔۔" نانی پیاری بوکھلائی ہوئی گھسٹ کرتی کچن سے نکلتیں شہریار کے کمرے کا رخ کرنے لگیں۔۔۔" ماردتا منڈے نُو۔۔۔ ویکھ چیکاں (چیخیں) مار رہا منڈا۔۔۔!"

یاور، داور اور زارون بھی کچھ کچھ پریشان سے کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیسا ردعمل دیں۔۔۔

"یہیں لاش کا انتظار کریں یا اندر جا کے وصولیں۔۔۔!" زارون نے معصومیت سے پلکیں جھپکاتے اور عینک سیٹ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"درفٹے منہ منڈیا۔۔۔" اندر جاتی نانی پیاری وہیں ڈبل کے صوفے پہ ٹک گئیں" منہ کو جندرا مار کے رکھا کر۔۔۔ جو مرضی جی میں آئے پڑل کر کے منہ سے نا نکالا کر۔۔۔!"

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اندر جانے سے کترا رہی تھیں۔۔۔ جہاں سے ہنوز چیخم دھاڑ کی آوازیں نمودار ہو رہی تھیں۔۔۔ وہ تینوں ابھی فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ شہریار نک سک سے تیار ہاتھ میں فائل اور فولڈر تھامے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔۔۔ صوفے کی بیک پھلانگتا وہ پل میں ان سب کے سامنے تھا۔۔۔ ان کی بوکھلائی اور ششدر صورتوں پہ نگاہ ڈالتا وہ جھکا اور سینٹرل ٹیبل پہ رکھی فروٹ باسکٹ سے سیب اٹھایا اور اسے لہراتا ہوا لاؤنج کے خارجی دروازے کی جانب بھاگا۔۔۔

"نانی پیاری۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کو کچھ کھلا پلا دینا۔۔۔ بلڈ پریشر لو ہو گیا ہوگا۔۔۔ خوب بھاگے ہیں وہ میرے پیچھے۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔!"

اس کے نکلتے ہی جیسے وہ تینوں بھی اس کی بات کی تہہ تک پہنچے اور مہر یار کے باہر آنے سے پہلے تینوں نے اسی کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی ورنہ سارا عتاب ان تینوں پہ نازل ہوتا۔۔۔ نانی پیاری بھی ہانپتی کانپتی اٹھیں اور کچن کا رخ کیا۔۔۔

"لے دس۔۔۔ مجھے چھڈ گئے پھائے (پھانسی) لگنے کے لیے۔۔۔ میرا چکی تھلے ہاتھ آیا ہوا ہے جو یہیں بیٹھوں۔۔۔ اوپر سے ناشتوں کے بغیر نکل گئے۔۔۔ ستیاناس سارے پراٹھے اب وہ اکیلا فضلو

سائڈ نگل لے گا۔۔۔!"

پیچھے لاؤنج خالی تھا بس مہریار کی طیش سے بھری آوازیں مسلسل ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن اور رباب خان چھوٹے سے لاؤنج میں خاموش بیٹھی تھیں۔۔۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں مگن آنے والے حالات کے لیے لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھیں لیکن زمن نہی جانتی تھی کہ رباب آنٹی کے دماغ میں جو چل رہا ہے وہ اس کی سوچوں سے ماورا ہے۔۔۔

" ویسے ڈاکٹر مہریار اس قدر قابل ہیں زمن کہ مجھے قوی امید ہے کہ وہ ہماری زوہا کا کامیاب آپریشن کریں گے۔۔۔ تمہارے انکل بھی کہہ رہے تھے کہ کیس کریٹیکل ضرور ہے لیکن مہر آسان ٹاسک لیتا بھی نہی۔۔۔!"

رباب آنٹی نے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سموسے کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور کن اکھیوں سے زمن کو دیکھا جو مسلسل اپنے پیروں کو گھور رہی تھی۔۔۔ رباب آنٹی کے کہنے پہ سر اٹھا کے امید افزا نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

" ہوپ سو آنٹی۔۔۔ امی تو خود رات سے بے حد پُر یقین ہیں۔۔۔ انہیں نا جانے کیوں لگنے لگا ہے جیسے ڈاکٹر مہریار لازمی زوہا کو ٹھیک کر دیں گے۔۔۔ لیکن میرا دل ففٹی ففٹی پہ ہے کیونکہ ہر دوسرے ڈاکٹر نے ہمیں ایسی ہی امیدیں دلائیں تھیں۔۔۔ اب تو امید باندھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔۔۔!"

" پاگلوں والی باتیں نا کرو۔۔۔ کبھی بھی دل چھوٹا نہی کرتے۔۔۔ حالات کبھی ایک سے نہی رہتے بیٹا۔۔۔ اور ویسے بھی کہا نا ڈاکٹر مہریار بے حد قابل ہے۔۔۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ ماشاءاللہ کئی کامیاب آپریشنز کر چکا ہے۔۔۔ خان صاحب تو خود اس کی قابلیت کے مداح ہیں۔۔۔ تم بس اللہ کے بعد سب کچھ اب اس پہ چھوڑ دو۔۔۔ خود کو ریلیکس کرو تا کہ زوہا کے آپریشن کے لیے ہونے والی بھاگ دوڑ نبٹا سکو۔۔۔ سمجھی۔۔۔!" اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے چائے کے مگ کو منہ لگایا تھا کیونکہ زمن کی کھوجتی سی نگاہیں ان پہ جمی تھیں۔۔۔

"آنٹی۔۔۔آپ کو اس ڈاکٹر پہ اتنا اعتبار کیوں ہے۔۔۔اور مجھے کیوں لگتا ہے جیسے آپ اور انکل اس سے کافی کلوز ہیں۔۔۔میرا مطلب۔۔۔یعنی۔۔۔" اسے اپنی بات سمجھانے میں مشکل درپیش آئی تو رباب خان نے ہاتھ اٹھا کے اسے ٹھہرنے کا اشارہ دیا۔۔۔ایک لمبا سا گھونٹ چائے کا بھر کے انہوں نے مگ کو اپنے گھٹنے پہ ٹکایا۔۔۔

"دیکھو بچی۔۔۔خود کو جتنا زیادہ لایعنی منطقوں میں الجھاؤ گی اتنا ہی مصیبت بڑی نظر آئے گی۔۔۔ جہاں تک مہریار کی بات ہے تو ہاں ہم دونوں اسے کافی وقت سے جانتے ہیں۔۔۔پہلے تو تمہارے انکل کا سٹوڈنٹ تھا لیکن پھر گھر آنا جانا شروع ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دل کا بہت نفیس انسان ہے۔۔۔ہمدرد اور خیر خواہ۔۔۔ہم نے کوئی زبردستی تو نہیں کی نا زوہا کے علاج کے لیے۔۔۔اور نا ہی زوہا کوئی پہلی پیشنٹ ہے جس کا وہ علاج کرے گا۔۔۔ایسے کئی آئے اور ماشاءاللہ اپنے پیروں پہ چلتے ہوئے گئے ہیں۔۔۔بس حوصلہ اور صبر رکھو۔۔۔جہاں اتنا کیا ہے وہیں تھوڑا اور سہی۔۔۔!"

"تو آنٹی فیس۔۔۔" زمن کی سوئی فیس پہ بھی اٹکی پڑی تھی۔۔۔

"کر لے گا وہ مینیج۔۔۔" ان کے منہ سے ایکدم نکلا۔۔۔

"کیا مطلب مینیج کرلے گا۔۔۔ہماری پھوپھی کا بیٹا ہے کیا جو مینیج کرے گا۔۔۔آپ بھی نا آنٹی۔۔۔" زمن برا مانتے ہوئے بولی تو رباب آنٹی نے بھنویں اچکاتے خود کو سنبھالا اور بات بنائی۔۔۔

"بابا مینیج سے مراد یہ کہ وہ آپریٹ کرے گا نا اور علاج معالجے پہ جو رقم خرچ ہو گی وہ ہم آہستہ آہستہ بھی ادا کرسکیں گے۔۔۔بس چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔آم کھاؤ نا پیڑ کیوں گنتی ہو۔۔۔!"

"جب آم لگے ہی نا ہوں گے تو پیڑ ہی گنوں گی نا۔۔۔!" زمن کو یہ معاملہ ہضم نہیں ہو رہا تھا لیکن زیادہ پوچھتی تو رباب آنٹی برا بھی مان سکتی تھیں۔۔۔اتنا بےلوث ہو کے کون چلتا ہے ہمراہ۔۔۔وہ بھی آج کے دور میں۔۔۔

"تم بس سکون کرو اور ہمیں بھی کرنے دو۔۔۔ہم ہیں نا فکر کرنے کو۔۔۔تحمل نام کی تو شے ہی نہیں لڑکی تم میں۔۔۔اچھا یہ بتاؤ ہاجرہ کی واپسی کب ہے۔۔۔!" انہوں نے مگ میز پہ رکھ کے پلیٹر میں رکھے

سموسے کا کنارہ توڑ کے منہ میں ڈالتے ہوئے اسے گھر کا۔۔۔

" آنے والی ہوں گی۔۔۔درزن کے پاس گئی ہیں۔۔۔ساتھ میں زوہا کی میڈیسنز بھی لانی تھیں میڈیکل سے۔۔۔!"

" اچھا چلو میں جا رہی ہوں ابھی۔۔۔دوبارہ چکر لگاؤں گی۔۔۔" وہ ٹانگ پہ جمی ٹانگ اتارتے ہوئے بولیں پھر کچھ یاد آنے پہ تھوڑا آگے کو جھکیں۔۔۔" اچھا سنو۔۔۔میرے ساتھ اگلے ہفتے کنگ مال چلو۔۔۔وہاں ایک شاپ ہے۔۔۔جہاں سارا کا سارا اسٹاف لیڈیز ہے۔۔۔انہیں کیش کاؤنٹر کے لیے ایک پڑھی لکھی اور پرکشش لڑکی کی ضرورت ہے۔۔۔اچھی پے دے رہے ہیں۔۔۔میری فرینڈ ہی ہے جس کی شاپ ہے۔۔۔اس سے بات کی ہے میں نے تمہاری۔۔۔سکول سے ریزائین دو اور وہاں چلو میرے ساتھ۔۔۔یہاں کی نسبت محنت بھی کم ہے اور سیلری بھی زیادہ ہے۔۔۔ٹائمنگز ایسی ہیں کہ تم ساتھ کچھ اور بھی کر سکو گی۔۔۔!"

" سیریسلی آنٹی۔۔۔" وہ پُرجوش ہوتی تھوڑا آگے کو کھسکی۔۔۔" کب چلنا ہے۔۔۔"

" بس جب تم چلو۔۔۔لیکن سکول ریزائین دے دو اسی ویک میں۔۔۔کمٹمنٹ خراب نا ہو۔۔۔!"

" دے دوں گی۔۔۔بلکہ صبح ہی دے دوں گی۔۔۔لیکن یہ جاب تو پکی ہے نا۔۔۔!"

" ایک دم پکی۔۔۔تمہاری آنٹی نے کچے کام کیے ہیں کیا کبھی۔۔۔!"

رباب آنٹی نے فخر سے کرسی کے ساتھ کمر ٹکائی۔۔۔زمن نے چہرہ تھوڑا سا جھکایا اور مشکوک انداز میں گویا ہوئی۔۔۔

" کیے تو نہیں لیکن بس زوہا کا آپریشن کیسے۔۔۔کس طرح۔۔۔"

" مار کھا لو گی تم اب مجھ سے۔۔۔"

وہ سچ میں ادھر ادھر سر گھماتیں اسے کوئی چیز مارنے کے لیے نگاہ دوڑانے لگیں۔۔۔زمن بوکھلا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔

" مذاق کیا تھا بابا۔۔۔میں چائے لاتی ہوں دوبارہ بنا کے۔۔۔"

وہ فوراً خالی برتن اٹھا کے کچن کی اور نکل گئی۔۔۔

"رہنے دو لڑکی۔۔۔ جا رہی ہوں میں۔۔۔ آج گھر پر تمہارے خان انکل کے کچھ گیسٹ آنے والے ہیں زیادہ دیر کے لیے نہیں آئی تھی۔۔۔!"

رباب خان خود بھی بیگ کندھے پہ ڈالتی زمن کو انتباہ کرتی اس کے پیچھے ہی نکل گئیں۔۔۔!

☆......☆......☆

شہریار نے ایک جھٹکے سے میڈیکل سٹور کے باہر بائیک روکی تھی۔۔۔ پیچھے بیٹھے زارون کی چیخ پکار پر اسے بری طرح گھورتے ہوئے وہ طیش سے بولا۔۔۔

"اوزنانی۔۔۔ چُپ کر جا۔۔۔ ایک ذرا سی ٹانگ سڑی ہے تیری۔۔۔ پورا شہر ہوا میں اٹھا رکھا ہے۔۔۔!"

"یہ ذرا سی سڑی ہے۔۔۔ میری کھال اتر گئی ہے اور تم کہتے ہو یہ ذرا سی ہے۔۔۔" زارون روہانسا ہوتا بائیک سے اترتے ہوئے بولا۔۔۔ وہ اپنی پینٹ کا پائنچہ اونچا کر کے پنڈلی چیک کرنے لگا۔۔۔

"یہ دیکھو۔۔۔" اس نے جلا ہوا حصہ شہریار کے آگے کیا۔۔۔

"میری گودی میں دے دے اپنی ٹانگ......" شہریار چڑا۔۔۔

"یہ ذرا سا نہیں ہوتا۔۔۔ اس میں ستر فیصد کا اضافہ کر دو تو میڈیکلی میں پورا جل چکا ہوں گا۔۔۔ سمجھے۔۔۔"

شہریار نے اسے دیکھ کے زور سے آنکھیں میچیں۔۔۔ یہ بلا اور اس کی منطقیں اس کے بس سے باہر کی تھی۔۔۔

"سوچتا ہوں پھپھو نمرہ کے گھر کتنا سکون ہو گا۔۔۔ جو انہوں نے اپنے گھر کی نیشنیلٹی پاکستان ٹرانسفر کر کے حاصل کیا ہو گا۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش زارون تجھے میں ایزی پیسہ کرا سکتا۔۔۔!"

"ارے ہاں۔۔۔ یہ بھی آئیڈیا اچھا ہوتا۔۔۔ لیکن کیا تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی لمٹ ہے۔۔۔!"

زارون ٹانگ بھول کے دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ شہریار کا دل چاہا کہ سڑک کے بیچ بیٹھ کے کسی گاڑی کے اپنے اوپر سے گزرنے کا انتظار کرے۔۔۔ زارون جواب ناپا کے ٹانگ کی طرف متوجہ ہوا۔۔۔

"بولا بھی تھا مجھے ٹھیک سے بیٹھ لینے دو۔۔۔ پر نہی۔۔۔ تم جان بوجھ کے کرتے ہو ایسا شہری۔۔۔ میرا پیر فٹ ریسٹ پہ آنے کی بجائے ٹانگ سائیلینسر کو جا لگی۔۔۔ اب میرا جسم داغی ہو گیا ہے شہری۔۔۔ پرایا دھن داغی ہونا اچھا نہی ہوتا۔۔۔!"

"کیا!!!!!۔۔۔" شہریار نیم چلاتے ہوئے بولا۔۔۔" اوئے اوئے کون ہے وہ جو تیرے دماغ میں ایسے کارتوس فٹ کرتا ہے۔۔۔ جن کو تُو موقع محل دیکھے بنا چلائے جاتا ہے۔۔۔ چلائے جاتا ہے۔۔۔!"

"نانی پیاری۔۔۔ وہ مجھے اکثر کام کی باتیں بتاتی رہتی ہیں۔۔۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ میں پرایا دھن ہوں۔۔۔ اپنا خیال رکھوں۔۔۔ کوئی داغ دھبہ پڑ گیا تو کیا جواب دیں گی۔۔۔!"

"او میاں۔۔۔" شہریار نے ہاتھ جوڑے" تیرے بدیسی ہونے کی وجہ سے کہا تھا، تیرا جینڈر نہی بدل دیا تھا کوئی۔۔۔ دل تو کر رہا ہے تیرے جیسی آئٹم کا منہ کسی کے جہیز کے ٹرک میں پیڈسٹل فین کے اوپر فٹ کرا کے بھیج دوں۔۔۔ گھومتے رہو۔۔۔ پتا نہی کس سوراخ سے تاڑ رہے تھے ہمیں جو متھے آ لگے۔۔۔ رکو اب ادھر۔۔۔ آئینٹمنٹ لے کے آتا ہوں۔۔۔ سکون سے کھڑے ہونا۔۔۔ سمجھے!"

وہ اسے اچھی طرح تاڑ کے میڈیکل کے اندر جانے لگا جب پیچھے سے زارون نے آواز دی۔۔۔

"جوس بھی لیتے آنا۔۔۔ بی پی لو ہو رہا میرا۔۔۔ سر کو چکر آ رہے۔۔۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا۔۔۔ دل گھبرا رہا ہے اور متلی سی بھی ہو رہی۔۔۔!"

شہریار شرمندہ ہوتا کن اکھیوں سے ارد گرد دیکھتا فوراً واپس پلٹ گیا مبادا کوئی اسے زارون کے ہمراہ نا سمجھے۔۔۔

"کمینہ پرایا دھن بن کے سانس لے گا۔۔۔ ٹرانس جینڈر چول۔۔۔!"

وہ دانت کچکچاتا فوراً اسٹور میں غائب ہوا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

مہریار اپنے آفس میں بیٹھا زوہا کی کیس ہسٹری فائل ریڈ کر رہا تھا۔۔۔ مڑی پلکوں والی آنکھوں پہ نظر کے گلاسز لگا رکھے تھے۔۔۔ بالوں کو آج جیل نہی لگایا تھا اسی لیے کچھ ماتھے پہ گرے ہوئے

تھے۔۔۔اس کی وجاہت وقت کے ساتھ اضافے کی جانب گامزن تھی۔۔۔ہلکی بڑھی داڑھی اور گھنی مونچھوں تلے عنابی ہونٹ سنجیدگی سے ایکدوسرے میں پیوست تھے۔۔۔زوہا کا کیس کامپلیکیٹڈ تھا لیکن لاعلاج نہیں تھا۔۔۔وہ اس کا ایک ہی کامیاب آپریشن کرنا چاہتا تھا ورنہ اکثر کیسز میں دو سے چار آپریشنز کی نوبت آجاتی تھی۔۔۔بظاہر ایسکلیلیٹر سے پیٹھ کے بل گھسٹ کے گرنے والی زوہا کو اصل چوٹ حرام مغز پر لگی تھی۔۔۔اسی انجری نے اس کے چلنے پھرنے کی طاقت سلب کر رکھی تھی۔۔۔وہ دیکھ دیکھ کے پریشان ہوتا رہا تھا کہ بہت سے ڈاکٹرز جنہوں نے زوہا کا کیس ہینڈل کیا تھا ان میں سے بیشتر کی پریسکرائیب کی گئی ہائی ڈوز ادویات کا زوہا کو سٹیرک بنانے میں ہاتھ تھا۔۔۔وہ اپنے پیشے کے نااہل افراد سے بے حد شاکی رہا کرتا تھا۔۔۔ایک حلف کے تحت وہ اس پیشے میں آیا تھا بلکہ ہر ڈاکٹر جب تک کہ وہ ہاؤس جاب مکمل کر کے پریکٹیکل فیلڈ میں نہیں آجاتا وہ خود سے عہد باندھے رکھتا ہے کہ کبھی انسانیت کی خدمت میں کوتاہی نہیں کرے گا لیکن جیسے ہی اڑان کو وسیع آسمان ملتا ہے پر نکلتے ہیں مزاج بھی بدل جاتے ہیں عہد بھی کسی اندھیرے کونے میں جا چھپتے ہیں اور حلف کی پاسداری بھی بھلا دی جاتی ہے۔۔۔یاد رہتا ہے تو بس یہ کہ مارننگ شفٹ کتنی رقم بنا کے دے گی اور شام کا کلینک ان کی آمدن میں کتنا اضافہ کرے گا۔۔۔!

وہ تھک کے فائل بند کرتا اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا گیا۔۔۔نگاہوں کے سامنے زمن کے گھر کا منظر گھوم گیا۔۔۔وہ خاصا بے نیاز سا بندہ تھا۔۔۔اپنے حال اور کام میں مست رہنے والا۔۔۔جو ذمہ داری سر پڑ پڑتی تھی بس اسے احسن طریقے سے پورا کرنے والا لیکن خود سے عام طور پر کسی نئی ذمہ داری کو قبولنے میں کبھی پہل نہیں کی تھی اس نے۔۔۔اور وہ اسی لیے کتراتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا فرائض کو نبھانا اس کی سرشت میں شامل ہے۔۔۔زمن اس کی ذمہ داری تھی نا فرض لیکن رباب خان نے اسے الجھا دیا تھا اور اب اسے اس معاملے کو اپنے ساتھ ہی کرنا ہی تھا۔۔۔ہاجرہ کا پریشان چہرہ اسے ابھی بھی نقش بہ از بر تھا۔۔۔ان کی امید افزا نگاہیں جو دوران معائنہ اس پہ جمی ہوئی تھیں وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔۔۔گھر کے حالات کا بھی وہ بنظر غائر جائزہ لے آیا تھا۔۔۔سفید پوشی کی قبا اوڑھ رکھی تھی پورے گھر نے۔۔۔وہ جانتا تھا کہ ہاجرہ کی سلیقہ مندی اور قناعت نے ان کے سروں کو ڈھانپ رکھا ہوگا۔۔۔زوہا کا

لاچار وجود کبھی بھی اتنا انتظار نا کرتا جو ان کے پاس رقم ہوتی۔۔۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پہلو بدلا تھا۔۔۔گلاسز اتار کے ٹیبل پہ رکھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے آنکھیں سہلائیں اور جیسے بند پپوٹوں کے پیچھے ہی کہیں زمن کا سراپا چھپا بیٹھا تھا۔۔۔اس کا خیال آتے ہی اس کے جلے کٹے تاثرات ذہن میں گردش کرنے لگے۔۔۔وہ ایک محنتی لیکن جذباتی سی لڑکی تھی۔۔۔ دبلے پتلے جسم کے ساتھ لمبا قد اور سنہری سفید رنگت۔۔۔مڑی پلکوں کے ساتھ گہری سیاہ بادامی آنکھیں۔۔۔وہ گدڑی میں لعل دکھائی دیتی تھی۔۔۔تو کیا وہ واقعی گدڑی میں ہی چمکنے کے لیے تھی۔۔۔؟ یہ سوال وہ کئی بار خود سے کر چکا تھا۔۔۔ ۔رباب خان نے جتنا اس کے بارے میں بتایا تھا اس سے زیادہ جاننے کی اسے چاہ بھی نہی تھی۔۔۔وہ اس سارے معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن اپنے انداز سے۔۔۔رباب خان کے کہنے کے مطابق وہ عمل نہی کر سکتا تھا۔۔۔جن تلخیوں کو اس نے ماضی میں گھونٹ گھونٹ بھرا تھا وہ ان کی کڑواہٹ آج بھی زبان پہ محسوس کرتا تھا اور بد قسمتی سے وہ حال میں جینے والا ماضی پرست انسان تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

ہاجرہ زوبا کی ادویات کا شاپر احتیاط سے سنبھالے بقایا پیسے اپنے والٹ میں ڈالتی باہر نکل رہی تھیں۔۔۔جب شہریار اندر داخل ہوتا ان سے ٹکراتا ٹکراتا بچا تھا۔۔۔باہر کی دھوپ کی تیز روشنی میں سے اندر آتے اسے منظر ایک دم واضح نہی ہو سکا تھا۔۔۔پھر بھی ہاجرہ کا والٹ نیچے گر گیا تھا۔۔۔وہ معذرت کرتا جھکا اور فوراً والٹ اٹھا کے انہیں پکڑایا۔۔۔جواباً ہاجرہ شکریہ کہتی آگے بڑھنے کو تھیں جب شہریار نے چونکتے ہوئے انہیں بغور دیکھا۔۔۔

"ایک سیکنڈ آنٹی۔۔۔!" وہ بے ساختہ پکار بیٹھا۔۔۔ہاجرہ نے رک کر گردن موڑی اور استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔۔۔

"آپ وہی ہیں نا جو ڈنٹسٹ کے پاس بھی آئی تھیں۔۔۔آپ کے ساتھ آپ کی بیٹی بھی تھی شائد۔۔۔!" بیٹی کا سن کے ہاجرہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔۔۔شہریار فوراً سنبھلا۔۔۔

"مجھے غلط مت سمجھیے گا۔۔۔آپ کے چہرے سے انسیت محسوس ہوتی ہے جیسے کہیں دیکھا ہو۔۔۔

جیسے آپ سے جان پہچان ہو۔۔۔نا جانے کیوں۔۔۔وہ اس دن ڈینٹسٹ کے پاس دیکھ کے بھی چونک گیا تھا اور آج دوبارہ دیکھا تو تجسس کی بنا پہ پوچھے بغیر رہ نہی پایا۔۔۔!"

شہریار کے سادگی سے کہنے کے باوجود ہاجرہ کا ہاتھ میکانکی انداز میں چادر کے پلو کی طرف گیا اور انہوں نے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔۔۔شہریار شرمندہ سا ہوتا نگاہیں جھکا گیا۔۔۔ ہاجرہ اس کی شرمندگی زائل کرنے کے لیے ازراہ مروت بولیں۔۔۔

"بس بیٹا آتے جاتے کتنے ہی چہرے ایسے ہوتے ہیں جو جانے پہچانے لگتے ہیں۔۔۔آپ کو بھی ایسا ہی لگا ہوگا۔۔۔اس میں اچنبھے کی بات نہی ہے۔۔۔میں اب نکلتی ہوں۔۔۔دیر ہو رہی ہے۔۔۔!" وہ بات مکمل کرتی پلٹ گئیں جب شہریار نے ایک بار پھر پیچھے سے پکار لیا۔۔۔

"آپ برا نا مانیں تو میں چھوڑ دوں آپ کو آنٹی۔۔۔؟"

یہ کہہ کر شہریار پچھتایا۔۔۔اسے فوراً محسوس ہو گیا کہ وہ جلد بازی سے کام لے گیا ہے۔۔۔

"جی نہی شکریہ بیٹا۔۔۔میں جا سکتی ہوں خود ہی۔۔۔آپ اپنا کام کرو۔۔۔!"

ہاجرہ سپاٹ لہجے میں جواب دیتیں فوراً دروازہ کھول کے سٹور سے باہر نکل گئیں تھیں مبادا وہ پھر نا روک لے۔۔۔شہریار نے اپنے سر کی پشت پہ ہلکی سی چپت رسید کی اور خود سے مخاطب ہوا۔۔۔

"ان آنٹی کا معلوم کرنا ہے ویسے کہ کون ہیں۔۔۔ پتا نہی کہاں دیکھا ہے انہیں۔۔۔کہیں تو دیکھا ہے۔۔۔!"

وہ پرسوچ نگاہیں لیے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

"مے آئی کم ان سر۔۔۔!" شہزور کی سیکرٹری لائبہ نے اس سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔۔۔لیپ ٹاپ میں مصروف شہزور نے سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔۔۔

"سر یہ کچھ ڈیٹیلز ہیں جو نادرہ کے دفتر سے کریمی صاحب کی جانب سے موصول ہوئی ہیں۔۔۔ آپ نے کہہ رکھا تھا جن کا۔۔۔!"

"او ہاں۔۔۔" وہ فوراً متوجہ ہوا۔۔۔"لاؤ دکھاؤ۔۔۔اور تم جا سکتی ہو۔۔۔!"

لائبہ فوراً واپس مڑی تھی اور اس نے بنا لمحہ ضائع کیے وہ فائل کھولی تھی۔۔۔جوں جوں وہ نگاہیں دوڑا رہا تھا اس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔۔۔ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔۔۔یکدم وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور طیش سے وہ فائل اڑا کے سامنے پھینکی۔۔۔ایک ہی نام کی تمام لڑکیوں کی تفصیل اس میں درج تھی پر جس کی اسے تلاش تھی وہ اس میں کہیں نہی تھی۔۔۔

"آہہہہہ۔۔۔" وہ غرایا تھا" تم دنیا کے جس کونے میں چھپ جاؤ۔۔۔نام تو کیا ہستی بھی بدل لو۔۔۔اگر اس دھرتی پہ ہو تو شہزور تمہیں ڈھونڈ لے گا۔۔۔یہ میرا خود سے عہد ہے۔۔۔اور شہزور خود سے بدعہدی کبھی نہی کرتا۔۔۔!"

ابھی غصے کی ایک شدید لہر باہر نکلنے کو بے تاب تھی تبھی ٹیبل پہ رکھا پیپر ویٹ اٹھا کے سامنے دیوار پہ دے مارا تھا۔۔۔دھپ سے واپس کرسی پہ بیٹھ کے شہزور لمبے لمبے سانس لے کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔لیکن جب سکون نہی ملا تو ٹیبل سے سیل اور چابیاں اٹھاتا کرسی کی بیک سے کوٹ جھپٹتا آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن، ہاجرہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر زوہا کو وہیل چیئر پہ بٹھا کے قریبی پارک میں لے آئی تھی۔۔۔ہاجرہ سختی سے منع کرتی تھیں زوہا کو کہیں باہر نکالنے نہی دیتی تھیں۔۔۔ایک تو لوگوں کی ترحم بھری نگاہیں ان سے برداشت نہی ہوتی تھیں اور دوسرا زوہا بھی سہہ نہی پاتی تھی۔۔۔لیکن زمن ہمیشہ زور دیتی تھی کہ اسے باہر کھلی فضا میں نکالنا از حد ضروری تھا خاص طور پر اسے ہسٹیریک ہونے سے بچانے کے لیے۔۔۔رباب آنٹی کے جاتے ہی زمن، زوہا کو لیے پارک میں چلی آئی تھی۔۔۔گھر پہنچنے پر اگر اس سے پہلے ہاجرہ پہنچ چکی ہوں گی تو آج خوب ڈانٹ پڑنے والی تھی۔۔۔

پارک میں حسب معمول چہل پہل تھی۔۔۔موسم کی خنکی ابھی ماحول پہ طاری تھی۔۔۔دم توڑتی سورج کی کرنوں میں ابھی ہلکی ہلکی سی تپش تھی جو جسم کو بھلی لگ رہی تھی۔۔۔اس نے قریب ایک کیاری

سے پھول توڑا اور زوہا کے بالوں میں ٹکایا۔۔۔زوہا نے بیزاریت سے سر سے اتار کر انگلیوں میں تھام لیا۔۔۔

"سونگھو تو سہی۔۔۔اتنی اچھی خوشبو ہے۔۔۔دل بہلایا کرو نا زوہا میری جان۔۔۔!"

"لولی لنگڑی زندگی سے دل نہی بہلایا جاتا آپی۔۔۔چلتی پھرتی زندگیاں اچھی لگتی ہیں۔۔۔دل ان سے لگتا ہے۔۔۔مجھے تو یہی نہی معلوم ہو پاتا کہ دن کب ہوا اور رات کہاں آئی تو بھلا پھولوں کی خوشبو مجھے کس بہار کا پتا دے گی۔۔۔!"

اسقدر تلخی۔۔۔اتنی ترشی۔۔۔زمن سُن سی ہو کر وہیل چیئر روک گئی۔۔۔اس کے سامنے آتے وہ پیروں کے بل بیٹھ گئی۔۔۔دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ رکھتی وہ رسان سے بولی۔۔۔

"اتنی مایوسی زوہا۔۔۔ہاں۔۔۔؟ چندا ابھی تو تمہاری مٹھی میں امید کی کرن موجود ہے۔۔۔تمہارے آپریشن کے سیکسیس فل ہونے کے اسی فیصد چانسز ہیں۔۔۔تم ٹھیک ہو سکتی ہو۔۔۔ڈاکٹرز مایوس نہی ہیں۔۔۔تو پھر اتنی دل گرفتہ کیوں ہوتی ہو۔۔۔مجھے تو آنٹی رباب نے ایسے کیسز بھی دکھائے ہیں جو کسی حادثے کے بعد اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا تو دور کی بات بستر پہ لیٹے سے بیٹھ نہی سکے۔۔۔تم تو ماشاءاللہ بیٹھ جاتی ہو۔۔۔

"بیٹھتی نہی۔۔۔بٹھائی جاتی ہوں۔۔۔!" وہ نروٹھے پن سے بولی تو زمن کو بے ساختہ اس پہ پیار آیا۔۔۔اس نے زوہا کے دونوں ہاتھ تھام کے ہونٹوں سے لگائے۔۔۔

"اچھا ایک پل کو سوچو زوہا۔۔۔بس ایک پل کو۔۔۔"

زوہا نے اس کی نگاہوں میں اپنی سوالیہ نگاہیں ڈالیں۔۔۔

"اگر یہ حادثہ میرے ساتھ ہوتا۔۔۔" زوہا نے فوراً اپنا ہاتھ زمن کے ہونٹوں پہ رکھا تھا لیکن اس نے فوراً اسے ہٹا کے بات جاری رکھی۔۔۔"تو کیا تم مجھے مایوس ہونے دیتی۔۔۔کیا میرا دل بہلانے میں کسر اٹھا رکھتی۔۔۔کیا مجھے اکیلا چھوڑ دیتی۔۔۔؟"

"کبھی نہی آپی۔۔۔اپنی جان لڑا دیتی لیکن آپ کا خیال رکھتی۔۔۔آپ کو کبھی تنہا نا ہونے

دیتی۔۔۔آپ کا دل اداس نا ہونے دیتی جیسے آپ اور امی میرا نہیں ہونے۔۔۔"

اس نے یکدم بات ادھوری چھوڑی تھی۔۔۔زمن نے یہیں سے سرا پکڑا۔۔۔

"یعنی تم مانتی ہونا کہ میں نے اور امی نے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا۔۔۔تو میری جان ایک پل کو بس کبھی یہ سوچ کر دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا زوہا کہ یہاں اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی سانسیں پوری کر رہے ہیں جن کا دل بہلانے والا کوئی نہی۔۔۔پیار بھرے بول سنانے والا کوئی نہیں۔۔۔خیال رکھنے والا کوئی نہیں۔۔۔آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔۔۔کیا یہ نعمت نہیں ہوتی۔۔۔؟"

زوہا نے اثبات میں سر ہلا کے پلکیں جھکا لیں۔۔۔چہرے پہ ملال سا چھا گیا۔۔۔اس نہج پہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اور اب ایک پل کو واقعی اسے خیال آیا کہ کیا ہوتا جو وہ بے یارو مددگار کسی بوسیدہ بستر پہ لاغر وجود لیے پڑی ہوتی اور اس کا کوئی اپنا اس کی دیکھ بھال کو نا ہوتا۔۔۔اس سوچ نے اس کے وجود کو جھرجھرا دیا تھا۔۔۔وہ حتی المقدور جھکی۔۔۔زمن سمجھ گئی اسے گلے لگانا چاہتی ہے۔۔۔وہ خود سے آگے ہوئی اور زوہا کے گلے لگی۔۔۔آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔۔۔زمن نے اس کے سر کی پشت کو محبت سے سہلایا اور بنا کچھ کہے محض اپنے لمس سے اسے دلاسہ دیا۔۔۔زوہا کو ایسی ڈوز کی گاہے بگاہے ضرورت تھی۔۔۔زمن اس کی بہن تھی اور اس کے مزاج کے تمام رنگوں سے آشنا تھی۔۔۔اس نے زوہا کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور کھڑی ہوتی واپس اس کی پشت پہ آ گئی۔۔۔وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے وہ اب معمول کی گفتگو شروع کر چکی تھی اور زوہا اس کی باتوں کے دلچسپی سے جواب دینے لگی تھی۔۔۔!

"زندگی آپ کو چانس دیتی ہے۔۔۔اختیار نہیں دیتی۔۔۔تو بس جو ملتا ہے اسی کا فائدہ اٹھانا دانشمندی ہے۔۔۔لاحاصل کی تگ و دو میں توانائی صرف کرنا حماقت ہوا کرتی ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

ہاجرہ تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوئی تھیں اور گیٹ بند کر کے اس سے پشت ٹیک کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔۔۔دل کی عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ سمجھ نہی پا رہی تھیں۔۔۔میڈیکل سٹور پر ملنے والا وہ لڑکا ان کا گھر تک پیچھا کر گیا تھا۔۔۔اس کے پیچھے ایک اور نوجوان بھی تھا جسے وہ غور سے دیکھ نہی پائی

تھیں لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ انہی کے پیچھے آیا تھا۔۔۔ جیسے ہی وہ اپنے گھر کے قریب پہنچی تھیں وہ لڑکا اس انداز میں گلی میں بائیک چلاتا داخل ہوا تھا جیسے کسی کا گھر ڈھونڈ رہا ہو۔۔۔ ادر گرد سر گھما کے نیم پلیٹس پڑھتا وہ درحقیقت ان کی ہی جانب متوجہ تھا اور یہی چیز ہاجرہ کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔۔۔ وہ اسے نا جانتی تھیں اور نا ہی ذہن پہ زور دینے کے باوجود انہیں یہ یاد آسکا تھا کہ اس لڑکے کو کہیں دیکھ رکھا ہو۔۔۔ ایسے میں پھر اس کا ان کے گھر تک پیچھا کرنا انجانے خوف مین مبتلا کر گیا تھا۔۔۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئیں تھیں انہوں نے اس کی بائیک کو تیزی سے دہلیز کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا لیکن اگلے ہی پل وہ دروازہ بند کر گئی تھیں۔۔۔ خود کو پرسکون کرنے کے بعد وہ چادر اتارتی برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ گئیں اور زمن کو آوازیں دینے لگیں۔۔۔ ایک بار دو بار لیکن وہ گھر ہوتی تو سنتی۔۔۔ ہاجرہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھیں اور اندر زوہا کے کمرے میں جا کر دیکھا تو اس کا بیڈ خالی تھا اور کونے پہ ہمیشہ پڑی رہنے والی وہیل چیئر بھی غائب تھی۔۔۔ وہ سمجھ گئیں کہ زمن، زوہا کو باہر لے گئی ہے۔۔۔ وہ غصے اور بے بسی کے گھونٹ بھرتیں واپس تخت پہ آبیٹھیں۔۔۔

"ہمیں یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔۔۔" وہ باآواز خود سے مخاطب ہوئیں۔۔۔ "جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔۔۔ بس جیسے ہی زوہا کا آپریشن ہو جائے گا میں رباب سے کہوں گی کہ کوئی مکان دیکھ دے۔۔۔ لیکن یہاں سے جانا ہوگا اس سے پہلے کہ کوئی نئی آفت گھر کی راہ دیکھ لے۔۔۔ مجھے زمن کو نہیں بتانا، ہرگز نہیں۔۔۔ میری بچی پہلے ہی مصیبتیں جھیلتی آئی ہے مزید اسے پریشان نہیں کرنا۔۔۔ بس جو کرنا ہوگا میں خود کروں گی اور جلد از جلد کروں گی۔۔۔!"

وہ عرصے سے اکیلے میں خود سے باتیں کرنے کی عادی تھیں۔۔۔ کئی بار وہ پورے قصے خود کے ساتھ دہرا لیا کرتی تھیں۔۔۔ جب ساتھی چھوٹ جائیں تو تنہائی ساتھی بن جایا کرتی ہے۔۔۔ بے لس ساتھی۔۔۔ ان کی تنہائی بھی ان کا ایسا ساتھی تھی جس سے وہ بچھڑوں کی باتیں چھیڑا کرتی تھیں۔۔۔ انہوں نے چپل اتار کر پاؤں اوپر کیے اور گاؤ تکیے پہ سر رکھ کے کروٹ کے بل لیٹ گئیں۔۔۔ نگاہیں سامنے کیاریوں میں جمی تھیں اور آنکھوں کے کنارے گیلے ہونے لگے تھے۔۔۔ یادیں، باتیں، بے بس

راتیں قطار در قطار نمکین پانیوں کی شکل میں نکلتی چلی جا رہی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

تیز رنگنگ ٹون نے الٹے سوئے شہزور راؤ کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔۔۔وہ رات بہت دیر سے گھر آیا تھا۔۔۔اب آدھا دن گزر چکا تھا اور اس کی نیند تھی کہ پوری ہونے میں نا آئی تھی۔۔۔وہ ذرا سا کسمسایا اور رخ پھیر کے دوبارہ سو گیا لیکن بیل بند نا ہوئی تو سستی سے الٹے سیدھے ہاتھ مارتا سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل کو پکڑنے لگا۔۔۔

"ہیلو۔۔۔!" پھاڑ کھاتا لیکن غنودہ لہجہ تھا۔۔۔

"سوری سر۔۔۔اٹس می سر۔۔۔لائبہ۔۔۔سوری آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا۔۔۔!" اس کی سیکرٹری نے "اس وقت" کو تھوڑا سا چباتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں بولو لائبہ۔۔۔کیا بات ہے۔۔۔؟" اس نے آنکھیں مسل کر حواس جگانے کی کوشش کی۔۔۔

"وہ سر۔۔۔گارڈ مزمل آیا تھا ابھی۔۔۔وہ بتا کر گیا ہے کہ اس کو جس لڑکی کے بارے میں معلوم کرنے کا آپ نے ذمہ سونپا تھا، اس کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے۔۔۔!"

"واٹ۔۔۔" اب کے وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔۔۔"کیا۔۔۔کیا پتا چلا ہے لائبہ۔۔۔جلدی بتائیں۔۔۔!"

"سر وہ کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکی جہاں کام کرتی ہے اس جگہ کا اس نے معلوم کر لیا ہے۔۔۔اب جب آپ چاہیں تو وہاں لے جائے گا آپ کو وہ۔۔۔!" لائبہ نے ہچکچاتے اسے پوری بات بتائی۔۔۔پتا نہیں لیکن اس کا دل کر رہا تھا وہ یہ سب شہزور کو نا بتائے لیکن وہ نا بتاتی تو گارڈ کو خود تو بتانا ہی تھا۔۔۔

"زبردست۔۔۔کمال۔۔۔اچھا اسے کہو میں بس آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔۔۔باقی کی تفصیل میں خود آ کے لیتا ہوں۔۔۔اوکے۔۔۔رکھو تم۔۔۔اور ہاں۔۔۔" اسے ایک دم یاد آیا۔۔۔"وہ تم نے کمپنی سے لون مانگا تھا۔۔۔آج آفس آ کر آسائین کر دوں گا۔۔۔!"

"تھینک یو سر۔۔۔تھینک یو سو مچ۔۔۔مجھ پر احسان ہو گا آپ کا۔۔۔پہلے ہی میری والدہ کے علاج کے لیے کافی مدد کی ہے آپ نے میری۔۔۔!"

"فارگیٹ اٹ۔۔۔" وہ بے نیازی سے بولا۔۔"اوکے رکھتا ہوں۔۔۔بائے۔۔۔" اس نے کال کاٹ دی تھی۔۔۔

"بائے سر۔۔۔" لائبہ نے سیل فون کو کان سے ہٹا کے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔اس کے ہونٹوں پہ یاسیت آمیز طنزیہ مسکراہٹ کھیل گئی۔۔۔

"معلوم نہیں سر کہ کون کس پہ احسان کر رہا ہے۔۔۔!"

سیل فون ٹیبل پہ رکھتی وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

سنہری بیگم ہال کمرے میں اپنے دیوان خاص پر براجمان تھی۔۔۔زیورات کے ڈبے سامنے میز اور کچھ پہلو میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔۔۔کئی ڈبوں کے ڈھکن کھلے تھے اور کچھ ابھی بند تھی۔۔۔سنہری بیگم ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھامے انہیں ٹٹول رہی تھی۔۔۔خاصے بھاری اور وزن دار کنگنوں کی چمک دور سے ہی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔۔۔کافی فاصلے پہ کام کرتی جوان ملازمائیں چور نظروں سے گاہے بگاہے اس طرف دیکھتی تھیں۔۔۔ہاتھ سست روی کا شکار تھے کہ دل دیکھ دیکھ کر بھر ہی نہیں رہا تھا۔۔۔سونے کی چمک اور سرخ جوڑے کی ہمک عورت کی ازلی کمزوری ہوا کرتی ہے۔۔۔ہاتھ باندھے پشت پر رکھی کھڑی تھی جو حسرت سے ان زیورات کے ڈبوں کو نہیں بلکہ ان نوخیز اور نو عمر ملازماؤں کو دیکھ رہی تھی جن کی آنکھوں کے خواب ابھی مرے نہیں تھے۔۔۔وہ نہیں جانتی تھیں کہ رکھی جب اس حویلی میں آئی تھی تو ان ہی کے جیسے خواب لائی تھی لیکن خوابوں کو نوچ پھینکنا اس حویلی کی روایت رہی ہے۔۔۔گھر بسانے کا ارمان رکھی کے بالوں میں بڑھتی سفیدی کے ساتھ ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔۔۔ساری عمر بیت جاتی تھی لیکن جس قرض کے بدلے یہاں اپنی جوانیاں لے کر لڑکیاں آتی تھیں وہ قرض ان کے بڑھاپے تک ادا نہیں ہو پاتا تھا۔۔۔ان کے لواحقین گاؤں چھوڑ چھاڑ جا چکے ہوتے تھے

یا پھر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے تھے اور یہ بیچاریاں اس آس میں عمر نکال دیتی تھیں کہ جیسے ہی ان کے ماں باپ کا قرض ادا ہو جائے گا وہ انہیں یہاں سے لے جائیں گے لیکن ایسا کبھی نا ہوا تھا اور نا سنہری بیگم ہونے دے سکتی تھی۔۔۔

"اے رکھی۔۔۔" وہ کنگن ایک ہاتھ میں کرتی دوسرے سے پاندان سے چھالیہ منہ میں پھانکتی ہوئی پکاری۔۔۔

"ذرا جا اشرف کو کہہ کہ سنار کو سنیہا پہنچا دے کہ ہفتے دس دن میں چکر لگائے حویلی کا۔۔۔ وریشہ کے آنے سے پہلے میں ان کو پالش کروا دوں۔۔۔ ورنہ اس کے سامنے یہ سب کروانا اچھا نہیں لگتا۔۔۔"

"ہاں وہ کہے گی کہ خالہ نے اپنے استعمال ہوئے زیور میرے متھے مار دیئے۔۔۔ ہیں نا اماں۔۔۔!"

شہزور راؤ خوشبوؤں میں نہایا وہاں داخل ہوا تھا۔۔۔ اس کے آتے ہی ملازمائیں سب ادھر ادھر ہو گئیں تھیں۔۔۔ سنہری بیگم نے چڑ کے نظر ان کنگنوں سے ہٹا کے بیٹے پر ڈالی اور ٹھہر گئی۔۔۔ نیلی جینز کے اوپر کالی شرٹ پہنے۔۔۔ کف فولڈ کیے۔۔۔ ہاتھ میں چابیاں اور موبائل تھامے وہ اس قدر وجیہہ لگ رہا تھا کہ سنہری بیگم نے غصے کے باوجود اس پہ دم کیا۔۔۔ زوردار پھونک اس کے قریب آنے پر ماری تو شہزور ہاتھوں کی آڑ دیتا قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔۔۔

"ہولی مارا اماں۔۔۔ اڑ ہی نا جاؤں کہیں تمہاری پھونکوں سے۔۔۔!"

"ناخیری صلا۔۔۔ کیوں اول فول بکتا رہتا ہے۔۔۔ جب بھی پاس آ کر بیٹھتا ہے کلیجہ ساڑ کے اٹھتا ہے۔۔۔ اب بتا ذرا یہ صاحب بہادر کی سواری کدھر چلی ہے۔۔۔!"

"شہر چلا ہوں ذرا۔۔۔ آفس میں کام ہے کچھ۔۔۔ ہو سکتا ہے رات کو واپسی میں دیر ہو جائے۔۔۔ اور ہاں ابا آئیں تو ان سے کہنا کل میں بھی پنچائیت میں بیٹھوں گا۔۔۔!"

اس نے ماتھے پہ بل ڈالے فولڈ ہوئے کف دوبارہ سیٹ کیے۔۔۔ سنہری بیگم نے تشویش سے اسے دیکھا۔۔۔

"اب کون سا چن چاڑھنا ہے پتر۔۔۔نا کر دیکھ میرا بچہ، تیرے ابا نے مشکل سے پنڈ والوں کا غصہ ٹھنڈا کیا ہے۔۔۔نہی تو تیرے پانی کاٹنے کی وجہ سے معاملہ بہت بگڑ گیا تھا۔۔۔اب تُو پھر کوئی نیا پٹو کا ناڈال دینا۔۔۔تُو سکون سے اپنے شہر کے کام نبٹا نا۔۔۔ادھر کے سلسلے باپ کو دیکھنے دے۔۔۔ ہاں کہہ دیا میں نے بس۔۔۔!"

اس نے نروٹھے انداز میں بات ختم کر کے زیور کا ڈبہ واپس اٹھایا جیسے شہزور اس کی بات مان کے ہی اٹھے گا لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔۔۔ضدی اور ہٹ دھرم۔۔۔

"تجھے کس نے کہا ہے اماں کہ مجھے متیں دے کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔۔۔شہزور راؤ کو کوئی ماں کا لعل نہیں روک سکتا پنچائیت میں بیٹھنے سے۔۔۔اور کل میں دیکھوں گا کون میرے آگے پھرتا ہے۔۔۔ ڈنڈے سوٹے چلانے پڑے یا گولیاں کل چوہدری قاسم راؤ اور اس کا پتر اپنا ٹھکا دکھا کے ہی حویلی واپس آئیں گے۔۔۔بتا دینا ابا کو۔۔۔چلتا ہوں۔۔۔!"

وہ انتہائی سنجیدگی سے کہتا کھڑا ہوا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔۔۔سنہری بیگم حق دق اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔یکدم کچھ خیال آیا تو پاس سے گزرتے کی کلائی تھام کے روکا۔۔۔

"سن میری بات۔۔۔" شہزور ماتھے پہ بل لیے رکا۔۔۔انداز میں عجلت تھی۔۔۔"یا تو تُو ویاہ کر لے چوہدری اکبر کی کڑی سے۔۔۔ہمارا پیر آپوں آپ اچا ہو جائے گا۔۔۔میں وریشہ والا معاملہ ٹھپ کر دیتی ہوں۔۔۔نہیں کروں گی اس سے تیرا ویاہ۔۔۔اب اگر تُو ٹھکا ہی دکھانا چاہتا ہے تو لے آ ان چوہدریوں کی کڑی اور پھر دیکھ کیسے ساتھ کے سات پنڈ تجھے سلا میں کرتے۔۔۔میں تو خود چاہتی ہوں کہ ان کل کے بنے چوہدریوں کے بال پیروں کے نیچے داب لوں۔۔۔میرا بھی رعب بیٹھ جائے ان زلیلوں پہ۔۔۔!"

"واہ اماں واہ۔۔۔" اس نے ایک جھٹکے سے کلائی چھڑائی۔۔۔"تیرا بھی جواب نہیں۔۔۔کتنی جلدی بھانجی کو کھڈے لائن لگا دیا۔۔۔ساری محبت لپیٹ کے پاندان میں ڈال دی۔۔۔پر کا کوا بنانے میں تو تجھے بس دو منٹ لگتے ہیں۔۔۔اب خیال آتا ہے کہ رائی کا پہاڑ بنانے میں تُو نے کتنی جلدی کی ہو گی نا اماں۔۔۔!"

اس کے کاٹ دار طنز کی وجہ سنہری بیگم اچھے سے سمجھ گئی تھی اور بری طرح تلملاتی ہوئی پہلو بدل گئی تھی۔۔۔شہزور کی ایسے کڑوے سچ ہمیشہ ان کا پارہ ہائی کر دیا کرتے تھے۔۔۔

"اور ویسے بھی اماں۔۔۔بار بار ایک ہی بات کی تکرار نا کرایا کر۔۔۔کہہ دیا نا کہ شادی اسی سے کروں گا جس سے منگنی کی تھی تو بس اسی سے کروں گا۔۔۔اور اسے ڈھونڈ کے لاؤں گا۔۔۔چاہے صدیاں لگ جائیں۔۔۔!"

وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا تھا۔۔۔

"ہونہہ۔۔۔صدیاں لگ جائیں چاہے۔۔۔" سنہری بیگم نے تپ کر نقل اتاری تھی۔۔۔کھٹاک سے زیور والا ڈبہ بند کیا اور اسے پٹخ دیا۔۔۔سارے میں خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔ارد گرد دبکی ہوئی ملازمائیں واپس دبے پیر کام پر لگ گئی تھیں اور اس خاموشی میں یکدم کسی کے بیٹھے گلے سے چلانے کی آوازیں ابھرنا شروع ہوئیں تھیں۔۔۔سنہری بیگم کا ماتھا شکنوں سے اٹ گیا تھا۔۔۔دل چاہا کہ سارا طیش جا کر اس چلانے والے پر اتار آئیں۔۔۔

"اے رکھی۔۔۔ادھر مر۔۔۔!"

رکھی فوراً پاس آ کھڑی ہوئی۔۔۔

"جا کے دے اسے زہر مہرہ۔۔۔بند کرا اس کی آوازیں ورنہ سر پھٹ جائے گا میرا۔۔۔جا جلدی۔۔۔!"

رکھی وہاں سے بھاگی تھی۔۔۔اور سنہری بیگم مٹھیاں اور کان بھینچتی آنکھیں بند کر کے اس آواز کو جیسے سماعت تک پہنچنے سے روکنے لگی۔۔۔ایک ہول سا اٹھتا تھا اس آواز کو سن کر۔۔۔حویلی کی دیواریں جیسے ہلنے لگتی تھیں گویا اسی پہ الٹ جانا چاہتی ہوں۔۔۔وہ اپنے اندر کی بے چینی کو ڈھانپنے کی خاطر دوسری ملازماؤں کو اونچی اونچی چلا کر کاموں کو دوڑانے لگیں۔۔۔!

☆......☆......☆

"آئیے آئیے مسز خان۔۔۔کیسی ہیں۔۔۔کیسے راستہ بھول گئیں۔۔۔؟" وہ رباب آنٹی کے ساتھ

شاپ کے اندر داخل ہوئی تو ایک نفیس اور ماڈرن ڈریسنگ والی خاتون فوراً ان ہی جانب بڑھی تھیں۔۔۔ رباب آنٹی ان کے گلے ملیں اور وہ خاتون ان دونوں کو لیے ایک سائیڈ پر ہو گئیں۔۔۔

"میں الحمدللہ تمہارے سامنے ہوں اور ہمیشہ کے جیسی۔۔۔" وہ ہنسیں۔۔۔ اور پھر زمن کی جانب دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئیں۔۔۔ "بھئی اس بار راستہ نہیں بھولی بلکہ اپنی بھانجی کو لائی ہوں۔۔۔ بتایا تھا نا کہ جاب چاہیے جسے، یہ وہی ہے۔۔۔ انتہائی محنتی اور مخلص ہے۔۔۔ دل لگا کے کام کرے گی لیکن فائزہ! تمہیں میری بھانجی کو اچھا پیکج دینا ہوگا۔۔۔!"

اپنی بھانجی کہہ کر انہوں کے جیسے زمن کا سیروں مان بڑھایا تھا۔۔۔ وہ متشکر نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔۔۔

"ماشاءاللہ۔۔۔ بھانجی بھی آپ جیسی ہی حسین ہے مسز خان۔۔۔" انہوں نے زمن کو چاہت سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "اور ہاں جی بلکل یاد ہے مجھے، بے فکر ہو جاءیں آپ۔۔۔ آپ کی بھانجی میری بھانجی۔۔۔ اور پیکج کی بھی آپ فکر نا کریں۔۔۔ میری شاپ کا ماحول اور سٹاف بھی اطمینان بخش ہے ان شاءاللہ بیٹی کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔۔۔!" مس فائزہ مسلسل اسے محبت سے دیکھتے ہوئے سادہ لہجے میں بولیں۔۔۔ وہ طبعاً اچھی لگ رہی تھیں۔۔۔ لب و لہجے میں حلیے کے برعکس کوئی بناوٹ نہیں تھی نا ہی کسی قسم کا زعم۔۔۔ زمن کو لگا کہ یہاں وہ ایزیلی ایڈجسٹ کر لے گی۔۔۔ باقی کا سارا وقت رباب آنٹی اور ان کی دوست بات چیت کرتی رہیں جبکہ وہ شاپ کا اچھے سے جائزہ لیتی رہی۔۔۔ نامور مال کے سیکنڈ فلور پر لیڈیز ایکسیسریز کی شاپ تھی۔۔۔ اس کے علاوہ برانڈڈ ڈریسز کا بھی سیکشن تھا۔۔۔ وہ سکول سے ریزائین دے چکی تھی اور اب بس کسی دن اسے فیئرویل کے لیے کال کیا جانا تھا کیونکہ اس کا ریزائین اچانک تھا اس لیے اس کی فیئرویل بھی ڈیو ہو چکی تھی۔۔۔ وہ چلتی ہوئی سٹالرز والے سیکشن پہ آ کھڑی ہوئی۔۔۔ ایک سٹالر کو ہاتھ کی پوروں سے چھوتے بے اختیار اسے زوہا کا سٹالر یاد آ گیا جو اسے حادثے والے دن دلایا تھا۔۔۔ نا جانے اس دن وہ سٹالر ہڑبونگ میں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر کدھر گرا، کہاں گیا۔۔۔ زوہا کو اوڑھنا نصیب ہی نا ہو سکا۔۔۔ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔۔۔ چھوٹی سی خوشی بھی کبھی کبھار

انسان سے۔ بہت بڑی قیمت وصول کرتی ہیں۔۔۔وہ سر جھٹکتی واپس آنٹی رباب کیجانب بڑھ گئی۔۔۔!

☆......☆......☆

پورے چھت پہ نانی پیاری نے دریاں بچھوا کے سردیوں کے کپڑے پھیلا رکھے تھے جنہیں دھوپ لگوا رہی تھیں۔۔۔وہ ہمیشہ ہر موسم کے کپڑے ابھی بھی چھت پہ سارا سارا دن دھوپ میں پھیلا دیا کرتی تھیں۔۔۔اس کے بعد رضائیوں اور کمبلوں کی باری آتی اور لڑکوں کی موجیں لگ جاتیں۔۔۔فضلو اور نانی پیاری ان چاروں کے ہاتھوں زچ ہو جاتے لیکن یہ چار کا ٹولا اپنا ساز و سامان لے کر چھت پر ڈیرا ڈال لیتا اور پھر لازم تھا کہ ہر ہر کپڑا پہن کر دیکھا جاتا۔۔۔ہر سویٹر جیکٹ اوپر چڑھائی جاتی۔۔۔پہن پہن کر ہی ان کپڑوں کی درگت بنا دیتے تو تھک ہار کر انہیں کے اوپر چت لیٹ جاتے۔۔۔نانی پیاری کی دہائیاں سارا دن فضا میں گونجتی رہتیں۔۔۔آج بھی وہ صبح سے خود بھی چھت پر کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔۔۔ساتھ اون سلائیوں والی ٹوکری رکھ چھوڑی تھی۔۔۔دستانے، مفلر اور ٹوپے بننے کا کام شروع ہو چکا تھا۔۔۔لیکن ابھی ان کے لیے ضروری تھا کہ ان کپڑوں کو ان چاروں کے عتاب سے بچا کر رکھیں۔۔۔کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پہلے شہریار صاحب ہاتھ میں موبائل اور ایک رجسٹر لیے چھت پر چڑھے۔۔۔دریوں پہ پھیلے کپڑے دیکھ کے آنکھیں چمک اٹھیں۔۔۔

"ارے اوووووو جنگجوؤ۔۔۔" فورا منڈیر سے نیچے دیکھتے اونچی آواز لگائی۔۔۔" مالم غنیمتم اوپر پھیلیم۔۔۔جلدم جلدم تشریفم لے آوم۔۔۔نانی پیارم بھی اوپر چوکسم بیٹھم۔۔۔!"

(مال غنیمت اوپر پھیلا ہوا ہے۔۔۔جلدی جلدی تشریف لے آؤ۔۔۔نانی پیاری بھی اوپر چوکس بیٹھی ہوئیں۔۔۔)

یہ وہ سگنل تھا جو خاص حالات میں خاص انداز میں پیغام جاری کرنے کے لیے دیا جاتا تھا۔۔۔سگنل کی لہریں پہنچنے کی دیر تھی چھت کی طرف چڑھتی سیڑھیوں پر بھونچال آیا تھا۔۔۔نانی پیاری ہکا بکا اس افتاد کو دیکھتی فورا الرٹ ہوئی تھیں۔۔۔نیچے جھک کر چپل اٹھا کے ہاتھ میں تھامی اور شہریار کو دکھاتے ہوئے بولیں۔۔۔

"اوئے پھٹکنجر ۔۔۔ مجھے سب پتا ہے کیا بولا ہے تُو نے ۔۔۔" یہ گالی نانی پیاری کی ذاتی ایجاد تھی جس کا استعمال وہ ان چاروں پہ انتہائی غصے کی حالت میں کیا کرتی تھیں ۔۔۔ لیکن ان چاروں کی بلا سے ۔۔۔ اس گالی کو وہ کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے ۔۔۔

شہریار چہرہ نیم جھکائے کمینی مسکراہٹ لیے نانی کی اور بڑھا ۔۔۔ اس کے پیچھے وہ تینوں بھی تھے ۔۔۔ سبھی کی آنکھیں کپڑوں کے ڈھیر پر تھیں ۔۔۔ ایک سیزن بعد نکلنے والے کپڑے ان کے لیے بہت بڑی تفریح ہوا کرتے تھے ۔۔۔

"نانی قسم لے لیں جو تنگ بھی کیا تو ۔۔۔ بس کپڑے اچھے سے پھیلانے آئے ہیں ہم ۔۔۔!"

"ہم مدد کریں گے نانی ۔۔۔ صبح سے ایک ہی سائیڈ کو دھوپ لگ رہی اب سائیڈ بدل دیتے ہیں ۔۔۔!" یاور نے اپنے کینوس اتار کر پرے اچھالے اور دری پر چڑھا ۔۔۔

"یہ سونگھ ذرا داور ۔۔۔ میرے پیروں سے بو تو نہی آ رہی نا ۔۔۔!" اس نے کپڑوں کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھے یاور کے ناک کے آگے اپنا پاؤں کیا تو وہ ابکائی روکتا اس کی ٹانگ کھینچ گیا ۔۔۔ نتیجتاً وہ دھڑام سے گرا تھا اور یہ "بس شروع ہو جاؤ بھائیو" کا ایک مبہم اشارہ تھا اور بھائی لوگ جیسے بھوسے میں سے سوئی ڈھونڈنے میں جت گئے تھے ۔۔۔ نانی پیاری کی ہاہاکار اور مسلسل زلیلو کمینو کی پکار انہیں مزید جوشیلا کر رہی تھی ۔۔۔ ایک ایک سویٹر جیکٹ پہنا اور اتارا جا رہا تھا ۔۔۔ داور نے موزے اٹھا کے کانوں پہ پہنے اور بکرے کی طرح کان لٹکا کے نانی پیاری کے قریب آ کے منہ کھول کر بولا ۔۔۔

"بے ے ے ے ے ے ۔۔۔!"

نانی پیاری نے کھینچ کے چپیڑ ماری اور پرے دھکیلا ۔۔۔

شہریار نے ایک جرسی پہنی اور اس کے گریبان میں منہ ڈال کے سونگھا تو کچھ یاد آنے پر اس نے فوراً اسے اتارا اور یاور کے منہ پر ماری ۔۔۔

"یہ والی پچھلے سیزن تُو نے ہنڈا ہنڈا (برت کے) کے بنا دھوئے ٹرنک مین گھسا دی تھی ۔۔۔ غلیظ پلید آدمی ۔۔۔!"

" اچھا۔۔۔واقعی۔۔۔" یاور نے جرسی کو پُر شوق انداز میں ساتھ لگایا۔۔۔" مجھے ہی دے دو پھر۔۔۔!"

" لے مرلو سارے ہی کپڑے لے لو میرے۔۔۔ننگا پھر لوں گا۔۔۔!" شہریار جارحانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا تو راستے میں اکڑوں بیٹھے زارون نے ایک سویٹر اچک کے شہریار کے سر پہ منڈھا۔۔۔

" یہ لے یہ پہن لے شہری۔۔۔روتا کیوں ہے۔۔۔!"

شہری کا سر اور گردن سویٹر کے شکنجے میں دیکھ زارون نے کمال بھولپن سے ایک اور اٹھایا اور اسے بھی ہار کی طرح پہناتے ہوئے بولا۔۔۔

" یہ بھی لو۔۔۔آج تمہیں سویٹروں سے بھر دوں گا شہزادے۔۔۔لو یہ ایک اور۔۔۔!"

شہریار کو سنبھلنے کا موقع دیے بنا زارون اپنا کمال دکھا رہا تھا۔۔۔ داور، یاور کے کان میں پھسپھسایا۔۔۔

" یہ اپنے زارون بابا آج کل تیز دھار نہیں ہوئے ہوئے۔۔۔ایسا پھرتے ہیں کہ پھڑکنے کی بھی نوبت نہیں آتی۔۔۔!"

"صحبت جانی صحبت۔۔۔بقول نانی نُحتی صحبت۔۔۔!"

" ہاں تیرے ساتھ زیادہ جڑا رہتا ہے۔۔۔!"

" نہیں جس کو ورمالا پہنا رہا ہے نا اسی کے ساتھ چپاں رہتا ہے۔۔۔یہ اپنے شہری بھیا کا رنگ ہے جو دکھائی دے رہا۔۔۔!"

" چل پھر حصہ ڈالیں۔۔۔!"

" بسم اللہ کراں۔۔۔!"

اور اس کے بعد وہاں طبل جنگ بج گیا تھا۔۔۔نانی پیاری سر نیہوڑے بیٹھی تھیں۔۔۔اور وہ چاروں ایک دوسرے کو جیکٹوں اور سویٹروں میں مدولتے غدر مچا رہے تھے۔۔۔ستم یہ ہوا تھا کہ اس لپیٹ میں نانی کا آدھا بنائی ہوا سویٹر بھی آ گیا تھا۔۔۔جسے داور نے زارون کے گرد لپیٹا تو اس کی

سلائیاں ادھڑتی چلی گئیں تھیں۔۔۔اور ہر معرکے کے اختتامی مراحل کی طرح اس بار بھی زارون بیچوں بیچ پڑا تھا اور اس کی چھاتی پہ شہریار چڑھا تھا۔۔۔پیچھے داور اور یاور کپڑوں پہ اوندھے لیٹے جیسے تیراکی کر رہے تھے۔۔۔نانی پیاری بے بسی سے سارا منظر دیکھ رہی تھیں اور اس گھڑی کو کوس رہی تھیں جب انہوں نے یہ کھڑاک چھت پہ پھیلایا تھا۔۔۔وہ ہار کر فضلو کو پکارنے لگیں اور فضلو کی پکار نے ان چاروں کو ایک پل کو تھمنے پہ مجبور کیا تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر یہ طے کر سکیں کہ "فجلو" اوپر آئے تو اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔۔۔زارون بھی شہریار کے نیچے دبا ہوا پھسپھسایا۔۔۔

"فجلو کو ان دریوں میں لپیٹ کر ماریں گے۔۔۔!" اس کی آواز بھی ٹھیک سے نہی نکل رہی تھی لیکن فضلو کا انجام طے کرنے میں مدد دی تھی۔۔۔

"ہاں اس کو نکیل ڈالنی بہت ضروری ہے۔۔۔فی الحال تجھے تکبیر پھیروں گا۔۔۔!" شہریار نے پُرسوچ انداز میں پہلا جملہ کہا اور دوسرا کہہ کر دوبارہ زارون کی گردن دبوچ لی تھی۔۔۔نانی پیاری کو ان کی حرکتوں پہ بے بسی بھری ہنسی بھی آرہی تھی جسے چھپانے کو چادر کا پلو منہ پہ رکھ لیا تھا اور آنکھوں کے تاثرات ہنوز خشونت زدہ تھے۔۔۔ان چاروں کو ان کے حال پہ چھوڑتی بکتی جھکتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔۔۔!

"آلے مہر۔۔۔آج تو تم چاروں کو پٹھانا ٹنگوایا تو میرا نام بھی پیاری نہیں۔۔۔پھٹکنجر نا ہوں تو۔۔۔!"

"نانی پیارم نیچے جارم اور آج ہٹلرم بری طرح پیٹم۔۔۔!"

(نانی پیاری نیچے جا رہی ہیں اور آج ہٹلر بری طرح پیٹے گا)

داور نے ہانک لگا کے باقی تینوں کو خبردار کیا تھا لیکن یہاں پرواہ کسے تھی۔۔۔کسی کو اثر نا ہوتا دیکھ کر داور بھی یاور کی بلا وجہ گردن دبوچ کر کپڑوں میں منہ دے گیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ اوٹی سے باہر آیا تو نرس فاطمہ نے اسے اطلاع دی۔۔۔

"سر کوئی مس زمن آئی ہیں۔۔۔کافی دیر سے ویٹ کر رہی ہیں۔۔۔کہہ رہی ہیں آپ کے پاس ان کی بہن کا کیس ہے۔۔۔!"

مہریار نے بھنویں اچکاتے ہوئے گاؤن اور گلوز نرس کے حوالے کیے اور سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔۔۔کاریڈور سے گزرتے ہوئے اس کے چہرے پہ نامحسوس سی مسکراہٹ تھی۔۔۔زمن کو محض انتظار کروانے کی خاطر وہ بلاوجہ کاؤنٹر پہ ٹھہرا تھا۔۔۔وہاں کچھ ڈیٹیلز چیک کرنے کے بعد اپنے کمرے کا رخ کیا۔۔۔

زمن انتظار سے اکتا کر اب کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔۔۔وہ بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی تھی۔۔۔اسے واپس مال پہنچنا تھا اور یہاں بس وہ ایک ضروری کام سے آئی تھی۔۔۔دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مہریار اندر داخل ہوا۔۔۔وہ اپنی جگہ پہ ساکت ہوئی اور بے اختیار اسے دیکھے گئی۔۔۔بلیک ڈریس پینٹ پہ ایش گرے شرٹ پہن رکھی تھی جس کے کف فولڈ کیے ہوئے تھے۔۔۔بال کچھ بے ترتیبی سے ماتھے پہ گرے تھے۔۔۔اونچی ناک پہ نظر کی عینک لگائے وہ بلا کا سنجیدہ لگ رہا تھا۔۔۔"ہینڈسم" بھی لگ رہا تھا لیکن اس لفظ کی تردید اس نے دل میں فوراً اسے پیشتر کر دی تھی۔۔۔وہ اس کے قریب سے گزرتا اپنے ٹیبل کی جانب بڑھا تو اس کے چھ فٹ سے نکلتے قد کو زمن نے گردن اونچی کیے نخوت سے دیکھا۔۔۔

"آیا بڑا۔۔۔ایسے جیسے درخت کو منہ فٹ کیا ہو۔۔۔بھلا اتنا لمبا بندہ بھی اچھا لگتا ہے کیا۔۔۔!"

اس نے ایک بار پھر دل میں ہی اسے دس میں سے زیرو نمبر دیا تھا۔۔۔وہ اب اپنی کرسی پہ بیٹھ رہا تھا اور عینک کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

"مجھ میں کیڑے نکال لیے ہوں تو سلام قبول کریں۔۔۔گو کہ اصولاً چھوٹوں کو بڑوں سے سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے لیکن خیر جانے دیجیے۔۔۔آپ آئیے بیٹھیے۔۔۔!"

اسے بھگو کے مارتے ہوئے حسب معمول اس نے زمن کو حیران کیا تھا۔۔۔وہ نا جانے کیسے اس کے خیالات پڑھ لیتا تھا۔۔۔

"ہمم نیورو سرجن ہے نا اسی لیے اسے پتا چل جاتا ہے۔۔۔ورنہ اتنی بھی کیا الہامی آتما۔۔۔!"

وہ آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھتی اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سوچ رہی تھی جب اچانک سے وہ ذرا سا ہنسا۔۔۔زمن کو جیسے سپرنگ ہی لگ گئے۔۔۔اسے پکا یقین ہو گیا کہ وہ دماغ پڑھ لیتا ہے۔۔۔وہ خائف ہوتی اسے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔۔۔

"کیا۔۔۔" مہریار استفہامیہ اسے دیکھتے ہوئے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتا دوبارہ ہنسا تو اس کے ایک قطار خوبصورت دانت پہلی بار زمن نے دیکھے۔۔۔اس نے ایک فائل اٹھا کے کھولی اور اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔۔۔زمن کو ہتک کا احساس ہوا۔۔۔وہ اس سے پوچھ بھی تو سکتا تھا کہ کیسے آنا ہوا۔۔۔ خیریت تو ہے۔۔۔!

"کیسے آنا ہوا۔۔۔خیریت تو تھی۔۔۔!" مہریار نے فائل میں منہمک رہتے ہوئے اس سے پوچھا تو زمن جو آرام دہ حالت میں کرسی پہ بیٹھی تھی تھوڑا سا آگے کو ہوگئی جیسے ابھی اٹھ کے بھاگ جائے گی۔۔۔ مطلب اتنا بھی کوئی کیسے کسی کے اندر چلتی کھد بد جان سکتا ہے۔۔۔اس نے کچھ بھی مزید سوچنے سے خود کو روکا اور بیگ میں ہاتھ ڈال کے ایک اینولیپ نکالا۔۔۔

"یہ کیا ہے۔۔۔!" اپنے سامنے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"پیپیسے۔۔۔" وہ معمولی سا ہکلائی۔۔۔اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں۔۔۔

"کیا کروں ان کا۔۔۔؟" ہنوز وہی بے نیازی تھی۔۔۔کاغذ پہ قلم چلاتے مصروف لہجے میں پوچھا تو زمن چڑ گئی۔

"آپ لیں تو سہی۔۔۔پھر بتا بھی دیتی ہوں۔۔۔!"

"کیوں لوں۔۔۔" قلم روکتے اسے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔۔۔"کس لیے ہیں۔۔۔؟"

"یہ۔۔۔وہ۔۔۔یہ اصل میں وہ۔۔۔!" اسے بات شروع کرنے میں دشواری ہوئی۔۔۔

"یہ یا وہ۔۔۔پہلے اس کو فائنل کرو۔۔۔پھر اصل بات پر آؤ!"

"آپ مجھے کنفیوز کرنا بند کریں۔۔۔سمجھے۔۔۔" اس کا لہجہ کچھ تیز ہوا۔۔۔"یہ کچھ رقم ہے۔۔۔زوہا کے علاج کے لیے جمع کی تھی امی نے اور میں نے۔۔۔رباب آنٹی کہہ رہی تھیں کہ آپریشن کے بعد رقم قسطوں میں آپ کو چکا لیں گے۔۔۔لیکن مجھے یہ مناسب نہیں لگا۔۔۔کیوں بلاوجہ اتنا بھارا اپنے سروں پہ اٹھا کے رکھنا۔۔۔جتنی رقم ہم ارینج کر سکتے ہیں وہ تو کم از کم ادا کر ہی سکتے ہیں۔۔۔تو یہ۔۔۔بس یہ وہی ہیں۔۔۔آپ۔۔۔لے لیں۔۔۔!"

اس نے ایک سانس میں بات مکمل کر کے طویل سانس بھرا تھا۔۔۔لیکن اپنی اتنی لمبی دل پذیر تقریر کے جواب میں بھی جب مقابل کو زبردست انہماک سے لکھتا پایا تو یوں لگا جیسے دیوار سے گفتگو کر رہی تھی۔۔۔اس کا اعتماد ڈول رہا تھا، ہاتھوں میں خفیف سی لرزش پیدا ہو رہی تھی جو مہر یار کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔۔۔

"کہاں جاب شروع کی ہے۔۔۔؟"

اچانک پوچھے جانے والے سوال پہ زمن بری طرح سٹپٹائی۔۔۔

"کیا مطلب۔۔۔وہی سکول جاب اور کہاں۔۔۔!" وہ بے ربط ہوئی۔۔۔

"کس مال میں۔۔۔؟" فائل بند کرتے ہوئے اس نے پین کو ہولڈر میں لگایا۔۔۔زمن کو لگا جھوٹ بولنا بیکار ہوگا اس لیے سچ سچ کہہ دیا۔۔۔

"آنٹی رباب نے یہ نئی جاب ارینج کی ہے۔۔۔لیکن آپ کو کیا پرابلم ہے۔۔۔آپ بھلا کیوں۔۔۔"

"کنگز مال، سیکنڈ فلور اوپر چڑھتے ہی لیفٹ سائیڈ پہ پہلی شاپ۔۔۔!"

اس کی شاپ کی مکمل لوکیشن بتا کے وہ اب سکون سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔۔۔زمن کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی۔۔۔بے حد گہری آنکھیں تھیں اس کی۔۔۔خوبصورت کا لفظ اس نے رد کیا تھا۔۔۔

"آپ کیا میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔۔۔؟" زمن حیرت زدہ تھی۔۔۔

"ضرورت نہیں۔۔۔!" وہاں ہنوز وہی بے نیازی کا عالم تھا۔۔۔

"ضررت نہیں تو یہ سب کیا ہے۔۔۔میری جاب تبدیل کرنے کا کس نے بتایا آپ کو۔۔۔؟ اچھاااااا۔۔۔" اس نے اچھا کو لمبا کیا۔۔۔"رباب آنٹی سے پوچھا ہوگا۔۔۔ہے نا۔۔۔خاصی آکورڈ حرکت ہے ویسے یہ۔۔۔آپ کو سوٹ نہیں۔۔۔"

"متجس ہونا میری فطرت نہیں۔۔۔اور میں فالتو باتوں کے جواب دینا پسند نہیں کرتا۔۔۔اس لیے اب یہ پیسے اٹھائیں اور اپنی شاپ آنر کو واپس کریں جن سے آپ نے بطور قرض لیے ہیں۔۔۔!"

زمن کے صحیح معنوں میں توتے اڑے تھے۔۔۔اس نے یہ پیسے فائزہ خاکوانی سے ہی قرض لیے

تھے۔۔۔وہ زوہا کے آپریشن کا بار کسی پہ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔۔۔یکا یک اسے ڈاکٹر مہریار سے عجیب طرح کا خوف محسوس ہوا جو ابھی بھی اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔زمن کو اس کی نگاہیں اپنے اندر اترتی محسوس ہوئیں۔۔۔وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔۔۔

"میں چلتی ہوں۔۔۔مجھے شاپ پہ پہنچنا ہے۔۔۔!"

وہ فوراً دروازے کی جانب بڑھی تھی جب پیچھے سے مہریار نے پکارا۔۔۔وہ تھمی لیکن پلٹی نہیں۔

"یہ لفافہ لیتی جاؤ اور اسے لوٹا دو۔۔۔آپریشن کے پیسے میں ہر قیمت پہ وصولوں گا فکر نا کرو۔۔۔فی الحال اپنے چھوٹے سے دماغ کو الجھنوں سے دور رکھو۔۔۔اور ہاں۔۔۔رکشہ ٹیکسی کے انتظار میں مال کے باہر نا کھڑی رہا کرو۔۔۔ایک آٹو روزانہ تمہیں پک بھی کر لیا کرے گا اور ڈراپ بھی کرے گا۔۔۔اب یہ لفافہ اٹھاؤ اور جاؤ۔۔۔بزی ہوں۔۔۔کافی وقت لے لیا تم نے میرا۔۔۔!"

زمن کے پتھر بنے پیر جیسے زمین نے جکڑ رکھے تھے۔۔۔پلٹنے کی ہمت ہی نا رہی تھی۔۔۔نا آپ جناب کا تکلف اور نا مروت بھرا لہجہ۔۔۔یہ تو ایسے حکم صادر کر رہا تھا جیسے۔۔۔جیسے۔۔۔اس کے آگے سوچ کے ہی زمن کے نتھنے پھولنے لگے تھے۔۔۔وہ بمشکل ہمت مجتمع کرتی پلٹی۔۔۔نگاہوں میں چنگاریاں لیے وہ میز تک واپس آئی اور جھپٹنے والے انداز میں لفافہ اٹھایا۔۔۔دماغ پہ اس قدر غصہ سوار تھا کہ دروازے تک پہنچنے میں کرسی سے بھی ٹکرائی اور دروازہ جو اندر کی جانب کھینچنا تھا اسے باہر کی طرف دھکیلنے میں کچھ پل ہلکان ہوئی۔۔۔

"پل کرو۔۔۔یعنی اپنی طرف کھینچو۔۔۔!" سکون سے ریوالونگ چیئر کی ہتھی پہ کہنی ٹکائے، ہاتھ کی مٹھی بنا کے لبوں پہ رکھے بیٹھے مہریار نے ایک اور ٹھنڈی چوٹ کی تھی۔۔۔

"آہہہہہ۔۔۔" حلق سے غراتی آواز نکالتی زمن نے بلآخر دروازے کو کھینچا اور ایک خونخوار نظر اس پہ ڈالتی بولی۔۔۔

"مجھے مطلب پتا ہے۔۔۔بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔سمجھے آپ۔۔۔!"

"آں ہاں۔۔۔پل یعنی باہر کو دھکا لگانا۔۔۔؟" وہ بھنویں اچکاتا سادہ لہجے میں پوچھ رہا تھا یا بتا رہا

تھا۔۔۔زمن خود پہ ضبط کرتی آفس سے باہر نکل گئی۔۔۔مہریار نے کب سے دبائی مسکراہٹ کو راستہ دیا۔۔۔

"پاگل۔۔۔!" کہہ کر اپنے دائیں جانب کھلے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ بھرپور کروفر کے ساتھ اپنی کالی پجارو سے اترا تھا۔۔۔خوبروئی میں وہ بلاشبہ بے مثال تھا۔۔۔لیکن نرم اوصاف کی اس میں ہمیشہ سے کمی رہی تھی۔۔۔اپنے کوٹ کے کالر کو دونوں ہاتھوں سے جھٹکتا وہ سامنے موجود سکول کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر وہ ناک کی سیدھ میں چلتا اندر داخل ہوا تو گیٹ پہ موجود گارڈ کو جرات نہیں تھی کہ اسے روک کے بنا اجازت اندر جانے پہ بازپرس کرتا۔۔۔وہ سیدھا چلتا کاریڈور کے اختتام پہ موجود ایک آفس میں داخل ہوا جہاں پہلے سے اس کا بندہ موجود تھا۔۔۔ایک خاتون سراسیمہ سی اپنی ٹیبل کے کناروں کو مضبوطی سے تھامے کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔۔۔وہ گریس فل سی عورت اس سکول کی پرنسپل تھی۔۔۔اس کی خود کی حالت کسی یرغمال بنائے جانے والے انسان جیسی تھی۔۔۔بار بار تھوک نگل کر حلق تر کرتی وہ مسلسل بڑی سی گلاس ونڈو سے باہر جھانک رہی تھی جہاں سے سکول کا کافی ایریا کور ہوتا تھا۔۔۔اس کے سکول کی ریپوٹیشن داؤ پر لگی تھی۔۔۔ایک ہتھیار تھامے شخص اس کے آفس میں موجود تھا جب کہ دو باہر گیٹ پر تھے۔۔۔شہزور نے پیر سے کرسی کو تھوڑا سا کھینچا اور جیبوں سے ہاتھ نکالتا اس پر براجمان ہوا۔۔۔اس دوران ایک پل کو بھی اس نے پرنسپل کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں جس کے باعث وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔۔۔

"نصر۔۔۔کیا بتایا ہے انہوں نے۔۔۔؟"

پاس کھڑے اپنے اسی بندے سے اس نے پوچھا تھا جو اس کے آنے سے پہلے کا اس آفس میں موجود تھا۔۔۔

"سر یہ رہیں مکمل ڈیٹیلز۔۔۔!"

اس آدمی نے ایک پرچا شہزور کے سامنے میز پر رکھا تھا۔۔۔وہ فوراً تھوڑا آگے ہوا اور بے چینی

سے اسے پڑھنے لگا۔۔۔اس کا چہرہ اندرونی کیفیت کے باعث سرخ ہوا تو پرنسپل نے گھبرا کر فوراً بات کا آغاز کیا۔۔۔

"دیکھیں سر۔۔۔جس نام کی لڑکی کو آپ ڈھونڈ رہے ہیں وہ یہاں کبھی بھی جاب نہیں کرتی رہی۔۔۔لیکن ہمارے پاس اس نام سے ملتی جلتی یہ ایک لڑکی جاب کرتی تھی۔۔۔اسے ایک ویک ہوا ہے ریزائین کیے۔۔۔اور ایڈریس ہمارے پاس یہی تھا۔۔۔ہمیں بھی اب معلوم ہوا ہے کہ اس نے اپنا درست پتا نہیں لکھوا رکھا تھا۔۔۔خدا جانے وجہ کا تھی لیکن یہ بچی بہت شریف اور سلجھی ہوئی تھی۔۔۔اگر آپ کو اس سے کسی قسم کا ایشو ہے تو کا ہینڈلی اتنا خیال رکھیے گا کہ کسی عزت دار لڑکی کی عزت۔۔۔"

"ششش۔۔۔"شہزور نے آگے کو جھک کر شتکارا۔۔۔"شٹ اپ۔۔۔!"

پرنسپل یکدم خفت زدہ ہو کر بالکل چپ سادھ گئی۔۔۔شہزور راؤ کرسی جھٹکتا کھڑا ہوا تو آفس کے ماحول میں ناپسندیدہ آواز پھیل کے معدوم ہوئی۔۔۔پرنسپل نے ناگواری سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔۔۔شہزور مڑا اور اپنے ساتھ آئے شخص کو وہ پرچا پکڑاتے ہوئے کہا۔۔۔

"یہ بھی کافی ہے۔۔۔ایڈریس میں خود معلوم کرلوں گا۔۔۔واپسی کرو۔۔۔!"

اور وہ شخص سرخم دیتا آگے بڑھا اور شہزور کے لیے آفس کا دروازہ کھولا۔۔۔باہر نکلتے ہی ایک خفیف سی مسکراہٹ چوہدری شہزور راؤ کے چہرے پہ نمودار ہوئی۔۔۔

"تو اس نام سے تم اس شہر میں موجود ہو۔۔۔آں ہاں۔۔۔اب جلد ملاقات ہوگی پیاری" زمن!"

کوٹ کا کالر درست کرتا ہاتھوں کو پشت پہ باندھتا وہ گردن اکڑائے سکول کی عمارت سے باہر نکلتا چلا گیا۔۔۔!

❀ ❀

قسط نمبر 4

کندنی دھوپ سونا اگلنے لگی، برف زاروں میں چاندی پگھلنے لگی
خالی شاخیں ہرے پات سے بھر گئیں، غنچے کھلنے لگے، رت بدلنے لگی
نرم پٹ سن کے ریشے، بسنتی ہوا، دور تک پھیلتی ماںجھیوں کی صدا
ندی ہر گھاٹ پہ رخ بدلنے لگی، ریشمی دھوپ میں ناؤ چلنے لگی
پاؤں لمبی مسافت سے بوجھل ہوئے سارے دیہات آنکھوں سے اوجھل ہوئے
گم ہوئے درد کی منزلوں کے نشاں، عشق چلتا رہا، شام ڈھلنے لگی
خانقاہوں میں گوشہ نشیں ہو گئے، ساتوں درویش تھک ہار کے سو گئے
آٹھواں قصہ گو اٹھ کے چلنے لگا، چاند تکتا رہا، آگ جلنے لگی
ہر اماوس کے دن، شام کا جھٹپٹا، سر پہ باندھے ہوئے شوخ چنچل گھٹا
ہر جھروکے پہ آ کر گھڑی بھر رکا، ہر دریچے پہ بارش مچلنے لگی
نیم پختہ روش پہ چمکنے لگے تیرے نادیدہ قدموں کے روشن نشاں
یک بیک گل شبو کی ہری بیل پر، تیری آواز خوشبو میں ڈھلنے لگی

"نجمہ ثاقب"

نیم اندھیرے کمرے میں بند کھڑکی کے پار چمکتے چاند کی روشنی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔۔۔
وہ راکنگ چیئر پہ ہلکے ہلکے جھولتا سبک ہوا میں جھومتے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔۔کمرے میں بے حد

دھیمی آواز میں سر بکھر رہے تھے اور رائٹنگ چیئر کی معمولی سی چرچراہٹ پھیلی تھی۔۔۔اس کی کشادہ پیشانی پہ لکیریں بن اور مٹ رہی تھیں۔۔۔سوچوں اور یادوں کے گرد باد کے جھکڑ اسے اپنے ساتھ لے جانے کو پر تول رہے تھے لیکن وہ سر جھٹکتا اٹھا اور کھڑکی کھول دی۔۔۔

ہوا کے میٹھے جھونکے یکلخت سارے میں پھیل گئے۔۔۔موسیقی کے دھیمے سُروں نے کھلی فضا میں بکھرنے کی راہ ڈھونڈی۔۔۔ایک لمبی سانس کھینچ کر اس نے دونوں بازو سینے پہ لپیٹے اور ابا کی باتوں کو یاد کرنے لگا۔۔۔

ان کا شادی کے لیے درخواست کرنا اسے بے چین کر گیا تھا لیکن پہلی بار وہ ان سے کچھ کہہ نہیں سکا تھا ورنہ وہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جایا کرتا تھا۔۔۔وجہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھی شائد اب وہ ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔۔۔وہ تکلیف دہ یادوں کو دفنا دینا چاہتا تھا جو اس کی زندگی کو کالی گھٹا کی طرح آج بھی گھیرے ہوئے تھیں۔۔۔رات کی تاریکی میں فضا میں کوئل کی کوک نے ارتعاش پیدا کیا تو وہ نگاہوں سے اسے تلاشنے لگا۔۔۔وہ جانتا تھا یہ کوئل یہیں کہیں کسی ٹنڈ منڈ شاخ پہ ٹکی رہتی ہے۔۔۔رات کو بلا جواز اڑتی دکھائی دیتی تھی۔۔۔نا کوئی ساتھی نا کوئی ہمراہی۔۔۔اکیلی تھی وہ بھی۔۔۔جیسے وہ ہو گیا تھا۔۔۔وہ کوئل اس کے جیسی تھی یا وہ اس جیسا تھا۔۔۔اس نے چہرہ اونچا کیے چاند کو تکا تو گول روشنی کے تھال کے آگے سے وہی کوئل تیزی سے اڑتی ہوئی نکل گئی۔۔۔بے ساختہ اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا تھا۔۔۔

"تم مسکراتے ہو نا تو جیسے دل ہلکا پھلکا سا ہو جاتا ہے۔۔۔ذہن ہر قسم کی پریشانی کو بھولنے لگتا ہے۔۔۔!"

ایک فقرے کی بازگشت ہوا کے ساتھ اس کی دماغ کی پرتیں کھنگالتی گزر گئی۔۔۔اس نے آنکھوں کو زور سے میچ کے دوبارہ کھولا اور خود کو ریلیکس کرنے کی سعی کرنے لگا۔۔۔دانستہ آج کی زمن سے ہونے والی ملاقات کو یاد کیا۔۔۔اس کا ہاسپٹل آ کر پیسے دینا بیک وقت اسے کوفت اور لطف میں مبتلا کر گیا تھا۔۔۔مطلب اس قدر خودداری تھی اس میں کہ وہ قرض لے کر اس کی مقروض ہونا چاہتی تھی۔۔۔اس وقت بھی بے اختیار وہ کھل کے مسکرا دیا۔۔۔اسے یہ ماننے میں تامل نہیں تھا کہ زمن کو دیکھ کر

عجیب سا کیف محسوس ہوتا تھا جیسے من پسند شخص کا پاس ہونا ہی کافی ہوتا ہے

بھلے بیچ میں خاموشی حائل رہے۔۔۔ایسا ہی اسے زمن کو دیکھنے کے بعد محسوس ہوتا تھا۔۔۔وہ کچھ سوچ کے واپس مڑا اور اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز سے اس نے زمن کا پرانا سیل فون نکالا۔۔۔ واپس کھڑکی پہ آ کر اس نے گیلری کھولی اور اس کی تصویریں دیکھنے لگا۔۔۔اپنے مزاج سے یکسر الٹ وہ ناقابل فہم حرکت کر رہا تھا۔۔۔زمن کی اکیلی تصویر کو زوم کیا اور اتنا زوم کیا کہ اس کے لونگ کے سیاہ موتی کی چمک اسے صاف دکھائی دی۔۔۔ایک بار پھر زمن کے نقوش نے اسے جکڑا تھا۔۔۔وہ اپنے لب بھینچ گیا۔۔۔"پتا نہیں جانے والے چھوڑ کر جاتے وقت یادوں کا بستر باندھ کر ساتھ کیوں نہیں لے جاتے......"

ایک طویل مدت تھی جو بیچ میں حائل تھی۔۔۔کون کہاں کیسے غلط تھا کبھی احتساب ہی نا ہو سکا تھا۔۔۔اگر وہ منصف ہوتا تو کب کا سب کو کیفر کردار تک پہنچا چکا ہوتا لیکن ذہن کے تانے بانے الجھے ہوئے تھے۔۔۔گرہیں کھلتیں تو کڑی سے کڑی ملتی۔۔۔

"آپ کو آنا ہوگا۔۔۔وقت آ گیا ہے۔۔۔احتساب کا، حساب کا۔۔۔!"

وہ پورے چاند کو دیکھتا ہوا کسی سے غائبانہ مخاطب ہوا تھا۔۔۔کوئل دوبارہ تیزی سے چاند کے آگے سے اڑتی ہوئی

گزری۔۔۔اس نے کھڑکی بند کر دی اور زمن کی تصویر کو بغور دیکھتا اپنے بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔۔۔!

☆......☆......☆

یاسر کا سیل فون بج رہا تھا اور وہ نیند میں دھت تھا۔۔۔مسلسل بجنے پر اس نے جھنجھلا کر اٹھایا۔

"نیند برباد کر دی ابھی اسائنمنٹ بنا کے سویا تھا۔۔۔!"

ایگزامز سر پہ تھے اور پڑھائی کے لیے مہریار کا ڈنڈا پورے زوروں سے چل رہا تھا۔۔۔سیل فون چیک کیا۔۔۔شہریار کی کال تھی اس نے کال پیک کی۔۔۔

"جی بھیا۔۔۔" وہ بولا۔۔۔

"اوئے گھونچو۔۔۔لان میں آؤ" اس نے بس اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔۔۔

کیا مصیبت ہے۔۔۔داور مر گیا ہے جو مجھے اٹھایا ہے" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور پاس ہی ڈنگروں کی طرح سوئے پڑے داور کو ہلکا سا ٹھڈا مارا۔۔۔چپل پہنتا وہ لان میں آیا تو شہریار دیوار پر چڑھا بیٹھا تھا۔۔۔

یاور کو سب سمجھ آ گئی کہ یہ اندر آنے کے ڈرامے تھے۔۔۔

"یار ہاتھ دے۔۔۔منہ کیا دیکھ رہے ہو" شہریار نے کہا

۔تو یاور نے آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ کندھا لگایا جس کا سہارا لے کر شہریار اندر کودا تھا۔۔۔

"ہمارے گھر میں دروازہ بھی ہے!" یاور نے یاد دہانی کروائی۔۔۔

"جس میں قدم رکھنے کا مطلب یہ تھا مہر لالہ میری بوٹیاں کر دیتے" شہریار کپڑے جھاڑنے لگا۔۔۔

"تو آپکو جانے کی اور چوروں کی طرح آنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔کیا مجھے نہیں پتہ کمبائین سٹڈی کرنے گئے تھے یا مولا جٹ دیکھنے۔۔۔!" یاور نے آنکھیں گھمائیں۔۔۔

"بے حیا۔۔۔بڑے بھائی پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں" شہریار نے گھورا۔۔۔

"تو بڑا بھائی میری مدد نہ لیتا" یاور نے بھی دو بہ دو جواب دیا۔۔۔

شہریار نے اسکی گردن پر گھما کر ہاتھ مارا۔۔۔اور اندر جانے لگا۔۔۔وہ بھی گردن رگڑتا پیچھے تھا۔۔۔

"ویسے ایک بات پوچھوں" وہ شہریار کے پیچھے کچن میں آ گیا جو ادھر ادھر چیزیں پلٹتا کھانے کے لیے کچھ تلاش کر رہا تھا۔۔۔

جلدی پوچھ" پلیٹ میں ٹرائفل نکالتے ہوئے وہ بولا۔۔۔

"زارون کو ڈراپ کر کے کہاں گئے تھے۔۔۔سچ بتانا۔۔۔وہ کہہ رہا تھا کہ کسی عورت کے پیچھے ے ے ے۔۔۔!" یاور کی بات پر شہریار نے اسکی جانب دیکھا۔

"میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا" شہریار نے کہا اور فریز رکھولا۔۔۔

"مہر لالہ کو آپ کی ان لفنگی حرکتوں کا پتا لگ گیا نا تو۔۔۔" وہ دھمکی دینے والے انداز میں بولا لیکن سامنے ہنوز سکون دیکھ کر ٹون بدلی۔۔۔"کیا لگتا ہے آپ کو، عام بات ہے یہ" یاور چڑا۔۔۔

"نہیں اس میں ایسا خاص الخاص تُو ہی بتا دے کیا ہے۔۔۔!" اسنے ٹرائفل کھاتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

"مجھے بھی بتاؤ کہاں گئے تھے۔۔۔ یہ اکیلے اکیلے کب سے مشن پہ نکلنے لگے ہو آپ۔۔۔" یاور نے شانے اچکائے۔۔۔

"تم میرے باپ نہ بنو۔۔۔ سو جا کے۔۔۔ میں نے تم سے اتنے سوال کر لیے نا تو لگ پتہ جائے گا تمھیں" شہریار نے اسکو گھورا۔۔۔

"کرلیں۔۔۔ میں کون سا کانا ہوں" یاور نے بھی لاپرواہی سے کہا۔۔۔

"اچھا تو پھر کب جا رہا ہے میرا بھائی اسلام آباد اسٹڈی ٹور کا بہانا بنا کے۔۔۔!" ایک آئی برو آچکا کر وہ اسکی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔۔۔

جبکہ یاور ہونق رہ گیا۔۔۔

یہ اس نے کہاں سن لی تھی بات۔۔۔؟ یاور کی حیران شکل دیکھ کر شہریار ہنس دیا۔۔۔

"تم اس مغالطے میں مت رہنا کہ مجھے تمہاری طرف سے بے خبری ہے۔۔۔ اور یہ پہلی بار ہے جب داور کے بنا تم کسی ایکٹیویٹی کو سرانجام دینے جا رہے ہو۔۔۔ ابھی پھلجھڑی چھوڑ دی نا اس کے کان کے پاس تو تمہیں بم بنا کے پھوڑ دے گا

وہ۔۔۔!" اسکا شانہ تھپتھپا کر وہ وہاں سے جانے لگا جبکہ یاور نے مٹھیاں بھینچ لیں تھیں۔۔۔ اسی وقت شہریار واپس پلٹا اور بولا۔۔۔

"ویسے وہ کیا ہے نا ایک دن تمہیں شیشہ کیفے میں بھی دیکھا تھا۔۔۔ اور اگر سوچو یہ بات پتا لگ جائے داور کو تو یہ جو چھجا بنا ہوا نا تمہارے بالوں کا اس کا انتم سنسکار لازمی کر دے گا وہ۔۔۔ چل اب نکل شاباش۔۔۔ سو جا جا کے۔۔۔ آیا بڑا مجھے تڑیاں دینے والا۔۔۔!"

وہ چلا گیا تو یاور کڑھتا ہوا سوچنے لگا۔۔۔ یقیناً یہ بات زارون نے نکالی ہو گی۔۔۔ وہی تھا آس پاس جب وہ فون پہ بات کر رہا تھا۔۔۔

"یہ زارون کو تو گلو پلا دینی ہے کسی دن۔۔۔ہمیشہ کے لیے ڈکا لگ جائے اس کے منہ کا۔۔۔!"

بڑبڑاتا ہوا وہ کمرے میں واپس چلا گیا تھا جبکہ سیڑھیوں کے نیچے نیم اندھیرے میں چھپے ٹرائفل کھاتے شہریار نے اس کے اوپر چڑھ جانے کے بعد نانی پیاری کے کمرے کا رخ کیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ اپنے کام سے بے حد مطمئن تھی۔۔۔فائزہ خاکوانی بے حد نفیس خاتون تھیں۔۔۔اس کا خیال رکھتی تھیں۔۔۔اس کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔۔۔بس کیش کاؤنٹر پہ بل کرنا ہوتا تھا اور اکاؤنٹ وغیرہ کی چیکنگ اور اپ ڈیٹس کا خیال رکھنا۔۔۔اس کے علاوہ وہ اپنی مرضی سے ڈسپلے کاؤنٹرز پہ کسٹمرز کو ڈیل کرنے بھی کھڑی ہو جاتی تھی۔۔۔آج بھی وہ حسب معمول لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی تھی جب اس کے موبائل پہ کال آئی۔۔۔اس نے سکرین سے دھیان ہٹائے بنا کال پک کر کے موبائل کان سے لگایا۔۔۔

"ہیلو۔۔۔جی کہیے۔۔۔!"

دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس کے ہوش اڑانے کے لیے اس کا ایک ہی جملہ بہت تھا۔۔۔

"جتنی جلدی ہو سکے اپنا ٹھکانہ بدل لو کیونکہ تمہیں تلاش کرنے والے بہت جلد تم تک پہنچنے والے ہیں۔۔۔تمہارے سکول تک رسائی ہو چکی ان کی۔۔۔بائے۔۔۔!"

کال کٹ چکی تھی اور زمن کا سارا وجود سن پڑ رہا تھا۔۔۔ایک دم سے دم گھٹنا شروع ہوا تھا۔۔۔کمپیوٹر سکرین سے نگاہیں ہٹا کے اس نے فائزہ خاکوانی کو تلاشا اور چھٹی لے کر گھر کو دوڑ لگا دی۔۔۔

دوسری طرف لائبہ نے کال کاٹ کر سیل فون کو گھورا اور اسے اپنی ٹیبل کے دراز میں رکھ کر پراجیکٹ فائل اٹھاتی شہزور دراؤ کے آفس کا رخ کیا۔۔۔!

☆......☆......☆

زمن چھوٹے سے لاؤنج میں ادھر سے ادھر پنڈولم کی طرح جھولتی ہلکان ہو رہی تھی۔۔۔پریشانی اس کے پورے وجود کو لپیٹے ہوئے تھی۔۔۔قریب ہی ہاجرہ صوفے پہ دونوں پیر اوپر کیے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔۔۔ان کی آنکھیں روئی روئی سی متورم تھیں۔۔۔زمن ان کو دیکھ زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔۔۔

" امی۔۔۔میری ہمت ہیں آپ۔۔۔معلوم ہے نا آپ کو۔۔۔؟" وہ رک کے ان کے قریب ہی سینٹرل ٹیبل پہ بیٹھ کے ان کے دونوں ہاتھ تھامتی ہوئی بولی۔۔۔" اگر آپ اس طرح ہمت ہاریں گی یا پریشانی سے بیمار پڑ گئیں تو میرا کیا بنے گا امی۔۔۔ہم کوئی نا کوئی حل نکال لیں گے لیکن ایک دوسرے کی ہمت بن کے۔۔۔!"

" تھک گئ ہوں زمن۔۔۔بھاگ بھاگ کے۔۔۔پیروں کا چکر ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔۔۔کبھی کبھار لگتا ہے میں نے اپنی سکت سے زیادہ جھیل لیا ہے۔۔۔اب سہا نہیں جاتا زمن۔۔۔!" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔۔۔زمن اٹھ کے ان کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گئ۔۔۔سر ان کے کندھے سے لگایا۔۔۔

" اللہ کبھی بھی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور اگر آپ کو لگ رہا ہے کہ آپ کی ہمت جواب دیتی جا رہی ہے تو یقین مانیں امی کوئی ان دیکھا روزن کھلنے والا ہے۔۔۔جہاں سے ہماری اندھیری زندگیوں میں روشنی اترے گی۔۔۔کیونکہ جب مشکلیں حد سے زیادہ ہو جائیں تو یہ آسانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔۔۔!"

" ہوں۔۔۔" وہ مسکرائیں۔۔۔اور ایک ہاتھ سے اس کا سر سہلانے لگیں۔۔۔" وہ لوگ کبھی بھی گھر تک پہنچ سکتے ہیں

زمن۔۔۔اور ایک بار انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا تو میں نہی جانتی آگے کیا ہو۔۔۔!"

" کیا ہو گا امی۔۔۔مار دیں گے۔۔۔مار دیں۔۔۔اب کیا ماریں گے۔۔۔ہم تو عرصہ ہوا ان کے لیے مر چکے۔۔۔اب کون سی موت دینی ہے انہیں ہم تینوں کو۔۔۔!" وہ کندھے سے سر ہٹا کے بے حد مشتعل سی بولی تھی۔۔۔لیکن پھر خود کو پرسکون کرتے ہوئے بولی۔۔۔

" میں رباب آنٹی سے بات کرتی ہوں کوئی گھر دیکھیں۔۔۔جتنی جلدی ہو سکے ہم شفٹ کر لیں۔۔۔زوہا اور آپ چند دن آنٹی رباب کے ہاں رک جائیے گا۔۔۔!"

" بلکل نہی۔۔۔اس کی فیملی لائف ڈسٹرب ہر گز نہی کرنی۔۔۔پہلے ہی سر سے پیر تک اس کے احسانوں تلے دبی ہوں۔۔۔تم مکان کا کہو زوہا کو بھی دیکھ لیں گے۔۔۔نا جانے کب ڈاکٹر ڈیٹ دیں گے اور اس کا آپریشن ہو گا۔۔۔کم از کم ایک طرف سے تو پریشانی ختم ہو۔۔۔!"

"جلدی۔۔۔ٹیسٹوں کی رپورٹیں آچکی ہیں۔۔۔رباب آنٹی بتادیں گی باقی ڈیٹیل۔۔۔!" اسے یکدم یاد آیا کہ پیسے دینے گئی تھی تو آفس سے نکلتے ڈاکٹر مہریار نے ریسپشن سے رپورٹس لینے کا کہا تھا لیکن اس کے دماغ پہ فتور بھرا تھا سو بنا سنے ہی نکل آئی تھی۔۔۔اب ہاجرہ کو بتا کے ڈانٹ بھی کھاتی اور پریشان بھی کرتی۔۔۔

"اچھا میں میم فائزہ سے بھی بات کروں گی۔۔۔وہ بھی رہائش کا مسئلہ حل کر سکتی ہیں۔۔۔کل کرتی ہوں بات۔۔۔!"

"جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔۔۔زوہا کے آپریشن کے دوران کسی قسم کی ہڑبونگ نا مچے بس۔۔۔!"

"نہی ہو گا کچھ۔۔۔فکر نا کریں۔۔۔آپ اٹھیں اب سوئیں جا کے۔۔۔میں بھی جا رہی ہوں بس۔۔۔!"

ہاجرہ سر ہلاتی کمرے میں چلی گئیں۔۔۔زمن نے ایک لمبا سانس خارج کیا اور سر صوفے سے ٹیک لیا۔۔۔دوپہر کو آنے والی فون کال کو سوچنے لگی جس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔۔۔!

☆......☆......☆

چہار باغ حویلی کے پچھلے میدان میں اس وقت جشن کا سماں تھا۔۔۔چوہدری شہزور رراؤ بے حد خوش تھا اور جب وہ خوش ہوتا تھا تو یار بیلی اکھٹے کر کے غل غپاڑہ کیا کرتا تھا۔۔۔پنڈ کے لوگ نالاں ہوتے تھے لیکن اپنی عزت بچانے کو کان بند کر لیتے۔۔۔چوہدری قاسم تو بری بھلی سن لیتے تھے لیکن شہزور بندوق نکالتے دیر نہی لگاتا تھا۔۔۔وہ آج بہت بڑی کامیابی حاصل کر کے آیا تھا۔۔۔سالوں سے جس کی تلاش میں دھرتی ادھیڑنے لگا ہوا تھا اج اس کا پتا لگ بھگ اس کا ہاتھ میں تھا۔۔۔ڈیک کی بے ہنگم آوازیں گاؤں کی خاموش فضا میں بھدا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔۔۔سنہری بیگم اور چوہدری قاسم اس وقت اپنے کمرے میں موجود اس ہنگامے کو روکنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔۔۔سنہری بیگم تسبیح کے دانے رولتی

وقفے وقفے سے ایک پھونک غصے میں چکراتے چوہدری قاسم پہ مارتی جبکہ دوسری آنکھیں بند

کیے چہرہ پچھلے میدان کی جانب اونچا کر کے شہزور پہ غائبانہ مارتی۔۔۔اس کی اس پھوں پھوں سے چوہدری قاسم زچ ہو رہے تھے۔۔۔

”کبھی اللہ واسطے کی نماز تو تو نے پڑھی نہیں سنہری لیکن تسبیح ایسے لے کے بیٹھتی ہے جیسے نا جانے کہاں کی پیرنی ہو۔۔۔ہونہہ۔۔۔!“

”چلووو۔۔۔“ سنہری نے تسبیح روک کے جارحانہ تیوروں سے خاوند کو گھورا۔۔۔” چوہدری جی بیچ میں نا ٹُدر ٹُدر آیا کرو

۔۔۔کتنی باری بولا ہوا ہے کہ عمل خراب ہوتا ہے۔۔۔پر مجال ہے اس حویلی میں میری کوئی سنتا ہو۔۔۔!“

” تیری سنی کے ہی نتیجے بھگت رہا ہوں۔۔۔نا سنی ہوتی تو آج ان حالوں میں نا ہوتا۔۔۔اکو اک پتر ہے اور کہے سے باہر ہے۔۔۔صرف تیری وجہ سے۔۔۔اب بند کر یہ پھونکیں مارنی۔۔۔ہزار بار منع کیا ہے تجھے مت کیا کر یہ عمل شمل۔۔۔تجھے ہوا کبھی اثر۔۔۔!“

” ساری عمر سنہری نے گال دی آپ سب کے لیے لیکن کسی کو قدر نا آئی میری۔۔۔!“ سنہری بیگم پلو منہ پہ ڈالے پھسکنے لگی تو چوہدری قاسم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔۔۔

” اچھا بند کر اب یہ سب۔۔۔سوچ آگے کیا کرنا ہے۔۔۔تیرا پتر ڈھونڈ بیٹھا ہے اسے۔۔۔ایسا پکا پیٹھا ہے کہ مجال ہے جو ہوا بھی لگنے دی ہو اس کے اتے پتے کی۔۔۔ورنہ پتا نا کٹا چکا ہوتا اس کا۔۔۔!“ وہی ازلی تنفر زدہ لہجہ۔۔۔

” چوہدری جی کون سے پتے کو رو رہے ہو۔۔۔اس کے ٹھکانے کو ہی تو رو رہا تھا وہ عرصے سے۔۔۔کبھی کی گواچی ہوئی تھی مل کے نہی دے رہی تھی۔۔۔بات یہ کریں کہ پتر آپ کا اک نمبر دا ڈھیٹ۔۔۔پتا نہیں کس کُھڈ سے ڈھونڈ نکالا ہے اسے۔۔۔!“

” ڈھونڈا ہے تو اسے گمنا ہو گا سنہری۔۔۔ورنہ سب کچھ ہی باہر آجائے گا۔۔۔ایک غلطی نے مجھے آج یہ دن دکھایا ہے۔۔۔!“

"ہاں تو منع کیا تھا میں نے۔۔۔ پر چوہدری جی آپ کا دل بڑا مکھن ہے۔۔۔ پگھل ہی جاتا ہے بس۔۔۔ کبھی دلوں پہ تو کبھی چہروں پہ۔۔۔!"

آخری فقرہ اس انداز میں کہا گیا کہ چوہدری قاسم بیوی کے تاثرات سے اندازہ لگاتے رہے آیا طنز کیا ہے یا تعریف۔۔۔ وہ تھک کے جہازی پلنگ پہ ٹیک لگائے ٹانگیں اونچی کیے نیم دراز ہوئے۔۔۔

"لگواتا ہوں پتا۔۔۔ اس سے پہلے کہ یہ منڈا بہت اگاں نکل جائے۔۔۔!"

"لے دس چوہدری جی۔۔۔ مجھے ون سونے تراہ ناڈالیں۔۔۔ تسبیح پڑھنے دیں اب مجھے ذرا۔۔۔ دیکھنا کچھ ہی دیر میں یہ نچ گانا بند کر کے اندر آتا۔۔۔!"

چوہدری قاسم کے لہجے کی پراسرایت نے سنہری بیگم کا دل دھڑکا دیا تھا۔۔۔ اندر اٹھتے شور کو دبانے کے لیے وہ تیز تیز تسبیح کے دانے گرانے لگی۔۔۔ حویلی کے پچھلے میدان میں ایک شور برپا تھا اور حویلی کے صحن کی بکڑ پہ بنی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بھی دھیما دھیما شور اٹھتا تھا۔۔۔ جو اکثر حویلی کے مکینوں کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے دب جایا کرتا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

شہریار نے ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ ہاتھ میں تھاما خالی باؤل نیچے فرش پہ دیوار کے ساتھ رکھا اور بنا آواز ہاتھوں کو جھاڑتا نانی پیاری کے کمرے میں داخل ہوا۔۔۔ اندر نیم اندھیرے سے کچھ زیادہ اندھیرا تھا۔۔۔ شہریار نے تھوک نگل کے حلق تر کیا۔۔۔ اندھیرا تو ویسے ہی اس کے چھکے چھڑانے میں ہمیشہ سے معاون رہا تھا۔۔۔ وہ ٹٹول ٹٹول کے محتاط سا چلتا نانی پیاری کے بیڈ قریب پہنچا اور سوئی ہوئی نانی کا بازو ہلایا۔۔۔

"نانی۔۔۔ او نانی۔۔۔ نانی اٹھیں۔۔۔!"

نانی پیاری کمبل میں کسمسائیں لیکن چہرے سے کمبل نہی ہٹایا۔۔۔

"نانی۔۔۔ اٹھیں۔۔۔ میں شہری۔۔۔ بات کرنی ہے آپ سے۔۔۔ ضروری۔۔۔!"

زچ ہو کے شہریار نے نانی کو ہلکا سا جھنجھوڑا۔۔۔ شہریار سرہانے کی طرف جھکا ہوا تھا جبکہ نانی پیاری نے پائنتی کی طرف سے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے اس کی پشت پہ زوردار ہاتھ مارا۔۔۔ کمرے میں

شہریار کی دلخراش چیخ گونجی جسے سن کے نانی پیاری بھی حواس باختہ ہوتی چلائیں۔۔۔شہریار فوراً اپنا منہ بھینچتا نانی پیاری کا منہ پکڑنے کی بجائے گلا تھام گیا تو نانی کو غصہ آ گیا۔۔۔

"ستیاناس جائے تیرا شہری۔۔۔اوئے کلمو ہے۔۔۔تیرا دماغ پگھل گیا ہے کیا۔۔۔بے حیا!"

"او سوری۔۔۔" شہریار نے بغور دیکھنے کے بعد گلا چھوڑا۔۔۔" ایک دم ہو گیا نانی۔۔۔لیکن آپ چلائیں کیوں۔۔۔ابھی آ گئی نا ساری پلٹن اس کمرے میں تو آپ کا کمرا کلب بن جانا ہے۔۔۔!"

"تُو چلایا تو میں چلائی۔۔۔تُو کیوں چلایا۔۔۔؟"

"وہ آپ کے منہ کی جگہ پیر نکل آئے تو میں ڈر گیا تھا یار۔۔۔!"

"اور مت کام ہی کرتی کہ پیر نکل آئے تو منہ دوسری طرف ہی ہو گا نا۔۔۔!"

"اچھا اب بس کریں۔۔۔کیا آدھی رات کو ہلکان کر رہی ہیں۔۔۔میں ضروری کام سے آیا تھا نانی۔۔۔بات کرنی ہے اپ سے۔۔۔!"

"تکیہ لگا میری کمر سے پہلے پھر بول جو بولنا ہے۔۔۔!"" نانی پیاری پائینتی کی طرف ہی تھوڑا اونچا ہو کے بیٹھتی ہوئی بولیں۔۔۔شہریار نے فٹافٹ دو تکیے نانی کے پیچھے رکھے اور اپنی ٹانگیں بھی اوپر چڑھا کے چوکڑی مار لی۔۔۔

"نا تُو تو پیر نیچے رکھنا۔۔۔سارے دن کی بند جرابوں کی واڑھ (بدبو) میرے کمبل میں نا گھسا۔۔۔!"

"یار نانی آج ہی پہنی تھیں۔۔۔اور مجھے وہم ہوتا ہے کہ پلنگ کے نیچے سے بھوت ٹانگیں کھینچ لیتا ہے۔۔۔اس لیے ایسے ہی بیٹھنے دیں۔۔۔!"

"شرم کر۔۔۔کاکا ہے جو ایسے ڈرتا ہے۔۔۔بول اب جلدی۔۔۔فجر میں اٹھنا بھی ہے میں نے۔۔۔!"

"نانی۔۔۔آپ کو یاد ہے۔۔۔!" وہ تھوڑا آگے ہوا۔۔۔" وہ عورت جو ہم نے ڈینٹسٹ کے پاس دیکھی تھی۔۔۔جس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔۔۔!"

ایک پل میں نانی کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔۔۔تاثرات بدل گئے۔۔۔

"کیا کرنا ہے تُو نے اسے۔۔۔!" مدھم پھنسی سی آواز میں پوچھا۔۔۔

"نانی۔۔۔" اس کا لہجہ سرسراتا سا تھا۔۔۔نانی کو پھریری سی آگئی۔۔۔

"وے شہری۔۔۔دفع ہو جا ادھر سے۔۔۔نیند آرہی مجھے۔۔۔سونے دے۔۔۔!"

"نانی۔۔۔کس کی طرح تھی وہ عورت۔۔۔ہو بہو کس کا چہرہ تھا۔۔۔بتائیں نانی۔۔۔آپ بھی ٹھٹھکیں تھیں نا۔۔۔!"

بنا ان کی بات پہ توجہ دیے وہ اپنی کہے گیا۔۔۔تو نانی پیاری کے چہرے پہ تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔۔۔وہ یک ٹک شہریار کو دیکھے چلی گئیں۔۔۔!

☆......☆......☆

کہانی سب کی ہوتی ہے۔۔۔منہ سے بتائے بتائے بنا کسی کو سنائی نہی دیتی۔۔۔اور کچھ لوگ بتانے پہ قادر ہوتے ہوئے بھی چھپائے رکھتے ہیں کیونکہ اپنی کہانی کا سب سے بھیانک کردار وہ خود ہوتے ہیں۔۔۔!

پوری حویلی اس وقت خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔۔۔جھینگروں کی آواز سردیوں کی خاموش اور تاریک راتوں میں کانوں میں سوراخ کرتی ہے لیکن بعض اوقات یہ آواز زندگی کا احساس دلاتی ہے۔۔۔ کچھ نا کچھ کہیں نا کہیں ہلچل پیدا کیے ہوئے

ہے بھلے سے بدنما کیڑا ہی سہی۔۔۔! چوہدری شہاب الدین اپنے جہازی سائز پلنگ پہ تھوڑا سا تکیے پہ سر اونچا کیے لیٹے تھے۔۔۔ان کا ذاتی ملازم شرفو آج ان کے ساتھ موجود نہیں تھا۔۔۔اس کی بیوی بیمار تھی اور اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے ایک دن کی چھٹی درکار تھی۔۔۔اپنے بدل میں وہ اپنے بھائی کو چوہدری صاحب کے لیے چھوڑ گیا تھا لیکن چوہدری شہاب شرفو کے عادی تھے۔۔۔اس لیے تمام ضروری کاموں سے فراغت کے بعد اسے کمرے سے نکال دیا تھا۔۔۔وہ کمرے سے باہر برآمدے میں چار پائی ڈالے سر تک رضائی میں دبکا سویا ہوا تھا۔۔۔غریب کی رات جلدی ڈھل جاتی ہے اور دن بھی عجلت بھرا ہوتا ہے۔۔۔وہ بے خبر سویا پڑا تھا اس تسلی سے کہ اب اسے چوہدری جی کے پاس نہیں جانا۔۔۔!

چوہدری شہاب الدین عرصہ دراز سے بے خوابی کے مرض کا شکار رہے تھے جب کہ وہ ابھی فالج میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔۔۔اس وقت بھی وہ بے مقصد آدھی آدھی رات تک حویلی کی راہداریوں میں

چکرایا کرتے تھے۔۔۔اب بھی انہیں نیند نہیں آتی تھی۔۔۔کھلی آنکھوں اور بند زبان کے ساتھ کمرے کی چھت کو تکا کرتے تھے اور پھر تھک کے نگاہ سامنے والی دیوار کے اونچے روشدان پہ ٹھہر جایا کرتی۔۔۔ایک دہشت پھریری کی صورت وہاں سے داخل ہوتی تھی اور انہیں اپنی لپیٹ میں لینے کو بے تاب رہا کرتی۔۔۔شرفو پاس ہوتا تھا اور چوہدری شہاب پاس رکھی چھڑی مار کر یا تپائی پہ دھرا گلاس گرا کر اسے نیند سے جگا لیتے۔۔۔اس کے جاگتے ہی وہ دہشت میں لپٹا ہیولا ملامت زدہ نگاہیں ان پہ جمائے واپس روشن دان میں جا سماتا۔۔۔لیکن آج شرفو غائب تھا اور وہ ہیولا آزادسا روشدان کی جھری سے کسی مرغولے کی مانند کمرے میں اتر آیا تھا۔۔۔چوہدری شہاب کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی اور ان کی لکنت زدہ زبان سے بے ڈھنگے الفاظ نکلنے لگے۔۔۔ہیولا کمرے میں چکراتا ان کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔۔۔وہ اسے پہچانتے تھے۔۔۔اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان سے انتقام لینے کے در پہ ہے۔۔۔ان پہ خوف طاری ہونے لگا تھا۔۔۔وہ بھنچی ہوئی آواز میں اسے ہشکانے لگے۔۔۔

"ننکل جا۔۔۔نکل ییییہاں سے۔۔۔کککیا لینے آتا ہےہے مجھ سے۔۔۔مممیں نے نہیں مممارا تجھے۔۔۔ججس نے مارا ہےہے اس کے پاس ججا!!!!۔۔۔چھوڑ دے مممیرا پپپیچھا۔۔۔میں ننے ککچھ نہیں کیا۔۔۔ششرفو۔۔۔ششرفو۔۔۔!"

آخر میں وہ شرفو کو آوازیں دینے لگے۔۔۔ان کی آواز خوف سے بلند ہونا شروع ہو گئی تھی۔۔۔اس سردی میں وہ تر پیشانی اور تیز تنفس لیے مسلسل شرفو کو آواز دے رہے تھے جو حویلی میں موجود ہی نہیں تھا۔۔۔وہ ہیولا اب ان کے بستر کے قریب منڈلا رہا تھا۔۔۔کوئی پل جاتا تھا اور وہ ان پہ تسلط جما لیتا۔۔۔ان کی جان کھینچ لیتا۔۔۔انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا شیشے کا جگ اور گلاس ایک ساتھ ہاتھ مار کر فرش پہ گرا دیا۔۔۔زوردار چھناکے کی آواز سے کرچیاں سارے فرش پہ پھیل گئیں اور حویلی کی راہداریاں روشن ہونا شروع ہوئیں۔۔۔

"کککدھر مر گگئے ہو سب۔۔۔ییییہ مار دے گگا مجھے۔۔۔!"

حیات راؤ افراتفری میں کمرے میں داخل ہوئے اور اندر کا منظر دیکھ حیرت زدہ رہ گئے۔۔۔

ان کے پیچھے کشور خاتون بھی تھیں۔۔۔

"اباجی۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔" حیات راؤ پریشان سے ان کے قریب آ کر بیٹھے اور ان کا ہاتھ تھاما۔۔۔

"شرفو اسی لیے اپنا بھائی چھوڑ کے گیا تھا کہ وہ یہاں آپ کے ساتھ سوئے اور آپ نے اسے باہر بھیج دیا۔۔۔ اگر بھیجنا ہی تھا تو رات ہی مجھے کہلوا تو دیتے میں ہی آپ کے پاس آجاتا۔۔۔!" انہیں والد کی تنہائی کے احساس نے قلق میں مبتلا کیا۔۔۔ لیکن شہاب الدین کا دھیان ہی کہاں تھا ان کی باتوں پر۔۔۔ سامنے انگلی سے بمشکل اشارہ کرتے ہوئے بولے۔۔۔

"یییہ۔۔۔ اسے لے جا ٹھھ۔۔یات۔۔۔ یہ ممممارنے آیا ہہہے مجھے۔۔۔ لللے جااااسے۔۔۔!"

"کون اباجی۔۔۔ یہاں کوئی نہیں۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہیں۔۔۔!" حیات راؤ نے پریشانی سے یہاں وہاں دیکھا۔۔۔ ان کی دیکھا دیکھی کشور خاتون بھی ہونق سی ارد گرد نگاہ دوڑا گئیں۔۔۔ بے اختیار فطری خوف کے تحت شوہر سے قریب ہوئیں۔۔۔

"یییہہہ سامنے کھڑا ہے۔۔۔ مممارنے آیا ہے مجھے۔۔۔ اسے للگتا ہے کہ ااسے میں نے مارا ہہہے۔۔۔ ییہ مجھ سے ببدلہ لینے آآآیا ہے۔۔۔ ببچا مجھے۔۔۔!"

حیات راؤ ہکا بکا سے ان کی بات سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ کشور خاتون سے وہاں مزید ٹھہرنا دوبھر ہو گیا تھا۔۔۔ وہ شوہر کو اپنے جانے کا اشارہ دینے کے انداز میں ٹہوکا دے کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔۔۔ ان کے جاتے ہی حیات راؤ نے زوردار آواز نکال کر شرفو کے بھائی کو پکارا تھا۔۔۔ دوسری پکار پر وہ افتاں وخیزاں کمرے میں داخل ہوا تھا۔۔۔

"کہاں چلے گئے تھے تم۔۔۔ کہا نہیں تھا کہ اباجی کے پاس رہنا مسلسل۔۔۔!" حیات راؤ اس پہ گرم ہوئے تو وہ کھسیا گیا۔۔۔

"چوہدری جی وڈے چوہدری جی مجھے چھڑی مار مار کے کمرے سے باہر نکال رہے تھے جی۔۔۔ میں نے بہتیرا کہا تھا جی کہ یہیں نکرے لگ کے بیٹھ رہوں گا جی لیکن مانے ہی نہیں اس لیے برآمدے

میں چلا گیا تھا جی۔۔۔!"

اسے مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔۔۔ پو پھٹنے سے پہلے جاگنے والا غریب آدمی تھا۔۔۔ حیات راؤ سر جھٹک کے باپ کی طرف متوجہ ہوئے جن کے چہرے کی رنگت غیر معمولی زرد پڑ چکی تھی۔۔۔

"میں یہیں ہوں اباجی۔۔۔ آپ سو جائیں بے فکر ہو کر۔۔۔!"

"ننننہیں۔۔۔ اسے نننکال پہلے۔۔۔ ییییہ مجھے سونے ننننہیں دے گا۔۔۔ مممیرا گلا دباتا ہہہہے۔۔۔ میرا سسسانس رک جاتا ہے۔۔۔ اسے کبھہ میں نے نہیں مممارا اسے۔۔۔!"

"کسے اباجی۔۔۔ آخر کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔۔!" حیات راؤ زچ سے ہوتے کرسی قریب کھینچ کے بیٹھتے ہوئے بولے۔۔۔

"ییییہ سامنے ہی تو کھکککھڑا ہے۔۔۔ تتتتجھے دکھائی کککیوں نہیں دددیتا۔۔۔!"

"کون کھڑا ہے اباجی۔۔۔ بتائیں مجھے۔۔۔!" حیات راؤ طویل سانس بھر کر ضبط سے بولے۔۔۔

"آآآآفتاب۔۔۔ آفتاب ککککھڑا ہے۔۔۔ مممارنے آیا ہے مجھے۔۔۔!"

اور حیات راؤ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔ وہ ششدر سے والد کا چہرہ دیکھتے ان کی ہر باتوں پہ غور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ لیکن ایک ہی فقرے کی بازگشت مسلسل تھی۔۔۔ "اسے میں نے نہیں مارا۔۔۔ اسے میں نے نہیں مارا۔۔۔!"

☆......☆......☆

چوہدری قاسم کڑھ کڑھ کے بولنے کے بعد سو چکے تھے۔۔۔ شہزور بھی اپنا یار دوستوں کا ہنگامہ بند کر کے انہیں فارغ کرنے کے بعد کمرے میں جا چکا تھا۔۔۔ مردان خانے کے ملازم ابھی جاگ رہے تھے جو حویلی کے پچھلے حصے کی صفائی کر رہے تھے۔۔۔ سنہری بیگم اپنے کمرے کے ایک کونے پہ بچھے تخت پہ تسبیح ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔۔۔ نگاہیں نیم اندھیرے میں سامنے بند کھڑکی کے باہر ہوا سے لہراتے الٹے شوق کے درختوں کے پتوں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔) الٹا شوق پنجاب کے اکثر علاقوں میں اس درخت کو کہتے ہیں جس کے پتے اور شاخیں نیچے کی جانب بڑھتے ہیں (کوئی اس وقت سنہری بیگم کے چہرے کو

دیکھتا تو ایک عجیب سی ہیبت محسوس کر کے سہم جاتا۔۔۔ چہرے پہ درشتی لیے اس نے ٹانگیں تخت سے نیچے اتاریں۔۔۔ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں میں جماتے بغور سامنے بیڈ پہ سوئے چوہدری قاسم کو دیکھا۔۔۔ بنا چپل پہنے ننگے پاؤں وہ اٹھ کے کمرے سے باہر نکلی تھی۔۔۔ حویلی کی طویل راہداریاں اس وقت خاموش اور سنسان تھیں۔۔۔ ٹھنڈ کے احساس سے بے خبر سنہری ننگے پیر چلتی دالان عبور کرتی بڑے سے صحن میں پہنچ چکی تھی۔۔۔ کتوں کے بھونکنے اور جھینگروں کی چھلتی آوازیں اس نے اپنی آنکھیں دائیں بائیں گھما کے سنیں۔۔۔ اپنے قدموں کا رخ نکڑ پہ بنی اس چھوٹی سی کوٹھری کی جانب کیا جہاں سے آج معمول سے زیادہ آوازیں آتی رہی تھیں۔۔۔ کوٹھری کی چہار دیواری میں بس ایک دروازہ نصب تھا اور ایک سلاخوں والی کھڑکی۔۔۔ جس کی سلاخوں میں محض اتنا فاصلہ تھا کہ پانی کا گلاس اور روٹی کو گولا بنا کے اندر ڈالا جا سکے۔۔۔

سنہری نے لاشعوری طور پہ بائیں ہاتھ سے اپنی شلوار کے دونوں پائینچے ایک ساتھ تھوڑے اونچے کر لیے، اتنے کہ اس کے ٹخنے دکھائی دینے لگے۔۔۔ دوسرے ہاتھ سے چادر کو ٹھوڑی کے نیچے سے مضبوطی سے جکڑا۔۔۔ حویلی کے اندر جب جب یہ آوازیں کانوں میں پڑتی تھیں، دل چاہتا تھا ابھی کوٹھری کا دروازہ کھلوا کے گلا گھنٹوا دیں۔۔۔ لیکن ابھی جب کوٹھری کے پاس بلکل پاس موجود تھیں تو سر سے پیر تک سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔۔۔ نامعلوم سی دہشت نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔۔۔ یا انہیں محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ اندر موجود وجود لاچار ہونے کے باوجود جیسے ہر جگہ سرائیت کیے ہوئے تھا۔۔۔ پورے چاند کی روشنی تھی جو بس کچھ حد تک اندر جا پاتی تھی ورنہ کوٹھری ہمہ وقت اندھیرے میں ڈوبی رہا کرتی تھی اور جو اندر تھا وہ اس اندھیرے کا عادی تھا۔۔۔ سنہری بیگم نے قریب ہو کر سلاخوں والی کھڑکی پہ سہارے کے لیے دائیں ہاتھ کی محض انگشت شہادت رکھی اور اندھیری کوٹھری میں جھانک کر کسی کو تلاشا۔۔۔ ایک گلٹی سی حلق میں اتری اور آنکھیں مزید پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔ دماغ کہتا تھا فوراً پلٹ جائے لیکن دل اکسا رہا تھا ذرا خبر تو لے۔۔۔ تبھی سلاخوں کے دوسری طرف بے حد قریب سے آواز ابھری۔۔۔

"کسے ڈھونڈ رہی ہے۔۔۔؟"

سنہری بیگم بدک کے دو قدم پیچھے ہوئی۔۔۔جواب میں کچھ بھی نا کہا۔۔اندر سے پھر آواز ابھری۔۔۔

"ابھی زندہ ہوں۔۔۔تب تک ہوں جب تک تم لوگ انجام کو نا پہنچ جاؤ۔۔۔میرا معاملہ تو اللہ کے حوالے ہے اور جو اس کے حوالے ہے وہ اس کی امانت ہے اور جو اس کی امانت ہے اس میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوتا۔۔۔اس لیے جا اور اپنے انجام کا انتظار کر۔۔۔چلی جا واپس۔۔۔!"

خوف کی زرد لہریں سنہری بیگم کے پورے وجود کو شل کیے ہوئے تھیں۔۔۔قدم تھے کہ پلٹنے سے انکاری تھے اور ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر۔۔۔حلق کو چھیل کر چند الفاظ نکلے۔۔۔

"سارا سارا دن کیوں شور ڈالا ہوتا ہے۔۔۔خاموش ہو جاؤ اور اسی خاموشی میں مر جاؤ نا۔۔۔سانسیں بخش دی ہوئی ہیں کیا کافی نہیں۔۔۔!"

"کیوں۔۔۔خدا ہو جو سانسیں دیتے ہو۔۔۔میری سانسیں تو وہیں سے آ رہیں جہاں سے تجھے ملتی ہیں۔۔۔دعا کیا کر تیری جتنی رہ گئیں ہیں وہ جب ختم ہونے پہ آئیں تو تیری جھولی میں بس خسارے ہی نا رہ جائیں۔۔۔!"

"تو مرے یا نا مرے لیکن صبح چوہدری جی کو کہہ کر تیری زبان لازمی کٹوا دوں گی۔۔۔!" سنہری بیگم کو اس کی بات سن کر پتنگے لگے تھے۔۔۔اس نے غرا کے جواب دیا۔۔۔

"یہ بھی کر کے دیکھ لے۔۔۔کچھ تو کر کے تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا نا۔۔۔آج تک تو ہوا نہیں۔۔۔!"

"منحوس۔۔۔مر یہیں۔۔۔یہی قبر ہے تیری۔۔۔!"

"یہ میری نہیں تیری قبر بنے گی سنہری۔۔۔یہ کوٹھری تیرا خاتمہ طے کرے گی۔۔۔جا لوٹ جا واپس ابھی کے لیے۔۔۔دفع ہو۔۔۔!"

اس لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے سنہری کی چلتی زبان کو تھم لگا دیا تھا۔۔۔یکدم اس کا تنفس تیز ہوا تھا۔۔۔وہ الٹے قدموں واپس ہونے لگی۔۔۔جو خوف پہلے پہلو کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اب اچانک سے دل میں اتر گیا تھا۔۔۔اس کے پلٹتے ہی کوٹھری سے بے ہنگم قہقہے ابھرنا شروع ہوئے جنہوں نے

سنہری بیگم کے قدموں میں تیزی پیدا کر دی۔۔۔وہ جس تنتنے سے کوٹھری میں جھانکنے آئی تھی اب کسی مار کھائے چوہے کی طرح بل میں جا گھسی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

من من بھر کے قدموں سے اپنے کمرے تک پہنچ کر اس نے چادر کے پلو سے چہرے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور ٹوٹی شاخ کی مانند اپنے بستر پہ ڈھے گئی۔۔۔یکدم احساس ہونے پہ چہرہ موڑ کے چوہدری قاسم کو دیکھا کہ کہیں جاگ تو نہیں گئے لیکن وہ محض کسمسا کے کروٹ بدل گئے تھے۔۔۔سنہری بیگم نے چادر کا پلو چہرے پہ جھلایا۔۔۔دل کو گھٹن سی گھیر رہی تھی۔۔۔آنکھیں جلنے لگیں تھیں۔۔۔بازو آنکھوں پہ لٹکا کے اس نے اس جلن کو برداشت کرنے کی کوشش کی۔۔۔

”شاید عمل ادھورا چھوڑ کر اٹھی ہوں تا اس لیے سارا اپڑ رہا ہے۔۔۔!“ خود سے مخاطب وہ جیسے اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھی لیکن اسے ہو نہیں رہی تھی۔۔۔لیمپ کی طرف کروٹ لیے اس کے شیڈ کی جھالر کو تکتے اس کا ذہن وہ گفتگو دہرانے لگا جو ابھی کچھ دیر پہلے وہ کوٹھری کے باہر کر کے آئی تھی۔۔۔ایک مدت بعد وہ وہاں گئی تھی اور جیسے زندگی اجیرن کرنے کا نسخہ لے آئی تھی۔۔۔تنگ آ کر وہ چت لیٹ کے چھت کو گھورنے لگی۔۔۔منقش چھت کی کڑیاں جیسے رفتہ رفتہ ماضی کی کڑیوں سے جڑنے لگی تھیں۔۔۔!

☆......☆......☆

زندگی کیوں نہ تجھے وجد میں لاؤں واپس
چاک پر کوزہ رکھوں ، خاک بناؤں واپس
وقت کا ہاتھ پکڑنے کی شرارت کر کے
اپنے ماضی کی طرف بھاگتا جاؤں واپس
دیکھ میں گردشِ ایام اٹھا لایا ہوں
اب بتا کون سے لمحے کو بلاؤں واپس

نذر حسین ناز

صبح کا منظر ہے، ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک کا حسین امتزاج ہے۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی زندگی جاگ اُٹھی ہے۔

گھر کی عورتیں پتھر کی گھرٹ) چکی (پر جوار، گندم اور باجرہ کے دانے پیس رہی ہیں۔ ہاتھ سے گھومنے والی چکی کی موسیقی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔۔۔ درخت یا ٹاں وِیں) ٹاواں سرائیکی زبان کا لفظ ہے جو سوکھی ہوئی کم از کم دس بارہ فٹ کی لکڑی ہوتی ہے جس کے اوپر کانٹے دار جھاڑیاں باندھ دی جاتی ہیں تا کہ رات کو بلی یا گیدڑ ان پر بیٹھی مرغیوں تک نہ پہنچ سکے (پر بیٹھے مرغ کی اذان سونے والوں کو ایک نئی صبح کے لیے چتاونی دے رہی ہے۔۔۔

مسجد کے صحن میں سیپارے پڑھتے بچوں کی آواز دور تک سنائی دے رہی ہے۔۔۔ کسانوں نے اپنے بیل جوت لیے اور ان کے گلوں میں لٹکتی ہوئی ٹلیوں کی آواز نے پرندوں کو بھی جگا دیا ہے۔۔۔ نیلگوں آسمان پر چمکتے ستاروں کی روشنی مدھم پڑ رہی ہے دور اُفق پر اُبھرتے ہوا سورج ایک اور دن کو جنم دے رہا ہے۔۔۔ زنانیوں نے مٹی کے برتنوں ڈھی) ڈھی مٹی کا برتن ہے جس میں دودھ جمایا جاتا ہے (میں جمی دہی کو چاٹی کے اندر ڈالا تو سوندھی جیسی دہی کی خوشبو نے بچوں کو جگا دیا۔۔۔ پنڈ کے بچے لال رنگ کے کمہار کے ہاتھ سے بنے پیالے لے کر دہی لینے پہنچ گئے۔۔۔ مٹی کے گھبکار اور پرندوں کی چہچہاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سماں باندھ دیا ہے۔۔۔

چاروں طرف لہلہاتی فصلوں کے کھیتوں کے بیچ مقامی مٹی کی کوکھ سے جنمے ہیں۔۔۔ اس لیے وہ ماحول دوست اور ذائقے میں با کمال ہیں۔۔۔ سب لوگ جاگ چکے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں۔۔۔ گھر کی عورتیں ناشتہ بنانے میں لگ گئی ہیں۔۔۔ تندور اور پتھر کی بنی ہوئی تھوبی پر تازہ روٹیوں کی مہک نے بھوک کو اور دو بالا کر دیا ہے۔۔۔ گھر کی پتھاری پر بیٹھ کر سب مل کر مکھن، دہی اور ساگ سے ناشتہ کرنے کے بعد معمول کے کاموں میں جُت گئے۔۔۔ چرواہے بکریوں، بھیڑوں اور گائے کے ریوڑوں کو آس پاس کی چراگاہوں میں لے کر نکل لیے ہیں۔۔۔ اپنے ڈنگروں کی گنتی کرتے وہ خوش ہیں۔۔۔ اس خوشی کا اظہار وہ لوک گیتوں کی سُریلی تان گا کر کرتے ہیں۔۔۔ کمہار،

ترکھان، موچی اور نائی بھی رزق روزی کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔۔۔عشاء کی نماز کے ساتھ ہی سو جانے والا گاؤں دن کا اجالا مکمل نمودار ہونے سے پہلے ہی جاگ اٹھا ہے اور یہیں ایک کچی پگڈنڈی پہ دور سے چار الہڑ لچکتی ڈال جیسی گاؤں کی مٹیاریں چلی آ رہی ہیں۔۔۔ان میں سے دو کی ہنسی سارے رستے کو چوکس کرتی ہے۔۔۔موٹے کھدر کے کپڑے کے بنے تھیلے کلیجوں سے لگائے وہ کسی بات پہ کانوں میں پھسپھساتی ہیں اور پھر نقرئی قہقہے روکنے کو منہ پہ دوپٹوں کے پلو دھر لیتی ہیں۔۔۔ان چار میں سے ایک گندمی شفاف چہرے اور تیکھے نقوش والی قدرے شرارتی ہے اور اس کی بلی جیسی چمکتی آنکھوں میں امنگیں ٹھاٹھیں مارتی ہیں۔۔۔ان چار میں سے دوسری کے چہرے پہ بلا کا بھولپن اور حسن ہے۔۔۔اس کے سرخ پھولے گال ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں تمتمائے جاتے ہیں۔۔۔وہ باتیں کرنے سے زیادہ سننے کی شائق ہے۔۔۔ان چار میں سے تیسری کا مزاج دونوں سے یکسر مختلف ہے۔۔۔اس کی دودھیا سفید رنگت پہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن پہ برائے نام پلکیں ہیں۔۔۔اور چہرے کے خدوخال میں اتنی سی عمر میں سختی نمایاں ہے۔۔۔رنگت سفید ہونے کے باوجود کشش سے خالی ہے۔۔۔وہ نا زیادہ باتیں کرنے کی شوقین ہے اور نا کم سخن ہے لیکن اس کا من پسند مشغلہ طنز و تشنیع کے تیر برسانا ہے۔۔۔انداز ایسا کہ مقابل سے جواب نا بن پڑے اور سمجھ کے بھی محض مسکرا دے۔۔۔اور ان چاروں میں چار قدم آگے چلنے والی نازک اندام اور حسن کی نوخیزی کو بغل میں چھپائے خراماں خراماں چلتی وہ چوتھی جو بے حد سیانی اور سبھاؤ سے بات کرتی دل میں اترتی ہے۔۔۔ان چار کا ساتھ بچپن سے لڑکپن تک چلا آیا ہے۔۔۔چاروں فطرتاً ایک دوسرے سے بلکل مختلف ہونے کے باوجود ہمیشہ ساتھ رہتی تھیں تو ایک تو وجہ یہ تھی کہ اس پورے پنڈ میں ان چاروں کے پاس دوستی کے لیے بہتر آپشن نہیں تھا اور دوسرے وہ نظر انداز کرنا جانتی تھیں سوائے ایک کے جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بنا پلکوں کے اندر تک کھبتی محسوس ہوا کرتیں۔۔۔وہ تینوں چاہتی تو اسے اپنے جُٹ سے نکال سکتی تھیں لیکن وہ یتیم و مسکین تھی۔۔۔اور پنڈ کا پانی بڑا الحاظ والا تھا جو ان تینوں کو بچپن سے راس تھا۔۔۔

حویلی نزدیک آ رہی تھی۔۔۔سب سے اگلی نے پچھلی تینوں کو پلٹ کر ایک نظر گھورا تا کہ ان کی

کھلکھلاہٹیں بند ہو جائیں۔۔۔ان تینوں میں سے دو نے فوراً انگلیاں شرارتاً ہونٹوں پہ جمائی تھیں جبکہ تیسری کے ہونٹ نخوت سے بھنچے پھر وہ بد بدائی۔۔۔

"سارے پنڈ کو منہ دھیانے کرا کے حویلی کے سامنے پاک بیبیاں نا بن جایا کرو۔۔۔!" اور ساتھ ہی وہ بات کا اثر زائل کرنے کو زم سی ہنسی ہنس دی تھی۔۔۔

"ویسے سارے رستے تم دونوں کے ہاسے ہی تو رونقیں لگاتے ہیں۔۔۔!"

"اور تیرا کام سارے رستے سڑنا لوسنا اور حویلی کے پھاٹک پہ پہنچ کے پھلجھڑیاں چھوڑنا ہے۔۔۔ہے نا سنہری۔۔۔؟"

گندمی شفاف رنگت اور تیکھے نقوش والی رابی نے طنز کیا تھا۔۔۔وہ ویسے بھی برداشت کی ذرا ہلکی تھی۔۔۔کڑوی باتیں سن کے جواب دینا لازم تھا اس پہ۔۔۔

"اب حویلی پہنچتے ہی مت شروع ہو جانا۔۔۔چلو جلدی اندر۔۔۔اماں ناراض ہوتی ہیں دہلیز پہ بحث تکرار کرنے سے۔۔۔!" سب سے اگلی کشور نے مفاہمانہ انداز میں ٹوکا تو سنہری کینہ توز نگاہوں سے رابی کو دیکھتی منہ پھیر گئی۔۔۔رابی نے آنکھیں مٹکا کے اپنی ہم نوا و ہم خیال کو دیکھا تو خانم چہرہ بلتے کے پیچھے کیے مسکراہٹ چھپا گئی۔۔۔

"کشور رات کو مہندی گھولی تھی میں نے۔۔۔کسی وقت آ کے لگا دینا میرے بالوں میں۔۔۔روکھے سے ہو رہے ہیں۔۔۔!"

کشور دھیمی مسکان چہرے پہ سجاتے اثبات میں سر ہلا گئی۔۔۔اسے کسی بھی کام کو انکار کرنے کی عادت نہی تھی اور سنہری اس عادت کا اکثر ناجائز فائدہ اٹھاتی تھی۔۔۔لیکن رابی کو سنہری کا ایسے حکم جاری کرنا اور کشور کا مان جانا کبھی نہیں بھاتا تھا۔۔۔ابھی بھی وہ فوراً بیچ میں کود دی تھی۔۔۔

"نا تو تمہارے ہاتھوں پہ لیپ ہوا ہوا ہے کیا۔۔۔کبھی خود بھی ہاتھ پیر ہلا لیا کرو سنہری۔۔۔جب سے ماسی کے ہاں آئی ہو حرام ہے تمہیں کچھ کرتے دیکھا ہو۔۔۔!"

"ہاں تو کیوں کروں۔۔!" وہی دل جلاتی مسکراہٹ سنہری ہونٹوں پہ سجائے بولی۔۔۔" جب میرے کام کرنے کو لوگ موجود ہیں تو تمہیں کس بات کے مروڑ اٹھتے ہیں رابی۔۔۔اچھا چل کشور نا آئے تو آ

جانا اور لگا جانا میرے سر پہ مہندی۔۔۔!" اپنی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر کے کہتی وہ اس وقت رابی اور خانم دونوں کو زہر لگی۔۔۔

"مہندی تو نہیں آگ لگانے آجاؤں گی تمہارے جھاٹوں کو۔۔۔ نا رہیں گے نا دوبارہ ضرورت پڑے گی۔۔۔!"

رابی کے جواب پہ سنہری کی سفید رنگت یکدم سرخ ہوئی تھی۔۔۔ کشور لپک کے درمیان میں آئی اور مفاہمتی لہجے میں بولی۔۔۔

"رابی۔۔۔ سنہری۔۔۔ چُپ کر جاؤ دونوں۔۔۔ چلو اندر اب۔۔۔ اور سنہری بارہ بجے کے بعد آ کے لگا جاؤں گی۔۔۔ فکر نا کرو۔۔۔!"

"مجھے کاہے کی فکر۔۔۔ میرا کام تو ہو کے ہی رہتا ہے۔۔۔ اگر تم نا لگاتی تو رابی سے ہی لگواتی اور سنہری بنا بات کے کوئی بات نہیں کہتی۔۔۔!"

اتنا کہہ کے وہ حویلی کا پھاٹک عبور کرتی اندر چلی گئی۔۔۔ پیچھے رابی اس کی چٹیا کھینچنے کو لپکی لیکن کشور اور خانم دونوں نے اسے جکڑ لیا۔۔۔

"جانے دو نا۔۔۔ پتا بھی ہے اس کی عادت کا پھر بھی منہ لگتی ہو۔۔۔!" خانم تاسف سے دور جاتی سنہری کی پُشت دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

"ایسی کی تیسی اس کی عادت کی۔۔۔ یہ تم دونوں ہو ورنہ میں تو کبھی بھی اسے ہم تینوں کے بیچ نا آنے دیتی۔۔۔ فتنی۔۔۔ جب سے آئی ہے روز کوئی نا کوئی فساد ڈالتی ہے اور بنتی ایسے ہے جیسے کہاں کی پیرنی ہو۔۔۔!"

اس کا غصہ فی الحال کم نہی ہونا تھا اس لیے ایک ہاتھ کشور نے اس کا تھاما اور دوسرا خانم نے اور دہلیز پار کرتی اندر لے گئیں۔۔۔ جہاں اس پنڈ کے اندر ایک چھوٹا پنڈ "حویلی لکھاں" کے نام سے آباد تھا۔۔۔ جہاں ایک ہی حویلی کے اندر چار حویلیاں تھیں۔۔۔ اور چاروں میں چوہدری شجاعت کی اولادیں بستی تھیں۔۔۔ یہیں سے آنے والے وقت نے سب کی زندگیوں کو نئے موڑ دینے تھے۔۔۔!

☆......☆......☆

حویلی لکھاں اس حویلی کا نام کیوں پڑا اس کی اصل کوئی نہیں جانتا لیکن اس حویلی کی ظاہری شان وشوکت اور طرز تعمیر اپنے دور کے حساب سے نہایت منفرد تھا۔۔۔چوہدری شجاعت کی ہمیشہ سے خواہش رہی تھی کہ ان کی اولاد ایک ہی جگہ پہ رہے لیکن وہ اس معاملے میں کچھ وسیع النظر تھے جو سب کی ذاتیات کا لحاظ رکھتے تھے۔۔۔اس نہج پہ سوچتے انہوں نے چار حویلیاں اس انداز میں تعمیر کروائیں جو بظاہر ایک ہی دکھائی دیتی تھیں لیکن جب اندر داخل ہو جاتے تو چار متصل حویلیاں تھیں۔۔۔سب کی ایک دوسرے سے مناسب پردے داری بھی تھی اور مکمل خبر گیری بھی تھی۔۔۔حویلی کا وسیع وعریض باغ اور صحن مشترکہ تھا اور ایک بہت بڑا آہنی گیٹ حویلی کے باہر نصب تھا جو سبھی کے مشترکہ استعمال میں تھا۔۔۔

چوہدری شجاعت کی چار اولادیں تھیں جن میں تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔۔۔سب سے بڑے بیٹے شہاب الدین راؤ تھے جن کی شخصیت کا رکھ رکھاؤ اور مزاج خاصا مغرورانہ تھا۔۔۔ان کی نسبت ان کی بیگم سکینہ ایک وضعدار لیکن سنجیدہ مزاج خاتون تھیں۔۔۔تین اولادیں تھیں۔۔۔بڑے بیٹی نمرہ راؤ بیٹے حیات راؤ اور پھر حسنات راؤ۔۔۔چوہدری شہاب الدین سے چھوٹے مہتاب راؤ تھے جن کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی بیگم حمیدہ کا مزاج ہو بہو اپنے جیٹھ سا تھا۔۔۔نا کسی کو زیادہ منہ لگاتی تھیں نا کچھ خاص مروت نبھاتی تھیں۔۔۔ان کی ایک ہی اولاد تھی قاسم راؤ۔۔۔اور سب سے چھوٹے بیٹے آفتاب راؤ تھے جو چوہدری شجاعت کے دوسرے نکاح سے تھے اور اسی بنا پہ شہاب الدین اور مہتاب راؤ نے انہیں کبھی خاص اہمیت نہی دی تھی۔۔۔جبکہ فطرتاً آفتاب راؤ اپنے سوتیلے بھائیوں سے متضاد تھے۔۔۔نرم خو، خوش مزاج اور دردمند۔۔۔قدرت نے اپنے ہی جیسی شریک سفر قسمت میں لکھی تھی۔۔۔رقیہ بے حد منکسر المزاج خاتون تھیں۔۔۔دو بیٹیاں تھیں کشور اور خانم۔۔۔کشور، خانم سے چھے سال بڑی تھیں۔۔۔اس بیچ تین بار رقیہ کی گود ہری ہو کر اجڑی تھی اور جب بے حد دعاؤں منتوں سے خانم پیدا ہوئی تو وہ جیسے پوری حویلی کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔۔۔حسین تو کشور بھی بے حد تھی لیکن خانم کی بات الگ تھی۔۔۔چودہ سال کی عمر میں ہی اس کی اٹھان غضب کی تھی۔۔۔ویسے بھی پنڈ دیہاتوں میں بچیاں خالص خوراک اور تنومندی کی وجہ سے جلدی قد کاٹھ نکال لیا کرتی تھیں۔۔۔خانم نے بھی لاابالی سی عمر میں جیسے سبھی کی توجہ کھینچ لی تھی۔۔۔

چوہدری شہاب الدین اپنے سوتیلے بھائی کی اس اولاد سے خاص خار کھاتے تھے کیونکہ جتنی انہیں نفرت اس سوتیلے بھائی سے تھی اتنی ہی اس کی اولاد ان کے گھر پہ چھائی ہوئی تھی۔۔۔کشور تو اپنے سگھڑاپے اور رکھ رکھاؤ کے باعث سکینہ بیگم کو شروع سے ہی پسند تھی لیکن خانم کے لاڈ سب یونہی بلا جواز اٹھانا لازم سمجھتے تھے۔۔۔حیات راؤ کی وہ گڈی تھی اور حسنات کی پری۔۔۔نمرہ کی بھی اس میں جان بند تھی۔۔۔جب تک نمرہ راؤ بیاہ کے حویلی سے چلی نہیں گئی تھیں تب تک خانم ان کے ساتھ ان کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔۔۔پھر ان کا بیاہ اپنے ماموں زاد سے ہو گیا اور عنقریب وہ یہ ملک بھی چھوڑ جاتی۔۔۔خانم ان کی جدائی میں بیمار پڑ گئی۔۔۔حویلی کے ہر فرد کے ہاتھ پیر پھول گئے۔۔۔نمرہ کے لمبے لمبے خط پنڈ پہنچا کرتے جو خانم کے ذکر سے بھرے ہوتے اور خانم اس دن باغ میں خط لیے بلبل کی طرح چہکتی پھرتی۔۔۔چوہدری شہاب الدین اپنی اولاد کا کشور اور خانم سے لگاؤ بمشکل سہہ پاتے تھے تو اس میں ہاتھ سکینہ بی بی کا تھا۔۔۔وہ گاہے بگاہے دونوں بہنوں کی تعریفوں کے پُل باندھے رکھتیں اور ان کے سامنے اس قدر رسان اور محبت سے ذکر کرتیں کہ شہاب الدین چاہ کے بھی اپنی نفرت کا اظہار کھل کے نہیں کر پاتے تھے۔۔۔دوسری طرف خانم کو ان کے رویے کے روکھے پن کی کبھی پرواہ نہیں رہی تھی۔۔۔وہ موقع بے موقع تایا کے پاس پہنچ جاتی اور ان سے فرمائشیں کیا کرتی۔۔۔کبھی کبھار شہاب الدین جھاڑ دیتے تو کبھی خانم کی ضد اور لاڈ کے انداز کے آگے ہار جایا کرتے۔۔۔کچھ ایسا تھا اس بچی میں کہ وہ اس کے سامنے وہ تمام تر تلخی ظاہر نہیں کر پاتے تھے جو ان کے اندر شروع سے اس کے باپ کو لے کر موجود تھی لیکن جیسے ہی خانم منظر سے غائب ہوتی وہ ویسے ہی اکھڑ بن جاتے کہ لگتا ابھی سامنے آئی نہیں اور انہوں نے پرخچے اڑائے نہیں۔۔۔وقت بھلا برا سنگ سنگ گزر رہا تھا۔۔۔!

اسی طرح حویلی کا چوتھا حصہ چوہدری شجاعت کی بیٹی کا تھا جہاں وہ رہائش پزیر تھیں۔۔۔جن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔۔۔رابی دونوں بھائیوں کی لاڈلی تھی۔۔۔اکلوتی بہن ہونے کے ناتے اس کی کوئی بات نہیں ٹالی جاتی تھی۔۔۔رابی چلبلی ضرور تھی پر اسے اپنی اقدار اور روایات کا پاس تھا۔۔۔وہ اپنے کسی عمل سے ماں باپ اور بھائیوں کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی تھی۔۔۔خانم سے بے پناہ دوستی کے

باعث وہ بھی شہاب الدین کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی مگر سگی بھانجی تھی اس لیے اس پہ ٹوک نہیں لگاتے تھے۔۔۔ان کی بہن کی شادی پھوپھی زاد سے ہوئی تھی جو یتیم تھے اور لڑکپن سے چوہدری شجاعت کے زیرِ کفالت تھے۔۔۔انہوں نے مکمل ذمہ داری کے ساتھ بھانجے کا کاروبار سیٹ کروایا تھا اور پھر بیٹی کو جائداد سے حصہ دے کر فارغ کر دیا تھا۔۔۔اس بات کا شہاب الدین اور مہتاب کو بے حد قلق تھا۔۔۔وہ اپنے تئیں یہی سوچ بیٹھے تھے کہ بہن کو حویلی میں جگہ دے دی۔۔۔بہنوئی کو کاروبار کرا دیا تو اب بس۔۔۔جائیداد میں سے حصے داری ختم۔۔۔لیکن چوہدری شجاعت خوفِ خدا رکھنے والے انسان تھے اور پھر اس کام کے لیے انہیں آفتاب راؤ نے قائل کیا تھا۔۔۔پہلے تو اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب یہ بات شہاب الدین اور مہتاب کے علم میں آئی تو ان کی نفرت آفتاب کے لیے مزید بڑھ گئی تھی۔۔۔اور اسے مہمیز کرنے میں چوہدری مہتاب راؤ کے اکلوتے سپوت قاسم راؤ کا بھی ہاتھ تھا جو ہو بہو اپنے تایا شہاب الدین کی فطرت لے کر پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا۔۔۔جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتے ہی اس نے باپ اور تایا کے ذہنوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔۔۔شہاب الدین کو اپنے اس بھتیجے پہ بے پناہ فخر تھا۔۔۔وہ ایسی ذہنیت حیات اور حسنات میں پروان چڑھانے میں ناکام رہے تھے۔۔۔انہیں اپنی اولاد سے بے حد شکوے شکایات تھیں۔۔۔جن اوصاف کو دنیا سلام کرتی تھی ان کی نظر میں وہ ان کے بیٹوں کی کجیاں تھیں۔۔۔ایک طویل مدت سے وہ چاہتے تھے کہ اس وسیع و عریض حویلی کے اندر موجود وہ حصہ جہاں آفتاب اور اس کا گھرانہ آباد تھا وہ ویران ہو جائے۔۔۔بنجر ہو جائے۔۔۔ان کے قبضے میں آ جائے۔۔۔لیکن وہ اپنے کسی داؤ میں کبھی کامیاب نا ہو سکے تھے کیونکہ آفتاب راؤ صلح جو اور منکسر المزاج انسان تھے۔۔۔انہوں نے کبھی زیادہ کا لالچ نہی کیا تھا۔۔۔جو زمینیں باپ کی طرف سے ترکے میں ملیں تھیں انہی پہ راضی شاکر تھے گو کہ وہ کوئی چھوٹی اراضی نہی تھی پینتیس مربع زمین صرف ان کے حصے میں آئی تھی اور یہ عیش شہاب الدین اور مہتاب کے سینوں کو دہکائے رکھتا تھا۔۔۔ان دونوں بھائیوں نے کبھی بھی چوہدری شجاعت کی دوسری شادی کو تسلیم نہی کیا تھا جو کہ ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔۔۔چوہدری شجاعت اپنی رشتے کی پھوپھی کے قریب المرگ ہونے پہ اس کے پنڈ

گئے تو وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھ کے ٹھٹھک گئے۔۔۔پھوپھی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی اکلوتی اولاد بس ایک بیٹی تھی۔۔۔ جنازے کا سارا انتظام چوہدری شجاعت نے کیا اور دفنانے تک وہ وہیں موجود رہے۔۔۔جیسے ہی واپسی کرنے لگے پھوپھی کے سسرال سے کسی نے آواز بلند کی اس کی اکلوتی بیٹی کا اب کیا کیا جائے۔۔۔اتنے بڑے گھر میں جوان جہان لڑکی کیسے رہے گی۔۔۔شور چوہدری شجاعت کے کانوں میں بھی پڑا لیکن وہ بھلا کیا کہہ سکتے تھے۔۔۔پھر بھی کچھ دیر کے لیے مزید ٹھہر گئے۔۔۔تبھی ایک شاطر رشتے دار آگے بڑھا اور نازو کے سر پہ ہاتھ رکھتا بولا کہ میں اسے اپنی بہو بناتا ہوں۔۔۔روٹی پانی کا آسرا ابھی ہو جائے گا اور چھت بھی مل جائے گی۔۔۔کسی کی آواز ابھری۔۔۔" چاچا تیرا بیٹا تو نیم پاگل ہے۔۔۔اور پھر دورے کی حالت میں بندہ پھڑکا سکتا ہے۔۔۔" چاچا سٹپٹایا لیکن خود پہ قابو پاتے بولا۔۔۔" پاگل نہیں ہے سیدھا ہے اور بندہ ابھی تک کون سا پھڑکایا ہے۔جو تُو اچھل اچھل کے بول رہا ہے۔۔۔زخمی ہو گیا تھا ایک لیکن غلطی اس کی تھی۔۔۔اللہ لوک کو غصہ کیوں دلایا اس نے۔۔۔!"

بھیڑ میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔۔۔کوئی کہہ رہا تھا کہ کر دینا چاہیے کوئی کہتا تھا کہ نہیں یہ اتنی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کے ساتھ ظلم ہو گا۔۔۔صرف اس کے مکان کے لالچ میں یہ رشتے دار اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔۔۔چوہدری شجاعت بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔۔۔اندر ہی اندر کوئی چیز چبھو کے لگانے لگی کہ یہاں اس وقت وہ سب سے قریبی اور بااثر رشتے دار ہیں۔۔۔یہ وقت ان کے خاموش رہ جانے کا نہیں ہے۔۔۔مرنے والی سے ان کی والدہ اور والد کا گہرا تعلق تھا اور نازو کا سارا بچپن بھی ان کی نگاہوں کے سامنے گزرا تھا۔۔۔وہ نا صرف حسین صورت تھی بلکہ طبعاً بھولی بھالی بھی تھی۔۔۔کوئی ایسے کیسے اس پہ اپنا حق جتا کر اپنے نیم پاگل بیٹے کے لیے اسے لے کر چلتا بنے۔۔۔وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہجوم کے بیچ میں آن موجود ہوئے۔۔۔وہ شخص لوگوں کی اکثریت کو خاموش اور اپنے حق میں دیکھ کر بوکھلائی اور مخبوط الحواس نازو کے سر پہ چنی ڈال کر اسے کھڑا کر رہا تھا۔۔۔

" چل پتر۔۔۔چل میرے گھر۔۔۔تالا میں ڈالتا ہوں۔۔۔فی الحال گھر چل۔۔۔چالیسویں کے بعد پورے دھوم دھڑکے سے اپنی نہو بناؤں گا۔۔۔کتنی نیک بچی ہے تُو کہ تیرے حصے میں رب سوہنے

نے اللہ لوک لکھ دیا۔۔۔بڑے کرم ہیں تیرے۔۔۔!"

"رکو چاچا۔۔۔!" چوہدری شجاعت آگے بڑھے۔۔۔سارا مجمع دو دو قدم پیچھے ہوا۔۔۔وہ چلتے ہوئے اس نام نہاد رشتے دار کے عین سامنے آکھڑے ہوئے اور دھمک کے بولے۔۔۔

"میرے پنڈ میں بھی ایک اللہ لوک ہے چاچا۔۔۔تمہاری دو بیٹیاں ہیں بیاہنے والی۔۔۔ان میں سے ایک کا ہاتھ مانگتا ہوں تم سے اس جھلے کے لیے۔۔۔کہو قبول ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو شجاعت پتر۔۔۔آپے میں تو ہو۔۔۔؟ میں کوئی کمی کمین ہوں جو اپنی دھی دے دوں گا کسی پاگل کو۔۔۔یا میری بیٹیاں لاوارث ہیں۔۔۔!"

"دے نہیں سکتے تو لے کر کیوں جا رہے ہو۔۔۔کیا نازو لاوارث سمجھی ہے۔۔۔یا کمی کمینوں کی ہے۔۔۔؟"

"اچھا۔۔۔" چاچا چمک کے بولا۔۔۔"کون ہے اس کا وارث۔۔۔ہاں بتا ذرا۔۔۔تُو ہے کیا۔۔۔؟"

"ہاں میں ہوں اس کا وارث۔۔۔کوئی جائے اور امام مسجد کو بلا لائے۔۔۔نکاح پڑھوانا ہے۔۔۔!"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔۔۔

"نکاح کس سے۔۔۔اپنے ساتھ آئے کامے سے۔۔۔؟ ہاں ہے تو جوان جہاں۔۔۔چلو نازو کا بھلا اسی میں ہے۔۔۔پاگل تو نہیں ہو گا نا۔۔۔!"

سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔۔۔قیافے لگا رہے تھے۔۔۔کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ چوہدری شجاعت نازو کو اپنی منکوحہ بنا کے لے جانے والا ہے۔۔۔وہ تو جب امام مسجد نے نکاح پڑھوایا اور پانچ کلے زمین حق مہر کے عوض نازو سے چوہدری شجاعت کے لیے منظوری مانگی تو پنڈ والوں نے رشک و حسد سے انگلیاں داب لیں۔۔۔کیا قسمت کھلی تھی نازو کی۔۔۔بھلے شادی شدہ تھا لیکن چوہدری شجاعت ابھی گھبرو جوان اور وجیہہ و شکیل انسان تھا۔۔۔کتنی عورتوں نے حسرت سے سوچا تھا کہ نازو کی جگہ ان کی اپنی بیٹی ہوتی۔۔۔نازو کو ماں کا غم ابھی ہوش پکڑنے کہاں دے رہا تھا جو ہو رہا تھا وہ غائب دماغی سے قبول کیے جا رہی تھی۔۔۔یوں اجڑی پجڑی نازو کچھ ہی دیر میں لال آنچل اوڑھے سوگ زدہ حسن کی بکل اوڑھے چوہدری شجاعت کے ہمراہ ہو لی۔۔۔چوہدری شجاعت اس وقت تک کچھ

نہی جانتے تھے کہ حویلی جا کے کیا جواب دیں گے لیکن یہ طے تھا کہ وہ نازو کو سیدھا وہیں لے جانے والے تھے۔۔۔نا بھی لے جاتے تو ان کے نکاح ہی خبر پنڈ لازمی پہنچ چکی ہونی تھی۔۔۔وہ زندگی کے ہر معاملے میں راست باز رہے تھے اس لیے نازو کو بھی وہ جگ ہنسائی کی وجہ بننے نہیں دے سکتے تھے۔۔۔ ان کی واپسی پہ بڑی چوہدرائن نے نا کوئی احتجاج کیا نا واویلا ڈالا بس التجا کی کہ ان کی سوکن ان کی حویلی میں نا رکھی جائے۔۔۔چوہدری شجاعت بیوی کے دکھ کا اندازہ کر سکتے تھے اس لیے بنا چوں چراں نازو چھوٹی حویلی منتقل ہو گئی لیکن دس سالہ شہاب الدین اور آٹھ سالہ مہتاب کے دلوں میں ڈھیروں نفرت اتر آئی۔۔۔خاص طور پر شہاب الدین جو کہ فطرتاً کینہ پرور تھا اور مہتاب چونکہ بڑے بھائی کا اثر قبول کیے ہوئے تھا لہٰذا اس کے دل میں موجود عداوت کو شہاب الدین نے مہمیز کیا تھا۔۔۔نازو حسین عورت تھی اور چوہدری شجاعت کے دل کو بے حد لگنے لگی تھی۔۔۔وہ کوشش کرتے تھے کہ دونوں بیویوں کے درمیان انصاف قائم رکھ سکیں لیکن دل نازو کے معاملے میں بے ایمانی پہ اتر آیا تھا۔۔۔ان کا جھکاؤ قدرتی طور پر اس کی طرف بڑھ گیا تھا۔۔۔نازو اپنی خوش بختی پہ نازاں تھی لیکن یہ خوش بختی طویل المیعاد نہیں تھی۔۔۔پہلے بچے کی پیدائش میں کم ہی وقت رہ گیا تھا۔۔۔

شہاب الدین اور مہتاب چھوٹی حویلی آئے تھے۔۔۔بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ دونوں وہاں آتے تھے۔۔۔لیکن جب بھی آتے نازو جی جان سے ان کی خاطر کرتی۔۔۔چوہدری شجاعت بھی اس بات سے خوش ہوا کرتے۔۔۔اس دن بھی نا جانے وہ بے وقت کیوں چلے آئے۔۔۔ہاتھ میں چند پتنگیں تھیں۔۔۔نازو نے منع کرنا چاہا کیونکہ چوہدری شجاعت کو پتنگ بازی ہرگز پسند نہی تھی مگر رشتے کی نزاکت کے کارن خاموش ہو گئی۔۔۔سوچا چوہدری جی آ گئے تو اپنے سر لے لے گی کہ اس نے انہیں پتنگیں مہیا کی تھیں۔۔۔شہاب الدین اور مہتاب چھت پہ جا پہنچے۔۔۔چھت کو جاتی سیڑھیوں کے اوپر دیوار کے ساتھ ایک ترتیب سے گندم اور جوار کی بوریاں رکھی تھیں۔۔۔اناج کے بھڑولے اوپر چھت والے کمرے میں ہی دھرے ہوئے تھے۔۔۔شام تک چوہدری شجاعت کامے ساتھ لاتے تو وہ بوریاں ان بھڑولوں میں الٹ ڈالتے۔۔۔نازو نے ستو کا شربت بنایا اور مٹی کے روغنی پیالے لیے پھولے سانس کے ساتھ چھت

کی سیڑھیاں چڑھتی ان دونوں کے لیے اوپر آئی۔۔۔مہتاب نے شرماشرمی آگے بڑھ کر تھال تھام لیا جبکہ شہاب الدین کی کینہ توز نگاہیں نازو کے وجود پہ گڑی تھیں۔۔۔نازو نے ایک آخری کوشش کی تھی کہ انہیں سمجھا بجھا کے نیچے اتار لے۔۔۔گرمی کی شدت سے دماغ پگھل رہے تھے اور وہ دونوں بھی تو ابھی چھوٹے تھے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان کے دماغ اتنے چھوٹے نہیں۔۔۔وہ مایوسی سے نفی میں سر ہلاتی واپس پلٹ گئی۔۔۔سج سج سیڑھیاں اترنے لگی۔۔۔نیچے پہنچتے وقت لگتا۔۔۔شہاب الدین برق رفتاری سے آگے بڑھا اور گندم اور جوار کی بوریاں سیڑھیوں کی طرف الٹا دیں۔۔۔دانوں کا سیلاب سیڑھیوں میں بہہ گیا ارنازو کو ساتھ لیتا ہوا اتر گیا۔۔۔ایک زوردار چیخ سارے میں گونجی تھی اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔۔۔مہتاب کے سان وگمان میں بھی نہی تھا کہ شہاب الدین ایسی کسی حرکت کو سرانجام دینے والا ہے۔۔۔اس کی پتنگ کٹ چکی تھی لیکن وہ سکتے کی کیفیت میں ڈور تھامے پھٹی آنکھوں سے سیڑھیوں کے کنارے پہ کھڑے شہاب الدین کو دیکھ رہا تھا جس کے ہونٹوں پہ خباثت سے پُر مسکراہٹ اسے اچھی نہیں لگی تھی۔۔۔

"یہ کیا کیا ویرے تونے۔۔۔؟" وہ بمشکل حلق سے آواز نکال پایا۔۔۔

"وہی جس کا موقع پورے سال سے نہی ملا تھا۔۔" آنکھیں شہاب الدین کی بھی پھٹی ہوئی تھیں لیکن اندرونی جوش سے۔۔۔وہ چلتا ہوا مہتاب کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔۔"چل اتر اب نیچے۔۔۔کسی کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل چل۔۔۔!"

"کسی کو پتا لگ گیا تو کیا بنے گا بھاء۔۔۔!"

"ایسے تو لگتا نہی لیکن اگر تو یہیں جما رہا تو لگ جاے گا۔۔۔نکل جلدی۔۔۔!"

اور وہ مہتاب کا ہاتھ تھام کے تقریباً گھسیٹتا ہوا اسے لیے سیڑھیاں اترا جہاں نازو بے ہوش پڑی تھی۔۔۔اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔۔۔گرم تپتے فرش پہ اس کا نازک لیکن ممتا کا بوجھ سموئے وجود انگارہ بن رہا تھا۔۔۔شہاب الدین نفرت سے اس کے اوپر سے پھلانگتا گزرا اور مہتاب کو بھی اس زور سے کھینچا کہ وہ یا تو پھلانگتا یا پھر نازو سے بری طرح ٹکراتا اور وہ ٹکرا کے گرا۔۔۔اسے لگا جب وہ گرا تو اس کا

گھٹنا نازو کے پیٹ پہ لگا ہے جس سے وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی پھڑ پھڑائی تھی۔۔۔لیکن شہاب الدین نے وہاں کھڑے ہونے کی مہلت ہی نہی دی تھی اور وہ دونوں بڑی حویلی آ گئے تھے۔۔۔شام تک اطلاع پہنچ گئی تھی کہ نازو کی حالت نازک ہے اور اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے لیکن خود اسے ہاسپٹل لے جانا پڑا۔۔۔چوہدری شجاعت کی نیندیں حرام ہو گئیں۔۔۔انہیں بیٹے کی ہوش کیا ہوتی وہ بس نازو کی زندگی بچانے کی تگ و دو میں لگے تھے۔۔۔خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے قریبی ہسپتال کے ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا اور شہر لے جانے کا کہا تھا۔۔۔نومولود بیٹے کو چوہدری شجاعت نے بڑی بیگم کے حوالے کیا جسے انہوں نے نم آنکھوں سے سینے سے لگا لیا۔۔۔ایسا بھلا کب چاہا تھا انہوں نے۔۔۔نازو بھلے ان کی سوکن سہی لیکن وہ دل سے دعا گو تھیں کہ بچے سے اس کی ماں دور نا ہو۔۔۔شہر لے جانے میں مزید وقت برباد ہوا اور جب ڈاکٹروں کو کوئی امید نا رہی تو نازو کے اشارے پہ انہوں نے مایوس کھڑے چوہدری شجاعت کو اندر جانے کا کہا کہ مریض سے آخری ملاقات کر لیں۔۔۔چوہدری شجاعت لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے نازو کے سرہانے اس کا نحیف ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔۔۔

"مجھے معاف کر دے نازو۔۔۔میں تیرا خیال نہی رکھ سکا۔۔۔مجھے معاف کر دے۔۔۔!"

"آپ کیوں معافی مانگتے ہیں۔۔۔میرے سر کے سائیں ہیں آپ۔۔۔معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کہ میں آپ کی غیر موجودگی میں اپنا اور آپ کی اولاد کا خیال نہی رکھ سکی۔۔۔!"

وہ سانس کھینچ کھینچ کے بولتی چوہدری شجاعت کو رُلا گئی۔۔۔انہوں نے اس کا ہاتھ ماتھے سے لگایا اور کچھ خیال آنے پہ یکدم بولے۔۔۔

"نازو۔۔۔تُو گری کیسے۔۔۔بوریاں ایسے نہیں الٹ سکتی تھیں۔۔۔میں نے بڑی احتیاط سے رکھوائی تھیں۔۔۔سچ بتا نازو۔۔۔یہ حادثہ کیسے ہوا۔۔۔؟"

اور نازو کی بجھتے دیے جیسی آنکھوں میں وہ منظر لہرایا جب شہاب الدین نے بوریوں کو لڑھکایا تھا۔۔۔اس نے تو یونہی پلٹ کے دیکھا تھا لیکن اس دس سالہ بچے کی اس حرکت نے اسے اس قدر ششدر کیا کہ وہ ہوش و حواس کے ساتھ اپنا وجود بھی سنبھال نہی پائی تھی۔۔۔مگر اب ان باتوں کا فائدہ

نہی تھا۔۔۔وہ جان گئی تھی کہ اس کے پاس بس چند گھڑیاں ہیں ۔۔۔وہ باپ کے دل میں کم سن بیٹوں کے خلاف نفرت کا بیج بو کے نہی جا سکتی تھی۔۔۔

"مممم۔۔۔میرا پیر اچانک پھسل گیا۔۔۔اور بس سب ختم ہو گیا چوہدری صاب۔۔۔آپ میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔۔۔اس کی دیکھ بھال کرنا۔۔۔میں اس کے روپ میں آپ کے پاس رہوں گی۔۔۔مجھ سے راضی ہیں نا آپ۔۔۔؟"

نازو کی ڈوبتی نبض اور ٹوٹتی سانسیں چوہدری شجاعت کے ہاتھ پیر پھلانے لگیں۔۔۔وہ اٹھ کر ڈاکٹر کو بلانے لگے لیکن نازو نے ہاتھ کے دباؤ سے روک لیا۔۔۔

"ججج۔۔۔جواب دیں مجھے۔۔۔آپ راضی ہیں نا۔۔۔؟"

"میں تجھ سے راضی ہوں نازو۔۔۔میرا اللہ بھی راضی ہو۔۔۔مت جا مجھے چھوڑ کے۔۔۔!"

وہ بچوں کی طرح اس کے ٹھنڈے ہاتھ پہ پیشانی ٹکائے رونے لگے۔۔۔نازو کے حسین چہرے پہ مسکراہٹ سورج کی آخری کرن کی مانند ابھری اور ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔۔۔چوہدری شجاعت کے ہاتھوں میں اس کا بے جان ہاتھ رہ گیا۔۔۔نازو چلی گئی اور جاتے جاتے شہاب الدین اور مہتاب کا پردہ رکھ گئی۔۔۔چوہدری شجاعت دیوانے سے ہو گئے۔۔۔نازو انہیں بیٹا دے کے گئی تھی۔۔۔اپنی نشانی کے طور پر لیکن اس کی کمی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔ایک خلا تھا جو چوہدری شجاعت کے لیے پُر نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔زندگی میں آنے والا ہر شخص دل کی رہگزر سے گزرتا دل کا کچھ نا کچھ حصہ ساتھ ہی لے جاتا ہے پھر دل خالی خالی سا لگتا ہے ہر پوری خوشی بھی ادھوری لگتی ہے۔۔۔نازو سے ہوئے بیٹے کو بڑی بیگم کے حوالے کرنے کے بعد انہیں کتنے ہی دن اس کا ہوش نہی رہا۔۔۔بڑی بیگم نے ہی اس کا نام آفتاب رکھا۔۔۔اور اسے اپنی اولاد مان لیا۔۔۔دن رات ویسے ہی جاگ جاگ کے اس کی دیکھ بھال کرنے لگیں جیسے سگی اولاد ہو۔۔۔چوہدری شجاعت غم سے تھوڑا ابھلے تو انہوں نے حویلی کے معاملات کی جانب نگاہ کی تو احساس ہوا کہ اتنے دن سے نا وہ اس ننھی جان کی خبر گیری کر رہے تھے اور نا اس خاتون کی جس نے اس مشکل وقت میں بنا کسی کینے اور خار کے سوکن کی اولاد کو سینے سے لگایا تھا۔۔۔اگر اس وقت وہ ایسا

نا کرتیں تو وہ سوچ بھی نہی سکتے تھے کہ آفتاب کا کیا بنتا۔۔۔شہاب الدین اور مہتاب دونوں پہ نازو کی موت نے اثر چھوڑا تھا لیکن مہتاب کا حال سوا تھا۔۔۔شہاب الدین کا ارادہ نازو کو مارنے کا نہی تھا نا ہی اتنے سی عمر میں وہ اتنے بڑی تخریب کاری کر سکتا تھا۔۔۔اس کے ذہن نے بس یہ سوچا تھا کہ نازو سیڑھیوں سے گرے گی اور زخمی ہو جائے گی۔۔۔ہڈی پسلی ٹوٹے گی اور اس طرح اپنی ماں پہ سوکن بننے کا بدلے مل جائے گا۔۔۔لیکن اس کی موت کا اسے شائبہ تک نا تھا۔۔۔وہ جتنا بھی چالاک شاطر سہی تھا تو دس سالہ بچہ ہی جس کی سوچ بدلے کے تناظر میں بھی اسی حد تک محدود تھی کہ ہاتھ پیر توڑ دو اور کہانی ختم۔۔۔موت اور مار دینے جیسے افعال اس کی ذہنی سطح سے اوپر کی باتیں تھیں۔۔۔وہ اندر ہی اندر بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔۔۔اس نے ابھی تک باپ کا سامنا نہی کیا تھا مبادا نازو نے کچھ بتانا دیا ہو اور اس کا چہرہ دیکھ باپ کو یاد آجائے۔۔۔مہتاب اس سے کھچا کھچا سا تھا کہ اگر شہاب الدین کی حرکت کھل گئ تو وہ ساتھ نا دھر لیا جائے۔۔۔ان دونوں کو معلوم نہی تھا کہ مرنے والی کا ظرف بڑا تھا، ان دونوں کو معاف کر کے مری ہے۔۔۔چوہدری شجاعت چھوٹی حویلی گئے تھے اور کتنی دیر سیڑھیوں اور اس پہ بکھرے اناج کے دانوں کو دیکھتے رہے۔۔۔نگاہوں کے سامنے نازو کا سراپا لہرا جاتا جو نا جانے کس اذیت سے فرش پہ ڈھیر ہوا پڑا رہا تھا۔۔۔اس کا جما ہوا خون اب بھی موجود تھا۔۔۔دل کو قرار آتے آتے ہی آتا کیونکہ ان کا ذہن ماننے سے انکاری تھا کہ اناج کی بوریاں اپنے آپ سیڑھیوں پہ پلٹ گئیں۔۔۔انہوں نے چھوٹی حویلی کی صفائی کروا کے اسے بند کروا دیا۔۔۔وہ بڑی حویلی آگئے اور آفتاب پہ پوری توجہ دینے لگے۔۔۔شہاب الدین اور مہتاب نے جب دیکھا کہ باپ نے نا کوئی ہوچھ پڑتال کی ہے نا کوئی تفتیش تو مطمئین ہو گئے۔۔۔انہی یقین ہو گیا کہ نازو کچھ بھی بتا کے نہی گئ۔۔۔ایک بار پھر شہاب الدین نے گردن اکڑا کر اور سینہ تان کے حویلی میں منڈلانا شروع کر دیا۔۔۔آفتاب اپنی ماں جیسا شریف النفس اور صلح جو بچہ تھا۔۔۔بڑی چوہدرائین کا لاڈلا بھی تھا اس لیے شہاب الدین کو مزید زہر لگنے لگا تھا۔۔۔وہ شہاب الدین کی جانب ہمکتا بھی تو اسے پرے دھکیل دیتا اور اگر کوئی موجود نا ہوتا تو ہاتھ بھی جڑ دیتا۔۔۔وقت بیتتا گیا اور بچے بڑے ہوئے تو دلوں میں بچپن سے بیٹھی چپقلش زبانوں پہ سمانے لگی۔۔۔شہاب الدین کھل کر

آفتاب کے خلاف زہر اگلتا جبکہ مہتاب کو یہی کافی تھا کہ جب بن کہے اس کا کام ہو رہا ہے تو وہ بلاوجہ بول کے برا کیوں بنے۔۔۔آئے دن شہاب الدین زمینوں پہ جھگڑا کر کے آجاتا۔۔۔نا آفتاب کو کام کرنے دیتا نا خود سکون سے کچھ کرتا۔۔۔بڑی چوہدرائین اپنی اولاد کی رگ رگ پہچانتی تھیں اور آفتاب انہیں سگی اولاد سے بڑھ کر ہو چکا تھا۔۔۔وہ فطرتاً ہی ایسا تھا۔۔۔اس قدر ماں کا خیال رکھتا تھا کہ بڑی چوہدرائین کی آنکھیں اس کی محبت اور فرمانبرداری پہ بھیگ جایا کرتی تھیں۔۔۔وہ چوہدری شجاعت سے اٹھتے بیٹھتے ذکر کرنے لگی تھیں کہ بچوں کے نام ان کی زمینیں اپنی زندگی میں لگا دو۔۔۔کل کو ترکہ چھوڑا تو نا جانے کون کس کس کی حق تلفی کر جائے۔۔۔چوہدری شجاعت بھی اپنے دونوں بڑے بیٹوں کی آفتاب سے عداوت سے واقف تھے لہذا انہوں نے پورے انصاف سے تینوں بیٹوں کے نام زمینیں لگا دیں۔۔۔یہی وہ وقت تھا جب ایک رات آفتاب ماں باپ کے کمرے میں موجود ماں کے پیر دبا رہا تھا۔۔۔چوہدری شجاعت قریب ہی اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے سیف الملوک پڑھ رہے تھے۔۔۔وہ جانتے تھے ماں کے پیر دبانے کے بعد آفتاب ان کے پیروں کی تیل سے مالش کرے گا اور کندھے دبائے بنا نہی جائے گا۔۔۔اور اس کے اپنی طرف آنے سے پہلے وہ دو صفحے پڑھ لینا چاہتے تھے۔۔۔آفتاب نے نیم دراز آنکھیں بند کیے ماں کو دیکھا اور پھر کتاب میں منہمک باپ پہ نگاہ ڈالی اور ہمت مجتمع کرتا بولا۔۔۔

"اماں جی۔۔۔ابا جی۔۔۔!"

دونوں نے چونک کے ایک ساتھ آفتاب کی جانب دیکھا۔۔۔وہ ابھی بھی بنا رکے ماں کے پیر دبا رہا تھا۔۔۔بڑی چوہدرائین فوراً بولیں۔۔۔

"کیا ہے آفتاب۔۔۔کچھ چاہیے میرے پتر کو۔۔۔جھجھک کیوں رہا ہے۔۔۔؟؟؟"

"جھگڑا تو نہیں ہوا آج پھر زمینوں پر۔۔۔؟؟" چوہدری شجاعت نے نگاہ ترچھی کیے مشکوک لہجے میں پوچھا۔۔۔

"نہیں ابا جی۔۔۔ایسا کچھ نہی ہے۔۔۔وہ ایک بات کہنی تھی بس۔۔۔!" آفتاب رسان سے بولا

"تو کہہ نا پتر۔۔۔چھیتی کرنا۔۔۔ہول پڑتا ہے بڑھاپے میں۔۔۔!" بڑی چوہدرائین اٹھ کے

بیٹھتی ہوئی بولیں۔۔۔آفتاب مسکرادیا۔۔۔

"وہ اباجی۔۔۔مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی زمینیں ہم تینوں بھائیوں کے نام کرانے لگے ہیں۔۔۔؟"

"ہاں تو۔۔۔کیوں اعتراض ہے تجھے کوئی۔۔۔؟؟"

"نہیں اباجی۔۔۔اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے۔۔۔آپ کی مرضی ہے جو چاہیں کریں لیکن مجھے بس یہ کہنا تھا کہ اگر ایسا کر ہی رہیں ہیں تو آپا قدسیہ کا حصہ بھی ان کو دیں۔۔۔باپ کی جائیداد میں بیٹی کا بھی حصہ ہوتا ہے اباجی۔۔۔کل کو رب نے میری پکڑ کرلی کہ بہن کا حصہ کیوں کھاگئے تو کیا جواب دوں گا۔۔۔؟؟"

اور اس انداز میں بات کرنا آفتاب کا ہی خاصہ تھا۔۔۔وہ ماں باپ کے لیے اتنا باادب تھا کہ ان کی کوتاہی کو اپنا جرم بنا کے احساس دلا دیا کرتا تھا۔۔۔چوہدری شجاعت تھرااٹھے۔۔۔بڑی چوہدرائین بھی ٹھٹھک گئیں۔۔۔یہ خیال ان کے دماغ میں کیونکر نا آیا۔۔۔صدیوں سے بیٹیاں جائیدادوں سے حصے معاف کرتی آئی تھیں۔۔۔نا کوئی دیتا تھا نا بیٹیاں شرماشرمی مانگا کرتی تھیں۔۔۔اور یہ ریت برقرار تھی۔۔۔قدسیہ کی شادی ہوگئ۔۔۔حویلی کے پہلو میں اس کے لیے چھوٹی حویلی بنادی گئ تھی۔۔۔اس وقت تک حویلی اندر سے تین حصوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی اس لیے قدسیہ آپا کا گھر حویلی کے پائیں باغ کی جگہ تعمیر کیا گیا تھا بعد میں اسے بھی حویلی کے اندر لے لیا گیا۔۔۔داماد بھانجا تھا اور اسے کاروبار کرانے میں پوری مدد کی تھی چوہدری شجاعت نے۔۔۔اب جب زمین کی تقسیم کا معاملہ آیا تھا تو خود ان کے ذہن میں بھی کہیں بیٹی کا خیال نا آیا تھا اور اس وقت ہاتھ میں سیف الملوک پکڑے اس کی سیاہ جلد کو دیکھتے ان کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔۔۔بیٹے کو خوف تھا کہ رب پوچھ نا لے تو کیا انہوں نے بھلا دیا تھا۔۔۔؟؟؟ چوہدرائین کی آنکھیں برسنے لگیں تھیں اس خیال سے کہ کاش اس ہیرے نے ان کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا۔۔۔اگلے دن پو پھٹنے کے بعد یہ دہائی پورے پنڈ میں پڑ گئ تھی کہ چوہدری شجاعت اپنی بیٹی کو جائیداد میں سے حصہ دے رہے ہیں۔۔۔چونکہ اپنی زندگی میں مال تقسیم ہو رہا تھا لہٰذا

قدسیہ کو برابر کا حصہ ملنے جا رہا تھا۔۔۔ جیسے ہی یہ خبر شہاب الدین اور مہتاب کے کانوں میں پڑی وہ تن فن کرتے ڈیرے پہ پہنچے۔۔۔ چوہدری شجاعت چارپائی پہ گاؤ تکیے سے کہنی ٹکائے ٹانگیں اوپر کیے حقہ پی رہے تھے۔۔۔ دونوں بھائی باپ کے روبرو ہوئے۔۔۔

"اباجی نا کوئی مشورہ نا کوئی صلاح۔۔۔ بھلا کوئی دھیوں کو بھی زمین دیتا ہے۔۔۔ رواجوں رسموں کو بھول گئے ہیں کیا آپ۔۔۔؟"

شہاب الدین دھیمے لیکن غراتے لہجے میں مخاطب تھا۔۔۔ قریب آفتاب کھڑا تھا جسے اس کا انداز دیکھ کے طیش آیا تھا لیکن مٹھیاں بھینچ کے کھڑا رہا۔۔۔

"رسمیں اور رواج بھولا ہوں تبھی شریعت یاد آئی ہے۔۔۔ قدسیہ میری اولاد ہے اور میری جائیداد کی حصے دار۔۔۔ اور چونکہ میں ابھی مرا نہیں اس لیے اس کا حصہ برابر کا بنتا ہے۔۔۔ اور وہ اسے مل کے رہے گا۔۔۔!" وہ تحمل سے کش لیتے ہوئے بولے۔۔۔

"تو اباجی حویلی کس کھاتے میں بنوا دی۔۔۔ وہ نا دیتے نا۔۔۔ داج بھی دیا اور اب حصہ بھی۔۔۔!" مہتاب کی ناک پہ بھی اس وقت غصہ دھرا تھا۔۔۔

"تو کیا داج دینے سے حصہ مر جاتا ہے کم عقلو۔۔۔ انہی باتوں نے تو ستیاناس کیا ہے دماغوں نے۔۔۔ بیٹیوں کے حصے کھا کھا کے قبر میں جا پڑے پچھلے۔۔۔ اب دیتے ہوں گے حساب۔۔۔ مجھے بھی مرنا ہے اور میں رب کے حضور جواب دہ نہیں ہونا چاہتا اس معاملے میں۔۔۔ مزید تکرار نا سنوں اب میں۔۔۔!" چوہدری شجاعت ٹانگیں نیچے اتار کے سیدھے ہو بیٹھے۔۔۔ تنفس بھی تیز ہوا اور حقہ بھی پرے دھکیل دیا۔۔۔ آفتاب قریب ہو کے کندھے دبانے لگا۔۔۔ شہاب الدین نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سب کے پیچھے یہی ہے۔۔۔ اس کا بس چلتا تو کہیں زندہ گاڑ دیتا آفتاب کو۔۔۔ اسے اور مہتاب کو یہی ہضم کرنا مشکل تھا کہ یہ سوتیلا ان کی زمینوں میں حصے دار ہے اوپر سے قدسیہ آپا کا بھی حصہ بنا ڈالا تھا۔۔۔

"میں ایسا نہی ہونے دوں گا اباجی۔۔۔ مزاق ہے اتنی زمین عورت کے نام لگا دینا۔۔۔ آپ کی عمر

ہو گئی ہے اس لیے عقل کام نہیں کر رہی ورنہ سوچتے تو پتا چلتا کہ اپنے پتروں کے نام ساری زمین کرنے سے اس میں کتنا وادھا ہوتا ہے۔۔۔دھیوں کو دی تو سمجھو روڑھ دی۔۔۔گھاٹا ڈال دیا اباجی گھاٹا۔۔۔!"

شہاب الدین کی آواز اور انداز گستاخ ہوتے جا رہے تھے اور آفتاب کے لیے مزید برداشت ممکن نا رہی تو بول اٹھا۔۔۔

" بھا شہاب۔۔۔ذرا ہوش کرو۔۔۔اباجی ہیں ہمارے۔۔۔بدتمیزی نا کرو۔۔۔جو بہتر سمجھیں گے کریں گے وہ۔۔۔!"

" اوتو چپ کر۔۔۔" شہاب الدین، آفتاب کی جانب لپکا لیکن مہتاب نے بازو جکڑ لیا۔۔۔" سب جانتا ہوں کیا میسنیاں چلاتا رہتا ہے اباجی کے کان میں۔۔۔یہ سب آگ تیری لگائی ہوئی ہے۔۔۔اتنا ہی سگا بن رہا تھا تو اپنا حصہ چھوڑ دیتا نا۔۔۔بدنسلے۔۔۔!"

" بھاااا شہاب۔۔۔!!!!" آفتاب کی للکارتی آواز گونجی۔۔۔اس سے پہلے کہ بات بڑھتی چوہدری شجاعت اشتعال آمیز انداز میں کھڑے ہوئے اور غضبناک نظروں سے شہاب اور مہتاب کو دیکھتے ہوئے آفتاب سے بولے۔۔۔

" آفتاب۔۔۔پتر ذرا جا ادھر سے۔۔۔بلکہ گھر جا اور روٹی پانی کا کہہ کے آ۔۔۔ابھی پٹواری آنے والا ہو گا۔۔۔ساتھ چار بندے بھی ہونے۔۔۔جا سب کے کھانے کا کہہ کے آ۔۔۔!"

" جی اباجی۔۔۔" آفتاب بنا چوں چرا کیے وہاں سے چلا گیا۔۔۔آفتاب کے وہاں سے نکلتے ہی چوہدری شجاعت واپس چارپائی پہ بیٹھے لیکن اس بار ان کی آنکھوں میں چنگاریاں سی جل رہی تھیں اور وہ چنگاریاں شہاب الدین کو اپنے وجود پہ پڑتی محسوس ہوئیں۔۔۔

" جب ناز و مری تو تیری عمر کیا تھی شہاب۔۔۔؟؟؟"

وہ بولے تو ان کی آواز میں بے حد ٹھنڈک تھی جو شہاب اور مہتاب دونوں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی۔۔۔

" یہ کیسا سوال ہے اباجی۔۔۔اس عورت کو مرے عرصہ بیت گیا اب کیا قبر کھدوانی ہے۔۔۔؟"

شہاب الدین نے خود پہ قابو پاتے واپس اکڑ کر پوچھا۔۔۔

"یہ جس کو بدنسلا کہا ہے نا تُو نے۔۔۔اس کی ماں تھی وہ۔۔۔اور جس کو تم دونوں بھائیوں نے غیر ارادی قتل کیا تھا۔۔۔سمجھا۔۔۔!"

"یہ۔۔۔یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ اباجی۔۔۔" مہتاب فوری پریشان ہوا تھا۔۔۔"ہم نے کسی کا قتل نہی کیا تھا اباجی۔۔۔توبہ استغفار۔۔۔!"

"اچھااااا۔۔۔چلوووووو" چوہدری شجاعت نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔۔۔"قتل نہی کیا تھا سیڑھیوں سے دھکا دے دیا تھا۔۔۔بس اتنی سی بات تھی۔۔۔!"

"اباجی ہوا میں تیر نا چلائیں۔۔۔صاف صاف بات کریں۔۔۔!" شہاب الدین کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔۔۔وہ اپنے حواس کو حتی المقدور قابو رکھے ہوئے تھا۔۔۔

"بات کون سی ہو رہی تھی اور آپ کون سا کھاتا کھول کے بیٹھ گئے۔۔۔!"

"اس لیے کہ یہ کھاتا آفتاب نے کھول دیا تو تم دونوں بھائیوں کو کہیں پناہ نہی ملے گی۔۔۔اگر اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی ماں کو تم دونوں نے قتل کیا ہے تو وہ تم دونوں کو اپنی نسل دکھا دے گا۔۔۔!"

"اباجی۔۔۔بھا شہاب نے دھکا دیا تھا۔۔۔مجھے تو پتا بھی نہی تھا کہ بھا ایسا کچھ کرے گا۔۔۔میرا کوئی ہاتھ نہی۔۔۔میں بے قصور ہوں۔۔۔!" مہتاب ویسے ہی سدا کا ڈرپوک انسان تھا اس لیے فوراً سے اگل گیا۔۔۔شہاب الدین نے اسے کٹیلی نگاہوں سے دیکھا جیسے ابھی گردن دبا دے۔۔۔چوہدری شجاعت استہزائیہ ہنسے اور نفی میں سر ہلانے لگے۔۔۔

"سالوں سے یہ راز میرے سینے میں دفن ہے۔۔۔اور شائد ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔۔۔جس دن میں نے چھوٹی حویلی کو تالا ڈالا تھا اسی دن وہاں سیڑھیوں میں خالی بوری کے ساتھ تیری غلیل اٹکی دیکھی تھی شہاب۔۔۔جو بوری اٹھاتے وقت یقیناً تیرے ہاتھ میں تھی۔۔۔میں سمجھ گیا تھا کہ نازو کی موت کا سبب کیا ہے۔۔۔میں یہ سب پی گیا کیونکہ وہ بہشتن کسی کا نام لے کر نہی گئی تھی۔۔۔اور پھر میں کسی کو کیا کہتا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں نے ایک جان لے ڈالی ہے۔۔۔آفتاب ماں سے محروم ہوگیا تو صرف تم دونوں کی وجہ سے۔۔۔اور آج اسی کو بدنسلا کہہ کر دراصل خود کو بدنسل ثابت کر رہے ہو۔۔۔!"

شہاب الدین اور مہتاب ایکدم خاموش ہو گئے تھے۔۔۔مہتاب کی جلد بازی نے سارا کام خراب کر دیا تھا اس لیے اب صفائی دینے کا کوئی فائدہ نہی تھا۔۔۔اس دن شہاب الدین کے ہاتھ میں واقعی غلیل تھی اور وہ پتنگ بازی کرتے وقت غلیل ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا تاکہ دوسروں کی پتنگوں کا نشانہ لے سکے۔۔۔اس کا نشانہ بہت پکا تھا۔۔۔جس وقت ناز و سیڑھیاں اتر رہی تھی وہ غلیل ہاتھ میں لیے لیے ہی بوریوں کی طرف آیا تھا اور انہیں الٹاتے ہوئے بھی غلیل اس کے ہاتھ میں تھی جو بوری کے سوت کے ساتھ اٹک کے نکل گئی لیکن گھبراہٹ اور جوش میں اسے محسوس نہی ہوا تھا۔۔۔وہ دونوں چپ چاپ ڈیرے سے نکل آئے تھے۔۔۔چوہدری شجاعت کے پاس ان کا ایسا راز تھا جس سے پردہ ہٹتا تو وہ پورے پنڈ میں منہ دکھانے کے لائق نا رہتے۔۔۔چوہدری شجاعت باپ تھے ان کا بچپن جان کے چھوڑ دیا لیکن آفتاب کے کان میں بات پڑتی تو وہ اپنی ماں کا بدلہ لازمی لیتا۔۔۔اس لیے اس وقت خاموشی میں ہی بھلائی تھی۔۔۔قدسیہ آپا کو حصہ دینا اپنے حصے سے ہاتھ دھو لینے سے بہت بہتر تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

جس دشمنی کی بنیاد شروع سے شہاب الدین اور مہتاب نے ڈال دی تھی اسے کوئی نہی ہلا سکا۔۔۔اور آفتاب سے دشمنی اس کی پیدائش سے پہلے سے چل رہی تھی سو اسے اس کے بچوں کی پیدائش پہ بھی موقوف نہی کیا گیا۔۔۔چوہدری شجاعت نے اپنی زندگی میں تینوں کی شادیاں کی تھیں۔۔۔شادیاں ہو کر اولادیں ہو چکی تھیں لیکن دلوں میں آیا بال کبھی نا نکل سکا۔۔۔چوہدری شجاعت اور بڑی چوہدرائین دونوں کا انتقال ہو گیا۔۔۔وقت بدل گیا۔۔۔اولادیں بڑی ہو رہی تھیں اور کچھ ہو چکی تھیں۔۔۔چوہدری مہتاب بھی ایک کار ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔۔۔چوہدری شجاعت نے حویلی کو اندر سے تین حصوں میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ ہر ایک کا الگ الگ پورشن بن گیا تھا۔۔۔ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے بیرونی راستہ استعمال کرنا پڑتا تھا کیونکہ اندر سے سب کے رہائشی حصے بلکل الگ تھلگ تھے جن کو کوئی دروازہ یا راہداری نہی دی گئی تھی۔۔۔گو کہ چوہدری شجاعت چاہتے تھے کہ تینوں حویلیوں کو اندر سے راستہ دیا جائے تاکہ سب کو ایک دوسرے کی خبر رہے لیکن یہاں شہاب الدین نے ان کی ایک نہی چلنے دی تھی۔۔۔یوں بظاہر ایک ہی بڑی سی حویلی کے اندر چار چھوٹی حویلیاں تعمیر ہو گئیں۔۔۔شہاب الدین

کے اپنے بیٹے نا سہی لیکن تایا کی دشمنی کے بوئے بیج کو مہتاب کا بیٹا قاسم راؤ پانی دے رہا تھا۔۔۔وہ بالکل شہاب الدین کی طرح نفرت کرتا تھا آفتاب سے۔۔۔اور اسی بنا پہ حیات اور حسنات کی قاسم سے نہی بنتی تھی۔۔۔چوہدری شہاب الدین کے بیٹوں کو اپنے چاچا آفتاب سے پرخاش نا تھی۔۔۔وہ اسے پسند کرتے تھے اور درحقیقت انہوں نے آفتاب سے بہت کچھ دیکھا تھا۔۔۔حیات راؤ شروع سے فتنے فساد والی باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔۔۔کچھ شہر جا کے پڑھنا شروع ہوئے تو ذہن کو مزید وسعت ملی۔۔۔شہاب الدین کی بیگم سکینہ کا مزاج بھی کچھ ایسا تھا کہ نا وہ بے حد فریفتگی دکھاتی تھیں نا کسی سے عداوت پالتی تھیں۔۔۔صاف گو اور کھرا مزاج کی تھیں لیکن آفتاب کی چھوٹی بیٹی میں ان کی بھی جان بند تھی۔۔۔وہ اسے تکلیف دینے کی کسی کو بھی اجازت نہی دیتی تھیں۔۔۔کشور اور حیات راؤ کی نسبت بڑی چوہدرائین طے کر گئی تھیں۔۔۔شہاب الدین کو اس پہ بھی اعتراض تھا اور وہ ایسی کسی نسبت کو نہی مانتے تھے لیکن جب حیات راؤ چار سال ہوسٹل رہ کر واپس آئے تو کشور پہ اتفاقیہ نگاہ پڑ گئی اور دل نے جیسے ہر طرف سے نگاہیں بند کر لیں۔۔۔ایسا نہیں تھا کہ حیات راؤ ہوسٹل سے پنڈ نہیں آیا کرتا تھا۔۔۔وہ ہر جمعرات کی صبح پہنچ جایا کرتا تھا اور ہفتے کی صبح اس کی واپسی ہو جایا کرتی۔۔۔اس دوران کشور کبھی بھی ان کی حویلی میں پیر نہی دھرتی تھی۔۔۔نا کبھی حیات راؤ کا دل مچلا اسے دیکھنے کو۔۔۔اس کا سارا دھیان محض اپنی تعلیم مکمل کرنے پر رہا۔۔۔

اس دن بے حد گرمی تھی۔۔۔سورج کی چبھن تڑکے ہی جسموں میں سوراخ کرنے پہ تلی تھی۔۔۔کشور، رابی اور خانم مائی جی کے گھر سے واپسی کر رہی تھیں۔۔۔ابھی تک ان تینوں میں سنہری کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔۔۔اتنے سے راستے نے ہی تینوں کو پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔۔۔راستے میں کھال پھلانگتے ہوئے رابی کو شرارت سوجھی اور ایک ٹانگ اس میں گھسا دی۔۔۔

"اوئے ہوئے ستیاناس جائے۔۔۔ہو گئی میری شلوار غرق۔۔۔اب گھر واپس گئی نا ایسے تو اماں نے جوتیاں مارنی ہیں میرے سر پہ۔۔۔!" رابی نے دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں دائیں ٹانگ کا پائینچہ پکڑ رکھا تھا۔۔۔چہرے پہ مسکینیت طاری کیے وہ کشور کو دیکھ رہی تھی۔۔۔

"رابی بہت کمینی ہو۔۔۔جان کے کیا ہے نا تم نے۔۔۔؟" خانم نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔۔۔

"لو بھلا مجھے کیا قاسم نے کاٹا ہے جو جان کے کروں گی۔۔۔ غلطی سے ہوا ہے بھئی۔۔۔!"
اس نے بے حد سہل انداز میں قاسم راؤ پہ طنز کیا تھا۔۔۔ سبھی جانتے تھے دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔۔۔ کشور نے تادیبی انداز میں سر ہلایا۔۔۔
"مت بولا کرو ایسے۔۔۔ کسی دن چاچی کے کانوں میں تمہارا کوئی جملہ پڑ گیا تو کیا کرو گی۔۔۔ کچا چبا جائیں گی وہ۔۔۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا قاسم۔۔۔!" کشور ہمیشہ مصلحت کی راہ چنتی تھی۔۔۔
"ہاں۔۔۔ اماں اسی کے لیے تو کہتی ہیں ایک انڈا وہ بھی گندا۔۔۔!" وہ بھی رابی تھی۔۔۔ اسے کب کسی کا اثر ہوتا تھا۔۔۔
"اچھا اب بس کرو۔۔۔ کرنا کیا ہے وہ بکو۔۔۔!" خانم بیکار کی بحث سے جھنجھلا کے بولی۔۔۔
"کشور آپا کو کہو میری ٹانگ دھلوانے کے لیے کولہو کے سامنے والے ٹیوب ویل پہ لے چلے۔۔۔ ٹھنڈے ٹھار پانی سے دھو کے ہی مجھے ٹھنڈ پڑے گی۔۔۔!"
خانم جانتی تھی اس کا جواب یہی ہو گا۔۔۔ وہ خود بھی اندر سے یہی چاہتی تھی۔۔۔ ٹیوب ویل کے ٹھنڈے میٹھے پانی کا اتنی گرمی میں سوچ کے ہی تراوٹ سی اتر آئی۔۔۔
"پاگل ہوئی ہو۔۔۔ نا بابا نا۔۔۔ وہاں سے رستہ پکی سڑک تک جاتا ہے اور ادھر لاریاں گزرتی ہیں۔۔۔ خوامخواہ کسی نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں سمجھے گا۔۔۔!"
"ایویں اچھا نہی سمجھے گا۔۔۔ ہم کیا گئے گزرے گھروں سے ہیں۔۔۔ یا پورے پنڈ میں بدنام ہیں کیا۔۔۔ کوئی انگلی نہی کر سکتا آپا ہماری طرف۔۔۔!" رابی برا مان گئی تھی۔۔۔ وہ اپنے وقار اور عزت نفس کو لے کر ویسے بھی بے حد حساس تھی۔۔۔
"کہہ تو رابی ٹھیک رہی ہے آپا۔۔۔ آپ بلاوجہ فکریں نا پالا کریں۔۔۔!" خانم نے بھی رابی کی طرف داری کی تو کشور نے گھور کے دیکھا۔۔۔
"کون کہے گا تم دونوں چودہ سال کی ہو۔۔۔ اتنی لمبی لمبی زبانیں ہیں منہ میں۔۔۔ کل کو بیاہی جاؤ گی تو جوتے کھاؤ گی۔۔۔!"
دونوں کشور کی بات پہ ایک دوسرے کو دیکھتی ہنسی دبا گئیں۔۔۔ رابی نے آگے بڑھ کے کشور کا

بازو کھینچا۔۔۔

"ابھی تو چلو آپا۔۔۔واپسی پہ جوتے کھالیں گے۔۔۔!"

وہ تینوں ٹیوب ویل پہ چلی آئیں۔۔۔ہودی کی منڈیر پہ بیٹھ کے تینوں نے پیر پانی میں ڈال دیے تھے۔۔۔سارے جسم میں سرور کی لہر دوڑ گئی تھی۔۔۔ٹھنڈا یخ پانی اس جھلساتی گرمی کو مات دے رہا تھا۔۔۔ چاچا بخشو بھاگا آیا اور ہاتھ میں تھامی پوٹلی سے بڑے بڑے چار پانچ آم نکال کے پانی میں پھینکے۔۔۔

"او کڑیو۔۔۔ابھی ٹھنڈے ہو جائیں گے تو کھالینا۔۔۔تمہاری چاچی کو کہتا ہوں کچی لسی بنا کے رکھے۔۔۔سویرے کا ناشتہ ہو جائے گا۔۔۔!"

سادہ لوح لوگ تھے سادہ زمانے تھے۔۔۔پنڈ کی ہر بہو بیٹی اپنی ہوتی تھی۔۔۔یہ تینوں تو پھر حویلی کی بیٹیاں تھیں۔۔۔سبھی سلامیں کرتے تھے اور آؤ بھگت بھی۔۔۔چاچا بخشو واپس ہولیا۔۔۔رابی نے تیز دھار بہتے پانی سے اپنا پائنچہ دھویا اور اب تینوں تھوڑے تھوڑے ٹخنے ننگے کیے ٹھنڈے پانی کے مزے لے رہی تھیں۔۔۔دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا اس لیے کشور کو بھی بے فکری ہو گئی۔۔۔رابی اور خانم نے فوراً آم انگلیوں کی پوروں سے نرم کر کے کھانے شروع کر دیے تھے جبکہ یوں کھلے عام کچھ کھانا پینا کشور کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔۔۔ادھر ادھر کی باتوں میں کچھ ہی وقت گزرا تھا جب ان کی پشت پہ اچانک مردانہ آواز ابھری۔۔۔

"السلام وعلیکم۔۔۔!"

وہ تینوں ایک ساتھ گردن گھما گئیں۔۔۔اپنے پیچھے حیات راؤ کو کھڑا دیکھ کے کشور کے چہرے کی رنگت گلال ہوئی تھی۔۔۔کتنے عرصے بعد اتنے نزدیک سے دیکھا تھا اسے۔۔۔کسی کو خبر نہیں تھی کہ جس وقت حیات راؤ حویلی میں قدم رکھتا تھا اپنی چھت کے ایک بنیرے کی اوٹ سے دو کٹاری سی آنکھیں اسے نہارا کرتی تھیں۔۔۔جس کشور کو کبھی سامنا کرنے کی ہمت نا ہو سکی تھی وہ چھپ چھپ کے دیدار سے سیر ہوا کرتی تھی۔۔۔اور آج وہی دشمن جاں سامنے تھا۔۔۔اتنے قریب کہ اس کا ایک ایک نقش ازبر کر سکتی تھی پر نگاہیں اٹھانے کا یارا کب تھا۔۔۔لہلہاتے کھیتوں کے پس منظر میں کشور کا دہکتا اناری چہرہ حیات راؤ کو بے حد دل نشین لگا۔۔۔چند ثانیے جیسے وہ بھول گیا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔۔۔رابی کے کھانسنے کی آواز اس

کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ جیسے یکدم ہوش میں آیا۔۔۔

"سلام بھا۔۔۔کیسے ہیں۔۔۔مزاج کیسے ہیں۔۔۔دل کے حال کیسے ہیں۔۔۔؟" رابی نے لہکتے ہوئے سوال کم چھیڑ زیادہ تھا۔۔۔وہ سب کی منہ چڑھی تھی اور چھوٹے موٹے مذاق وہ آرام سے کیا کرتی تھی۔۔۔کچھ شہر سے اسی کی لائی کتابیں پڑھ پڑھ کے بھی اس کی زبان و بیان میں بے حد وسعت آئی تھی۔۔۔حیات راؤ مسکراہٹ دباتا قریب آیا اور کن اکھیوں سے کشور کے پانی میں ڈوبے خوبصورت سپید پاؤں اور برہنہ ٹخنوں کو دیکھا۔۔۔کشور فوراً سے پیشتر پانی سے پاؤں کھینچتی چپل پہنتی کھڑی ہو گئی۔۔۔حیات راؤ زیرلب مسکراتا خانم کی طرف متوجہ ہوا۔۔۔

"میری گڑیا کیسی ہے۔۔۔اور سکول کی بجائے یہاں کیا کر رہی ہو تم دونوں۔۔۔!"

"چھٹیاں ہو گئیں لالہ گرمیوں کی۔۔۔اور رابی کا پیر کھال میں جا پڑا تھا تو وہی دھونے یہاں چلی آئیں۔۔۔آپ کتنے دن کے لیے آئے ہیں بھا۔۔۔؟"

خانم اسے دیکھتے ہی ہودی سے باہر نکل آئی تھی۔۔۔اس کے بازو کے ساتھ جھولتے لاڈ سے پوچھا۔۔۔رابی بھی چپل پہن کر اس کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔جبکہ کشور چند قدم پیچھے تینوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔۔۔

"اس بار آیا تو دو دن کے لیے تھا لیکن ابھی ابھی تم لوگو کو یہاں دیکھ کر ارادہ بدل دیا ہے۔۔۔ سوچ رہا ہوں کہ ہفتہ رہ کے جاؤں۔۔۔!" نگاہ بے ساختہ کشور پہ پڑی۔۔۔

"کیوں بھا۔۔۔" رابی چہکی۔۔۔"سیر کروائیں گے کیا۔۔۔؟"

"مرمت کرواؤں گا۔۔۔تم دونوں کی جو یہاں بنا بتائے آ کے نا جانے کب سے بیٹھی ہوئی ہو۔۔۔!" ان کی امیدوں پہ پانی پھیرتا وہ ایک طرف ہوا اور ہاتھ پھیلا کے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔۔۔

"حیات بھا ویسے پہلی بار آئی ہیں ہم یہاں۔۔۔ہماری تو زندگی کتابیں پڑھ پڑھ کے کتاب جیسی ہو گئی ہے۔۔۔" رابی، خانم کا ہاتھ پکڑ کر آگے لگتے ہوئے مصنوعی یاسیت سے بولی اور پلٹ کے کشور کو دیکھا۔۔۔"یہ۔۔۔یہ اپنی کشور آپا کو ہوا لگائی ہے بھا تھوڑی سی۔۔۔سارا دن حویلی میں بند رہتی ہیں۔۔۔ سوچا تھوڑا سانس دلا لائیں ورنہ آپ کو ہی شکوہ ہوتا۔۔۔!"

آخری فقرہ آواز دبا کے کہا تھا جس نے خانم کی ہنسی نکال دی تھی۔۔۔کشور اس کی چلتی زبان سے خائف ہوتی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔۔۔حیات راؤ نے اس کے قدموں کے نشان دیکھے اس سے پہلے وہ آگے بڑھتا عقب سے بخشو چاچا کی آواز کان میں پڑی۔۔۔وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس تک آرہا تھا۔۔۔قریب پہنچ کے ہانپتے ہوئے سلام کیا۔۔۔حیات نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا جسے چاچا بخشو نے عقیدت سے تھاما۔۔۔

"کیسے ہو حیات پتر۔۔۔شہر میں سب خیری صلا ہے نا۔۔۔!!!"

"جی چاچا۔۔۔سب ٹھیک ہے۔۔۔آپ بتائیں سب خیر ہے۔۔۔کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔۔۔؟"

"پتر چوہدریوں کے ہوتے رب سوہنا کسی شے کی تھوڑ ہی نہیں ہونے دیتا۔۔۔شکر ہے اللہ سوہنے کا۔۔۔!"

چاچا بخشو عاجزی سے گویا ہوا۔۔۔حیات کو یکدم یاد آیا تو کہنے لگا۔۔۔

"اچھا چاچا۔۔۔آپ کے پوتے کا نویں کا کورس لے آیا ہوں۔۔۔شام میں حویلی چکر لگا لینا۔۔۔ساتھ اسے بھی لے آنا کچھ پوچھنا پاچھنا ہوا تو پوچھ لے گا۔۔۔!"

"لے آؤں گا۔۔۔لے آؤں گا۔۔۔" چاچا خوش ہو گیا۔۔۔"لمبی حیاتی پاؤ پتر۔۔۔رب سوہنا نیک ساتھ دے اور نیک اولاد سے نوازے۔۔۔کبھی کوئی دکھ نہ دیکھو۔۔۔!"

چاچا بخشو دعائیں دیتا واپس ہو لیا اور حیات راؤ نے پلٹ کے کچھ دور جاتی کشور کی پشت پہ دوپٹے کی اوٹ میں جھولتی لمبی چوٹی کو دیکھتے زیرِ لب "آمین" کہا تھا۔۔۔اور اپنے بیگ کو جھٹکا دے کر کندھے پہ دوبارہ سیٹ کرتا حویلی کی راہ ہو لیا تھا۔۔۔!

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

میرے جیسے بن جاؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے
دیواروں سے سر ٹکراؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا
ہر بات گوارا کر لو گے منت بھی اُتارا کر لو گے
تعویذیں بھی بندھواؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا
تنہائی کے جُھولے جُھولو گے ہر بات پرانی بھولو گے
آئینے سے تم گھبراؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا
جب سورج بھی کھو جائے گا اور چاند کہیں سو جائے گا
تُم بھی گھر دیر سے آؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا
بے چینی جب بڑھ جائے گی اور یاد کسی کی آئے گی
تم میری غزلیں گاؤ گے جب عشق تمہیں ہو جائے گا۔۔۔!

سعید راہی

یہ ایک نئی کالونی کے چھوٹے سے خوبصورت گھر کا سٹنگ ایریا تھا۔۔۔ایل شیپ صوفہ سیٹ کے سامنے دو خوبصورت لکڑی کی منقش کرسیاں رکھی تھیں، درمیان ایک چھوٹا سا گول میز تھا جس پہ کرسٹل کا واز پڑا تھا جس میں گلابی اور سفید پھول سجائے گئے تھے۔دائیں جانب دیوار پہ ایک ایل ای ڈی نصب تھی جس کے دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھڑکیاں تھیں جن پہ ہلکے گلابی اور گرے رنگ کے

پردے گرے تھے۔ایک کھڑکی کے آگے راکنگ چیئر پڑی تھی، وہیں دیوار کے ساتھ چھوٹی سی بک شیلف نصب تھی جس پہ چند ضخیم قسم کی کتابیں سجی تھیں۔گول سینٹرل ٹیبل کے نیچے چھوٹا سا گول رگ بچھا تھا۔فرش لکڑی کا تھا اور بے حد صاف شفاف تھا۔۔۔ہال کے دوسرے کونے پہ چار کرسیوں والا چھوٹا سا گول ڈائننگ ٹیبل تھا۔جس کے اوپر وسط میں کرسٹل کا نازک سا گلوب جھول رہا تھا۔اسی ڈائننگ ٹیبل کے عقب میں امریکن سٹائل کچن کا گلاس ڈور دکھائی دیتا تھا جہاں سے صاف ستھرے کچن کا نظارہ اچھا لگ رہا تھا۔ایک کل وقتی جوان ملازمہ شیلف پہ کٹنگ بورڈ رکھے سبزیاں کاٹ رہی تھی۔

فائزہ خاکوانی راکنگ چیئر پہ بیٹھی کتاب ہاتھ میں لیے موسیقی کے دھیمے سروں کے ساتھ کرسی پہ ہولے ہولے جھولتی پیشانی پہ انگنت شکنیں لیے بے چین سی صفحات پلٹ رہی تھیں۔تھک کے دیوار پہ نگاہ ڈالی جہاں گھڑی شام کے پانچ بجا رہی تھی۔انہوں نے بوجھل سی سانس خارج کی اور شیلف سے اپنا موبائل اٹھایا۔اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتیں، دروازے سے لائبہ اندر داخل ہوئی۔فائزہ خاکوانی نے موبائل واپس رکھا۔۔۔

"السلام وعلیکم ماما۔!" سلام کرتی وہ صوفے پہ ڈھیر ہوئی۔۔۔جوتے اتار کے ذرا دور اچھالے اور پاؤں اوپر کیے آنکھیں موند کے انہیں دبانے لگی۔۔۔فائزہ خاکوانی نے ناگواری سے اس کے جوتے دیکھے لیکن نظر انداز کر گئیں۔۔۔

"وقت دیکھا ہے تم نے۔۔۔؟ کدھر تھی تم۔موبائل تمہارا بند جا رہا تھا لائبہ۔بندہ ماں کو اتنا فالتو نا سمجھ لے کہ ایک فون کال کرتے ہاتھ دکھنے لگیں۔۔۔!"

ان کے انداز میں شکوہ تھا۔لائبہ آنکھیں کھول کے مسکرائی اور اٹھ کے ان کے پاس آ کے پُشت سے گلے میں باہیں ڈال کے گال پہ بوسہ دیا اور ٹھوڑی کندھے پہ ٹکا کے بولی۔۔۔

"باس حضور کے ساتھ سائٹ پہ جانا تھا۔اور آپ کو پتا ہے نا میرا باس اتنا کھڑوس ہے کہ کاش میں اسے دو لگا سکتی۔!"

"ایویں لگا سکتی۔۔۔!" فائزہ فوراً سے بولیں تو لائبہ کا قہقہہ سن کے ملازمہ نے بھی کچن سے لاؤنج

میں جھانکا اور لائبہ کو دیکھ کے تسلی کرتی واپس ہولی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ گھر ہوتی تو ایسے ہی اپنے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

" بڑا پٹ سے جواب آیا ہے ماما۔۔۔" وہ سامنے ہو کر ان کے گھٹنوں کے برابر بیٹھتی ہوئی بولی۔۔۔" اچھا کیا ہو جاے گا اگر دو لگا دوں گی۔۔۔ اور بتا رہی ہوں کسی دن لگا بھی دینے ہیں میں نے۔۔۔ روتا ہوا جاے گا اپنی اما۔۔۔ں!!!"

وہ کہتے کہتے اچانک ہی رکی تھی۔۔۔ فائزہ خاکوانی بھی چپ سی ہو کے اسے دیکھنے لگیں۔ ماحول بوجھل سا ہو گیا. لائبہ نے اپنا سر ماں کے گھٹنوں میں دے دیا۔۔۔ فائزہ نے دھیرے دھیرے اس کے ریشمی سیاہ بالوں کو سہلایا اور بولیں۔۔۔

" روتا ہوا جائے گا تو اس کی ماں کو تکلیف ہو گی نا۔۔۔!"

" تو اسے بڑا پتا چلے گا ماں کی تکلیف کا۔۔۔!" نروٹھا سا جواب آیا۔۔۔ فائزہ نے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔۔۔

" مت سوچا کرو اتنا۔۔۔ مت بھاگو سراب کے پیچھے۔۔۔ میں نے چھوڑ دیا تو تم بھی چھوڑ دو۔۔۔!"

" ہرگز نہیں۔۔۔ مر کے بھی نہیں۔۔۔!" ایک دم سر اٹھا کے وہ تھوڑے سخت لہجے میں بولی ساتھ ہی ماں کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے آنکھیں میچ کے دوبارہ کھولیں۔۔۔

" میں کیسے بھولوں ماما۔۔۔ جب ہمیں گولیوں سے چھلنی کیا جانے لگا تھا۔۔۔ جب ہمیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا۔۔۔ ہم سے ہمارا سب سے قیمتی خزانہ چھین لیا گیا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں مر سکتی ہوں لیکن بھول نہیں سکتی نا ہی اپنے باس کا پیچھا چھوڑنا والی ہوں میں۔۔۔!"

وہ رندھی آواز میں بولتی بچوں کی طرح ہاتھ کی ہشت سے ناک صاف کرتی ہوئی فائزہ کو ہنسنے پہ مجبور کر گئی۔۔۔

" گندی بچی۔۔۔ تمہاری تصویر کھینچنی چاہیے ایسے کرتے ہوئے۔۔۔ چلو اب چھوڑو فی الحال اس

موضوع کو۔۔۔کمرے میں جاؤ فریش ہو کے آؤ اور چائے پلاؤ مجھے اچھی سی۔۔۔تمہارے انتظار میں ابھی تک نہیں پی۔۔۔!"

لائبہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور ہینڈ بیگ ٹیبل سے اٹھا کے جانے لگی جب فائزہ خاکوانی کو یکدم کچھ پوچھنا یاد آیا۔۔۔

"لائبہ رکو۔۔۔!"

وہ پلٹ کے سوالیہ نظروں سے دیکھتی بیگ میں ہاتھ مار کر اپنا سیل ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔

"یہ لون کس خوشی میں لے رہی ہو کمپنی سے۔۔؟ منع کیا تھا میں نے بیٹا۔۔۔کیا کریں گے ان پیسوں کا ہم۔۔۔!"

فائزہ خاکوانی کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔۔۔لیکن لائبہ کو بھلا کہاں پرواہ تھی۔۔۔لہرا کے بیگ کندھے کی پشت پہ پھینکا اور آنکھیں گھماتی بولی۔۔۔

"جھومیں گے، پھریں گے، ناچیں گے، گائیں گے۔۔عیش کریں گے اور کیا۔۔۔!"

"تم جوتے کھاؤ گی مجھ سے اب۔۔۔کرواتی ہوں تمہیں عیش۔۔۔!" فائزہ اب کے واقعی جھک کے جوتی اتارتے ہوئے بولیں تو لائبہ چھت پھاڑ قہقہہ لگاتی وہاں سے رفوچکر ہو گئی۔۔۔

"باز آجاؤ۔۔۔ پہلے بھی بیکار میں لیا تھا لون تم نے۔۔۔اب کی بار میں نہیں لینے دوں گی سمجھی۔۔۔دیکھتی ہوں کیسے لیتی ہو تم۔۔۔!"

اپنے پیچھے اس نے ماں کی آواز سنی تھی اور شانے اچکاتے بالوں سے کیچر کھینچ نکالا تھا۔۔۔

"لون تو بس چھلکا ہے ماں میری۔۔۔گودا تو ابھی میں نے نکالا ہی نہیں۔۔۔دیکھتی جائیں۔۔۔ لائبہ نے عرصہ ہوا اپنے حق کی جنگ شروع کر دی ہوئی ہے اور اب وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔۔۔!"

☆......☆......☆

لاؤنج میں سکون و امن کا راج تھا۔۔۔سب کے ایگزامز سر پہ تھے تو سبھی اپنی اپنی کتابوں اور اسائنمنٹس میں منہ دیے پڑھ کم اور ہل زیادہ رہے تھے۔۔۔یاور اور داور کی مکمل بات چیت بند تھی کیونکہ

شہریار نے داور کے کانوں میں خوب زہر انڈیلا تھا کہ یاور اس کے علم میں لائے بنا اپنے دوستوں کے ساتھ گلچھڑے اڑاتا ہے اور اس صدمے نے داور کی زبان و بیان سب چھین لیا تھا۔۔۔دونوں میں ہر طرح کے سماجی، سیاسی اور معاشی روابط منقطع تھے۔۔۔زارون ویسے ہی طفیلی تھا۔۔۔وہ ان دونوں کے ساتھ ہی نتھی تھا۔۔۔اب جب وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہو رہے تھے تو وہ مجبوراً ہر تھوڑی دیر کے بعد شہریار کا سر کھاتا تھا۔۔۔شہریار کچن سے چائے کا بڑا سا مگ لیے وہاں داخل ہوا اور مسکراتی نگاہوں سے داور اور یاور کے مخالف سمتوں میں گھومے ہوئے چہرے دیکھے۔۔۔ چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کے اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے دوبارہ آ بیٹھا۔۔۔دونوں کو اس طرح دیکھ کے یک گونہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔۔۔اس رات جب شہریار نانی پیاری کے کمرے سے نکلا تھا تو باہر پھیلے مکمل اندھیرے کو دیکھتے ایک بار دل کیا واپس نانی کے پاس جا کے سو جائے لیکن نانی نے تو ابھی اسے زبانی دھکے مار کے نکالا تھا، واپس جاتا تو جوتا پکڑ لیتیں۔۔۔اللہ کا نام لیتا آگے بڑھا اور جو ٹرائفل کا خالی باؤل دیوار کے ساتھ رکھ کے گیا تھا اسی پہ پیر جا پڑا۔۔۔شیشے کے باؤل کا باریک سا شور جیسے دل کی رگیں کھینچ گیا۔۔۔شہریار کو دانتوں پسینہ آنے لگا۔۔۔شور کی آواز کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا" یا اللہ ایک بار کمرے میں پہنچا دے بس۔۔۔اس کے بعد دوبارہ کبھی آدھی رات کو کمرے سے باہر نظر آؤں تو بھلے سے کوئی چڑیل عاشق ہو جائے اف نہ کروں گا۔۔۔بس یہ آخری بار۔۔۔!" وہ بڑبڑاتا ہوا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا تھا جب اچانک سے سیڑھیوں کے نیچے سے یاور چادر کی بکل مارے نمودار ہوا۔۔۔شہریار کی بے ساختہ چیخ نکل گئی۔۔۔ایک اندھیرا ہی تو کم بخت مارتا تھا ورنہ شہریار کو کون ستا سکتا تھا۔۔۔اس کی چیخ نکلی اور بوکھلاہٹ میں پیر سے چپل اتار کے چادر میں لپٹے یاور کو دے ماری۔۔۔یاور چلایا۔۔۔چپل یاور کے سر کو لگتی اڑتی ہوئی پیچھے پڑے کارنر لیمپ کو جا لگی۔۔۔ جھٹکے کے ساتھ لیمپ نیچے اور چھناکے کے ساتھ اس کا بلب پھوٹ گیا۔۔۔دونوں دوبارہ چلا اٹھے۔۔۔ سب سے پہلے مہریار کے کمرے کی لائٹ جلی تھی اور پھر نانی پیاری کے۔۔۔بس کچھ ہی دیر میں سب یہاں مرثیہ پڑھنے موجود ہوتے۔۔۔یاور چادر سے منہ نکالتا بولا۔۔۔

"لو پہنچنے لگا ہے جلاد۔۔۔نا اتنا گلا پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی شہری بھیا۔۔۔اب دبوالینا مہر لالہ سے۔۔۔میں تو چلا۔۔۔!"

"تو تجھے آدھی رات کو کس نے کہا تھا یہاں چھلیٹا بن کے دبکنے کو۔۔۔میرا دل بند ہو جاتا تو میرے ہونے والے بچے یتیم ہو جاتے۔۔۔آہ لگتی تجھے کمبخت ان کی آہ۔۔۔!"

"واہ۔۔۔" یاور نے چادر کو ساڑی کے انداز میں بغل سے نکال کے کندھے سے گزارا۔۔۔" میں ان کا چاچا ہوں۔۔۔کفالت کرتا ان کی۔۔۔وہ مجھے ہی اپنا باپ سمجھتے۔۔۔!"

"ادھر رک تجھے باپ بناتا ہوں میں۔۔۔" شہریار اس پہ جھپٹا لیکن وہ جھکائی دے کے سیڑھیاں چڑھ گیا۔۔۔جاتے جاتے اسے بولا" پیچھے جہاں پناہ اپنی تلوار لیے آپ کی گردن مارنے آ پہنچے ہیں۔۔۔ان سے بچ کے اوپر پہنچ گئے تو مجھے سننا ہے کہ نانی پیاری کے کمرے سے دو گھنٹے بعد کون سی داستان سن کے نکلے ہو۔۔۔!"

بقایا شہریار تھا اور مہریار کی صلواتیں۔۔۔نانی پیاری کے فضیحتے۔۔۔وہ یکسر بھول گئی تھیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ دو گھنٹے مسلسل ان کے پیر دبا کے نکلا تھا۔۔۔اور دن چڑھتے ہی شہریار نے داور کو یاور کی کارگزاری گوش گزار کر دی تھی جیسے انتہائی بدتمیز اور نالائق بچے کی رپورٹ اس کے والدین کو دی جاتی ہے۔۔۔داور نے جواباً سخت گیر باپ جیسی تیوریاں چڑھا کے یاور کو دیکھا تھا اور پھر اس پہ پل پڑا تھا۔۔۔زارون نے بلاوجہ دونوں کے بیچ آ کے دو مکے کھانے کا شرف حاصل کیا تھا۔۔۔تب سے ان دونوں کی بات چیت مکمل بند تھی۔۔۔پیغام رسانی کا واحد ذریعہ زارون تھا۔۔۔زارون کو مزہ آ رہا تھا ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے میں کیونکہ وہ ابتدائی اور اختتامی الفاظ پاس سے لگاتا تھا۔۔۔شہریار نے کمینی مسکراہٹ لیے یاور کو بغور دیکھا تھا جو اسے ہی پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے چیر رہا تھا۔۔۔شہریار کو ہنسی آ گئی۔۔۔منہ میں چائے کا گھونٹ تھا کچھ پھوار کی صورت باہر نکلا اور کچھ کو وہ بمشکل نگلنے میں کامیاب ہوا۔۔۔جو باہر آیا تھا وہ لیپ ٹاپ کی سکرین پہ پڑا تھا۔۔۔شہریار کی صدمے سے آنکھیں باہر آنے والی ہو گئیں۔۔۔فوراً مگ کو بے دھیانی میں لیپ ٹاپ کے ساتھ ہی رکھتے وہ زور سے چلایا۔۔۔

"ٹشو پیپر دے مردود کوئی۔۔۔جلدی کرو گے۔۔۔!"

جواباً سب ادھ مرے سے پڑے رہے۔۔۔ یاور تو مر کے بھی نا دیتا۔۔۔ داور بھی یاور سے ناراض تھا تو سمجھو پورے جگ سے ناراض تھا۔۔۔ باقی بچا زارون تو وہ اپنا کالر کھڑا کرتا اسٹائل سے اٹھا۔۔۔

"کس کا ہے یہ تم کو انتظار میں ہوں نا۔۔۔ دیکھ لو ادھر بھی ایک بار میں ہوں نا۔۔۔!"

"زارون ٹشو دے ورنہ آج تجھے اچھی طرح بتا دوں گا کہ میں ہوں نا۔۔۔!"

"لا رہا ہوں لا رہا ہوں۔۔۔ تم بھلے میری قدر نا کرو لیکن میں کبھی یاروں کو پیٹھ نہیں دکھاتا۔۔۔!"

ٹشو کا ڈبہ کارنس پہ پڑا تھا اور زارون بنا عینک کے وہاں تک جا رہا تھا۔۔۔ آنکھیں مسلسل سکو سمٹ رہی تھیں۔۔۔ شہریار دھاڑا۔۔۔

"زارون تجھے عینک کے ساتھ پورا دکھائی نہی دیتا بنا عینک کے تو تو فٹ پاتھ پہ بٹھایا جا سکتا ہے۔۔۔!"

"ہیں۔۔۔!" زارون وہیں رک کے اچنبھے سے بولا۔۔۔ "وہ کس لیے بھلا۔۔۔!"

"بھیک مانگنے کے لیے۔۔۔ بھکاری۔۔۔!" شہریار کے جواب نے زارون کو غیرت بھرا غصہ دلا دیا تھا۔۔۔ اس نے شہریار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے انداز ے سے ٹشو باکس ٹٹولا اور بنا پلک بھی جھپکے ٹشو نکالا۔۔۔ نظریں ہنوز شہریار پہ تھیں۔۔۔

"او آجا میرے باپ۔۔۔ اتنے میں تو انڈے میں سے چوزہ نکل آتا ہے زارون۔۔۔!"

زارون ٹھٹک کے رکا اور پوچھا۔۔۔

"تو تم نے ٹائمنگ پاس بیٹھ کے چیک کی تھی۔۔۔ واہ تم میرے گرو بن جاؤ شہری۔۔۔!"

زارون نے قریب آ کے ٹشو پیپر پکڑایا۔۔۔

"اتنا نہی کیا پورا باکس پکڑ لاؤ۔۔۔!"

زارون واپس ہوا اور ٹشو باکس اٹھایا اور وہیں سے کھینچ کے شہریار کو دے مارا۔۔۔ شہریار جو سکرین پہ پڑے معمولی چھینٹے پورے انہماک سے صاف کر رہا تھا ٹشو باکس دیکھ نہی سکا۔۔۔ نتیجتاً وہ چائے کے مگ کو ٹکرایا اور مگ لیپ ٹاپ پہ لیٹ گیا۔۔۔ صدمے اور رنج کے زیر اثر شہریار جام ہو چکا تھا

ورنہ مگ میں بچے آخری دو گھونٹ ہی کی پیڈ میں جانے سے روک لیتا۔۔۔ پر ہونی ہو کے رہی۔۔۔ ساری چائے پیا سا لیپ ٹاپ چوس چکا تھا اور جواباً زوردار ڈکار لیتا ایک جھماکے سے بند ہوا تھا۔۔۔ اس منظر کو رضا کارانہ طور پر یاور اور داور دونوں نے نیم رخ سے ملاحظہ کیا تھا اور اب جب شہریار کا لیپ ٹاپ ہچکیاں لیتا بند ہو گیا تھا تو یاور نے سامنے پڑے نوٹس پورے جوش میں اڑائے اور کھڑا ہوتا سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔۔۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔ یہ ہے قدرت کا انصاف۔۔۔ شہری بھیا آپ کو کیا لگا تھا کہ میری داور سے چغلی کر کے آپ بچ جائیں گے۔۔۔ نہی بھیا نہی۔۔۔ آپ کو حساب دینا ہی تھا۔۔۔ ابھی تو لیپ ٹاپ ہی فوت ہوا ہے آپ کا۔۔۔ کیسا محسوس کریں گے جب آپ کو پتا لگے گا کہ رات کو استری کرتے وقت فجلو نے آپ کی جیکٹ جلا دی ہے۔۔۔ اور آپ کا بارہ ہزار والا پرفیوم جو الماری کے پچھلے کونے پہ پڑا رہتا ہے وہ خان نے باہر لان کے پودوں پہ چھڑک دیا ہے اور آپ کے موبائل کا چارجر بھی صبح پٹاخہ مار گیا تھا۔۔۔ مہر لالہ نے جس ساکٹ میں کرنٹ ہونے کی وجہ سے استعمال سے منع کیا ہوا ہے اسی میں لگا دیا۔۔۔ بس ایک گناہ شہری بھیا ایک گناہ۔۔۔ دیکھیں کیا کیا نہی ہو گیا آپ کے ساتھ۔۔۔!"

یہ ساری تقریر پورے ولولے اور جوش سے کرنے کے بعد یاور صوفے پہ ڈھیلا ہو بیٹھا۔۔۔ سانس پھول رہا تھا اور وہ فاتحانہ نگاہوں سے گنگ بیٹھے شہریار کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ داور اور زارون البتہ ہونق سے یاور کی کارکردگی سن رہے تھے اب جب وہ خاموش ہوا تو پہلی بار تھا داور اور زارون نے اس کے لیے سپاٹ تاثرات کے ساتھ سلوموشن تالی بجائی۔۔۔

"بس بس۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ یہ سب تو یاور بابا کے دماغ کے چھوٹے موٹے چٹکلے ہیں۔۔۔ یہ تالیاں کسی اور وقت کے لیے سنبھال رکھو۔۔۔!"

"کسی اور وقت کے لیے ضرورت ہی نہی پڑے گی یاور جانو۔۔۔ کیونکہ تم زندہ ہی نہی بچو گے۔۔۔!"

زارون ہنوز انہی تاثرات کی لپیٹ میں تھا۔۔۔ داور صوفے کی بازو پہ جھکا دونوں ٹانگیں صوفے پہ کیے گھٹنوں کے بل بیٹھا اپنے ہم پیدائش کی صورت نہار رہا تھا۔۔۔ یاور نے چڑ کے دونوں کو اشارتاً کہا۔۔۔

"کیا۔۔۔!ہاں کیا۔۔۔!"

اندر اندر اسے ابھی تک شہریار کے کسی طرح کے ردعمل نہ دینے کی فکر بھی ستانے لگی تھی۔۔۔

"اب اگر شہری بھیا کا ارادہ ہے کہ میں ان سے معافی مانگوں تو۔۔۔ تو۔۔۔!"

"سسس۔۔۔!" شہریار کی دھاڑ نے سب کی سٹی گم کر دی۔۔۔ یاور نے بھی تھوک نگل کے گلا تر کیا تھا۔۔۔

"تُو نے مجھے بہت ہلکے میں لے لیا یاور۔۔۔ بہت ہلکے میں۔۔۔"

زارون دونوں ٹانگیں اوپر چڑھائے شہریار کو ایسے انہماک سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی مووی کا سین ہو۔۔۔

"کہا تھا نا شہری سے پنگا نہیں چنگا۔۔۔ اب سن اوئے۔۔۔" شہریار زوردار بھڑک مار کے کھڑا ہو گیا۔۔۔

اوئے ے ے۔۔۔" زارون اور داور کے منہ سے بیک وقت نکلا۔۔۔

"شہری کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔۔۔ استری سے میری نہی تمہاری جیکٹ جلی ہے بیٹا ذرا جا کے چیک کر لیجیو۔۔۔ فجلو سے کہا تھا باکس روم سے نکال لائے وہاں میری نہی تمہاری پڑی تھی اسی کو ساڑھ کے سواہ کر دیا فجلو ڈارلنگ نے۔۔۔ پرفیوم میرا نہیں تھا اتفاق سے وہ بھی تمہارا ہی تھا وہی والا جو ابا پچھلی بار تمہیں دلا کے گئے تھے۔۔۔ میرے جگر تمہیں یاد ہو گا پچھلے ہفتے تم فیئر ویل کے لیے اپنا سارا سامان لے کے میرے کمرے میں ٹپک پڑے تھے تیار ہونے کے لیے تو تبھی یہ پرفیوم میرے روم میں ہی چھوڑ گئے تھے۔۔۔ میں نے الماری میں سنبھال لیا وہ بھی جراب چڑھا کے۔۔۔ تمہیں لگا تمہارے سوپر انٹیلیجینٹ بھائی نے اپنا پرفیوم موزے میں ڈال رکھا ہے اور بنا تحقیق تم خان کو تھما آئے اور اب میرا نہی تمہارا پرفیوم پودوں پہ مہک رہا ہے۔۔۔!"

جوں جوں شہری بولتا جا رہا تھا یاور اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ زارون کو میٹھی میٹھی سی ہنسی آ رہی تھی جسے دبانے کی وہ معمولی سی کوشش بھی نہی کر رہا تھا۔۔۔

"اب باقی بچا وہ چارجر تو دل جگر جانی وہ میرا نہی مہر لالہ کا ہے۔۔۔میرا تو کئی دن سے خراب ہوا پڑا ہے چارج کرنے کے لیے مہر لالہ کا لیا تھا لیکن وہ بھی تم نے اڑا دیا۔۔۔اب خود اڑنے کو تیار ہو جاؤ۔۔۔ہونہہ آیا بڑا۔۔۔شہری کو تڑیاں دینے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے۔۔۔!"

دارکو یاور کی حالت دیکھ کے ترس آ گیا۔۔۔لڑے تو وہ لڑے، مارے تو وہ مارے نقصان کرے تو وہ کرے۔۔۔کسی اور کو حق نہیں تھا کہ یاور کو کچھ کہہ جاتا۔۔۔داور اپنی جگہ سے اٹھا اور یاور کے ساتھ کھڑے ہو کے اپنا بازو اس کے کندھے پہ پھیلا یا۔۔۔

"شہری بھیا یہ آپ نے ٹھیک نہی کیا۔۔۔یاور کا وہ پرفیوم آپ کو مجھے دینا چاہیے تھا نا کہ خود رکھ لیتے اور وہ جیکٹ بھی یاور نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مجھے دے دے گا۔۔۔اور وہ چارجر۔۔۔چلیں اس کی خیر ہے اس کا میں نے کیا کرنا تھا۔۔۔!"

شہری اور یاور دونوں آمنے سامنے ایک دوسرے کو نگاہوں کا ہدف بنائے کھڑے تھے۔۔۔جبکہ زارون شہری کی سائیڈ پہ اور داور، یاور کے پہلو میں بطور کمک موجود تھے۔۔۔

"لو بھلا۔۔۔چارجر، چارجر ہوتا ہے چاہے خراب ہو یا ٹھیک۔۔۔!" زارون نے عینک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے لقمہ دیا۔۔۔

"اچھا تو پھر اپنی ناسوں میں ٹُن لو۔۔۔!" داور چمک کے بولا۔

"اچھا ایک منٹ رکو۔۔۔میں اپنی عینک اتار لوں۔۔۔!"

زارون نے عینک اتار کے سینٹرل ٹیبل پہ رکھی۔۔۔اصل بات یہ تھی کہ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جنگ چھڑنے والی ہے اور ہر بار کی طرح سب سے پہلی شہادت اس کی عینک کے حصے میں آئے گی۔۔۔ شہریار اور یاور دو دو قدم آگے بڑھتے فاصلہ گھٹانے لگے۔۔۔زارون نے آنکھیں مل کے باکسنگ کے اسٹائل میں پوزیشن سنبھال لی اور دوسری طرف داور نے بھی ویسے ہی انداز میں خود کو تیار کر لیا۔۔۔شہریار نے تھوڑا آگے کو جھک کے یاور کو آنکھ ماری۔۔۔جواباً یاور نے بھی مکے لہراتے ہوئے شہریار کو اشارہ دیا۔۔۔

"آج یا تم دونوں بچو گے یا ہم دونوں۔۔۔!" شہریار نے سامنے والی ٹیم کو دھمکایا اور زارون کو

کندھا مار کے ہوشیار کیا۔۔۔ زارون نے تھوک نگل کے خود کو بیک اپ کیا۔۔۔

" دیکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کے سپاہی میں کتنا دم ہے شہری بھیا۔۔۔ آپ کے سپاہی کے لیے تو داور کا ایک ہاتھ ہی کافی ہے۔۔۔!" یاور نے داور کو کمر سے دھکیل کے آگے کیا اور پشت تھپکی۔۔۔

" دیکھ لیتے ہیں کس میں کتنا ہے دم۔۔۔ اگر داور نے زارون کو پچھاڑ دیا تو تم اگلا پورا ہفتہ بائیک کالج لے کے نہیں جاؤ گے بلکہ مہر لالہ کے ساتھ جاؤ گے اور بائیک رہے گی میرے پاس۔۔۔!"

" اور اگر زارون نے داور کو پچھاڑ دیا تو۔۔۔؟" یاور نے جانچتی نگاہیں گاڑ کے پوچھا۔۔۔

" تو زارون کے پاس رہے گی پورا ہفتہ بائیک۔۔۔ دیٹس اٹ۔۔۔!" شہریار نے کہہ کے بات ختم کی اور دھیان ان دونوں کی جانب کروایا مبادا یاور کا دماغ نا چل نکلے کہ زارون کے پاس بائیک ہونے کا مطلب شہریار کے پاس بائیک ہونا ہی ہے۔۔۔

" اوکے ڈن۔۔۔ اس کو تو پھونک سے اڑا دے گا میرا داور۔۔۔ چل جگر۔۔۔ جان لڑا دے۔۔۔!"

اور اب لاؤنج کے بیچوں بیچ داور اور زارون آمنے سامنے تھے۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکینی بھری نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ لڑ لو گے۔۔۔؟ شہریار اور یاور کی مسلسل حوصلہ دلاتی چیخ پکار کی وجہ سے ان دونوں کو بلآخر ایک دوسرے کی گردن پکڑنی ہی پڑی۔۔۔ یاور نے اسے کندھے پہ لادنے والے انداز میں اٹھا کے دوبارہ فلور کشنز پہ پٹخا تو زارون کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔۔۔

" کمینے انسان اتنی زور سے۔۔۔ اشارہ بھی کیا تھا کہ ہاتھ ہلکا رکھنا۔۔۔ اب دیکھو یہ زارون تمہاری ہڈی پسلی کو ماس بوٹی سے الگ کر کے دم لے گا۔۔۔!"

زارون جوش میں کہتا اس پہ چھپٹا تو سہی لیکن برا ہو عینک کا جو وہ اتارے ہوئے تھا اس لیے جس کو داور سمجھ کے دبوچنا چاہا تھا وہ داور کا عکس تھا اور اس کی وجہ سے زارون بابا دوبارہ فرش چاٹنے پہ مجبور ہو چکے تھے۔۔۔ داور نے نیچے بیٹھ کے زارون کی ٹانگ گھٹنے تک موڑی اور اسے دباؤ دیا تو زارون چلاتے ہوئے منمنایا۔۔۔

" داور ڈیل کرلو۔۔۔ماما نے جو آئی پیڈ بھیجا تھا وہ پورے تین دن کے لیے دوں گا استعمال کرنے کے لیے۔۔۔بس میری عزت رکھ لو۔۔۔ویسے بھی میں تمہاری پھوپھو کا بیٹا ہوں۔۔۔لحاظ بنتا ہے۔۔۔!"

" اگر تمہارا لحاظ کیا تو میرا جہاز بنا کے اڑا دیں گے یہ دونوں۔۔۔اس لیے اب تم چت پڑے رہو۔۔تمہاری تون (گردن) میرے گوڈے کے نیچے آچکی ہے۔۔۔!"

" پکڑا تم نے میرا گوڈا ہوا ہے۔۔۔میرا چرن تمہارا منہ چھونے کے قریب ہے اب شرافت سے مان جاتے تو اچھا تھا۔۔۔زاورن کو ہمیشہ ہلکے میں لیتے ہو تم لوگ۔۔۔جبکہ میرا ویٹ پینسٹھ کلو سے اوپر ہے۔۔۔اب جو میں پینترا دوں گا اس کو سہہ لینا پھر۔۔۔!"

" پہلے میرے پینترے سے تو نکل بیٹا۔۔۔دیکھو داور کا پاور۔۔۔!" کہہ کر ساتھ ہی داور نے اس کا گھٹنا مزید کمر سے لگایا تو وہ چلا کے بولا۔۔۔

" ایک بار نکال دے مجھے نیچے سے۔۔۔ایک بار۔۔۔دیکھ بھائی نہی۔۔۔ایک منٹ سیدھا ہونے دے۔۔۔میرا اکڑا کا پھنس گیا ہے۔۔۔چھوڑ دے داور!" وہ منتوں پہ اتر آیا تھا۔۔۔دونوں زور آزمائی کر رہے تھے جبکہ ان دونوں کو لڑوا کے پیچھے بڑے صوفے پہ شہریار اور یاور سکون سے چپس کا پیکٹ کھول کے کچر کچر کھا رہے تھے۔۔۔

" اب سارا دن پار ہو جانا ہے ان کا اس لڑائی میں۔۔۔!" شہریار منہ چلاتے ہوئے پُرشوق نگاہوں سے ان دونوں کو گتھم گتھا دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔یاور نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔۔۔

" جا شہزادے ذرا کوک تو لا۔۔۔!" شہریار کہنی سے ٹہوکتے ہوئے بولا۔۔۔

" فجلو کو آواز دے لو بھیا۔۔۔!" یاور بھی اس منظر کو دیکھنے اور چپس کھانے میں منہمک تھا۔۔۔کہاں اٹھتا بھلا۔۔۔

" فجلو نانی پیاری کے ساتھ مارکیٹ گیا ہے سبزی لینے۔۔۔جا لے کر آ۔۔" شہریار کا لہجہ تپش آمیز تھا۔۔۔

" آپ خود لے آؤ نا۔۔۔میرے لیے بڑا والا گلاس۔۔۔جاؤ شاباش۔۔۔جلدی ذرا۔۔۔!" یاور

نے اسے پچکارا اور شہریار نے چپس کا پیکٹ ٹیبل پہ پٹخ دیا۔۔۔

"تیری تو۔۔۔ مجھے حکم دیتا ہے۔۔۔!"

اب لاؤنج میں دو نیچے کارپٹ پہ اور دو اوپر صوفے پہ جنگ چھیڑے پڑے تھے۔۔۔ اور اس میں ان چاروں کا ہی دن پار ہونے والا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

دھوپ اتر چکی تھی لیکن جاتے دن کی روشنی ابھی باقی تھی۔۔۔ پرندوں نے واپسی کا قصد کر رکھا تھا۔۔۔ زمن چھوٹی سی ٹیک والی کرسی پہ بیٹھی شیشے کی دیوار سے باہر لان میں جھانک رہی تھی۔۔۔ اداس آنکھوں پہ مڑی ہوئی پلکیں گر گر کے اٹھتیں تو وہ جیسے ڈوبتی شام کا حصہ معلوم ہوتی۔۔۔ رباب آنٹی کچن سے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے لیے برآمد ہوئیں۔۔۔ فرائیڈ نگٹس اور سپرنگ رولز کے ساتھ سبز چائے وہ بھی ڈھیر سارے پستے بادام کے ساتھ۔۔۔ زمن کی من پسند تھی۔۔۔ پاس آتے ہی خوشبو سارے میں پھیل کے اسے بھی متوجہ کر گئی۔۔۔ وہ ایک گہرا سانس کھینچ کے ان کی جانب دیکھتی مسکرائی۔۔۔ رباب آنٹی نے ٹرے چھوٹی سی شیشے کی میز پر رکھی اور خود بھی اس کے مقابل ویسی ہی کرسی پہ ٹک گئیں۔۔۔ یہ آرائشی طرز کی چھوٹی چھوٹی سی کرسیاں تھیں جو گلاس وال کے پاس سجائی گئی تھیں۔۔۔ یہاں بیٹھ کے پورے لان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔۔۔ رباب خان نے سبز چائے کا مگ اس کے سامنے رکھا اور اپنا تھام کے سکون سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئیں۔۔۔

"اب بتاؤ میری جان کیا پریشانی ہے۔۔۔ ایسے اچانک کیوں آئی ہو۔۔۔ فائزہ کو بتا کے آئی ہو نا۔۔۔؟"

رباب خان کے یکے بعد دیگرے سوالوں پر اس نے ایک سپاٹ نگاہ ان پر ڈالی اور ہونٹ تھوڑے باہر کو نکال کر بھینچ لیے۔۔۔ یہ زمن کا مخصوص انداز تھا جب بھی بات کا سرا نا مل رہا ہوتا یا کوئی پریشانی ہوتی تو ہونٹ جیسے اس انداز میں جم ہی جاتے۔۔۔

"پریشانی نہیں آنٹی۔۔۔ پریشانیاں۔۔۔!"

"کیا مطلب۔۔۔ اب کیا ہوا۔۔۔ کہیں جاب تو نہیں چھوڑ آئی۔۔۔؟" رباب آنٹی نے سرعت سے سیدھی ہو کر پوچھا۔۔۔

"نہیں بابا۔۔۔جاب کیسے چھوڑ سکتی ہوں آپ کو بنا بتائے۔۔۔ہم پکڑے گئے ہیں شائد آنٹی۔۔۔!" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسا کر ٹھوڑی پہ جمائیں۔۔۔

"پکڑے گئے ہیں۔۔۔کیا مطلب ہے لڑکی۔۔۔کیا اول فول بول رہی ہو صاف بتاتی ہو یا لگاؤں ایک۔۔۔!" رباب آنٹی کو ہول پڑ رہے تھے۔۔۔چائے کا مگ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا جبکہ زمن نے ابھی تک چھوا بھی نہیں تھا۔۔۔

"آنٹی ہم تک پہنچنے والے ہیں وہ لوگ۔۔۔اس میں الجھا ہوا کیا ہے۔۔۔کیا آپ نہیں جانتیں کس سے بھاگ رہے ہیں ہم۔۔۔!" وہ چڑ گئی۔۔۔آنکھوں میں نمی بھر گئی۔۔۔رباب خان نے اسے بغور دیکھا اور اپنی مٹھیاں بھینچ کر واپس کھول خود کو نارمل کرتے بولیں۔۔۔

"کس نے بتایا تمہیں۔۔۔؟"

"کال آئی تھی۔۔۔ان نون نمبر تھا۔۔۔وہ بھی پی ٹی سی ایل نمبر۔۔۔موبائل نمبر نہیں تھا۔۔۔!"

"تھا کون دوسری طرف۔۔۔؟"

"کسی لڑکی کی آواز تھی لیکن صاف لگ رہا تھا جیسے آواز کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔!"

"ہممم۔۔۔" رباب خان نے ہنکارا بھرا۔۔۔"کہا کیا تھا۔۔۔؟"

"بس اتنا کہ جس کو تمہاری تلاش ہے وہ تم تک پہنچنے والا ہے۔۔۔کچھ اسی طرح کا۔۔۔حرف بہ حرف تو یاد بھی نہی مجھے متن ہی سمجھ آیا بس اور حواس سلب ہو گئے میرے۔۔۔!"

دونوں کے بیچ کچھ دیر کو مکمل خاموشی چھا گئی۔۔۔دونوں سوچ رہی تھیں اور نگاہیں چائے کے مگوں سے اڑتی بھاپ پہ جمی تھیں جو اب پہلے سے تھوڑی کم ہو گئی تھی۔۔۔

"امی کو بتانا پڑا حالانکہ بتانا نہی چاہتی تھی لیکن کال سن کے میں اتنی گھبرا گئی تھی کہ سیدھا مال سے گھر آ گئی۔۔۔امی چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئیں تھیں کہ کچھ ہوا ہے۔۔۔!"

"تو کیا کہا ہاجرہ نے۔۔۔؟"

"کہتی ہیں مکان تبدیل کرو جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔اسی لیے آئی ہوں آپ کے پاس۔۔۔آپ

کوئی گھر دیکھ دیں۔۔۔انکل سے بھی کہیں۔۔۔میں نے فائزہ آنٹی سے بھی بات کی ہے۔۔۔کہہ رہی تھیں بتائیں گی پتا کر کے۔۔۔!"

"زوہا کے آپریشن کی ڈیٹ کیا دی ہے مہریار نے۔۔۔؟" رباب خان نے پرسوچ نگاہوں سے پوچھا۔۔۔

"اسی مہینے کا لاسٹ ویک۔۔۔اور اس سے پہلے ہمیں شفٹ کرنا ہوگا۔۔۔امی زوہا کے آپریشن کے دوران کسی قسم کی کوئی فکر اور ٹینشن نہی چاہتیں۔۔۔!"

"ہمم۔۔۔!" رباب خان نے ہنکارا بھرا اور زمن کا مگ اٹھا کے اسے پکڑایا ساتھ اپنا بھی اٹھالیا۔۔۔

"فکر نا کرو۔۔۔ہو جائے گا بندوبست۔۔۔میں مہریار سے بات۔۔۔"

ہرگز نہیں۔۔۔!" زمن ان کی بات کاٹ گئی۔۔۔"آپ ڈاکٹر مہریار سے کچھ نہیں کہیں گی۔۔۔مجھے سمجھ نہی آتی آپ ان پہ اتنا ریلائے کیوں کرتی ہیں۔۔۔عجیب سائیکو ہیں وہ۔۔۔آپ کو پتا ہے میری ٹوہ لگاتے ہیں۔۔۔انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے سکول جاب چھوڑ کے کون سی جاب شروع کی ہے۔۔۔اور مجھے ایک آٹو لینے آتا ہے جو کہ انہی کا ہائر کیا ہوا ہے۔۔۔حد ہے۔۔۔بھلا کیوں میرے سرپرست بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔؟ ایک بار زوہا کا آپریشن ہو جائے تو سارے لحاظ ایک طرف رکھ دینے ہیں میں نے۔۔۔!" وہ غصے میں بولتی چلی گئی۔۔۔سارا غبار یہیں اسی بات پہ نکل گیا۔۔۔

"دل تو کر رہا ہے ایک تھپڑ لگاؤں۔۔۔" رباب آنٹی کو بھی غصہ آگیا۔۔۔"ایک تو کوئی خبر گیری کرنے والا آج کے دور میں ملتا نہی اور مل جائے تو اسے تمہارے جیسے چول خود سے دور کر دیتے ہیں۔۔۔خبردار زمن جو کسی قسم کی بدتمیزی کی ہو تم نے مہریار سے۔۔۔تمہارے انکل کا سب سے چہیتا شاگرد ہے اور ان کے لیے فیملی ممبر کی طرح ہے۔۔۔!"

"تو میری جان کو کیوں آگئے ہیں۔۔۔؟"

"کس نے کہا ایسا۔۔۔؟"

زمن کو اپنی بات کا جواب عقب سے سنائی دیا۔۔۔وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔۔۔ہاتھ میں

تھامے مگ سے چائے چھلکتے چھلکتے بچی۔۔۔وہ مگ واپس ٹیبل پہ رکھ گئی۔۔۔پیچھے مہریار کھڑا تھا۔۔۔مکمل اور سحر انگیز۔۔۔کالی لیدر کی جیکٹ کے ساتھ فان کلر کی پینٹ پہنے وہ شاندار دکھائی دے رہا تھا۔۔۔زمن بری طرح سٹپٹائی تھی۔۔۔رباب آنٹی نے اسے تادیبی نگاہوں سے دیکھا اور مہریار سے مخاطب ہوئیں۔۔۔

"آؤ آؤ مہر۔۔۔تمہارا ہی ذکر چل رہا تھا۔۔۔!"

"جی اندازہ ہو گیا تھا اس ذکر خیر کا۔۔۔ان محترمہ کو تو میرے ساتھ چار چاند لگانے کا موقع نصیب ہو جائے بس۔۔۔!"

وہ زمن کی ہی چھوڑی ہوئی کرسی پہ براجمان ہوا اور پھیل کے بیٹھ گیا۔۔۔چھوٹی سی نازک سی کرسی تھی اور اوپر بیٹھا چھ فٹ سے اونچا چوڑا مہریار۔۔۔زمن نے تعجب سے دیکھا کہ کرسی ابھی تک چرچرائی کیوں نہیں۔۔۔

"ٹوٹے گی نہیں بے فکر رہو۔۔۔میں ایسی چیز پہ بھروسہ نہیں کرتا جس میں پختگی نا ہو۔۔۔!"

وہ ایک بار پھر اس کے چہرے سے اس کی سوچ پڑھ چکا تھا۔۔۔زمن نے رخ پھیر کے شکوہ کناں نظریں رباب آنٹی پہ ڈالیں جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا ایسے کرتا ہے یہ بندہ میرے ساتھ۔۔۔آنٹی رباب نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے نگاہیں چرا لیں۔۔۔مہریار نے اس کا رکھا سبز چائے کا مگ تھاما اور ابرو اچکا کے پوچھا۔۔۔

"جھوٹی تو نہیں۔۔۔؟"

"چکھنی بھی نصیب نہیں ہوئی۔۔۔" زمن کلس کے بولی۔۔۔

"گڈ۔۔۔کیونکہ میرے نصیب کی تھی۔۔۔!" وہ کہہ کے مگ ہونٹوں سے لگا گیا۔۔۔

رباب آنٹی مہریار کی طرف متوجہ ہوئیں۔۔۔

"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا۔۔۔خان صاحب نے ذکر تو نہی کیا تھا تمہارے آنے کا ورنہ تم آ رہے ہو اور وہ گھر نا ہوں ممکن ہی نہیں۔۔۔!"

زمن نے رباب آنٹی کو اسے اس قدر اہمیت دینے پہ نخوت سے لب ایک جانب سے اچکائے جو

مہر یار کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکے۔۔۔

"اصل میں کسی کو کہا تھا کہ آٹو پہ سیدھا گھر پہنچنا ہے لیکن وہ آٹو لے کر یہاں پہنچ گیا۔۔۔ مجھے اطلاع مل گئی تو سوچا معلوم کر لوں کسی سے موٹی رقم لے کر آپ کو تو نہیں دینے پہنچ گئیں تاکہ آپ کے ذریعے مجھے دے سکیں۔۔۔!"

وہ بول رہا تھا اور نگاہیں ہنوز زمن پہ جمی تھیں جو اس کی بات پہ خفت زدہ رہ گئی تھی۔۔۔ رباب آنٹی نے اسے کھوجتی نظر ڈالی اور جیسے معاملے کی تہہ میں پہنچ گئیں۔۔۔

"تم ہاسپٹل گئی تھی زمن۔۔۔؟" انہوں نے تھوڑے سخت لہجے میں استفسار کیا تو زمن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔۔۔ یہی بھیگی نگاہ جب مہر یار کی جانب اٹھی تو یکدم کسی کی شبیہہ دماغ کو جھنجھوڑتی چلی گئی۔۔۔ وہ یک ٹک زمن کے بھیگے نین کٹورے دیکھے گیا حتیٰ کہ رباب آنٹی نے گلا کھنکھار کے چائے کا مگ میز پہ جما کے رکھا۔۔۔

"آہمم۔۔۔ مہر یار زوہا کے آپریشن کی کون سی تاریخ دی ہے پھر۔۔۔؟" انہوں نے بات بدل دی۔۔۔

"اسی منتھ کے لاسٹ ویک میں اور سر خان بھی کیس فالو کریں گے۔۔۔ بس تیاری پکڑیں۔۔۔ زوہا کو اسی ہفتے ہاسپٹل شفٹ ہونا ہے۔۔۔ اس دوران اس کی ضروری میڈیکیشن اور ٹریٹمنٹ کا ابتدائی پراسس سٹارٹ ہو جائے گا۔۔۔ بس پھر آپریشن۔۔۔ ان شاءاللہ کامیابی کے چانسز زیادہ ہیں۔۔۔!"

اس نے تفصیلی بتایا۔۔۔ زمن نے پورے انہماک سے اس کی بات سنی تھی اور ذہن میں یہ سوچ گھوم رہی تھی کہ اگر اسی ویک ہاسپٹل شفٹ کرنا ہے تو گھر کیسے شفٹ ہوگا۔۔۔

"ہمم۔۔۔ اس ویک کے اندر زمن کو گھر بھی شفٹ کرنا ہے۔۔۔ اس کا بندوبست ہوتے ہی زوہا ہاسپٹلائز ہو جائے گی۔۔۔!" رباب آنٹی نے اس کی سوچوں کو الفاظ کا روپ دیا۔۔۔ مہر یار چونک کے دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

"ایسی کیا جلدی ہے۔۔۔ کوئی مسئلہ ہے جو تبدیل کرنا ہے اچانک سے۔۔۔!"

زمن ہرگز بھی نہیں چاہتی تھی کہ یہ معاملہ مہریار کے سامنے لایا جائے اس لیے فوراً اپنے لیے چائے لانے کا کہا اور مہریار کے پیچھے سے گزرتے ہوئے ایک پل کو رکی، رباب آنٹی کو ہاتھ لہرا کے نا بتانے کا اشارہ کیا۔۔۔ وہ گومگو کی کیفیت میں اسے دیکھتی مہریار کو بتانے لگیں۔۔۔

" وہ۔۔۔ اصل میں۔۔۔ کافی وقت سے ہاجرہ مکان تبدیل کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ وہ کیا ہے ناجب سے زوہا بیمار ہوئی ہے محلے داروں نے ہمدردی کی آڑ میں باتیں بنا بنا کے اس کو ٹارچر کیا ہوا ہے تو اب ہاجرہ نہیں چاہتی کہ مزید یہاں رہے۔۔۔ زوہا کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جگہ تبدیل کی جائے۔۔۔!!

ان کے تسلی بخش جواب پہ زمن نے مہریار کے پیچھے سے دونوں انگوٹھے دکھا کے ویلڈن کہا جبھی اچانک سے مہریار نے گردن گھما کے اسے دیکھا۔۔۔ زمن نے بوکھلا کے ہوا میں ہاتھ چلا چلا کے مکھیاں مارنی شروع کیں تو مہریار مجھتے ہوئے سر جھٹک کے سیدھا ہو گیا۔۔۔

" کوئی مکان ملا ہے یا ابھی ڈھونڈنا ہے۔۔۔؟"

زمن نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ رباب آنٹی نے اسے دیکھ کے دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

" مل ہی گیا ہے سمجھو۔۔۔ بس دو تین دن میں شفٹ ہو جائیں گے۔۔۔ فکر والی کوئی بات نہیں۔۔۔!"

" کہاں ؟؟؟" مہریار نے بھنویں اچکائیں اور آنکھیں چھوٹی کرتے ہوئے سادہ لہجے میں بولا۔۔۔ " مجھے بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میری پیشنٹ کو کہاں لے جایا جا رہا ہے۔۔۔!"

" وہ شاپ والی آنٹی فائزہ کی انیکسی میں۔۔۔ میری باس۔۔۔ جن کی شاپ پہ میں جاب کرتی ہوں۔۔۔!"

زمن نے پیچھے سے فوراً سامنے آتے بنا سوچے سمجھے کہہ دیا تو رباب آنٹی کا دل کیا اب واقعی جوتا اتاریں اور دو چار اس کے دماغ پہ لگا ہی دیں۔۔۔ جسے وہ بچہ بنا رہی تھی وہ اپنی عمر سے کہیں آگے تھا۔۔۔ وہ مجبوراً مسکراتی سر ہلا گئیں تو مہریار ایک گال سے مسکراتا خاموش ہو گیا۔۔۔

" اچھا آنٹی میں اب چلتی ہوں۔۔۔امی انتظار کر رہی ہوں گی۔۔۔!" وہ آگے بڑھ کے اپنا بیگ اٹھاتی ہوئی عجلت میں بولی۔۔۔اسے واقعی اب اس شخص کی کھوجتی نگاہوں سے بچنے کی ضرورت تھی۔۔۔

" آپ تو چائے لینے کچن میں جا رہی تھیں غالباً۔۔۔!" وہ اسے یاد دلاتا ہوا جتا گیا۔۔۔رباب آنٹی نے تاسف سے سر ہلایا۔۔۔وہ اندر ہی اندر میں جی بھر کے اس کی عقل پہ ماتم کر رہی تھیں۔۔۔

"گھر جا کے پیوں گی۔۔۔ابھی آٹو والا ویٹ کر رہا ہے باہر۔۔۔امی بھی ہریشان ہو رہی ہوں گی۔۔۔!"

مہریار ایک دم سے کھڑا ہوا اور بولا

" چلو میں چھوڑ دیتا ہوں۔۔۔ٹھیک ہے میم چلتا ہوں۔۔۔ان شاء اللہ پھر کسی دن چکر لگاؤں گا ایک تفصیلی بیٹھک کے لیے۔۔۔!"

رباب آنٹی بھی کھڑی ہو کے الوداعی کلمات کہنے لگیں اور زمن کو آنکھیں دکھا کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔۔۔لیکن وہ ٹھس سی کھڑی رہی۔۔۔

" میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔۔۔جلدی آؤ۔۔۔!"

رعب سے کہہ کے وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔۔۔اس کے نکلتے ہی رباب آنٹی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔۔۔

" الو ہو تم ایک نمبر کی۔۔۔عقل تو جیسے گھاس چرنے گئی ہے۔۔۔بچہ ہے جسے بچہ بنا رہی ہو۔۔۔میں تو کہتی ہوں بتا ہی دیتی وہ بہترین رہائش کا بندوبست کر سکتا تھا۔۔۔!"

" کیوں۔۔۔کیوں کریں گے یہ جناب ایسا کچھ۔۔۔" زمن دھیمی آواز میں آنکھیں نکالتی بولی۔۔۔

" اور دیکھا آپ نے۔۔۔مجھ سے مخاطب کیسے ہوتے ہیں یہ۔۔۔مجھے تو لگتا ہے آنٹی کوئی نا کوئی چن چڑھا دینا ہے اس بندے نے۔۔۔!"

" کیسا چن میری جان۔۔۔!" رباب آنٹی نے جانچتی نظریں اس پر گاڑیں تو جواباً اس نے بھی ایسے ہی دیکھا

" یہ بندہ نا ہم سے ڈبل پیسے لینے والا ہے دیکھ لینا۔۔۔سود سمیت وصولے گا سب کچھ ورنہ میری

پھوپھی کا بیٹا ہے جو یوں فریفتہ ہو رہا ہے زوہا کے کیس پہ۔۔۔!" اندیشوں بھرے لہجے میں کہتی وہ رباب خان کو چونکا گئی۔۔۔ یکدم خاموشی سے وہ اس کا چہرہ دیکھے گئیں۔۔۔ تبھی باہر مسلسل ہارن کی آواز نے دونوں کو چونکایا تو وہ خود سے آگے ہو کے گلے ملتی باہر کو لپکی۔۔۔

"یہ جن ہارن پہ ہاتھ رکھ کے بھول جاتا ہے جب تک محلے والے اپنے اپنے گیٹ پہ نا نکل آئیں۔۔۔!"

ساتھ ساتھ بولتی وہ جا چکی تھی جبکہ رباب خان ابھی تک اپنی جگہ پہ جمی کھڑی تھیں اور دماغ میں مسلسل زمن کی کہی آخری باتوں کی بازگشت تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

شہریار اور زارون پیدل سڑک پہ چلتے چلے آ رہے تھے۔۔۔ بائیک داور اور یاور کالج سے واپسی پر ہتھیا کے لے گئے تھے اور ان دونوں کو آج یونی میں ہی دیر ہو گئی تھی سو اب پیدل ہی نکل پڑے تھے اور یاور اور داور کو منہ بھر بھر کے یاد بھی کیا جا رہا تھا۔۔۔ شام گہری ہو رہی تھی اور بھوک سے پیٹ میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔۔۔ زارون نے خود کے علاوہ شہریار کا فولڈر اور بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔۔۔ دو قدم پیچھے چلتے وہ بمشکل شہریار کا بیگ ٹٹول رہا تھا جس میں اس کی انگلیوں سے محض خالی ریپرز اور کاغذ ہی مس ہو رہے تھے۔۔۔

"بندے کے پاس اتنے پیسے ہونے چاہئیں کہ رکشہ ہی لے سکے۔۔۔!" بلآخر ہاتھ باہر نکال کر وہ ناصحانہ انداز میں گویا ہوا تو شہریار نے کمینی سی مسکراہٹ ہونٹوں میں سمیٹ کے شرٹ کی فرنٹ پاکٹ کو تھپتھپایا۔۔۔ لینے کو وہ رکشہ لے سکتا تھا لیکن مہینے کا آخر چل رہا تھا اور وہ آدھے گھنٹے کے سفر کے لیے پانچ سو خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔۔۔

"اتنی ٹانگوں میں اینٹھن ہو رہی ہے تو تم ذرا اپنے پیسوں کو ہوا لگوا لو۔۔۔ مجھ غریب کو بھی گھر پہنچا کے دعائیں لو۔۔۔!"

زارون نے فولڈرز بغل میں کسے اور دونوں بیگ اچھال کر پشت پہ پھینکے اور چھوٹی انگلی سے عینک درست کرتا ہوا بولا۔

"ماما کا فون آیا تھا۔۔۔کہہ رہی تھیں کہ پیدل چلا کرو۔۔۔پیدل چلنے والا زیادہ دیر تک جوان رہتا ہے۔۔۔یہ اپنے چینے مینے نہی دیکھے کیا۔۔۔سب پیدلو پیدلی جاتے ہیں اور لمبی عمر پاتے ہیں۔۔۔!"

شہریار دو قدم آگے تھا اس کی بات پہ حیرانی سے بھنویں اچکائیں اور دل میں سوچنے لگا کہ زارون کے کافی پر پرزے نکل آئے ہیں۔موصوف عقل کا استعمال سیکھ رہے ہیں۔۔۔وہ ناک چڑھا کے بولا۔۔۔

"کمینے ہوتے ہیں وہ۔۔۔!"

"شہری کتے۔۔۔!"

شہریار پلٹ کے اس پہ جھپٹا۔۔۔

"اوئے تیری تو۔۔گالی دیتا ہے۔۔۔!"

"شہری یہاں نہی سامنے دیکھ۔۔۔کتے۔۔۔!"

شہریار سپاٹ انداز میں اس کا کالر چھوڑ کے مڑا تو چار پانچ کتوں کو اسی سمت آتے دیکھا۔۔۔سبھی پُرشوق نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور مکمل تفریح کے موڈ میں تھے۔۔۔

"زارون۔۔۔"شہریار پھسپھسایا۔۔"تم بھگا لو گے کیا۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔میں خود بھاگ لوں گا۔۔۔!" زارون سنجیدہ تھا۔۔۔

"کہیں سے پتھر پکڑو بڑے بڑے۔۔۔!"

"تم اتنے بڑے ہو کے ڈرتے ہو کتوں سے۔۔۔؟" زارون اس کے عقب میں کھسکتا ہوا بولا۔۔۔

"مجھے کتو فوبیا ہے۔۔۔!"

"کون سا لوبیا۔۔۔اب کتے کون سا لوبیا کھاتے ہیں۔۔۔؟" زارون پھسلتی عینک کو سیٹ کرتا بولا۔۔۔

"لال والا۔۔۔"شہریار زچ ہوا۔۔۔"کتو فوبیا۔۔۔فوبیا۔۔۔مطلب کتوں سے ڈر۔۔۔میں کتو فوبیا کا مریض ہوں۔۔۔!" شہریار کو بھی ابھی ہی خبر ہوئی تھی اپنے اس مرض کی۔۔۔

"چچ چچ چچ۔۔۔اس بھری جوانی میں شہری تمہیں کتو فوبیا ہو گیا۔۔۔ابھی تو تمہارے ہنسنے کھیلنے

کے دن تھے۔۔۔اتنی جلدی تم کیسے۔۔۔"

شہریار نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔۔۔

" آپ منہ بند کرنے کا کیا لو گے زارون بابا۔۔۔!"

کتے نزدیک آرہے تھے اور یہ دونوں قدم بہ قدم پیچھے کھسک رہے تھے۔۔۔

" تمہاری گھڑی، تمہارے سنیکرز، تمہارا آئی فون اور تمہاری باکسنگ کٹ۔۔۔!"

" میری بنیانیں اور انڈرویئر بھی رکھ لیتے۔۔۔!"

" نا کر یار۔۔۔ یاور تو جان سے مار دے گا مجھے اگر باقی سب بھی میں نے لے لیا تو۔۔۔!"

شہریار کا دل کیا اس معصومیت پہ پلٹ کے اس کا منہ چوم لے۔۔۔لیکن ابھی کتے ان دونوں کو چومنے کے در پہ تھے۔۔۔

" زارون فی الحال تو پیچھے مڑ اور بھاگ۔۔۔ورنہ چودہ ٹیکے لگیں گے۔۔۔وہ بھی پیٹ میں۔۔۔!"

زارون اپنا پیٹ سہلاتے ہوئے بولا۔۔۔

" اس دن کے لیے یہ پیٹ بڑا کیا تھا کیا۔۔۔شہری مہر لالہ ڈبل ڈوز کے ساتھ سات بھی تو لگا سکتے ہیں۔۔۔!"

اس سے پہلے کہ ناک تک زچ آیا شہریار کچھ کہتا ایک آواز کانوں میں پڑی۔۔۔

" او ہیلو۔۔۔یہاں ادھر۔۔۔!"

دونوں نسوانی آواز پہ ٹپ ٹپا کے سیدھے ہوئے۔۔۔ایک لڑکی ان کا خوف بھانپ لیتی تو کیا عزت رہ جاتی۔۔۔

" اے جنگجوؤ۔۔۔ادھر لیفٹ کی طرف منہ کرو اور جو کھلا گیٹ ہے اس سے اندر آجاؤ۔۔۔تھوڑی دیر میں یہ کتے چلے جائیں گے تو تم دونوں بہادر بھی گھر چلے جانا۔۔۔!"

وہی نسوانی آواز دوبارہ آئی تو شہریار نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی۔۔۔بائیں جانب چھوٹی سی بالکونی پہ ایک خوبصورت لڑکی سر کو اسٹالر سے ڈھکے ہاتھ میں مگ لیے کھڑی تھی۔۔۔زارون

نے بھی منہ اونچا کر کے دیکھنا چاہا تو شہریار نے فوراً ہاتھ بڑھا کے اس کی عینک اچک لی جبکہ نظریں ہنوز اس لڑکی پر تھیں۔۔۔وہ لڑکی ہنسی دباتی اس کا دھیان ان قریب آتے کتوں کی جانب کروا گئی تو شہریار نے زارون کا ہاتھ تھاما اور کھلے گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔۔۔پیچھے کتے بھی پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے۔۔۔زارون اس کے ساتھ کسی اندھے فقیر کی طرح لڑکھڑاتا کسی طرح گیٹ پار کر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔اندر جاتے ہی شہریار نے گیٹ بند کر دیا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔۔۔ہر بار ان دونوں کے بیچ خاموشی باتیں کیا کرتی تھی۔۔۔جب تک گھر نا آجاتا زمن، مہریار کا شجرہ نسب کھنگالتی رہتی تھی اور مہریار اس کے چہرے کے زاویے کن اکھیوں سے دیکھتا محظوظ ہوتا تھا۔۔۔اس کی نا عادت تھی نا مزاج لیکن زمن کو چڑانے میں ایک عجیب سا مزہ تھا۔۔۔ایک ان دیکھی سی اپنائیت۔۔۔ایک استحقاق۔۔۔!

وہ جو اپنے خیالوں میں مگن تھی گاڑی کا موڑ کاٹتے بمشکل مہریار پہ الٹتے بچی۔۔۔ڈیش بورڈ پہ بروقت ہاتھ پڑ گیا۔۔۔مہریار نے اچٹتی نگاہ ڈالی تو باریک چھوٹی سی ناک ضبط سے پھولتی پچکتی اپنے ساتھ اس باریک سے لونگ کو بھی جھلا رہی تھی جس کی مدھم سی چمک پہ بے اختیار مہریار نے دوبارہ نگاہ ڈالی تھی۔۔۔اسے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھا کہ اب سے پہلے اس نے کسی لڑکی کے ناک کے اس زیور کو بغور نہیں دیکھا تھا۔۔۔پر زمن کا ناک نقشہ ایسا تھا یا اس کی لونگ کی چھب نرالی تھی جو وہ ہر بار ایک نگاہ ڈالنے پہ مجبور ہو جاتا تھا۔۔۔

"بیٹھتے ہی کہا تھا سیٹ بیلٹ باندھنے کو۔۔۔اب یہ جھٹکے تمہیں پیشگی اطلاع دے کے تو نہیں آئیں گے۔۔۔!"

زمن نے اس کے کہنے پر بھی سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی اور وہ اسی پہ چوٹ کر رہا تھا۔۔۔مہریار نے ایک بیکری کے باہر گاڑی روک لی۔۔۔اور خود دروازہ کھول کے اترنے لگا۔۔۔

"کچھ لوگی۔۔۔کولڈ کافی۔۔۔شیک۔۔۔سلش۔۔۔؟؟؟"

"نہیں۔۔۔ زحمت مت کریں۔۔۔ مجھے بس گھر ڈراپ کر دیں۔۔۔ خوامخواہ گاڑی روک دی۔۔۔ پہلے ہی پوچھ لیتے تو رکنی نا پڑتی۔۔۔!" ونڈ سکرین سے ناک کی سیدھ میں دیکھتی وہ لہجے میں نخرہ بھر کے بولی تو مہریار نے مسکراہٹ لبوں میں دبائی۔۔۔

"تمہیں کیوں لگا کہ میں یہاں محض تمہارے لیے ایک کولڈ کافی یا شیک یا پھر سلش لینے رکا ہوں۔۔۔ تمہیں ڈراپ کر کے مجھے بھی گھر جانا ہے۔۔۔ فیملی والا بندہ ہوں۔۔۔ لڑکی اتنی خوش فہمی نہیں پالتے نقصان دہ ہوتی ہے۔۔۔ ابھی رکو میں آیا اور ہاں جب میں آؤں تو سیٹ بیلٹ بندھی ہو۔۔۔!"

وہ دروازہ بند کرتا وقار سے بیکری کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور زمن انتہائی بے بسی سے اس کی پشت دیکھتی اپنی عقل اور حالت پہ افسوس کر رہی تھی۔۔۔

"چول انسان۔۔۔ ایک نمبر کا دو نمبر۔۔۔ لو اتنی بے عزتی۔۔۔ واہ زمن بی بی واہ۔۔۔ تمہاری بھی کبھی کوئی حیثیت نہیں بننے والی۔۔۔ اب کیا ضرورت تھی اس دماغی مریض کو اتنا لمبا جواب دینے کی۔۔۔ سمپل نو کہا ہوتا تو کتنا سوبر لگتا۔۔۔ لے کے دس سنا گیا۔۔۔ اور اس کی فیملی بھی ہے۔۔۔ ہمم یعنی شادی شدہ ہیں موصوف۔۔۔ دیکھو بھلا کیا بنے جو ان کی بیوی مجھے ان کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا دیکھ لے۔۔۔ گھر پانی پت کا میدان بنا ہو۔۔۔ خیر میری بلا سے۔۔۔ ایک چھوڑ تین تین کر لیں۔۔۔!" عجیب بے نام سی الجھن نے گھیر لیا تھا اس کا دل کر رہا تھا بس پلک جھپکتے گھر پہنچے۔۔۔

"یہ سیٹ بیلٹ۔۔۔" اس نے اکتا کے سیٹ بیلٹ کھینچی۔۔۔" اسے کیسے باندھوں۔۔۔ بھلا اس آدمی کو یہ نہیں پتا کہ میں کب گاڑیوں میں بیٹھی ہوں جو مجھے یہ باندھنی آئے گی۔۔۔ میں کون سا امیر کبیر باپ کی اولاد ہوں۔۔۔ امیر کبیر تو چھوڑو یہاں تو باپ ہی نا ملا۔۔۔!" وہ ملامتی انداز میں کہتی لب بھینچ گئی۔۔۔ خود کو خود ہی سوری کیا۔۔۔ خود کی بات سے خود کا دل دکھا تھا۔۔۔

"پتا نہیں اچھی بھلی سمجھدار مشہور ہوں۔۔۔ اچھے مشورے دیتی ہوں۔۔۔ اچھی رائے دیتی ہوں لیکن اس بندے کے سامنے سب الٹ پلٹ کیوں ہو جاتا ہے۔۔۔ کیسا سکینر لگا ہے اس کی نظروں میں جو بھی تلپٹ کر دیتا ہے۔۔۔ بس ایکبار زوہا فارغ ہو جائے آپریشن سے دیکھنا ڈاکٹر مہریار ہم لوگ کیسے غنود ہوتے۔۔۔!"

اس کی خودکلامی میں رکاوٹ آئی جب مہریار نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے ہاتھ میں تھامے شاپرز پچھلی سیٹوں پہ سیٹ کیے۔۔۔اتنا سارا بیکری کا سامان دیکھ کے زمن کو حیرت تو ہوئی لیکن اسے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔۔۔ظاہری بات تھی شادی شدہ تھا تو یقیناً بچوں کے لیے لیا ہو گا سب۔۔۔اس نے سوچا اور ایک سرسری نگاہ ڈال کے واپس بیلٹ ٹٹولنے لگی۔۔۔مہریار اب ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا اور اس کی باریک لمبی سفید انگلیاں جیسے بیلٹ پر رقص کر رہی تھی۔۔۔وہ سرتاپا نازک دکھتی تھی یوں جیسے کوئی مومی کٹھ پتلی تال پہ جھومتی ہو۔۔۔مہریار نے نگاہ پھیر کر گاڑی اسٹارٹ کی اور یکدم اس کی جانب مڑ کر اس کی سیٹ بیلٹ پکڑی اور سہولت سے باندھ دی۔۔۔زمن نے اپنا سانس مکمل روک لیا تھا حالانکہ مہریار نے بے حد احتیاط سے سیٹ بیلٹ باندھی تھی کہ کہیں اس کا ہاتھ اسے چھو نا جائے پھر بھی زمن کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔۔۔وہ بیٹھی کی طرح دونوں ہاتھ اوپر کیے ڈیش بورڈ کی بناوٹ پہ غور کر رہی تھی۔۔۔مہریار نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا

"ہاتھ نیچے کرو ایسے لگ رہا جیسے نماز کی نیت کرنے لگی ہو۔۔۔!"

اس نے سٹپٹا کے ہاتھ نیچے کیے اور شیشے کے پار بھاگتے مناظر از بر کرنے لگی۔۔۔مہریار نے زیر لب کہا۔۔۔

"پاگل۔۔۔!"

گھر پہنچتے ہی وہ نیچے اتر گئی تھی۔۔۔دروازے کے کھلے شیشے پہ جھکی اس کا تیز تیز شکریہ ادا کیا تا کہ بس اب وہ جائے لیکن اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا جب وہ خود بھی اترا اور گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا بیکری کا سارا سامان نکالا اور اس کا انتظار کیے بنا گھر کی بیل بجا دی۔۔۔زمن منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اسے وہیں کھڑی ملاحظہ کرتی رہی۔۔۔ہاجرہ نے گیٹ کھولا۔۔۔نہایت خوشدلی کے ساتھ مہریار کو خوش آمدید کہا اور اندر لے گئیں۔۔۔مہریار نے مڑ کے ایک جتاتی نظر اس پہ ڈالی اور استہزائیہ مسکراتا اندر غائب ہو گیا۔۔۔زمن کو احساس ہوا کہ وہ کب سے ہونقوں کی طرح اس کی گاڑی کے پاس کھڑی ہے تو چہرے پہ ہاتھ پھیرتی اندر داخل ہوتی گیٹ بند کر گئی۔۔۔!

☆......☆......☆

وہ دونوں سکون سے گیٹ بند کیے اندر کھڑے تھے جب کہ دروازے کے پار کتوں کی غراہٹ بخوبی سنی جا رہی تھی۔۔۔

"شہری یہ آپس میں بھلا کیا باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ سننا ذرا۔۔۔ مجھے لگتا ہے باہر چھپ کے ہمارا انتظار کریں گے۔۔۔!" زارون گیٹ کے اندر سے کان لگائے کتوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا تو شہریار اس کی لمبی گردن پہ ہاتھ جماتے جماتے تھم گیا۔۔۔ مٹھی بھینچ کے ضبط بھرے لہجے میں بولا۔۔۔

"مجھے ان کی زبان سمجھ نہی آتی بھائی میرے۔۔۔ تم کوشش کرتے رہو جب سمجھ جاؤ تو مجھ غریب کو بھی سکھا پڑھا دینا۔۔۔!"

زارون مدبرانہ سر ہلاتا مزید چوکس ہوا سننے لگا۔۔۔ شہریار نے گردن گھما کے ارد گرد کا جائزہ لیا تبھی جالی والا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتی وہی لڑکی سامنے آئی۔۔۔ ہاتھ میں ابھی بھی مگ تھام رکھا تھا۔۔۔ اورنج شرٹ اور ٹراؤزر پہ بلیک اور اورنج اسٹالر لیے وہ بے حد فریش اور پرکشش لگ رہی تھی۔۔۔ شہریار نے ایک ہی نظر میں اس کا مکمل جائزہ لیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔۔۔ زارون بھی کسی کے آنے کو محسوس کر کے فوراً اس طرف منہ کیے سیدھا ہوا۔۔۔ دونوں یک ٹک اس لڑکی کو دیکھے جا رہے تھے اور حواس باختگی تھی جو سلام میں پہل بھی نہیں کی حالانکہ اسی کے گھر میں کھڑے تھے۔۔۔ وہ لڑکی بھی چند سیکنڈ دونوں کو دیکھتی رہی پھر بنا سلام دعا کے اپنی بات کہنے لگی۔۔۔

"ہماری یہ کالونی نئی ہے۔۔۔ کافی پلاٹس خالی ہیں اس لیے آوارہ کتوں کی بھرمار ہے۔۔۔ ویسے تو گارڈ بیٹھا رہتا ہے بائیں والے موڑ پر آج آئی تھنک وہ موجود نہی ہے ورنہ اب تک وہ انہیں بھگا چکا ہوتا۔۔۔ یہ چیئرز پڑی ہیں۔۔۔ آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ کر انتظار کر لیں۔۔۔ گارڈ کسی کام سے ہی گیا ہو گا ابھی آتا ہو گا تب تک ڈریے نہی، بیٹھ جائیے۔۔۔!"

آخری فقرہ کہتے وہ زیرلب مسکرائی جیسے مذاق اڑایا ہو تو شہریار کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔۔۔

"ہم کوئی ڈرتے ورتے نہیں ہیں۔۔۔ اور کتوں سے تو بالکل بھی نہی ڈرتے۔۔۔ اصل میں ہم یونی سے واپس آ رہے ہیں اور پہلی بار اس روٹ پہ آئے ہیں۔۔۔ راستہ سمجھ نہیں آ رہا تھا تو بیچ میں رک گئے

تھے ورنہ یہ کتے تو ایک ایک لات کی ماریں ہماری۔۔۔!"

شہریار کے کہنے پہ زارون کا منہ کھلا تھا جسے بند کرنے کے لیے شہریار نے اس کے پیٹ میں کہنی چبھوئی۔۔۔

"جی جی۔۔۔بلکل۔۔۔اصل میں شہری ان کتوں سے راستہ ہی پوچھنے والا تھا لیکن پھر آپ آ گئیں۔۔۔!"

زارون اور اس کی مدلل گفتگو۔۔۔شہریار سپاٹ چہرے سے آنکھیں گول گھماتے اس کی بات کو سمجھا تو دل کیا گیٹ کھولے اور اسے کتوں کے آگے دھکیل دے۔۔۔وہ لڑکی جو پہلے دبی دبی مسکرا رہی تھی یکدم کھل کے ہنس دی۔۔۔ہاتھ میں تھاما مگ اس نے سیڑھی پہ رکھ دیا۔۔۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔۔۔آپ تو بلاوجہ شرمندہ ہو گئے۔۔۔آپ لوگ بیٹھ جائیے میں پانی لاتی ہوں آپ کے لیے۔۔۔!"

"پانی میں کوئی شربت ملا لیجیے گا۔۔۔ڈھارس ہو جائے گی۔۔۔!" زارون عینک ٹکاتے ہوئے بولا۔۔۔وہ لڑکی انگشت شہادت سے اپنی ناک کی نوک کی چھوتی مسکراہٹ چھپاتی واپس اندر جانے لگی کہ شہریار نے روک لیا۔۔۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔آپ زحمت مت کیجیے۔۔۔ہم بس اب نکلتے ہیں۔۔۔یہ سچ ہے ہم کتوں سے ڈر گئے تھے۔۔۔تھینکس فار ہیلپنگ اس۔۔۔گارڈ اب موجود ہوگا اگر کوئی مسلہ ہوا تو ہم اسے کہہ لیں گے۔۔۔ویسے میرا خیال ہے کتے بھی جا چکے ہیں۔۔۔!"

"جی اور ہم بھی چلتے ہیں۔۔۔!" زارون دانت دکھاتا ہوا بولا۔۔۔شہریار نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے اچھے سے گھورا جیسے کہہ رہا ہو تو گھر چل بیٹے۔۔۔!وہ لڑکی چند قدم آگے آئی اور گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔۔۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔سڑک خالی ہے اور گارڈ بھی موجود ہے۔۔۔!"

اس لڑکی نے راستہ دیا تو وہ دونوں باہر نکل گئے۔۔۔الوداعی کلمات کہہ کر دونوں آگے بڑھنے

لگے تھے جب شہریار نے پلٹ کے اس لڑکی کو دیکھا جو ہنوز گیٹ سے کندھا ٹکائے دونوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔۔۔شہریار دو قدم واپس ہوا اور اس کے قریب آ کر رکا۔۔۔

"نام جان سکتا ہوں آپ کا۔۔۔؟"

"لائبہ۔۔۔لائبہ راؤ۔۔۔!"

وہ لڑکی الوداعی مسکراہٹ سے نوازتی گیٹ بند کر گئی اور شہریار زیر لب اس کا نام دہراتا زارون کے پیچھے چل دیا۔۔۔!

☆......☆......☆

آج بڑے دنوں بعد حویلی کے ڈائننگ ہال کی قسمت جاگی تھی جہاں چوہدری قاسم، شہزور اور سنہری بیگم اکھٹے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔۔۔سنہری بیگم کے چہرے کی رونق خوب تھی۔۔۔اس کی بڑی خواہش رہا کرتی تھی کہ باپ بیٹا کسی ایک وقت کا کھانا ایک ساتھ کھایا کریں تا کہ گزشتہ کچھ عرصے میں دونوں کے درمیان جو ایک ان دیکھی خلیج حائل ہو چکی تھی وہ دور ہو سکے لیکن شہزور پروں پہ پانی ہی کہاں پڑنے دیتا تھا۔۔۔باپ کو تپانا اور طیش دلانا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔۔۔دو دن سے موڈ اچھا تھا سو حویلی میں وقت بھی گزار رہا تھا اور باپ کے ساتھ زمینوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔۔۔!

"آموں کے باغ کا چکر لگا لینا صبح شہزور۔۔۔کرمو بتا رہا تھا سارا پھل تیار ہے بس بجھوانا ہے اب۔۔۔تم ایک بار دیکھ آؤ ورنہ آڑھتی بعد میں کیپت ڈالتے ہیں۔۔۔!"

چوہدری قاسم نے لقمہ نگل کر شہزور کو دیکھا جو چھری کانٹے کی مدد سے بروسٹ نفاست سے کھا رہا تھا۔۔۔باپ کی بات سن کر اس کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں بس خاموشی سے کھاتا رہا۔۔۔سنہری نے چاؤ سے چوہدری قاسم کی پلیٹ میں مٹن قورمے کا سالن ڈالا جہاں پہلے ہی گنجائش نہیں تھی۔۔۔

"ایسے کر یہ ڈونگا ہی میرے منہ کو لگا دے۔۔۔بس ڈالتی جاتی ہے، ڈالتی جاتی ہے۔۔۔سب کچھ رل مل کے گتاوا بن جاتا ہے۔۔۔نا کھانے کو دل کرے نا دیکھنے کو۔۔۔!"

چوہدری قاسم نے تپ کے سنہری کو گھورا اور نخوت سے کھاتے بھی رہے۔۔۔سنہری نے سر جھٹکا

اور شہزور کی طرف محبت پاش نگاہوں سے دیکھا اور ڈش اٹھا کر اس کی جانب جھکی۔۔۔

"نا اماں۔۔۔ بلکل بھی نہی۔۔۔!" شہزور نے ماں کا ارادہ بھانپ کر فورا پلیٹ ہاتھ میں تھام کر پیچھے کی۔۔۔ سنہری کا منہ بن گیا۔۔۔ ڈش واپس پٹخنے والے انداز میں ٹیبل پر رکھی اور بیٹے کو گھورنے لگی۔۔۔

"اماں ایسے نا دیکھ۔۔۔ میں رات کو اتنا ہیوی کھانا نہی کھا سکتا۔۔۔ آج اگر بیٹھ ہی گیا ہوں تو سب کچھ مجھے ہی نا ہضم کروا۔۔۔ اباجی کو دے وہ عادی ہیں۔۔۔!"

"ہاں جی تُو آج ماں پیو کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھ ہی گیا ہے تو ہم پہ احسان ہی ہوا تیرا۔۔۔ ورنہ ماں کو تو تیرا چہرہ دیکھے دیہاڑی پوری گزر جاتی ہے۔۔۔!" سنہری ہاتھ سے چاول کھاتے ہوئے کلس کے بولی۔۔۔ چوہدری قاسم نے بھی تائیدی انداز میں ایک نظر اسے دیکھا لیکن وہ بھلا کب پرواہ کرتا تھا۔۔۔

"ہفتے کے لیے شہر جا رہا ہوں اس لیے سوچا آج کھانا ساتھ کھا لوں۔۔۔ یہ جو پوری دیہاڑی بعد شکل نظر آجاتی ہے پورا ہفتہ نہی آنی۔۔۔ ہو سکتا ہے چار دن اوپر ہو جائیں۔۔۔!"

اس نے چوہدری قاسم اور سنہری دونوں کو جھٹکا دیا۔۔۔ چوہدری قاسم کی تیوری پہ بل پڑے تھے۔۔۔ انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور پلیٹ پرے کھسکائی۔۔۔ شہزور نے جھکے سر کے ساتھ ایک اچٹتی نگاہ باپ کے اسعمل پہ ڈالی اور دوبارہ مگن ہو گیا۔۔۔ اس کی یہ بے نیازی سنہری کو بھی کھلی تھی۔۔۔

"میں بھی کہوں آج میرے چن پتر کو کدھر سے ساتھ بیٹھ کے کھانے کی ہوش آ گئی۔۔۔ کان کھول کے سن لے شہزور تو شہر نہی جائے گا۔۔۔ سمجھا۔۔۔!"

"اچھا۔۔۔ واقعی۔۔۔" شہزور نے ہنس کے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔۔۔ گھونٹ بھر کے واپس رکھا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیے وہ ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

"شہر میں میری کمپنی ہے اماں۔۔۔ روز جاتا ہوں روز آتا ہوں۔۔۔ کوئی نیا نہیں جانے لگا۔۔۔!" اب کی بار اس کا لہجہ تھوڑا کرخت تھا۔۔۔ چوہدری قاسم کو اشتعال سا آیا اور انہوں نے اسے ٹوکا۔۔۔

"نیا نہی جانے لگا لیکن یہ ایک ہفتے کے لیے جو جانے لگا ہے وہ نیا ہی ہے پتر۔۔۔ تیرا دماغ لگتا ہے ابھی تک ٹھکانے نہی لگا۔۔۔ جس دن تجھے کھے کھانی پڑی نا اس چکر میں اس دن تجھے پتا چلے گا۔۔۔!"

" ابا کھے تو اب تک کھائی ہے اسے ڈھونڈنے میں ۔۔۔ اب تو بس رسائی کرنی ہے اس تک ۔۔۔ اور وہ بھی سمجھو ہو چکی ۔۔۔ اب اسے ساتھ لے کے حویلی آؤں گا ۔۔۔ !"

" مجھے منظور نہیں ۔۔۔" سنہری نے نخوت سے ہاتھ جھٹکا ۔۔۔

" تو میں وہیں رہ جاؤں گا ۔۔۔ !" وہ بھی اسی کا بیٹا تھا، کندھے اچکاتا ہوا بولا ۔۔۔

" میں بھی دیکھتا ہوں تُو اسے کیسے لاتا ہے اس حویلی میں ۔۔۔ مرے ہوؤں کو نا اکھاڑ ۔۔۔ ورنہ سچ میں دفن کروا دوں گا ۔۔۔ !"

چوہدری قاسم غصے سے کرسی دھکیلتے کھڑے ہوئے تو شہزور بھی انہی کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔

" کروا کے دیکھ لیں ۔۔۔ پہلے بھی تو کروایا تھا ۔۔۔ زندہ ڈھونڈ لیا نا میں نے ۔۔۔ اب مرنے ہی نہی دوں گا ۔۔۔ سمجھے آپ اباجی ۔۔۔ !"

یہ کہہ کر وہ تن فن کرتا وہاں سے جا چکا تھا ۔۔۔ چوہدری قاسم تلملاتے ہوئے واپس کرسی پہ بیٹھے ۔۔۔ سنہری نے پانی کا گلاس بڑھایا جس سے دو گھونٹ بھر کے انہوں نے واپس پٹخ دیا ۔۔۔

" اسی واسطے کہا تھا کہ پتا کرائیں، مجھے زندہ لگتی ہیں ۔۔۔ !"

" کروایا تھا ۔۔۔ مری ہوئیوں کی اطلاع ملی تھی مجھے ۔۔۔ دھوکہ دے گیا کمبخت خدا بخش ۔۔۔ !"

" تو اب کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے ۔۔۔ ایک بار یہاں آ گئیں تو پتا ہے نا کیا ہو گا ۔۔۔ !"

اور چوہدری قاسم نے خالی نظروں سے سنہری کو دیکھا تھا جس کی چھوٹی چھوٹی بنا پلکوں کے آنکھیں انہیں کسی سانپ کے جیسی لگیں ۔۔۔ وہ جھرجھری لے کے اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکھڑائے لہجے میں بولے ۔۔۔

" کچھ دیر آرام کرنے لگا ہوں ۔۔۔ اپنے منتر جاپ آج کمرے میں نا کرنا ۔۔۔ سونا ہے مجھے، تھک گیا ہوں ۔۔۔ صبح دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے ۔۔۔ !" یہ کہہ کر وہ بنا سنہری کی اور دیکھے وہاں سے چلے گئے۔

" اونہہ ۔۔۔ ایک تو دونوں باپ بیٹے کے مڑنگے (مزاج) ہی ٹھیک نہی ہوتے ۔۔۔ !"

وہ کلستی وہیں بیٹھی رہی ۔۔۔ نظریں شیشے کے گلاس میں بھرے پانی پہ تھیں جس کی سطح پہ دھیرے

دھیرے ارتعاش پیدا ہوا اور وہ بھنور میں بدل گیا۔۔۔ماضی کا بھنور۔۔۔سیاہ کرتوں کا بھنور۔۔۔ہوشربا بھنور، دلگداز بھنور۔۔۔!

☆......☆......☆

حیات راؤ کے حویلی پہنچنے کی خبر نے حویلی کھاں کو جگا دیا تھا۔۔۔سکینہ جو فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک جاگا کرتی تھیں وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آرام کی غرض سے لیٹی تھیں لیکن بیٹے کے آنے کی پکارنے جیسے توانائی بخش دی تھی۔۔۔فوراً کمرے سے باہر نکل کر دالان کا رخ کیا۔۔۔جب سے نمرہ کی شادی ہوئی تھی ان کا دل ہمہ وقت اداس رہتا تھا۔۔۔وہ جلد از جلد حیات کا گھر بسانا چاہتی تھیں مگر وہ پڑھائی کا شوشہ چھوڑ کر چپ کروا دیتا تھا۔۔۔دالان میں پہنچ کر نگاہ سیدھی بیٹے کی اور گئی جو کندھے پہ بیگ ڈالے آستین سے پسینہ پونچھتے وہیں چلا آرہا تھا۔۔۔ماں کو دیکھ کر وجیہہ چہرے کی تازگی میں اضافہ ہوا۔۔۔سکون آور سانس خارج کرنے سے ناک تلے قدرے بڑھی ہوئی مونچھ پھڑ پھڑائی۔۔۔سکینہ بیگم کے پاس آکر فوراً ان کا ہاتھ تھام کر چوما۔۔۔وہ گلے لگانا چاہتی تھیں لیکن حیات راؤ نے روک دیا۔۔۔

"اماں پسینے سے پورا بھیگا ہوا ہوں۔۔۔گلے نا لگائیں۔۔۔گیلی ہو جائیں گی۔۔۔!"

سکینہ نے ایک چپت اس کے چوڑے سینے پہ لگائی اور کھینچ کے خود میں سمویا۔۔۔

"بچپن سے ماں کو گیلا کرتا آیا ہے۔۔۔اب کیا تیرا پسینہ مجھے بھاری لگے گا۔۔۔تیرا پسینہ بہتا ہے تو میرا دل نچڑتا ہے پگلے۔۔۔تیری تھکاوٹ تجھے سینے سے لگا کے ہی لے لیتی ہوں۔۔۔!"

حیات نے محبت پاش نگاہوں سے ماں کو دیکھا اور بولا۔۔۔

"لیں پھر ایک اور جپھی۔۔۔!" وہ دوبارہ گلے لگتا ہنس کر بولا تو سکینہ نے اس کا منہ چوم کر پیشانی پہ آئے بال اوپر کیے۔۔۔

"جا جا کے جلدی سے نہا دھو۔۔۔تیرے ابا جی آنے والے ہوں گے۔۔۔ساتھ والے پنڈ گئے تھے۔۔۔اب تک تو شائد ڈیرے پہ آبھی گئے ہوں۔۔۔!"

"ہممم۔۔۔جاتا ہوں۔۔۔اور باقی سب ٹھیک ہیں اماں حویلی میں۔۔۔یہ چاچا آفتاب اور

پھو پھو قدسیہ کے گھر والے۔۔۔؟"

حیات نے لہجے کو سرسری رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن سکینہ چونکیں تھیں۔۔۔یوں آتے ہی کبھی نہی پوچھتا تھا وہ سب کا۔۔۔

"اور مہتاب کے گھر والے بھی یہیں ہوتے ہیں۔۔۔!" سکینہ نے یاد دلایا تو وہ کھسیا گیا۔۔۔

"وہی وہی۔۔۔سبھی اماں۔۔۔سبھی کا پوچھا ہے۔۔۔سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔!"

"سب کرم ہے اللہ کا۔۔۔فارغ ہو لے نا تو ساروں سے مل لے جا کے۔۔۔ملنا کیا ہے سب ادھر ہی اکھٹے ہو جائیں گے تیرے آنے کا سن کر۔۔۔میں رچی کو بھیجتی ہوں ساروں کو بتا آئے کہ تو شہر سے آگیا ہے۔۔۔!"

"نہی اماں مت بھیجو۔۔۔سب کو پتا چل گیا ہو گا۔۔۔!"

وہ اپنی جھونک میں کہتا جانے لگا لیکن زبان اوپری ہونٹ کو لگا تا ایک آنکھ میچ گیا۔۔۔سکینہ نے اس کی پشت کو بغور دیکھا لیکن بولیں کچھ نا۔۔۔ماں کی خاموشی محسوس کرتا وہ خود ہی پلٹا اور بھاؤ سے بولا۔

"ابھی آتے ہوئے راستے میں رابی مل گئی تھی۔۔۔اور اس کا تو آپ کو پتا ہے نا کہ ڈھولچی ہے پوری۔۔۔سب کو خبر کر دی ہو گی۔۔۔اس لیے کہہ رہا تھا کہ ملازمہ کو نا بھیجیں۔۔۔ویسے بھی میں سب سے شام میں ملوں گا ابھی اپنی اماں سے باتیں کرنی ہیں مجھے۔۔۔!" وہ لاڈ سے کہتا اپنی پیشانی سکینہ کے سر سے چھوتا ہوا بولا۔۔۔سکینہ نے اونچے لمبے بیٹے کی بلائیں لیں اور ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پہ لگا تیں بولیں۔

"چل جا اب۔۔۔جلدی سے نہا دھو کے آ۔۔۔میں ناشتہ بنواتی ہوں۔۔۔!"

اور حیات فوراً وہاں سے غائب ہوا تھا۔۔۔سکینہ نے بیٹے کے بدلے انداز پہ کچھ پل غور کیا اور پھر مسکراتی ہوئی باورچی خانے کا رخ کیا۔۔۔!

☆......☆......☆

رقیہ نے ناشتہ چوہدری آفتاب کے سامنے سلیقے سے لا کر رکھا تو وہ جو حساب کتاب کا کھاتا کھولے بیٹھے تھے اسے بند کرتے مسکرا کر بیوی کو دیکھنے لگے۔۔۔رقیہ ان کی والہانہ نگاہوں سے گھبراتی ادھر ادھر دیکھتی انہیں گھورتے ہوئے بولی۔۔۔

"کیا کرتے ہیں۔۔۔جوان بچیاں ہیں گھر میں۔۔۔دیکھ لیں تو کیا سوچیں گی۔۔۔!"

چوہدری آفتاب نے بیوی کا ہاتھ تھاما اور اپنے سامنے رکھی کرسی پہ زبردستی بٹھا کر بولے۔۔۔

"میاں بیوی کی محبت بھری گفتگو اور ان کا محبت سے ایک دوسرے کو دیکھنا بچوں کے ذہن پہ اچھا اثر ڈالتا ہے اللہ کی بندی۔۔۔اور پگلی محبت سے زیادہ تو میں نے تمہیں عزت دینے کی کوشش کی ہے۔۔۔میری اتنی خدمت کرتی ہو تم۔۔۔میری بچیوں کی تربیت کرتی ہو تو بدلے میں میں تمہیں میٹھی نظروں سے دیکھ بھی نہیں سکتا کیا۔۔۔؟"

"توبہ استغفار جی۔۔۔میں کون ہوتی ہوں ایسے سوچنے والی۔۔۔بس ویسے ہی کہا تھا کہ بچیاں میرے ساتھ مخول کرتی ہیں۔۔۔یہ جو چھوٹی ہے نا آپ کی وہ اکیلے میں پتا ہے کیا بولتی ہے۔۔۔؟"

"کیا بولتی ہے۔۔۔؟" چوہدری آفتاب نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے محظوظ لہجے میں سوال کیا۔۔۔

"کہتی ہے اماں آپ کی تو پسند کی شادی ہوئی لگتی ہے۔۔۔ابا جی ایویں ہی تو آپ کے گن نہیں گاتے۔۔۔ضرور آپ دونوں نے محبت کی ہوگی۔۔۔لیں بتائیں بھلا۔۔۔یہ چھٹانکی سی ہے اور باتیں سنیں ذرا اس کی۔۔۔ماں سے سوال کرتی ہے ایسے۔۔۔!"

چوہدری آفتاب کھل کے ہنسے اور ہاتھ میں تھاما نوالہ خفت زدہ سی رقیہ کے منہ میں ٹھونس دیا۔۔۔وہ اس عمل کے لیے تیار نہیں تھیں سو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا گئیں۔۔۔چوہدری آفتاب نے محبت پاش نگاہوں سے اپنی ہمدم و غمگسار کو دیکھا جو آج بھی روز اول کی طرح ان کی ایک میٹھی نگاہ سے گھبرا جایا کرتی تھیں۔۔۔چوہدری آفتاب نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور ناشتے کی جانب متوجہ ہو گئے۔۔۔آج ویسے بھی انہیں جلدی تھی۔۔۔انہیں زمینوں پہ جلد از جلد پہنچنا تھا۔۔۔فصل اتر رہی تھی اس لیے سر پہ موجود رہنا ضروری ہوتا تھا۔۔۔

"خیر سے حیات آیا ہے شہر سے۔۔۔خانم بتا رہی تھی۔۔۔صبح مائی جی کے گھر سے واپسی پہ ملاقات ہوئی ہے ان کی۔۔۔ابھی کچھ دیر میں جا کے خیر خبر لے کر آؤں گی بھرجائی کے ہاں سے۔۔۔!"

چوہدری آفتاب دلجمعی سے سن رہے تھے۔۔۔حیات ان کا لاڈلا بھتیجا تھا اور اس کے آنے پہ وہ بے حد سکون محسوس کرتے تھے۔۔۔بن کہے وہ بازو بن جاتا تھا ان کا۔۔۔وہ کچھ کہنے لگے تھے کہ پیچھے سے بھاری مردانہ آواز ابھری۔۔۔

"آپ جم جم آئیں چاچی۔۔۔لیکن آپ سے پہلے میں خود اپنے چاچا جی سے ملنے چلا آیا۔۔۔!"

حیات نے پشت سے ہی چوہدری آفتاب کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو سرور کی سی کیفیت ان کے رگ و پے میں سما گئی۔۔۔وہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے ہو کر بھتیجے کو سینے سے لگا لیا۔۔۔حال احوال پوچھ کر حیات، رقیہ چاچی کی چھوڑی کرسی پہ بیٹھ گیا اور دونوں چچا بھتیجا شہر کی کہانیاں کھولنے لگے۔۔۔رقیہ مسکرا کر چائے پانی کا بندوبست کرنے باورچی خانے کی جانب مڑی تو کشور کا دھنک رنگ آنچل تیزی سے راہداری میں گم ہوا تھا۔۔۔وہ مسکراہٹ دباتی اندر چلی گئیں۔۔۔اور باہر حیات، چوہدری آفتاب کے ساتھ باتیں کرتا مسلسل نگاہیں بچا کر ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔۔۔یہ پہلی بار تھا کہ وہ شہر سے واپس آیا تھا اور نہا دھو کر سیدھا یہاں چلا آیا تھا ورنہ اب تک سہہ پہر کے بعد بڑے سے صحن میں شام کو جب سبھی اکھٹے ہوتے تو وہیں سب بزرگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔لیکن اس دفعہ جیسے قدم ہی دل مجبور ہوا تھا جو کشور کے پلو سے بندھا یہاں آن پہنچا تھا اور حیات اسی پلو سے بندھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

حویلی کے وسیع و عریض صحن میں اس وقت خوب رونق تھی۔۔۔چاروں گھروں کے افراد خانہ وہاں موجود تھے۔۔۔پھوپھو قدسیہ بیمار تھیں لیکن حیات کے شہر سے آنے کا سن کر وہ بھی یہاں آ بیٹھی تھیں۔۔۔یہ صحن حویلی کے باغ کے پہلو میں تھا۔۔۔ایک طویل راہداری باغ کی جانب نکلتی تھی۔۔۔جہاں ہر قسم کا پھلدار اور پھولدار درخت پودا موجود تھا۔۔۔لڑکیوں کا زیادہ تر وقت وہیں بیتتا تھا۔۔۔چوہدری آفتاب نے وہاں پینگ ڈلوا دی تھی جس کے بعد لڑکیوں کو وہیں گھسے رہنے کا بہانہ مل گیا ہوا تھا لیکن آج سب کی سب صحن میں تھیں سوائے کشور کے جو ملازماؤں کے ساتھ کچن میں لوازمات تیار کر رہی تھی۔۔۔گرمیوں کے دن تھے دودھ سوڈے اور شربت کا دور چلتا تھا۔۔۔ساتھ پھل رکھے جاتے جن میں آم سرفہرست تھا۔۔۔صحن کے چہار اطراف بڑے بڑے پائیوں والی چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔۔۔چاروں کونوں پہ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔۔۔چارپائیاں بچھانے سے پہلے سارے صحن کو پانی بہا کے ٹھنڈا کیا گیا تھا۔۔۔فرش سے گرمی بھاپ بن کے اڑی تو ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پہ جوتا اتار کے پیر رکھنے کو دل کرنے لگا۔۔۔ایک طرف چار پانچ کرسیاں اور پیڈسٹل فین الگ سے سیٹ تھا جہاں حیات اور رابی

کے دونوں بھائی بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔۔۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔۔۔ ایک چار پائی پہ پھپھو قدسیہ اور حمیدہ بیٹھی تھیں جبکہ ان کے سامنے والی پر سکینہ اور رقیہ موجود تھیں۔۔۔ چار پائیوں کے کنارے رکھے گاؤ تکیے سبھی کو کمر ٹیکنے کا موقع دے رہے تھے۔۔۔ خانم اور رابی صحن کے برامدے کے موٹے گول ستون سے بازو لپیٹے گول گول چکر کھا رہی تھیں اور ساتھ باتیں کیے جا رہی تھیں۔۔۔ ایک مکمل گھریلو سکون دیتا منظر تھا جب ایک جانب سے شہاب الدین سر پہ اونچے شملے کی پگ پہنے نمودار ہوئے اور پورے کروفر سے چلتے آ کر ایک چار پائی پر براجمان ہو گئے۔۔۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگتے تھے۔۔۔ ان کے بیٹھتے ہی چوہدری آفتاب اور پھپھو قدسیہ کے شوہر چوہدری انور ایک ساتھ اپنے حصے سے یہاں آتے دکھائی دیے تو شہاب الدین نے نخوت سے مونچھوں کو بل دیے۔۔۔ دونوں کے وہاں آتے ہی تینوں لڑکے اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔۔۔ چوہدری شہاب کو اشتعال آیا۔۔۔

"میرے آنے پہ تم لوگوں کی ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں، اندھے ہو گئے تھے جو میں دکھائی نہی دیا۔۔۔!"

انہوں نے لڑکوں کو لتاڑ کر رکھ دیا تو شرمندگی سے تینوں بغلیں جھانکنے لگے۔۔۔ رابی اور خانم بھی سہم کر کتنی یہیں دیکھنے لگی تھیں۔۔۔ حیات نے آگے بڑھ کر باپ کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگایا اور بولا۔۔۔

"ایسا نہی ہے اباجی۔۔۔ اصل میں آپ کے پاس سے ہی تو اٹھ کر آئے تھے ہم باہر تو بس خیال نہی رہا۔۔۔!"

"دھیان رکھا کرو پترو۔۔۔ چلو شاباش بیٹھو باتیں شاتیں کرو۔۔۔!"

انور چوہدری نے معاملہ رفع دفع کیا۔۔۔ تینوں واپس نشستیں سنبھال چکے تو مرد زمینی معاملات پہ بحث کرنے لگے۔۔۔ تبھی کشور ملازمہ کے ساتھ بڑے بڑے تھالوں میں سٹیل کے گلاس اور جگ لیے وہاں چلی آئی۔۔۔ ساتھ نفاست اور سلیقے سے کٹے پھل بھی تھے۔۔۔ چار پائیوں کے وسط میں پڑے لکڑی کے ٹھوس میز پر اس نے سب سجا دیا۔۔۔ سب بڑوں کو گلاس تھمانے کے بعد شش و پنج میں تھی کہ لڑکوں کو کیسے دے۔۔۔ آج دل کو عجیب پکڑ دھکڑ لگی تھی۔۔۔ دھڑکن پلٹ پلٹ کر کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔ پلکیں اٹھانا محال ہوا جا رہا تھا کیونکہ پہلی بار حیات کی نگاہیں خود پہ ٹھہری محسوس ہو رہی تھیں۔۔۔ اس گرمی میں اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔۔۔ بے بسی سے کن اکھیوں سے ماں کو دیکھا جنہوں

نے اس کی حالت بھانپ کر فوراً ابی اور خانم کو آواز لگائی۔۔۔ دونوں دگڑ دگڑ کرتی بھاگی چلی آئیں۔۔۔ شہاب الدین نے شرر بار نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا لیکن الہڑ عمر تھی دھیان ہی کہیں اور ہوتے تھے۔۔۔ ماں کے اشارے پہ خانم نے جلدی سے ٹرے پکڑی اور بھائیوں کی جانب لے گئی۔۔۔ سب نے گلاس اٹھا کے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگانا لازم سمجھا۔۔۔ وہ سبھی اس سے ایسی ہی محبت کرتے تھے۔۔۔ حیات نے اپنی کرسی کو اس رخ پر موڑا جہاں سے ماں کے پیچھے لگ کر بیٹھی کشور دکھائی دے سکتی۔۔۔ سکینہ نے بیٹے کی حرکت کو دیکھ لیا تھا۔۔۔ وہ دل میں الفاظ تولنے لگیں کہ رقیہ کے کان میں بات ڈال دیں کہ جس رشتے کی چاہت مرحوم چوہدری شجاعت کو تھی اب اسے جوڑا جائے پر ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔۔۔ شہاب الدین کی دھاڑ نے ساری محفل تلپٹ کر کے رکھ ڈالی تھی۔۔۔ وہ غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور غضبناک نظروں سے آفتاب اور بہنوئی کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ تمام خواتین بھی صورتحال سے پریشان اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئیں۔۔۔ جبکہ چوہدری آفتاب کے سکون میں رتی فرق نہیں آیا تھا۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکے تھے۔۔۔ حیات پریشان سا باپ کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔۔۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے آڑے نا لگا۔۔۔ وہ زمین کل بھی میری تھی آج بھی میری ہے اور رہنی بھی میری ہی ہے۔۔۔ لازم نہیں اباجی نے جو غلطی کی اس کا خمیازہ ان کے پتر بھگتیں۔۔۔ مہتاب تو بنا کچھ کہے سنے چلا گیا دنیا سے۔۔۔ لیکن اس کا بھائی زندہ ہے اور یہ زمین میں اپنے اور مہتاب کے پتر کے نام لگوا کے رہوں گا۔۔۔ سمجھے۔۔۔؟؟؟“

شہاب الدین بھڑک کے بولے تو سب کو مسئلے کی نوعیت کا اندازہ ہوا۔۔۔ چوہدری آفتاب نے سکون سے ہاتھ میں تھاما گلاس خالی کیا اور اسے نیچے فرش پہ ایک طرف رکھ کر گردن اونچی کیے شہاب الدین کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔۔۔

”کل ڈیرے پہ بھی آپ نے تماشا لگایا تھا بھا شہاب اور میں خاموش رہا تھا۔۔۔ مجھے لگا کسی بات کا غصہ یہاں نکال رہے ہیں لیکن آج میں بھی آپ کو آخری بار کہہ رہا ہوں کہ جو زمین اباجی نے میرے نام لگا دی سو لگا دی۔۔۔ میں اس کا ایک انچ ٹکڑا بھی آپ کو نہیں دوں گا۔۔۔ رہ گیا مہتاب بھا کا پتر قاسم تو زمینوں

کی نا اسے کمی ہے نا آپ کو۔۔۔ ہاں لالچ کی حد نہیں ہوتی۔۔۔ ورنہ سارا جگ جانتا ہے کہ آپ اباجی کے جانے کے بعد میری کتنی اور کونسی زمین ہڑپ کر چکے ہیں۔۔۔!"

"آفتاب۔۔۔" شہاب الدین بری طرح گرجے۔۔۔ "حد میں رہ اس سے پہلے کہ میں تیرے سینے میں گولیاں اتار کے کھیل ہی ختم کر دوں تیرا۔۔۔ تُو کیا اور تیری اوقات کیا۔۔۔ اباجی جو ناانصافی کر گئے سو کر گئے۔۔۔ ان کو تو پکڑ نہیں سکتا لیکن تجھے چھوڑ کر اپنے مرے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا میں۔۔۔!"

ان کی اس قدر دیدہ دلیری پہ چوہدری آفتاب متانت سے ہنس دیے۔۔۔ جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بیوقوفی کو نظر انداز کرتا ہو۔۔۔ چوہدری مہتاب کی بیوہ حمیدہ کے بھی چتون تیکھے ہو چلے تھے وہ جیٹھ کی مکمل حمایتی تھیں۔۔۔ انہیں بھی کہاں بھاتا تھا آفتاب اور اس کا ٹبر۔۔۔ اب جب بات کھلی تھی تو ان کا حق تھا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی جگہ کھڑی ہوتیں لہذا سب خواتین سے چند قدم کی دوری بنا کر وہ گردن اکڑائے جیٹھ کی پشت پر کھڑی ہو گئیں۔۔۔ سکینہ نے شوہر کو ملامت سے دیکھا اور نظر پہلو میں باپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھے پریشان سے بیٹھے پر پڑی تو تاسف کی لہر چہرے پہ دوڑ گئی۔۔۔ وہ کیا بات کرنے جا رہی تھیں اور یہاں کون سا سیاپا کھل گیا تھا۔۔۔ اتنے سال بعد حیات شہر سے رہنے آیا تھا ورنہ تو محض رات گزار کر پو پھٹنے سے پہلے واپسی ہو جایا کرتی تھی۔۔۔ وہ دل میں دکھ سے سوچتی نمرہ کو یاد کرنے لگیں۔۔۔ نمرہ باپ کی لاڈلی تھی اور اکثر ان کے غصے کو قابو کرنے کے لیے اسے ہی ان کے سامنے کیا جاتا تھا لیکن اب تو وہ بیاہ کے حویلی سے جا چکی تھی اب تو جو کچھ تھا بس خود کے ہاتھوں میں تھا۔۔۔ انہوں نے ہمت کی اور شوہر سے مخاطب ہوئیں۔۔۔

"چوہدری جی۔۔۔ سکون سے بات کریں۔۔۔ بھائی ہے آپ کا آفتاب۔۔۔ بھلا کوئی بھائیوں کو بھی یوں۔۔۔"

"میرا بھائی مر چکا ہے۔۔۔ یہ سوتیلا ہے سوتیلا۔۔۔ اور سوتیلے بھائی نہیں ہوا کرتے۔۔۔ بس شراکت دار ہوا کرتے ہیں۔۔۔ اور تُو بیچ میں نا آ حیات کی ماں۔۔۔ تجھے ان زمینوں کے جھمیلوں کا کیا پتا جن پہ غیر قابض ہو گئے ہیں۔۔۔!"

شہاب الدین نے بیوی کی بات کاٹ کر اپنی کہہ سنائی تھی۔۔۔ جواباً سکینہ پلو دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر پریشان نظروں سے حیات کو دیکھنے لگیں۔۔۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح وہ اس وقت باپ کو یہاں

سے لے جائے۔۔۔لیکن صورتحال ابتر ہو رہی تھی۔۔۔

" نا میں غیر ہوں نا قابض۔۔۔" آفتاب نے دکھ آمیز لہجے میں جواب دیا۔۔۔" میں نے اپنا حق چھوڑا تھا اگر یاد ہو آپ کو بھا شہاب۔۔۔نہیں تو کروا دوں گا۔۔۔اب جس زمین کی آپ بات کر رہے ہیں یہ اباجی نے مجھے دی تھی اور اس پہ میری اولاد کا حق ہے۔۔۔اس کا چپہ بھی آپ کو نہی دوں گا۔۔۔آپ مجھے بھائی نا سمجھیں لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو اباجی کی جگہ سمجھ کے عزت دی ہے۔۔۔اور مجھے اس بات کے لیے افسوس نا لگائیں۔۔۔!"

آفتاب کا اتنا کہنا تھا کہ شہاب الدین کو پتنگے لگ گئے۔۔۔وہ گریبان جھپٹنے کو آگے بڑھے لیکن حیات نے انہیں پیچھے سے جکڑ لیا اور آفتاب کے سامنے انور چوہدری اور ان کے دونوں بیٹے سینہ تان کے کھڑے ہو گئے۔۔۔ان سب کی دلی وابستگی آفتاب سے رہی تھی کیونکہ شہاب الدین کے کروفر اور غرور کے آگے کوئی سماتا ہی نہیں تھا۔۔۔قدسیہ کے سب بچے آفتاب پر جان دیتے تھے۔۔۔شہاب الدین یہ منظر دیکھ کر بری طرح تلملائے۔۔۔خود کو غصے سے حیات کی جکڑ سے چھڑایا اور چادر کو جھٹک کے آفتاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے غرائے۔۔۔

" یہ ایک زمین ہی کیا آفتاب۔۔۔میرا وعدہ ہے تجھ سے کہ میں تیرے پاس کچھ بھی نہیں رہنے دوں گا۔۔۔!"

ان کی یہ بات صرف وہاں کھڑے مرد حضرات نے سنی تھی جب کہ خواتین کو کچھ فاصلے پہ ہونے کی وجہ سے سنائی نہی دی تھی۔۔۔شہاب الدین وہاں رکے نہی تھے اور محفل بدمزہ کرتے چلے گئے تھے۔۔۔

آفتاب نے جس متانت کے ساتھ ان کی کرختگی اور ناانصافی کا سامنا کیا تھا اس کے لیے سکینہ اور حیات جی بھر کے شرمندہ تھے۔۔۔سکینہ نے آگے بڑھ کر حواس باختہ کھڑی کشور کو ساتھ لگایا اور یکا یک انہیں ناجانے کیا سوجھی کہ کلائی میں پہنا سونے کا موٹا کنگن اس کی کلائی میں چڑھا دیا۔۔۔یہ بے اختیاری عمل تھا۔۔۔وہ ایسا کرنے کا ارادہ نہی رکھتی تھیں لیکن انہیں خود بھی نہی معلوم تھا کہ ایک دم سے ان سے یہ کیسے ہو گیا تھا۔۔۔سبھی حیرت زدہ سے دیکھتے رہ گئے تھے۔۔۔حمیدہ بری طرح تلملائی تھیں۔۔۔رقیہ ناسمجھی سے شوہر کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جن کے چہرے پہ ہنوز اطمینان تھا لیکن بھرجائی کی اس حرکت پہ ماتھے پہ سوچ

کی لکیریں ضرور ابھریں تھیں۔۔۔قدسیہ نے فوراً آگے بڑھ کر کشور کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور رقیہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔۔۔آفتاب کا ماتھا چوما۔۔۔قدسیہ پھپھو کے دونوں بیٹوں نے حیات کو گھیر لیا اور چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی تو سارا ماحول بدل گیا۔۔۔ابھی کچھ دیر پہلے جو کشیدہ فضا شہاب الدین چھوڑ گئے تھے وہ ایک دم سے تبدیل ہو گئی تھی۔۔۔انور چوہدری نے آفتاب کے کندھے پہ بازو پھیلایا اور انہیں لیے گپ شپ لگانے اپنی حویلی کی جانب چل دیے۔۔۔خانم اور رانی جو ستون کی آڑ میں دبکی ہوئی تھیں چھلانگیں مارتی کشور کو ہلکان کرنے سر پر پہنچ گئیں۔۔۔صحن میں ہنسی اور خوشی ایکدم سے پھیلی تھی اور بے حد بھلی لگ رہی تھی۔۔۔سکینہ ،شہاب الدین کی وجہ سے متفکر تھیں کہ انہیں کیا جواب دیں گی لیکن بیٹے کا کھلتا چہرہ دیکھ دل جیسے ہلکا ہو گیا تھا۔۔۔وہ جانتی تھیں کہ شہاب الدین کو اس رشتے پہ قائل کرنے کے لیے کسے بلانا پڑے گا۔۔۔حمیدہ منہ پھلائے کھڑی تھیں ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رقیہ کا مسکراتا چہرہ نوچ لیتیں۔۔۔وہ وہاں سے جانے ہی لگیں تھیں جب نظر گیٹ پہ بت بنے کھڑے قاسم کی جانب اٹھی۔۔۔لال بھبھوکا چہرہ اور پتھریلے تاثرات۔۔۔کوئی بھی دیکھ کر اندازہ لگا لیتا کہ اس کے اندر کیسی ہلچل ہے۔۔۔سبھی نے حمیدہ کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور قاسم راؤ کو دیکھا۔۔۔چھ فٹ سے نکلتا قد، سرخ و سفید رنگت، ہلکے گھنگریالے بالوں سے بھرا ہوا اونچی پیشانی والا سر۔۔۔قاسم بے حد خوبرو تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ خون چھلکا رہا تھا۔۔۔حیات اور رانی کے بھائی اس کی جانب بڑھنا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی اس کے پیچھے سے سنہری نمودار ہوئی تھی۔۔۔چھریرے بدن اور متناسب قد پہ بے تحاشا گوری رنگت والی سنہری۔۔۔چھوٹی آنکھوں اور بنا پلکوں والی سنہری۔۔۔مکاری سے مسکراتی اور عیاری سے مسکراہٹ پہ پردہ ڈالتی سنہری۔۔۔سنہرے مستقبل کی تلاش میں "حویلی لکھاں" میں قدم رکھنے والی سنہری۔۔۔وہ سنہری جس نے آنے والے وقت میں سب کی تقدیروں کے ساتھ کھیلنے کا ہنر آزمانا تھا۔۔۔جس نے نصاب لکھنا تھا اور حساب لگانا تھا۔۔۔!

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا

تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر، تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو، انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا

ابرِ گریز پا کو برسنے سے کیا غرض
سیپی میں بن نہ پائے گہر، تم کو اس سے کیا

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر، تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا

(پروین شاکر)

ٹھنڈی گیلی سیاہ سڑک اس وقت رات کی تاریکی اور دھند میں لپٹی بے حد اجاڑ دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ ہر پل سرکتا تاریکی اور دھند کو مزید دبیز کرتا جا رہا تھا۔۔۔ یہ کیلیفورنیا کی ایک قدرے سنسان سڑک تھی جو پلے لینڈ سے متصل تھی۔۔۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا۔۔۔ پلے لینڈ سنسان پڑا تھا۔۔۔ چند گھنٹے پہلے رونقوں میں ڈوبا، قہقہوں اور چہکاروں سے اٹا تھا۔۔۔ بھاگتے دوڑتے اور من مانی کرتے بچوں اور ان کے پیچھے لپکتے ان کے والدین سے جیسے یہاں زندگی بھری تھی۔۔۔ لیکن پھر سارا ماحول جیسے خاموشی کی قبر میں جا سویا تھا۔۔۔ جھولے ساکت اور دیوہیکل سوِنگز جام ہو چکے تھے۔۔۔ جگہ جگہ ایستادہ مختلف کارٹون کریکٹرز پہ بنے بڑے بڑے پتلے رات اور دھند کے پس منظر میں عجیب ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے۔۔۔ اکا دکا فوڈ پوائنٹس کھلے دکھائی دے رہے تھے لیکن گاہکوں کا رش نہیں تھا۔۔۔ لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔۔۔ سب کے ٹھکانے تھے جہاں ان کی چھوٹی چھوٹی دنیائیں آباد تھیں۔۔۔ لیکن ایک شخص دھندلی سڑک کے کنارے بینچ پر خاموش ٹانگ پہ ٹانگ رکھے یوں بیٹھا تھا کہ اس پر بھی کسی پتلے کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ لانگ کوٹ کے اوپر ہیٹ پہنے اور گلے میں مفلر لپیٹے وہ اپنے لانگ بوٹ کی چمک پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوا تھا۔۔۔ چہرے پہ نا کوئی تاثر تھا نا احساس۔۔۔ بے حد سپاٹ چہرہ اس کی آنکھوں سے لگا نہیں کھاتا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں بے حد سرخی تھی اور وہ بھیگی بھیگی سی تھیں۔۔۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ایک ڈھائی فٹ کی سٹک تھام رکھی تھی جس کی مسلسل ہلکی ہلکی ضرب وہ اپنے گھٹنے پہ رکھی دوسری ٹانگ کے ٹخنے پہ مارتا تھا۔۔۔ ایک غیر ارادی فعل تھا جو ادا ہو رہا تھا۔۔۔ وہ نا جانے کب تک بیٹھا رہتا جب قریب سے تین بائیکس پہ ہپی نما لونڈے ہوٹنگ کرتے زن سے گزرے۔۔۔ پہلی بار اس کے بے تاثر چہرے پہ ناگواری کی لہر جاگی اور جیسے چہرے کی برف پگھلی۔۔۔ وہ ٹانگ سے ٹانگ اتارتا ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا ہوا۔۔۔ ہاتھ میں تھامی اسٹک کو انگلیوں میں ہلکا سا گھمایا اور ناک کی سیدھ میں اسی جانب چل دیا جس طرف وہ لڑکے گئے تھے۔۔۔ ایک چھوٹا سا ٹھکانہ اس کا بھی تھا جہاں وہ محض رات گزارنے جاتا تھا۔۔۔ ورنہ دن تو کیسے گزر جاتا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔۔۔ ایک طویل مدت ہو چکی تھی اسے مسافر ہوئے۔۔۔ پیروں کے آبلے اب اس سے مانوس ہو چکے تھے۔۔۔ وہ یونہی اپنی زندگی تمام کرنا چاہتا

تھا۔۔۔وہ کبھی واپس پلٹ کے دیکھنا نہی چاہتا تھا کیونکہ واپس پلٹنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں لیکن وہ پتھر ہو کے یہاں آیا تھا اور اب پلٹتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔۔۔!

ہلکی سی خنکی لیے رات بھیگ رہی تھی اور آج وہ بلا مقصد گاڑی گھما رہا تھا۔۔۔زمن کے گھر سے نکلے اسے دو گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی بنا کسی وجہ کے سڑکیں ناپے۔۔۔لوگ اسے اینگری ینگ مین کہہ کر بلاتے تھے اور وہ بلاشبہ تھا بھی۔۔۔اس نے کھلکھلا کے ہنسا چھوڑ دیا تھا۔۔۔وہ سدا سے ایسا نہیں تھا لیکن جب سے تھا تب سے اس نے خود کو بدلنے کی کوشش نہی کی تھی۔۔۔ایک فیز وہ تھا جو اس کے لڑکپن کا تھا تب وہ اچانک آگہی کی منزلیں ایک جست میں طے کرتا نفرت جیسے جذبے میں ملفوف ہو گیا تھا۔۔۔پھر یہ غلاف بھی اترا تھا۔۔۔اس نے بھی زندگی جینے کی شعوری کوشش کی تھی مگر یہ مدت بہت تھوڑی سی تھی۔۔۔ایک حادثہ دوبارہ سے اسے اسی تابوت میں بند کر گیا جس سے باہر وہ روشنی کے خوف سے آتا ہی نہیں تھا۔۔۔وہ سامنا ہی نہی کرنا چاہتا تھا رشتوں کا اور ان سے جڑی حقیقتوں کا۔۔۔اور آج زندگی اسے ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں اسے پرانے پنے کھولنے تھے۔۔۔وہ سب پڑھنا آسان نہی تھا۔۔۔کئی یادیں مٹ چکی تھیں اور کئی دھندلی تھیں لیکن جو اس کی شخصیت پر پکارنگ چھوڑ گئیں تھیں وہ بھیانک تھیں اور انہی سے وہ فرار اختیار کرتا آیا تھا۔۔۔!

ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے ڈرائیو تھرو سے اس نے اپنے لیے کافی آرڈر کی اور ایک قدرے سنسان سڑک کے کنارے گاڑی روک کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتا زمن اور ہاجرہ کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔آج کتنی ہی دیر ہاجرہ اس سے باتیں کرتی رہی تھیں۔۔۔وہ اس کا چہرہ اتنی عقیدت اور احترام سے دیکھتی تھیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتا تھا۔۔۔اسے کئی بار ان کی نگاہیں کچھ کھوجتی سی محسوس ہوئیں تھیں۔۔۔وہ اس کے نقش ٹٹولتی تھیں اور اس کے دیکھنے پر نگاہ چرا لیتیں۔۔۔کتنی بار وہ اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے خاموش ہو جاتیں۔۔۔ان کے لب پھڑپھڑاتے اور پھر ساکت ہو جاتے۔۔۔زمن اس دوران مسلسل آس پاس منڈلاتی رہی تھی۔۔۔وہ اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔۔۔باتوں باتوں میں اس نے جان لیا تھا کہ ابھی تک انہوں نے اگلی رہائش گاہ نہیں ڈھونڈی تھی۔۔۔زمن نے رباب آنٹی کے سامنے محض اسے

ٹالنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا۔۔۔جاتے ہوئے وہ ہاجرہ کو تسلی دے کر آیا تھا کہ وہ خود فائزہ خاکوانی سے بات کرے گا اگر ان کی انیکسی خالی ہوئی تو وہ شفٹ ہونے میں مدد کرے گا۔۔۔زمن کو پتنگے لگ گئے۔۔۔وہ سٹپٹا کے کچھ کہنا چاہتی تھی جب اس نے بے دھڑک اسے جھڑک دیا۔

"جتنی انسان کی عقل ہو اتنا ہی کام کرنا چاہیے۔۔۔تمہارا کام بس اتنا ہے کہ طریقے سے جب تک مجبوری ہے نوکری کرو اور ناک کی سیدھ میں گھر واپس آجایا کرو۔۔۔اس کے بعد کی سب فکریں تم مت پالو۔۔۔ان کے لیے دوسروں کی عقل پر بھروسہ کرو۔۔۔سمجھی۔۔۔!"

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔۔۔لاؤنج سے نکل کر برآمدہ عبور کرتا گیٹ کی جانب جا رہا تھا جب زمن تن فن کرتی اس کے پیچھے گئی۔۔۔ہاجرہ کے منع کرنے کے باوجود وہ نہیں رکی۔۔۔

"آج مجھے آپ بتا ہی دیں کہ مجھ پر کس حیثیت سے رعب جھاڑتے ہیں۔۔۔آخر میرا اور آپ کا رشتہ ہی کیا ہے۔۔۔میں کیوں بلاوجہ آپ کے پریشر میں آؤں۔۔۔ڈاکٹر ہیں بس علاج سے مطلب رکھیں یہ مفت کی تعلق داری کیوں نبھا رہے ہیں۔۔۔!"

وہ دروازے سے سر جھکا کر باہر نکل رہا تھا لیکن زمن کی بلا تکان چلتی زبان نے اسے روک لیا۔۔۔اس نے ہنکارہ بھر کے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔۔۔ مسلسل دیکھا اور اتنا بغور دیکھا کہ زمن بری طرح سٹپٹائی۔۔۔ہاتھوں سے کپڑوں کی نادیدہ سلوٹیں جھاڑیں اور دوپٹہ درست کیا۔۔۔تیکھی ناک کی نوک کو شہادت کی انگلی سے چھوا۔۔۔مہریار مسکرا دیا۔۔۔

"ایک گہری نگاہ تمہارے باتوں کے توتے اڑا سکتی ہے۔۔۔زمانہ تو اس سے بہت گھاگ ہے۔۔۔جب تک تم نے نبھا لیں تو سو نبھا لیں اب خود کو حالات کے حوالے کر دو۔۔۔وقت اور حالات بہت جلد سب کی حیثیت کا تعین کر دیں گے۔۔۔اور اب دروازہ بند کر کے اندر جا کے باقی کا کڑھ لینا۔۔۔یہاں ہاتھ کانپ رہے ہیں تمہارے۔۔۔چلتا ہوں۔۔۔!"

اور زمن نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو وہ سچ میں کپکپا رہے تھے۔۔۔وہ واقعی اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔۔۔مہریار باہر نکل گیا تو اس نے دروازہ مارنے والے انداز میں بند کیا تھا۔۔۔!!!

کافی کا بھاپ اڑاتا کپ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ مسلسل زمن اور ہاجرہ کے متعلق سوچتا خود کو انتہائی قدم کے لیے تیار کر رہا تھا۔۔۔زمن کو مدد کی ضرورت تھی۔۔۔وہ جتنی بھی بہادر بنتی لیکن ایک پوائینٹ پر آ کر وہ پسپا ہو جاتی تھی۔۔۔وہ سہارا تلاشنے لگتی تھی۔۔۔اور مہریار چاہتا تھا کہ اب کی بار اسے آسرا ڈھونڈنا نا پڑے بلکہ اس کے پاس ہمہ وقت ایسا کوئی موجود ہو جس پہ وہ مکمل بھروسہ کر سکے اور مکمل اختیار سونپ سکے۔۔۔اس نے کافی کا کپ احتیاط سے کپ ہولڈر میں رکھا اور ہاتھ میں موبائل تھام کر اس کی سیاہ سکرین کو گھورنے لگا۔۔۔کچھ سوچ کر اس نے ایک لمبا سانس خارج کیا اور کال ملا دی۔۔۔دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔۔۔اس کی سماعتیں مکمل چوکس ہوئی بس دوسری جانب سے ابھرنے والی آواز کی منتظر تھیں اور جیسے ہی کال پک ہوئی اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔

"آپ کی ضرورت ہے۔۔۔وہیں جہاں آپ کو ہونا چاہیے تھا ہمیشہ سے۔۔۔!"

اور کہہ کر اس نے بنا دوسری طرف کا جواب سنے کال کاٹ دی تھی۔۔۔وہ انکار کی گنجائش نہیں چاہتا تھا۔۔۔بہت لمبا سفر تھا اور بے حد دھول تھی جس کے چھٹنے کے بعد ہی منظر واضح ہو سکتا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

شہزور بہت جلدی آفس پہنچا تھا۔۔۔جوش اس کے ہر ہر انداز سے عیاں تھا۔۔۔وہ کتنے دنوں کے لیے شہر آیا تھا خود بھی نہیں جانتا تھا لیکن یہ بات پکی تھی کہ اب کی بار خالی ہاتھ واپسی نہیں ہو گی اس کی۔۔۔جس کے لیے اتنے سالوں سے سڑکیں ناپ رہا تھا اسے لے کر جائے گا۔۔۔وہ اپنا کوٹ اتار کر سیٹ کی پشت پہ ڈالتا ریلیکس سا سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔۔۔گرے شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا اور اس کی سرخ و سفید رنگت آج مزید چمک رہی تھی۔۔۔ہلکی بڑھی شیو اور گھنی مونچھوں تلے عنابی لبوں کی تراش میں بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔۔۔ہلکے سنہرے بال تھوڑے سے ماتھے پہ گرے تھے اور عقب میں گلاس وال سے آتی دھوپ کی روشنی میں بے حد دلکش لگ رہے تھے۔۔۔اگر رعونت اور تکبر کو چوہدری شہزور راؤ کی ذات سے نکال دیا جاتا تو وہ کسی لڑکی کا بھی خواب ہو سکتا تھا۔۔۔ذرا سی دائیں بائیں کرسی گھماتے وہ اس

دلنشیں پیکر کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے جوان ہونے تک بارہا سوچا تھا۔۔۔زندگی میں جب جو چاہا تھا پایا تھا تو اب وہ بھلا کیسے اسے چھوڑ دیتا جسے بچپن سے چاہتا آیا تھا۔۔۔وہ کچی عمر کا خواب تھی۔۔۔وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے پاگل تھا تو محض اس لیے کہ اسے خود سے منسوب ہر چیز اپنی دسترس میں رکھنے کی عادت تھی۔۔۔

"وہ تم سے کبھی منسوب نہیں تھی شہزور راؤ۔۔۔تم زبردستی خود سے اسے نتھی کرتے ہو۔!"

کوئی اس کے کان میں بدبدایا تھا۔۔۔وہ چونک کے سیدھا ہوا۔۔۔بلا وجہ نتھنے پھڑپھڑائے۔۔۔پلٹ کر گلاس وال کی جانب رخ پھیرا اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکا کر وہ باہر کا منظر دیکھتے ہوئے خود سے ہم کلام ہوا۔۔۔

"زبردستی ہی سہی لیکن میری ہے۔۔۔اور جب میری ہے تو میرے ساتھ ہی جائے گی۔۔۔اور اب میں اسے وقت دے رہا ہوں نا۔۔۔ورنہ کیا مجھے مشکل تھا کہ ابھی جاتا اور اسے اس کے گھر سے نکال کر حویلی لے جاتا۔۔۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ سکون اور تسلی سے اس سے میری پہلی ملاقات ہو۔۔۔میں اسے ڈرانا نہیں چاہتا۔۔۔جیسے وہ بچپن میں مجھ سے کھیلنا پسند کرتی تھی اور کسی کے ساتھ بھی نہیں کھیلتی تھی ویسے ہی چاہتا ہوں وہ اب بھی بس مجھ پر اعتبار کرے۔۔۔!"

وہ شائد اپنے ضمیر کو تسلی دے رہا تھا۔۔۔وہ جانتا تھا کہ وہ اسے خوفزدہ کرنے کی حد تک تنگ کرتا رہا ہے لیکن اس دفعہ وہ طریقے سے اس تک جانے کا خواہشمند تھا۔۔۔اس کے گھر کا مکمل پتا اس کے پاس موجود تھا۔۔۔لیکن اب وہ اس کے گھر پر دھاوا بولنے کی بجائے مہمان کے طور پر جانا چاہتا تھا۔۔۔گزشتہ تمام عرصے میں اس کی جانب سے ہوئی تلاش کے نتیجے میں جس طرح اسے ٹھکانے بدلنے پڑے تھے،اب کی بار ایسا نا ہو۔۔۔درحقیقت وہ اسے فرار ہی کا تو موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔۔۔اس نے کچھ سوچ کر اپنے پی اے کو کال ملائی۔۔۔دوسری طرف سے کال اٹھاتے ہی وہ ٹیک لگا گیا اور سکون سے مخاطب ہوا۔۔۔

"ہاں نصر۔۔۔تیاری مکمل ہے۔۔۔؟بس کل شام کو چلنا ہے۔۔۔آج کا دن میں ضروری کام

نمٹاؤں گا اور فارم ہاؤس کا چکر لگاؤں گا۔۔۔پہلے وہیں لے کر جاؤں گا۔۔۔وہاں سے گاؤں۔۔۔تم نے فارم ہاؤس کی صفائی وغیرہ کروا دی تھی نا۔۔۔؟"

نصر کا تسلی بخش جواب موصول ہونے کے بعد وہ کھل کر مسکرایا۔۔۔نگاہوں کی چمک یکسر بڑھ گئی تھی۔۔۔کال بند کر کے چند پل وہ آنکھیں موندے کچھ سوچتا رہا اور پھر دوبارہ نمبر کسی کو کال ملائی۔۔۔

"ہیلو۔۔۔ہاں لائبہ۔۔۔آفس پہنچو جلدی۔۔۔کچھ ضروری کام ہے اور گھر انفارم کر دو کہ تم دو اگلے تین دن کے لیے آفس کے کام سے میرے ساتھ آؤٹ آف اسٹیشن چل رہی ہو۔۔۔"

وہ ایک پل کو خاموش ہوا تھا شائد لائبہ کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔اس نے ٹیبل سے کوئی فائل اٹھائی۔۔۔ایک دو صفحات پلٹے اور پرے کھسکاتے ہوئے بولا۔۔۔

"مجھے تمہیں اپنے ساتھ فارم ہاؤس لے کر جانا ہے،وہاں تمہیں میری گیسٹ کو کمپنی دینی ہے۔۔۔سمجھ رہی ہو نا۔۔۔ہممم۔۔۔نائس۔۔۔ایم ویٹنگ۔۔۔!"

وہ کال بند کر گیا اور موبائل ٹیبل پر رکھ کر واپس گلاس وال کی جانب منہ پھیر کر کرسی ہولے ہولے گھمانے لگا۔۔۔سب کچھ مکمل تھا۔۔۔وہ اس بار مکمل اطمینان اور پورے پلان سے چل رہا تھا۔۔۔وہ لائبہ کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا تھا تاکہ زمن کو گھبراہٹ نا ہو۔۔۔وہ خود کو تنہا اور غیر محفوظ محسوس نا کرے۔۔۔لیکن قدرت کسی کے پلانز کے حساب سے نہیں چلتی۔۔۔اس کا اندازہ اسے عنقریب ہونے والا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

آج اتوار تھا۔۔۔فائزہ خاکوانی اس وقت کچن میں موجود تھیں۔۔۔صبح کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا جب لائبہ جاگنگ سوٹ پہنے بالوں کی اونچی سی پونی کیے سامنے کی طرف سے بالوں کو بینڈ سے سمیٹے ،کانوں میں ہینڈ فری ڈالے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی۔۔۔وہ صبح خیز تھی۔۔۔چھٹی والے دن بھی وہ اسی روٹین میں اٹھتی تھی۔۔۔ایک گھنٹہ وہ ایکسرسائز کو لازمی دیتی تھی۔۔۔اس نے اوپر والے پورشن کے ایک حصے کو سبز اور پھولدار پودوں سے سجا رکھا تھا۔۔۔وہیں ایک جانب ٹریڈمل اور ایکسرسائز میٹ بچھا ہوا تھا جہاں وہ ورزش کرتی تھی۔۔۔اور اب وہ فارغ ہو کر ناشتے کے لیے نیچے آئی تھی۔۔۔کرسی کھینچ کر

بیٹھنے کے بعد اس نے موبائل کی سکرولنگ شروع کر دی تھی۔۔۔فائزہ خاکوانی نے اسے گھور کر دیکھا اور جوس کا گلاس اس کے آگے کیا لیکن اس کا مکمل دھیان فون کی جانب تھا۔۔۔فائزہ نے چڑ کر اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹا اور ہینڈ فری نوچے۔۔۔لائبہ نے آنکھیں میچ کر خود کو پرسکون کیا اور رُوٹھے انداز میں ماں کی جانب دیکھا۔۔۔کچھ ورزش کی وجہ سے چہرہ تمتما رہا تھا کچھ وہ قدرتی سرخ و سفید تھی۔۔۔اونچی پونی میں خفا سے تاثرات کے ساتھ وہ فائزہ خاکوانی کو ہو بہو اپنے باپ کی کاربن کاپی لگی۔۔۔وہی طنطنہ، وہی نقوش اور ان میں گندھی نخوت۔۔۔!

فائزہ نے اس سے نگاہیں چرائیں اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔۔۔

"ماں کو گھور لیا ہو تو ناشتہ کر لو مہارانی۔۔۔باقی کا دن اسی ڈھول کو پیٹنا ہے۔۔۔!" ان کا اشارہ سیل فون کی جانب تھا۔۔۔

"ماما ایک دن ملتا ہے بس چھٹی کا۔۔۔اس دن کو تو مرضی سے گزار لینے دیا کریں۔۔۔لیکن نہی۔۔۔بلکل ساسوں جیسا رویہ ہو جاتا ہے آپ کا مجھ سے۔۔۔!"

سلائس پہ مکھن لگاتے ہوئے وہ نیم خفگی سے بولی تو فائزہ دھیما سا مسکرا کر سر جھٹک گئیں۔۔۔

"میں کیوں بنوں گی بھلا ساس۔۔۔لیکن کسی نا کسی نے تو بننا ہے نا اس لیے تمہیں تھوڑا انسان بنانا چاہتی ہوں۔۔۔میں نہی چاہتی کوئی یہ کہے کہ تم بلکل اپنے باپ پر گئی ہو۔۔۔!" سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر انہوں نے ڈبل روٹی کے سلائس کا لقمہ لیا۔

"ماما۔۔۔!!!" لائبہ تنبیہا پکاری۔۔۔"کیا ماما۔۔۔نہیں ہوں میں اپنے باپ جیسی۔۔۔کیوں مجھے ریلیٹ کرتی ہیں اس شخص سے جو ہماری زندگیوں میں کہیں نہی ہے۔!"

"اچھا اگر نہی ہے تو کیوں شہز۔۔۔" ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ لائبہ کے موبائل پر کال آنے لگی تھی۔۔۔

"لیں شیطان کا نام لینے لگی تھیں اور اسی نے کال کر دی۔۔۔!" لائبہ شرارت سے ماں کو دیکھتی نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی بولی۔۔۔

" بکو نہیں۔۔۔شرم کرو اسے شیطان بولتی ہو۔۔۔خود کی حرکتیں دیکھی ہیں کبھی۔۔۔!" فائزہ نے تادیبی نگاہیں اس پر گاڑتے ہوئے کہا۔۔۔لائبہ نے انگلی کے اشارے سے بعد میں بات کرنے کا کہا اور کال پک کی۔۔۔

" جی سر السلام وعلیکم۔۔۔جی سر میں ٹھیک۔۔۔جی جی۔۔۔"

وہ بول رہی تھی اور فائزہ مکمل توجہ سے اسی کو سن رہی تھیں۔۔۔جس کے چہرے پر اب ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔۔۔

"لیکن سر میری مدر شائد نا مانیں۔۔۔مجھے ان سے۔۔۔!"

وہ کہتی کہتی پھر چپ ہوئی۔۔۔اور اب کی بار وہ خاموشی سے بات سنتی رہی۔۔۔کال بند کر کے اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔۔۔فائزہ بری طرح پریشان ہو گئیں۔۔۔

"کیا ہوا ہے لائبہ۔۔۔وہ ٹھیک تو ہے نا۔۔۔ایسے کیوں بیٹھ گئی ہو۔۔۔بولو بھی۔۔۔!"

" ماما وہ ٹھیک ہے بلکل۔۔۔آپ کو اس کی فکر لگ گئی ہے۔۔۔لیکن وہ جو کرنے جا رہا ہے وہ ٹھیک نہی ہے۔۔۔!"

" لائبہ مجھ سے تھپڑ کھا لو گی اب۔۔۔جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے۔۔۔میرا دل بیٹھ رہا ہے۔۔۔!"

" آپ کی ورکر ہے ایک زمن۔۔۔اٹھیں ابھی اس کے گھر چلیں۔۔۔!" وہ کھڑی ہوئی۔۔۔

" کیوں لیکن۔۔۔ایسے کیسے۔۔۔!"

فائزہ کھڑی ہوتیں بری طرح پریشان ہوئی پوچھ رہی تھیں۔۔۔

" تم کیسے جانتی ہو زمن کو۔۔۔وہ تو بہت اچھی اور پیاری بچی ہے۔۔۔؟؟"

لائبہ دونوں ہتھیلیاں میز کی سطح پر رکھے لاچاری سے ماں کو دیکھتی سوچ رہی تھی کہ کدھر سے بتائے اور کہاں سے شروع کرے۔۔۔فائزہ خاکوانی ایک گہرا سانس بھر کر کرسی سے واپس ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔۔۔

" میرا کھڑوس باس اس پیاری بچی کے پیچھے پڑا ہے ماما۔۔" وہ دانت چباتی بولی۔۔۔" رکیں بتاتی ہوں۔۔۔!"

کچھ سوچ کر اس نے پوری بات ماں کو بتانے کا فیصلہ کیا۔۔۔ویسے بھی اس معاملے میں انہیں اعتماد میں لینا از حد ضروری تھا۔۔۔

"میرا اول درجے کا کمینہ باس۔۔۔ایک نمبر کا دو نمبر۔۔۔"

"لائبہ۔۔۔" فائزہ نے چڑ کر ٹوکا۔۔۔" اصل بات پر آؤ۔۔۔مجھ سے سٹریس برداشت نہی ہوتا لائبہ۔۔۔!"

"میری بات آرام سے سنیں۔۔۔ہمیں فی الحال زمن کے گھر جانا ہے اور اسے اس کی فیملی سمیت ہماری انیکسی میں شفٹ کرنا ہے ماما۔۔۔کیونکہ۔۔۔!!!"

اور اس نے ہر وہ بات جو اس مد میں اسے معلوم تھی ماں کے گوش گزار کر دی۔۔۔فائزہ خاکوانی نے دکھ اور اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔۔۔جیسے جیسے وہ سنتی جا رہی تھیں ان کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔۔۔لائبہ نے ان کے دونوں ہاتھ ارادتاً تھام رکھے تھے کیونکہ ماں کی حساسیت سے وہ بخوبی واقف تھی۔۔۔

"اب آپ کیا کہتی ہیں۔۔۔کیا فوری طور پر اسے اس مصیبت سے نکالنا نہی چاہیے ماما ہمیں۔۔۔؟"

ساری بات کہہ چکنے کے بعد وہ رسان سے ماں سے پوچھ رہی تھی جنہوں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر ٹیبل پر رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور اپنی آنکھوں کی نمی نفاست سے صاف کر لی۔۔۔

"ماما۔۔۔یہ وقت دکھی ہونے یا پریشان ہونے کا نہی ہے۔۔۔شہزور سر کی کسی بھی حرکت پر ہم کمپرومائز نہی کریں گے۔۔۔اسے کسی کی زندگی سے کھیلنے کا حق نہی ہے اور اگر وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تب بھی اس کی ایسی کی تیسی۔۔۔میں دیکھتی ہوں کیسے کرتا ہے وہ یہ شادی۔۔۔!"

اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر فائزہ افسردگی سے مسکرائیں۔۔۔ان کا دلکش چہرہ یکدم مرجھا سا گیا تھا۔۔۔

"ہم بھلا کس حق سے اسے روک سکتے ہیں لائبہ۔۔۔ہمارا لگتا ہی کیا ہے وہ۔۔۔!"

"یہ تو وقت بتائے گا ماما کہ کون کس کا کیا لگتا ہے۔۔۔لیکن میں اس پر جو حق رکھتی ہوں اس سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوں گی۔۔۔اب اٹھیں جلدی۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کھڑوس مجھے کال کرے دوبارہ ہمیں زمن کے گھر پہنچنا ہے اور اس کی فیملی کو یہاں لانا ہے۔۔۔اس کے بعد دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔۔۔!"

"چلو چلیں۔۔۔زمن جتنی سویٹ ہے میں بھی نہیں چاہتی کہ وہ کسی مشکل میں پڑے۔۔۔لیکن پہلے ہم رباب کے ہاں جائیں گے۔۔۔زمن اس سے قریب ہے اور اس افراتفری کی صورتحال کو وہی قابو کر سکتی ورنہ ہم ایک دم جا کر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چلو سارا سامان سمیٹو اور ہماری انیکسی میں چلو۔۔۔اس لیے رباب کو لینا ضروری ہے۔۔۔میں راستے میں اسے ساری سچویشن سے باخبر کر دوں گی۔۔۔تم بانو کو کہو کہ پیچھے سے دھیان رکھے اور گیٹ نا کھولے۔۔۔!"

فائزہ آخر میں اسے ہدایات دیتی اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور لائبہ عجلت میں گاڑی کی چابیاں ڈھونڈتے ہوئے بانو کو پکارنے لگی۔۔۔!

☆......☆......☆

"حیات ولا" میں بقول نانی پیاری "ڈشکروں کی فوج" گھر پہ موجود تھی۔۔۔ڈائیننگ ہال کے ٹیبل پہ چاروں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔۔۔داور اور یاور بائیں جانب کی کرسیوں پر اور زارون اور شہریار دائیں جانب ان دونوں کے مقابل۔۔۔ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھنے کا سیشن چل رہا تھا۔۔۔نگاہوں ہی نگاہوں میں ہڑپ کر لینے کا پیغام دیا جا رہا تھا۔۔۔چاروں کے درمیان سرد جنگ کئی دن سے جاری تھی۔۔۔شہریار نے مکھن لگانے والی چھری اٹھائی اور اس کی دھار پہ انگلی پھیرتا یا سر کو ایک آنکھ چھوٹی کیے تول رہا تھا۔۔۔زارون جو اپنی عینک کو ٹی شرٹ کے دامن سے صاف کر رہا تھا، اس نے کن اکھیوں سے شہریار کی حرکت دیکھ کر خود بھی کانٹے کو بطور ہتھیار اٹھا کر بلکل سیدھ پہ بازو سامنے کھڑا کر لیا۔۔۔دوسرے ہاتھ سے سرعت سے عینک آنکھوں پہ لگائی۔۔۔داور نے چمچ اٹھایا اور تلوار پکڑنے کے انداز میں اسے لہرانے لگا۔۔۔یاور نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ ڈھال کے طور پر سامنے کی اور کچھ الگ قسم کا ہتھیار ڈھونڈنا چاہا۔۔۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں اسے اپنی نقل کرنے کا طعنہ دیں اس لیے اسے کچھ ہٹ کر چاہیے تھا۔۔۔لیکن ٹیبل پہ کانٹے چمچیاں ہی پڑے تھے۔۔۔اس نے ایک جائزہ لیتی نگاہ دوبارہ میز پر دوڑائی اور ٹوتھ پکس کی ڈبی سے ایک ٹوتھ پک نکال کر انگلی اور انگوٹھے میں دبائے شہریار اور زارون کو دیکھتا ہوا ہواؤں کو چبھونے لگا۔۔۔بتانے کا مقصد تھا کہ ایسے ہی تم لوگوں کی ہوا نکال کر رکھ

دوں گا۔۔۔شہریار استہزائیہ ہنسا اور اپنی مکھن لگانے والی چھری کی دھار پہ انگلی پھیرتا ہوا بولا۔۔۔

" ہی ہی ہی۔۔۔آج تک اس چھری سے ڈبل روٹی پہ مکھن لگتا آیا ہے۔۔۔آج میں اس سے تم دونوں کا فیٹ نکال دوں گا۔۔۔ہی ہی ہی۔۔۔!"

وہ دوبارہ اونچا سا ہنسا تو یاور نے اسے ناک چڑھا کر یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل جانے کا یقین ہو۔۔۔اس کے خود کے ہاتھ میں ٹوتھ پک اور ڈھال کے طور پر پلیٹ جیسے ہتھیار چمک رہے تھے۔۔۔

" یہ جو کانٹا میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو نا۔۔۔" زارون کو لگا اسے بھی دھمکانا چاہیے۔۔۔" اس پر آج تک بوٹی ٹنگ کے کھائی ہے۔۔۔آج میں اس پہ تم دونوں کو ٹنگ کے رکھ دوں گا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔!"

وہ بھی شہریار جیسا ہی ہنسا تھا۔۔۔شہریار نے حوصلہ افزائی کے طور پر اس کا کندھا تھپکا۔۔۔

" اپنی شکل دیکھی ہے۔۔۔کھال اترے بکرے جیسی ہو رہی ہے۔۔۔ہمیں کیا ٹنگو گے زارون بابا آپ کے تو اپنے بخیے ادھڑے پڑے ہیں۔۔۔!"

داور نے کہہ کر دفعتاً اٹھ کے ہاتھ میں پکڑا چمچ زارون کی کانٹا تھامے بند مٹھی پہ مارا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔۔۔زارون بلبلا اٹھا اور روہانسا ہوتا شہریار سے بولا۔۔۔

" یہ لو۔۔۔دیکھا۔۔۔انجانے میں وار کیا ہے۔۔۔اب میرا بدلہ تم پر واجب ہے شہری۔۔۔یہ کانٹا پکڑو اور ان دونوں کو نوڈلز کی طرح لپیٹ دو اس پر۔۔۔!"

" صبر کرو صبر اور دشمنوں پر وار بے خبری میں ہی کرو تو کاری ہوتا ہے۔۔۔!"

" دشمنی تو آپ نے کی ہے شہری بھیا ہم دونوں سے۔۔۔کیا تھا جو آپ ہماری شکایت نا کرتے مہر لالہ سے۔۔۔آپ کی وجہ سے انہوں نے ہم دونوں کے کالج چکر لگایا ہے۔۔۔صرف آپ کی وجہ سے۔۔۔!"

" ہاں تو اچھا کیا نا۔۔۔کرتوتیں معلوم ہو گئیں تم دونوں کی۔۔۔کالج میں پڑھنے کے بہانے سیاستیں کرتے ہو۔۔۔کبھی سنا ہے کہ میں یا مہر لالہ کسی سیاسی گروپ کا حصہ بنے ہوں۔۔۔اچھا ہوا تم دونوں کے ساتھ۔۔۔!"

شہریار اچھل اچھل کے بول رہا تھا۔۔۔ساتھ چھری مسلسل لہراتے ہوئے وہ اسے بائیں جانب

بیٹھے زاروں کی طرف کر دیتا تو وہ فوراً سر ٹیبل کے نیچے گھسیڑ لیتا۔۔۔اس کی کم بختی آتے پتا نہی چلتا تھا۔۔۔!

وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ایک دوسرے پہ پل پڑنے کو تیار تھے تبھی نانی پیاری اور فضلو ناشتہ لیے وہاں داخل ہوئے۔۔۔چاروں نے اپنے اپنے ہتھیار نیچے کیے۔۔۔یاور نے ٹوتھ پک ابھی تک تھام رکھی تھی اور چبھونے کے لیے بے چین تھا۔۔۔نانی پیاری آ گئی تھیں اس لیے ہدف دور ہو چکے تھے۔۔۔مایوس نگاہوں میں فضلو کا تھل تھل کرتا پیٹ امید کی کرن بن کے چمکا۔۔۔اس کے قریب آتے ہی یاور کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔۔۔فضلو نے ہاتھ میں ہاف فرائی انڈوں کی پلیٹ اور دوسرے میں مکھن کا پلیٹر پکڑ رکھا تھا۔۔۔پیچھے نانی پیاری پراٹھے اور چائے کا تھرماس لیے ہانپتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔۔۔یاور نے اپنے سر پہ پہنچ چکے فضلو کے پیٹ میں زور کی ٹوتھ پک چبھو دی۔۔۔بس جیسے کتے کی دم پہ پاؤں آنے سے کتا بدک کر اچھلتا ہے بلکل ویسے ہی فضلو اچھلا تھا۔۔۔اور ایسا اچھلا تھا کہ ہاف فرائی انڈوں کی پلیٹ چھوٹ کر زاروں کے اوپر پڑی تھی۔۔۔وہ ٹی شرٹ کا دامن اٹھا کر دوبارہ عینک صاف کر رہا تھا اور اب اس کے دامن میں انڈے بھرے تھے۔۔۔ہونق سا وہ اپنی جھولی تک رہا تھا۔۔۔شہریار نے دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھ لیے۔۔۔داور اور یاور دونوں اچک اچک کر زاروں کی صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے۔۔۔فضلو بیچاری سی شکل بنا کر مکھن والا پلیٹر ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔۔۔نانی پیاری نے قریب آ کر پراٹھے اور تھرماس ٹیبل پر رکھے اور فضلو کو گھر کا۔۔۔

"یہ بت بن کر کیوں کھڑا ہے کم بخت۔۔۔مکھن رکھ۔ یہاں کیا خود کو لگائے گا۔۔۔؟"

"وہ نانی جی۔۔۔وہ۔۔۔" فضلو کھسیایا۔

"ارے ہٹ پراں۔۔۔کیا وہ وہ کر رہا ہے۔۔۔انڈے کدھر ہیں۔۔۔؟"

"گود میں۔۔۔!" فضلو منمنایا۔

"نانی فجلو نے زاروں کی گود بھرائی کر دی ہے انڈوں کے ساتھ۔۔۔!" یاور نے ساتھ بیٹھے داور کی کرسی کی پشت پہ بازو پھیلاتے ہوئے فخریہ اطلاع دی۔۔۔نانی پیاری نے حیرت سے زاروں کو دیکھا جو ہاف فرائی انڈے ٹی شرٹ کی جھولی میں کسی خیرات کی طرح لیے بیٹھا تھا اور چہرے پہ سکتے کے آثار تھے۔۔۔

"ستیاناس جائے تیرا فجلو۔۔۔دفع ہو جا اندر۔۔۔ساڈا نا ہووے تے۔۔۔کوئی کام تیرا ج کا نہیں۔۔۔لے دس پکڑ کے سارا ہی لبیڑ دیا تم لوگوں نے۔۔۔!"

"ہم نے نہی کیا نانی۔۔۔فجلو نے اس کی گود بھرائی کی ہے۔۔۔فجلو نے۔۔۔!" شہریار نے ناک سے مکھی اڑائی۔۔۔

"وے زارون۔۔۔وے منڈیا اٹھ۔۔۔جا جا کے دھو خود کو۔۔۔او رن باہر کھرے پہ جا۔۔۔غسل خانے میں واڑھنا کریں۔۔۔!"

"اب کہاں جاؤں گا نانی۔۔۔!" زارون کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔۔۔"میری گود بھر گئ اور مجھے خبر بھی نا ہوئی۔۔۔امی نے پوچھا کس کے ہیں یہ انڈے۔۔۔کہاں سے آئے ہیں یہ انڈے تو کیا کہوں گا۔۔۔نانی میں کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔!"

زارون ہونق پن سے بولتا جا رہا تھا اور شہریار سمیت داور اور یاور کے قہقہے چھت پھاڑتے باہر آئے۔۔۔فجلو نے بھی بتیسی نکالی اور شرما کے بولا۔۔۔

"زارون بابا۔۔۔میرا نام لے دینا۔۔۔میں یہ الزام اپنے سر لیتا ہوں۔۔۔!"

تینوں میز بجا بجا کے ہنسے اور ہنستے ہوئے ایک دوسرے پہ گرنے لگے۔۔۔نانی پیاری بات سمجھنے کی کوشش میں تھیں۔۔۔

"دیکھو مکرنا جانا فجلو۔۔۔ورنہ یہ دنیا مجھے جینے نہی دے گی۔۔۔میں اس پاپی دنیا کا سامنا نہیں کر پاؤں گا۔۔۔!" زارون اپنی ٹی شرٹ کی جھولی پھیلائے ان انڈوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔۔۔نانی پیاری کو تاؤ آیا اور کھینچ کے چپیڑ زارون کے گال پہ دھری۔۔۔

"ہن ہوش آئی کہ لاواں اک ہور۔۔۔نک دم ہوگئ میں تم لوگوں کی حرکتوں سے۔۔۔!"

"کیا نانی۔۔۔اب آپ بھی ہم سے تنگ آگئیں ہیں۔۔۔آپ تو ہماری ٹیم ممبر تھیں۔۔۔!" زارون گال پہ ہاتھ دھرے بولا۔۔۔

"کھسماں نوکھا گئ یہ ٹیم۔۔۔میری تو ہڈیاں کھڑک گئیں تم چاروں کو سنبھالتے سنبھالتے۔۔۔شہر

آئی تھی کہ کسی طرح کوئی سوادی لڑکی دیکھ کر مہر کو ویاہ پہ راضی کریں گے۔۔۔لیکن وہ منڈا اپنے پہ ہاتھ دھرنے نہی دیتا۔۔۔میں تو نکو نک ہو گئی اب تو۔۔۔!"

نانی پیاری واقعی اکتائی ہوئی تھیں۔۔۔فضلو کو بھی دو ہتڑ مار کر کچن میں بھیجا تو وہ لجاتا ہوا زارون کو دیکھتا چلا گیا۔۔۔

"نانی میری کروا دیں۔۔۔!" داور منہ بسور کے لاڈ سے بولا

"کس سے کرا دوں تیری۔۔۔ ہوا چھینک کے جائے گی کیا کڑی۔۔۔؟"

"نہی نانی۔۔۔لڑکیاں بہت ہیں۔۔۔گڑیا، مونا، حیا، فاخرہ، مبینہ، ہانیہ۔۔۔جتنی کہیں گی لڑکیاں مل جائیں گی نانی۔۔۔!" داور نے جذبات میں کافی لمبی لسٹ دے دی تھی اور اب سب اس کا مشکوک نگاہوں سے ایکسرے کر رہے تھے۔۔۔

"بے حیا۔۔۔اسلام میں چار کی اجازت ہے۔۔۔تو ان سب سے کرے گا کیا۔۔۔!" نانی پیاری فکرمند سی ہوتی بولیں۔۔۔

"وقفے وقفے سے سبھی سے کروا دیں گے نانی۔۔۔ایسا بھی کیا اچنبھا۔۔۔!"

داور کی بجائے جواب مہریار نے دیا تھا۔۔۔دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑا سفید کرتہ شلوار پہنے۔۔۔کف کہنیوں تک فولڈ کرتا وہ سرد نگاہوں سے داور کو ہی دیکھ رہا تھا۔۔۔داور کی سیٹی گم ہو گئی۔۔۔ وہ جھک کر خالی پلیٹ کا ڈیزائین رٹنے لگا۔۔۔باقی تینوں بھی فوراً ناشتے کی طرف متوجہ ہوئے۔۔۔نانی پیاری نے خفا خفا سی نظر مہریار پر ڈالی جو اس نے دیکھ لی۔۔۔وہ مبہم سا مسکرایا اور چلتا ہوا اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔

"ناک صاف کرنا آتا نہی جناب کو اور نکاح کا کتنا شوق چڑھا ہوا ہے۔۔۔کبھی ڈگریوں کی فہرست گنوائی ہے۔؟؟؟ بس سارا دن بے ہودگیاں کروا لو۔۔۔اس دفعہ اگر تمہارا جی پی اے اچھا نہ آیا نا داور تو گاؤں بجھوا دوں گا اور ابا جی سے کہوں گا وائی بیجی کروائیں تم سے۔۔۔چار دن میں عقل اور شکل سب ٹھکانے لگ جائے گا۔۔۔سمجھے۔۔۔!"

"سمجھ گیا لالہ۔۔۔!"

"کیا سمجھ گیا۔۔۔؟"

"یہی کہ نا کھیلیں گے نا کھیلنے دیں گے۔۔۔سب کنوارے مریں گے۔۔۔!" داور نے کہا اور اپنی پلیٹ میں پراٹھا رکھ کر اس کے بڑے بڑے لقمے لینے لگا۔۔۔مہریار نے سر جھٹکا اور نانی پیاری سے مخاطب ہوا۔۔۔

"کیا چل رہا ہے نانی۔۔۔ چھٹی کے دن اچھا سا ناشتہ مل جائے گا کیا۔۔۔؟"

وہ فرصت سے ناشتے کی میز پہ نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔۔۔کن اکھیوں سے نانی پیاری کا روٹھا ہوا چہرہ بھی دیکھا۔۔۔شہریار نے زارون کو یہاں سے کھسکنے کا اشارہ کیا لیکن جواباً اس نے بے بسی سے گود دکھائی۔۔۔

"کون سی فرصت مہر پتر۔۔۔ابھی ہسپتال سے کال آئے گی اور تو نکل جائے گا۔۔۔تیری تو چھٹی آج تک نا دیکھی میں نے۔۔۔!" نانی نے کلستے لہجے میں کہا لیکن پورے انہماک اور شوق سے پراٹھے اور رات کا سالن اس کے آگے رکھا تھا۔۔۔ساتھ اچار کا جار بھی کھسکایا۔۔۔مہریار نے ایک نظر سارے لوازمات پہ نظر ڈالی اور پوچھا۔۔۔

"انڈے نہیں فرائی کیے نانی آپ نے۔۔۔؟ مجھے تو پراٹھا انڈے کے ساتھ لینا تھا۔۔۔!"

"سب کے سب فرائی انڈے زارون کی گود میں فلائی کر گئے لالہ۔۔۔!" نانی کی بجائے شہری نے نوالہ نگلتے ہوئے مصروف لہجے میں جواب دیا جیسے ناشتہ کرنے سے زیادہ اہم اس وقت کچھ اور نہیں تھا۔۔۔مہریار نے حیرت اور بے یقینی سے زارون کی مسکین شکل کو دیکھا اور پھر نظر اس کے چہرے سے پھسلتی گود میں اتری تو وہاں انڈے اپنی بے بسی کا نوحہ بیان کر رہے تھے۔۔۔زارون نے اپنی حالت کی المناکی دکھانے کی خاطر ٹی شرٹ کا دامن تھوڑا اونچا کر کے مہریار کی جانب کیا اور لہجے میں حلاوت بھر کے بولا۔۔۔

"مہر لالہ۔۔۔ان میں سے کوئی ایک دو سلامت ہیں تو اٹھا لیں۔۔۔ورنہ تو شیک بن چکا ہے۔۔۔!"

اور مہریار کو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔۔۔طیش کی شدید لہر اس کا وجود بھگو گئی لیکن وہ صبر کے گھونٹ

بھرتا نانی کو بے بسی سے دیکھتا سر مار کر رہ گیا۔۔۔دونوں انگوٹھوں کو جوڑے ان پہ پیشانی ٹکائے وہ سوچ رہا تھا کہ ناشتہ کیسے شروع کرے کہ اس کے موبائل کی بیل پہ سب نے سکھ کا سانس لیا تھا کیونکہ جب تک وہ کال سنتا سب کو ترتیب میں آنے کا تھوڑا سا وقت مل جاتا۔۔۔مہریار نے کال پک کی اور موبائل کان سے لگاتے نانی کو ہاتھ کے اشارے سے مگ میں چائے ڈالنے کا کہا۔۔۔نانی پیاری نے سرعت سے چائے انڈیلی اور ساتھ شہریار کو آواز دبا کر گھر کا۔۔۔

"وے شہری۔۔۔چک اینو۔۔۔لے جا ایہاں سے۔۔۔اس سے پہلاں کہ سباں دی (سب کی) ٹنڈ کر دے مہر۔۔۔!"

مہریار جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چند فٹ کے فاصلے پر خاموشی سے فون سن رہا تھا۔۔۔اس کے چہرے پہ تفکر سا تھا۔۔۔شہریار نے بغور دیکھ کر کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔۔۔

"نہیں ہوتی کسی کی ٹنڈ نانی۔۔۔آپ کا لاڈلا فون بند کرے گا۔۔۔پلٹے گا۔۔۔ہم سب کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھے گا اور بنا ناشتہ کیسے نیواں نیواں ہو کے نکل جائے گا۔۔۔!"

شہریار کی پیشن گوئیوں پہ باقی تینوں کو کلی اعتبار تھا۔۔۔وہ تینوں مہریار کی جانب کسی ٹی وی اسکرین کی طرح یک ٹک دیکھنے لگے۔۔۔مہریار کال بند کر کے پلٹا۔۔۔چلتا ہوا میز کے قریب آیا۔۔۔ان چاروں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور مڑ کر باہر جانے لگا لیکن پھر ٹھٹھک کے واپس ہوا اور میز کے قریب آ کر دونوں ہتھیلیاں جما کر شہریار کو نظروں میں لیتا ہوا بولا۔۔۔

"تم لوگوں کے پاس شام تک کا وقت ہے۔۔۔باربر شاپ پہ جاؤ اور کٹنگ کروا کے آؤ ورنہ شام کو میری واپسی پر اگر اسی طرح ملے تو تم لوگوں کی ٹنڈ کروا دوں گا وہ بھی فضلو سے۔۔۔سمجھے۔۔۔!"

انہماک سے ناشتہ کرتے شہریار کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔۔۔باقی تینوں نے اپنے ہاتھ سر پر دھر لیے۔۔۔مہریار خشمگیں نظروں سے دیکھتا وہاں سے چلا گیا۔۔۔نانی پیاری اس کے لیے ڈالی چائے کا مگ اپنی طرف کھسکا کے بیٹھ گئیں۔۔۔

"اک گل تے پکی اے۔۔۔اس منڈے نے گھوڑی نہیں چڑھنا۔۔۔بڑے بڑے ڈھیٹ

دیکھے میں لیکن ناجی اپنے مہر پتر سا کوئی ایک نہیں دیکھا۔۔۔جی تو کرتا ہے مہر کے ہتھ پیر باندھ کے۔۔۔"

"پالمیا لو وتے لا۔۔۔آہو۔۔۔!"

وہ چاروں کورس میں بولے تھے۔۔۔سب کی بھڑاس اس آہو میں جمع ہو کے نکلی تھی۔۔۔نانی پیاری لاچاری سے انہیں دیکھتی نیم گرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگیں۔۔۔!

☆......☆......☆

عجیب ہی منظر تھا۔۔۔چھوٹے سے لاؤنج میں وہ دونوں ہونق سی کھڑی کبھی رباب خان کو دیکھتی تھیں تو کبھی ان کے ہمراہ آئی لائبہ اور فائزہ خاکوانی کو۔۔۔

"رباب اتنی جلدی میں کیسے نکلیں۔۔۔مالک مکان کو کیا کہیں گے اور میرے پاس مکان کا ایڈوانس کرایہ دینے کے پیسے ابھی نہیں ہیں۔۔۔چند دن تو رکو۔۔۔اور۔۔۔اور آپ لوگ کھڑی کیوں ہیں۔۔۔؟؟؟"

ہاجرہ کو بات کرتے یکدم خیال آیا کہ زمن کی باس ان کے گھر موجود ہیں اور پہلی ملاقات ہے اس لیے ان کی جانب متوجہ ہوئیں۔۔۔

"بیٹھیں پلیز۔۔۔پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں۔۔۔زمن تو آپ کی تعریفیں کرتی نہی تھکتی۔۔۔آپ بیٹھیں تو۔۔۔!" وہ زمن کو ٹہوکا مارتی ہوئی وہاں سے ہٹیں اور صوفوں پہ ایک آدھ بکھری پڑی چیزیں سمیٹیں۔۔۔زمن کے اپنے حواس سلب تھے اسے کچھ سمجھ نہی آ رہا تھا ہو کیا رہا ہے۔۔۔وہ دونوں ناشتہ کر رہی تھیں جب بیل کی آواز پہ ہاجرہ نے گیٹ کھولا تھا۔۔۔اس نے ہاجرہ کے پیچھے رباب آنٹی اور فائزہ خاکوانی کے ساتھ ایک پیاری سی لڑکی کو اندر آتے دیکھا تو ہاتھ میں تھاما لقمہ وہیں رہ گیا۔۔۔وہ استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اپنی باس کو دیکھ کر وہ کیا ردعمل دے۔۔۔رباب خان نے اندر داخل ہوتے ہی ہاجرہ کے ہاتھ پیر پھلا دیے۔۔۔

"ہاجرہ۔۔۔چار جوڑے پیک کرو اپنے اور زمن کے۔۔۔ضرورت کی چار چیزیں رکھو اور نکلو جلدی۔۔۔زمن کی باس ہیں یہ فائزہ۔۔۔میری اچھی اور پرانی دوست بھی ہیں۔۔۔ان کی انیکسی خالی ہے اور ضرورتاً فرنشڈ بھی ہے۔۔۔انہیں بھی فوری طور پر اچھے پیئنگ گیسٹ کی ضرورت تھی تو مجھے خیال آیا

کہ اچھا موقع ہے تمہیں وہیں شفٹ کر دوں۔۔۔!"

ہاجرہ اور زمن کی تو جیسے ہوائیاں اڑی تھیں۔۔۔ اتنی جلدی بھلا کوئی کیسے شفٹنگ کر سکتا ہے۔۔۔لائبہ کن اکھیوں سے مسلسل زمن اور گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔۔۔مزاج میں بے تکلفی تو ازل سے تھی اس لیے چھوٹی سی ٹیبل پہ ناشتے کے ادھورے لوازمات پڑے تھے، وہیں ٹک کے ان کے ساتھ پوری ایمانداری سے انصاف کرنے لگی۔۔۔زمن نے ایک نظر حیرت سے اسے دیکھا ضرور لیکن اس وقت توجہ طلب لائبہ کی بے تکلفی نہیں بلکہ رباب آنٹی کی افراتفری تھی۔۔۔

"رباب میں سوہا کو کیسے اٹھا سکتی ہوں۔۔۔اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔۔۔وہ تو سیکنڈ نہیں لگاتی ہسٹیریک ہونے میں۔۔۔یوں اچانک سے اسے کہا کہ ہم گھر چھوڑ رہے ہیں تو اللہ جانے کیسے ری ایکٹ کرے۔۔۔رک جاؤ۔۔۔ایک دن تو دو مجھے۔۔۔!"

ہاجرہ بے بس سی ہوتی بولیں۔۔۔تو رباب خان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔۔۔

"ہاجرہ میں نے کہا ابھی جانا ہے تو بس ابھی جانا ہے۔۔۔تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔۔۔بحث میں وقت برباد نا کرو۔۔۔!" رباب کا لہجہ جہاں تلخ ہوا تھا وہیں انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ہاجرہ کا ہاتھ نامحسوس انداز میں دبایا تھا۔۔۔اس دباؤ نے ہاجرہ کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔۔۔لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ جیسے ٹھنڈے پسینے سے نہا گئیں۔۔۔انہوں نے فائزہ خاکوانی کا چہرہ دیکھا جس پہ محض ایک پرسکون اور شانت سی مسکراہٹ تھی۔۔۔رباب خان نے انہیں راستے میں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس معاملے سے خود کو لاتعلق ظاہر کریں گی جب تک ہاجرہ ان کے گھر نہی آ جاتیں۔۔۔فائزہ خاکوانی، ہاجرہ کے قریب ہوئیں اور ان کے چہرے کو انہی کے دوپٹے کے پلو سے تھپتھپا کر سہلایا اور تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔۔۔

"آپ مجھے اپنی دوست سمجھ سکتی ہیں جیسے رباب۔۔۔بھروسہ رکھیں۔۔۔اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔۔۔!"

ماحول کی سنگینی دیکھتے ہوئے لائبہ نے زمن کے اڑی رنگت والے چہرے کو بغور دیکھا اور کھنکار

کر اپنی جانب متوجہ کیا تا کہ اس کا دھیان ان تینوں کی باتوں سے ذرا سا ہٹ سکے۔۔۔

"ویسے پراٹھے بھی ناشتے میں مزہ دیتے ہیں۔۔۔ماما تو مجھے سلائس پر ٹرخا دیتی ہیں۔۔۔آج عرصے بعد ایسا ناشتہ کیا ہے۔۔۔بائی دا وے زمن آپ کا کھایا پیا جاتا کدھر ہے۔۔۔!"

وہ ارادتاً اس کی توجہ بھٹکا رہی تھی۔۔۔زمن اس کو دیکھ کر بدقت مسکرائی اور مہمان نوازی کا حق ادا کرنے کے لیے اس کے پاس آ کر اس کے لیے مگ میں چائے انڈیلنے لگی۔۔۔

"آپ کو اچھا لگا ہم غریبوں کا ناشتہ۔۔۔! خوشی کی بات ہے۔۔۔چائے بھی لیں۔۔۔اس ناشتے کا جوڑ چائے کے ساتھ ہی بنتا ہے۔۔۔!"

"آپ بھی لو نا تھوڑا سا ورنہ سارا ہی ہڑپ کر جاؤں گی میں۔۔۔!"

وہ اسے باتوں میں لگائے ان تینوں خواتین کو کچھ وقت دینا چاہتی تھی۔۔۔دوسری طرف ہاجرہ حلق تر کرتے ہوئے رباب سے پوچھ رہی تھیں۔۔۔

"سوہا کا کیا کروں رباب۔۔۔؟؟ اسے تیار کرنے دو۔۔۔کپڑے بدل دوں بس اس کے۔۔۔!"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔۔۔سوہا سیدھا ہاسپٹل جائے گی۔۔۔مہریار نے ایمبولینس کال کی ہے۔۔۔آتی ہوگی۔۔۔اس کی سرجری ہے اب اور اسے ایک ہفتہ پہلے مہریار نے ہاسپٹل رکھنا ہی تھا سو اچھا ہو جائے گا آج ہی شفٹ ہو جائے گی۔۔۔تم سوہا کے ساتھ ہی جانا، میں زمن کو لے کر فائزہ کے ہاں جاتی ہوں۔۔۔بس اپنا ضروری سامان پیک کر کے زمن کو دے دو وہی لے جائے گی۔۔۔باقی جو کچھ ہے وہ بھی چند دن تک خاموشی سے اٹھوا لیں گے۔۔۔مالک مکان سے راستے میں فون پہ بھی بات ہو سکتی ہے۔۔۔چابیاں پڑوس میں دے دو۔۔۔بس۔۔۔اب اس سے ہٹ کے کچھ نہیں۔۔۔نکلنے کی کرو۔۔۔!"

رباب خان نے سارا پروگرام جیسے کسی اسکرپٹ کی طرح ترتیب دے رکھا تھا۔۔۔ہاجرہ اثبات میں سر ہلاتی گردن موڑ کر زمن کو دیکھتی ہوئی بولیں۔۔۔

"زمن۔۔۔جلدی بیٹا۔۔۔فٹافٹ ایک ہی بیگ میں میرا اور اپنا ضروری سامان رکھو۔۔۔ایک چھوٹا بیگ سوہا کا ریڈی کرو۔۔۔ابھی کے ابھی۔۔۔!"

" امی کب تک بھاگیں گے ہم۔۔۔؟ تھکی نہیں ہیں کیا۔۔۔مجھ سے مت چھپائیں۔۔۔مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ رباب آنٹی یوں ہی جلدی نہیں مچا رہیں۔۔۔لیکن کیا اس بار ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔۔تھک گئی ہوں بھاگتے بھاگتے۔۔۔!"

رباب جو سمجھ رہی تھیں کہ اسے بنا کوئی کلیو دیے یہاں سے لے جائیں گی تو وہ غلط تھیں۔۔۔یہ آٹھواں گھر تھا جو گزشتہ کئی سالوں میں ان ماں بیٹیوں کو بدلنا پڑا تھا تو کیا اب زمن اب بھی سمجھ نہیں جاتی کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔۔۔!

رباب خان نے پیشانی مسلتے ہاجرہ کو اسے قابو کرنے کا اشارہ کیا جسے زمن نظر انداز کرتی فائزہ خاکوانی سے مخاطب ہوئی۔۔۔

" میم۔۔۔آپ سے تو میں نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا مکان کے حوالے سے تو اب اچانک سے آپ کیسے۔۔۔؟؟ مطلب میں کنفیوز ہوں۔۔۔مجھے کچھ کلئیر کرنا ہے۔۔۔!"

"تمہیں "میں" راستے میں کلئیر کر دوں گا۔۔۔!" لاؤنج کے دروازے سے مہریار اندر داخل ہوتا ہوا بولا۔۔۔زور سارا "میں" پر تھا۔۔۔

" کیونکہ تمہارا دماغ ضرورت سے زیادہ چلتا ہے۔۔۔سو ہاہے بعد ایک چھوٹی سی سرجری کی تمہیں بھی ضررت ہے۔۔۔!"

لائبہ کے منہ میں چائے کا گھونٹ تھا جو ہنسی کی وجہ سے پھوار کی صورت باہر آتے آتے بچا تھا اور بمشکل نگلنے سے اسے اچھو لگ گیا تھا۔۔۔وہ سب مہریار کے ساتھ ہی یہاں پہنچے تھے اور لائبہ راستے میں ہی اس ہستی سے متعارف ہوئی تھی۔۔۔مہریار نے راستے میں ہو بہو زمن کے یہی الفاظ کوٹ کیے تھے جو ابھی ابھی اس نے کہے تھے اور وہ اس کے اندازے کی درستی پہ ہنسی نہی روک پائی تھی۔۔۔دبی دبی مسکراہٹ تو باقی سب کے ہونٹوں پہ بھی آگئی تھی لیکن یہ وقت جلدی کرنے کا تھا۔۔۔زمن کی بولتی بند ہوئی اور وہ اگلے آدھے گھنٹے میں جیسا کہا گیا تھا ویسا ہی کر کے سنجیدہ تاثرات لیے آچکی تھی۔۔۔ایک چلچلاتی نظر اس نے دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے کھڑے مہریار پہ ڈالی جو فرصت سے دیواروں کی سیلن پہ غور کر رہا

تھا۔۔۔اس نے ہاتھوں میں تھامے دو درمیانے سائز کے بیگ دھپ سے اس کے پیروں کے پاس لا پٹخے اور ابروؤں سے اٹھانے کا اشارہ کیا۔۔۔مہریار نے جواباً ایک آنکھ سکیڑ کے اسے اور پھر بیگز کو دیکھا اور پشت سے ایک ہاتھ یوں لہراتا ہوا سامنے لایا جیسے بیگ پکڑنے لگا ہو لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنے بال سنوارتا بولا۔۔۔

"جلدی سے باہر لے آئیں۔۔۔ویٹ کر رہا ہوں۔۔۔زیادہ وقت نہی ہے میرے پاس۔۔۔آپ کو ڈراپ کر کے سوہا کے لیے مجھے ہاسپٹل بھی جانا ہے۔۔۔!"

اور خود یہ جا وہ جا۔۔۔زمن ہکی اور خفت کے احساس سے کھڑی رہ گئی۔۔۔سوئے اتفاق باقی سب اس وقت سوہا کے پاس اس کے روم میں تھے جس کے لیے باہر ایمبولینس آ چکی تھی۔۔۔

"اگر میری یہ بستی کسی کے سامنے کی ہوتی نا تو آج یہ ڈاکٹر کا بچہ گنجا ہو کے جاتا یہاں سے۔۔۔پتا نہی اس کی بیوی کیسے اسے برداشت کرتی ہوگی۔۔۔!"

اس کے گال جل رہے تھے۔۔۔انہیں تھپتھپا کے اس نے بیگ اٹھائے اور گاڑی میں رکھنے چلی گئی۔۔۔اس نے سوچ لیا تھا کہ بیگ اس کی قیمتی گاڑی کی ڈگی میں رکھ کے وہ اسے زور سے بھرپور آواز کے ساتھ بند کرے گی۔۔۔

اس کے باہر نکلتے ہی عقب سے رباب خان نمودار ہوئی تھیں۔۔۔مسکراہٹ دباتی وہ سینے پہ ہاتھ لپیٹے سوچ رہی تھیں کہ مہریار کو ساتھ لانا کس قدر اچھا ہوا تھا ورنہ اس بلا کو قابو کرنے میں بہت وقت برباد ہوتا۔۔۔سر جھٹکتی وہ کچن کی جانب چلی گئیں جہاں کاؤنٹرز پہ پڑا کچھ کھانے پینے کا سامان سمیٹنا لازم تھا تاکہ ان کی غیر موجودگی میں خراب نا ہو۔۔۔!

☆......☆......☆

حویلی لکھاں جو عرصہ دراز سے ٹکڑوں میں بٹ کر اب ہری حویلی میں تبدیل ہو چکی تھی پچھلے کئی دن سے اداسی کی لپیٹ میں تھی۔۔۔سارا دن حویلی کے ملازم اندر باہر چکراتے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے سوگ کی سی کیفیت ساری حویلی پہ چھائی ہوئی ہے۔۔۔وجہ کشور بی بی کا اچانک بیمار ہو جانا

تھا۔۔۔جس دن کا چوہدری شہاب الدین کے منہ سے اپنے والد کا نام سنا تھا جیسے جسم سے ساری توانائی ختم ہو گئی تھی۔۔۔کب کے کھرنڈ زدہ زخموں سے دکھ رسنے لگے تھے۔۔۔جسمانی سے زیادہ ذہنی اذیت نے انہیں بستر سے لگا دیا تھا۔۔۔ان کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔۔۔اس وقت بھی وہ اپنے جہازی سائز بیڈ پر سکڑی سمٹی سی کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔۔۔قریبی اور بھروسے مند ملازمہ گاہے بگاہے آتی تھی اور کھانے پینے کا پوچھ کر چلی جاتی یا ہاتھ پیر دبانے بیٹھ جاتی۔۔۔ان کی چوہدرائن ایک نیک خصلت عورت تھی اور اس کا یوں بیمار اور بیزار ہونا سبھی کے لیے تکلیف دہ تھا۔۔۔کشور بی بی کی آنکھ کے کنارے سے آنسو نکل کر ان کے تکیے میں جذب ہوتے دھیرے دھیرے اسے بھگو رہے تھے۔۔۔اسی اثنا میں حیات راؤ اندر داخل ہوئے۔۔۔بیوی کو یوں ملگجی حالت میں دیکھ کر افسردہ ہوئے اور دروازہ بند کرتے ان کے قریب آئے۔۔۔سائیڈ ٹیبل پر کھانے پینے کی اشیاء جوں کی توں رکھی تھیں۔۔۔حیات راؤ نے اپنی بیوی پہ محبت کی نگاہ ڈالی اور شرارتاً ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔۔۔کشور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں۔۔۔بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتی وہ شاکی نگاہوں سے خاوند کو دیکھ کر گویا ہوئیں۔۔۔

"آپ کی کسر رہتی تھی کیا حیات جی۔۔۔یہ کیا طریقہ ہے بھلا۔۔۔!" روٹھا لہجہ اور ان کا حیات جی کہنا۔۔۔حیات راؤ کھل کر مسکرائے۔۔۔کشور جب تک حویلی کی بڑی چوہدرائین نہیں بنی تھیں تب تک انہیں" حیات جی" کہہ کر بلایا کرتی تھیں اور جب منصب بدلا تو بہت خاص اور کم مواقعوں پر انہیں یوں بلاتی تھیں۔۔۔

"تو اور کیا کروں۔۔۔جب بیوی کو میری پرواہ ہی نہیں ہو گی تو کچھ تو کروں گا نا اس کا دھیان اپنی طرف کرنے کو۔۔۔!" جواباً وہ بھی انہی کے جیسے لہجے میں بولے۔۔۔

"چھوڑیں۔۔۔یہ عمر ہے بھلا ایسی باتوں کی۔۔۔؟"

"ارے واہ میری عمر کو کیا ہوا۔۔۔اب بھی مہر کا بڑا بھائی لگتا ہوں اور یاد نہیں جب شہر گئی تھی تو وہاں کالونی کی عورتیں تمہیں اس کی آپا سمجھیں تھیں۔۔۔!" کشور مسکرا دیں۔۔۔

"عورت کو کم عمری میں لپٹی تعریف سب سے زیادہ بھاتی ہے۔۔۔ہے نا۔۔۔!"

"مجھے نہی بھاتی۔۔۔" واپس وہی لہجہ اور انداز۔۔۔ناک بھی نزاکت سے سڑکا۔۔۔حیات راؤ کو تیس سال پرانی کشور لگی جو ان سے ذرا ذرا سی بات پر پورے مان اور استحقاق سے روٹھا کرتی تھی۔۔۔انہوں نے بیوی کا ہاتھ تھاما اور مضبوطی سے دبا کر اوپر دوسرا ہاتھ رکھ کر گویا ہوئے۔۔۔

"بھول جاؤ اب۔۔۔اباجی کا وہم ہے۔۔۔لیکن تم جانے والوں کے لیے زندہ لوگوں کو اذیت تو نا دو نا کشور۔۔۔مجھ سے تمہاری ایسی حالت برداشت نہی ہوتی۔۔۔!"

ان کا کہنا تھا اور کشور کے آنسو ٹپ ٹپ برسنے لگے۔۔۔حیات راؤ نے محبت سے انہیں صاف کیا تو وہ سسکتی ہوئی آگے کو جھک کر اپنا سر ان کے کندھے سے ٹیک گئیں۔۔۔حیات راؤ نے نرمی سے اپنی انگلیوں سے ان کے بالوں کو سہلایا۔۔۔

"میرے والد تھے ناوہ۔۔۔ماں تھیں۔۔۔کیسے بھولوں۔۔۔کام کاج میں لگ کر ہر ایک کی یاد سینے میں دبا لیتی ہوں لیکن اباجی کے الفاظ میرا کلیجہ چھلنی کر گئے ہیں۔۔۔مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ آخر کیوں۔۔۔کیوں وہ اباجی سے خوفزدہ ہیں۔۔۔کہیں۔۔۔کہیں حیات جی اباجی نے خود تو میرے ابا کو ما۔۔۔!!!"

"نہیں ہرگز نہیں۔۔۔پاگل ہو گیا۔۔۔وہ بھلا کیسے مار سکتے ہیں۔۔۔ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔" حیات راؤ سختی سے ان کا فقرہ بھانپ کر انہیں ٹوک گئے۔۔۔کشور نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔۔۔

"جب خالی بیٹھوں تو ذہن کڑیاں جوڑنے لگتا ہے اور جب اماں اور ابا کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ یاد آتا ہے تو۔۔۔"

وہ رکیں اور شوہر کو بھی نگاہوں سے دیکھا۔۔۔حیات راؤ دم سادھے انہیں سن اور دیکھ رہے تھے۔۔۔

"تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ سب کچھ سازش تھا۔۔۔!"

"ششش۔کشور خاموش ہو جاؤ۔۔۔اپنے وہم سینے میں دبا لو بلاوجہ زبان پہ لاؤ گی تو سچائی کی ہوا لگ جائے گی انہیں۔۔۔مرنے والے نہی پلٹتے لیکن زندہ لوگوں کا ضمیر اگر مرا ہو تو وہ بھی کسی زندہ لاش سے کم نہی ہوتا اس لیے اگر کسی کا کچھ کیا دھرا ہے تو اسے اپنی ہی عدالت میں اپنا منصف بننے دو۔۔۔حبس زدہ روحیں زیادہ دیر تک جرم کی گھٹن نہیں سہہ پاتیں اور ایک دن آتا ہے جب وہ دم گھٹنے

کے خوف سے سب کچھ خود ہی آشکار کر دیتی ہیں۔۔۔تم بھی انتظار کرو اور صبر کرو کیونکہ کچھ رشتے ہمیں مصلحتاً باندھ دیتے ہیں کشور۔۔۔!"

حیات راؤ نے آزردگی سے انہیں خود سے لگا لیا۔۔۔ایک تھکن زدہ سانس کشور کے لبوں سے آزاد ہوئی جس میں سسکی کی آمیزش تھی۔۔۔حیات راؤ ان کی تکلیف کا بخوبی احساس تھا لیکن وقت نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔۔۔پرت در پرت چھپے راز جب تک آشکار نہ ہو جاتے وہ کسی کو بھی کٹہرے میں کیسے کھڑا کر سکتے تھے۔۔۔

"اچھا چلو یوں کرتے ہیں کچھ دن تک شہر چلتے ہیں۔۔۔ذرا بیٹوں سے ملو گی تو طبیعت اچھی ہو جائے گی۔۔۔خالہ پیاری بھی تم سے بہت اداس ہیں۔۔۔!"

کشور سیدھی ہوئیں اور نفی میں سر ہلاتی ہوئی اسی نروٹھے لہجے میں بولیں۔۔۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔۔۔آپ لڑکوں سے کہیں آکر مل جائیں مجھ سے۔۔۔مجھے دونوں چھوٹوں کی بہت یاد آرہی ہے اور ساتھ خالہ پیاری کو بھی لیتے آئیں۔۔۔!"

"اچھا ٹھیک ہے جیسے میری جان کی خوشی۔۔۔"

کشور ان کے انداز پہ سرخ ہوئیں۔۔۔"بس تم اب ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔ملازم بھی مالک کے بنا پریشان ہو جاتے ہیں اور تم تو اس حویلی کی روح ہو کشور۔۔۔اٹھو اور حویلی کو دیکھو۔۔۔مجھے تم اندر باہر آتی جاتی نہیں دکھتی تو وحشت ہوتی ہے۔۔۔!"

اور کشور بھلا خاوند کی اس قدر محبت پر سرشار کیسے نا ہوتیں۔۔۔حیات راؤ کے باہر جانے کے بعد وہ بھی اپنا غم پس پشت ڈال کر تازہ دم ہونے کے لیے واشروم چلی گئیں لیکن ان کے بھیگے تکیے کی نمی فضا میں اڑتی ہوئی ماضی کے مرغولے سے جا ملی۔۔۔کوئی پرت اٹھنے کو تھی تاکہ سربستہ رازوں سے پردہ اٹھ سکے۔۔۔!

☆......☆......☆

سخت ترین حبس کے بعد موسم کھلا تھا۔۔۔تیز آندھی نے گرمی کا زور توڑا تھا اور اس کے بعد ہونے والی بارش نے فضا کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔۔۔تیز بارش اب کن من میں تبدیل ہو چکی تھی۔۔۔وہ دونوں کب سے ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے حویلی کی طویل وعریض چھت پہ چکر کاٹ رہی تھیں۔۔۔

بہت کم ہوتا تھا جب وہ چھت پر آیا کرتیں تھی اور ایسا مردوں کی غیر موجودگی میں ممکن ہو پاتا تھا۔۔۔کشور حسب معمول چائے پکوڑوں کا اہتمام کرنے کے لیے باورچی خانے میں تھی اور اسے ان دونوں کی جانب سے لاڈ بھرا حکم ہوا تھا کہ ان کے لیے چھت پہ لے آئے، کشور کو بھلا کام سے کب انکار ہوتا تھا۔۔۔رابی نے تیز ہوا سے اڑتا ہلکا گیلا دوپٹہ گلے سے اتار کر جھٹکا اور اسے دوبارہ اچھی طرح اوڑھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں خانم سے بولی۔۔۔

"خانم۔۔۔ایک بات دیکھی ہے تم نے۔۔۔؟"

خانم نے ذرا سی گردن موڑ کر ابرو اچکا کر رابی کو سوالیہ طرز پہ دیکھا۔۔۔وہ محتاط سی بنیرے سے باہر تاحد نگاہ نظر آتے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی ساتھ یہ بھی ڈر تھا کہ باہر سے کسی کی نگاہ نا پڑ جائے۔

"یہ جو سنہری ہے۔۔۔عجیب سی نہیں ہے۔۔۔تم نے کبھی غور کیا ہے چار دن ہو گئے ہیں اسے آئے لیکن اس نے چاروں حویلیوں کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے جیسے۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔چھچھوری۔۔۔" خانم ہلکا سا جوش لیے تیزی سے اس تک آئی۔۔۔"تمہیں بھی لگا نا۔۔۔مجھے بھی بلکل ایسا ہی لگا۔۔۔سچی رابی میں بھی حیران ہوں کہ یہ کتنی وہ ہے۔۔۔وہ کیا کہتی ہیں چاچی حمیدہ۔۔۔آپ پوتری۔۔۔!"

اس کی بات پہ بے ساختہ رابی کا قہقہہ نکلا۔۔۔آواز چھت پہ پھیلی تو خانم نے گھبرا کے اپنے ہی دوپٹے کے پلو سے اس کا منہ دبایا۔۔۔

"مروانا ہے کیا۔۔۔آہستہ ہنسو۔۔۔کشور آپا نے خبردار کیا تھا کہ کسی کو پتا نا چلے کہ ہم چھت پہ ہیں اور تم پورے زمانے کو بتا دو۔۔۔!"

"تم نے بات ہی ایسی کہی میری ہنسی نکل گئی۔۔۔اچھا چھوڑو۔۔۔ہم کیا بات کر رہے تھے۔۔۔"

وہ ہنسی روک کر کہتی بنیرے کے ساتھ بنی چھوٹی سی بنی پہ بیٹھ گئی۔۔۔

"ہاں یہ سنہری۔۔۔قسم سے خانم مجھے تو اس کا آنا ہی سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔اور تم نے دیکھا جس دن کی یہ آئی ہے، کبھی حیات بھیا کے پیچھے پھر رہی ہوتی ہے اور کبھی میرے بھائیوں کے۔۔۔اور دیکھو میرے گھر آتی بھی

تب ہے جب میں یہاں تمہارے پاس ہوتی ہوں۔۔۔اماں کو تو ایک آنکھ نہی بھاتی یہ چھپکلی۔۔۔!"

"ہممم۔۔۔اور اتنے دن میں بس ایک ہی بار ہماری طرف آئی ہے۔۔۔حالانکہ کشور آپا نے کتنی بار بلایا ہے اسے۔۔۔!"

"مجھے تو اس کا کشور آپا کو منہ پھاڑ کر نام سے بلانا ہی نہی پسند۔۔۔مانا ہم دونوں سے بڑی ہے لیکن آپا سے تو چھوٹی ہے۔۔۔اور اوپر سے حیات بھیا کو بھی نکے چوہدری جی کہتی ہے۔۔۔لو بتاؤ اتنی تم ہیروئین۔۔۔!"

رابی نے ناک سکوڑ کر کہا تو خانم کچھ سوچتی ہوئی اس کے ساتھ لگ کر آن بیٹھی۔۔۔

"چاچی حمیدہ کہہ رہی تھیں میری پنیوی (بھانجی) مستقل آ گئی ہے میرے پاس اور رہورے مستقل ہی رہ جائے۔۔۔تمہیں ان کی اس بات کی کیا سمجھ آئی رابی۔۔۔؟"

"یہی کہ وہ اس نک چڑھے قاسم کریلے کا ویاہ کر دیں گی اس سے۔۔۔دیکھنا۔۔۔!"

"قاسم بھائی مانے گا کیا۔۔۔مجھے تو نہیں لگتا۔۔۔اس کے تو ٹشن ہی بہت ہیں۔۔۔!"

"وہ مانے نا مانے اس کی اماں کے بھی ایک سو ایک ٹشن ہیں۔۔۔لیکن اصل بات سوچنے کی یہ ہے کہ سنہری بھلا مستقل ادھر ہی کیوں آئی ہے۔۔۔دیکھ خانم سوچنے کی بات ہے نا کہ اس کے مامے چاچے سب جیوندے جاگتے ہیں۔۔۔اس کی بڑی بہن بھی ملکوں کی نوہ ہے اور اسے پاس بھی بلاتی رہی ہے لیکن اسے ادھر ہی آ کے رہنے کا چاء کیوں چڑھا ہوا ہے۔۔۔!"

رابی پراندہ پشت سے آگے لا کر اس کے بل کھول کر دوبارہ گوندھتے ہوئے گہرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔۔۔خانم اس کے تدبر کی ہمیشہ سے قائل تھی۔۔۔اس وقت بھی اسے متاثر سی دیکھتی اپنا پراندہ بھی آگے ڈال کر اس کے بل کھولتی بولی۔

"ہوسکتا ہے حمیدہ چاچی نے زبردستی کی ہو۔۔۔اماں کہہ رہی تھیں حمیدہ چاچی کا بڑا پیار تھا اپنی بہن سے۔۔۔اس کی نشانی سمجھ کے پاس بلا لیا ہو۔۔۔!"

"تو یہ نشانی اپنی حویلی میں سجائیں نا۔۔۔سارے میں پڑکتی پھرتی ہے۔۔۔لکھ لے خانم کوئی چن

چڑھائے گی یہ۔۔۔شکل سے ہی خاصی تیز لگتی ہے۔۔۔دیکھتی ایسے ہے جیسے سالم نگل کے اگل دے گی۔۔۔آؤ ؤ ؤ۔۔۔!"

رابی نے سرسراتے لہجے میں بات مکمل کر کے آخر میں اچانک ابکائی کی تو خانم الہڑ پنے سے دونوں ہاتھوں کی تالی بجاتی گھٹنوں پہ جھکی ہنستی چلی گئی۔۔۔رابی بھی اس کے اوپر گرتی ہنسنے لگی۔۔۔نوخیز ہنسیاں فضا میں سر بکھیرنے لگیں۔۔۔ان کو روک اچانک سنہری کے سامنے آنے سے لگی۔۔۔دونوں یکدم گھبرا کر کھڑی ہوتی خاموش ہو گئیں۔۔۔رابی کسی سے ڈرتی نہی تھی لیکن اتنی بھی پر اعتماد نہی تھی کہ کسی کی برائی اس کے منہ پہ کر سکے۔۔۔سنہری کی بنا پلکوں والی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سرد سا تاثر تھا لیکن ہونٹوں پہ بناوٹی مسکراہٹ۔۔۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں۔۔۔لگتا ہے کسی کا ماس کھا رہی ہو دونوں۔۔۔بڑی شوقین لگتی ہو۔۔۔!"

اس کی عجیب و غریب توجیہہ پر دونوں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا اور جب سمجھ آئی تو رابی تو رابی خانم کے ماتھے پہ بھی بل نمایاں ہو گئے۔۔۔

"ہم کسی کی چغلی نہی کر رہے تھے سنہری۔۔۔اور یوں طعنہ دینے سے پہلے یہ بھی ذہن میں رکھ لیتی کہ اوروں کا تجسس کرنا بھی منع ہے۔۔۔!" رابی کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔۔۔

"ہائے اللہ رابی میری بہن۔۔۔" سنہری یکدم پینترا بدلتی فکرمندی سے اس کے قریب آئی اور اس کا کندھا تھامنا چاہا لیکن رابی جھٹک گئی۔۔۔سنہری بائیں گال سے مسکرائی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پٹپٹاتی ہوئی بولی۔۔۔

"غصہ نہی کرو میری بہن۔۔۔اس کا نقصان صرف تمہیں ہو گا۔۔۔میں نے کب کہا کہ تم نے چغلی کی۔۔۔یہ تو تم خود بولی۔۔۔میں نے تو یہ بھی نہیں کہا کہ غیبت کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اپنے بھائی کا گوشت کھانے والا۔۔۔تم اپنی طرف لے گئی تو میرا کیا قصور۔۔۔؟""

انتہائی سفید رنگت۔۔۔ہلکے سنہری بال اور بنا پلکوں کے چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔۔۔رابی کو وہ اس قدر مکار لگی کہ چند پل کو اس کی زبان گنگ سی رہ گئی۔۔۔وہ کہہ بھی گئی تھی، بہہ کر مکر بھی گئی تھی اور سکون

سے دوبارہ پھر کہہ گئی تھی۔۔۔خانم نے نیم ناراضی سے چہرہ موڑ کر بنیرے کی طرف کر لیا اور بلاوجہ آسمان پہ تیرتے بادل دیکھنے لگی۔۔۔سنہری نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں آسمان دیکھا اور دوپٹے کا پلو جھٹکتی واپس مڑتی ہوئی بولی۔۔۔

"کشور نے چائے اور پکوڑے بھیجے تھے۔۔۔ٹرے پہلی سیڑھی پہ پڑی ہے۔۔۔کب کی پڑی ہے اٹھا لینا۔۔۔ٹھنڈے موسم میں ٹھنڈے چائے پکوڑوں کا اپنا ہی سواد ہے۔۔۔میں سکینہ ماسی کی طرف جا رہی ہوں۔۔۔چوہدری حیات کہہ رہا تھا یہیں چائے پی لو آ کر۔۔۔چلتی ہوں۔۔۔تم لوگ کھاؤ۔۔۔" شہادت کی انگلی منہ میں دبا کر خاموش ہوئی اور پھر بولی۔۔۔" ارے بابا پکوڑے کہہ رہی ہوں ماس نہی کہا۔۔۔!"

مدھم سی مسکان سجا کر وہ واپس ہو لی۔۔۔گنگ سی خانم اور رابی اس کی پشت پہ جھولتا شیشوں جڑا پراندہ دیکھ رہی تھیں جسے بالوں میں ڈالنے کی اجازت ان کی حویلی میں کنواری لڑکیوں کو نہیں تھی لیکن وہ سنہری تھی۔۔۔رابی کا سانس مارے طیش کے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔۔۔سنہری سیڑھیوں کے پاس جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔۔۔رابی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔

"سنہری سانپ۔۔۔!"

☆......☆......☆

چوہدری آفتاب ابھی ابھی زمینوں سے لوٹے تھے۔۔۔موسم اچھا ہو رہا تھا تو وہ بھی کچھ دیر کو گھر چلے آئے۔۔۔ان کے پہنچتے پہنچتے پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔۔۔یہ آسمان کے موسم دل کی کوئی رگ پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔۔۔ان کی نرمی، گرمی، سختی، سردی سب دل پہ اثرانداز ہوتی ہے۔۔۔سہانا موسم طبیعت کے بوجھل پن کو کم کرنے میں بے حد کارگر ہے۔۔۔چوہدری آفتاب کا دل بھی چوہدری شہاب الدین کی باتوں کی وجہ سے کئی دن سے بوجھل اور بجھا بجھا سا تھا۔۔۔گو کہ وہ محسوس نہی کرواتے تھے لیکن خود تو کرتے تھے۔۔۔بھائیوں کی کج روی کے وہ بچپن سے عادی تھے لیکن ماں باپ کی زندگی میں اتنا ذہن پہ سوار نہیں کرتے تھے پر اب کچھ عرصے سے جیسے دل نے دکھنے کا عہد باندھا تھا۔۔۔بات

بات پہ تکلیف میں آجاتا تھا۔۔۔تھا تو انسان کا نا تو وہ بھی کب تک بے حس رہ سکتے تھے۔۔۔کبھی کبھار خود کو بہت اکیلا محسوس کرتے پر تبھی ان کے بھتیجے جیسے بازو بن جاتے تھے۔۔۔انہیں علم تھا کہ شہاب الدین اس بات کی بنا پر بھی ان سے خار کھاتے تھے کہ ان کی اولاد باپ سے زیادہ اپنے چاچے کا دم بھرتی ہے لیکن یہ تو محبتوں کا اعجاز تھا جو سوکھے کو ہرا کر دینے پہ قادر ہے۔۔۔

چوہدری آفتاب حویلی میں داخل ہوئے تو رقیہ ملازماؤں کے ساتھ گندم کی چھٹائی کروا رہی تھی۔۔۔وہ سیدھا نکلتے چلے گئے اور اپنے کمرے میں آ کر پگڑی اور لٹھے کی چادر اتار کر سنگھار میز پہ رکھی۔۔۔پلنگ پہ لیٹتے لیٹتے ہی رقیہ اندر چلی آئیں۔۔۔انہوں نے پہلے تو آگے بڑھ کر چھت والا پنکھا چلایا اور پھر شوہر کی طرف آئیں۔۔۔

"کیا چوہدری جی۔۔۔طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔یوں بنا سلام دعا لیے اندر آ گئے۔۔۔سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔؟" وہ پریشان سی چلتی ان کے پیروں کے پاس آ بیٹھیں اور پیر اٹھا کر گود میں رکھے، نرم ہاتھوں سے دبانے لگیں۔۔۔چوہدری آفتاب نے سکون سے آنکھیں موندے جواب دیا۔۔۔

"بس دل کیا اپنی بیگم کے ہاتھ کے چائے پکوڑے کھانے کا تو گھر چلا آیا۔۔۔تم کہتی ہو تو واپس ہو جاتا ہوں۔۔۔" وہ شرارتاً مسکرائے۔۔۔آنکھیں ہنوز بند تھیں۔۔۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔۔۔میں کیوں کہوں گی بھلا۔۔۔اللہ آپ کے قدموں سے میری حویلی آباد رکھے۔۔۔مجھے تو بس آپ کی پریشانی کا خیال تھا۔۔۔!"

"پریشان نہیں ہوں رقیہ بس سوچوں میں گھرا ہوں۔۔۔بھرجائی نے اس دن کشور کے ہاتھ میں کنگن ڈال دیا تھا۔۔۔بھا شہاب کو اب تک پتا چل چکا ہو گا۔۔۔وہ اس رشتے پہ اتنے آرام سے کبھی نہیں مانیں گے۔۔۔اور مجھے اپنی بچی بڑی عزیز ہے رقیہ میں نہیں چاہتا کہ وہ جس گھر بیاہ کر جائے وہاں کسی ایک کے دل میں بھی اس کے لیے میل ہو۔۔۔!"

انہوں نے بلا خر دل کی بات بیوی سے کہہ ہی دی تھی۔۔۔رقیہ ان کے پیروں کی انگلیوں کا نرمی سے مساج کرتے ہوئے مسکرائیں اور بولیں۔۔۔

"ہماری کشور بڑے گنوں والی ہے چوہدری جی۔۔۔اور بھاء شہاب کی باتوں سے پریشان نا ہوں۔۔۔میری بھرجائی سکینہ سے بات ہوئی تھی انہوں نے کہا حیات کی مرضی ہی ادھر ہے اور وہ اپنے پتر کی مرضی کے بنا کہیں بھی اس کا متھا نہیں جوڑیں گی۔۔۔باقی رہ گئی بھاء شہاب کی بات تو مرد کون سا سارا دن حویلیوں میں ہوتے ہیں چوہدری جی۔۔۔عورت نے نبھانی تو ساس نندوں کے ساتھ ہوتی ہے اور بھرجائی سکینہ تو بہت سیانی عورت ہے۔۔۔وہ سب سنبھال لے گی۔۔۔آپ دل سوڑا نا کریں۔۔۔سچ پوچھیں میرے دل کو تو بہت تسلی اور خوشی ہے اس دن کی۔۔۔میری بچی اپنوں میں نظروں کے سامنے رہے گی، من چاہی ہوگی اور کیا چاہیے ہمیں بھلا۔۔۔باقی باتیں وقت کے ساتھ مک مکا جاتی ہیں۔۔۔آپ فکریں نا پالیں۔۔۔!"

رقیہ کی باتیں اور انگلیوں کا لمس ان کی روح تک کو سرشار کر رہا تھا۔۔۔ان کے ہاتھوں کا جادوئی لمس یونہی ان کی ساری تھکن چن لیا کرتا تھا۔۔۔

"زمین والا معاملہ میرے دل میں گڑ گیا ہے رقیہ۔۔۔بھاء شہاب نے تو جیسے اس زمین پہ نظر ہی گاڑ لی ہے۔۔۔اور وہ کدورت نہیں نکالتا دل سے۔۔۔عداوت پال لیتا ہے۔۔۔کل کو ان نازک رشتوں میں زمین ہی دراڑ نا پیدا کر دے۔۔۔!"

ان کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔۔۔رقیہ کے ہاتھ ایک پل کو تھمے لیکن پھر اسی انہماک سے انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے بولیں۔۔۔

"ایک بات بتائیں چوہدری جی۔۔۔یہ جو اس زمین نے اتنا جھگڑا ڈالا ہوا ہے آپ دے کیوں نہی دیتے۔۔۔میں تو کہتی ہوں کشور کو جہیز میں دے دیں۔۔۔زمین ہماری بچی کے پاس بھی رہے گی اور بھاء شہاب کا گلہ بھی دور ہو جائے گا۔۔۔!

رقیہ کی بات مکمل ہوتے ہی چوہدری آفتاب نے ایک جھٹکے سے اپنے پیر ان کے ہاتھوں سے چھڑوائے اور اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔۔۔ان کا چہرہ غصے اور ضبط کی شدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔۔۔رقیہ گھبرا گئیں اور کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے لیکن چوہدری آفتاب نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔۔۔

"میں نے ساری زندگی اپنے بھائیوں کے ساتھ اُچی نیویں نہیں کی رقیہ۔۔۔پہلے بھی مہتاب کی

زندگی میں بھاء شہاب نے پُلی کے پار والی زمین کا رولا ڈالا میں نے بنا چوں چرا کیے زمین اگلے دن ان کے نام لگوادی تھی لیکن یہ زمین کا ٹوٹا میرے اباجی اور اماں جی کی امانت ہے۔۔۔یہاں اباجی کی وصیت کے مطابق مسجد اور مدرسہ ہی بنے گا اور بھاء شہاب یہ بات اچھی طرح جانتا ہے لیکن لالچ نے اسے اتنا کیا ہوا ہے۔۔۔زمین زمین کرتے اس زمین کو بھولا ہوا ہے جس میں سمانا ہے۔۔۔میں نے اپنے ماں پیو کو منہ دکھانا ہے رقیہ۔۔۔میں اس زمین کا ایک سوتر بھی کسی کو نہی دوں گا۔۔۔بھلے وہ میری دھی کا رشتہ لے یا نا لے۔۔۔نصیب میرے رب سوہنے نے لکھے ہیں بھاء شہاب نے نہیں۔۔۔اگر کشور کا نصیب حیات سے جڑا ہے تو ہونا ہی ہونا ہے اور اگر نہی تو میں اپنی ساری زمین جائیداد بھی چوہدری شہاب الدین کے حوالے کر دوں گا نا تو نہیں ہو گا۔۔۔اس لیے دوبارہ ایسی بات نا کرنا مجھ سے۔۔۔میرے مرے ماں پیو کی وصیت کا سودا نہی کروں گا میں۔۔۔!"

چوہدری آفتاب بے حد جذباتی ہو گئے تھے۔۔۔ان کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔۔۔رقیہ نے بڑی نرمی اور چاہت سے ان کا بازو سہلایا اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔۔۔

"جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہو گا چوہدری جی۔۔۔فکر ہی نا کریں۔۔۔میں بھلا کب آپ کی مرضی سے ہٹ کر چلی ہوں۔۔۔آپ دکھی نا ہوں۔۔۔آرام کریں میں ابھی آپ کے لیے گرم گرم پکوڑے اور چائے لے کر آئی۔۔۔کشور نے بنالی ہو گی اب تک۔۔۔لیں میں آئی۔۔۔!" کہتے ساتھ ہی رقیہ نے پیر پلنگ سے اتارے۔۔۔چپل پہنی اور عجلت میں کمرے سے باہر نکل گئیں۔۔۔چوہدری آفتاب نے دوبارہ کمر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔۔۔انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس زمین پہ مسجد اور مدرسے کی تعمیر کا کام شروع کروا دیں گے تاکہ بھاء شہاب کی نظر اس سے ہٹ جائے۔۔۔لیکن وہ نہی جانتے تھے کہ جن کی نظروں پہ لالچ اور حرص کی چربی چڑھی ہو تو وہ حرم پاک کی دہلیز پہ بھی وار کرنے سے نہی چوکتے۔۔۔!

☆......☆......☆

مہتاب راؤ کی حویلی کے ہال کمرے میں اس وقت قاسم راؤ کی غراہٹیں گونج رہی تھیں۔۔۔وہ شدید نفرت اور اشتعال کے زیر اثر پھنکار رہا تھا۔۔۔حمیدہ بی بی بیٹے کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کر رہی

تھی۔۔۔تخت پہ ٹانگیں نیم پسارے وہ ایک ہاتھ میں حقے کی نے تھامے دوسرے سے اس کی خالی ہوتی چلم جانچ رہی تھی۔۔۔

"شیداں۔۔۔اے شیداں یہ حقہ لے جا اور بھر کے لا اسے۔۔۔ہزار بار کہا ہے کہ دھیان رکھ لیا کرو آپنے آپ ہی لیکن مرن جوگیاں ہوش ہی نہیں کرتیں۔۔۔!"

ایک طرف سے دروازے میں سے جوان ملازمہ بھاگی چلی آئی اور جلدی سے حقہ لے جانے لگی۔۔۔

"اچھی طرح بھر کے لا اور سن تھوڑا سا گڑ بھی رکھ لا۔۔۔"حمیدہ بی بی نے حقہ لے جاتی رشیدہ سے کہا۔۔۔وہ سر ہلاتی جانے لگی تو دوبارہ پکار کر بولی۔۔۔

"اور خبردار جو نے کو منہ لگایا تو۔۔۔منہ پَن (توڑ) دوں گی۔۔۔سمجھی۔۔۔سب پتا ہے مجھے تیرے تماشوں کا۔۔۔کم ذات جوٹھا کر لاتی ہے حقہ۔۔۔!"

جواباً شیداں زبان دانتوں میں دیتی کھسیانی سے وہاں سے کھسک گئی۔۔۔قاسم راؤ مسلسل ٹہلتا ماں کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔۔۔ایک پل کو ٹھہرا اور بولا۔۔۔

"ادھر میں اس وقت سے بکواس کر رہا ہوں اور تجھے اپنے حقے کی پڑی ہے اماں۔۔۔میں کہہ رہا ہوں مجھے کشور اور حیات کا رشتہ منظور نہیں ہے اور تو دھیان ہی نہی دے رہی۔۔۔تو بات کر جا کے چاچے آفتاب سے میرے لیے۔۔۔!"

وہ تنتناتا ہوا سامنے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھ گیا اور حتمی لہجے میں بولا۔۔۔حمیدہ بی بی نے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے جوان پتر پہ اچٹتی نگاہ ڈالی اور گاؤ تکیے کے نیچے ہاتھ مار کر دو تین چھالیہ نکال کر پھانکتے ہوئے بولی۔۔۔

"کس دن تو نے چاچے کے ساتھ سیدھی تند ڈالی ہے جو اتنے دھڑلے سے کشور کا رشتہ مانگ لوں اور پھر بھرجائی سکینہ بات کر چکی ہے وہ بھی بھرے مجمعے میں۔۔۔مجھے یہ چالاکی نہیں سوجھی ورنہ کر دیتی لیکن کرتی کیسے تو اب تو مجھے بتا رہا ہے کہ تجھے کشور پسند ہے۔۔۔میرا تو دماغ ہی پولا کر دیا ہے قاسم تو نے۔۔۔میں سنہری کو بلا کے بیٹھی ہوں تیرے لیے اور تو نواں لُچ تلنے لگا ہے۔۔۔!"

حمیدہ بی بی نے بھی لگی لپٹی رکھے بنا تابڑ توڑ کہہ ڈالیں۔۔۔قاسم سیدھا ہوا اور تھوڑا آگے ہو کر بیٹھتا ماں کے قریب چہرہ لایا۔۔۔

"اماں تجھے کس نے کہا ہے کہ میرا دل آگیا ہے کشور پہ۔۔۔ہاں سوہنی بیشک رج کے ہے لیکن میں اتنا تھڑا ہوا نہیں ہوں کہ اس کے علاوہ چوہدری قاسم کو کوئی ملے گی نہیں۔۔۔لیکن کشور کے ساتھ شادی کرا کے مجھے وہ زمین چاہیے۔جس پہ تایا شہاب نظریں گاڑ کے بیٹھا ہے۔۔۔!"

قاسم راؤ کے لہجے میں اپنی برتری کا زعم بول رہا تھا۔۔۔وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا حمیدہ بی بی کو بہت پیارا لگا۔۔۔فوراً واری صدقے ہوتی ہوئی بولی۔۔۔

"میریا شہزادیا۔۔۔میریا سوہنیا۔۔۔اک کشور کیا لکھاں کشور میں تیرے لیے حویلی لکھاں میں لے آؤں۔۔۔لیکن مکھنا ابھی بھر جائی بات کر چکی ہے۔۔۔تُو دعا کر کہ بھاء شہاب نا مانے تو سمجھ کشور تیری۔۔۔!"

"اور اگر تایا مان گیا تو۔۔۔؟" قاسم اندیشوں میں گھرا تھا۔۔۔

"تو پھر سنہری کے لیے مان جانا پتر۔۔۔دیکھ میری پنیوی یتیم و یسیر ہے۔۔۔اس کا بھی کون آسرا ہے میرے بغیر۔۔۔تُو اس سے ویاہ کرے گا تو دب کے رہے گی۔۔۔سوچ نا ذرا نا آگے نا پیچھے۔۔۔زمین بھی ہے اس کے نام۔۔۔کلا موج کرے گا میرے بچے۔۔۔!"

"ہرگز نہیں اماں۔۔۔زہر لگتی مجھے تیری پنیوی۔۔۔پرے واڑ اسے کہیں۔۔۔" چوہدری قاسم تاؤ کھاتا کھڑا ہو گیا۔۔۔"مجھے کشور سے ویاہ کرانا ہے نہیں تو خانم کے سیانے ہونے کا انتظار کروں گا۔۔۔پر ویاہ تو چاچے آفتاب کی ہی کسی کڑی سے کروں گا میں۔۔۔سنہری کی زمین کے لالچ نا دے مجھے۔۔۔وہ پنڈ کے پنڈ لے آئے ساتھ لیکن جو زمین چاچے آفتاب کے پاس ہے نا اس کا تجھے اندازہ نہیں۔۔۔اس لیے دوبارہ نام نا لینا اپنی اس پنیوی کا۔۔۔!"

وہ تن فن کرتا حمیدہ بی بی کو حیران چھوڑ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔۔۔دروازے کے باہر کھڑی سنہری سرعت سے اوٹ میں ہوئی۔۔۔اشتعال سے اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور اس کا بس نہیں چل رہا

تھا کہ ہر شے کو تہس نہس کر دے۔۔۔وہ چوہدری قاسم پہ فریفتہ نہی تھی لیکن جو تضحیک اور تحقیر ابھی اس کے لہجے میں تھی اس نے اسے سر تا پا جھلسا کر رکھ دیا تھا۔۔۔وہ تو سکینہ بیگم کی طرف جانے کا بتانے آئی تھی حمیدہ کو لیکن ہمیشہ کی طرح متجسس ہو کر اندر ہوتی باتوں کو سننے کھڑی ہو گئی تھی۔۔۔اسے اندازہ نہی تھا کہ اس کی ماسی اسے بہو بنانا چاہتی ہے حالانکہ جب وہ یہاں آرہی تھی تو اپنے طرف سے ایسا ہی کچھ سوچ کر آرہی تھی پر تب اس کے سامنے بس قاسم راؤ تھا۔۔۔حویلی لکھاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ یہاں تو ایک سے ایک گھبرو بیٹھا ہے۔۔۔اب اس کے پاس آپشنز تھے اور وہ چننے کا حق رکھتی تھی۔۔۔لیکن خود کو رد کرنے کا اختیار اس نے کسی کو نہی دیا تھا۔۔۔وہ تلملاتی ہوئی وہاں سے ہٹی اور حیات راؤ کی حویلی کا رخ کیا۔۔۔

"یہ تو سنہری طے کرے گی قاسم باؤ کہ کس کا ویاہ کس سے ہونا ہے۔۔۔اور کس کا کس سے نہیں ہونے دینا۔۔۔!"

شیشوں والا پراندہ جھلاتی، اپنے وجود میں چنگاریاں جمع کرتی وہ غائبانہ سب کو باور کرا رہی تھی۔۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری شہاب الدین اپنی حویلی کے دالان میں بیٹھے ڈھیلے سادہ کرتے اور لنگی میں رنگی دیو ہیکل کرسی پہ بیٹھے تھے۔۔۔قریب ہی تازہ حقے کی مہک پھیلی تھی اور وہ مسلسل حقہ گڑگڑاتے بیوی اور بیٹے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔سکینہ بی بی نے آنکھ کے مبہم اشارے سے حیات کو بلکل خاموش رہنے کا کہا تھا جو بار بار کچھ کہنے بولنے کو پر تول رہا تھا۔۔۔لیکن سکینہ بی بی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس معاملے میں اپنی دلی پسند باپ کو ظاہر کر کے ضد چڑھا دے۔۔۔

"تیرا یہ منڈا احمق ہے سکینہ احمق۔۔۔چوہدری کی اولاد ہو کر اتنا نکما اور نا اہل ہے کہ مجھے تو کبھی کبھار شک پڑتا ہے جیسے جمدے ہی وٹایا (پیدا ہوتے بدلا) گیا ہے۔۔۔!"

چوہدری شہاب نے حقے کی نے حیات کی جانب کر کے سکینہ بی بی سے کہا۔۔۔ان کے ایسا کہنے سے وہ برا مان گئیں۔۔۔

" خیری صلا چوہدری جی۔۔۔ایویں وٹایا گیا ہے۔۔۔کوئی پہلوٹی کے پتر کو بھی ایسا بولتا ہے بھلا۔۔۔اور جو بھی کچھ ہوا ہے وہ میں نے کیا ہے چوہدری جی۔۔۔!"

" ایسے کیسے کر دیا تُو نے۔۔۔کنگن پہنانا مذاق نہیں ہے چوہدرائین۔۔۔میں آفتاب کی شکل دیکھنا پسند نہی کرتا اور تُو نے اس کی دھی ساری عمر کے لیے میرے پتر کے سر منڈھ دی ہے۔۔۔نا کیا سارے زمانے میں کڑیوں کا کال پڑ گیا تھا۔۔۔اس سے تو بہتر تھا قدسیہ کی رانی کو ڈال دیتی تو میں سہہ جاتا۔۔۔!"

" ہائے ہائے کیسے ڈال دیتی۔۔۔ بالڑی سی تو ہے ابھی۔۔۔اور حیات تو اسے اپنی نکی بہنوں سا چاہتا ہے۔۔۔کشور تو حیات کے جوڑ کی ہے چوہدری جی۔۔۔!"

" مجھے نہیں بنانا جوڑ اس کا۔۔۔تو انکار کر فورا۔۔۔اس کمی کمین آفتاب کی اولاد سے میں اپنی نسل ودھاؤں گا۔۔۔سوچیں بھی نا۔۔۔!"

چوہدری شہاب الدین پٹھے پہ ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے تھے اور حیات راؤ کی بے کلی بڑھ رہی تھی۔۔۔اس کی برداشت جواب دے رہی تھی۔۔۔سکینہ بی بی نے نامحسوس انداز میں پیڑا آگے کو گھسیٹا اور اس گھسیٹنے میں انہوں نے حیات کا پیر اپنے پیر سے مسلا تا کہ وہ حوصلہ رکھے اور باپ کے آگے خاموش رہے۔۔۔حیات ماں کے اس انداز پہ لب بھینچتا سر جھکا گیا۔۔۔

" دیکھیں چوہدری جی۔۔۔" سکینہ بی بی تھوڑی دھیمی آواز میں شروع ہوئیں۔۔۔چوہدری شہاب نے ترچھی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا اور ایک ابرو سوالیہ اچکایا۔۔۔

" آپ کسی زمین کی بات کر رہے تھے نا اس دن آفتاب سے۔۔۔دیکھیں نا چوہدری جی ہم کشور کو بیاہ لائیں گے تو آفتاب نے آخر کڑی کو کچھ تو دینا ہے نا۔۔۔خالی ہتھ تو نہی ٹورے گا نا۔۔۔کوئی زمین جیداد کوئی ماڑا موٹا ٹوٹا۔۔۔چلیں ویاہ پہ نا دے لیکن بعد میں تو دے گا نا۔۔۔تو تب آپ اس سے وہ زمین مانگ لینا۔۔۔وہ نا نہیں کرے گا تب۔۔۔!"

سکینہ بی بی نے جو پینترا کھیلا تھا اس سے حیات راؤ عش عش کر اٹھا تھا۔۔۔وہ جانتا تھا کہ یہ سب وہ شوہر کو منانے کے لیے کر رہی ہیں لیکن ایسی بات تو اس کے سان وگمان میں نہیں آئی تھی۔۔۔چوہدری

شہاب سوچ میں پڑ گئے تھے۔۔۔ چہرے کی خشونت ابھی بھی قائم تھی لیکن آنکھوں میں نیم رضامندی کا شائبہ دکھائی دے رہا تھا۔۔۔

"آفتاب بڑا ڈھیٹ ہے۔۔۔ اس کی آکڑ نہیں مکتی۔۔۔ دھی دے بھی دے گا نا تب بھی لت او پر رکھنے کی کوشش کرے گا۔۔۔ کل کو نا مانا اگر زمین دینے کو تو میں ایک دن بھی اس کی کڑی اپنی حویلی میں رہنے نہی دوں گا۔۔۔ لکھ لو ماں پتر میری یہ بات۔۔۔!"

یہ توڑ مروڑ کر رضامندی کا عندیہ تھا لیکن جذبات کو قابو میں رکھنے کی ضرورت تھی۔۔۔ شہاب الدین ایک گھاگ انسان تھے۔۔۔ پر سے پرندہ بنا لیتے تھے۔۔۔ معاملہ سلجھنے سے پہلے الجھتا اس سے پہلے ہی کسی بنے لگ جاتا تو بہتر تھا۔۔۔

"میں پہلے زمین کی بات رکھوں گا اس کے آگے پھر اس کی دھی کا رشتہ لوں گا۔۔۔ تو بھلے چار کنگن اور چڑھا دے اپنی طرف سے لیکن جب تک وہ زمین میرے نام نہیں ہوتی تب تک میں نہیں مانتا۔۔۔!"

گاڑی وہیں کی وہیں آن رکی تھی۔۔۔ سکینہ بی بی نے ایک طویل سانس بھری۔۔۔ حیات بھی بے چین سا پہلو پہ پہلو بدلے اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا اس سے پہلے والد کے سامنے کوئی بات نکل جائے۔۔۔ سکینہ بی بی نے شوہر کو تاسف سے دیکھا اور کچھ سوچتی دوبارہ ذرا سا آگے کو جھکتی کچھ کہنے لگیں۔۔۔ اب کے آواز اتنی دھیمی تھی کہ دائیں جانب بنے ایک ترتیب میں چار ستونوں میں سے ایک کی اوٹ میں چھپی سنہری کو ٹھیک سے کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔۔۔ اس نے تھوڑا اور زور لگا کے سننا چاہا لیکن مشکل ہوئی تبھی پیچھے سے اچانک کسی نے زوردار آواز میں پکارا۔۔۔

"اے۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ اور یوں کھڑی چھپ چھپ کے کیا باتیں سن رہی ہو۔۔۔!"

سنہری بری طرح بوکھلا کر پلٹی اور پشت پہ کچھ فاصلے پر کھڑے اس لڑکے کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی جو تیوریاں چڑھائے آنکھیں سکوڑے اسے بری طرح گھور رہا تھا۔۔۔ چھ فٹ سے نکلتا قد اور صحتمند مضبوط جسم۔۔۔ چمکتی گندمی رنگت اور گردن کو چھوتے خوبصورت گھنے سلکی بال۔۔۔ بھرے بھرے ابروؤں کے نیچے کٹارسی گلابی ڈورے لیے بھوری آنکھیں۔۔۔ تیکھی ناک کی نوک پہ چھوٹا سا تل اور باریک عنابی

لب۔۔۔بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ تیکھے تیور لیے اسے یوں جانچ رہا تھا جیسے وہ کوئی چور ہو۔۔۔سنہری چند پل تو سٹپٹائی سی کھڑی رہی تھی لیکن پھر فوراً خود کو سنبھال گئی تھی۔۔۔دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ کر ایک ہاتھ سے پرانده جھلاتی مقابل کا بھرپور جائزہ لیتی ایک ادا سے بولی۔۔۔

"مجھے چھوڑو۔۔۔تم کون ہو اور یوں اچانک کہاں سے ٹپکے ہو۔۔۔؟"

اس کے انداز پہ سامنے والا خشونت سے اسے گھورتا رہا اور پھر ہاتھ میں تھاما بیگ تھوڑا جھٹک کر فرش پہ رکھا۔۔۔دونوں ہاتھ پشت پہ باندھتے سینہ تان کر بولا۔۔۔

"چوہدری حسنات راؤ۔۔۔!"

اور سنہری کا دم جیسے سینے میں ہی اٹک گیا تھا۔۔۔!

❁ ❁

ناول گنوا کے دل و جاں ہم کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 7

ہم سب اس کہانی کے کردار ہیں جس کا دورانیہ بہت کم رہ گیا ہے۔ہم میں سے بہت سے لوگ اپنا کردار ادا کر کے چلے گئے ہیں اور باقی جانے والے ہیں۔کہانی کے وہ کردار یاد کیے جائیں گے، جنہوں نے لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کی، بدلہ نہیں لیا۔طاقت کے ہوتے ہوئے بھی معاف کر دیا اور ہلاکت ہو گی ان کے لیے جو اپنی انا کا شکار ہوئے، جنہوں نے اپنی خوشی اور سکون کی خاطر لوگوں کا جینا حرام کیا۔

بے شک ہر کردار کو کیفر کردار تک پہنچنا ہے!!

صبر بھی رنگ لاتا ہے اور
غصہ بھی رنگ لاتا ہے مگر
صبر کے رنگوں سے زندگی حَسین ہو جاتی ہے

جبکہ
غصے کا رنگ محبت اور
وقار کے ہر رَنگ کو نگل جاتا ہے"۔

☆......☆......☆

ماضی میں حویلی لکھاں کے نام سے پہچانی جانے والی حویلی کب کی ماضی کی راکھ میں دب چکی تھی۔اب اس حویلی کا وہ حصہ جو چوہدری شہاب الدین راؤ کی رہائش گاہ ہوا کرتا تھا سبز حویلی کے نام سے جانا جاتا تھا۔جس حویلی کے دالان میں کبھی چوہدری شہاب الدین کا کروفر پوری آن بان سے براجمان تھا اب وہاں چوہدری حیات راؤ اپنی انکساری اور حلیمی کا تاج سر پہ سجائے ہوئے تھے۔چوہدری

شہاب کی زندگی کی شام ہو چکی تھی اور وہ ایک لاچار اور بے بس وجود تھے جو سارا وقت بستر پہ ہوتا تھا لیکن دل کی کیفیت آج بھی روز اول جیسی تھی۔۔۔نا زم ہو سکا تھا نا اپنے گناہ قبول کرنے کا حوصلہ جمع کر سکا تھا۔ انہیں یہی لگتا تھا جیسے سب ان کے ساتھ ظلم کرتے آئے ہیں اور اب بھی روا رکھے ہوئے ہیں۔بستر پہ پڑے پڑے انہیں ماضی ستاتا تھا اور بے تحاشا یاد آتا تھا لیکن اس میں بھی وہ خود کے لیے کرلاتے تھے۔اس خود ساختہ مظلومیت نے ان کی جانب سے سب کو متنفر کر ڈالا تھا لیکن ان کے لیے وقت اور حالات ویسے ہی گزرے تھے جس تناظر میں وہ دیکھنا چاہتے تھے۔شرفوان کا مساج کرنے کے بعد نہلا دھلا کے صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تھوڑی دیر وہیل چئیر پر بٹھا کر باہر لے گیا تھا لیکن اب جھک جھک کے سلامیں کرنے والوں کے انداز بدل چکے تھے۔لوگ اب بھی انہیں دیکھتے ہی ادب سے سلام کہتے مگر انداز میں خاکساری نہیں رہی تھی۔یہی چوہدری شہاب تھے جن کو کبھی کسی کے سلام کرنے کے انداز میں کوئی کمی دکھ جاتی تو کھیڑی سے سجے پیر کا ٹھڈا زوردار انداز میں مقابل کو دے مارتے تھے بھلے سے اس کے پیٹ میں لگے یا پیٹھ پہ۔انہیں پسند تھا کمی کمینوں کا پیروں میں لوٹ پوٹ ہونا۔مگر اب ان کا دور گزر چکا تھا اور حیات راؤ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔۔۔وہ کمیوں کو اپنے برابر بلا جھجک بٹھا لیتے تھے۔چوہدری شہاب کی قوت گویائی مضطرب ہوئی تھی مگر طنطنہ اور اکڑ کا مینار نہیں ڈھے سکا تھا۔وہ سرخ جلالی چہرے کے ساتھ شرفو کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں درشتی سے کہہ کر واپس اپنے کمرے میں آ چکے تھے۔۔۔جہازی سائز بیڈ کے ایک جانب وہ نیم دراز تھے۔۔۔شرفوان کی پشت کے پیچھے دو نرم تکیے لگا گیا تھا۔انہوں نے شرفو کو بھی کمرے سے باہر بھیج دیا تھا۔دماغ میں غصہ اور نفرت شراٹے مارتے دریا کی مانند بہہ رہا تھا۔انہیں اپنی اولاد پہ طیش تھا۔اولاد کی اولاد پہ غصہ تھا۔۔۔حیات راؤ نے ان کے زور دینے کے باوجود چوہدری حاکم کو مہریار کے رشتے سے دوٹوک منع کر دیا تھا اور ان کے کان میں مہریار کی ناپسندیدگی پہنچ چکی تھی۔۔۔یہی بات انہیں کاٹ رہی تھی کہ کیا ان کی حیثیت اتنی بھی نہیں رہی کہ ان کے حکم کے مطابق یہ رشتہ طے ہو جاتا۔ان کی بات کو مانا جاتا بھلے کوئی راضی تھا یا نہیں۔ان کے پوتے کا اشتعال انہی کے جیسا تھا لیکن پھر بھی ان کی ضد تھا۔مہریار کو وہ شروع سے اپنے اختیار میں کرنا چاہتے

تھے لیکن حالات نے اسے ان سے اس قدر بددل کر دیا کہ وہ یکسر ان سے دور ہوتا چلا گیا۔۔۔وہ لیٹے لیٹے چوہدری حاکم سے رابطے کا ذریعہ سوچ رہے تھے۔شرفو بھلے ان کا خیر خواہ تھا لیکن وہ حیات راؤ کے تابع تھا۔پچھلی بار بھی شرفو کے ذریعے ہی حاکم کو بلوایا تھا اور انجام بدمزگی پہ مبنی تھا لیکن اب ان کا دماغ ایسی چال سوچ رہا تھا جس سے چوہدری حاکم کی بیٹی سے مہریار کا رشتہ طے ہو جائے۔اور یہ سب وہ محض اپنی انا کا پرچم بلند رکھنے کے لیے کرنا چاہتے تھے۔زمانے کو بتانا چاہتے تھے کہ آج بھی وہ سب پہ حکومت کرتے ہیں۔اپنے بستر پہ لیٹے لیٹے وہ سب کی قسمتیں طے کرتے ہیں اور حویلی کی سلطنت کے اصل تاجدار وہی ہیں۔وہ یہ بھول گئے تھے کہ چوہدری حاکم وہ شخص ہے جس نے ماضی میں ان کی عزت پہ ہاتھ ڈالا تھا۔ان کا عصبیت پسند ذہن ٹوٹے ہوئے ان ہی رشتوں کو جوڑنا چاہتا تھا جن کی وجہ سے حویلی کا سکون برباد ہوا۔عزتیں اچھالیں گئیں اور وہ اپنے پوتے کی نگاہ میں عمر بھر کے لیے معتوب ٹھہرے۔جب انسان کو اندر سے ضمیر چوٹ مارنے پہ آجائے تو وہ اس کو دبانے کے لیے انہی لوگوں کو اپنے گرد اکھٹا کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ اس حال میں پہنچا ہوتا ہے۔ان سے بنا کر رکھنے کی کوشش میں نڈھال ہوتا ہے لیکن اپنے ضمیر کے سامنے ہار نہیں مانتا۔چوہدری شہاب الدین بھی ان سب کڑیوں کو واپس جوڑنا چاہتے تھے جو گناہوں کے زنگ سے آلودہ تھیں لیکن خود کو ایک شخص سے ہارتا نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ ایک شخص پوری دنیا میں بس ایک ہی تھا۔۔۔چوہدری آفتاب راؤ۔!

☆......☆......☆

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہمسفر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں
تیرے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں

کوئی مکاں کوئی زنداں سمجھ کے رہتا ہے
طلسم خانۂ دیوار و در کو دیکھتے ہیں
وہ بے خبر میری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طنز سے میرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں
یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں
ہماری دربدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
فراز ہم سے سخن دوست، فال کے لئے بھی
کلامِ غالب آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

"احمد فراز"

ہسپتال کے نیم تاریک کمرے میں پرسکون خاموشی تھی۔سہ پہر کا وقت تھا اور کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔باہر کاریڈورز سے گزرتی نرسوں کے قدموں کی چاپ اور اسٹریچرز گھسیٹے جانے کی چرچراہٹ سماعتوں میں پڑتی تو احساس ہوتا کہ یہ ہسپتال ہے اور یہاں زندگیاں دم توڑتی ہیں تو کبھی بجھتے دیے کی لو جیسی پھڑپھڑاتی زندگی کو جینے کی نوید مل جاتی ہے۔دونوں سروں پہ زندگیاں ہے بس فرق آنے جانے کا ہے۔!

ہاجرہ نے قرآن پاک بند کر کے اسے چوما اور ہاتھ پہ لپیٹی تسبیح کو آنکھوں سے لگا کے اٹھیں۔چند قدم کے فاصلے پر ہسپتال کے بیڈ پہ زوہا کا نیم غنودہ سا وجود پڑا تھا۔انہوں نے اس کے قریب آ کر ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی پہ ہاتھ پھیر کے بال پیچھے کیے اور اس کے چہرے پہ پھونک ماری۔ایک طرف دیوار گیر شیلف نصب تھی وہاں قرآن پاک رکھا اور واپس زوہا کے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھ کر تسبیح کے دانے

گرانے لگیں۔ان کی نظریں اس کے چہرے کو ٹٹول رہیں تھیں ۔۔۔وہ صبح سے یہاں شفٹ ہو چکے تھے اور اب سہ پہر ہونے کو آئی تھی ۔مہر یار نے وقت برباد نہیں کیا تھا بلکہ آنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی زوہا کے ضروری ٹیسٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔اسی سب میں دوپہر ہو گئی تھی اور پھر زوہا کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔یہ ایک پرائیوٹ روم تھا۔کمرے میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی ۔اے سی سے لے کر مائیکرو اوون تک ۔لیکن تھا تو یہ ہسپتال کا کمرا اور ہسپتال کے کمرے جتنے مرضی لگژری ہوا کریں۔کبھی بھی انسانی اعصاب پہ اچھا اثر نہیں ڈالا کرتے ۔ہاجرہ کا بھی دل بے چین سا تھا۔انہیں زمن کی فکر بھی ستائے جا رہی تھی ،نا جانے کیا کر رہی ہو گی ۔رونا دھونا نا ڈالا ہو۔لیکن رباب خان کے ہونے کی تسلی بھی تھی ۔وہ اسے ٹیکل کرنا بخوبی جانتی تھیں۔زوہا کو نیند آور دوا دی گئی تھی ۔صبح سے اس نے ڈاکٹرز کے ساتھ خاصا تعاون کیا تھا۔اور ہاجرہ کو حیرت تھی کہ زوہا بلکل پر سکون رہی تھی ۔نا اس نے شور شرابا ڈالا تھا اور نا ہی وہ مچلی تھی ۔مہر یار مسلسل اس کے ساتھ رہا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر نا جانے اسے کیا کہتا کہ وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کے اسے دیکھتی اور مسکرا دیتی ۔ہاجرہ مہر یار کے رویے پہ نثار ہوتی رہیں۔ورنہ زوہا انجان چہرے دیکھتے ہی قابو سے باہر ہو جاتی تھی ۔!

اسے نیند میں جاتا دیکھ کر ہاجرہ دھیرے سے اٹھیں اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔چمکتی دھوپ میں ہسپتال کا صاف ستھرا لان اور خوبصورت پودے انتہائی دلکش لگ رہے تھے ۔۔ایک بھولی بسری یاد یاداشت کے پردے پہ سر سرائی۔

وہ تھیں ،بے تحاشا پھول تھے اور ان کو نچھاور کرنے والا ان کی متاع حیات ۔۔۔کیا دن تھے جب ان کے گرد محبت گنگنایا کرتی تھی ۔اچھوتے جذبے دل کو گرمایا کرتے تھے ۔انہیں کسی نے نئی نئی محبت کا ادراک بخشا تھا اور وہ اسی خمار میں اسے ہی اپنی کل کائنات مانے پیچھے چل پڑیں تھیں ۔محبت تو اندھی ہوتی ہے اس لیے انہوں نے بھی اعتبار کی ڈور تھمانے کے بعد پلٹ کے آنکھیں نہی کھولیں تھیں ۔چاہنے والے نے انہیں بے تحاشا چاہا تھا۔اس قدر کہ انہیں خود سے خود ہی محبت ہو گئی تھی ۔وہ جہاں پیر رکھتی تھیں وہاں کسی کی جذبے لٹاتی نگاہیں انہیں ہواؤں میں اڑائے رکھتی تھیں ۔زندگی سبک

خرامی سے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی پھر اچانک سے فسوں ٹوٹا اور ان کا خواب تھا کوئی جو کرچیوں میں تبدیل ہو کر ان کی زیست کا باب ہی بدل گیا۔ جب طوفان تھما تھا تو نا چاہت تھی نا چاہنے والا۔ جو باقی بچا تھا وہ تھی نارسائی، بے اعتباری اور جدائی اور اسی کو سمیٹے انہوں نے زندگی کے کتنے سال بتا دیے تھے۔ دل آج بھی اسے پکارتا تھا جو ان کی رگوں میں خون بن کے دوڑتا تھا۔ لیکن فرق بس اتنا تھا کہ وہ جو پہلے ان کی دھڑکنوں کی جمع تفریق کر لیا کرتا تھا اب اس قدر دور جا چکا تھا کہ ان کے دل کی ویرانی الہام بن کے اس کے دل میں اترتی نہی تھی۔۔۔ فاصلوں کو چاہتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوا کرتا لیکن جب چاہتوں کے رنگ پھیکے پڑ جائیں تو فاصلے اوس بن کر ان پہ برستے ہیں اور ان کا نقش مکمل دھو ڈالتے ہیں۔۔۔!

☆......☆......☆

یہ ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ کا بند دروازہ تھا۔ اس نے اپنی جیب سے میگنیٹک کارڈ نکالا اور دروازے کے ہینڈل کیساتھ متصل مشین میں سلائیڈ کیا۔ دروازہ کلک کی آواز سے کھل گیا۔ وہ کارڈ واپس جیب میں ڈالتا اندر داخل ہوا۔ ایک طرف رکھے شو ریک میں اس نے اپنے لانگ بوٹ اتار کر رکھے اور آرام دہ سلیپرز پہنے۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی خود کار نظام کے تحت اپارٹمنٹ کی روپ لائٹس روشن ہو گئی تھیں۔ اندھیرے میں ڈوبا اپارٹمنٹ اب ہلکی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صاف ستھرا ہال جو تھوڑے مگر نفیس فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی گولائی میں مناسب سائز کا میرون صوفہ سیٹ رکھا تھا اور بیچوں بیچ میرون پوشش سے سجا سینٹرل ٹیبل جس پر چند میگزینز اور ایش ٹرے رکھی تھی۔ ایش ٹرے میں پرانے سگریٹوں کی راکھ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف کونے میں اوپن کچن تھا اور اس کے ایل شیپ کاؤنٹر کے گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین خوبصورت بار اسٹولز پڑے تھے۔ یہی کاؤنٹر ڈائننگ کا کام پورا کرتا تھا۔ اسٹو و پہ ایک خوبصورت چائے کی کیتلی پڑی تھی۔ کچن کے بالکل مقابل دیوار کے ساتھ ایک سنگل بیڈ آراستہ تھا۔ ایک چھوٹی سی سائیڈ ٹیبل اور ان پہ نفاست سے رکھا کتابوں کا ڈھیر۔ سائیڈ ٹیبل کے ساتھ راڈ آئرن کا بنا لیمپ تھا جس کے شیڈز بند کلی سے مشابہ تھے اور ان کا رخ بیڈ کی

طرف تھا۔بیڈ کی پائینتی کی جانب کچھ فاصے پر ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ اپارٹمنٹ کے واشروم کا تھا جہاں لانڈری کا بھی انتظام تھا۔بیڈ کی داہنی جانب راکنگ چیئر کی پشت پر خوبصورت سلور جھالر والے میرون پردے لٹک رہے تھے اور یہ اپارٹمنٹ کا سب سے حسین منظر تھا۔یہ بالکنی تھی جہاں سے پورا شہر دکھائی دیتا تھا۔رات کی تاریکی میں جاگتا شہر۔روشنیوں سے ٹمٹماتا شہر۔عمارتوں سے مزین اور ان میں رہنے والے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بھاگتے مکین۔!

وہ اپنے تھکے ہوئے اعصاب لیے تھری سیٹر صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔اسے کافی کی یا پھر چائے کی شدید طلب تھی۔۔۔اس نے ایک بار پھر سوچا کافی یا چائے۔؟بس کچھ گرم۔!اس کے ٹھنڈے یخ وجود کو گرمائش چاہیے تھی۔۔۔مگر آلکسی اسکے پورے وجود کو جکڑے ہوئے تھی۔اس نے ہاتھ سے صوفہ ٹٹولا اور ریموٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ریموٹ کی بجائے اس کا موبائل فون ہاتھ آیا۔وہ گھر سے باہر جاتے کبھی بھی موبائل ساتھ لے کر نہیں جاتا تھا۔اسے کبھی کسی کی کال آتی تھی نا اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی تھا۔بے دلی سے اس نے موبائل کی اسکرین روشن کی تو اس کی سکرین ان کمنگ کال کی وجہ سے بلنک کر رہی تھی۔نمبر اس کے لیے انجان نہیں تھا لیکن ایک عرصہ ہوا تھا وہ سب کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔نا جانے کیا سوچ کے اس نے کال پک کر کے موبائل کان سے لگایا۔وہ کچھ بولا نہیں تھا۔مقابل بھی شائد جانتا تھا کہ جو بھی کہنا ہے اسے ہی کہنا ہے۔۔۔اس لیے اسی نے کہا تھا اور جو کہا تھا وہ سن کے وہ ایک جھٹکے سے لیٹے سے اٹھ بیٹھا تھا۔اس کے پورے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔دھڑکنیں منتشر ہونے کی بجائے جیسے تھم گئی تھیں۔۔۔بلکہ اسے لگا تھا کہ وقت ہی رک گیا ہے۔!

☆......☆......☆

دو کمروں کا چھوٹا سا پورشن تھا لیکن ہوادار اور صاف ستھرا تھا۔انیکسی باقی رہائشی حصے سے الگ تھی لیکن ایک طویل راہداری اندر سے دی گئی تھی جو سیدھا انیکسی کے پچھلے دروازے تک جاتی تھی۔جب کہ انیکسی کا گیٹ کوٹھی کے پچھلی طرف کی سڑک کی جانب کھلتا تھا۔ایک طرح سے انیکسی کو مکمل پرائیویسی بھی حاصل تھی لیکن اس کا رابطہ مرکزی رہائشی حصے سے بھی قائم رکھا گیا تھا۔زمن کو پورشن اچھا لگا تھا۔کم از کم

جہاں سے وہ آئی تھی وہاں سے تو بے حد بہترین تھا۔وائٹ واش کی وجہ سے دیواریں روشن اور کمرے کشادہ لگتے تھے۔دو درمیانے سائز کے بیڈرومز تھے اور دونوں کے ساتھ ایک ہی اٹیچ واشروم تھا جس کے دوطرفہ دروازے دونوں بیڈرومز میں کھلتے تھے۔چھوٹا سا سٹنگ ایریا تھا جو تین طرف سے بڑی بڑی کھڑکیوں سے مزین تھا۔اس کے ساتھ ہی مناسب سا کچن جس میں ضرورت کے مطابق کیبنٹس اور کاؤنٹرز نصب تھے۔مجموعی مطور پر یہ اب تک کی ایک بہترین رہائش گاہ تھی۔۔۔یہاں تھوڑا بہت فرنیچر اور کچھ الیکٹرک کا سامان پہلے سے ہی موجود تھا۔۔ایک درمیانے سائز کی فرج بھی تھی اور مائیکرو ویو اوون بھی پڑا تھا جو وہ لوگ اپنی زندگی میں اپنے گھر میں پہلی بار استعمال کرتے۔صبح سے کتنی بار وہ اس گھر کا جائزہ لے چکی تھی اور اب مکمل بیزار سی تھک کے صوفے پہ بیٹھ کے اس کی پشت سے سر ٹیکے آنکھیں موندے دن میں ہونے والے واقعات کو ذہن میں دہرانے لگی۔۔۔مہریار نے انہیں یہاں ڈراپ کیا تو رباب آنٹی، فائزہ خاکوانی اور لائبہ کے ساتھ اندر چلی گئیں جب کہ وہ قصدا ٹھہری رہی۔۔۔مہریار اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور بے نیازی سے سن گلاسز آنکھوں پہ سیٹ کرتا گاڑی آگے بڑھانے ہی والا تھا جب اچانک وہ تیزی سے آگے آئی اور دروازے کی کھڑکی سے تقریبا پوری اندر گھستے ہوئے بولی۔

"رکیں۔۔۔اتنی بھی کیا آفت ہے آپ کو۔۔۔!"

مہریار نے اس کے انداز پہ حیرت چھپاتے سنجیدگی سے بھنویں اچکائیں۔یہ انداز تھا پوچھنے کا کہ بولو کیا کہنا ہے۔زمن نے گہرا سانس بھرتے حلق تر کیا اور بولی۔

"مجھے بھی زوہا کے پاس جانا ہے۔وہ امی سے اکیلے ٹیکل نہی ہوتی۔مجھے بھی لے جائیں۔!"

"تو یہاں گھر کون دیکھے گا۔اندر دیکھو تو سہی جا کے کہ کون ہیں، کیسے لوگ ہیں۔رہائش کیسی ہے۔!" مہریار نے گاڑی کو ریس دی جیسے اسے بہت جلدی ہو۔زمن کو تپ چڑھنے لگی تھی لیکن مجبوری تھی۔

"میں فائزہ آنٹی کو اچھے سے جانتی ہوں ڈاکٹر مہریار۔باقی آ کر جان لوں گی۔ویسے بھی رباب آنٹی ہیں نا وہ مینج کر لیں گی۔!"

"کیوں۔وہ کیسے مینج کریں گی۔آپ کی آیا ہیں وہ۔یا کُل وقتی ملازمہ۔کیا انہیں گھر نہی جانا

اپنے۔زمن ہر بندے کو اپنی ذمہ داریاں خود اٹھانی چاہیئں۔دوسروں پہ بس اتنا انحصار کریں جتنا وہ بخوشی برداشت کرلیں۔۔۔!"

وہ سنجیدہ تھا اور زمن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔خفت،ناگواری یا شائد کچھ اور۔آنکھیں مفت میں گیلی ہونے پہ تلی تھیں۔وہ چند پل سوچتی رہی کہ کیا جواب دے۔۔۔جب بولی تو گلے میں سانس اور آنسو ایک ساتھ اٹکے پڑے تھے۔۔۔

"بہت شکریہ مجھے احساس دلانے کا۔۔۔ورنہ آج تک تو اس بارے میں کبھی سوچا ہی نا تھا۔آج بھی آپ نا بتاتے تو نا جانے کب تک دوسروں کا استحصال کرتی رہتی میں۔اصل میں باپ کبھی سر پر رہا نہیں۔امی اور زوہا کی خاطر بہت چھوٹی عمر میں پیروں پہ کھڑی ہو گئی تھی ایسے میں جب بھی کبھی رباب انٹی کا سہارا ملا تو انکار نہیں کیا اور پھر عادت سی ہوتی چلی گئی۔ہمارے لیے چاچا تایا،پھپھو خالہ،ہر رشتہ ان سے وابستہ ہے اس لیے ان پہ ڈیپینڈ کرنے لگی۔آئیندہ خیال رکھوں گی۔آپ جائیے آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔میں رکشہ یا کیب سے چلی جاؤں گی کچھ دیر میں۔۔۔!"

وہ کہہ کر رکی نہیں۔کھڑکی سے سر باہر نکالا اور مزید کچھ کہے بنا اندر چلی گئی۔اپنے پیچھے اس نے مہریار کے تاثرات بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔۔۔باقی کا وقت وہ رباب آنٹی کے ساتھ انیکسی کی چھوٹی موٹی صفائی اور سیٹنگ میں مشغول رہی حالانکہ انیکسی صاف ستھری تھی،ان کے جانے کے بعد وہ فائزہ خاکوانی اور لائبہ کے پاس آ گئی۔دونوں نے اس کا باتوں سے دل بہلائے رکھا۔فائزہ خاکوانی تو اس کے لیے بے حد حساس ہو رہی تھیں کیونکہ ایک تو جگہ نئی اور پھر وہ اس وقت اکیلی تھی۔وہ اسے کسی بھی طرح سے بور نہیں ہونے دے رہی تھیں۔وہ بور ہو بھی نہیں رہی تھی کیونکہ لائبہ اپنی ذات میں پوری تفریح تھی۔اس لڑکی کے پاس اس قدر ذخیرہ تھا باتوں اور قصے کہانیوں کا اسے بار بار لائبہ کو دیکھ دیکھ کر زوہا کی یاد ستاتی رہی۔وہ بھی بلکل ایسی ہی باتونی تھی۔۔۔بولنا اور بے تحاشا بولنا۔نت نئے واقعات کو دلچسپ انداز میں گوش گزار کرنا کہ مقابل خود ہی دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔وہ کھانا کھا کر واپس اپنے پورشن میں آئی تھی اور تب سے سوچ رہی تھی کہ اب ہاسپٹل کا چکر لگا

لے۔امی کو یقیناً اس کی ضرورت ہوگی مگر جب خیال آتا کہ وہاں مہریار سے سامنا ہو سکتا ہے تو دل بیٹھ سا رہا تھا۔نجانے صبح سے جب بھی اس شخص کا خیال آرہا تھا آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔۔۔کچھ تھا جو دل دکھا گیا تھا۔وہ ذہن جھٹکتی اٹھی اور شولڈر بیگ اٹھا کر اس میں پیسے چیک کرتی وہاں سے باہر نکلی۔اس کا ارادہ فائزہ خالہ کو انی کو بتا کے ہاسپٹل جانے کا تھا لیکن برآمدے میں بانو مل گئی تو اس نے ان کے آرام کرنے کا بتایا جبکہ لائبہ بھی اپنے روم میں تھی۔وہ بانو کو بتا کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔باہر نکل کر اس نے سڑک پر اچھی طرح جھانکا۔۔۔لاشعور میں بیٹھا خوف اسے مضطرب کر رہا تھا لیکن اسے ماں سے ملنے کی بے چینی تھی۔وہ مضبوط چال لیے بلکل سیدھ میں چلتی نکڑ تک آئی تھی جب اچانک اس کے بائیں جانب پشت سے گاڑی کا ہارن بجا۔وہ بری طرح اچھلی تھی۔فوراً مڑی تو دیکھا یہ وہی گاڑی تھی جس کے پاس سے وہ ابھی گزری تھی لیکن دھیان نہیں دیا تھا کہ کس کی ہے اور اندر کوئی بیٹھا ہے۔۔۔مہریار کو ڈرائیونگ سیٹ پہ دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔صبح کی اس کی کہی تمام باتیں یاد آنے لگیں۔وہ پلٹ کر دوبارہ چلنے لگی۔مہریار نے دوبارہ ہارن دیا اور ہاتھ نہیں ہٹایا۔زمن کے قدم رکے اور دماغ گھوم گیا۔ایک بار پہلے بھی اپنے ہی ہاسپٹل کے باہر یوں ہی ہارن پہ ہاتھ رکھ چھوڑا تھا اور مجبوراً اسے رکشے سے اتر کر اس کی گاڑی میں بیٹھنا پڑا تھا۔صورتحال اب بھی عجیب ہونے جا رہی تھی۔نئی کالونی تھی اور وہ بھی نئے تھے۔کوئی اپنے ٹیرس سے جھانک لیتا یا دروازے پہ نکل آتا تو پہلا امپریشن ہی برا پڑتا۔فوراً واپس مڑی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔اس طرح کہ ایک پیر گاڑی کے اندر رکھا تھا اور دوسرا سڑک پہ ہی دھرے رکھا۔مہریار کا ہاتھ ہارن سے ہٹ گیا تھا۔وہ بلکل سیدھ میں سامنے دیکھ رہا تھا۔

”دروازہ بند کرو۔۔۔!“ گلاسز آنکھوں پہ لگاتے نارمل لہجے میں بولا۔زمن کا دل کیا گود میں رکھا شولڈر بیگ دے مارے۔عجیب ہی رویہ تھا اس شخص کا۔

”کیوں کروں اور کیوں آئے ہیں یہاں۔کچھ سنانے کو باقی رہ گیا تھا جو سنانا تھا۔!“

”ہاں۔“ دوٹوک جواب۔

”سنائیں۔بولیں۔سن لوں گی۔مجبوری انسان کو سب کچھ کروا لیتی ہے۔ہم بھی اس وقت مجبور ہیں۔ورنہ

جو کچھ اور جس لہجے میں آپ مجھے سنا کے چلتے بنے تھے کوئی اور ہوتی تو دن میں تارے دکھا دیتی۔!"

"کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میں یہ سب تمہیں ہی کہہ سکتا تھا اور کہتا رہوں گا۔۔۔!"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی جبکہ زمن کی طرف والا دروازہ ہنوز کھلا تھا۔اس کے دل کو دھڑکا سا لگا لیکن اپنا دوسرا پاؤں اندر پھر بھی نہیں کھینچا تھا۔

"کیوں کہتے رہیں گے۔کس رشتے سے۔کس حق سے۔اور میں کیوں سنتی رہوں گی بھلا۔!"

"حق کی بات نا کرو زمن بی بی۔ایک سو ایک حقوق نکل آئیں گے۔اور رشتہ بنانے کی کیا جلدی پڑی ہے۔ذرا چھری تلے دم تو لو۔!" وہ مسکراہٹ دباتا صاف اسے تپا رہا تھا اور وہ واقعی بری طرح تپ گئی تھی۔مہر یار نے بھانپ لیا کہ وہ اترنے لگی ہے تو گاڑی چلا دی۔۔۔زمن نے پھرتی سے پیر اندر کھینچ لیا اور حیرت سے مہر یار کی جانب دیکھا جو انہماک سے سامنے دیکھ رہا تھا۔گاڑی سپیڈ پکڑنے لگی تھی۔ناچار زمن نے گاڑی کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھینچ کے بند کیا۔مہر یار نے آنکھیں میچ کے دوبارہ کھولیں اور ہونٹوں سے بے ساختہ سسکاری سی نکلی۔زمن کو لطف آیا۔۔۔اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی کے حوالے سے پچی ہیں۔۔۔مہر یار نے کالونی سے گاڑی نکال کر سیدھی سڑک پہ ڈال دی تھی۔زمن نروٹھے لہجے میں باور کرا گئی۔

"میں نے امی کے پاس جانا ہے۔۔۔مجھے یاد آرہی ہے ان کی۔پتا نہیں صبح سے کیا کر رہی ہوں گی میرے بنا۔!"

"تمہاری اطلاع کے لیے ہم وہیں جارہے ہیں اور بے فکر رہو وہ صبح کی کافی فریش ہیں اور زوہا بھی خاصی خوش باش اور رائزی فیل کر رہی ہے۔۔۔!"

زمن کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔تو کیا کسی نے اسے یاد بھی نہیں کیا۔۔۔زمن نے کن اکھیوں سے خفیف سی گردن موڑ کر مہر یار کی جانب دیکھا تو اس نے اچانک سے پوری گردن موڑ کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔زمن کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔دل اس قدر شدت سے دھڑکا کہ لگا آواز باہر تک سنائی دے رہی ہو گی۔مہر یار کے گلاسز کی وجہ سے اس کی نگاہوں کے تاثرات نیم واضح تھے

لیکن زمن کے لیے یہ بھی خجل ہونے کو کافی تھا۔اس نے فوراً ماحول کا اثر ختم کرنے کے لیے سوال داغا۔

"آپ کی فیملی میں کتنے لوگ ہیں۔مطلب آپ کے بچے شچے کتنے ہیں۔؟"

مہریار کی بھنویں متعجب سی ایک دوسرے سے ملیں اور پھر اس نے حظ اٹھانے کی غرض سے کہہ دیا۔

"چار۔لیکن فی الحال۔۔۔!"

زمن کے حلق میں کچھ اٹکا۔وہ بڑبڑائی "لا حول ولا قوۃ الا باللہ"...

"ماشاءاللہ۔آپ کی مسز کیسی ہیں۔؟"

"کیا مطلب کیسی ہیں۔ویسی ہی ہیں جیسی ہیں اور آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ملنا ہے؟"

"ملوا دیں۔میں بھی دیکھوں کہ ان کے سامنے بھی آپ ایسے ہی ٹھرک جھاڑتے ہیں یا اکیلے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہیں!"

مہریار نے ایک جھٹکے سے گاڑی سائیڈ پہ روک کر کھڑی کی۔زمن نے سانس روک لیا۔مہریار پورا اس کی جانب گھوما اور اس کی فق رنگت والے چہرے کو دیکھا۔

"ادھر دیکھو میری طرف۔" وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔نظریں سامنے جمائے۔"میں نے کہا ادھر دیکھو زمن۔!" اس نے ڈپٹ کر کہا تو زمن نے با دل نخواستہ گردن پھیری۔مہریار نے گلاسز اتار کر ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے اور اب اس کی گہری نظریں زمن کو اپنے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔"کہاں پھنس گئی۔" اس نے دل میں سوچا لیکن دم سادھے رکھا۔

"کسی مصیبت میں نا پھنسو اسی بات سے بچا رہا ہوں۔" مہریار نے حسب سابق اس کی سوچ کا جواب الفاظ سے دیا تھا۔

"اور ایک بات یاد رکھنا۔میں بلا ضرورت کسی سے بات نہی کرتا نا پسند کرتا ہوں کہ مجھ پر کوئی رائے زنی کرے۔عمر اور رتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو بات کی جائے وہ اچھی لگتی ہے ورنہ وہی ہوتا ہے جو اس وقت تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔بلا وجہ کی شرمندگی۔"

مہریار کے ایسا کہنے پر زمن کا سر جھکا تھا لیکن شرمندگی سے نہیں چہرے پہ آیا اشتعال چھپانے

کے لیے۔

"ہر بار یہ بندہ بس مجھے ذلیل کرنے کے لیے ہی سامنے آتا ہے۔چین ہی نہیں پڑتا جب تک مجھے چار باتیں سنا نا لے۔ٹھرکی کہیں کا۔!"

وہ دل میں اسے کوستی نظریں گود میں رکھے شولڈر بیگ کے اسٹریپ پہ گاڑے ہوئے تھی۔

"میں نے کبھی ایسے عامیانہ کام نہیں کیے جن کی وجہ سے مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔جب بھی، کچھ بھی کیا ہے ڈنکے کی چوٹ پہ کیا ہے۔چھپ کے جو کیا جائے اس میں آپ کی شخصیت کی کمزوری عیاں ہوتی ہے۔۔۔اور میری شخصیت اتنی مضبوط ہے کہ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے چور لمحوں کا انتظار نہیں کرتا۔اگر تم میں ایسا کچھ ہوتا تو ٹھرک نہیں جھاڑتا بلکہ دو گواہ اور قاضی بغل میں لے کر آتا۔۔۔سمجھی۔۔۔نیکسٹ ٹائم جب مجھ سے بات کرو تو ذہن میں رکھنا کہ میں ڈاکٹر مہر یار راؤ ہوں۔کوئی سڑک چھاپ لفنگا نہیں۔!"

کاش کہ زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتی۔کاش گاڑی کا فرش ہی ٹوٹ جاتا اور وہ نیچے گر جاتی۔اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس کوئی چھل ہو اور پل میں منظر بدل جائے۔اففففف! زبان پھسل جائے اور غلط بندے کے سامنے غلط بات پہ پھسل جائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے اسے آج معلوم ہوا تھا۔اسے نہیں کہنا چاہیے تھا ایسا۔۔۔وہ ایک معتبر پیشے سے منسلک اس کی بہن کا فی الحال مفت علاج کرنے والا وہ ڈاکٹر ہے جو رباب آنٹی کو بہت قریب سے جانتا ہے۔کیا عزت رہ جائے گی رباب آنٹی کی نظر میں اگر یہ انہیں بتا دے کہ وہ اسے ایک ٹھرکی انسان سمجھتی ہے۔۔۔زمن کو رہ رہ کر اپنے اوپر افسوس ہو رہا تھا۔مہر یار مکمل خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ہاسپٹل قریب آنے والا تھا۔زمن نے ہمت کی اور حلق تر کرتے ہوئے بولی۔۔۔

"س۔س۔سس۔سوری۔۔۔!" پھنسی ہوئی آواز بمشکل نکل پائی تھی۔مہر یار نے چونک کر نگاہیں ذرا کی ذرا پھیر کر اسے دیکھا اور بولا۔

"ہممم۔۔۔کیا کہا۔آواز نہیں سنائی دی تمہاری۔دوبارہ کہنا پلیز۔۔۔!"

"میں نے کہا مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔میں بھول گئی تھی کہ آپ ایک جانے مانے نیورو سرجن ہیں اور ہم ادھار پہ آپریشن کروانے والے آپ کے نادار پیشنٹس۔مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔بلکہ میں آئندہ بے حد خیال رکھوں گی۔۔۔!"

"پہلی بات نا تو میں کسی کا ادھار پہ آپریشن کرتا ہوں اور نا مجھے جبرا مظلوم بننے والے لوگ پسند ہیں۔میں تم سے آپریشن کی پوری فیس وصول کروں گا۔بے فکر رہو۔اور اچھی بات ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔انسان کو زبان وکلام کے معاملے میں بھی کے ساتھ محتاط رہنا چاہیے۔لو آگیا ہاسپٹل۔!"

وہ رسان سے کہتا اس کا جھکا سر دیکھ کر مسکراہٹ ضبط کر رہا تھا۔اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت زمن کا دل دھاڑیں مار کر رونے کو کر رہا ہو گا لیکن وہ اسے گنجائش دینے کے موڈ میں قطعا نہیں تھا۔اس نے ہاسپٹل کے سامنے گاڑی روکی اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔۔۔

"اب جاؤ اندر اور اپنی امی اور بہن سے مل لو۔واپسی جب کرنی ہو گی مجھے بتا دینا میں ڈراپ کر دوں گا۔!"

"نہیں۔اس کی ضرورت۔۔۔" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر لب بھینچ گئی۔

"پھر بھاشن دے دے گا۔چپ ہی رہ زمن۔" دل میں خود کو سمجھاتی وہ اثبات میں سر ہلاتی دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگی جب مہریار نے اسے پکارا۔اس نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ضبط کی شدت سے ہلکی گلابی پڑتی آنکھیں۔لمبی مڑی ہوئی نم زدہ پلکیں۔۔۔صاف شفاف سنہری رنگت جو خفگی کی سرخی لیے ہوئے تھی۔۔۔ونڈ سکرین سے سورج کی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور ان کرنوں نے اس کی باریک ناک میں پہنے لونگ کے چھوٹے سے سیاہ موتی کو خیرہ کیا تھا۔۔۔مہریار نے بے ساختہ نگاہ چرائی تھی۔ذہن کے پردے پہ کوئی چہرہ ابھرا تھا اور اس نے ماحول کا فسوں جیسے پل میں تحلیل کر دیا تھا۔وہ گہری سانس بھر کر خود پہ قابو پاتا اس سے مخاطب ہوا۔۔۔

"یہ دو تین دن تم مال جانے سے پرہیز کرنا۔میں نے فائزہ خاکوانی صاحبہ کو بھی انفارم کر دیا ہے۔۔۔وہ خود تمہیں منع کر دیں گی۔۔۔زوہا کے آپریشن تک محتاط رہو اور گھر میں رہو۔تمہاری امی بھی گھر نہیں

ہوں گی۔ رباب میم کو بلاوجہ پریشان نا کرنا اور میں بھی ہاسپٹل میں بزی رہوں گا اس لیے احتیاط رکھنا۔!"

زمن کا دماغ بھک سے اڑا تھا لیکن مزید بے عزتی کروانے کا یارا نا تھا۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہہ دے کہ آپ میرے گاڈ فادر ہیں جو میرا پورا شیڈول ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ اب بھلا کہیں آنا جانا بھی اس بندے کی مرضی سے کرنا ہے مجھے۔۔۔ وہ دل میں باقاعدہ جھگڑ رہی تھی لیکن لب بھینچ رکھے تھے۔۔۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتری اور دروازہ زور سے بند کرنے ہی لگی تھی کہ مہریار نے اس کی سائیڈ پہ جھک کر دروازے کو تھام لیا اور آہستگی سے بند کر دیا۔ ایک خشمگیں نگاہ ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

"اب شرافت سے اندر جاؤ اور یہ چند دن اگر میرے کہے کے مطابق عمل کر لو گی تو شان نہی گھٹے گی تمہاری۔ کہیں آنے جانے سے روک رہا ہوں تو تمہاری بہتری کے لیے۔ جاؤ شاباش۔۔۔!"

اس بار اس کا لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔ زمن آگے بڑھ گئی۔۔۔ گاڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے پہلی سیڑھی پہ پیر رکھ کر اس نے پلٹ کر مہریار کو دیکھا اور بنا آواز کے پورا زور لگا کے ہونٹوں کو حرکت دی۔۔۔

"ٹھرکی۔۔۔!"

کہہ کر جھپاک سے نظروں سے غائب ہو گئی۔۔۔ مہریار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ کی بند مٹھی رکھ کر خود کو کمپوز کیا اور زیر لب بولا۔

"پاگل، بے وقوف۔۔۔!"

پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے بھی یہ پاگل، بے وقوف لڑکی اسے کسی کی مسلسل یاد دلا رہی تھی اور وہ اس یاد سے پیچھا چھڑانے کے لیے جلد از جلد اندر جا کر مصروف ہو جانا چاہتا تھا۔۔۔!

☆......☆......☆

ملگجے اندھیرے میں بھی محسوس ہو رہا تھا کہ سارا آفس ادھیڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی شے سلامت نہی رہی تھی اور نا جگہ پہ موجود تھی۔ شیشے کی کرچیوں نے جا بجا کارپٹ کو ڈھک رکھا تھا۔ آفس کی دیواروں پہ لگی سینریوں کے فریم خستہ حالت میں گرے پڑے تھے اور ان کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔۔۔ بڑی ساری ایل ای ڈی بھی تباہ حال تھی۔ ایل ای ڈی کے نیچے ایستادہ شیشے کی شیلفیں ٹوٹ چکی تھیں۔ کارنر پہ رکھا

کرسٹل کا گول میز اور اس پہ رکھے خوبصورت نفیس کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز تمام کے تمام ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ایک جانب رکھے صوفہ سیٹ کی ترتیب بگڑی ہوئی تھی اور اس کے بیچ میں پڑا منقش شیشے کا سینٹرل ٹیبل بے دردی سے توڑ دیا گیا تھا۔وسیع و عریض گلاس ٹاپ ٹیبل کے اوپر کچھ بھی نہیں تھا۔لیپ ٹاپ سمیت ہر ہر شے زمین بوس ہو چکی تھی۔آرام دہ آفیشل چیئر کو اٹھا کر گلاس ٹاپ پر مارا گیا تھا جس کے باعث شیشہ چٹخ چکا تھا اور رہی کرسی عقب میں موجود گلاس وال کو ماری گی تھی لیکن اسے خاص نقصان پہنچنے سے بچت ہو گی تھی۔اس سارے منظر کا مجموعی جائزہ خاصا ہولناک تھا لیکن اس منظر کی ہولناکی پہ جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی وہ شہزور راؤ کا اشتعال میں لتھڑا وجود تھا جو گلاس وال کے ساتھ ٹیک لگائے نڈھال سا آنکھیں موندے گہرے سانس لے رہا تھا۔اپنے آفس کی اس حالت کا ذمہ دار وہ خود تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ابھی اس کے سامنے کوئی ذی روح آ گیا تو شاید وہ اسے جان سے مار ڈالے،اس لیے اس نے آفس لاک کر رکھا تھا۔ہر شے تہس نہس کر دینے کے باوجود اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔وہ آج پھر ناکام واپس آیا تھا۔لیکن اس بار کی ناکامی اسے خون کے آنسو رلا رہی تھی۔نفرت اور انتقام جیسے سیاہ سیال بن کے رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔کیسا کھیل کھیلا گیا تھا اس کے ساتھ۔۔۔جب اس نے شرافت کا چولا چڑھا لیا تھا اور بنا کسی مار دھاڑ یا زور زبردستی کے وہ اچھے انداز میں وہاں جا کر زمن کا سامنا کرنے والا تھا۔اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنا چاہتا تھا۔اس کا ارادہ تو نکاح تک کرنے کا تھا۔وہ مکمل تیاری کے ساتھ وہاں گیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں ہو گا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا زمن اور اس کی ماں کو منانے میں مگر اس بار وہ نامراد نہیں لوٹے گا۔وہ زمن کو تاحیات اپنے نام کر کے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔اس نے نصر سے کہہ کر اپنے فارم ہاؤس کو کسی تاج محل کی مانند سجوایا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے تاروں اور کہکشاؤں کی بارات وہاں استقبال کو موجود ہو۔وہ تصور میں بار ہا زمن کا حیرت میں ڈوبا چہرہ لاتا جو اپنے ایسے شاندار استقبال اور اس کی محبت کی انتہا جان کر بننے والا تھا۔لیکن ہوا کیا۔؟؟؟اس کے منہ پر ایسا جوتا پڑا تھا جس کی چھاپ اور آواز نے اس کا پورا وجود سن کر رکھ دیا تھا۔وہ جو معمولی سی بات پر مقابل کو ادھیڑ کر رکھ دینے والوں میں سے تھا آج اس بری طرح ذلیل

ہو کر واپس آیا تھا کہ اگر وہ انتقامی ذہن کا حامل نا ہوتا تو وہ کچھ کھا بیٹھتا لیکن اسے اس کے انتقام نے ایسا قدم اٹھانے سے روک لیا تھا۔اس نے اپنے آفس واپس آ کر خود کو یہاں بند کر لیا تھا اور کچھ ہی دیر میں آفس اکھاڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔نصر پریشانی سے اس کے دفتر کے باہر ٹہلتا رہا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا کیونکہ اپنے باس کے غصے سے وہ خود بھی خائف رہا کرتا تھا۔

اندر شہزور نیم وا آنکھوں سے سامنے خلا میں غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔یہ تو طے تھا کہ زمن اور اس کی فیملی پاتال میں بھی چھپی تھی تو ڈھونڈ نکالنا اس پر لازم ہو چکا تھا۔وہ کسی صورت اب اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔وہ اپنے والدین کو خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دے گا۔محبت گئی بھاڑ میں اب تو ضد پوری کرنی تھی۔سیدھی انگلی راس نہیں آئی تھی لہٰذا اب ٹیڑھی ہی رکھنی تھی۔اس نے تھک کر اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔۔۔رہ رہ کر اس کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب وہ پھلوں، مٹھائیوں سے لدی گاڑی اور خوبصورت سے پھولوں کے بکے کو ہاتھ میں تھامے زمن کے گھر کے سامنے اترا تھا۔نصر نے ڈرائیور کی مدد سے ایک ایک کر کے تمام سامان گاڑی سے اتروا کر تھڑے پر ڈھیر لگانا شروع کر دیا تھا۔۔سفید پینٹ کوٹ اور سٹیل گرے شرٹ میں وہ بلاشبہ بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔۔۔پنجوں کے بل اچک کر ایک گہری سانس بھر کر خود کو سیدھا کھڑا کیا۔دائیں ہاتھ سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا جن کا ہیئر کٹ تازہ لگ رہا تھا۔بکے کے پھولوں کی خوشبو کو ناک کے تھوڑا قریب کر کے سونگھا تو ہونٹ خود بخود مسکرا دیے۔اسے کہاں عادت تھی ایسے طریقوں سلیقوں کی۔وہ تو رف ٹف سی شخصیت والا بندہ تھا اور اسی میں ایک الگ ہی چارم تھا اس کا لیکن آج وہ ماضی کا کوئی ایسا رویہ دہرانا نہیں چاہتا تھا جس کی وجہ سے زمن اس سے بدظن ہوتی۔اسے یاد آ رہا تھا جب اس نے ایک آڈیٹوریم میں اسے دیکھا تھا تو صرف اس کے چہرے کی خشونت اور جارحانہ پن کی وجہ سے وہ اسے دیکھتے ہی غائب ہو گئی تھی۔تب ایک طویل ترین مدت بعد اسے دیکھا تھا اور ایک پل بھی نہیں لگا تھا اسے پہچاننے میں۔حالانکہ اس کی تلاش کرتے اسے کافی وقت ہو چلا تھا۔۔آج وہ کسی بھی طرح کی غلطی دہرانا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ سابقہ ہر خطا کی تلافی اور معافی مانگنے کو بھی تیار تھا۔وہ دل ہی دل میں تمام فقرے دہرانے لگا جو اسے اندر جا کر زمن اور

اس کی والدہ سے کہنے تھے۔کیا کہہ کر اسے زمن کو ساتھ لے جانا تھا۔بلکہ نہیں وہ ابھی نصر سے کہے گا کہ فٹافٹ ایک مولوی پکڑ لائے تو وہ نکاح کر کے زمن کو ساتھ لے کر اپنے فارم ہاؤس چلا جائے گا۔وہاں اس نے چپہ چپہ جیسے تاروں سے سجا رکھا تھا۔اپنی بے تابیاں اور بے چینیاں بتائے گا۔اپنی محبت کا یقین دلائے گا اور جب زمن کا دل اس سے صاف ہو جائے گا تو وہ اسے گاؤں لے جا کر اماں اور ابا جی کو حیران کر دے گا۔۔وہ تو اپنی دانست میں انہیں مرا ہوا سمجھے بیٹھے ہیں تو جب سامنے زندہ سلامت دیکھیں گے تو ان کا کیا ردعمل ہوگا۔؟؟؟شہزور نے سر جھٹک کر خیالات کی رو سے خود کو باہر نکالا۔ابھی اسے اپنے ماں باپ کے رویوں کو نہیں سوچنا تھا کیونکہ یہ بات پکی تھی کہ وہ خوش نہیں ہوں گے لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔اسے زمن مل گئی تھی اس کے لیے یہی کافی تھا۔باقی ہر بات وقت کے ساتھ معمول پہ آ ہی جاتی۔نصر اپنے باس کا خوشی سے مزین نیم گلابی چہرہ دیکھ کر مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔اس نے کبھی بھی شہزور راؤ کو ایسے خوش یا مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔وہ دونوں ہاتھ پُشت پر باندھے اس کے حکم کے انتظار میں تھا۔۔شہزور نے اسے بیل دینے کا اشارہ کیا۔نصر فوراً حکم بجا لایا۔بیل دینے کے بعد دونوں دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔۔۔اردگرد کی چھتوں اور ادھ کھلے دروازوں سے سر نمودار ہونے لگے تھے جن کی رشک آمیز نگاہیں تھڑے پہ ڈھیر لگے رنگ برنگے اور انواع و اقسام کے پھلوں اور مٹھائیوں پہ جمی تھیں۔نصر نے دوبارہ بیل دی۔دروازہ کھلنے میں دیر ہو رہی تھی۔شہزور کے ماتھے پر پہلا بل نمودار ہوا۔نصر کو گھبراہٹ ہونے لگی۔۔۔اس نے آگے بڑھ کر دروازہ دھڑدھڑا دیا۔کسی کے قدم گھسیٹ گھسیٹ کر آنے کی آواز قریب آتی گئی۔شہزور کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔وہ پُرشوق نگاہیں دروازے پہ جمائے آنے والے کے لیے بے چین سا لگا۔دروازہ کھلا اور ایک ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں موجود مرد موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے نمودار ہوا۔۔۔

"جی۔کون ہو۔کس سے ملنا ہے۔گھنٹی کیا تمہارے باوا نے لگوائی ہے جو یوں بجائے جا رہے ہو۔۔؟"

آنے والا بیزار کن تاثرات لیے نصر کو دیکھتے ہوئے بولا جو شہزور سے چند قدم آگے کھڑا تھا۔نصر

نے گھبرا کر شہزور کو دیکھا مبادا اس آدمی کی بات پہ غصہ آئے اور اس کی پسلیاں سینکنے کا وقت یہی بن جائے۔۔۔لیکن شہزور حیرت سے اس آدمی کو جانچ رہا تھا۔

"جی ہمیں زمن بی بی سے ملنا ہے۔ان کو بلا دیجیے۔!" نصر نے شہزور کی جانب سے جواب ناپا کر خود ہی اس آدمی سے کہا۔اس آدمی نے سر سے پیر تک نصر کو اور پھر اس کے پیچھے پھولوں کا بکے تھامے شہزور کو دیکھا۔اس کے بعد نگاہیں تھڑے پہ سجے بہت سے ٹوکروں کی جانب چلی گئی تو آنکھیں مارے استعجاب کے چوپٹ کھل گئیں۔موٹے موٹے شیشوں سے پرے ڈیلے جیسے ابلنے کو تیار تھے۔

"او میاں ہو کون۔اور یہ کیا تام جھام ہے۔تین سالوں میں آج تک باجرہ بیٹی کا کوئی رشتے دار نہی دیکھا تم کدھر سے منہ اٹھا کر اس کی بچی کا نام لے رہے ہو۔شریف عورتیں تھیں یوں بلا وجہ نام مت لاؤ زبان پر۔جاؤ کام کرو اپنا جا کر اور یہ سب سامان اٹھاؤ میرے تھڑے سے۔!"

وہ آدمی چڑچڑاہٹ بھرے لہجے میں کہتا انہیں جیسے دھتکار رہا تھا۔نصر نے پلٹ کر شہزور کو دیکھا جس نے سر کو جنبش دی۔۔۔جواباً نصر نے اس آدمی کو گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا جواب دروازہ بند کر کے اندر جانے لگا تھا۔وہ بیچارہ بوکھلا کر عینک سنبھالتا سانس درست کرنے لگا۔

"زمن بی بی کہاں ہیں۔جتنا پوچھا ہے اتنا بتاؤ ورنہ تھوبڑا بگاڑ دوں گا۔!"

"میاں وہ ماں بیٹیاں تو کل کی یہاں سے جا چکی ہیں۔بنا بتائے اچانک سے۔مجھے بھی ان کی کسی جاننے والی نے فون پہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ یہ مکان چھوڑ رہی ہیں۔وہ تو اپنا ایڈوانس بھی نہی لے کر گئیں اور کتنا سامان بھی چھوڑ گئی ہیں۔اللہ جانے واپس لینے آتی ہیں کہ نہیں۔" وہ رٹو توتے کیطرح بولتا جو کچھ معلوم تھا سب بتا گیا۔

"اب مجھے تو چھوڑو۔تمہارے باپ برابر ہوں گا۔گریبان پہ ہاتھ ڈال رکھا ہے۔۔۔!"

بڑے میاں کو نصر کا یہ طور طریقہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔نصر نے پلٹ کر دوبارہ شہزر کو دیکھا اور بنا اس کے کچھ کہے خود ہی دوبارہ سوال کیا۔

"کہاں شفٹ ہوئی ہیں وہ لوگ۔ایڈریس بتاؤ۔جلدی۔!"

"اللہ قسم معلوم ہوتا تو بتا دیتا۔مجھے تو خود کچھ نہیں پتا۔میں تو خود ان کے اس طرح چھوڑ جانے پہ ناراض ہوں۔بھلا بتاؤ یہ کوئی طریقہ ہے کیا۔نا کچھ بتایا نا کہا سنا اور یوں اچانک سے نکل گئیں چوروں کیطرح۔۔۔!"

وہ آدمی اپنی صفائی میں مسلسل بولتا شہزور کے ضبط کا امتحان بنا ہوا تھا۔

"اپنا سامان لینے کب آئیں گی۔۔۔؟" نصر نے آخری سوال پوچھا

"مجھے کیا پتا۔جس طرح گئی ہیں مجھے تو نہیں لگتا کہ واپس آئیں گی۔اور اگر آئیں تو کب آئیں میں کیا جانوں۔۔۔!"

نصر نے ایک جھٹکے سے گریبان چھوڑا اور اس آدمی کا سینہ سہلاتے ہوئے کالر درست کیا۔وہ آدمی صبر سے دو قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔نصر نے شہزور کے پاس آ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا جو کسی پتھر سے مشابہ تھا۔اس قدر سختی اور تندی تھی کہ نصر ہچکچا گیا۔شہزور کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ہاتھ میں تھاما بکے چرمرانے کی آواز ابھری۔وہ آدمی شہزر کے تیور دیکھ کر خوفزدہ ہوتا اندر بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اتنے میں ہی شہزور نے بکے پوری قوت سے دور اچھال دیا۔گلی میں پھول یوں بکھر گئے جیسے اس وقت شہزور کے دل کے ارمان۔شہزور آگے بڑھا اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا اس آدمی سے پوچھنے لگا۔

"دیکھو۔اگر تمہیں کچھ بھی معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں تو مجھے بتا دو۔وہ لڑکی میری ہونے والی بیوی ہے۔سمجھے۔۔۔!"

"دیکھو صاحب۔مجھے اگر معلوم ہوتا تو کیا میں یہاں کھڑا ذلیل ہو رہا ہوتا" وہ شخص گھگھیایا۔" مجھے تو ان ماں بیٹی کا فون نمبر بھی نہی معلوم۔!"

"تو کال پہ کس سے بات کی تھی تم نے۔؟" نصر نے غراتے ہوئے سوال کیا۔

"اس بی بی نے ہی یہ مکان کرائے پہ لیا تھا مجھ سے۔اور کوئی مسلہ ہوتا تھا تو وہی کال کرتی تھی۔اس کا نمبر ہے میرے پاس اگر آپ مجھے پندرہ منٹ دو تو میں ابھی جا کر گھر سے موبائل لے آتا ہوں کیونکہ زبانی مجھے نہیں یاد۔یہاں تو میں سامان ایک کمرے میں کرنے آیا تھا بس میں ابھی گیا ابھی آیا۔!"

شہزور نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا کیونکہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ واپس نہیں آئے گا۔اور اس کے پاس اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا جو ضائع کرتا۔اس نے نصر کو اشارہ کیا اور وہ واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔نصر نے بھی اس کی تقلید کیا تو پیچھے سے اس آدمی کی آواز سنائی دی۔

”یہ سامان تو اٹھوا لو صاب۔!“ اس کا اشارہ تھڑے پہ سجے پھل اور مٹھائیوں کی جانب تھا۔نصر نے بنا پلٹے اسے جواب دیا۔

”یہ تم رکھ لو۔تمہارا جو خون خشک ہوا ہے ان کو کھا کر دوبارہ بن جائے گا۔!“

نصر کے بیٹھتے ہی گاڑی دھول اڑاتی نکل گئی۔اس آدمی نے فوراً ان ٹوکروں کو اٹھا کر گھر کے اندر کرنا شروع کیا تھا کیونکہ ارد گرد کے گھروں سے نکلی گردنیں اب ٹانگوں پہ چل کر باہر آنے لگی تھیں اور اس کا یہ مال غنیمت بانٹنے کا ارادہ بلکل نہیں تھا۔!

☆......☆......☆

مہریار کے آفس میں اس وقت الجھن آمیز خاموشی تھی۔کھڑکیوں کے بلائینڈز ہٹے ہوئے تھے اور سہہ پہر کی تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔اپنی کرسی پہ دھیرے دھیرے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومتا مہریار خشمگیں نگاہوں سے رباب خان کو دیکھ رہا تھا۔جبکہ رباب خان بے حد مطمئن سی کرسی پہ ڈھیلے انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی مہریار کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ان کے انداز میں بے حد فرصت تھی لیکن مہریار جھولنے کے باوجود صاف بے چین محسوس ہو رہا تھا۔۔۔

”مذاق کر رہی ہیں۔۔۔ہیں نا؟“ مہریار نے ہونٹوں پہ انگوٹھا جما رکھا تھا جبکہ کہنی میز پر تھی۔وہ واضح طور پر مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔۔۔

”تمہارا میرا مذاق ہے کیا مہریار بیٹے۔؟“ رباب خان نے الٹا سوال کیا۔۔۔

”جو بات آپ نے کی ہے ایسی بات یا تو مذاق میں کی جاتی ہے یا انتہائی مذاق میں۔!“ مہریار نے ابرو اچکا کر کہا تو رباب خان ہنس دیں۔

”میں ابھی صرف سنجیدہ ہوں یا پھر انتہائی سنجیدہ۔۔۔تم بس میری بات پر غور کرو اس سے پہلے کہ

مجھے تمہارے سر کی سفارش ڈالنی پڑے۔!"

"اب یہ سر کہاں سے آ گئے بیچ میں۔۔۔ دیکھیں۔" وہ سیدھا ہو کر دونوں بازو میز پر جماتے ہوئے گویا ہوا۔

"میرے حالات و واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ میں ایسا کچھ بھی افورڈ نہیں کر سکتا میم۔ آپ نے جو جتنا کہا میں نے مانا بھی اور کیا بھی لیکن یہ سب میرے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے۔ میں بری طرح پھنسوں گا۔ بچوں کا کھیل تو نہیں ہے نا۔!"

وہ بے حد سنجیدہ تھا اور کچھ روٹھا سا بھی۔ رباب خان بالکل اسی کے انداز میں بیٹھتے ہوئے جواب کے لیے تیار تھیں۔

"اگر تم جیسا عقلمند مرد اس سب کو بچوں کا کھیل سمجھ لے تو خان صاحب کو کہوں گی ایک سرجری تمہاری بھی کر دیں۔!"

مہریار بے اختیار بولا۔" لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ کیا آپ بھی۔۔۔ کیسی بات کر رہی ہیں۔۔۔؟"

"اسی لیے کہا نا مجھے سفارش ڈالنے پر مجبور مت کرو مہریار۔ معاملے کی سنگینی کو سمجھو۔ ایک بار کچھ نہیں ہوا تو دوسری بار کی گارنٹی ہے کہ کچھ نا ہو گا۔ اور تم کوئی غیر تو نہیں ہو۔ اگر تم پر بھروسہ نا کروں تو کس پر کروں۔ یہ بہت بڑا ٹاسک ہے مہریار۔ بہت سے مسائل ہیں ارد گرد۔۔۔ میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتی لیکن درخواست کر سکتی ہوں کہ ایک بار سوچنا۔ ہر کوئی اپنی اصل تک پہنچ جائے گا۔ اور جب یہ معاملہ سنور جائے تو تمہیں اختیار ہو گا کہ میوچول انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ معاملہ نبٹا لینا۔ لیکن ابھی محض سیفٹی پرپز کے لیے میرا ساتھ دو مہریار۔۔۔ ورنہ اگر ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔!"

رباب خان اپنی بات کہہ کر کرسی سے ٹیک لگا کر پیچھے ہو گئیں۔ وہ بغور مہریار کے تاثرات کا جائزہ لینے لگیں جو اتار چڑھاؤ کا شکار تھے۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے جیسے خود کو کسی بات کے لیے بہ زور آمادہ کر رہا تھا۔ رباب خان اٹھ کھڑی ہوئیں اور ٹیبل سے اپنا بیگ اٹھا کر مایوس سی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔۔۔

"میم۔۔۔!"

مہریار کی آواز نے ان کے قدم روک لیے تھے لیکن وہ مڑی نہیں تھیں۔ ہونٹوں پہ نامحسوس سی مسکراہٹ رینگ گئی تھی جیسے انہیں پتا ہو کہ وہ کیا کہنے لگا ہے۔۔۔

"مجھے رات تک کا وقت دیں۔ میں سوچ کر بتاتا ہوں۔!" وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ رباب خان نے پلٹ کر غراہٹ آمیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"مہریار یہ رات تک کی مہلتیں زندگیاں اجاڑ دیا کرتی ہیں کیا ابھی تک تمہیں تجربہ نہی ہوا۔۔ کیا رات تک میں کوئی کرشمہ ہو جائے گا جو سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔ مرد بنو مہریار اور مردوں کی طرح اون کرو۔ مہلتیں بزدل مانگا کرتے ہیں جو کبھی پلٹ کے دیکھتے بھی نہیں۔۔۔!"

"وہ بزدل نہیں ہیں میم۔ بس سب کچھ اتنا پیچیدہ ہو گیا کہ ہر سرا ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔!"

مہریار کو برا لگا تھا تبھی فوراً دفاعی لہجے میں جواب دیا۔ رباب خان استہزائیہ مسکرائیں اور فوراً چہرے کو سپاٹ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں یا نا۔۔ ایک جواب۔ دوٹوک۔!"

مہریار نے بے بسی سے انہیں دیکھا جہاں کوئی نرمی نہی تھی اور گہری سانس چھوڑتا بولا۔

"ڈن۔ جیسا آپ کہیں لیکن اگر انجام اچھا نا ہوا تو ذمہ داری آپ کی ہوگی میری نہی۔۔۔!"

"انسان اپنی نیتوں کا پھل پاتا ہے مہر بیٹا۔۔!"

اتنا کہہ کر وہ مطمئن سی آفس سے باہر چلی گئیں اور مہریار جسم کو ڈھیلا چھوڑتا کرسی پر گرا۔ دماغ میں جیسے کھچڑی پک رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر آنکھیں موند لیں۔!

☆......☆......☆

وہ زوہا کے بیڈ کے پاس اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے وہ اس کے ہاتھ کی ہشت کو چوم لیتی اور پھر محبت سے اس کا سر سہلانے لگتی۔ زوہا ہوش میں تھی اور ہلکی پھلکی بات چیت کر رہی تھی۔۔۔ وہ پہلے کی نسبت فریش محسوس ہوتی تھی۔ ہاسپٹل میں ہونے نے اسے پریشان نہیں کر رکھا تھا بلکہ اس کی توقع کے برخلاف وہ بے حد امید افزا باتیں کر رہی تھی۔۔۔ ہاجرہ اس سے ملنے کے بعد کچھ

دیر پہلے ہی کمرے سے باہر گئیں تھیں۔

"میری گڑیا بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہونے والی ہے۔۔۔ایک بار پھر سے ہمارے گھر کی رونقیں لوٹ آئیں گی۔ہم دونوں جی بھر کر چھت پر واک کیا کریں گے۔۔۔برآمدے میں پہلے کی طرح پینگ لگوالیں گے اور۔۔۔"

"اور اس بار پہلی باری آپ کی۔۔۔!"

زوہا نے اس کی بات اچک کر جملہ مکمل کیا تو زمن بے ساختہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔زوہا جب تندرست تھی تو ان کے برآمدے میں پینگ لگی ہوئی تھی جو زیادہ اونچی نہیں جاتی تھی۔زوہا نے کبھی بھی زمن کو پہلی باری لینے نہیں دی تھی۔چھوٹی تھی تو زمن بھی اس کو بچوں کی طرح جھلاتی تھی۔پھر زوہا بستر سے لگ گئی اور زمن نے پینگ اتار دی۔اس کا جھولنے کا کبھی دوبارہ دل ہی نا کیا۔اب جب زوہا عنقریب ٹھیک ہونے والی تھی تو ایک بار پھر دونوں بہنیں پرانی یادوں کو تازہ کرنا چاہتی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے آپی۔ڈاکٹر مہریار اتنے گریس فل ہیں وہ اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ بندہ مرتا مرتا جی اٹھے۔ان کی تو باتوں میں بھی شفا ہے۔۔۔!"

زمن کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔کچھ وقت پہلے کی ہوئی تکرار یاد آئی اور بارہا اس کے ہاتھوں ہوئی عزت افزائی بھی تو بھنویں اور ڈیلے اچکا کر بمشکل بات کو ہضم کیا۔۔۔

"اچھی بات ہے۔ڈاکٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔مریض کی آدھی بیماری تو پیاری پیاری باتیں ختم کر دیتی ہیں۔!"

"آپی وہ کہتے ہیں میں جب چلنے لگوں گی تو وہ مجھے ایک بہت بڑا سرپرائز دیں گے۔۔۔یہ بات انہوں نے کتنی ہی نار میرے کان میں کہی۔۔۔!"

"ایسا کیا۔" زمن کو اچنبھا ہوا۔" مثلاً تمہارے نام پلاٹ لگانا ہے انہوں نے۔۔۔ایویں شوخیاں۔!" زمن نروٹھے لہجے میں بولی۔

"ارے نہی آپی۔یہ تو بعد میں ہی پتا چلے گا نا۔لیکن وہ جھوٹ نہی بولتے۔۔۔اور کہتے ہیں کہ اس

کے لیے مجھے مکمل تعاون کرنا ہوگا خود کو کمپوز رکھنا ہوگا۔اور ان کی کہی ہر بات ماننی ہوگی۔وہ اتنی بار سرپرائز کا کہہ چکے ہیں تو یقیناً وہ دیں گے۔میں بے حد ایکسائیٹڈ ہوں اس سرپرائز کے لیے۔!"

زمن مسکرادی۔وہ سمجھ گئی کہ ڈاکٹر مہریار نے اس کی بہن کی نفسیات کو سمجھ لیا ہے اور اسی کے مطابق اس کے ساتھ ڈیل کر رہے تھے۔

"وہ بلکل ٹھیک کہتے ہیں،تم ویسے ہی کرو جیسے وہ کہتے ہیں تا کہ میں اور میری گڑیا جلد از جلد مستیاں کرسکیں۔تمہیں پتا ہے میں اپنی چھوٹی بہن کو کتنا مس کرتی ہوں۔جب سے تم بیمار ہوئی ہو میں نے کوئی دوست نہی بنائی کیونکہ میری سب سے قریبی دوست تو تم ہی تھی نا۔اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو جو اتنی ساری باتیں جمع ہو رکھی ہیں وہ سب کی سب کریں گے۔۔۔!"

زمن دانستہ اس کا دھیان اپنی اور کھینچ رہی تھی۔وہ حساس لیکن بھولے ذہن کی لڑکی تھی۔۔اس کی زندگی کی یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔سرپرائزز،مستیاں اور خوب ہنسنا۔زمن ان سب چیزوں کو مس کرتی تھی۔

"آپی۔۔۔" زوہا نے اچانک کچھ یاد آنے پر اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی پیشانی سے بال ہٹانے لگی۔

"آپی۔۔۔ہم نے گھر چھوڑ دیا ہے نا۔آپی کیا اب وہ ادھر بھی پہنچ چکے ہیں نا ہمیں مارنے کے لیے۔۔۔ہے نا۔تبھی امی نے صبح صبح اتنی جلدی میں سب سمیٹا تھا نا۔!"

وہ سوالیہ نظروں سے زمن کو دیکھ رہی تھی اور زمن لاجواب سی اس کی آنکھوں میں۔۔۔زوہا کی ذہنی حالت ایسی نہی تھی کہ اسے سٹریس دیا جاتا۔دو دن بعد اس کی سرجری تھی اور اس کے لیے لازم تھا کہ پرسکون رہے۔زمن نے ایک پل کو سوچا اور پھر رسان سے جواب دیا۔

"اب ہمیں کوئی ڈھونڈ بھی لے تو پرواہ نہی زوہا۔۔۔ہم اب سیف ہیں۔ہمیں اب کوئی نہی مار سکتا۔!"

"اور اگر انہوں نے یہاں بھی ہمیں ڈھونڈ لیا آپی۔ہم کتنا بھاگیں گے۔کب تک بھاگیں گے۔اب تو اتنا بھاگ لیا ہے کہ دل کرتا ہے کہ سب ایک جھٹکے میں ختم ہو جائے یا ہم یا پھر یہ تماشا۔!"

زوہا کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔زمن بھانپ گئی کہ وہ سٹریس لینے کے قریب ہے اس لیے اس

نے فوراً سے حکمت عملی پہ عمل کیا۔

"یہ جو تمہارے ڈاکٹر صاحب ہیں نا۔ وہ ہمارے ساتھ کچھ برا ہونے نہیں دیں گے زوہا۔ تمہیں ان پر یقین ہے نا۔؟"

اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات اس نے کیوں کہی ہے بس اس وقت زوہا کو پرسکون کرنے کے لیے مہریار کے نام سے بڑا ٹانک سجھائی نہیں دیا۔

"یہ ڈاکٹر مہریار ہیں نا جو ہمیں بچا رہے ہیں نا آپی۔ ہے نا۔ مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ جس طرح وہ ٹریٹ کر رہے ہیں ضرور وہی ہمیں اس مشکل سے بھی نکال لیں گے۔ امی کہتی ہیں کہ یہ بہت اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور مجھے بھی ان کی موجودگی میں حفاظت کا احساس رہتا ہے۔۔۔ آپ کو ایسا نہیں لگتا کیا آپی۔؟"

اس نے زمن کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ سے اسے دبایا تو وہ چونکی۔

"ہممممم۔۔۔ اممم۔۔۔ ہاں لگتا ہے۔ بالکل لگتا ہے۔!" ذہن میں پھر سے مہریار کا اپنے ساتھ برتاؤ گھوما۔۔۔ لیکن زوہا سے کیا کہتی بھلا۔

"اچھا اب تم تھوڑا ریسٹ کرو۔ رات تک ادھر ہی ہوں میں۔ اٹھو گی تو باتیں کرنا۔!"

زوہا نے بنا تکرار کے آنکھیں موندلیں تھیں۔ زمن نرم انگلیوں سے اس کا سر سہلاتی فکرمندسی آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا ہو جو وہ یہاں بھی پہنچ جائے۔ کہاں جائیں گے وہ لوگ۔ کس سے مدد مانگیں گے۔ آنٹی رباب سالوں سے ان کے لیے حفاظتی بند بنی ہوئی تھیں لیکن وہ ہر جگہ پہنچا تھا۔ سب کر کے دیکھ لیا۔ نام بدل لیے، ٹھکانے بدل لیے۔ پہچان بدل لی لیکن نا بدل سکا تو ان ظالموں کا کٹھور دل۔ وہ سب بھول سکتی تھی لیکن اپنے بچپن سے جڑی خوفناک یادوں کو یاداشت سے نوچ کر نکال نہیں پھینک سکتی تھی۔ اسے شدت سے باپ کی محرومی کا احساس ستاتا تھا۔ جب وہ اوروں کے رحم و کرم پہ جی رہی تھیں تو ایک باپ کا ہونا کیا معنی رکھتا تھا یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ اس نے سوچوں کی طنابیں واپس کھینچیں اور اپنے تھکے ہوئے دماغ سے جوڑ توڑ کرنے لگی کہ اگر یہاں بھی وہ پہنچ گیا تو اگلی منزل کون سی ہو سکتی ہے۔۔۔؟؟؟؟!

☆......☆......☆

چہار باغ حویلی کا پچھلا صحن سنسان پڑا تھا۔اتنی بڑی حویلی تھی، ملازمین زیادہ تر سامنے والے حصوں میں رہتے ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ مالکوں کو یہاں پچھلے حصے میں آنا پسند نہیں۔۔۔یہاں کوٹھری تھی جس تک صرف مالکوں کی رسائی تھی۔دن میں دو وقت کا باسی پرانا یا جیسا بھی جینے لائق کھانا ایک چھوٹے شاپر میں ڈال کر کوٹھری کی سلاخوں والی اکلوتی کھڑکی سے اندر پھینک دیا جاتا تھا۔پھینکنے والے ملازم یا ملازمہ کو کبھی جرات نہیں ہوئی تھی کہ آگے ہو کر ایک نظر اندر بھی ڈال لیں کہ آخر کون قسمت کا مارا یہاں سالہا سال سے بند ہے۔۔۔ایک گہری خاموشی چھائی رہتی تھی کوٹھری میں۔۔۔کبھی کبھار تو شک پڑتا تھا جیسے اندر کوئی ذی نفس موجود ہی نہیں لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ خاموشی کیسے طوفان سہہ چکی ہے۔۔۔ اسی صحن کے گرد چوڑی چوڑی طویل کیاریوں میں خوش رنگ پھولوں کی جگہ ٹنڈ منڈ جھاڑیاں اور خودرو پودوں کی بھرمار تھی۔صاف صفائی کا دھیان نا رکھنے کی وجہ سے صحن میں بھی کئی جگہوں سے گھاس نے سر اٹھالیا تھا۔۔۔مجموعی طور پر دل بوجھل کر دینے والا ماحول طاری رہتا تھا۔ایک لمبے اونچے درخت پر گلہریاں بھاگتی پھر رہی تھیں۔کوے نے کسی شاخ سے اڑان بھری اور دیوار پر آبیٹھا لیکن یہاں مہمان نہیں آیا کرتے تھے صرف سنہری بیگم دبے پیروں کوٹھری کی "زیارت" کرنے آتی تھی۔اس کا انداز ایسا ہی ہوا کرتا تھا جیسے اونچی سانس بھی لے گی تو بے ادبی ہوگی۔وہ ہمیشہ بنا جوتے کے ہوتی تھی۔ہاتھ میں تسبیح لیے مسلسل ہلتے ہونٹوں کی پھونک سے اپنے گرد حصار پر حصار بناتی سنہری کو انجان شخص دیکھ لیتا تو سمجھتا نا جانے کیسی فلک بوس عقیدت ہے جس کی بنا پر وہ اس طرح سے چلتی آتی تھی لیکن یہ اس کا وہ خوف تھا جو اسے کوٹھری کے اندر بند انسان سے تھا۔ہر طرح سے لاچار سالوں سے قفس میں قید وہ انسان جو اس کا بظاہر کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے اندر کے ڈر سے چھٹکارہ نہیں پا سکی تھی۔۔۔یہی ڈر اسے پیروں میں چپل اڑسنے نہیں دیتا تھا مبادا چاپ اس کوٹھری کے اندر نا چلی جائے۔یہی ڈر اسے اونچی سانس بھی نکالنے نا دیتا تھا مبادا کوٹھری اس کا سانس ہی نا پی جائے۔۔۔اس وقت بھی وہ بنا چپل کے ہاتھ میں لمبی سی تسبیح لیے کپکپاتے دل پہ قابو پاتی سہج سہج کوٹھری سے قریب آرہی تھی۔اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ یہاں آتی ہی کیوں ہے۔۔۔؟کس لیے۔؟ کتنی مزید لاچاری اور کیسی بے بسی دیکھنا

چاہتی تھی وہ جو ہر بار اس امید پر یہاں آتی کہ اندر موجود وقت کے ہاتھوں رل چکی ہستی اس کے آگے گھگھیا کے رحم کی بھیک مانگے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار بس ایک بار اندر سے صدا آئے کہ اسے یہاں سے رہائی دے دی جائے، اس خواہش کا پورا ہونا اس کی حسرت تھی۔ وہ چند قدم مزید قریب ہوئی۔ کھڑکی سے اندر فاصلے سے ہی جھانکنے کی کوشش کی لیکن باہر کی تیز روشنی کی وجہ سے اندر کا منظر مزید سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تھوڑی اور کوشش کی تو تعفن کی لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ سالوں سے بند انسان کی ہر حاجت اسی کوٹھری میں بند تھی۔۔۔ سنہری بیگم بے ساختہ اپنی چادر کا پلو ناک پہ رکھتے دوبارہ تھوڑا سا آگے ہوئی اور تبھی اچانک ایک ہاتھ ان سلاخوں سے باہر آیا اور اس کا گلا دبوچ لیا۔۔۔ سنہری بیگم کی چیخ خوف کے مارے حلق میں ہی گھٹ گئی۔ یوں لگا جسم سے ساری جان کھینچ لی گئی ہو۔۔۔ آنکھیں ابل کر حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ وہ جھٹپٹائی اور خود کو چھڑانے کی سعی کی۔ یکدم اس ہاتھ نے کچھ دیر بعد اس کی گردن کو پرے دھکیل دیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہوتی رکوع میں جاتی اپنی گردن سہلانے لگی۔ کھانسی دبانے کی کوشش میں اس کی چھوٹی چھوٹی بنا پلکوں والی آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا تھا۔۔۔ چاہتی تو ایک پکار پر سارے ملازمین چلے آتے لیکن وہ ایسا کیسے چاہ سکتی تھی۔ کیا بتاتی کہ سنہری کی گردن اس سبز نسوں والے سیاہ ہاتھ نے دبوچ لی تھی جس کو کبھی سلاخوں سے باہر نکلا دیکھ کر ملازمہ غش کھا کے گر پڑی تھی۔۔۔ دوبارہ اس نے اس کوٹھری میں کھانا پھینکنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سنہری بیگم تھی اور یہ ہاتھ جس وجود سے پیوستہ تھا وہ اسی کے کارن یہاں بند تھا۔۔۔ وہ اس سے ڈر جاتی یا دب جاتی تو سنہری کا طنطنہ کس طرف منہ کرتا۔۔۔!

''کیا ہوا۔۔۔ سانس بند ہوا تیرا بدبخت۔۔۔ بس اتنی سی دیر میں۔۔؟'''' اندر سے آتی سرسراتی آواز نے اسے سیدھا کھڑا ہونے پہ مجبور کیا۔ وہ شہ رگ پہ ہاتھ رکھے سلاخوں کے پار سے دکھائی دیتی دو شرربار نگاہوں کو دیکھ رہی تھی جن میں استہزاء ناچ رہا تھا۔۔۔ وہ آنکھیں وقت کی دھول میں اٹ کر سیاہ ہو چکے چہرے پہ اندر کو دھنس چکی تھیں لیکن ان کی چمک اور دیدہ دلیری آج بھی ویسی ہی تھی جیسی ماضی میں ہوا کرتی تھی۔۔۔ وہ آواز قہقہہ لگاتی اس کا مذاق اڑانے لگی۔ سنہری کو اس کے ہنسنے کی آواز نے وحشت زدہ کر دیا۔

"اپنا منہ بند رکھ۔۔۔کون سی مٹی ہے تیری جس کے کس بل ہی نہیں نکلتے۔حالت دیکھ اپنی اور آ کر دیکھ۔۔۔کون سے حال آ گئے تجھ پر لیکن تیری اینٹھن نا گئی۔ناپاک کم ذات۔!" سنہری کا طیش کم نہی ہو رہا تھا بلکہ دل کر رہا تھا آج اس کوٹھری کو آگ ہی لگا دے۔بہت لمبا چل چکا تھا یہ قصہ۔۔۔اب ختم ہی کر دے۔

"میری مٹی کا خمیر تجھے لگا ہوتا نا انسانیت چھو جاتی تجھے۔یہ جو تیرے اندر کی حیوانیت ہے نا وہ اس لیے ہے کہ تجھے شیطانی مٹی لگی ہوئی ہے۔دیکھ کیسے کیسے اجاڑا ہے تیری شیطانیت نے سب کو۔اب تیرا وقت آنے والا ہے۔۔۔انتظار کر۔۔۔!"

اور سنہری کا دل کیا کہ تیزاب لے کر اس انسان کا منہ جلا دے۔جس نے اسے پکو کے دے دے کر مار ڈالنے کی قسم کھا رکھی تھی۔۔۔وہ مٹھیاں بھینچتی سلاخوں سے قریب ہوئی اور غرائی۔

"بڑا غرور ہے خود کی نیکی اور پارسائی پر۔۔۔تیری یہ نیکی تیرے اپنوں کو نہی بچا پائی۔سب کو کھیڑ (بکھیر) کر رکھ دیا ہے میں نے۔تو جوڑنے لگے تو تجھے شروع کرنے کے لیے سرا ہی نہیں ملے گا۔۔۔!"

عین اسی وقت اندر سے ایک گندگی میں لتھڑا پرانا شاپر گولا بنا آیا اور سنہری بیگم کے منہ پہ آ لگا۔۔۔ایک پل کو تو جیسے دماغ بھک سے اڑا تھا۔بے یقینی سے اپنے پیروں میں گرے اس غلیظ شاپر کو دیکھا اور اس کی وجہ سے اپنے چہرے اور کپڑوں پہ لگی گندگی کو دیکھا۔۔۔کراہیت، طیش، بے بسی اور سب فنا کر دینے کی چاہت ایک ساتھ سنہری پہ حملہ آور ہوئیں۔۔۔اس نے منہ اونچا کر کے ان سلاخوں پہ تھوکا اور پھنکاری۔

"تیرا انجام بہت بھیانک ہے۔اور اب بس بہت ہوئی۔اب تیرے ہونے کی ہی ضرورت نہی۔کتا پاگل ہو جائے تو گولی مار دینی چاہیے،میں نے بلاوجہ تجھے پالے رکھا۔۔۔اب اور نہیں۔تجھے مار کر تیری لاش کو گٹر کے حوالے کروں گی۔دیکھنا تو۔۔۔!"

وہ پلٹی تو اس کے کانوں میں کوٹھری سے نکلی آواز پڑی۔۔۔

"یہ سوچ کر نکالنا مجھے یہاں سے۔۔۔جس دن یہاں میرا آخری دن ہوا اسی دن سے یہ کوٹھری تیرے نام ہو جائے گی۔یہ کوٹھری دن گنے گی تیرے آنے کے۔۔۔یہ کوٹھری سانپ اور بچھو اکٹھے

کرے گی تیری قبر کے لیے۔۔۔سوچ کے کھولنا اس کوٹھری کو۔۔۔سوچ کے۔۔۔تیرا ماضی تیرے ہمزاد کیطرح تیرے ساتھ کھڑا ہے۔تُو اور وہ ایک ساتھ یہیں دفن ہو گے۔یہیں فنا ہو گے۔۔۔!"

سنہری نے پلٹ کے نہی دیکھا بلکہ انتہائی تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔۔۔اس کے ننگے پیروں سے ماضی کی دھول لپٹتی اس کے ہمراہ ہو لی تھی۔!

☆......☆......☆

ہمیں لوگوں کے متعلق اتنا ہی جاننا چاہیے جتنا وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے متعلق جانیں۔

کیونکہ تجسس اگر علمی ہو تو شعور کے در کھولتا ہے جبکہ شخصی ہو تو شر کے۔۔۔

اپنے وسیع و عریض اور اونچی چھت والے ہوادار کمرے میں نواڑی پلنگ پہ لیٹا حسنات راؤ سنہری کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔وہ لڑکی اسے پہلی نگاہ میں ہی اچھی نہیں لگی تھی۔۔۔کچھ عجیب نہیں بلکہ بے حد عجیب سے تاثرات تھے اس کے چہرے پر اور پھر جس دیدہ دلیری سے وہ پلٹ کر اسی سے سوال کرنے لگی تھی وہ اسے کہیں بہت چبھا تھا۔اسے کبھی بھی تجسس کرنا اور لوگوں کی باتیں سننا پسند نہیں تھا۔ان کی حویلی کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی تھا۔سکینہ بیگم ایک اچھی ماں تھیں جو اولاد کی شخصیت پروان چڑھاتے ہوئے اخلاقیات پہ زور دیتی ہیں۔انہوں نے نا کبھی خود تجسس کیا تھا نا اپنی اولاد کو چھپ کر باتیں سننے کی عادت ڈالی تھی۔ایسا ہی ماحول پھپھو قدسیہ اور آفتاب چچا کے گھر کا تھا۔حمیدہ چچی کی عادات گو کہ الگ تھلگ تھیں لیکن وہ بھی چوری چھپے کوئی کاروائی نہی کرتی تھیں۔یہ اس حویلی کی پہلی مکین تھی جسے اس نے یوں ستون کی آڑ میں چھپ کے اپنے ہی گھر والوں کی باتیں سنتے دیکھا تھا۔بھلا کسی چار دن کے مہمان میں کہاں سے ایسی جرات آ گئی۔۔۔اسے برا تو بے حد لگا تھا لیکن سنہری اسی وقت وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔وہ اماں ابا سے ملنے لگ گیا تھا۔۔۔چھے ماہ بعد واپس آیا تھا۔سب بے حد اداس تھے اس سے۔ابا کا وہ لاڈلا تھا اس لیے کتنی ہی دیر بغلگیر رہے۔وہ آنکھیں میچے ماں باپ کے سینے سے لگا ان کی خوشبو اپنے اندر اتارتا رہا۔حیات نے اپنے سے چھوٹے لیکن خود سے اونچے بھائی کو سینے سے لگا کر خوب بھینچا تھا۔دونوں بھائی پڑھائیوں کے سلسلے میں شہروں میں بسے تھے۔ایک چھٹی پہ گھر آتا تو دوسرے

شہر ہی ہوتا تھا دوسرا آتا تو پہلا حویلی میں نہیں ہوتا تھا۔حیات تو سادا ایم اے اکنامکس کی ڈگری کے لیے محنت کر رہا تھا جبکہ حنات بہاولپور میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں تھا۔۔۔بلا کا پڑھاکو اور سنجیدہ مزاج تھا لیکن بھائی سے خوب بنتی تھی۔۔۔دونوں کا ہنسی مذاق ایک دوسرے کو ہی سمجھ آتا تھا اور اس پہ بس وہ خود ہی ہنس سکتے تھے۔۔۔قدسیہ پھپھو کے بیٹوں سے بھی اچھی دوستی تھی لیکن وہ حیات سے قدرتی قریب تھا۔کچھ دیر اماں ابا کے پاس ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ تازہ دم ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ساتھ ہی آنکھ سے اشارے سے حیات کو بھی چلنے کا کہا۔دونوں بھائی راہداری سے ہوتے اندر کمروں کی جانب بڑھ گئے۔

"بھائی۔۔۔یہ پیلیا کی مریضہ کون گھوم رہی ہے حویلی میں۔۔۔!"

بیگ ایک کندھے سے دوسرے پہ ڈالتے اس نے وہیں رک کر حیات سے پوچھا تو وہ حیران سا اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"پیلیا کی مریضہ۔کس کو دیکھ آئے ہو۔اگر آفتاب چاچو کی بیٹیوں میں سے کسی کو کہا ہے تو اپنے دانت بچانا مجھ سے۔۔۔اور رانی کو بولا ہے تو وہ تو ہر وقت لال اتنی رہتی ہے کہ ٹماٹر لگتی ہے۔!"

"اوئے ہوئے۔۔۔"حنات کی تان خالی راہداری میں دور تک گونجی۔"آفتاب چاچو کی کون سی بیٹی کی وجہ سے میرے دانت ٹوٹیں گے بھائی۔پہلے یہ بتائیں نا اس کے بعد رانی کو میں بتا دوں گا کہ آپ نے اسے ٹماٹر کہا ہے تو وہ آپ کے دانتوں کی خبر لے لے گی۔!"

"تم زیادہ بنو مت۔۔۔اماں نے اسی لیے بلایا تھا تمہیں کہ ابا کو مناؤ آ کر کشور کے لیے۔کا کے نا بنو اب۔۔۔!"حیات نے اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگاتے آہستہ آواز میں گھر کا۔

"ویسے یہ اچانک سے آپ کو کیا سوجھی۔پہلے تو آپ کے گوڈے سوکھے تھے۔۔۔!"

"سوکھے تھے۔؟کیا مطلب۔!"حیات نے حیرت سے دہرایا۔

"مطلب ابھی تازے ہی عشق میں ڈوبے لگ رہے ہیں۔!"

"افففف۔حنات تم اور تمہاری بے سروپا باتیں۔ابھی جاؤ شام میں چھت پہ چل کر تفصیل بتاتا

ہوں۔۔۔نکواب۔ابھی ابا کے ساتھ ڈیرے پہ جارہا ہوں۔آج کل ان کا کوئی حکم نہی ٹالتا تا کہ۔۔۔"

"تا کہ بلا ٹل جائے۔"حسنات نے جملہ مکمل کر کے قہقہہ لگایا اور حیات کے مکے سے بچتا اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا گیا۔نہا دھو کے وہ کچھ دیر جھپکی لینا چاہتا تھا لیکن نظروں کے سامنے بار بار سنہری کا تیز طرار چہرہ آ جاتا۔۔اس کے دل کو کھٹک سی لگ گئی تھی۔وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی کون تھی اور اتنے مزے سے یوں دندناتی کیوں پھر رہی تھی۔کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اسی بارے سوچتا نیند میں اتر گیا تھا۔۔!

☆......☆......☆

"ماسی ایک بات تو بتا۔۔!"سنہری حمیدہ کے آگے بال کھولے فرش پر بیٹھی تھی۔حمیدہ ہلکے ہاتھوں سے اس کے گھنے بھرے بالوں میں تیل کا مساج کر رہی تھی۔سنہری نے مندی آنکھوں سے سوال کیا۔حمیدہ نے تیل کی کٹوری سے تھوڑا سا مزید تیل اس کے سر پر انڈیلا اور بولی۔

"ہاں پوچھ۔پہلے کبھی اجازت لے کر پوچھا ہے کیا۔بلکہ تجھے کبھی کسی سے اجازت لینی آئی ہے کیا۔!"

"یہ گلہ کر رہی ہو ماسی یا تعریف کر رہی ہو۔۔؟؟؟"سنہری نے ایک آنکھ کھولتے ہوئے پوچھا۔

خیر ابھی اس کو چھوڑ۔یہ بتا کہ یہ جو تیری جٹھانی کی آل اولاد ہے وہ ساری اوقات سے باہر کیوں ہے؟"

"ہیں۔ہیں۔ہیں۔۔۔"حمیدہ اس کے انداز پر ششدر سی بولیں۔"یہ کیا زبان ہے سنہری۔سیدھی طرح تائی جی کہہ۔جو قاسم کہتا ہے یا پھر ماسی بول۔کسی نے سن لیا تو تیری ماں کی تربیت پر حرف آئے گا جھلیے۔!"

"نا سنہری کو کسی کی پرواہ نہی۔اور میری بات کوئی کیوں سنے گا اس کام کے لیے میں آپے بہتیری ہوں۔اچھا بتا نا۔یہ تیری جٹھانی کے منڈے خود کو سمجھتے کیا ہیں۔؟"

"چار جماعتیں پڑھ لی ہیں بس اور کیا۔نمرہ نے بھی چودہ کر لیں۔حیات کی بھی سولھویں پوری ہو جانی ہے اب اور وہ حسنات،تو وہ اس حویلی کا پہلا ڈاکٹر ہو گا۔آکڑ تو آنی ہی ہے نا۔!"

"یہ اپنا قاسم کیوں نہیں پڑھا ماسی۔!"سنہری بال چھڑواتی حمیدہ کی طرف منہ پھیر کر بولی۔

"لے دس۔وہ کیوں پڑھے بھلا۔اس کا دماغ پولا ہے کیا۔اتنی زمین جائیداد اور پھر ان کے

بکھیڑے، اسے بھلا لوڑ ہی کیا ہے ڈگریوں کی۔ ایویں ہی تو نہیں اپنے تائے کا لاڈلا۔ جیسا وہ اپنے پتروں کو دیکھنا چاہتے تھے ویسا قاسم نکلا ہے ماشاء اللہ۔ اور پڑھائیاں کروا کر میں اپنے چن سے پتر کا منہ پچھلے پاسے لگا دیتی۔۔۔ پوری حویلی کے منڈوں میں سب سے گھبرو ہے قاسم۔ قدسیہ کے لڑکے لے لے یا سکینہ بھرجائی کے، قاسم جیسا ایک بھی نہی۔۔۔!"

اور سنہری کی نگاہوں کے سامنے حیات اور حسنات کے پرکشش اور وجیہہ چہرے آگئے جن کو ان کے رکھ رکھاؤ نے مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ قدسیہ پھپھو کے بیٹے بھی پیارے تھے لیکن ان کے قد درمیانے تھے جبکہ حیات اور حسنات کے قد چھے فٹ سے اوپر نکلتے محسوس ہوتے تھے، اوپر سے بات کرنے کا شائستہ انداز۔۔۔ جبکہ قاسم کا ہر سوال اینٹ اور ہر جواب پتھر ہوا کرتا تھا۔ حسنات سے گو کہ اس کی ملاقات ناخوشگوار تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس سے مرعوب ہو کر آئی تھی۔۔۔

"یہ جو ہے۔۔۔ کیا نام ہے بھلا ماسی اس کا۔۔۔" سنہری نے بالوں کو سمیٹتے ہوئے جوڑے کی شکل دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "یہی جو تیری دیورانی کی وڈی کڑی ہے۔۔۔!"

حالانکہ اسے نام معلوم تھا اور ذہن نشین بھی لیکن محض تجاہل سے کام لے کر دل کو تسکین دے رہی تھی۔

"کشور۔۔۔ کشور نام ہے اس کا۔ ہونہہ۔۔!" حمیدہ چاچی کا رقیہ کے ذکر سے منہ کا ذائقہ ایسے ہی کڑوا ہو جاتا تھا۔

"ہاں ہاں وہی نحوست سی رہتی ہے جس کے منہ پر۔۔۔" سنہری کو اچھا لگا تھا حمیدہ کا اس کے لیے اس لہجے میں بولنا۔ "اس کی واقعی بات پکی ہے حیات کے ساتھ۔۔۔؟" لہجے کو سرسری سا بنالیا تھا لیکن دل میں پکڑ دھکڑ تھی۔

"آہو ہو چکی ہے۔۔۔ سب کے بیچ بیٹھ کر مانگی ہے سکینہ بھرجائی نے۔۔۔ نا تھوڑی کرنی تھی اس کمی کمین آفتاب نے۔ ہونہہ۔ کڑی اتنے اونچے گھر چلی جائے گی اتنا گھبرو منڈا مل جانا ہے اور بھلا کیا چاہیے تھا دونوں میاں بیوی کو۔ اللہ جانے کیا ہے آفتاب کی اس کڑی میں۔ حویلی کے منڈے ائنے ہوئے پھر رہے ہے اس کے پیچھے۔۔۔!" انہوں نے دانستہ خود کو کہنے سے روکا کہ قاسم بھی کشور سے شادی کرنا

چاہتا ہے۔اس بات سے انجان کہ سنہری یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔۔۔

"کالا جادو ماسی کالا جادو۔۔۔" سنہری تھوڑا آگے ہوئی۔" یہ جو مائی جی کے گھر جاتی ہیں نا تینوں سبق شبق دہرانے ،وہاں جا کر کشور مائی کے ساتھ اندر کمرے میں چلی جاتی ہے اکثرا اور رانی اور خانم باہر صحن میں بیٹھی ٹائیں ٹائیں کھیلتی رہتی ہیں۔اب بتا ماسی بھلا اندر کیا کرتی ہوں گی یہی نا جادو ٹونا۔دیکھ لینا ایک دن بات کھل جانی یہ بھی۔!"

سنہری اس قدر وثوق سے بولی کہ حمیدہ بھی سوچ میں پڑ گئی حالانکہ مائی جی سے حویلی کی سب عورتوں نے سبق پڑھا تھا۔لیکن سنہری کی باتوں کے پھیر میں بھول بھال گئی یہ بات۔۔۔

"آپے سوچ ماسی۔ہے کیا کشور میں۔اس سے تو سوہنیاں ہمارے پنڈ کی کمہارنیاں ہوتی ہیں۔بس اس کے مقدر ہرے ہیں جو یہاں جم (پیدا) بیٹھی ہے ورنہ دیکھتی تو کیسے کمیوں کے گھروں میں رلتی۔!"

"سچ کہہ رہی ہے سنہری تو۔مجھے بھی شک پڑتا ہے دونوں ماں بیٹی پر۔ساری حویلی ان کمبختوں کے نام کی تسبیح پڑھتی ہے۔جسے دیکھو رقیہ کشور، رقیہ کشور لگا ہوا کرنے اور وہ نکی میسنی ہے۔جو اس سے تو اللہ بچائے" حمیدہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے سر سے اترتا پلو واپس سر پر کھینچا۔" مجھے تو اس کڑی کے چھن ابھی سے اچھے نہی لگتے جب دیکھو حویلی کے مردوں کے کان کھاتی ضدیں منوا رہی ہوتی ہے۔بھائی بھائی کرتی سب کے پیچھے پھرتی رہتی ہے اور ماں آنکھیں بند کیے چھوٹ دے کر بیٹھی ہوئی۔یہ اپنے حیات اور حسنات تو لفظ نا سنیں اس خانم بیماری جوگی کے خلاف۔۔۔قسمے۔!" حمیدہ چاچی سامنے دیوار کی جڑ میں دیکھتی خانم کو کوس رہی تھی جیسے اسی دیوار کے نیچے دفنا ڈالیں گی۔۔۔سنہری نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کیا اور حمیدہ کے قریب ہوئی۔۔۔

"اے ماسی" اس کی آواز سرگوشی سے کم نا تھی۔۔۔" تو یہ ویاہ رکوا دے کسی طراں۔یہ کشور اور حیات کا۔!"

"آئے ہائے میں کیسے رکوا دوں۔بھلا سب کی مرضی میں میری کہاں چلنی۔!" حمیدہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔سنہری کو اس کے انداز سے تھوڑی مایوسی ہوئی لیکن میں ہمت نہی ہاری۔

"دیکھ ماسی تیری عقل حویلی کی چار دیواری میں ہی گھمن گھیریاں کھاتی رہتی ہے۔کبھی اس سے باہر نکل تو ہوا لگے نا۔اگر کشور کا ویاہ حیات سے ہو گیا تو تیری دیورانی اور اس کی دھی سر پر چڑھ کر ناچیں گی۔حویلی کے وڈے ہیں نا تایا شہاب تو ان کی نوہ بھی وڈی مانی جائے گی تو اس طراں سب کو اس کی جی حضوری کرنی پڑے گی ماسی۔اور پھر کشور زور پکڑے گی تو اپنی ماں کو بھی زور آور بنائے گی نا تو پھر تجھے بھی اپنی دیورانی کے آگے پیچھے پھرنا پڑے گا ماسی۔!"

"رقیہ کے آگے پیچھے پھرتی میری جُتی۔اس کی اوقات کیا ہے جو مجھ پہ حکم چلائے۔گُت پُٹ کے ہتھ میں نا دے دوں۔!"

"جب سب کا ایکا ہو جانا ہے نا تب تیری اکیلی کی گُت پٹنی ہے مل کر سب نے۔۔۔بتا رہی ہوں۔سوچ ماسی سوچ۔کسی طراں کشور کا تڑا دے رشتہ اور کسی ایسی سے کرا دے حیات کا جو تیری مان کے چلے۔میرا مطلب کوئی ایسی جو تیرے شریکوں میں سے نا ہو۔۔!"

سنہری نے حمیدہ کو سوچ ڈال دی تھی وہ جانتی تھی اسے رقیہ اور اس کے ٹبر سے کتنی نفرت ہے بس اسی نفرت کو مہمیز کرنا تھا۔اب اس سوچ پہ حمیدہ کیسے عمل کرتی یہ وہ جانے لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو اگلا قدم سنہری نے سوچ رکھا تھا پر پہلے ایسا ہونا لازمی تھا۔

☆......☆......☆

شام ڈھلے سب صحن میں جمع ہو چکے تھے۔دلوں میں کتنی ہی نفرتیں اور کدورتیں سہی لیکن یہ شام کی چائے ایک ساتھ پینا واجب تھا حویلی والوں پر۔اسی بیٹھک میں لڑائی بھی ہو جاتی من منا بھی ہو جاتا اور زمینوں کے رولے بھی نبٹا لیے جاتے۔شہاب الدین تہبند کرتے میں سر پر اونچے شملے والی پگ پہنے بڑی سی چوڑے پایوں والی چارپائی پہ براجمان تھے۔قریب تازہ حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔آج اس محفل کا حصہ قاسم بھی تھا اور ایسا بہت کم ہوا کرتا تھا۔شہاب الدین کے قریب کرسیوں پر چوہدری آفتاب اور انور چوہدری دونوں بیٹھے کسی گھمبیر معاملے پہ بات چیت کر رہے

تھے جسے شہاب الدین بظاہر غیر دلچسپی سے لیکن در حقیقت پوری دلجمعی سے سن رہے تھے۔ایک طرف حویلی کی چاروں خواتین اور سنہری براجمان تھیں اور حیات کی شادی کے حوالے سے بات چیت چل رہی تھی۔تینوں لڑکیاں پیڑھیاں قریب ہی ڈالے سر جوڑے بیٹھی تھیں اور دھیما دھیما کشور کو چھیڑا جا رہا تھا جس کی گلال رنگت دیکھ دیکھ کر سنہری کا دماغ شل ہونے کو آچکا تھا۔وہ جان بوجھ کر ان میں نہیں بیٹھی تھی اور باقی خواتین نے مروتاً اسے بڑوں میں بیٹھنے سے نہیں ٹوکا تاکہ کہیں حمیدہ برا نا منا جائے۔رابی کی زبان بند نہیں ہوئی تھی وہ مسلسل باقی دونوں کا دھیان اس کی جانب کروائے ہوئے تھی۔۔۔

"دیکھو۔۔۔دیکھو ذرا کشور آپا۔۔۔اس باندری کی نظریں دیکھو ذرا۔مسلسل بس ہمارے بھائیوں کو تاڑنے میں لگی ہوئی ہے۔باری باری ایسے جائزہ لے رہی ہے سب کا کہ لگتا ہے جیسے کسی ایک کو اپنے لیے چن لینا ہو۔!"

وہ کینہ توز نگاہیں سنہری پہ گاڑے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ساتھ ہی خانم کی گود میں رکھی کیریوں کی پلیٹ سے ایک پھانک پکڑ کر کتری۔۔۔

"ہممم۔واقعی اس کی تو نظریں ہی نہیں ہٹ رہیں آپا۔!" خانم نے بھی حصہ لیا۔ساتھ کھٹی امبی چبانے کی وجہ سے آنکھ بھی میچ رکھی تھی۔۔۔

"تم دونوں نا کم از کم یہاں بیٹھی یہ سب نا کرو۔وہ اگر وہاں دیکھ رہی ہے تو تم دونوں اس کو دیکھ رہی ہو۔حساب برابر۔!" کشور نے دونوں کو گھرکا۔اسے ہمیشہ کی طرح ڈر تھا کہ ان کی باتیں کسی کے کانوں تک نا پہنچیں۔

"اویں حساب برابر۔۔۔ہم اسے دیکھ رہی ہیں اور وہ لڑکوں کو۔وہ ہمارے ساتھ بیٹھنا پسند ہی کب کرتی ہے آپا۔اللہ جانے صبح مائی جی کی طرف جانے کے لیے کیوں چل پڑتی ہے اور اس وقت اتنی میٹھی بنے گی جیسے روح افزا کا شربت ہو۔!" رابی نے لفظ لفظ چبا ڈالا تھا۔اس طرح وہ سنہری کو چبانا پسند کرتی۔خانم اس کی بات سن کر کھلکھلائی۔خواتین نے چہرے اس طرف موڑ کر نگاہوں سے تنبیہہ

کی۔۔۔مردوں کی موجودگی میں اس طرح ہنسنا معیوب لگتا تھا۔سنہری کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سب کا جائزہ لیتی تھیں لیکن محسوس نہیں ہوتا تھا۔وہ اس جانب بھی نظریں گاڑے ہوئے تھی جہاں یہ تینوں تھیں اور اس طرف بھی جہاں قدسیہ پھپھو کے بیٹے اور حیات راؤ کے برابر قاسم بھی انتہائی تلخ تاثرات لیے بیٹھا تھا۔سنہری ان پانچوں کا اچھے سے جائزہ لے رہی تھی۔بلاشبہ قاسم بہت وجیہہ تھا اور پھپھو قدسیہ کے لڑکے بھی اچھے دکھتے تھے۔لیکن کچھ تھا جو حیات میں الگ تھا۔کچھ ایسا جو اس کی جانب کھینچتا تھا یا پھر سنہری کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔وہ ابھی بے دھیانی کی کیفیت میں بیٹھی انہی باتوں کو سوچ رہی تھی جب ایک طرف سے حنات راؤ گھر کے آرام دہ کرتا شلوار میں تازہ دم سا یہاں آتا دکھائی دیا اور جیسے سارے میں چھا گیا۔اس کی شخصیت نے کوئی طلسم پھونک دیا تھا۔وہ پہلے آفتاب اور انور کی جانب گیا اور پوری گرم جوشی سے اپنے چاچا اور پھپھا سے بغلگیر ہوا۔اس کے بعد اس نے لڑکوں کا رخ کیا۔۔۔سبھی لڑکے اس سے بے حد تپاک سے ملے سوائے قاسم کے اور حنات کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔سب سے ملنے کے بعد وہ خواتین کی جانب بڑھا۔قدسیہ پھپھو اس کے قریب آتے ہی کھڑی ہو گئیں تھیں۔کتنے مہینے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ان کا بھتیجا پہلے سے زیادہ سجیلا ہو گیا تھا۔انہوں نے زیر لب ماشاءاللہ کہہ کر پیشانی چومی۔حمیدہ لیے دیے انداز میں ملیں لیکن قاسم کی نسبت بہتر ملیں تھیں۔رقیہ نے بھی کندھے پہ پیار دے کر بڑی محبت سے حال احوال دریافت کیا۔حنات خواتین سے مل کر سنہری کو مکمل نظر انداز کرتا کشور کی جانب آیا۔ساتھ بیٹھی رابی اور خانم نے فوراً پیڑھی چھوڑی تھی اور استقبالیہ مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔حیات راؤ ان دونوں سے کافی بڑا تھا اس لیے اس کی انسیت اور لگاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اب بھی دونوں سے بلکل چھوٹی بہنوں کی طرح برتاؤ کرتا تھا۔جبکہ حنات کا انداز پہلے کی نسبت بدل چکا تھا۔ایک ان دیکھا تکلف اور فاصلہ پیدا ہو چکا تھا ان کے بیچ۔وہ پہلے سی بے تکلفی نہیں تھی لیکن اجنبیت بھی نہیں تھی۔حنات نے سب سے پہلے کشور کو سلام پیش کیا۔۔۔انداز میں قدرے شوخی تھی۔

”سلام بھر۔۔۔اوہ کشور آپا۔!“ وہ دانستہ بھرجائی کہتا رک گیا تھا۔کشور کے گال تپ سے گئے۔اس

نے دھیمی آواز میں سلام کا جواب دیا۔ دور بیٹھے حیات نے یہ منظر ہونٹوں میں مسکراہٹ دبا کر دیکھا تھا۔

"اور تم دونوں کیسی ہو نوٹنکیو۔۔۔!"۔ وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا تو رابی کی باچھیں چر گئیں جبکہ خانم نے تھوڑا سا منہ پھلا لیا۔

"حنات بھائی ہم نوٹنکی کب سے ہو گئیں۔ کیا آپ ہمیں اس نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔۔۔!"

خانم کے خفا چہرے کو حنات نے غور سے دیکھا اور پھر ایک قدم پیچھے ہو کر اس کا سر سے پیر تک جائزہ لے کر ہنکارا ابھرا۔۔۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں حنات بھائی۔۔!" خانم اس کے یوں دیکھنے پہ خفیف سی ہوئی۔ جبکہ رابی بھی خانم کے پہلو سے نکل کر سامنے ہوئی اور اس کا بلکل حنات والے انداز میں جائزہ لیا۔ پھر حنات اور رابی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر زوردار ہنکارا ابھرا جس سے خانم روہانسی ہوتی کشور کی جانب مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ کشور مسکرا کر کندھے اچکا گئی۔

"چھے ماہ بعد آیا ہوں میں لڑکی۔ پورے چھے ماہ۔۔۔" حنات ایک ہاتھ پشت پہ باندھتا اور دوسرے سے اپنی ٹھوڑی کھجاتا بولا۔ "اور تمہیں پتا ہے چھے ماہ بہت ہوتے ہیں کسی انسان کے اندر تغیر لانے کے لیے۔۔۔!"

"ہاں سچ کہا حنات بھیا۔ بلکل سچ۔" رابی نے پہلے اس کی تائید کی اور پھر اس کی طرف گردن موڑ کر بولی۔ "ویسے تغیر کیا ہوتا ہے۔؟"

"ہونہہ۔ نکمیاں۔۔۔ ایک دم نکمیاں۔ کہاں بیٹھ کر پڑھتی ہو۔ دسویں کی بجائے چوتھی میں ہونا چاہیے تھا تم دونوں کو۔" حنات نے تاسف سے سر جھٹکا۔ "تغیر کہتے ہیں ایک ایسی بلا کو جو جسم میں داخل ہو جائے تو پہلے انسان کو صحتمند بنا دیتی ہے۔ اس کے گال لال لال سے ہو جاتے ہیں۔ قد بھی کچھ۔ بس کچھ۔" ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں سے "کچھ" کا سائز بتایا۔ "لمبا سا ہو جاتا ہے۔ رنگ دہی لسی جیسا سفید ساد کھنے لگتا ہے۔ آنکھیں یہ موٹی موٹی اور گہری گہری ہو جاتی ہیں۔ اور پھر۔۔۔" وہ پر اسرار لہجے میں خانم کو دیکھتے ہوئے کہتا جا رہا تھا اور رابی اور خانم کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔ حنات کے چہرے پہ فکرمندی کے آثار تھے۔ رابی

نے خانم کو سر تا پیر دوبارہ دیکھا اور فکرمندی سے بولی۔

"حسنات بھیا اپنی خانم تو بلکل ایسی ہی ہے۔۔۔اب اسے تغیر ہونے والا ہے۔؟"

"ہاں۔بہت بڑا تغیر۔بس اللہ رحم ہی کرے۔کوئی بات نہیں خانم پری۔۔۔" وہ شروع سے اسے پری کہتا تھا۔" دنیا میں ہر مرض کا علاج ہے۔اس تغیر کا بھی ہے۔تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔!"

"حسنات بھیا اگر میرا تغیر ٹھیک نا ہوا تو۔" خانم کی آواز پھنسی پھنسی سی نکلی۔اس کی سفید رنگت فق ہو رہی تھی۔حسنات نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس اس کا علاج ہے پری۔وہ ٹیکا یاد ہے جو پچھلی بار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔!"

"وہی جو آپ نے لعل دین گوالے کی مج کو لگایا تھا۔!"

رابی کو جھٹ یاد آیا تھا۔

"ہاں وہی۔ٹھیک سمجھی رابی گڑیا۔وہی ٹیکا اس کا علاج ہے۔سارا تغیر نکل جائے گا۔۔۔!"

"نانا۔۔۔میں نہیں لگواؤں گی وہ ٹیکا۔" خانم سہم کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بازو مسلنے لگی۔" مجھے نہی لگوانا۔ابا سے کہوں گی حکیم جی سے دوائی لا دیں گے۔ان کے پاس میرے تغیر کا علاج لازمی ہو گا حسنات بھیا۔مجھے آپ کا ٹیکا نہیں لگوانا۔!"

"سوچ لو۔۔۔ڈاکٹری پڑھ رہا ہوں۔ابھی تو مدد کر دوں گا لیکن اگر مجھے انکار کرو گی تو ڈاکٹر بننے کے بعد منہ بھی نہیں لگاؤں گا خانم پری۔!"

"مجھے نہی لگوانا بس تو نہی لگوانا۔۔۔مرنے دیں مجھے اس تغیر میں۔!"

"ایسے کیسے مرنے دوں پری تمہیں۔" وہ بے حد جذباتی انداز میں دو قدم آگے آتے ہوئے فکرمندی سے بولا تو خانم کو حوصلہ ہوا کہ اسے اس کی پرواہ ہے۔وہ پرسکون سی مسکرا دی۔۔۔

"ٹیکا لگا کر ماروں گا نا۔!" دوسرے ہی پل اس کی خوشی کافور کرتا وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔اس کے ساتھ دبی دبی ہنسی کشور اور رابی کی بھی شامل تھی جبکہ خانم نے نم آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے

رخ موڑ لیا تھا۔ حسنات بغور اس کی آنکھوں کی نمی دیکھتا واپس لڑکوں کے ٹولے کی جانب چل دیا۔ یہ سارا منظر دیکھتے سنہری آگ پہ لوٹ گئی تھی۔ ایسی انسیت ایسا مذاق پیار بھلا خانم سے ہی کیوں۔۔۔ رابی اور کشور سے ہی کیوں۔ دور بیٹھے حسنات اور حیات دونوں کو وہ چلچلاتی تیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اس نے قاسم کو دیکھا پھر قدسیہ پھپھو کے لڑکوں کو دیکھا اور نظریں دوبارہ حسنات اور حیات پہ آن ٹھہریں۔

”بس فیصلہ ہوگیا۔ پہلے حیات۔ نا بنی بات تو پھر حسنات۔!“

سنہری نے وہیں بیٹھے اپنے مستقبل کا تعین کر لیا تھا۔ اسے انہیں دونوں میں سے کسی کا ساتھ چاہیے تھا اور بس۔ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر کو سنہری حروف سے لکھنا چاہتی تھی۔۔۔!

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 8

بخت کے تخت سے یکلخت اتارا ہوا شخص
تُو نے دیکھا ہے کبھی جیت کے ہارا ہوا شخص

ہم تو مقتل میں بھی آتے ہیں بصد شوق و نیاز
جیسے آتا ہے محبت سے پکارا ہوا شخص

کب کسی قرب کی جنت کا تمنائی ہے
یہ ترے ہجر کے دوزخ سے گزارا ہوا شخص

بعد مدت کے وہی خواب ہے پھر آنکھوں میں
لوٹ آیا ہے کہیں جا کے سِدھارا ہوا شخص

اب اندھیرے ہیں کہ لیتے ہیں بلائیں اس کی
روشنی بانٹ گیا دیپ پہ وارا ہوا شخص

موت کے جبر میں ڈھونڈی ہیں پناہیں اس نے
زندگی یہ ہے ترے لطف کا مارا ہوا شخص

ساحل سمندر کی یخ بستہ سرد ہوائیں اپنے ساتھ لہروں کو اڑائے پھر رہی تھیں۔۔یہ آتی سردیاں تھیں لیکن یہاں سخت گرمی بھی جھلسا دینے والی نہیں تھی۔۔گرمیاں چونکہ رخصت ہو رہی تھیں تو لوگ جاتی ہوئی گرمی کا لطف لینے ساحل سمندر پر ٹوٹے پڑے تھے یہ اور بات کہ سورج نکلنے کے باوجود نا تو ہوا میں گرمائش تھی نا حدت اور نا ہی سمندر کی لہروں سے کھیلنا سکون آور تھا بلکہ کپکپانے پہ مجبور کر رہا تھا۔۔پھر بھی سن باتھ لینے والوں کی کمی نہیں تھی۔۔گورے اپنے اس شوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔۔من موجیوں کی بڑی تعداد تفریح کی خاطر سمندر کی لہروں میں اتری ہوئی تھی۔۔۔یہیں کافی فاصلے پر ایک شخص ایسا بھی تھا جس کو ٹھنڈی ہوائیں جسم میں انی کی طرح گڑ نہیں رہی تھیں۔۔۔لہریں جیسے اس کے پیروں سے لپٹ لپٹ جانے کے بعد اس کے وجود کی اداسی اور تنہائی کو پینے کے لیے کوشاں تھیں۔۔وہ اتنے ہجوم میں اکیلا تھا اور تنہائی لوگوں کی عدم موجودگی کا نام نہیں بلکہ ہجوم میں لوگوں کی آپ میں عدم دلچسپی کا نام ہے۔۔۔وہ بھی ساری دنیا کے لیے غیر اہم ہو چکا تھا۔۔اس نے ساری دنیا کو خود سے الگ کر ڈالا تھا۔۔اب وہ کسی کو پکارتا تھا نا کوئی اسے آواز دیتا تھا۔۔وہ کبھی پلٹ کے دیکھتا تھا نا اس کا وجود پتھر ہوتا تھا کیونکہ اس نے دل پتھر کر لیا تھا۔۔لہروں کے شور میں وہ سمندر کے اندر کھڑا گھٹنوں تک بھیگ چکا تھا۔۔اس کی نگاہیں سمندر کے بیچوں بیچ گڑی ہوئی تھیں۔۔۔موجوں میں بنتی سفید جھاگ جیسے مرغولوں میں ڈھل کر مجسم اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔۔وہ مرغولے سمندر کی سطح پر چکر کھاتے اور پھر اس کے پیاروں کی شکل میں ڈھلتے جاتے۔۔باری باری سب کے چہرے بنتے اور بگڑتے جا رہے تھے۔۔اس کے اپنے اور اس کے دکھ سکھ کے ساتھی اور پھر اس کی پیٹھ پر وار کرنے والے اس کے دل کو ٹکڑوں میں بانٹ دینے والے اس کی ہستی کو تاراج کر دینے والے۔۔ان سب کے چہرے وہ دوبارہ زندگی میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔۔وہ بھول چکا تھا کہ اس کی ذات سے کون کون منسلک ہے۔۔اسے بس اپنی سانسیں پوری کرنے سے مطلب تھا۔۔وہ دن کو رات اور رات کو دن کرتا تھا محض اس انتظار میں کہ کب اس کی زندگی کی کتاب ختم ہو اور آخری پنے پر "ختم شد" لکھا آجائے۔۔وہ اپنی تمام نارسائیوں سمیت زمین میں اتر جائے اور تمام خلقت کی نگاہوں سے کسی چھل کی مانند اوجھل ہو

جائے۔۔اسے نہیں سوچنا تھا بیتی یادوں کو۔۔اسے نہیں بھٹکنا تھا رشتوں کی بھول بھلیوں میں۔۔۔وہ پتھر ہو چکا تھا اور وہ دوبارہ ماضی کا تیشہ اپنے وجود میں مارنے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا تھا۔۔اس نے سن ہوتے ہاتھ کو جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موبائل نکالا۔۔بنا چہرے جھکائے محض نگاہیں نیچی کر کے ایک نظر اس کی روشن سکرین کو دیکھا جہاں میسیجز کے نوٹیفیکیشنز دکھائی دے رہے تھے اور پہلی پہلی سطر ہر میسیج کی واضح تھی۔۔اس نے میکانکی انداز میں ہاتھ بلند کیا اور موبائل پوری قوت سے دور سمندر میں اچھال دیا۔۔آتی جاتی بے ہنگم لہروں میں ایک معمولی سے چھپاک میں وہ موبائل ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔۔اس کی منجمد نگاہوں نے اس جگہ کو کتنی دیر گھورا اور پھر وہ تھکے تھکے وجود کے ساتھ واپس ہو لیا۔۔زندگی ساحل پہ رواں دواں تھی لیکن اس نے اپنی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دی تھی۔۔!

☆......☆......☆

شہزور راؤ دو دن کی شدید ذہنی اذیت کے بعد گاؤں کے سفر پر تھا۔۔پچھلے دو دن اس نے جس طرح گزارے تھے یہ وہ جانتا تھا یا نصر جو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا تھا۔۔دو دن شہزور اپنے آفس سے باہر نہیں آیا تھا۔۔نصر نے اس صورتحال کو اپنے تئیں بہترین انداز میں ہینڈل کیا تھا۔۔تمام سٹاف مکمل حاضر رہا تھا یہاں تک کہ لائبہ بھی موجود رہی تھی لیکن سب میں شہزور کے حوالے سے چہ میگوئیوں کا نصر نے تسلی بخش انداز میں جواب دیا تھا۔۔سٹاف بچہ نہیں تھا سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزور آفس کے اندر موجود ہے لیکن آفس اندر سے لاکڈ ہے۔۔آفس کی گلاس ونڈو جس سے وہ سارے اسٹاف پہ نگاہ رکھتا تھا ،اس کے بلائینڈز مکمل بند نہیں تھے اور سبھی نے بارہا شہزور کو اندر ٹہلتے اور ساتھ مسلسل سموکنگ کرتے دیکھا تھا۔۔اس نے سگریٹ اس قدر پیے تھے ان دو دنوں میں کہ ان کی بُو آفس کی چار دیواری سے نکل کر باہر تک پھیلنے لگی تھی۔۔۔اس کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں تھا اس لیے نصر نے بہت طریقے سے سٹاف کو قائل کیا تھا کہ شہزور آفیشل معاملات کی وجہ سے بے حد مصروف ہے اسے مکمل یکسوئی اور تنہائی چاہیے اس لیے وہ کمپنی کے بھلے کے لیے دو دن سے شدید محنت کر رہا تھا۔۔سٹاف قائل ہوا تھا یا نہیں لیکن لائبہ نے نصر کی نگاہ بچا کر فائل چہرے کے آگے کر کے امڈ آنے والی مسکراہٹ کو چھپایا تھا۔۔اسے

ایک کمینی سی خوشی ہو رہی تھی شہزور کو اس حال میں دیکھ کر۔۔۔وہ چاہتی تھی کہ وہ مزید تڑپے اور اتنا تڑپے کہ بیمار پڑ جائے۔۔اس کی بیماری کی خبر پا کر اس کا باپ بھی یہاں پہنچ جائے تاکہ ایک بار وہ اس انسان کو دیکھ سکے جس نے ایسی باکمال شخصیت پیدا کی تھی۔۔۔وہ لطف لے سکے اس باپ کی بے بسی کا جس کی اکلوتی اولاد کسی لڑکی کے پیچھے ان حالوں میں پہنچ چکی تھی۔۔کم از کم کچھ عرصے کے لیے تو اس نے زمن کو شہزور کی پہنچ سے دور کر دیا تھا۔۔وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ بالآخر شہزور اسے ڈھونڈ نکالے گا لیکن اس بار اس کی بھی سر توڑ کوشش تھی کہ زمن کو شہزور کی پہنچ سے اس طرح دور کرے کہ وہ کبھی اس کی گرد بھی نا پا سکے۔۔۔لائبہ کا زیادہ تر کام چونکہ شہزور کے آفس کے اندر ہوتا تھا اس لیے دو دن اس نے فارغ رہ کر خوب اچھی طرح حالات کا جائزہ لیا تھا۔۔نصر کا اندر باہر آتے جاتے کسی کو نامعلوم لڑکی کا اپتا کروانے کے لیے مسلسل فون کالز کرنا یہ ثابت کرتا تھا کہ فی الحال شہزور زمن تک پہنچنے میں بری طرح ناکام ہو چکا تھا اور یہی وہ چاہتی تھی۔۔۔تیسرے دن شہزور آفس سے باہر آیا تھا تو اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ کرختگی تھی۔۔۔اس کے وجیہہ چہرے پر کھیلنے والی کسی کسی وقت کی مسکراہٹ اب جیسے بالکل معدوم ہو گئی تھی۔۔۔وہ دو دن پہلے والے کپڑوں میں ہی ملبوس تھا جو اب خاصے ملگجے ہو رہے تھے۔۔۔آفس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ تھا جہاں شہزور کی مختصر سی وارڈروب بھی سیٹ تھی اس کے باوجود اس نے کپڑے بدلنے کی زحمت نہی کی تھی۔۔۔اتنا ضرور تھا وہ چہرے اور بالوں پر پانی بہا کر آیا تھا کیونکہ اس کا چہرہ قدرے تازہ دم لگ رہا تھا اور بالوں میں نمی چمک رہی تھی۔۔۔اس کے آفس سے باہر آتے ہی لائبہ لپک کے اس کے قریب آئی تھی۔۔۔

"ارے سر۔۔آپ نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔۔میں تو سارا سامان پیک کیے آپ کی کال کا ویٹ کرتی رہی۔۔۔وہ فارم ہاؤس جانا تھا نا ہمیں۔۔۔لیکن آپ تو ایسے غائب۔۔۔"

وہ چلتا جا رہا تھا اور لائبہ اپنی کہے جا رہی تھی پھر ایک دم سے وہ رکا اور اس پہ نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔۔

"ہمیں کہیں نہی جانا تھا مس لائبہ۔۔۔آپ اس بات کا ذکر کسی سے نہی کریں گی۔۔ریمیمبر

دیٹ۔۔۔!"

اس کی آواز میں ٹھہرا دینے والی سختی تھی۔۔لائبہ ایک پل کو گم صم ہی ہو گئی۔۔پھر فورا خود کو سنبھالتی تھوک نگلتی ہوئی بولی۔۔

"ڈونٹ یو وری سر۔۔ہمیں کہیں نہی جانا تھا۔۔یاد رکھوں گی میں۔۔۔"

وہ اسے بولتا چھوڑ قدم آگے بڑھا گیا جب دوبارہ کان میں لائبہ کی آواز پڑی۔۔۔

"لیکن ویسے ہمیں فارم ہاؤس جانا کیوں تھا۔۔کیا آپ کی گیسٹ نہی آئیں جنہیں مجھے کپنی دینا تھی۔۔؟"

وہ اسے چڑا رہی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی لیکن شہزور نے اس کے چڑاوے کو ہلکے میں نہی لیا تھا۔۔وہ طیش سے پلٹا اور اپنا دایاں ہاتھ کا مکا بناتے ہوئے لائبہ کی پشت پر دیوار پہ ٹھوکا۔۔لائبہ بری طرح بوکھلائی اور لاشعوری طور پر دونوں ہاتھوں کو دفاعی انداز میں چہرے کے آگے کر گئی۔۔شہزور اس کے انداز پہ طنزیہ مسکراتا بولا۔۔

"اوقات وہ حصار ہے جس کے اندر رہنے میں عافیت ہوتی ہے۔۔ذرا پیر باہر نکالا نہیں بلائیں جھپٹ لیتی ہیں۔۔اس لیے مس لائبہ دوبارہ کبھی مجھ سے چھیڑ خانی مت کیجیے گا۔۔میں گاؤں جا رہا ہوں۔۔واپس آ کر آئی بی انڈسٹریز کے ساتھ میٹنگ ارینج کر دینا میری۔۔مجھے ڈیل فائنل کرنی ہے۔۔۔ناؤ گو ٹو یور ورک۔۔!"

اتنا کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور مڑ کر سٹاف کیبنز کے سامنے سے گزرتا باہر نکلتا چلا گیا۔۔کیبنز کے اندر بیٹھی گردنیں اچک اچک کر باس کا موڈ دیکھنے کے لیے بے چین تھیں لیکن شہزور کے پیچھے لپکتے نصر کی ایک گھوری نے سب کو واپس کچھوے کی طرح خول میں گردن گھسیڑنے پر مجبور کر دیا۔۔لائبہ نے کب کی روکی مسکراہٹ کو کھل کر ہونٹوں پہ امڈنے دیا اور دونوں بازو سینے پہ لپیٹتی انگلیوں میں دبایا پوائنٹر گھمانے لگی۔۔۔

"ناکوں چنے چبانے ہیں شہزور راؤ۔۔اللہ جانے تم نے چبانے ہیں یا مجھے ہی نا چبانے پڑ

جائیں پرستے میں تو تم اب چھوٹنے والے نہیں۔۔!"

ہلکی آواز میں بڑبڑاتی وہ تالی بجاتی باآواز بلند سٹاف سے مخاطب ہوئی۔۔۔

"کم آن گائیز۔۔کھڑوس گیا ہے گاؤں۔۔سب اپنے اپنے لنچ کھولو۔۔آج پارٹی کریں گے۔۔۔!"

اور کچھ ہی دیر میں وہاں شور وغل مچا ہوا تھا۔۔لائبہ سب کے درمیان اونچے میز پہ یوں بیٹھی تھی جیسے اس کے باپ کا دفتر ہو۔۔!

☆......☆......☆

رباب خان ابھی ابھی ہاسپٹل سے ہاجرہ کو لے کر سیدھی فائزہ خاکوانی کے گھر پہنچی تھیں۔۔صبح کا وقت تھا اس لیے فائزہ اپنی شاپ پر تھیں جبکہ لائبہ آفس میں تھی۔۔زمن انتہائی بوریت کے عالم میں بانو کے کان کھانے کے بعد اب اپنے پورشن کے چھوٹے سے لاؤنج میں بنا آواز کے ایل ای ڈی لگائے سکرین کو گھور رہی تھی۔۔صوفے کی بیک پہ سر ڈالے دونوں پیر سنٹرل ٹیبل کے شیشے کے کنارے سے ٹکا رکھے تھے۔۔گھٹنے اونچے مڑے ہوئے تھے جن پر ریموٹ رکھا ہوا تھا۔۔ایک ہاتھ میں چائے کا بھرا ہوا مگ تھا جو تھوڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن اس کا دھیان اس وقت بہت سے حصوں میں بٹا ہوا تھا۔۔کبھی زوہا کا آپریشن، کبھی فائزہ آنٹی کی شاپ کی کاؤنٹر ڈیوٹی، کبھی ہاجرہ کا بیمار بیمار اور تھکا ہوا چہرہ اور کبھی وہ عفریت جس سے بھاگ کر وہ یہاں پناہ گزین تھے۔۔وہ جتنی مرضی بہادر بنتی لیکن اندر سے سہمی ہوئی تھی۔۔مہریار کی تنبیہات نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔۔یعنی بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ مہریار تک پہنچ گئی تھی۔۔آنٹی رباب نے یقیناً اس سے ان کا انتہائی ذاتی نوعیت کا یہ معاملہ شئیر کر دیا تھا تبھی وہ اسے اتنے دوٹوک اور سخت الفاظ میں باہر نکلنے اور مال جانے کے لیے محتاط رہنے کا کہہ رہا تھا۔۔ورنہ اسے کیا لگے وہ کہاں جاتی ہے کب آتی ہے۔۔وہ شہزور راؤ کے بارے میں جان چکا ہے یقیناً اور اب حفاظتی اقدامات کے طور پر اسے فی الحال گھر رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔۔وہ خود ہسپتال میں مصروف تھا۔۔زوہا کا کیس اس وقت اس کی پہلی ترجیح تھا۔۔ہر وقت کی نگرانی فی الوقت ممکن نہیں تھی تو اس نے بہتر سمجھا تھا کہ

زمن کو ہی گھر رہنے پہ مجبور کرے۔۔لیکن یہ ساری صورتحال زمن کے لیے قابل قبول نہی تھی۔۔وہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔۔معلوم نہی اسے برا کیا لگ رہا تھا۔۔۔مہریار کا شہزور کے بارے میں جان جانا۔۔اسے گھر رہنے پہ پابند کرنا۔۔یا شائد کوئی تیسری وجہ تھی جو اسے سجھائی نہی دے رہی تھی۔۔اسے آنٹی رباب پہ بھی غصہ تھا جنہوں نے اس کی زندگی کا تاریک پہلو مہریار کے سامنے عیاں کر دیا تھا۔۔کیا سوچتا ہوگا وہ اس کے بارے میں۔۔یقینا سارا نا سہی لیکن کچھ کچھ غلط اسے بھی کہتا ہوگا۔۔زمن کا دماغ سوچ سوچ کر پھٹنے کے قریب آ گیا تھا۔۔وہ شروع سے سوچنا شروع کرتی اور اب تک کے واقعات کو تسلسل سے ذہن میں لاتی چلی جاتی تو اس میں سے زیادہ جو بات اسے چونکاتی تھی وہ مہریار کا اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے فکر مند ہونا تھا۔۔وہ ہاسپٹل بیٹھا ہوا بھی اس پہ نگاہ رکھے ہوئے تھا تو کیوں۔۔؟؟؟کس رشتے سے۔۔کس حیثیت سے۔۔کوئی بھی بلا وجہ کسی کا اتنا خیال کیوں رکھے گا۔۔وہ تھک کر چائے کا مگ منہ سے لگا گئ۔۔اگلے ہی پل برا سا منہ بناتے مگ ہٹایا۔۔چائے شربت بن چکی تھی۔۔اس نے مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔۔تبھی باہر سے رباب آنٹی اور ہاجرہ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں جو رفتہ رفتہ لاؤنج کی طرف آ رہی تھیں۔۔زمن ٹانگیں نیچے اتارتی سیدھی ہو بیٹھی۔۔کڑے تیور لیے لاؤنج کے مرکزی دروازے کو گھورنے لگی جہاں سے ان دونوں کو اندر داخل ہونا تھا۔۔صاف پتا لگتا تھا کہ تفتیشی موڈ ہے۔۔۔ہاجرہ اور ان کے پیچھے رباب خان باتیں کرتی اندر داخل ہوئیں۔۔دونوں اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔۔رباب نے ہاجرہ کو کہنی مار کر بھنویں اچکاتے کوئی اشارہ دیا۔۔وہ چند قدم چل کر اس کے قریب آئیں اور ساتھ بیٹھ کر محبت سے اس کی پیشانی پہ آئے بال پیچھے کرتی گویا ہوئیں۔۔۔

"کیا بات ہے زمن۔۔ناراض ہو۔۔نا سلام نا دعا۔۔گھور ایسے رہی ہو جیسے بس ابھی لڑنا شروع کرنا ہے۔۔!"

رباب خان بھی اس کے بلکل مقابل سنگل چیئر پر بیٹھ گئیں۔۔زمن کی آنکھیں بلا وجہ بھیگنے لگیں۔۔۔وہ واقعی لڑنا چاہتی تھی لیکن ہاجرہ کے یوں محبت جتانے سے اس کا دل بھر آیا تھا۔۔آنسو امڈتے چلے آئے اور گالوں پہ لڑھکے تو ہاجرہ بے اختیار اسے سینے سے لگا گئیں۔۔کتنے دن ہو گئے تھے ان ماں بیٹی

کو ایک ساتھ سکون سے بیٹھے۔۔ ہاجرہ کا تقریباً سارا دن ہاسپٹل میں گزر جاتا تھا اور جب گھر آنا ہوتا تو زمن ہاسپٹل میں ہوتی تھی۔۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔۔ رباب خان البتہ سہولت سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اسے بغور دیکھتی دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں گاڑی کی چابی گھمارہی تھیں۔۔ زمن مسلسل بہتے آنسوؤں کی وجہ سے بول نہیں پارہی تھی اور ہاجرہ چھوٹے بچے کیطرح اس کا سر سینے سے لگائے اپنی بھی آنکھیں بھگوئے کبھی اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگاتیں تو کبھی اس کے بالوں میں بوسہ دیتیں۔۔ رباب خان نے کچھ دیر تو یہ سین برداشت کرلیا لیکن پھر ان کی بس ہو گئی۔۔

”اب ذرا کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ المناکی کس وجہ سے ہے۔۔ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے دریا بہائے جارہے ہیں تاکہ ایک بوکی میں بھی ڈال دوں۔۔!“

ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ زمن کو دو چپیڑیں ماریں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں تھا اس لیے حتی الامکان نرم لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔۔ ہاجرہ ان کی بات کے جواب میں مسکرائیں اور بولیں۔۔

”کتنے دن ہو گئے رباب مجھے اپنی بچی کے پاس بیٹھے۔۔ میں نے یہ بھی نا سوچا کہ آخر سب سے زیادہ پریشان تو یہی ہے اور اسے ہی ایسے وقت تنہا کر دیا میں نے۔۔!“ ان کی آواز دوبارہ سے بھرا گئی۔۔ زمن مزید شدت سے آنسو ٹپکانے لگی۔۔۔ رباب خان سیدھی ہوتی تھوڑا آگے ہوئیں اور میز پہ ہاتھ مارتی دونوں کو بوکھلانے پہ مجبور کر گئیں۔۔

”اینف۔۔۔ زمن اب تم چار سال پہلے والی زمن نہیں ہو۔۔ تمہیں خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔۔ ابھی ابتداء ہے۔۔ ابھی تو تمہارا امتحان شروع بھی نہیں ہوا۔۔ ابھی سے گھبرا گئی تو آگے تو تم ایک قدم بھی اپنے بل بوتے پر اٹھا نہیں سکو گی۔۔ کیا گھر اور کیا گھر سے باہر تمہیں اپنی ماں کی پروں سے باہر نکلنا ہوگا اب۔۔ ہر طرح کے خطرے کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کرنا ہوگی۔۔۔ سب سے بڑی بات ماں کے بنا رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔۔۔!“

ان کی آخری بات پہ زمن اور ہاجرہ دونوں بھونچکا رہ گئیں تھیں۔۔۔ رباب خان کچھ زیادہ ہی صاف گوئی کا مظاہرہ کر گئی تھیں لیکن وہ جانتی تھیں کہ اس کی اشد ضرورت ہے۔۔۔ زمن ایک جھٹکے سے ماں سے

الگ ہوئی اور رباب خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی بولی۔۔
" آج ایک ہی بار مجھے وہ تمام خطرات بتا دیں جس کے لیے کبھی آپ مجھے ڈراتی ہیں تو کبھی وہ آپ کا چہیتا ڈاکٹر کا بچہ۔۔!"
" تو کیا تمہیں شہزور چھوٹا خطرہ لگتا ہے۔۔۔؟ ہاں۔۔ بولو۔۔۔؟"
" میرے لیے وہ اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔۔۔ میں اس سے اتنا ڈر چکی ہوں کہ اب مجھے مزید اس سے ڈر لگنا بند ہو گیا ہے۔۔!"
" اچھا!!!۔۔" رباب خان سرسراتی آواز میں بولیں۔۔۔" سیریسلی۔۔ وہ پرانے کرائے کے مکان پر چکر لگا کے جا چکا ہے اور اس بار وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔۔ اس کے ساتھ شگن کا سامان تھا اور اس نے مالک مکان کو یہ بتایا ہے کہ تم اس کی ہونے والی بیوی ہو اور وہ تمہیں کسی بھی قیمت پر ڈھونڈ نکالے گا۔۔۔!"
زمن کی رو رو کے ہوئی گلابی رنگت یکدم سفیدی مائل ہوئی تھی۔۔۔ وہ بے یقینی سے رباب آنٹی کی شکل دیکھنے لگی۔۔ ہاجرہ الگ سہم سی گئی تھیں۔۔۔ انہیں ایک دم شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔۔۔ وہ دہری ہوتی کھانستی چلی گئیں۔۔۔ رباب خان فوراً اٹھ کر ان کی جانب بڑھیں اور زمن کو جلدی سے پانی لانے کا کہا جو بت بنی بس ماں کو غائب دماغی سے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔۔ رباب خان کی دوبارہ پکار پر جلدی سے پانی پکڑ لائی۔۔ ماں کے منہ کو گلاس لگاتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔۔ رباب خان نے تاسف سے دونوں ماں بیٹی کو دیکھا اور ہاجرہ کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پُرتفکر انداز میں بیٹھ گئیں۔۔۔
" اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اس طرح سے بوکھلا جاؤ۔۔ یہ تو بس تمہاری اس عقل سے عاری بیٹی کو سمجھانا چاہا تھا کہ ان حالات میں اسے بہادر بننا ہو گا اور ہوش مند بھی۔۔۔ لیکن بلاوجہ کی ہوشیار نہیں کیونکہ ضرورت سے زیادہ ہوشیاری انسان کو اندھے کنوئیں میں بھی گرا دیتی ہے۔۔۔ باہر جب دشمن تاک میں ہو تو خود کو چار دیواری میں محفوظ رکھنا دانشمندی ہے۔۔ حملہ کرنا ہے تو اندر سے تاک کے نشانہ لو لیکن ہر موقع پر سینہ تان کے دشمن کے سامنے نہیں آ جانا چاہیے۔۔!"
وہ اب رسان سے زمن کو سمجھا رہی تھیں جو خاموشی سے بس ناک کے ذریعے لمبی لمبی گیلی سانسیں

کھینچ رہی تھی۔۔ہاجرہ صوفے کی پُشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موندے گہرے سانس لے رہی تھیں۔۔رباب خان کی بات سن کر انہوں نے بند آنکھوں سے ہی تائید میں سر ہلایا تھا۔۔زمن لب بھینچے ماں کا اترا چہرہ دیکھتی رہی۔۔

"آپ نے ایسا کیوں کہا کہ مجھے امی سے دور ہونا پڑے گا۔۔کیوں۔۔۔کس لیے۔۔؟"

"ارے بابا حالات کا تقاضا ہوتا ہے۔۔" رباب خان زچ ہوتی بولیں لیکن نگاہیں چرا گئیں۔۔۔

"دیکھو۔۔زوہا کا آپریشن ہے اس کے لیے ہاجرہ کو وہاں رہنا ہے۔۔پھر کل کو تمہاری شادی نہی ہونی کیا۔۔کیا وہاں بھی ماں کو لے کر جاؤ گی۔۔۔نہیں نا۔۔تو بس اسی لیے کہہ دیا ایسا۔۔۔!"

"نہیں ہونی۔۔مجھے نہی کرانی۔۔میں بھلا امی کو اور زوہا کو چھوڑ کر جا سکتی ہوں کیا۔۔نیور۔۔مر کر بھی نہیں۔۔!" زمن اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے تلخ لہجے میں بولی۔

"مر کر تو قبر میں جانا ہوتا ہے میری چندا۔۔!" رباب خان اسے چڑا رہی تھیں یا نہیں لیکن وہ چڑ گئی تھی۔۔رونا تو پہلے ہی آرہا تھا اب لگ رہا تھا جیسے سارا زمانہ اس کے خلاف سا ہو گیا ہے۔۔وہ مزید بحث میں پڑے بغیر اندر کمرے میں چلی گئی۔۔اس کے جاتے ہی رباب خان نے ہاجرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور سرگوشیانہ کچھ سمجھانے لگیں جسے ہاجرہ بند آنکھوں کو بمشکل کھولتی سر سیدھا کیے سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔۔ان کا چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔۔ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بہت سا آرام کریں۔۔ڈھیر سارا آرام۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری حیات راؤ کا فون آیا تھا کہ وہ چند دن میں شہر کا چکر لگانے والے ہیں۔۔وہ کسی ضروری کام سے آرہے تھے اور عین ممکن تھا وہ چند دن کے لیے کم از کم یاور اور داور کو گاؤں لے جاتے کیونکہ کشور بی بی کا دل بے حد اداس تھا۔۔نانی پیاری نے اپنی پوٹلی سب سے پہلے باندھی تھی۔۔ان کا دل تو شائد سب سے زیادہ اداس تھا۔۔۔

مہریار لاؤنج میں کارنر

صوفہ پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے منہ کے آگے اخبار کیے بیٹھا تھا۔۔۔وہ چاروں اس کے بلاوے کے بعد سے ایک لائین میں بلکل سامنے کھڑے خود پہ لگنے والی چارج شیٹ کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔

"سب سے بڑا کمینہ یہ ہے جو مسکینی بوتھی بنا کے کھڑا ہو جاتا ہے نا بیچ میں۔۔۔ جیسے کسی بات کا پتا نہی اس کاکے کے پُتنے کو!"

شہریار نے زارون کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو جواباً زارون نے اپنے ازلی بھولپن کو دہراتے ہوئے پلکیں پٹپٹا کے اسے دیکھا۔۔۔شہریار کا دل کیا اس کی گردن دبوچ کر اس بار مروڑ کے دم لے۔۔۔داور نے تھوڑا سا آگے کو ہو کے زارون کے تاثرات دیکھے تو داد دیے بنا نہی رہ سکا۔۔۔

"قسم سے بڑے لیول کا میسنا ہے یہ۔۔۔شکل دیکھ لے کوئی اس کی تو دل کرے یتیم خانے چھوڑ آئے۔۔!"

اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہی تھی پھر بھی شہریار اور یاور نے اشارے سے باور کرایا کہ مہریار لالہ بیٹھے ہیں۔۔۔

"بول لو بول لو۔۔پتا ہے نا مجھ غریب کی پتلی گردن ہی پھنستی ہے لالہ کے ہاتھ میں۔۔۔تم لوگ تو پوشلیں دبا کے نکل جاتے ہو!"

زارون نے زبردستی ٹھوڑی کو تھرکایا جیسے ابھی رو دے گا جبکہ داور اور یاور نے اپنے پیچھے "پوشلیں" چیک کیں اور اپنے بعد شہریار کی بھی ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی۔۔

"ہاں سچ کہہ رہے ہو ہمارے لیے تو لالہ نے یہاں پلنگ ڈالا ہوا نا جس پہ تھا پڑ تھا پڑ سلانا ہے ہمیں۔۔نہی۔؟"

شہریار سوالیہ غرایا تو مہریار نے اخبار کا صفحہ زور سے جھٹکا۔۔۔یہ اشارہ تھا کہ وہ ان سب کی بکواسیات سن رہا ہے۔۔

"ایک تو یہ ہٹلر کے زمانے میں پیدا ہونے والا"

پیس اس دور میں پتا نہی کیوں ٹپک گیا۔۔!" یاور کا دکھ۔۔

ہ"ہمیں ٹپکانے کے لیے۔۔۔!" داور کے قیافے۔۔۔

ہ"کسی وقت بھی دورہ پڑ جاتا ہے ان ڈاکٹر صاحب کو تو۔۔۔!" زارون کے پھپھولے۔۔۔

ن"نہیں۔۔۔دن میں دو بار سنڈے چھوڑ کر۔۔۔!" شہریار کی سچ بیانیاں۔۔۔

مہریار نے اخبار تہہ کیا اور ایک جانب رکھ کے ان چاروں کو بغور دیکھا۔۔

ک"کیا ثابت کرنا ہے ابا کو اس بار کہ کتنے ادب اور تہذیب کے پروردہ بن رہے ہو یہاں شہر میں رہ کر!"

آپ نے کچھ ثابت کرنے کا موقع ہی کہاں دینا ہے لالہ۔۔۔اڑان سے پہلے ہی پنکھ کاٹ لیتے ہیں آپ تو۔۔۔!" شہریار جھکے سر سے بڑبڑایا۔۔۔

شہری کب سدھرو گے۔۔۔عمر دیکھو اپنی یار۔۔۔سٹڈیز کمپلیٹ ہو چکی ہیں تمہاری۔۔۔تھوڑے سے وقت میں جاب اسٹارٹ کرنے والے ہو۔۔۔لیکن سنجیدگی نام کی شے نہی تمہارے اندر۔۔۔!"

شہری بھائی کے بجائے آپ ہم دونوں پہ بھروسہ کر کے دیکھیں لالہ۔۔۔کبھی مایوس نہی کریں گے۔۔۔بلکہ ہم تو ابا کو بھی یہی کہنے کے لیے جی جان سے تیار ہیں اگر آپ دونوں کو شادی بیاہ جیسی نامراد چیز میں انٹرسٹ نہی تو ہم دونوں کا سر اوکھلی میں دے لیں۔۔۔جتنے کہیں گے موصلے موصول کریں گے ہم۔۔۔بس بھروسہ تو کریں۔۔۔!" یاور سینے پہ ہاتھ دھرے اس شدومد سے یقین دہانی کروا رہا تھا جیسے مہریار ابھی کلائی تھامے گا اور نکاح خوان کے پاس لے چلے گا۔۔۔اور داور اس کی تقلید میں مسلسل سر دھن رہا تھا۔۔۔

ت"تم دونوں تو بلکل خاموش رہو۔۔۔میرا تو پچھلی بار ہی دل کر رہا تھا کہ تم دونوں کو ابا کے ساتھ گاؤں بھیج دوں۔۔۔نا سکون سے یہاں رہتے ہو نا پڑھائی پہ دھیان دیتے ہو۔۔۔بس شرارتیں کروا لو دونوں سے۔۔۔اوپر سے چھٹی کا سارا دن تم دونوں سلیپنگ سوٹ میں گزار دیتے ہو۔۔۔دیکھ کے الجھن ہوتی ہے۔۔۔سوئی صورتیں، ڈھیلی مورتیں بنے رہتے ہو۔۔۔سارا دن سستی دور کیسے ہو جب حلیہ درست نہی ہوتا تو۔۔۔شہری۔۔"۔

مہریار نے شہریار کو مخاطب کیا تو وہ یوں چونکا جیسے نیند سے اٹھایا گیا ہو۔۔۔مہریار اس اوور ایکٹنگ پہ دانت بھینچ کے رہ گیا۔۔۔

"میں نے پرسوں کہا تھا کہ مجھے شام تک تم لوگوں کے بال کٹے ملنے چاہیئں اب میری لاسٹ وارننگ سمجھنا۔۔صبح ہی جاؤ اوران کے یہ غلیظ بال کٹواؤ۔۔۔دیکھ دیکھ کے وحشت ہونے لگی ہے۔۔۔بلکل فوجی کٹ کروا کے آنا۔۔سمجھے!"

مہریار اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔اسے پتا تھا کہ یہ سب فالتو کے لیکچر دے رہا ہے۔۔۔اثر چاروں میں سے کسی نے خاک بھی نہی لینا۔۔۔قمیض چھٹک کے ٹھیک کرتے ہوئے وہ مڑا اور زارون کو افسوس سے دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

ا" اورتم۔۔۔تمہیں تو پھپھو نے یہاں بھیج کے شدید غلطی کردی زارون۔۔۔کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم نے ان ہی کے رنگ میں رنگنا ہے تو پھپھو کو مشورہ دیتا کہ تمہیں تمہارے ددھیال روانہ کریں۔۔۔لیکن خیر۔۔۔کیا کرسکتا ہوں تمہارا۔۔۔بنو جو بن رہے ہو۔۔۔انسان بنے تو واپس بھیج دوں گا نا بنے تو تب بھی الٹی میٹلی واپس ہی بھیجوں گا۔۔۔اور کوئی آپشن ہے ہی نہیں۔۔"

وہ کوفت سے کہتا لاؤنج سے نکل گیا تو زارون سر کھجاتے ہوئے بولا۔۔۔

آ" آج لالہ ہمارے جیسی باتیں کر کے گئے ہیں نا دوستو۔۔۔ہے نا۔۔!"

مطلب۔۔۔" شہریار نے سینے پہ ہاتھ باندھتے ہوئے پوچھا۔۔

"مطلب بنا سر پیر کے۔۔۔مطلب کچھ بھی۔۔۔مطلب" یولیاں کہتے ہیں جسے۔۔۔

تمہارے دماغ کو خشکی ہوگئ ہے زارون۔۔۔بہتر ہے اب تم فائنلی کٹنگ کراؤ۔۔۔

"کرواؤں گا کرواؤں گا کیوں نہی مجھے کون سا شیمپو کے اشتہار میں کام کرنا ہے۔۔!"

تُو ویسے پٹنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے، لازم ہے"

کوئی نیا شوشہ چھوڑنا ہی چھوڑنا ہے۔۔!" شہریار بیزاری سے کہتا لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا۔۔پیچھے زارون سنجیدگی سے بولا۔۔

"کیا کروں۔۔ویسے میرا نام شوشہ رکھ دینا چاہیے تھا۔۔تم سب مجھے بھلا کیسے بُلاتے پھر۔۔اوئے شوشے۔۔شوشے ے ے ے۔۔۔شوشے کدھر مر گیا ہے تُو۔۔آج یہ اپنا شوشہ دکھائی نہی دے رہا۔۔اس شوشے کا گلا دبا دینا ہے آج۔۔" زارون بنا رکے مسلسل بولتا جا رہا تھا اور شہریار کے پیچھے داور اور یاور بھی وہاں سے جا چکے تھے۔۔زارون وہاں اکیلا بیٹھا کافی دیر تک شوشے چھوڑتا رہا تھا۔۔!

☆......☆......☆

یہ ان کی کالونی کا بہترین جینٹس سیلون تھا جہاں آج رش کچھ کم تھا۔۔۔یاور کو صبح سے کوئی دس چکر تو لگوائے گئے تھے کہ جا کر سیلون چیک کرے سیٹیں خالی ہیں یا نہی خوامخواہ انتظار نا کرنا پڑے۔۔لیکن یاور بھی ایک شہزادہ تھا۔۔پورا سیلون خالی پڑا تھا اور گھر آ کر دہائی دے دیتا تھا۔"بڑا رش ہے۔۔انی پڑی ہوئی ہے۔۔بڑا رش ہے۔۔" نتیجتاً باقی تینوں ٹھنڈے ہو کر واپس صوفوں میں دھنس جاتے کہ جب رش کم ہو گا تو جاتے ہیں۔۔جب آخری بار یاور نے آ کر وہی جواب دیا تو زارون بابا کی ہ میشگی سوئی عقل میں معمولی سی جنبش ہوئی اور وہ خان سے کہہ آیا جا کر سیلون کا چکر لگا کے آئے اور بتائے کتنے بندے بیٹھے ہیں۔۔۔خان پانچ منٹ مین واپس آیا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ترچھی ٹوپی کیے بولا۔۔

"ام تو کہتا اے خانا تم سارا گاؤں بی بلا لو تو ان کا بھی بال اتر جائے گا۔۔واں وہ استروں سے مکیاں (مکھیاں) مارراا اے۔۔تم لوگ چلے جاؤ تمارا گردن سکون سے مار دے گا۔۔!"

زارون خان کی بات کی گہرائی میں جائے بنا اندر گیا اور شہری کو بتا دیا کہ پورا سیلون خالی ہے یہ یاور ہم سب کے جذبات کے ساتھ کھیل رہا تھا۔۔یاور نے خشمگیں نظروں سے زوران کو دیکھا اور حسرت سے اپنے گردن کو چھوتے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔۔مہریار کی وارننگ نا ہوتی تو یقیناً اب بھی وہ سب ان کی نشو نما کرنا پسند کرتے۔۔شہریار دو دو چپت لگا کر آگے لگاتا یاور اور داور کو لے گیا۔۔وہاں پہنچ کر خالم خالی سیلون کے مالک نے ان سے کاؤنٹر پہ بیٹھے سوال کیا۔۔

"اپائنٹمنٹ لیا ہے۔۔!"

شہریار نے ایک نظر سیلون کی خالی پڑی سیٹوں اور ان کے ساتھ کھڑے ویلے لڑکوں کو دیکھا اور

سمجھ گیا کہ سیلون کا مالک بھاؤ دے رہا ہے۔۔وہ جواباً تھوڑا اکڑ کے بولا۔۔

"جناب بال کٹوانے ہیں کڈنیاں نہیں نکلوانی۔۔۔!"

وہ شخص بری طرح سٹپٹایا اور انہیں ہاتھ سے کرسیوں کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔۔جبکہ زارون ان کے پانچ منٹ بعد وہاں پہنچا تھا۔۔تینوں سکون سے کرسیوں پہ براجمان اپنے مطلوبہ ہیئر سٹائل سمجھانے کی تگ و دو میں تھے اور زارون باری باری تینوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہیئر ڈریسر کو ہدایات جاری کرتا۔۔

"بھائی جان ایسے کاٹیے گا کہ بس ٹنڈ ہی لگے۔۔تین مہینے تک دوبارہ آپ کا منہ نا دیکھنا پڑے۔۔۔!"

"میں تو کہتا ہوں اس کے بالوں کو تیلی لگا دیں۔۔وہ ہیئر سپرے کریں اچھی طرح اور لائٹر کا شعلہ دکھا دیں۔۔۔آپ کا وقت بچ جائے گا۔۔!"

"اس کے بالوں پہ وائی فائی کا سگنل ٹریس کر دیں بھائی جان۔۔لیکن سگنلز ڈراپ کر دیجیے گا۔۔کیونکہ اس کے دماغ کے سگنلز بھی ایسے ہی ہیں۔۔!"

شہریار گلے میں بندھا کپڑا نوچ کر اٹھا اور پیچھے بکواس کرتے زارون کو گردن سے پکڑ کر اپنی جگہ پٹختے ہوئے بولا۔۔

"پہلے اس کی حجامت ہوگی۔۔۔موٹی مشین مار دو۔۔ایک بال بھی دوسرے سے اونچا نیچا نا ہو۔زیادہ زبان چلائے تو روغنی ٹنڈ کرنے میں بلکل نا ہچکچانا۔۔بلکہ ٹوآب سمجھ کر استرا پھیرنا۔۔شروع ہو جاؤ اب۔!"

اور زارون کی بولتی یکدم ایسے بند ہوئی جیسے آف کا بٹن دبا دیا ہو۔۔تینوں کے بال بے حدرف ہو رہے تھے اور جس طرح کے ہیئر اسٹائل یاور اور داور بتا رہے تھے اس طرز پہ تو کاٹنے نا کاٹنے برابر ہوتے۔۔جولڑکا یاور کی کٹنگ کر رہا تھا وہ اس کے بالوں کی حالت دیکھ کر خاصا ناک منہ چڑھا رہا تھا۔۔اس کے بالوں پہ اسپرے سے پانی چھڑکتا ہوا بولا

"ہیئر ماسک لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔آپ کے بالوں کا ٹیکسچر خاصا خراب ہو رہا ہے۔۔!"

یاور نے اسے شیشے میں سے گھورا اور تشتیوں کیطرح دونوں آنکھیں ڈھیلی کیے ہونٹ لٹکائے بولا۔۔

" بال کٹوانے ہیں، سویٹر نہی بنوانا۔۔۔اب اگر میرے بالوں میں نقص نکلا نا تو میں اپنی اور تیری جگہ بدل دوں گا۔۔۔سمجھا۔۔!"

وہ لڑکا فورا سمجھ گیا تھا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا تھا۔۔اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کوئی لفنگا سا گاہک ہے اس سے پنگا لینا مناسب نہی ہوگا۔۔

باری باری تینوں اٹھے تو شہریار سکون سے کسٹمر سیٹ پہ بیٹھ گیا۔۔کارڈ دیکھتے ہیئر اسٹائل چوز کرتے وہ پورا وقت لے رہا تھا۔۔

"ہمیں تو کھوترا آلو (چھلا آلو) بنا دیا ہے اور خود دیکھو کیسا آرٹ ورک ڈھونڈ رہے شہری بھیا۔۔!"

داور جس کے سر پر بال محض درمیانی حصے میں دکھائی دے رہے تھے اردگرد سے سارے بال صفاچٹ ہو چکے تھے، جلے انداز میں یاور کو ٹہوکا دیتا ہوا بولا۔۔

" کاش میں نائی ہوتا نا تو اپنے گھٹنوں میں سر دے کر شہری کے بال مونڈ دیتا۔۔۔!" زاروِن نے تصور کی آنکھ سے خود کو نائی بنے دیکھا تو تسکین سی ہوئی۔۔شہریار کی کٹنگ کرنے والے لڑکے کو آواز لگاتے ہوئے بولا۔۔

" بھائی جان پیالہ رکھو اور سائیڈوں پہ مشین پھیر دو۔۔آج تم لوگوں کی دکان پہ ہمارا پورا پنڈ آنے والا ہے۔۔جلدی کرو۔۔۔!"

شہریار ایک جھٹکے سے مڑا اور بے یقینی سے زاروِن کو دیکھنے لگا۔۔یاور اور داور بھی نا سمجھی سے اسے دیکھ رہے تھے۔۔۔زاروِن ان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔۔

" خان نے مجھے کہا تھا پورا سیلون خالی ہے۔۔سارا گاؤں بلوا لو۔۔سب کی حجامت ہو جائے گی۔۔۔میں آتے ہوئے اسے کہہ آیا ہوں پنڈ فون کرے اور حیات ماموں سے کہے کہ جس جس کو بھیج سکتے ہیں بھیج دیں۔۔آج موجیں ہی موجیں ہیں یہاں۔۔!"

" او گدھے زلیل آدمی۔۔۔" شہریار ایک بار پھر جھٹکے سے گلے میں باندھا کپڑا کھینچتا ہوا کھڑا

ہوا۔۔" تُو اپنے جیسے ایک اور گدھے کو جو بکواس کر کے آیا ہے وہ یقیناً اباجی کو بتا چکا ہو گا۔۔ بھاگو گھر۔۔کہیں فون نا کر چکا ہو خان۔۔۔!"

شہریار ہونق سا سیلون سے نکل کر گھر کی جانب بھاگا۔۔اس کے پیچھے یاور اور داور بھی نکل گئے۔۔انہیں بھی فکر لگ گئی تھی کیونکہ خان بھی عقل کے معاملے میں پیدل ہی تھا۔۔پیچھے زارون سیلون کے مالک کو کہہ رہا تھا۔۔

"ارے آپ کیوں ہریشان ہو رہے ہیں انکل جی۔۔" زارون کاؤنٹر پہ بیٹھے آدمی سے مخاطب ہوا۔۔اندر اندر اسے پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ تینوں اسے چھوڑ گئے ہیں اور پیسے بھی نہی دے کر گئے جب کہ وہ بھی خالی جیب تھا۔۔کہیں یہ چاروں مل کر اس کی کٹائی کے بعد دھلائی نا شروع کر دیں۔۔

"آج تو آپ کی موجیں لگ جانی ہیں۔۔اتنا گاہک آئے گا کہ شام تک فرصت ہی نہی ملے گی آپ کو دکان کی صفائی سے۔۔میرا مطلب کہ بالوں سے ہی اتنی بھر جائے گی۔۔آپ کے سیلون کی چاندی ہو جائے گی چاندی۔۔اتنا گاہک آنے والا ہے اتنا گاہک کہ آپ کی دکان میں بالوں کا سیلاب آ جائے گا۔۔!"

کاؤنٹر پہ بیٹھے لحیم شحیم آدمی نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا اور ان تینوں نے زارون کو گھیر لیا۔۔کچھ دیر بعد زارون کرسی پہ بیٹھا تھا اور وہ تینوں اس کے گرد پہرے داروں کی طرح کھڑے تھے۔۔زارون کو اب یہاں تب تک بیٹھنا تھا جب کوئی آ کر کٹنگ کے پیسے چکا کر اسے لے نہی جاتا۔۔!

☆......☆......☆

فائزہ خاکوانی کے خوبصورت اور نفیس لاؤنج میں اس وقت ایک صوفے پر زمن اور ہاجرہ براجمان تھیں جبکہ دوسرے پر بلکل سامنے فائزہ بیٹھی تھیں۔۔لائبہ کچن میں بانو کو چائے کے ساتھ سنیکس لانے کا کہہ رہی تھی ساتھ گردن موڑ کر ان تینوں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔۔۔اسی کے کہنے پر فائزہ نے ان دونوں کو شام کی چائے پہ یہاں بلایا تھا۔۔اس کا مقصد بس ان کو ریلیکس محسوس کروانا تھا۔۔فائزہ نے ہاجرہ کے گود میں دھرے سفید ہاتھوں کو بغور دیکھا اور محبت سے بولیں۔۔

"ہاجرہ۔۔آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہیے گا۔۔جس حد تک ممکن ہوا میں

حاضر ہوں۔۔لیکن ہچکچا یئے گا مت۔۔۔اپنی بہن سمجھ لیجیے گا۔۔زوبا کا آپریشن ہو جائے تو ان شاء اللہ آپ کی بہت سی مشکلیں ایک ساتھ رفع ہو جائیں گی۔۔۔!"

ہاجرہ نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ایک نظر زمن کی ستے چہرے پہ ڈالی۔۔۔فائزہ سمجھ گئیں کہ ہاجرہ زمن کی وجہ سے بھی پریشان ہیں۔۔

"زمن ایک بات کہہ سکتی ہوں۔۔۔؟"

زمن ان کے طرز تخاطب پہ پہلے چونکی پھر شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔۔۔

"آنٹی آپ کو اجازت لینے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔۔۔ضرور کہیے۔۔۔میں سن رہی ہوں۔۔۔!"

"دیکھو بیٹا۔۔میں جانتی ہوں کہ یہ مشکل وقت ہے لیکن اس میں اگر عقل اور ہوش مندی سے کام نا لیا تو نقصان سب سے زیادہ تمہارا ہوگا۔۔وہ لڑکا شہزور تن تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا لیکن تھوڑی احتیاط تمہیں بھی رکھنی ہوگی بیٹا۔۔تم اپنی جاب کی طرف سے بلکل بے فکر ہو جاؤ۔۔۔ناشاپ کہیں جا رہی ہے نا جاب جائے گی۔۔۔تم بس زوبا کے آپریشن تک مال آنے سے گریز کرو۔۔مجھے تم لائبہ کی طرح عزیز ہو۔۔۔میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کسی بھی طرح کا نقصان ہو۔۔میری بھی ذمہ داری بن چکی ہو تم اب۔۔۔!"

اور زمن کا دل کیا دھاڑیں مار مار کر روئے۔۔ایک دن پہلے کوئی اسے کہتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔۔دوسروں پہ بوجھ نا بنے اور پھر کوئی اس سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس کی ذمہ داری بن چکی ہے،بے فکر ہو جائے۔۔۔کس کی سنے،کس کی بات پر عمل کرے۔۔۔عجیب کٹھ پتلی سی زندگی ہو گئی تھی۔۔۔وہ خود کیا تھی اس کی مرضی کیا تھی۔۔اسے کیا کرنا ہے،کہاں جانا ہے جیسے سب کچھ دوسروں کے ہاتھ میں جا چکا تھا اور پھر بھی اس سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔۔۔اس کا ذہن ڈھیر ساری منفی سوچوں کی آماجگاہ بن رہا تھا اور وہ ان سوچوں کو رفع کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔۔دل کرتا تھا کہ بھاڑ میں ڈالے سارے ڈر خوف اور کھل کر جئے۔۔۔جو ہوگا دیکھا جائے گا۔۔پھر دوسرے ہی پل اس کے اندر جیسے ساری طاقت اور ہمت نچڑ کر رہ جاتی۔۔۔اس کا دل بیٹھتا چلا جاتا۔۔وہ واپس بے بس اور لاچاری کی مورت بن جاتی تھی جو گہرے پانیوں میں ڈوب رہی تھی ہاتھ پیر

چلا رہی تھی مدد کے لیے پکار رہی تھی اور کسی سے بھی توقع کرتی تھی کہ کوئی بھی ہو لیکن اسے بچا لے۔۔۔ایک بار پھر دل میں باپ نا ہونے کا شکوہ سر سرایا اور دب گیا۔۔کس سے کہتی۔۔۔اس وقت جو حالت ان تینوں ماں بیٹی کی تھی وہ تینوں ہی اپنی جگہ پر وقت کے گھیرے میں تھیں۔۔تینوں الگ الگ جنگ لڑ رہی تھیں اور تنہا مقابلہ کر رہی تھیں۔۔۔وہ ماں سے نہی کہتی تھی کہ اس کی نظر میں ہاجرہ پہلے ہی شدید ذہنی اور قلبی خلفشار کا شکار رہیں انہیں مزید پریشانی میں مبتلا کرنا نا مناسب تھا۔۔ہاجرہ اس سے اپنی نہی کہہ رہی تھیں کہ وہ شہزور کا خوف دل میں دبائے بظاہر نارمل دکھتی تھی لیکن اندر سے وہ سہمی ہوئی تھی۔۔اوپر سے دربدری کا دکھ۔۔زوہا کے آپریشن کی فکر۔۔۔دونوں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے دکھ سے بچاتی اپنی اپنی لڑائی لڑتی نڈھال ہو رہی تھیں لیکن کہہ نہی پا رہی تھیں۔۔فائزہ خا کوانی اسے بہت سے دلاسے اور تسلیاں دے رہی تھیں جنہیں وہ بلکل خاموشی سے سن رہی تھی۔۔۔اسے لگتا تھا جیسے اب وہ سب کی سننے کے لیے ہی رہ گئی ہے۔۔اس کی اپنی کوئی رائے، کوئی مرضی، کوئی چاہت نہی ہے۔۔مجبوریوں نے اسے بری طرح زیر کیا تھا۔۔۔ہاجرہ اس کی حالت سمجھتی تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اس وقت ان لوگوں پہ بھروسہ کیے بغیر چارہ نہیں۔۔!

لائبہ چائے اور سنیکس سے بھری ٹرالی لیے وہاں چلی آئی۔۔زمن کے برابر میں بیٹھتے وہ اسے چائے کا مگ پکڑاتی اصرار سے سب کچھ کھلاتی رہی۔۔۔وہ بھی اس کا دل رکھنے کو تھوڑا بہت لیتی رہی تھی لیکن بھوک جیسے مر ہی گئی تھی۔۔۔ہاجرہ کو فائزہ بلکل لائبہ والے انداز میں کھلا رہی تھیں۔۔زمن کو احساس ہوا کہ دونوں ماں بیٹی بے حد بے لوث ہیں اور بغیر کسی صلے کی تمنا کیے مدد کرنے کو بے چین رہتی ہیں۔۔فائزہ، ہاجرہ سے زوہا کے متعلق دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھیں جب لائبہ نے زمن کے کان کے قریب ہو کر سرگوشیانہ کہا۔

"زمن ایک بات پوچھوں۔۔؟"""

زمن نے سینڈوچ کا چھوٹا سا نوالہ لیتے ہوئے اس پر استفہامیہ نگاہ ڈالی۔۔۔

"دیکھو میری بات کو غلط نا سمجھنا۔۔وقت آنے پہ میں اپنے سوال کا مقصد تمہیں واضح کر دوں گی لیکن

ابھی بس جاننا چاہتی ہوں کہ یہ شہزور نامی جو بندہ ہے اس سے کتنا عرصہ پہلے روبرو ملاقات ہوئی ہے۔۔؟"

زمن کے حلق میں سینڈوچ اٹک گیا۔۔اس نے فوراً چائے کا گھونٹ بھرا جو گرم ہونے کی وجہ سے اس کا حلق جلا گئی تھی لیکن اس پل اس کے دل کے سڑن ہر دوسری جلن پہ حاوی تھی۔۔۔اس نے لائبہ کو دیکھتے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار بھلا کب اس نے شہزور کو روبرو دیکھا تھا۔۔۔جب وہ دسویں جماعت میں تھی تب وہ انہیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ان کے گھر آ گیا تھا۔۔کچن کے جالی والے دروازے سے اس نے اسے اور شہزور نے زمن کو دیکھا تھا۔۔وہ نگاہ اس قدر جاندار تھی کہ اسے لگا تھا بیچ میں یہ جالی والا دروازہ حائل ہی نا ہو جیسے۔۔تب وہ ہاجرہ کو کہہ گیا تھا کہ بہت جلد اماں ابا کو لائے گا اور اپنی امانت لے جائے گا۔۔وہ لوگ ایک ہفتے کے اندر مکان چھوڑ گئے تھے۔۔جب جب اس نے اچانک سے انہیں ڈھونڈ نکالا تھا تو کبھی کبھار ساتھ والوں کی چھت پہ چھپے ہوئے۔۔۔کبھی عین اس کے پہنچنے سے پہلے رباب آنٹی کے ساتھ گھر چھوڑتے ہوئے گاڑی کے پچھلے شیشے سے اسے چھپ کے دیکھتے ہوئے جب وہ اپنی لینڈ کروزر سے اترتا ان کے ابھی ابھی چھوڑے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوتا تھا۔۔آڈیٹوریم میں بے حد قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہوتے ہوئے۔۔اس کے علاوہ تو بچپن کی یادیں تھیں۔۔بہت گہری چھاپ تھی ان کی اس کے دل و دماغ پر۔۔۔ہر ہر یاد اسے ازبر تھی جب جب وہ اور شہزور روبرو ہوئے تھے۔۔۔ذہن کے کسی گمشدہ گوشے سے آوازیں اٹھ رہی تھیں۔۔

" جلدی سے نوٹ بک رکھ دو زم۔۔۔تمہارا ٹیسٹ شروع ہونے لگا ہے۔۔!" وہ اسے کسی استاد کی سی سختی لیے لہجے میں کہہ رہا تھا۔۔۔وہ اپنا نچلا ہونٹ لٹکائے جواباً بولی۔۔

" بس ایک بار اور دیکھ لوں۔۔بس لاسٹ ٹائم۔۔!"

"نہیں۔۔۔بند کرو کاپی۔۔لکھو جلدی سے۔۔۔!"

اور وہ منہ بسورتی ٹو کا ٹیبل لکھنا شروع کرتی۔۔سامنے وہ مزے سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ رول کر کے اسٹک سی بنائے بیٹھ جاتا اور کڑی نگاہوں سے اسے لکھتا دیکھتا رہتا۔۔۔وہ کنفیوز سی ہوتی لکھتی جاتی اور جب یاد نا آتا تو رونے لگتی۔۔وہ پشت پہ ہاتھ باندھے کاغذی چھڑی

پکڑے اس کے پاس آتا اور ہنکارا بھرتے ہوئے کہتا۔۔

"بھول گئی ہو نا۔۔کتنی کمزور عقل ہے تمہاری۔۔ہزار باری یاد کیا ہے تم نے ٹو کا ٹیبل لیکن جب لکھتی ہو بھول جاتی ہو۔۔مجھے دیکھو فر فر آتا ہے۔۔۔پورے ٹو ویلو آتے ہیں مجھے۔۔۔نکمی ہو بلکل۔۔!"

اور وہ اسے کہہ نہیں پاتی تھی کہ تم تو بڑے ہو مجھ سے تمہارا دماغ بھی بڑا ہے اس لیے آتے ہیں۔۔میرا قد ابھی چھوٹا ہے نا تو عقل بھی چھوٹی ہے اور ٹو کا ٹیبل اتنا بڑا ہوتا ہے لیکن مجھے اگلے سال آرام سے یاد ہو جائے گا جب میرا قد اور عقل لمبی ہو جائے گی۔۔۔

یہ وہ معصوم سوچیں ہوتی تھیں جو اس جن سے وہ نہیں کہتی تھی لیکن اس کے اندر بھاگ دوڑ لگی ہوتی تھی۔۔وہ اسے ہاتھ آگے کرنے کو کہتا تو وہ اپنی گلابی چھوٹی سی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دیتی۔۔آنکھیں میچ لیتی اور جب وہ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولتی تو شہزور اسے بڑی محویت سے دیکھ رہا ہوتا تھا۔۔

"تمہاری پلکیں نقلی ہیں نا زم۔۔میری سکول کی ٹیچر لگاتی ہیں آنکھوں پہ جب کوئی فنکشن ہوتا ہے۔۔اتنی ی ی ی لمبی لمبی۔۔۔!" وہ شوق کے عالم میں انہیں چھونے لگتا تو وہ فوراً کاپی چھوڑ کے بھاگ لیتی۔۔۔کتنی ہی یادیں ذہن کی سلیٹ پہ نقش تھیں لیکن وہ سب انجانے خوف میں لپٹی تھیں ان میں انسیت نہیں تھی نا لگاؤ۔۔۔!

لائبہ کی آواز اسے حال میں کھینچ لائی۔۔وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھتی چائے کا کپ اور سینڈوچ میز پہ رکھتی اٹھ کر تیز رفتاری سے وہاں سے چلی گئی۔۔لائبہ کی نگاہوں نے اس کے اوجھل ہوتے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔۔اس کے چہرے پہ تجسس ہلکورے لے رہا تھا۔۔کسی کا بھی ماضی اس انجان قبر کی طرح ہوتا ہے جس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بار ہی سہی دل کے کسی کونے میں یہ خیال ضرور ابھرتا ہے کہ بھلا مردے کی اندر کیا حالت ہوگی۔۔۔!

☆......☆......☆

ابھی پہلی محبت کے
بہت سے قرض باقی ہیں

ابھی پہلی مسافت کی

تھکن سے چور ہیں پاؤں

یہ بھر جائیں تو سوچیں گے

دوبارہ کب اجڑنا ہے۔۔۔

وہ حیات راؤ کے ساتھ ابھی ابھی زمینوں کا چکر لگا کر لوٹا تھا۔۔حویلی کے پچھلی جانب بنے اپنے ٹھنڈے کمرے میں فرش پہ بیٹھ کر صوفے سے ٹیک لگائے وہ نیم اندھیرے ماحول کا لطف اٹھا رہا تھا۔۔اسے آئے تین دن ہو گئے تھے اور چونکہ وہ کافی مہینوں بعد آیا تھا تو حالات اس کی سوچ سے کہیں زیادہ تبدیل ہو چکے تھے۔۔وہ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ اباجی آفتاب چاچا کو پسند نہی کرتے لیکن اس بار جو نفرت اور انتقامی رویہ وہ ان میں دیکھ رہا تھا اس نے اسے ٹھٹھکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔۔یہ سب تو عنقریب بہت بڑی تباہی کی جانب جا سکتا تھا۔۔ان کے رشتوں کا برسوں کا سانجھ ٹوٹ سکتا تھا۔حویلی کے مکینوں کے دل ایک دوسرے سے ہمیشگی بنیادوں پہ دور ہو سکتے تھے۔۔یہ تو اس کی ماں کی مصلحت اندیشی اور آفتاب چاچا کا ظرف تھا جو حالات سنبھلے ہوئے تھے ورنہ جو رویہ اس نے اپنے والد کا نوٹ کیا تھا وہ نظر انداز کرنے کا قابل نہی تھا۔سب سے بڑی خطرے کی گھنٹی قاسم کی صورت میں بج رہی تھی جس کے انداز اور لب و لہجے میں آفتاب چاچا کے لیے لحاظ کم ہو چکا تھا۔۔اس نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ اس سب کے پیچھے اس کے اپنے اباجی کی شہہ ہے ورنہ قاسم کی کیا مجال جو چوں بھی کرے۔۔۔زمینوں پہ لے جانے کا شور اباجی نے اس کے آنے کے اگلے دن ہی ڈال دیا تھا لیکن وہ آلکسی سے ٹالتا رہا تھا۔۔آج حیات زبردستی اس کے کمرے میں گھس کر اسے تیار کرا کے لے گیا تھا۔۔اسے معلوم تھا کہ اب اباجی بولے تو ان دونوں کی اگلی پچھلی پشتیں کھنگال دیں گے لہذا بہتری اسی میں تھی کہ شرافت سے زمینوں پہ چلا جائے۔۔۔حیات نہی چاہتا تھا کہ اتنے عرصے بعد وہ گاؤں آیا تھا تو اباجی کی ڈانٹ پھٹکار کا شکار ہو۔۔وہ اس کے نہانے دھونے اور تیار ہونے تک کمرے میں کرسی پہ بیٹھا رہا تھا اور اسے ساتھ لے کر ہی نکلا تھا۔۔حسنات کا بلکل دل نہی کرتا تھا زمین کے معاملات میں الجھنے کا لیکن شہاب الدین

کے غصے کا بھی اسے علم تھا اور اس وقت صورتحال یہ تھی کہ سکینہ بی بی اور حیات دونوں نے اسے منع کیا تھا شہاب الدین کی خلاف ورزی کرنے سے جب تک کہ کشور اور حیات کی شادی کی ڈیٹ فکس نہی ہو جاتی۔۔۔ پہلے ہی اس رشتے کے لیے منانے میں دانتوں پسینہ آچکا تھا اور شہاب الدین تو وہ انسان تھے جو ضد پہ آجائیں تو ڈولی بیٹھی بیٹی اتار لیں۔۔اس لیے حسنات کو ناچار اپنے مزاج کے برخلاف وہی سب کرنا پڑ رہا تھا جو عام حالات میں کرنا کبھی پسند نہی رہا تھا۔۔۔وہ سیدھا ڈیرے پہ گئے تھے اور وہاں سے شہاب الدین کے ساتھ دونوں بھائی جیپ میں بیٹھ کر زمینوں کی طرف نکل گئے تھے۔۔۔سارا رستہ حسنات یہی سوچتا رہا تھا بھلا اس سیر کا کیا مقصد ہے لیکن ایک جگہ پہنچ کر جب شہاب الدین نے جیپ رکوائی تو وہ وہاں پہلے سے موجود پٹواری اور قاسم کو دیکھ کر کچھ حیران ہوا تھا۔۔حیرت تو حیات کو بھی ہوئی تھی لیکن اس کے تاثرات نارمل رہے تھے۔۔۔شہاب الدین جیپ سے اتر گئے۔۔اصل اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس وقت وہ جہاں کھڑے تھے یہ ان کی زمین نہی تھی بلکہ یہ تمام اراضی چوہدری آفتاب کی تھی اور جس ٹکڑے پہ وہ کھڑے تھے یہ وہی تھا جس کے لیے شہاب الدین کی ضد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔حسنات کے ماتھے کے بل قاسم اچھے سے دیکھ چکا تھا اور اس کے ساتھ تو اسے بچپن سے خار تھی جسے نکالنے کا موقع وہ جانے نہی دیتا تھا۔۔

" ارے واہ تایا جی۔۔آج تو آپ کے پتروں کو بھی توفیق مل ہی گئی کہ پیو کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔۔۔چلو اسی بہانے اپنی نئی زمین بھی دیکھ لیں گے۔۔!" قاسم راؤ صاف چڑاتا ہوا دونوں بھائیوں کو نگاہوں میں تولتا کہہ رہا تھا۔حسنات کچھ جواباً کہتا کہ حیات نے اس کی کلائی مضبوطی سے جکڑ لی۔۔یہ اشارہ تھا خاموش رہنے کا۔۔۔حسنات نے بھائی کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں التجائیہ تنبیہہ موجود تھی۔۔۔وہ جیپ سے اتر کر پیدل چلتا ان لوگوں سے کچھ دور چلا گیا تھا۔۔۔یہاں گھنے درختوں کی ایک لمبی قطار تھی جنہیں دیکھ کر ہی دل خوش ہو جاتا تھا۔۔ان درختوں کے پچھلی طرف آفتاب چوہدری نے ڈیرے کی طرز پر دو کمرے ڈال رکھے تھے لیکن خود وہ بہت کم یہاں موجود ہوتے تھے۔۔حسنات چلتا ہوا وہیں آگیا اور ایک کھڑی چارپائی بچھا کر اس پہ نیم دراز ہو گیا۔۔ٹیوب ویل پہ موجود ایک کاما دور سے

دیکھ کر بھاگتا ہوا وہاں آیا اور اس کی خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔۔حسنات اسے واپس بھیجنا چاہتا تھا لیکن کچھ خیال آنے پر سوال پوچھ بیٹھا۔۔۔

"چاچا ایک بات تو بتاؤ۔۔؟"

"جی سرکار ایک سو ایک پوچھو۔۔۔!"

"یہ آفتاب چاچا کو پتا ہے کہ قاسم اور ابا جی ان کی زمینوں کا چکر لگاتے ہیں اور پیمائشیں کراتے پھر رہے ہیں۔۔۔؟"

اس کے سوال پر وہ کاما خاموش ہو گیا۔۔کیا جواب دیتا دونوں طرف سرکار تھے۔۔ایک کی بات دوسرے سے کیسے کہتا۔۔۔دونوں کا کھاتا تھا۔۔۔اس کی مسلسل خاموشی پر حسنات نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو اس بار لہجہ سخت تھا۔۔

"سرکار پتا ہے چوہدری جی کو۔۔۔لیکن وہ جی درویش بندے ہیں جی۔۔کہتے ہیں آنے دو نا اپنے دو میرا کیا اتار لیتے ہیں۔۔۔اس زمین پہ بنے گا تو وہی جو طے ہے۔۔کم از کم میری زندگی میں تو اس پہ دوسری کوئی اور شے نہی بن سکتی۔۔۔!"

اور اس کا جوب سن کر حسنات پہلے سے زیادہ فکرمند ہو گیا تھا۔۔۔وہ اپنے باپ اور قاسم دونوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔۔وہ لوگ اپنی پہ آتے تو کچھ بھی کرتے اور اگر آفتاب چاچا انہیں ہلکے میں لے رہے تھے تو یہ ان کی انتہا درجے کی سادہ لوحی تھی۔۔۔وہ مزید بات کیے بنا واپس اٹھ آیا۔۔۔قریب آتے وہ قاسم اور ابا جی کو بغور دیکھ رہا تھا۔۔۔وہ دونوں جس طرح ہاتھوں میں نقشوں کے بنڈل پکڑے ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے یہ معمولی نوعیت نہی تھی۔۔۔حیات قریب ہی لاپرواہ سا کھڑا پٹواری کی بے تکی باتیں سن رہا تھا جسے قاسم نے پہلے سے بلا رکھا تھا۔۔۔حسنات کو یکدم گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔۔۔باقی کا تمام وقت اس نے بمشکل وہاں کھڑے رہ کر کاٹا تھا اور پھر یہاں سے ابا جی کی نا ختم ہونے والی اراضی کا چکر لگاتے باغوں کے پھل دیکھتے ٹھونکتے شام ہو گئی تھی۔۔۔واپسی پہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔۔حیات اسے مکمل نوٹس کر رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیسی پکڑ دھکڑ چل رہی ہے۔۔حویلی واپس پہنچ کر حسنات کسی سے ملے بنا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔۔تب سے وہ یونہی بیٹھا اپنا

دماغ سوچ سوچ کر شل کیے جا رہا تھا کہ اباجی اور قاسم کا لالچ ان کے خاندان کو کس تباہی کی جانب لے جا رہا تھا۔۔اسے یہ بات بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی کہ اماں اور حیات بھائی محض رشتہ کرنے کی خاطر اباجی کو اس زمین کا لارا دیے رکھیں اور بعد میں جب وہ زمین نا ملی اور نا ہی کشور کے حصے میں آئی تب کیا ہو گا۔؟ کیا اباجی اتنی سیدھی کھیر تھے۔۔؟؟ حیات بھائی اور اماں کو یہ معاملہ بالکل شفاف رکھنا چاہیے ورنہ آنے والے وقت میں سب سے زیادہ مشکلات کشور کو اٹھانی پڑ سکتی تھیں۔۔۔دوسری جانب وہ اس بات پہ بھی متاسف اور حیران تھا کہ اباجی کو آفتاب چاچا سے عداوت اس حد تک ہے کہ وہ اتنے دھڑلے سے ان ہی کی زمین کے لیے نقشے تیار کیے بیٹھے ہیں، پٹواری لے جا جا کر وہاں پیمائشیں کروائی جا رہی ہیں۔۔حالانکہ وہ زمین آفتاب چاچا کی تھی اور پکے کاغذوں پر تھی۔۔تو کیا وہ انہیں کیڑے مکوڑے کی حیثیت دیتے ہیں کہ جب راہ میں آئیں گے مسل تو دیں گے لیکن راہ بدلیں گے نہیں۔۔۔!

اس زمین کی خاصیت یہ تھی کہ بڑی سڑک کو لگتی تھی جو شہر کی جانب جاتی تھی۔۔۔زرخیز تو تھی ہی لیکن اصل بات یہ تھی کہ موقعے کی جگہ تھی۔۔چوہدری شہاب الدین اور قاسم کا گٹھ جوڑ ہو چکا تھا کہ یہاں ہوٹل بنایا جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔۔ہر ٹرک، ہر لاری یہیں سے ہو کر گزرتی تھی۔۔لیکن یہ بات ابھی تک تایا بھتیجے کے درمیان تھی۔۔۔حیات اور حسنات کو محض اتنا پتا تھا کہ آفتاب چاچا کی یہ زمین اباجی ہتھیانا چاہتے ہیں اور آفتاب چاچا کسی صورت پیچھے یہ ہاتھ دھرنے نہیں دے رہے۔۔کشور سے رشتہ بھی اسی شرط پہ کیا جا رہا تھا کہ حیات ہر صورت آنے والے وقت میں یہ زمین حاصل کرے گا۔

سوچ سوچ کر اس کا سر دکھنے لگا تھا۔۔وہ جلد از جلد یہ سارا معاملہ آفتاب چاچا کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ آفتاب چاچا اس مسئلے کو اتنا ہلکا لیں کیونکہ اپنے باپ اور قاسم کی سرشت سے وہ بخوبی واقف تھا۔۔اور اسے جلد از جلد اماں اور حیات بھائی سے بھی بات کرنی تھی کہ مستقبل کا کوئی رشتہ شرطوں کی بنیاد پہ طے نا کریں۔۔شرط رشتے کی وہ دراڑ ہے جو کسی بھی تعلق کے سرے سے شروع ہوتی ہے اور جڑ تک جاتے اسے کئی ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔۔۔پھر اس وقت حد سے زیادہ محبت حد سے زیادہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔۔۔اور شیشہ کتنا ہی خوبصورت ہو ٹوٹنے کے بعد خنجر بن جاتا ہے۔۔۔!

☆......☆......☆

حویلی لکھاں چاروں جانب سے درختوں سے گھری تھی جو اپنے آپ میں الگ ہی چھب دکھاتے تھے لیکن حویلی کے اندر بھی چاروں حویلیوں کے پچھلی جانب ایک وسیع رقبے کو باغ کی شکل دی گئی تھی۔۔ یہ شوق بھی حسنات کا تھا۔۔ اسے پھول پودوں سے بے حد محبت تھی۔۔ وہ شہر سے باقاعدہ بخشو چاچا کو پیغام بھیجا کرتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے پیڑ پودوں کا خیال رکھیں۔۔۔ اور ان دونوں بھائیوں کا کوئی بھی کام بخشو کے سر ماتھے پہ ہوتا تھا۔۔ اب جبکہ وہ چھٹیوں پہ آیا ہوا تھا تو وہ خود دن کے جس بھی حصے میں فرصت پاتا تھا وہاں آجاتا تھا۔۔۔ درختوں کے جھنڈ میں نیم خنک اور مدھم روشنی والا مدہوش کن ماحول جس میں پھولوں کی باس شامل ہوتی تھی کسی بھی باذوق کو اس جگہ کے عشق میں مبتلا کر سکتا تھا۔۔ یہاں ایک طرف رابی اور خانم نے جھولا ڈال رکھا تھا۔۔ خانم کو یہ جگہ بے حد پسند تھی جبکہ رابی کو لگتا تھا جیسے وہ جنگل میں نکل آئی ہو۔۔ یا اسے کسی نے درختوں کی بھول بھلیوں میں بند کر دیا ہو۔۔ وہ صرف خانم کا دل راضی کرنے کے لیے یہاں اس کے ساتھ آتی تھی۔۔ آج کل حسنات کی موجودگی میں دونوں ہی یہاں کا رخ نہیں کر رہی تھیں کیونکہ حسنات کو اپنے باغ میں ان کھلنڈریوں کا آنا کچھ خاص بھاتا نہیں تھا۔۔ وہ ان کا جھولا بھی محض اس لیے برداشت کرتا تھا کیونکہ اس کے لیے اسے سکینہ بی بی اور حیات کی جانب سے سخت حکم تھا۔۔ ڈھلتی شام کا سماں تھا اور فضا قدرے خوشگوار تھی۔۔ گرمی کا زور ٹوٹا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی ہوا اپنے ساتھ پھولوں کی مہک اڑائے پھر رہی تھی۔۔ اذانیں ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا جب سرمئی مٹیالی سی چادر اوڑھے چہرے کو آدھے سے زیادہ ڈھانپے سنہری بلی کی چاپ سے چلتی وہاں پہنچی تھی۔۔۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر اس نے چند گہرے سانس لیے تھے۔۔ چہرے کی سفید رنگت اندرونی جوش سے تمتما رہی تھی۔۔۔ بنا پلکوں والی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چادر کی اوٹ سے سارے منظر کا زیرک نگاہی سے جائزہ لے رہی تھیں۔۔۔ اس کا تنفس مسلسل پھولا ہوا تھا کیونکہ خوف اور جوش بیک وقت اس کے اعصاب پہ سوار تھے۔۔۔ اس نے دھیمی چال سے چند منٹ لیے تھے ادھر سے ادھر چکر لگانے میں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں اس وقت کوئی نہیں اور نہ کوئی آئے گا تب وہ مڑی اور ایک موٹے تنے والے درخت کی جڑ میں پیروں کے

بل بیٹھ گئی۔۔اس کی مٹھی میں ایک چھوٹا سا چاقو دبا ہوا تھا جس کی مدد سے اس نے تیزی کے ساتھ زمین کھودنی شروع کی۔۔وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی گاہے بگاہے پلٹ کے پیچھے بھی دیکھ لیتی تھی۔۔تھوڑی گہری کرنے کے بعد اس نے چادر کے پلو کو لگی ایک گرہ کھولی اور میلا سا تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔۔اسے ہونٹوں سے لگانے کے بعد ماتھے سے لگایا اور اس گھڑے میں دبا کر اوپر سے مٹی ڈالنے لگی۔۔اس کا سارا وجود پسینے میں بھیگ چکا تھا اور وہ بے حد مطمئین سی کام مکمل کر کے کھڑی ہوئی، ہاتھ جھاڑے۔۔اس سے پہلے وہ واپس ہوتی یکدم درختوں کی اوٹ سے حسنات باہر نکلا تھا اور سنہری کا سارا خون نچڑ کر جیسے پیروں میں چلا گیا تھا۔۔وہ ہکا بکا سی اس کی شکل دیکھ رہی تھی جو انتہائی تلخ تاثرات لیے قدم بہ قدم اس کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔۔ایک پل کو سنہری کا دل کیا بھاگ جائے لیکن فوراہی اس کی ازلی ہٹ دھرمی اس ہی آنکھوں میں عود کر آئی تھی اور وہ سینے پہ دونوں بازو لپیٹے پورے اعتماد سے پاس آتے حسنات کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے دیکھنے لگی۔۔ہونٹوں پہ ایسی مسکراہٹ تھی جسے حسنات کم از کم اچھی لڑکیوں کی مسکراہٹ نہی کہہ سکتا تھا۔۔حسنات اس سے چند قدم کی دوری پہ رک گیا۔۔اس نے اسے بغور دیکھا اور پھر اس جگہ کو دیکھا جو ابھی ابھی کھود کے واپس بھری گئی تھی۔۔

"کیا دبایا ہے یہاں۔۔۔؟" دوٹوک ہموار لہجہ۔۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔۔!" سنہری نے محض بہانہ گھڑنے کے لیے بے تکی بات میں الجھایا۔۔

"یہی سوال مجھے تم سے کرنا چاہیے بی بی کہ تم ہوتی کون ہو میرے باغ میں گھس کر مٹیاں کھودنے والی۔۔یہ میری حویلی ہے جہاں تم کھڑی ہو۔۔مہمان ہو اس لیے لحاظ کر رہا ہوں ورنہ جس دن کا آیا ہوں تمہاری مشکوک حرکتیں دیکھ رہا ہوں۔۔باقی سب کرتے ہوں گے برداشت لیکن میں نا تو اتنا با مروت ہوں نا اتنا عالی ظرف اس لیے جو چار دن یہاں ہو نا سکون سے چاچی حمیدہ کی حویلی میں گزارو، ورنہ سب حویلی والوں کو اکٹھا کر کے زلیل کرواؤں گا سمجھی۔۔۔!"

اتنا بے مروت لہجہ ایسی بدلحاظی۔۔سنہری حق دق سی حسنات کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں اس کے لیے حقارت ہلکورے لے رہی تھی۔۔۔اس کے تن بدن میں ایسی آگ لگی تھی کہ جی چاہ رہا تھا

حویلی کی ہر شے کو جلا کر بھسم کر دے۔۔۔بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔۔۔

”کر کے دیکھ لو۔۔ہمت ہے تو لگاؤ ہاتھ لے چلو حویلی والوں کے پاس۔۔۔!“

وہ اسے ایسی جتاتی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے دعوت دے رہی ہو۔۔حنات بلکل سپاٹ چہرہ لیے اسے گھورتا رہا اور پھر اچانک سے وہ آگے بڑھا اور سنہری کو کچھ بھی سوچنے سمجھنے یا کہنے سننے کا موقع دیے بنا اس کی ہی چادر کا پلو پکڑ کر اس کے سر کے گرد اس انداز میں لپیٹ ڈالا جیسے چور کو پکڑنے کے لیے اچانک سے اس پہ بوری ڈالی جاتی ہے۔۔۔سنہری کا پورا دھڑ اس چادر میں لپٹا مچلنے لگا۔۔۔یہ اس کی توقع سے بلکل الٹ تھا۔۔وہ ایسی کسی بات کا حنات کی جانب سے تصور بھی نہی کر سکتی تھی۔۔۔حنات طیش زدہ چہرے کے ساتھ اس کا چہرہ لپیٹنے کے بعد چادر ہی کا کونہ تھام کر اسے گھسیٹتا ہوا حویلی کے اندر لے جانے لگا۔۔سنہری کے ہاتھوں کے توتے صحیح معنوں میں اڑے تھے۔۔اسے یقین ہو گیا تھا کہ حنات اسے سب کے بیچ میں ایسے ہی لے جا کر پٹخ دے گا اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا بنا لگی لپٹی سب کو کہہ سنائے گا۔۔وہ نہی چاہتی تھی کہ اس کی شکایت پر کوئی بھی یہاں آ کر اس کی دبائی ہوئی چیز کے بارے میں جان جائے۔۔۔اس نے بروقت خود کو زمین پہ گرا لیا اور بری طرح سے ہاتھ پیر چلانے لگی۔۔۔

”چھوڑو مجھے۔۔چھوڑو۔۔۔میں نے گلہری کا بچہ دفنایا ہے وہاں اور کچھ نہی کیا۔۔۔چھوڑ مجھے حنات۔۔۔!“

وہ تقریباً کچے فرش پہ لیٹ چکی تھی اور اس کی گھٹی گھٹی اشتعال میں ڈوبی آواز چادر کے اندر سے حنات کو صاف سنائی دے رہی تھی۔۔حنات نے اسے چھوڑا اور یونہی اسے لیٹا ہاتھ پیر چلاتا چھوڑ کر سرعت سے اسی درخت کے پاس گیا۔۔سنہری جس چاقو کی مدد سے مٹی کھود رہی تھی وہ وہیں پڑا تھا اس نے جلدی سے اسی کے ساتھ واپس کھودنا شروع کیا۔۔۔زیادہ گہرا تو تھا نہی اس لیے کاغذ جلد ہی ابھر آیا۔۔اس نے وہ کاغذ جھپٹ کے نکالا اور جیب میں ڈال کر فوراً سنہری کے پاس آیا۔۔۔وہ ابھی تک ویسے ہی پڑی تھی۔۔۔حسنات نے نیچے جھک کر اس کی چادر کو ایک طرف سے ڈھیلا کیا جس کے ساتھ ہی سنہری کا چہرہ نمودار ہوا جو بری طرح سرخ پڑا ہوا تھا۔۔لمبے لمبے سانس لیتی اور ہاتھوں کو جھلا کر چہرے

پہ ہوا دیتی وہ حسنات کو انتہائی زہر لگی۔۔۔

"چھچھوری حرکتوں کی مشین" دل میں اسے خطاب سے نواز کر وہ اس سے کچھ دور جا کھڑا ہوا۔۔۔

"ہو گئی تسلی یا ابھی زلیل ہونا ہے مزید۔۔۔؟"

سنہری نے اپنے اندر اٹھتے اشتعال کو چہرے پہ آنے سے حتی الامکان روکے رکھا اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ لاتی بولی۔۔

"تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی حسنات۔۔۔ بھلا کیسا مذاق تھا یہ۔۔کوئی اپنوں سے بھی ایسے برتاؤ کرتا ہے کیا۔۔۔؟"

" کون اپنا۔۔۔اور کیا مذاق۔۔۔تم ہو کون جس کے ساتھ میں مذاق کروں گا۔۔۔یہ سب تمہیں سمجھانے کے لیے کافی نہی کیا کہ حسنات راؤ کسی کے ساتھ مذاق نہیں کرتا۔۔۔مجھے چھپ کے وار کرنا نہیں پسند اور نا ہی شب خون مارنا۔۔۔!"

وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے انتہائی سرد لہجے میں بولا تو سنہری کی کنپٹیاں خفت سے سلگ اٹھیں۔۔۔اس قدر بے عزتی اور وہ بھی بلا جھجھک۔۔۔وہ کھڑی ہو کر کپڑے جھاڑتی اسے مسلسل گھورتی رہی لیکن حسنات کے کسی انداز میں لچک دکھائی نہیں دے رہی تھی اس کا بس چلتا تو ابھی کے ابھی اس لڑکی کو حویلی کی چار دیواری سے باہر پھنکوا دیتا۔۔۔سنہری کو بہتر لگا کہ اس وقت یہاں سے غائب ہو جائے کیونکہ ایک بات کا اندازہ تو اسے بخوبی ہو گیا تھا کہ حسنات راؤ خطرناک حد تک صاف گو اور بے مروت تھا۔۔۔اگر اس نے مزید اکڑ دکھائی تو اس بار وہ اسے اندر سب کے بیچ لے جا کر ہی چھٹے گا۔۔۔مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔۔۔وہ غصہ پیتی سر جھٹک کے اندر کی جانب بڑھنے لگی لیکن ایک اچٹتی نگاہ اسی درخت کی کھوہ میں ڈالنی نہیں بھولی تھی۔۔۔فاصلہ ہونے اور تاریکی بڑھ جانے کی وجہ سے اسے دکھائی نہی دیا کہ وہ جگہ دوبارہ کھودی جا چکی ہے لیکن اندر ہی اندر اسے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔۔۔اس نے حسنات کو انتہائی تنفر زدہ نظروں سے دیکھا اور منہ پھیر کر چل دی۔۔۔

(معاف تو نہی کروں گی میں کبھی بھی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔۔سنہری کے ساتھ ایسا سلوک تو

اچھوں اچھوں کو ہضم نہی ہوتا تم کس کھیت کی مولی ہو حنات راؤ۔۔ایک دن تمہیں ایسے ہی دھول ہوتے نا دیکھا تو سنہری نام نہیں میرا۔۔۔)

وہ دل میں عزم کرتی جتنے قدم حنات سے دور ہو رہی تھی اتنا ہی اس کا وجود بھانبڑ کی طرح چیخ رہا تھا۔۔حمیدہ چاچی کی حویلی کے برآمدے میں پہنچ کر ستون کی آڑ لے کر اس نے پلٹ کر کافی دور کھڑے حنات کو اپنی نگاہوں کی زد میں لیا اور تھوک دیا۔۔!

☆......☆......☆

وہ بہت جلدی میں اپنے کمرے میں آیا تھا۔۔اس نے وضو کر کے مغرب کی نماز ادا کی اور پھر وہیں جائے نماز پہ بیٹھ کر جیب سے وہ مٹیالا سا کاغذ نکالا۔۔وہ ہلکے اعتقاد کا بندہ نہی تھا لیکن جادو برحق ہے یہ بیشک مانتا تھا۔۔اور سنہری جیسی لڑکی جس کو دیکھتے ہی اس کی چھٹی حس نے الارم دیا تھا کہ اس سے بچو،اس کی ایسی حرکت پکڑے جانے کے بعد وہ بلاشبہ متجسس تھا کہ اس کاغذ میں کیا ہے۔۔اس نے معوذتین کا ورد کیا اور خود پہ دم کرنے کے بعد وہ کاغذ کھولا ۔۔اس کی بھنویں تعجب سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔۔وہ لکھائی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کچھ اندازہ نہی ہوا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔۔عجیب سے الفاظ تھے جو بے ترتیب تھے بس درمیان میں ایک دائرہ بنا تھا جس کے اندر کشور اور حیات کا نام واضح سمجھ آیا تھا۔۔ان دونوں کے ناموں کو کاٹا گیا تھا۔۔اسے ایک لمحہ بھی نہی لگا تھا یہ سمجھنے میں کہ یہ تعویذ نما شے کس مقصد کے لیے دبائی جا رہی تھی۔۔غم و غصے سے اس نے وہ کاغذ اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔۔کچھ دیر یونہی بیٹھ کر وہ خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اٹھا اور اس تعویذ کو تلف کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔۔ان کے پنڈ کو نہر لگتی تھی وہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ چل کر وہاں پہنچ جاتا۔۔اپنی حویلی کے مرکزی دروازے سے باہر نکل کر وہ گیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا جب اچانک سے رک گیا۔۔کچھ سوچتے ہوئے اس نے قاسم کی حویلی پر نگاہ جمائی اور پھر بے اختیار اس کے قدم اس طرف اٹھ گئے۔۔یہ معاملہ نہر میں بہا دینے والا نہیں تھا۔۔!

☆......☆......☆

"اے سنہری۔۔۔ پتر کچھ بتائے گی بھی یا نہی۔۔۔ کیوں لوہا ترا ما بنی ہوئی ہے۔۔ مجھے بھی خام خاہ کے ہول ڈال رہی ہے۔۔!"

حمیدہ زچ ہوتی پلنگ پہ بیٹھ گئ تھیں۔۔ جب سے سنہری کمرے میں آئ تھی لال بھبھوکی بنی پاگلوں کی طرح کمرے کا چکر کاٹتی تو کبھی پلنگ کی پائینتی بیٹھ کر آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس بھرتی گردن کو دائیں بائیں جھٹک کر کڑاکے نکالتی۔۔۔ یہ اس کے غصہ ضبط کرنے کا ایک انداز تھا جو وہ بہت کم آزماتی تھی کونکہ زیادہ تر تو وہ غصے کا فوری اظہار کرتی تھی، ضبط کرنے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔۔۔ حمیدہ پریشان ہوگئیں تھیں کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔۔۔ وہ اس کے منہ سے پانی کا گلاس لگا رہی تھیں تا کہ کچھ پر سکون ہو سکے لیکن سنہری ہونا ہی نہی چاہ رہی تھی۔۔۔ ہار کر حمیدہ اب بیٹھ گئ تھیں تھیں لیکن وہ جیسے قسم کھا کر کمرے میں آئ تھی کہ منہ نہی کھولنا۔۔۔

"اچھا اگر تُو نہی بتاتی نا تو میں جا رہی ہوں سکینہ بھرجائی کی حویلی پوچھنے کہ کس نے میری دھی کو کچھ کہا ہے۔۔۔ میں بھی تو دیکھوں نا میری یتیم یسیر بچی کو کس نے دکھ دیا ہے۔۔۔ رک ذرا۔۔!"

حمیدہ پلنگ سے اتریں اور دروازے کی جانب بڑھیں۔۔ یہاں سنہری کو انہیں روکنا پڑا وہ بھلا کیسے انہیں باہر جانے دیتی۔۔۔

"رک جا ماسی۔۔۔ ساہ لے ذرا۔۔۔ بیٹھ جا۔۔۔ بتاتی ہوں۔۔۔ پہلاں سنہری کا دماغ تو ٹھنڈا ہونے دے۔۔ بتاتی ہوں تجھے۔۔۔!"

"تمہیں اگر بتانے میں مشکل ہو رہی ہے تو میں حاضر ہوگیا ہوں۔۔!" دروازے پہ حسنات کی آواز ابھری تھی جسے سن کر دونوں نے گردنیں موڑ کر ایک ساتھ دیکھا تھا۔۔۔

"لے دس پتر۔۔۔ گھر تو تیرا اپنا ہے لیکن بندا منداُ لگتا ہے کڑیوں والے کمرے میں یوں منہ چک کے وڑ آئے تو۔۔۔!" حمیدہ کو حسنات کا یوں دندناتے ہوئے کمرے میں آنا ایک آنکھ نہی بھایا تھا سو جتائے بنا نہی رہ سکیں۔۔۔

"چاچی دروازہ کھلا نا ہوتا تو کبھی نا آتا اتنے ادب آداب تو مجھ میں ہیں۔۔۔ میری عادت سے

واقف نہیں کیا آپ کہ مجھے دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا بھی نہی پسند اور جو میرے معاملوں میں اڑائے اس کی ٹانگ جڑ سے اکھاڑ بھی دیتا ہوں۔۔!" وہ انتہائی سنجیدہ دونوں ہاتھ پُشت پہ باندھے کھڑا ہموار لہجے میں بول رہا تھا۔۔اس کے تیور دیکھ کر ایک پل کو سنہری کو جھرجھری سی آ گئی تھی۔۔لیکن اگلے ہی پل وہ آنکھوں میں بے انتہا چبھن لیے اسے گھور رہی تھی۔۔

"خیری صلا پتر۔کیسی باتیں کر رہا ہے۔۔کیا ہوا ہے تجھے۔۔کہیں تیرا جھگڑا میری پنیوی کے ساتھ تو نہی ہو گیا۔۔!" وہ بات کے آخر میں ہنس دیں۔۔انہیں کھٹک ہوئی جیسے سنہری حنات سے ہی منہ ماری کر کے یوں جلتی کڑھتی بیٹھی ہوئی ہے۔۔حنات کو فالتو باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہی لگا ویسے بھی اسے سنہری کو دیکھ کر عجیب الجھن سی ہو رہی تھی۔۔اس نے کرتے کی جیب سے وہ کاغذ نکالا اور حمیدہ چاچی کی طرف بڑھایا۔۔

"چاچی یہ دیکھیں۔۔یہ آپ کی پنیوی" اس نے لفظ پنیوی پہ زور دیا تھا" ہمارے باغ میں دبا رہی تھی۔۔میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا اور تھوڑی زبانی کلامی خاطر بھی کر دی تو یہ تن فن کرتی وہاں سے چلی آئی۔لیکن چاچی یہ بات ایسے ہی چھوڑ دینے والی نہیں ہے۔۔کون ہوتی ہے یہ جو ہماری حویلی کے کسی بھی مکین پہ تعویذ کروائے۔۔آپ کی پنیوی ہے بیٹی نہی جو اس کا لحاظ کروں۔۔میں بیشک کمزور عقیدے کا مالک نہی ہوں لیکن مجھے اس کی یہ حرکت اپنی جگہ پہ ہی اس قدر ناگوار گزری ہے کہ یہ شکر کرے میں نے اسے دو لگا نہی دیں۔۔مجھے نہی معلوم اس کے گندے پیچھے میں کیا چل رہا ہے لیکن چاچی اسے ایک بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ کشور آپا اور حیات بھائی کے راستے میں آنے کی کوشش کرنے کا سوچا بھی تو اس کا حویلی سے صفایا کر دوں گا۔۔ان کا رشتہ تڑوانا تو دور کی بات ہے۔۔!"

اور حمیدہ چاچی تو جیسے بُت ہی بن گئی تھی۔۔تعویذ کھلا ہوا ان کے چہرے کے سامنے تھا اور جس پہ کشور اور حیات کا نام وہ بھی پڑھ سکتی تھیں۔۔اتنا تو پڑھنا وہ جانتی ہی تھیں ،باقی کیا لکیروں کا گھول گھولا ہوا تھا وہ انہیں بھی پلے نہی پڑا تھا لیکن اچانک سے ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ضرور پڑے تھے۔۔سنہری سے ایسی جلد بازی کی امید نہی تھی اور اگر کیا بھی تھا تو کم از کم انہیں تو اعتماد میں لیتی محتاط

توڑ ہتی ۔۔۔لیکن یہ وقت نرمی دکھانے کا نہی تھا بلکہ صاف مکرنے کا تھا۔۔۔

" دیکھ حسنات ۔۔۔ بہتان نا لگا۔۔بن ماں باپ کی بچی ہے ۔۔۔گناہ چڑھے گا تیرے سر۔۔۔بھلا اسے کیا لگے کشور نگوڑی اور حیات کے رشتے سے ۔۔۔چاد دن نہی ہوئے اسے یہاں آئے اور تم لوگوں کو کھٹکنے بھی لگی وہ۔۔۔!"

" چاچی چار دن کی آئی کے بارے میں تو معلوم ہے آپ کو تو میں جو بچپن سے آپ کے سامنے کھیل کود کے بڑا ہوا ہوں کیا میری فطرت سے نا واقف ہیں آپ ۔۔۔مجھے کبھی کسی پہ الزام تراشیاں کرتے دیکھا ہے کیا۔۔؟؟؟ خیر مدعے پہ آئیں اور اسے باز رکھیں ورنہ اگلی بار یہ تمام معاملہ چاروں حویلیوں کے مکینوں کو صحن میں جمع کر کے سامنے رکھ دوں گا۔۔۔ابا کا غصہ تو آپ جانتی ہی ہیں اور کشور آپا ان کی ہونے والی نوہ ہیں اس لیے اسے کہیں دور رہے ان سے۔۔۔!"

وہ حمیدہ کے ہاتھ سے تعویذ جھپٹتا تن فن کرتا وہاں سے جا چکا تھا جبکہ حمیدہ کی پوری کوشش تھی کہ تعویذ ان کے ہاتھ میں ہی رہ جاتا۔۔۔وہ اپنا خالی ہاتھ دوسری ہتھیلی پہ مارتی غصے سے سنہری کی جانب مڑیں جہاں وہ اب سکون سے پلنگ پہ بیٹھی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔۔۔نیم باز آنکھوں سے حمیدہ کو دیکھتی ہوئی بولی۔۔

" ماسی تیرے سورے کتنی اوکھی اردو بولتے ہیں۔۔۔مدعا، مکین اور ہور ے کیا کیا۔۔۔!"

اتنی بڑی بات ہو گئی تھی اور اس کا سکون قابل دید تھا۔۔۔حمیدہ کو اس پہ بری طرح ابال آیا تھا۔۔جی چاہا کھینچ کے دو تھپڑ لگا دیں لیکن کیسے لگاتیں اپنی بھی مرضی شامل تھی تعویذ کرانے میں۔۔۔

" بک بک بند کر بیماری جوگی۔۔۔" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔۔۔" دیکھ سنہری مخول کا وقت نہی ہے۔۔۔امید تو یہی ہے حسنات کسی سے کچھ نہی کہے گا لیکن اب تُو دوبارہ یہ تعویذ شویذ کے چکروں میں نا پڑنا۔۔۔کھسماں نو کھائے کشور بھی اور اس کا رشتہ بھی ۔۔۔اس کی سات نسلیں بھی رَل (مِل) جائیں تب بھی حمیدہ کو دبا نہی سکتیں۔۔۔ہونے دے یہ رشتہ۔۔۔دیکھنا بھر اشہاب الدین کیسے دن میں تارے دکھاتا اس پورے ٹبر کو۔۔۔!"

وہ اس کے پہلو میں بیٹھتی تسلی سے اسے سمجھانا چاہتی تھیں لیکن سنہری کے اندر کیسا شیطان تھا اس سے تو وہ خود بھی پوری طرح واقف نہی تھی۔۔۔

" ماسی تیری مت ماری گئی ہے بس۔۔۔ ذرا صبر کر جا۔۔۔ یہ رشتہ تو ٹوٹے گا ہی ٹوٹے گا۔۔۔ لیکن اس حسنات کو بھی ایسی نکیل ڈالوں گی کہ ساری عمر پچھتائے گا کس سے آڑا لگایا ہے اس نے۔۔۔ دیکھتی جا تو بس۔۔۔!"

حمیدہ اسے لاچاری دیکھتی نفی میں سر ہلاتی رہی۔۔۔ وہ خود بھی ایسا چاہتی تھی لیکن عمر رسیدہ عورت تھی اندازہ تھا کہ خواری بھی اٹھانی پڑ سکتی ہے اور رشتے کی بات بڑوں کے درمیان ہونی بچوں کا کھیل نہی ہوتا۔۔۔ سنہری اپنی پُر حدت نگاہیں فرش پہ جمائے خود کو تصور میں اس حویلی پہ راج کرتا دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ جان چکی تھی کہ اس حویلی میں زور آور کون ہے کس کی مانی سنی جاتی ہے لیکن اس سنگھاسن تک پہنچنے کے لیے اسے صرف دو گردنیں چاہیئے تھیں۔۔۔ حیات اور حسنات۔۔۔!

☆......☆......☆

چوہدری شہاب الدین کے ڈیرے پہ رات کے اس وقت صرف دو لوگ موجود تھے۔۔۔ ایک وہ خود تو دوسرا قاسم۔۔۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ شام ہوتے ہی پنڈ کی فضا خوشگوار ہو جاتی تھی۔۔۔ پیڈسٹل فین قریب رکھا تھا لیکن اس وقت بند تھا۔۔۔ پیلے بلب کی مدقوق سی روشنی میں آمنے سامنے چارپائیوں پہ بیٹھے چوہدری شہاب الدین اور قاسم درمیان میں رکھی لکڑی کی خستہ تپائی پہ پڑے کاغذوں کے پلندے پہ سر جھکائے ہوئے تھے۔۔۔ دونوں کے چہرے اندرونی جوش اور ولولے کے زیر اثر تھے۔۔۔ ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور گردنوں میں تناؤ تھا۔۔۔

" تُو دیکھتا جا قاسم پتر کہ اس آفتابے کے ساتھ میں کرتا کیا ہوں۔۔۔ ایسا جال پھینکوں گا کہ پھڑ پھڑانے کی بھی مہلت نہی ملنی اسے۔۔۔ ایک تیر سے دو شکار تو سب کرتے ہیں ہوں گے تیرا تایا ایک تیر سے اس کے پورے ٹبر کا شکار کرے گا۔۔!"

کاغذات کی اچھی طرح تسلی کر کے وہ اب ٹانگیں چارپائی کے اوپر سمیٹ کر آرام دہ حالت میں

تکیے پہ کہنی جمائے نیم دراز ہو گئے تھے۔۔۔قاسم ان کی بات سننے کے بعد مسکرایا اور کاغذوں کو رول کرنے لگا۔۔۔

"تایا جی یہ حیات کا کشور سے ویاہ کیے بغیر بھی تو ہم یہ سب کر سکتے تھے نا۔۔۔یہ سیاپا گلے ضرور ڈالنا تھا۔۔۔!" اندر کی کسک تھی جو زبان پہ آگئی تھی۔۔۔اگر کشور اسے مل جاتی نا تو وارے نیارے ہو جاتے۔۔۔

"جھلا ہوا ہے۔۔۔اسے نکیل ڈالنے کے لیے یہ ضروری ہے۔۔۔پہلے ویاہ ہو گا پھر اس کی زمینیں لوں گا اور پھر انہی زمینوں میں سے کسی ایک کے نیچے دفن کروا دوں گا اسے۔۔۔یہ میرا خود سے اور تیرے مرے پیو سے وعدہ ہے۔۔۔!!"

سرسراتی آواز اور ماحول کی خامشی۔۔۔قاسم کے رونگٹے سے کھڑے ہو گئے۔۔۔

"مروانا ہے کیا۔۔۔؟" وہ بے چین ہو کر پوچھ بیٹھا۔۔۔

"آہو۔۔ہستی ہی مٹا دینی ہے اس کی۔۔۔اپنے ہاتھوں سے گولیاں اتاروں گا سینے میں اس کے۔۔بس موقع ہاتھ آنے دے۔۔۔!" شہاب الدین تھوڑا آگے ہو کر بولے۔

"تو ایسے ماریں نا تایا کہ سانپ تو مر جائے لیکن لاٹھی کا کسی کو سراغ بھی نا ملے۔۔۔!" وہ بھی تھوڑا آگے کو جھکا۔۔دونوں کے سروں کا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا۔۔۔

"کیسے۔۔۔؟اس کی گڈی (گاڑی) کا حادثہ کروا دیں گے۔۔۔!" خود ہی سوال کا جواب ساتھ تھی کیا

"نہی تایا جی۔۔۔پرانا طریقہ ہے۔۔۔نیا طریقہ بتاؤں۔۔۔؟؟؟"

شہاب الدین کی آنکھوں کی شیطانی چمک بڑھ گئی۔۔۔وہ ہمہ تن گوش ہوتے بھتیجے کے منہ سے کان جوڑ کر بیٹھ گئے۔۔۔جوں جوں قاسم بولتا جا رہا تھا شہاب الدین کا بس نہی چل رہا تھا کہ آن کی آن میں سب مک مکا ہو جائے۔۔۔جس کام کے ہونے کا اتنے دن انتظار کرنا تھا وہ دن چڑھتے ہی ہو جائے۔۔۔!

☆......☆......☆

کشور اور خانم باورچی خانے میں بیٹھیں ناشتہ کر رہی تھیں۔۔۔رقیہ تیل والے چولہے پر جلدی جلدی پراٹھے پکا رہی تھیں۔۔۔کچھ ہی دیر میں چوہدری آفتاب یہاں موجود ہوتے اور ان کے آنے سے

پہلے وہ ان کا ناشتہ تیار رکھتی تھیں۔۔۔خانم کے دسویں کے امتحان ہونے والے تھے اور آج کل سارا وقت کتابوں میں سر دیے رہتی تھی۔۔۔مطالعہ پاکستان کا رٹہ لگاتے ہوئے وہ بل بل کے پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے نوالے اچار کے ساتھ کھا رہی تھی۔۔۔رقیہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں پھر انہیں غصہ چڑھنے لگ گیا۔کشور فوراً اماں کے تیور بھانپ گئی اور اسے ٹہوکا دیتے ہوئے بولی۔۔

"خانم بند کرو کتاب۔۔۔سکون سے ناشتہ تو کرو۔۔۔اماں دیکھ رہی ہیں تمہیں۔۔۔!"

خانم نے کتاب کی اوٹ سے جھانکا۔۔ماں کی غصیلی نگاہوں کا جواب پھیلی ہوئی مسکراہٹ سے دیا اور کتاب کے صفحے کا کونا موڑ کر گود میں رکھ لی۔۔۔رقیہ نے واپس دھیان چولہے کی جانب مبذول کیا۔۔۔اتنے میں چوہدری آفتاب کے ساتھ حسنات آتا دکھائی دیا۔۔۔رقیہ فرطِ محبت سے اٹھنے لگیں لیکن وہ خود ہی سرعت سے آگے ہوا۔۔

"ناناں۔۔بیٹھیں رہیں چاچی۔۔۔!" ان کے آگے جھک کر پیار لیتے وہ کشور کے ساتھ والی خالی پیڑھی پہ بیٹھ گیا۔۔۔چوہدری آفتاب خانم کے برابر بیٹھ کر اپنی لاڈلی کا احوال پوچھنے لگے۔۔حسنات کشور کے کان میں جھکا۔۔

"کیسی ہو بھرجائی۔۔۔کبھی ہماری حویلی کو بھی رونق بخشو۔۔۔لوگ عید ہی کریں آپ کا چہرہ دیکھ کر۔۔۔!" اس کے شرارتاً کہنے پر کشور نے گھبرا کر پہلے باپ کو دیکھا اور پھر ماں کو جن کے ہونٹوں پہ دبی دبی مسکان بتا رہی تھی کہ وہ حسنات کی بات سن چکی ہیں لیکن انجان بن رہی تھیں۔۔۔کشور شرماتے ہوئے ناشتے پر جھک گئی۔۔۔حسنات نے بھرپور مسکراتے ہوئے اپنی توپ کا رخ خانم کی جانب کیا۔۔۔

"اے توتی۔۔۔لگا لیا رٹہ تم نے۔۔۔؟؟؟" اس کی پکار پہ خانم نے نروٹھے انداز میں اسے دیکھا۔۔۔نچلا ہونٹ تھوڑا سا لٹکائے ہوئے آنکھوں کو چندھی کیے وہ اسے گھور بھی رہی تھی۔۔۔رقیہ نے چنگیر میں پراٹھے رکھ کر چوہدری آفتاب اور حسنات دونوں کے سامنے رکھے اور اب کٹوریوں میں سالن ڈال رہی تھیں۔۔۔

"میرا ایک مشورہ ہے!" وہ نوالہ توڑتے ہوئے دوبارہ بولا۔۔"پرات میں پانی بھر و اور کتاب کو

چوبیس گھنٹے کے لیے اس میں بھگو دو۔۔۔دھیان رکھنا کہ صحن میں رکھنی ہے پرات۔۔۔ساری رات اس پہ اوس گرنی چاہیے۔۔۔صبح جب تم دیکھو گی تو اس پرات کے پانی میں کتاب گھل چکی ہو گی۔۔سارے الفاظ تیر رہے ہوں گے۔۔۔دھیان سے پہلے باب سے شروع کرنا اور آخری باب تک کے سب الفاظ ترتیب سے پیتی جانا۔۔تھوڑے بہت جو رہ جائیں وہ اس نکمی رابی کو بھی پلا دینا۔۔بس جی تم دونوں کو ٹاپ کرنے سے روک کوئی نہی سکتا۔۔۔!"

ناشتہ بھولے اس کی باتیں آنکھیں پھاڑے سنتی خانم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔

"پورے ضلع میں ٹاپ کروں گی نا حسنات بھائی۔۔۔؟"

"لو ضلع کی کیا اوقات صوبے کی بات کرو پری۔۔۔صوبے کی۔۔۔بس رابی سے کہنا دل بڑا رکھے وہ دوسرے نمبر پر ہی آسکے گی کیونکہ زیادہ باب تم نے جو چوس لینے ہیں۔۔!"

"کوئی بات نہی حسنات بھائی۔۔۔اس کا دل بہت بڑا ہے۔۔۔اسے تو اپنے پاس ہونے کی بھی امید نہی یہ تو پھر دوسری پوزیشن ہو گی۔۔۔!" جوش سے وہ پول کھول گئی تھی۔۔۔

"ائی شاباش اے۔۔۔بس پھر بسم اللہ کرو آج سے ہی۔۔۔!"

اس سے پہلے کہ خانم سچی مچی اٹھ کر کتابیں بھگونے چل دیتی۔۔۔چوہدری آفتاب کا قہقہہ گونجا اور اسے ٹھٹکنے پہ مجبور کر گیا۔۔ساتھ رقیہ اور کشور کی ہنسی بھی شامل تھی جبکہ حسنات مزے سے ناشتہ کر رہا تھا۔۔اس کی بے نیازی دیکھ کر خانم سمجھ گئی کہ اسے حسنات نے پھر بیوقوف بنا دیا۔۔وہ روہانسی ہوتی باپ سے مخاطب ہوئی۔۔

"ابا۔۔الو بنایا نا انہوں نے مجھے۔۔۔؟"

"بنی بنائی کو میں کیسے بنا سکتا ہوں پاگل۔۔۔تم تو ریڈی میڈ پیس ہو پری۔۔۔!"

چوہدری آفتاب نے بیٹی کے خوبصورت چہرے کی پیشانی چومتے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔"پتا تو ہے تجھے حسنات کا پھر بھی اس کی شرارت سمجھ نہی پاتی میری جھلی۔۔۔!"

خانم ناراض سی حسنات کو دیکھتی وہاں سے واک آؤٹ کرنے لگی جب حسنات نے اسے ایسی

نظروں سے دیکھا کہ وہ اٹھ بھی نا سکی۔۔۔کیا نہی تھا ان نگاہوں میں دھونس، مان، تنبیہہ۔۔۔وہ پیڑھی پہ جم سی گئی لیکن کچھ الگ سا بھی لگا۔۔۔عجیب سا۔۔۔!

" چاچی۔۔۔" حسنات ماحول کا رخ بدلنے کے لیے رقیہ سے مخاطب ہوا۔۔" آپ کب تک مٹی کے چولہے پہ کھانا بنائیں گی۔۔۔اب تو اماں بھی سلنڈر کی عادی ہو گئی ہیں۔۔۔دو چولہے اکھٹے چل جاتے ہیں گیس سے۔۔۔یقین مانیں بہت جلدی کام نبٹ جاتا ہے۔۔۔آپ بھی سلنڈر منگوا لیں شہر سے۔۔۔گیس آتے تو ہمارے پنڈ میں ابھی پانچ سات سال لگ جائیں گے۔۔۔!"

" اماں کو تو بہت ڈر لگتا ہے سلینڈر رسے۔۔۔کہتی ہیں ایسے لگتا ہے جیسے بم ہو۔۔۔!" کشور نے ماں کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

" میں تو خود کہہ چکا ہوں کہ تھوڑا دل بڑا کرو۔۔۔بھرجائی سے طریقہ سیکھ لو۔۔۔اس میں تو کوئی شک نہی کہ سہولت ہو جائے گی رقیہ تمہیں۔۔۔قدسیہ آپا کی طرف بھی سلنڈر رہی ہے بس ایک تم ہی ہو جو اب تک تیل والے چولہے سے جان کھپاتی ہو۔۔۔!" چوہدری آفتاب نے ناشتے سے فراغت کے بعد برتن پرے کرتے رسان سے بیوی سے کہا۔۔۔رقیہ اب ان کے سامنے چائے کا بھرا ہوا پیالہ رکھ رہی تھیں۔۔۔ناشتے کی چائے وہ ہمیشہ چینی کے پیالے میں پیتے تھے۔۔۔

" اور چاچی ایمانداری کی بات کہوں تو جیسے آپ سلنڈر والے چولہے سے ڈرتی ہیں نا ویسے ہی خطرناک یہ تیل والا چولہا بھی ہے۔۔بس فرق یہ ہے کہ آپ کا اس پر ہاتھ بیٹھا ہوا ہے ورنہ حادثہ چولہا تھوڑی دیکھتا ہے یہ تو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔۔۔!"

" ٹھیک کہہ رہا ہے حسنات پتر۔۔اللہ سولیاں کرے بس۔۔۔!"

خانم بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے کی ناراضی بھلائے ماں کو سلنڈر والے چولہے کے لیے منانے لگی کشور کی بھی دھیمی آواز شامل ہو گئی تو رقیہ زچ ہوتے ہوئے بولیں۔۔۔

" اچھا وئی۔۔۔دیکھ لیتے ہیں سلنڈر والے چولہے کو بھی۔۔۔پیچھے ہی پڑ گئی تم دونوں تو۔۔۔!"

انہوں نے دونوں بیٹیوں کو گھر کا۔۔ساتھ ہی حسنات کو دیکھتی ہوئی بولیں۔۔۔

"پتر اگلی واری جب آئے گا نا شہر سے تو لگوا لوں گی وہ والا چولہا۔۔۔اب اپنے پتر کی بات تو نہی ٹال سکتی میں۔۔۔لیکن اگلی واری۔۔!" انہوں نے سب کو تسلی دلانے کے بعد مہلت لی تھی جیسے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں۔۔

"بے فکر رہیں۔۔اب جب آیا تو ساتھ لیتا آؤں گا سامان سارا۔۔گاڑی میں لوڈ کروا دوں گا۔۔!" وہ پوری تیاری کیے ہوئے تھا۔۔چوہدری آفتاب مسکرا دیے۔۔۔وہ اس کی عادت جانتے تھے جب کچھ ٹھان لیتا تھا تو کرتا ہی کرتا تھا لیکن جلد باز نہی تھا۔۔۔

"دوبارہ کب چکر لگے گا پتر تیرا۔۔؟"" انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"ویسے تو ہو سکتا ہے لگ جائے ورنہ حیات بھائی کے ویاہ تک آؤں گا۔۔۔اور اماں کہہ رہی تھیں وہ دیر نہی کریں گی بس تین چار ماہ میں انہوں نے حیات بھائی کو کھونٹے سے باندھ دینا ہے۔۔۔!"

وہ بولا تو اس کے انداز پر چوہدری آفتاب اور رقیہ کھل کر ہنس دیے۔۔کشور نا محسوس طریقے سے وہاں سے اٹھ گئی جب کہ خانم کا اپنی آپا کی شادی کا ذکر سنتے ہی جوش سے چہرہ کھل اٹھا۔۔۔پھر کچھ سوچ کر منہ پھلاتی ہوئی حسنات سے مخاطب ہوئی۔۔

"ہونہہ یہ بھی کوئی مزہ ہوا ویسے۔۔نا آپا کی منگنی ہوئی نا سہیلیاں اکٹھی ہوئیں نا ہم نے گانے گائے۔۔پہلے منگنی ہو پھر کچھ عرصے کے بعد شادی ہو تو مزہ آتا ہے نا۔۔۔!"

"جھلی۔۔۔!" چوہدری آفتاب اس کی بات سن کر کھڑے ہوتے اس کے سر پر محبت سے چپت لگاتے ہوئے بولے اور کمرے کا رخ کیا۔۔انہیں اب زمینوں کی طرف نکلنا تھا۔۔۔رقیہ بھی شوہر کی ضرورت کے پیش نظر پیچھے ہی ہو لیں۔۔حسنات نے ان کو جاتا دیکھا تو پراٹھے کا نوالہ چائے کے پیالے میں ڈبو کے منہ تک لے جاتی خانم کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے منگنی کروانا پری۔۔۔!"

خانم نے نوالہ چباتے ہوئے بے دھیانی میں اثبات میں سر ہلایا۔۔حسنات کھڑا ہوا اور پھر رکوع کی شکل میں جھک کر گھٹنوں پہ ہاتھ دھرے بولا۔۔۔

"تمہارا یہ شوق لازمی پورا کرواؤں گا پری۔۔۔تمہاری منگنی ہو گی پھر شادی۔۔۔اس کے بیچ تم اپنے سارے شوق اور ارمان پورے کرنا۔۔!"

خانم نے چہرہ اونچا کیا اور حسنات کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔عجیب۔بہت عجیب تھا کچھ۔۔وہ نظریں جھکا گئی۔۔۔حسنات اس کی کیفیت کا مزہ لیتے ہوئے سیدھا ہوا اور باہر کی جانب قدم بڑھاتا ہوا بولا۔۔۔

"اب جس کا نصیب تم سے پھوٹے گا اسے بھی تو وقت دینا ہے نا تا کہ وہ بیچارہ سوچ بچار کر لے آخر ساری عمر کی خواری ہے کوئی مذاق تھوڑی ہے۔۔۔خانم پری۔۔!"

وہ اسے حسب معمول بری طرح چڑاتا وہاں سے جا چکا تھا جبکہ خانم کو ہمیشہ کی طرح تھوڑی سی دیر سے پلے پڑا کہ وہ کیا کہہ گیا تھا۔۔پیر ھی سی اٹھی اور پلٹی لیکن حسنات چھلاوہ تھا کب کا غائب ہو چکا تھا۔۔ناچار بیٹھ گئی اور اس کی باتوں پہ غور کرتی سوچنے لگی کہ کیا تھا حسنات کے رویے میں۔۔۔؟؟؟ کچھ عجیب۔بہت ہی عجیب۔۔۔!!!!

ناول گنوا کے دل و جاں ہم کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 9

زندگی کیوں نہ تجھے وجد میں لاؤں واپس
چاک پر کوزہ رکھوں، خاک بناؤں واپس
دل میں اک غیر مناسب سی تمنا جاگی
تجھ کو ناراض کروں، روز مناؤں واپس
وہ مرا نام نہ لے صرف پکارے تو سہی
کچھ بہانہ تو ملے، دوڑ کے آؤں واپس
وقت کا ہاتھ پکڑنے کی شرارت کر کے
اپنے ماضی کی طرف بھاگتا جاؤں واپس
دیکھ میں گردشِ ایام اٹھا لایا ہوں
اب بتا کون سے لمحے کو بلاؤں واپس
یہ زمیں گھومتی رہتی ہے فقط ایک ہی سمت
تو جو کہہ دے تو اسے آج گھماؤں واپس
تھا ترا حکم سو جنت سے زمیں پر آیا
ہو چکا تیرا تماشا تو میں جاؤں واپس

نذر حسین ناز

اس کے ہاتھ میں اس کا ٹکٹ اور پاسپورٹ تھا۔ ائیر پورٹ کے پسنجر ایریا کے بیچوں بیچ وہ کھڑا سپاٹ نگاہوں سے آتے جاتے مسافروں کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب کسی منظر کو نگاہ بھر کے نہیں دیکھتا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ جس عذاب میں مبتلا تھا اس کی روح تک کانٹوں پہ گھسیٹی جارہی تھی گویا۔ وہ ہر ہر طرح سے خود کو ماضی کے دھاگوں میں الجھنے سے بچائے ہوئے تھا لیکن ماضی گزر ضرور جاتا ہے پر کچھ خار ایسے رگوں میں پرو جاتا ہے جدھر سے انہیں نکالو تو بھیانک تکلیف دہ یادیں منہ زور خون کے ریلے کی مانند آن کی آن میں پورے جسم کو زردیوں میں دھکیل دیتی ہیں۔ اس نے بھی ان رگوں میں پیوست خاروں کو ان چھوا کر رکھا تھا تاکہ وہاں سے رستی یادیں اس کی شکستہ ہستی کو مزید تاراج نہ کر سکیں۔

ایک چھوٹا سا ٹریولنگ بیگ اس کی دائیں ٹانگ کے پاس پڑا تھا اور وہ خود ساکت سا بس سب کو بھاگتا دوڑتا محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے سارا شہر حرکت میں ہے سوائے اس کے۔ اس کے قدم جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اس ملک کو چھوڑ کر جانے کے لیے یہاں کھڑا تھا۔ کتنے دن؟ کتنے ماہ؟ یا کتنے سال؟ یہ نہیں معلوم تھا لیکن اسے فی الحال یہاں سے جانا ہی تھا۔ ماضی کا عفریت اس کا پتا تلاش کر چکا تھا اور وہ خوف زدہ تھا۔ بہت سا وقت گزر چکا تھا۔ وہ واپس جاتا تب بھی ازالے نہ ہو پاتے۔ کچھ غلطیوں کو توبہ کے باوجود ادھوری بخشش ملا کرتی ہے۔ معافی تو مل جاتی ہے لیکن قلق نہیں جایا کرتے۔ کفارے تو معلوم ہوتے ہیں لیکن ادا نہیں ہو پاتے۔ سزا پوری تو ہو جاتی ہے لیکن داغ نہیں دھلا کرتے۔

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل ٹٹولنے کی کوشش کی تو یاد آیا کہ وہ اسے دو دن پہلے سمندر برد کر چکا ہے۔ ایک آزردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی اور وہ جیب سے ہاتھ نکال کر گردن پیچھے ڈالے اعصاب کی تھکن اتارنے لگا۔ آنکھیں موند کر اس نے خود کو اس حالت میں ڈھیلا چھوڑ کر چند لمبے سانس لیے اور تب ہی لندن جانے والی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور جھک کر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے ایک جانب چل دیا۔ وہ اسی فلائٹ کا مسافر تھا۔ وہ پاکستان جانے سے بچنے کی خاطر کیلیفورنیا سے لندن جا رہا تھا۔

وقت بیت جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وقت سے زیادہ حیران کر دینے والی کوئی شے نہیں، یہ

بدل جائے تو سب بدل جاتا ہے۔رشتے، احساس، جذبات سب لپک کر نگل جاتا ہے یہ وقت!

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

☆......☆......☆

وہ تھکا تھکا سا حویلی میں داخل ہوا تھا۔دیوہیکل آہنی گیٹ سے لے کر پورچ تک جاتی ڈرائیو وے پر گاڑی ڈالتے ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ یہیں سے دوبارہ واپس ہولے اور اس خلش اور کسک کا ازالہ کیے بنا پلٹ کر نہ آئے جو اس کے دل کو بری طرح ادھیڑ رہی تھی۔لیکن اس کے اعصاب کو واقعی سکون اور راحت کی ضرورت تھی اور اس کے ذہن کو معاملے پہ مزید دسترس حاصل کرنے کے لیے یکسوئی کی۔

اس کی لینڈ کروزر کی دھول جیسے ہی ڈرائیو وے پہ اڑنی شروع ہوئی اندر حویلی میں ہلچل اپنے جوبن کو پہنچ گئی۔ملازمہ نے سنہری بیگم کو اطلاع کی اور جیسے بھونچال آ گیا۔سنہری بیگم بیٹے کے استقبال کے لیے داخلی دروازے پہ پورے کروفر کے ساتھ کھڑی دکھائی دیں۔بیٹے کے آنے کی خوشی ظاہری تھی۔اصل خوشی انہیں بیٹے کے خالی ہاتھ آنے کی تھی کیونکہ چوہدری شہروز راؤ کہہ گیا تھا ایک ہفتے سے پہلے نہیں لوٹوں گا اور اگر وہ دوسرے دن ہی لوٹ آیا تھا تو یقیناً خالی ہاتھ نامراد لوٹا تھا۔اسی بات نے سنہری بیگم میں جوش بھر دیا تھا۔جس کلموہی کی پرچھائی سے بھی وہ نفرت کرنا نہ چھوڑے، اسے حویلی کی شان بنانے چلا تھا اس کا لاڈلا اور اس لاڈلے کے لاڈ ساری عمر اسے مہنگے ہی پڑے تھے۔

شہروز گاڑی سے اتر کر بازو پہ لٹکایا کوٹ پاس کھڑے ملازم پر اچھال کر اندر کی جانب بڑھا جہاں سامنے ہی ماں کا خوشی سے تمتماتا چہرہ دیکھ کر اس کا جی مکدر ہو گیا۔لاشعوری طور پر اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔غصے کی شدید لہر اس کا پور پور بھگو گئی لیکن وہ بدقت ضبط کر گیا۔اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں اس کی ناکامی پہ خوش ہے اور یہی بات اس کے انتقام کو مزید ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔

"ماں صدقے جائے۔میرا چن آ گیا۔میری حویلی کا تارا، میرا شہزادہ پتر۔جا رکھی جلدی سے ملازم کو کہہ صدقے کا بکرا لائے۔میں اپنے پتر کا صدقہ اتاروں گی۔جا جلدی۔" پاس کھڑی ادھیڑ عمر ملازمہ سے کہہ کر انہوں نے شہروز کی طرف پیش قدمی کی۔شہروز بری طرح چڑ گیا۔

''کیا اماں۔ طبیعت ول (ٹھیک) نہیں لگ رہی تیری۔ یہ اوپرے لاڈ کیوں دکھا رہی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں بکرے کے صدقے کی، معلوم ہے تجھے میدان نہیں مار کر آسکا اس لیے اتنی خوش ہے تو لیکن فکر نہ کر، شیر اپنا شکار چھوڑ بھی دے تو چبا ضرور ڈالتا ہے۔ میں اسے اس بار تو نہیں لا سکا لیکن اگلی بار میرے ساتھ برابر میں کھڑی ہوگی وہ، تو اس وقت یہ صدقے کا بکرا منگوانا اماں!''

وہ لفظ لفظ چبا تا سنہری بیگم سے بولا تو وہ پھیکی پڑیں۔

یعنی بھوت اترا نہیں تیرے سر سے۔ چل کوئی نہیں...... دیکھتے ہیں کس کس کنویں میں بانس ڈلواتا ہے تو...... وہ دل میں کہتے ہوئے آگے بڑھیں اور شہروز کو سینے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

''پتر! کیوں ماں کو دشمن سمجھتا ہے۔ چل ٹھیک ہے میں راضی نہیں اس کو لانے میں لیکن لے آتا تو خوش ہوتی تیری خوشی میں۔ کیا میرے پتر کی خوشی میری خوشی نہیں۔ چل اب اندر...... تا (غصہ) نہ کھا، چل کر کھانا کھا۔'' وہ اس کے سامنے اپنے دل کی دباتے، اسے پچکارتے ہوئے بولیں تو شہروز کے ماتھے کے بل تھوڑے ڈھل گئے۔

''ابھی تو کمرے میں جاؤں گا اماں۔ آرام کرنا ہے مجھے۔ شام سے پہلے نہ اٹھانا۔ رات کے کھانے پہ ابا جی بھی ہوں تو ملاقات بھی ہو جائے گی اور بات ہو جائے گی۔ لیکن فی الحال مجھے کسی صورت مت تنگ کرنا اماں۔''

وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ ناک کی سیدھ میں گردن اکڑاتا اندر چلا گیا۔ سنہری اس کی پشت کو پرسوچ نگاہوں سے تکتی رہ گئیں۔ کامے اور دوسری ملازمائیں آتے جاتے کن اکھیوں سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک للکار سے سب کو تتر بتر کیا۔

''کیا دیکھ رہے ہو تم لوگ۔ گردنیں زیادہ ہی اٹھنے لگی ہیں مالکوں کی طرف۔ کٹوا ہی نہ دوں۔ اپنے دیدے اور دماغ کام میں لگاؤ سب۔ سمجھے...... دفع ہو یہاں سے سارے۔''

خود وہ فوراً اندر جا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ چوہدری قاسم کو پتر کے آنے کی اطلاع بھی تو دینی تھی۔

☆......☆......☆

شہریار نانی پیاری کو لے کر قریبی بیکری تک آیا تھا۔ نئی کھلی تھی اس لیے نانی کو شوق ہوا کہ خود اپنی مرضی کے بادام والے رس لائیں گی۔ ساتھ انہیں کیک پیسٹری کا بھی ہڑکا تھا۔ مہر یار زیادہ میٹھا کھانے نہیں دیتا تھا ورنہ نانی پیاری کا دیہاتی جثہ ہر دوسرے دن میٹھے کے لیے تڑپتا تھا۔ ادھر وہ دونوں بیکری میں داخل ہو کر شیشے کے ڈس پلے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دروازے پہ جانی پہچانی آوازوں کے شور نے شہریار کو یکدم پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ یاور، داور اور زارون ایک ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے اور دروازہ اتنا چوڑا نہیں تھا کہ تینوں ایک ساتھ گزر پاتے لیکن تینوں بضد تھے کہ پہلے وہی اندر جائے گا۔

شہریار کا دل کیا دو دو چپیڑیں لگا کر واپس بھیج دے کیونکہ ہمیشہ ایسی جگہوں پر ان کے ہاتھوں عزت کا فالودہ ضرور ہوتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ تینوں پرلے درجے کے ڈھیٹ اور بے شرم تھے۔ داور کو تو بچوں کی طرح روتے ہوئے فرش پہ ایڑیاں رگڑنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ارد گرد گزرتے لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ یہ اچھا بھلا پیارا سا نوجوان ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے نتیجتاً ان کی ہمدردیاں اس کی جانب جبکہ متاسف اور ملامتی نگاہیں شہریار کی جانب ہوتیں۔ جسے اللہ لوک کے جذبات کا پاس نہیں۔ اس گھڑی شہریار اس گھڑی کو کوستا کب وہ اس کے بھائی کے طور پر دنیا میں وارد ہوا تھا۔

وہ جھر جھری لے کر ان کی جانب بڑھا۔ ساتھ نانی کے کان میں پھسپھسانا نہیں بھولا۔

”نانی! جلدی کریں۔ وہ تینوں بھی آ گئے ہیں۔ اگر ان کی فرمائشیں زیادہ ہو گئیں تو آپ کے کیک پیسٹری رہ جائیں گے۔“

کہہ کر وہ ان کی جانب بڑھ گیا لیکن نانی خدا جانے کیا سمجھیں، فوراً خود بھی ان کی طرف لپکیں۔

”اوئے منڈیو! باز نہیں آئے نا تینوں۔ پیچھے پیچھے پہنچ گئے نا۔ چلو جلدی سے لو جو لینا ہے شہری کہہ رہا ہے جتنی فرمائشیں کرنی ہیں کر لو۔ چلو شاوا...... جلدی کرو۔“

شہری ہونق سا نانی پیاری کا منہ دیکھ رہا تھا جو عینک اتار کر چادر کے پلو سے رگڑتے ہوئے آنکھیں چندھی کیے انہیں بیکری آئٹمز پہ دوڑا رہی تھیں۔

”چل گرو، ہو جا شروع!“ سب سے پہلے زارون کی آواز ابھری۔

وہ بیکری کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ہرڈ سیلے کاؤنٹر کی طرف یوں بھاگ بھاگ کر آنے لگا جیسے کیرم بورڈ کی گوٹی کو ہٹ کیا گیا ہو۔ سیلز بوائے اسے حیرت اور ہوشیاری سے دیکھ رہے تھے مبادا کوئی ہاتھ دکھا جائے۔ داور نے نئی بیکری ہونے کی وجہ سے باری باری ہر چیز چکھنے کا کام شروع کیا۔

''یہ دکھایئے گا ذرا...... یہ ٹیسٹ کروادو بھائی۔ نہیں یہ والا۔ ہاں ساتھ والا پستہ فیلور بھی۔ اچھا اب یہ نان خطائی دکھانا ذرا۔ اور یہ بکلاوا ٹیسٹ کراؤ۔ اسے بھی چیک کرلوں ذرا۔''

سیلز بوائے اسے ہر آئٹم تھوڑا تھوڑا چیک کروا رہا تھا اور ساتھ ہی فکر مندی سے اس کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ داور کی دیکھا دیکھی زارون اور یاور کو بھی ایسی ہی سوجھی اور چند لمحوں میں بیکری میں ان بھکاریوں کی صدائیں بھی گونجنے لگی تھیں۔

''بھائی یہ والا...... اچھا ذرا وہ والا...... تھوڑا سا یہ نیچے والا بھی۔''

شہریار ان کی حرکتوں پہ پریشان ضرور ہو رہا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ نئی بیکری تھی اور اکثر بیکریاں ابتدائی دنوں میں فری ٹیسٹنگ کرواتی ہیں۔ لیکن یہاں جب تک نانی پیاری کچھ ضروری سامان لے کر فارغ ہوئیں تب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ بیکری کا کیم شحیم اونر جو کافی وقت سے اندر کہیں چھپا بیٹھا تھا وہ اب سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ شہریار کاؤنٹر پہ بل دینے جانے لگا تو داور کی آواز کان میں پڑی۔

''میرا تو دوپہر کا کھانا یہیں ہو گیا بھیا۔ ایسا لذیذ کھانا اللہ روز دے اور میں روز کھاؤں۔'' وہ دانت نکوستا پیٹ پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ زارون اور یاور کو اپنی ٹیسٹنگ میں کچھ کسر محسوس ہوئی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں مجھے ایک عدد کلب سینڈوچ چکھنے کے لیے کہنا چاہیے۔ بھلا مٹھائیوں، بسکٹوں سے پیٹ بھرتا ہے کیا۔'' یاور متاسف سا دوبارہ بیکری آئٹمز پہ نگاہیں دوڑانے لگا۔ شہریار پریشانی سے لپک کر ان کے قریب آیا اور غراتے ہوئے بولا۔

''میں تم تینوں کو ادھیڑ کر رکھ دوں گا جو مزید کسی چیز کو کھانے کی فرمائش کی تو۔ سارے زمانے کے چول ندیدے بن کر آ گئے ہو تینوں۔ جوتیاں مار کر نکالیں گے اب یہ......'' پلٹ کر ایک نظر کاؤنٹر پہ

ڈالی جہاں بیکری کا مالک خشمگیں نگاہوں سے انہی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''دعا کرو یہ جو کچھ تم لوگوں نے چکھنے کے نام پر ٹھونسا ہے نا، وہ بل میں نہ ڈال دیں۔ اب یہیں کھڑے مرے رہو...... سمجھے!''

وہ کہہ کر چلا گیا تو زارون نے عینک اتار کر ٹی شرٹ کا دامن اونچا کر کے اسے اچھے سے رگڑا۔

''میں ٹانگیں توڑ دوں گا ان کی۔'' یاور غرایا۔

''اونچا کہہ......'' زارون نے اکسایا۔

''سن لیں گے۔'' یاور دھیمی آواز میں بدبدایا تو زارون بھنویں سکوڑتا شہریار کو گھورتے ہوئے بولا۔

یہ تو ویسے واقعی زیادتی ہوگی شہری کے ساتھ۔ اس نے تو کچھ چکھا بھی نہیں حالانکہ دو بار اس کے منہ میں اپنے منہ کا نوالہ دینے کی کوشش کی لیکن رج کے بدید ہے۔ اب مفت میں بل بھرے گا بے چارہ۔''

''تو شہری بھیا جانیں اور ان کی جیب۔ اپن لوگ تو پتلی گلی سے نکل لیں گے۔'' داور نے ہنستے ہوئے یاور کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ دونوں کان میں پھسپھسانے لگے تو زارون چلتا ہوا کاؤنٹر پر آیا جہاں بیکری کا مالک بیٹھا تھا۔

''انکل جی! میں زارون۔ میرے گھر والے یو کے میں ہوتے ہیں۔ اور میں یہاں پڑھائی کے لیے اپنے کزنوں کے پاس ذلیل ہونے آیا ہوں۔ انکل جی! میرا یہ کزن بہت غریب ہے۔ اس نے جو شرٹ کے نیچے بنیان پہنی ہوئی ہے وہ پھٹی ہوئی ہے اور انڈر ویئر میرا چوری کیا ہوا ہے۔ یہ اتنا غریب ہے کہ یہ جو ہماری نانی پیاری ہیں ان کی آنکھ کا موتیا نکال کر اسے بیچ کر اپنے آخری سمیسٹر کی فیس دینے والا ہے۔ انکل جی، ہم نے جو بھی کھایا پیا ہے اسے معاف کر دیں۔'' وہ کہتا جا رہا تھا۔

شہریار جو دوسرے کاؤنٹر پر نانی پیاری کے ساتھ کھڑا تھا، حیران پریشان سا اس کے قریب آ گیا۔ نانی پیاری بھی متجسس سی وہیں آ کھڑی ہوئیں۔ زارون کی آنکھیں کسی بھی وقت برسنے کو بے تاب تھیں جو ابھی بھی اپنی اور اپنے کزنوں کی غربت کے دکھ سنا رہا تھا۔

''ابھی تین ہفتوں کی دن رات مارکٹائی کے بعد اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنا ایک گردہ

اسے نکال کر دے دوں۔ یہ نیا آئی فون لینا چاہتا ہے۔ سو چا دے دوں تا کہ اس کی خواہش پوری ہو سکے لیکن غربت اتنی ہے کہ شش و پنج میں ہے کہ پہلے فون لے یا ہیوی بائیک خریدنے کا خواب پورا کرے۔ بس انکل جی، آپ ہمیں کھایا پیا معاف کر دیں۔ ہم بہت غریب ہیں، بہت ہی زیادہ والے غریب۔''

زارون کی پیتا سن کر بیکری کے مالک نے اپنے اسی سیلز بوائے کو قریب بلا کر پوچھا جو بل بنا رہا تھا۔

''کیا کچھ کھا گئے ہیں یہ سارے؟''

''ہر آئٹم چکھنے سے زیادہ کھایا ہے انہوں نے سر۔''

''بل میں ڈالو......اور ہر چیز ڈالو۔''

''دیکھیں سر، آپ کے اسٹاف نے خود ٹیسٹنگ کروائی تھی۔ اس میں ہمارا کیا قصور۔'' شہریار تلملاتے ہوئے بولا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا زارون کو یہیں بیک ہونے کے لیے چھوڑ جائے جو اپنے تئیں بھرپور بھولپن سے اب شہریار کو دیکھ رہا تھا۔

''ہم ٹیسٹ کرواتے ہیں لنچ یا ڈنر نہیں، نہ ہی یہاں بوفے کھول رکھا ہے ہم نے۔ شرافت سے بل دیجیے اور جائیے ورنہ گردہ ہمیں بھی نکالنا آتا ہے۔''

نانی پیاری کو ساری بات میں گردے والی بات کان میں پڑ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی چادر کا پلو پیچھے سے لا کر بغل میں دابا اور اس آدمی سے مخاطب ہوئیں۔

''وے تُو ہے کون......ہیں؟ میرے منڈے کا گردہ نکالے گا۔ ہاں بول؟'' انہوں نے زوردار ہاتھ شیشے کے کاؤنٹر پر مارا۔ دوسری جانب بیٹھا آدمی ہل کر رہ گیا۔ پریشانی سے کاؤنٹر کو جانچنے لگا کہ کہیں شیشہ ٹوٹ تو نہیں گیا۔

وہ قدرے نرمی سے نانی سے مخاطب ہوا۔

''دیکھیں اماں جی، یہ لڑکے کب سے بیکری کا سامان کھا رہے ہیں۔ ہم اس کا چارج تو کریں گے۔ لنگر تو نہیں کھولا ہوا نا ہم نے۔''

نانی پیاری کے پیروں سے لگی...... وہ شہریار کو غصے سے بولیں۔

''وے شہری دے اسے پیسے...... بوتھے پہ مار اس کے۔ میرے منڈے چارج کرے گا یہ۔ لے دس، بیٹریاں ہیں کہ منڈے۔ دے اسے پیسے جلدی اور گل سن......'' وہ اب بیکری کے مالک سے مخاطب تھیں۔ ''تو ابھی جانتا نہیں کہ یہ کس کے بھائی ہیں۔ ورنہ تجھے لانگری بھرتی کروا دیتا میرا مہر...... ہاں نہیں تے۔''

''ایکسکیوزمی! میں کب سے کھڑی ہوں۔ پلیز! یہ بل بنا دیجیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

اپنے عقب میں نسوانی آواز ابھرنے پر شہریار نے پلٹ کے دیکھا تو پیچھے کھڑی لڑکی دیکھتے ہی واپس تیزی سے چہرہ موڑ لیا۔ اس لڑکی نے بھی اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن شاید جلدی میں تھی یا نظر انداز کر دیا تھا۔ بیکری کے مالک نے اپنے ایک لڑکے کو اس کا بل بنانے کو کہا جو سب کے سب نانی پیاری کی وجہ سے اسی کاؤنٹر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ شہریار نے زارون کو دیکھا جو اب داور اور یاور کے درمیان راجہ اندر بنا پورے کروفر سے کھڑا تھا۔ اس نے تینوں کو وارننگ دیتی نگاہوں سے گھورا اور حلاوت بھرے لہجے میں اونر سے مخاطب ہوا۔

''جی آپ مجھے بل بنا دیں۔ میں پے کر دیتا ہوں۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ جب کھایا ہے تو بل تو دینا ہی ہے۔''

بیکری کے مالک نے تعجب سے اپنے سامنے کھڑے لڑکے کو دیکھا جو ابھی کچھ دیر پہلے بل دینے سے انکاری تھا اب یکبارگی گڑ کی ڈلی بنا جیب سے والٹ نکال رہا تھا۔

''وے نا دے شہری۔ میں ادھر ہی کھڑی ہوں دیکھتی ہوں کون میرے کسی منڈے کے گردے کو ہتھ لگاتا ہے۔ میں ہتھ پن کے گلے میں نہ ڈال دوں ان کے۔'' نانی پیاری کو اس کا یوں آرام سے بل دینے پہ آمادہ ہونا بھایا نہیں تھا۔

''نانی! آپ تینوں کو لے کر باہر چلیں میں سامان لے کر پیچھے ہی آتا ہوں۔''

وہی پرسکون انداز اور سبک لہجہ...... پیچھے کھڑے داور اور یاور نے حیرت سے ایک دوسرے کو

پھر شہریار کو دیکھا۔ زارون البتہ مسلسل اس بل ادا کرنے والی والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور بتیس دانت منہ سے اور آنکھیں حلقوں سے ابلنے کو تیار تھیں۔ وہ لڑکی مکمل اپنے دھیان میں تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

نانی پیاری بیکری سے نکلیں تو پیچھے پیچھے یاور اور داور بھی تھے جبکہ زارون شہریار کے پہلو میں آ کر کھڑا ہوا۔

''اوئے، بات سن! وہی کتوں والی لڑکی۔'' اس کی آواز دھیمی تھی۔

''کتوں والی نہیں، کتوں سے بچانے والی بول۔'' وہ جواباً اس سے دھیمی آواز میں بولا۔

''چل ایک ہی بات ہے۔ یاد تو کتوں کی وجہ سے ہے نا۔''

شہریار نے اسے فتنے منہ کہتی نظروں سے دیکھا۔ زارون نے فخریہ بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولا۔

''یاد کرواؤں اسے کہ ہم کون ہیں؟''

''کیوں آج اپنی کتوں والی کروانی ہے کیا؟'' شہریار کو چڑ چڑھی۔ وہ چاہ رہا تھا زارون غائب ہو جائے اور اسی پل اسے زارون کو یہاں سے بھیجنے کی ترکیب سوجھی۔

''سن...... یہ شاپرز پکڑ...... چپ کر کے نکل جا یہاں سے۔ میں گھر فجلو کو کہہ کر آیا تھا کہ میرے لیے چیز آملیٹ اور چاکلیٹ اسمودی بنا کر رکھے۔ ان دونوں چھوٹے کمینوں سے پہلے گھر پہنچ جا تاکہ میرے آنے تک یہ ہڑپ نہ کر جائیں۔ تجھ پہ تو مجھے اندھا اعتبار ہوا نا، اس لیے تیرے حوالے۔''

شہریار جانتا تھا کہ زارون اب وہ چیز آملیٹ اور اسمودی ٹھونسنے کے لیے میزائل کی اسپیڈ سے گھر پہنچے گا لیکن یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرے گا کہ فجلو کو چیز آملیٹ جیسی بلا کا پتا بھی نہیں، بنانا تو دور کی بات۔ پر فی الحال شہریار اسے نو دو گیارہ کرنا چاہتا تھا۔

زارون چلا گیا تو وہ جلدی سے اس لڑکی کی جانب بڑھا جو اب بل پے کر کے بیکری سے باہر نکلنے کو تھی۔

''سنیے...... مس...... اممم...... نام شاید ذہن سے نکل گیا میرے۔ کیسی ہیں آپ؟'' اس کی

تجاہلانہ پکار پہ وہ پلٹی لیکن انداز میں عجلت نمایاں تھی۔شہریار قریب ہوا۔

''پہچانا آپ نے؟''

''جی! مجھے کتے دیکھتے ہی اکثر آپ یاد آتے ہیں۔'' وہ سادے لہجے میں بھرپور طنز کرتی بولی تو شہریار پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔سارا شوق دھواں ہو گیا۔کھسیانی سی ہنسی ہنستا کچھ کہنا چاہ رہا تھا جب وہ خود ہی بولی۔

''کچھ اور یا بس؟ اصل میں باہر میری فرینڈ کھڑی ہے تو کچھ جلدی میں ہوں۔اب کبھی دوبارہ ملاقات ہوئی تو کتوں کے بجائے بیکری کا حوالہ دیجیے گا، مجھے یاد آ جائیں گے آپ۔''

وہ صاف بھگو کر مار رہی تھی اور شہریار کے پاس چپ رہنے کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔اس کی اچھی خاصی چارمنگ پرسنالٹی کو کتوں نے لیر ولیر کر دیا تھا۔لائبہ جانے لگی تو دوبارہ ایک سیکنڈ کو پلٹی اور بولی۔

''میرا نام لائبہ ہے۔بتایا تھا شاید آپ کو لیکن کتوں کے خوف کی وجہ سے یقیناً ذہن سے نکل گیا ہوگا۔چلتی ہوں۔سی یو!'' مسکراہٹ دباتی وہ باہر نکل گئی۔

شہریار نے اطراف میں سرسری نگاہ دوڑائی تو سیلز مین سے لے کر اونر تک سب مذاق اڑاتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔وہ فوراً باہر کو لپکا تو وہاں الگ ہی منظر تھا۔نانی پیاری لائبہ کے ساتھ آئی لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھیں جبکہ وہ گھبرائی سی مسلسل چھڑانے کی تگ و دو میں تھی۔نانی کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا جو شہریار کو چونکنے پر مجبور کر گیا۔اس نے اس لڑکی کو بغور دیکھا تو جھماکے سے وہ لڑکی یاد آئی جو ڈینٹسٹ کے پاس ملی تھی۔نانی پیاری کا اتاؤلا پن اسے ہراساں کر رہا تھا اور اوپر سے تابڑ توڑ عجیب و غریب سوالات کا سلسلہ......

''دھیے کدھر رہتی ہے؟''

''ماں کا نام کیا ہے؟''

''باپ کہاں ہوتا ہے؟''

''پیچھے سے کدھر کی ہے تُو، بچیے!''

لیکن وہ لڑکی گھبرائی سی تھی اور کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ لائبہ فوراً ان کے قریب پہنچی اور نانی کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ جھٹک کے چھڑایا۔

''یہ کراچی کی رہنے والی ہے۔ وہیں پیدا ہوئی تھی اور چار دن بعد وہیں چلی جائے گی۔ پلیز اب مزید پریشان نہ کریں۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ہم چلتے ہیں۔''

وہ جواباً کچھ بھی سنے بنا زمن کا ہاتھ تھامے تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ نانی پیاری مسلسل نفی میں سر ہلاتے بول رہی تھیں۔

''جھوٹ بولتی ہے۔ غلط کہتی ہے۔ پہلی واری دھوکا ہو سکتا ہے مجھے لیکن دوجی واری نہیں۔ جھوٹ کہتی ہے۔''

شہریار ان کی کیفیت سمجھتا ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرتا ساتھ لیے چلنے لگا۔

''نانی گھر چلیں، میں پتا کراتا ہوں۔ بے فکر رہیں۔ اس لڑکی کے گھر کا پتا ہے مجھے۔ معلوم کر لیں گے ہم۔ اس بار پتا کر کے ہی آؤں گا۔ ابھی گھر چلیں۔''

نانی پیاری گم صم سی اس کے ساتھ چل دیں جبکہ شہریار نے کئی بار پلٹ کر دور جاتی لائبہ اور زمن کی پشت کو بغور دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

''یاااار! آج بال بال بچ گئے۔ یقین مانو میری ایک سیکنڈ کے لیے تو جان ہی نکل گئی تھی۔''

گھر آتے ہی لائبہ نے شاپرز ٹیبل پہ رکھے اور دھپ سے صوفے پہ گری۔ زمن بھی غائب دماغی کی کیفیت میں قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ لاؤنج میں نیم اندھیرا تھا اور کچھ باہری روشنی کے زیر اثر ابھی تک اندر کا منظر واضح نہیں ہوا تھا۔ لائبہ نے بانو کو آواز لگا کر چائے لانے کا کہا جو اوپن کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مشغول تھی۔ فائزہ خاکوانی اس وقت گھر میں نہیں ہوتی تھیں اور لائبہ آج کل موڈ سے آفس جاتی تھی۔ اس کے تیور تو زمن کو بھی حیران کرتے تھے جیسے آفس اس کے باپ کا ہو۔

''ویسے زمن، تمہیں کیا لگتا ہے وہ اماں جی کون ہو سکتی ہیں؟ اور تمہیں اس طرح سے پکڑے

ہوئے تھیں جیسے ساتھ ہی کھینچ کر لے جائیں گی۔" لائبہ نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھیں لیکن ایک بار ڈینٹسٹ کے ہاں امی کے ساتھ گئی تھی وہاں بھی دکھی تھیں تو ایسے ہی چونک گئی تھیں۔ مجھے ان کا چہرہ کبھی یاد نہ رہتا جو ساتھ آئے لڑکوں کے تماشے ذہن میں نہ ہوتے۔ آج بھی وہی سب ساتھ تھے ان اماں جی کے، لیکن ویسے میں نہ انہیں جانتی ہوں نہ کبھی دیکھا ہے۔"

زمن کھوئے کھوئے انداز میں کہتی گئی۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی تھکن میں لپٹی بے زاری تھی۔ وہ آج کل گھر میں اکیلے رہنے کی وجہ سے قنوطی سی ہو رہی تھی اسی لیے لائبہ جب گھر ہوتی تو اسے تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ احتیاط کے پیش نظر وہ باہر کم ہی نکل رہی تھی۔

"چلو چھوڑو جو بھی تھیں تم فکر مند نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ان کی کسی جاننے والی سے شکل ملتی ہو تمہاری۔ عمر بھی تھی ان کی اس لیے مغالطہ بھی ہو سکتا ہے۔"

بانو نے گرم گرم بھاپ اڑاتے مگ ٹیبل پہ لا رکھے ساتھ شامی کباب تل کر لے آئی تھی۔

"جیو بانو! تم نہ ہوتیں تو کیا بنتا میرا اور ماما کا۔ قسم سے ہم دونوں کی پرورش میں تمہارا حصہ ہے۔" وہ شامی کباب کا ٹکڑا منہ میں رکھتی ہوئی بولی۔ بانو کے ساتھ اس کے مذاق چلتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ مسکرا کر بنا جواب دیے کچن کی طرف چل دی۔ لائبہ نے چائے کا مگ زمن کو تھمایا اور ساتھ شامی کباب اس کے آگے کیے۔ زمن نے نفی میں سر ہلا کر مگ منہ سے لگا لیا۔ لیکن آنکھوں میں تفکر ہلکورے لے رہا تھا۔ لائبہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ معترف تھی کہ زمن بے حد پیاری تھی۔ اس کے چہرے پہ ایسی کشش تھی جو مقابل کو اپنی جانب متوجہ ہی نہیں کرتی تھی بلکہ باندھ لیتی تھی۔ اس کے تیکھے نین نقش اور مڑی ہوئی لمبی پلکیں۔ آنکھوں کا ہلکا بھورا رنگ جو روشنی میں سنہری مائل لگتا تھا اور باریک اونچی ناک میں چھوٹا سا لونگ۔ چمکتی سفیدی مائل سنہری رنگت جس میں بلا کی ملاحت تھی۔

وہ گدھا ایویں ہی نہیں لٹو اس کے پیچھے۔ لیکن لٹو ہی کی طرح گھومتا رہ جائے گا اب۔ اس نے دل میں شہروز کے لیے سوچا اور زمن کو متوجہ کیا۔

''زمن! اگر تم اپنی حد تک رکھ سکو تو ایک بات کہوں تم سے؟''

زمن نے چونک کر اسے دیکھتے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن پہلے وعدہ کرو کہ تم گھبراؤ گی نہیں اور بھروسا رکھو گی۔''

زمن کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ اس نے مگ ٹیبل پہ رکھا اور لائبہ کی طرف مکمل رخ موڑ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بتاؤ لائبہ! کیا ہوا ہے؟ زوہا تو ٹھیک ہے نا، جلدی بتاؤ، امی بھی کل سے ہاسپٹل میں ہی ہیں۔ گھر بھی نہیں آئیں۔ کیا ہوا ہے لائبہ؟''

وہ بری طرح گھبرائی تھی۔ لائبہ اس کے یوں گھبرانے پہ خود اس سے زیادہ بوکھلائی۔

''او بھئی، حوصلہ زمن۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ تم نے تو مجھے ٹینشن ڈال دی۔ سب ٹھیک ہے یار۔''

زمن روہانسی ہوتی سر پکڑ گئی۔

''ایکچوئیلی، آج کل پتا نہیں کیوں چھوٹی چھوٹی بات پہ پینک کر جاتی ہوں۔ سوری لائبہ، میں اب کنٹرول کروں گی۔''

لائبہ نے اس سے قریب ہوتے تسلی آمیز انداز میں اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پرسوچ انداز میں بولی۔

''اب تو سوچ میں ڈال دیا تم نے کہ آیا بتاؤں یا نہیں۔ تمہارا کیا ہے یار میری بات سن کر بے ہوش ہی ہو جاؤ۔''

''ایسی بھی بات نہیں اب...... حد ہے۔'' زمن نے مسکراتے ہوئے کہا اور پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

لائبہ ابھی بھی اس کی آنکھوں کو دیکھتی یہی سوچ رہی تھی کہ بتائے یا نہیں۔ کہیں غلط تو نہیں کر دے گی بتا کے اور اگر فائزہ خاکوانی کو پتا چلا تو ان کا ری ایکشن کہیں اس کی سوچ سے الٹ نہ ہو۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی زمن تنبیہی لہجے میں گویا ہوئی۔

''دیکھو لائبہ! اب بتاؤ...... میں سسپنس سہنے والا بندہ نہیں ہوں۔ ابھی نہ بتاؤ گی تو بار بار پوچھتی رہوں گی۔ سکون نہیں آئے گا مجھے۔ پلیز اب بتاؤ۔''

''ہمم!'' لائبہ نے ایک لمبی سانس خارج کی اور جو ہوگا دیکھا جائے گا والے انداز میں کندھے اچکائے۔

''وہ جو بندہ ہے نا شہروز راؤ۔''

''ہاں کیا ہوا؟ پہنچ گیا کیا یہاں؟'' زمن ایک جھٹکے سے کھڑی ہوتی بولی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔ ساری بہادری بھاپ بن کے اڑی تھی۔ لائبہ نے دل میں خود کو سو جوتے مارنے کا تہیہ کیا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے اپنی ماں سے دو سو مزید پڑنے کا امکان تھا لیکن اب ہاتھی نکل گیا، دم کا کیا کرنا تھا بھلا منہ میں رکھ کر۔

''وہ شہروز راؤ جو ہیں نا، وہ الو کے پٹھے میرے باس ہیں۔ میں انہی کے آفس میں جاب کرتی ہوں۔'' اردگرد کی سب چیزیں زمن کو گھومتی محسوس ہوئیں۔ وہ یک ٹک لائبہ کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت شک، بے اعتباری اور خوف تھا اور لائبہ کو پہلی بار اپنی جلد بازی پہ جی بھر کر غصہ آیا تھا۔ پتا نہیں اب کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے زمن کو یقین دلانے کے لیے کہ شہروز راؤ بس اس کا باس ہے اس کے علاوہ وہ اس کے کسی کرتوت میں حصے دار نہیں۔

☆......☆......☆

مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں
وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کسے
قدم کہیں بھی ہوں زنجیر گھر کی دیکھتے ہیں
اگرچہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے
یہ سادہ لوح کہ تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی تو زخم اسے بھولنے نہیں دیتا
کوئی تو یاد عناں گیر، گھر کی دیکھتے ہیں
ہم ایسے خانہ بر انداز، گنج غربت میں
جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں
فرازؔ جب کوئی نامہ وطن سے آتا ہے
تو حرف حرف میں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

اس نے ہاتھ میں تھامی کتاب الٹا کر گود میں رکھ دی۔ سیاہ گہری آنکھوں اور خم دار پلکوں پہ لگے نظر کے نفیس سے گلاسز اتار کر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے آنکھوں کو مسلا لیکن تھکن زدہ آنکھوں میں راحت نے اترنے سے انکار کیا تو وہ سر راکنگ چیئر کی پشت پہ گرا کر انہیں چھت پہ گاڑ گیا۔ گود میں رکھی کتاب سے ایک طویل مدت بعد اس نے اپنی تنہائی بانٹی تھی۔ وہ اس وقت یو کے میں اپنے ایسے دوست کے فلیٹ میں موجود تھا جو زبردستی اپنے آپ کو اس کا دوست کہا کرتا تھا جبکہ خود اسے دوستیاں نبھانی نہیں آتی تھیں لیکن اوروں کو اس کی شخصیت کا سحر اس کے گرد منڈلانے پہ مجبور کر دیا کرتا تھا۔

یہ بھی ایسا ہی دوست تھا جسے معلوم ہوا کہ وہ یو کے آ رہا ہے تو اس نے اپنے ڈرائیور کو ایئرپورٹ بھیج دیا تھا جس کے ہاتھ میں اس لگژری فلیٹ کی چابیاں تھیں اور ساتھ ہی اس ڈرائیور کو آرڈرز تھے کہ اسے فلیٹ تک ڈراپ بھی کرے گا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بنا احتجاج کیے اس کے ساتھ یہاں آ گیا تھا۔ اس رات نیند نہ آنے کی وجہ سے اس نے عرصے بعد اپنے ٹریولنگ بیگ کے سامان کے نیچے سے یہ کتاب نکالی تھی۔

وہ سدا سے کتاب کا رسیا تھا۔ یہ شوق اس کے لہو میں گردش کیا کرتا تھا کبھی۔ کتاب پڑھنے والے کے لیے چہرے پڑھنا کچھ مشکل نہیں رہتا وہ کہ جو کتاب سے نکلا تھا چہروں سے ہوتے ہوئے سالہا سال شہروں ملکوں میں بھٹکتا رہا۔ بیسیوں چہرے پڑھے، دسیوں شہر اور ملک دیکھے، کہیں قیام نہیں لکھا تھا۔ ہر جگہ جلی حروف میں لفظ ''ہجرت'' نقش تھا۔ چہروں کی ہجرت، شہروں سے ہجرت، تھکا دینے

والی ہجرت، مار دینے والی ہجرت۔ انہی درماندگی زدہ ہجرتوں کو جھیلتے کسی دن خیال گزرتا کہ وقت نہیں پلٹتا پیچھے تو کیا، وہ خود پلٹ لیتا ہے۔

"لعل تھک جائیں تو ماؤں کی طرف آتے ہیں۔"

سو الٹے پاؤں سفر کا ارادہ باندھتا ملکوں سے پلٹتا شہروں سے چلتا چہروں سے ہوتا واپس کتاب تک پہنچا۔

لفظ لفظ یادوں کے در کھولتا تھا۔ حرف حرف دبے نقش ابھارتا تھا، وقت الٹے پاؤں چل پڑتا تھا اور پھر وہ وہاں ہوتا جہاں سے منظر کچھ یوں ہوتا کہ قفل پڑا قفس ہے، قفس کے ایک کونے میں پڑے ہم ہیں۔

اس نے بیتے وقت کی کوئی نشانی اگر پاس رکھی تھی تو وہ کتاب تھی اور اسی کی طرف وہ پلٹا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی رشتہ کوئی تعلق اور کوئی واسطہ گزرے وقت میں جھانکنے پہ مجبور نہیں کر پایا تھا۔ فاصلوں کو چاہتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوا کرتا لیکن جب چاہتوں کے رنگ ہی پھیکے پڑ جائیں تو فاصلے اوس بن کر ان پہ برستے ہیں اور ان کا نقش فنا کر ڈالتے ہیں۔ اس کا تو دل ہی فنا ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کب تک اس جنگ کو جاری رکھ پائے گا لیکن جب تک بھی رہتی خود سے رہتی۔ نہ کوئی فریق تھا نہ دشمن۔ نہ ابتدا تھی نہ انتہا۔ بس ہار تھی اور اسی کے آگے اس کا سر تسلیم خم تھا۔

☆......☆......☆

مہریار کو حیات راؤ کا فون آیا تھا۔ گاؤں میں حیات راؤ کی زمینوں پہ فصل کی کٹائی جاری تھی اور چوہدری حاکم راؤ کے بندوں نے دھاوا بولا تھا۔ ہاتھا پائی سے بات گولیاں چلنے تک گئی تھی۔ مہریار کو جیسے ہی معلوم ہوا تھا اس نے گاؤں کا قصد کیا تھا حالانکہ حیات راؤ نے اسے آنے سے منع کیا تھا پھر بھی وہ رہ نہیں پایا تھا۔ نکلنے سے پہلے اس نے رباب خان کو انفارم کرنا لازم سمجھا تھا اور ساتھ ہی وہ زوہا کے کمرے کا چکر لگانے بھی آیا تھا۔ وہ سو رہی تھی اور اس کے سرہانے کرسی پر زمن ٹانگیں اوپر کیے اپنے دھیان میں چھت پہ لگی سپاٹ لائٹس کو گن رہی تھی۔ اسے اپنے پیچھے مہریار کے اندر داخل ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔

''بارہ...... تیرہ...... چودہ۔'' وہ لگ بھگ گننے کے قریب تھی جب مہریار نے ایک نظر سیلنگ پہ ڈالی اور دوسری زمن کی اٹھی انگلی پر اور اس کی مشکل آسان کی۔

''بائیس ہیں۔ تین خراب ہیں اندر سے۔ دو پنکھے ہیں جن میں سے ایک کا ڈِمر کام نہیں کرتا اور اس کی اسپیڈ کم نہیں ہوتی بس فل اسپیڈ پہ چلتا ہے تمہاری طرح جبکہ دوسرا بالکل فٹ ہے۔ میری طرح......'' آخری دو لفظ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہے تھے۔

زمن نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پاؤں نیچے اتارتی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ مہریار دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے خود بھی بڑی فرصت سے ہر شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ زمن کو اپنی عقل پہ افسوس ہوا۔

جب بھی اس بندے سے سامنا ہوتا ہے لازمی میں کسی بے وقوفانہ سرگرمی کو سرانجام دے رہی ہوتی ہوں۔ حد ہے ویسے......

''یہ آپ کو بنا بتائے کہیں بھی گھس آنے کی عادت ہے کیا؟'' وہ کلستی ہوئی دونوں بازو سینے پر لپیٹتی ہوئی بولی۔

''کہیں بھی کیوں۔ میرا ہاسپٹل ہے۔ میری پیشنٹ کا روم ہے۔ میں جب چاہے آ سکتا ہوں۔ یہ تو اب تمہارا قصور ہے نا لڑکی کہ تم کہیں بھی اپنی بے وقوفیوں سے باز نہیں رہ پاتی۔''

زمن کو پتنگے لگے تھے۔ وہ ایک ابرو اچکاتی اسے سر سے پیر تک گھورنے لگی۔

''میرا نام زمن ہے۔ مجھے یہ لڑکی، یہ بی بی جیسے طرزِ تخاطب پسند نہیں۔ اگر آپ کی پسند ناپسند ہو سکتی ہے تو میری بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ ہموار لہجے میں اسے جتا گئی تھی۔ مہریار نے اسے جواباً اسی کے انداز میں گھورا تو وہ خفیف سی ہوتی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''تمہارا نام اچھے سے پتا ہے مجھے۔ یہ بھی اور وہ بھی جسے تم نے بھلا دیا۔ خیر ہاجرہ آنٹی کہاں ہیں؟''

''آنے والی ہیں۔ گھر گئی تھیں رباب آنٹی کے ساتھ۔'' وہ اس کی بات پر غور کرنا چاہتی تھی لیکن اسے زیادہ سوچنے کی مہلت مہریار نے نہیں دی تھی۔

''ہمم......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''میں ذرا گاؤں جا رہا ہوں ضروری کام سے۔ زیادہ سے زیادہ کل شام تک واپسی ہو جائے گی میری۔ ہاجرہ آنٹی کو بتا دینا کہ دو دن بعد زوہا کا آپریشن ہے۔ ہمارے بہت قابل نیورو سرجن ہیں عبداللہ بیگ وہ جرمنی سے پرسوں شام کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں یہاں۔ ان کے آتے ہی ان شاءاللہ ہم بسم اللہ کریں گے۔ چلتا ہوں۔'' وہ سادہ لہجے میں بات مکمل کرتا ایڑیوں کے بل مڑا اور باہر نکلنے لگا۔

زمن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''گاؤں کس لیے جا رہے ہیں؟''

مہریار زیرلب مسکرایا لیکن پلٹنے سے پہلے مسکراہٹ معدوم کر لی۔

''کیوں تمہیں چلنا ہے ساتھ۔ اداس ہو رہی ہو کیا۔''

''استغفراللہ!'' اس نے فوراً دائیں کان کی لو کو چھوا۔ ''مجھے کیوں اداسی ہو گی اور میں کیوں چلوں گی۔ وہ ہے نا آپ کی بیوی اور چار بچے۔ انہیں لے کے جائیں۔ میں نے تو بس یونہی پوچھا تھا۔''

بیوی اور چار بچوں کی بات پہ اس کے ذہن کے پردے پہ شہریار سے لے کر داور تک چاروں لہرا گئے تو دل میں لاحول پڑھ گیا۔ ہونٹوں پہ البتہ مسکراہٹ رینگ گئی جسے چھپایا بھی نہیں۔

''تمہیں میرے بیوی بچوں کا بڑا ہڑکا ہے۔ کسی دن ملاقات ہی نا کروا دوں تمہاری۔''

جواباً وہ محض شانے اچکا کر رہ گئی۔ اس کا پتا نہیں کیوں ہاں میں جواب دینے کو دل نہیں کیا۔

مہریار چند پل اسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''ویسے مجھے پتا ہے تمہیں بھی بہت کچھ پسند اور ناپسند ہو سکتا ہے لیکن کبھی کبھار جو ہمیں پسند ہوتا ہے وہ مفید نہیں ہوتا اور جسے ہم ناپسند کرتے ہیں وہ چاہے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ لوگوں کی پہچان کرنا سیکھو زمن بی بی۔'' اس نے بی بی پہ زور دیا۔

زمن چڑ گئی اور اس کے چڑ کر خفیف سا رخ موڑنے پر اس کی ناک کا چمکتا باریک سا لونگ نگاہوں میں بھرا۔ دل کو ذرا بے چینی سی ہوئی اور وہ الوداعی کلمات کہتا کمرے سے نکل گیا۔

"ادھار نہیں رکھا چول نے ویسے۔ دماغ میں کیڑا ہے اس دماغی مریض کے۔ پتا نہیں ہر وقت میری سوچیں ہی پڑھتا رہتا ہے جیسے۔ بڑا آیا تانترک۔"

وہ دوبارہ سکون سے بیٹھ کر کرسی سے پشت ٹیک کر زوہا کے پرسکون چہرے کو دیکھنے لگی اس بات سے انجان کہ اس کے عقب میں مہریار کی گردن دروازے سے اندر آئی تھی اور اس کی مکمل بات کانوں میں اچھے سے اتار کر وہ سر جھٹکتا واپس دروازہ بنا آواز بند کر گیا۔

☆.......☆.......☆

حویلی کے اداس درو دیوار میں زندگی دوڑ گئی تھی۔ ملازم مرد عورتیں جیسے اندر باہر بھاگتے پھر رہے تھے۔ آج کتنے مہینوں بعد مہریار راؤ کی گاڑی حویلی کے وسیع گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اور مہریار وہ تھا جو سارے پنڈ کا پسندیدہ تھا۔ وہ بہت پر اثر تھا۔ چلتا تو لگتا پورا علاقہ چل رہا ہے۔ چوہدری حیات راؤ اپنے بیٹے کے استقبال کے لیے مردان خانے سے نکل کر باہر صحن تک چلے آئے۔ کشور بی بی بھی برآمدے سے پرے جالیوں کے پار آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ڈبڈبائی آنکھیں بیٹے کا صدقہ اتار رہی تھیں جو گاڑی سے اتر کر باپ کے سینے سے لگا ان کا دل ترسا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً نگاہیں پھیر لیں مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ کالی پینٹ اور کالی ہی شرٹ پہ سن گلاسز لگائے وہ قد میں حیات راؤ سے بھی اونچا دکھائی دیتا تھا۔ سیدھی پڑتی دھوپ میں اس کی سفیدی مائل گندمی رنگت اس کی خوبروئی میں اضافہ کر رہی تھی۔ مہریار باپ کے بازو کے گھیرے میں ساتھ ساتھ چلتا یہیں آ رہا تھا۔ برآمدے سے اندر داخل ہو کر جیسے ہی اس نے جالی والا دروازہ کھولا ماں کو نم آنکھوں سے کھڑے اپنا ہی منتظر پایا۔ وہ بے حد تیزی کے ساتھ ماں کے سینے سے آ لگا۔ کشور بی بی کا دل نخلستان بن گیا۔ وہ مہریار کے ماتھے کو چومتیں تو کبھی اس کے ہاتھوں کا بوسہ لیتیں۔ مہریار انہیں کسی چھوٹے بچے کی طرح اپنے سینے میں چھپائے کتنی دیر کھڑا رہا تھا یہاں تک کہ حیات راؤ نے انہیں زبردستی ایک دوسرے سے الگ کر کے اندر ہال میں چلنے کو کہا۔

مہریار طائرانہ نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتا ہال میں داخل ہوا تو جیسے ذہن میں بہت سے مناظر ایک ساتھ دھکم پیل کرنے لگے۔ کیسی عجیب بات تھی کہاں اس کا بچپن گزرا، لڑکپن آیا اور جوانی

کے کئی سال لگاتار آتے جاتے گزرے اسی جگہ سے اس کی ایسی یادیں وابستہ تھیں جنہوں نے ہر اچھی اور شگفتہ یاد کو پی لیا تھا۔ ان گندی یادوں کی سیاہی سب رنگ چوس گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ماں کا ہاتھ تھامے وہیں ایک صوفے پر آ بیٹھا۔ کشور وقفے وقفے سے اس کی چوڑی ہتھیلی اور ہاتھ کی پشت چومتی تھیں۔ اپنے زنانہ نازک ہاتھوں میں دبا اس کا مردانہ صحت مند خون چھلکتا ہاتھ دیکھ کر دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ حیات راؤ نے ان کی کیفیت دیکھ کر ازراہِ مذاق کہا۔

''ایسے تو کبھی تیس سالوں میں میرا ہاتھ نہیں تھاما تم نے۔ ترسا کے رکھا ساری عمر ہمیں تو......''

کشور چونکیں۔ پھر بیٹے کے سامنے ایسی بات پہ شوہر کو خفیف سا گھورا اور بولیں۔

''شوہر نے مجھے خدانخواستہ بیٹے جیسی جدائی نہیں دی نا۔ یہ تو شہر جا کر ماں کو جیسے تابوت میں ڈال جاتا ہے کہ جب واپس آئے تو ہوا لگوا دے۔''

''استغفراللہ امی! کیسی بات کرتی ہیں۔'' مہریار ماں کی بات پر ہولتا انہیں اپنے ساتھ لگا گیا اور پھر اٹھ کر نیچے قالین پر کشور کی طرف پشت کر کے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور اپنا سر ان کی گود میں ڈال دیا۔ کشور نے بے حد محبت سے اس کے سر میں انگلیاں سہلانی شروع کیں تو مہریار آنکھیں موندے باپ سے مخاطب ہوا۔

''ابا! میں تو کہتا ہوں میرے بعد آپ بھی باری لے لیں۔ یقین مانیں جنت کا لطف ہے۔''

''برخوردار! تم بس لطف لو کیونکہ یہ جنت ہی ہماری ہے۔'' حیات راؤ معنی خیزی سے بولے تو دونوں باپ بیٹے کا قہقہہ سارے میں گونجا۔ باہر کام کرتے ملازمین کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ کتنے عرصے بعد حویلی کے بے رونق ماحول کا جمود ٹوٹا تھا۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد مہریار مدعا پر آیا۔

''اب بتائیں ابا! کیا رولا ہے چوہدری حاکم کا اور کیوں نئے تنازعے کھڑا کرتا پھر رہا ہے۔''

''او کچھ نہیں یار! تمہیں پتا تو ہے اس کا۔ میں تو منع کر رہا تھا کہ مت آؤ ایسا بھی کچھ نہیں ہوا۔'' حیات راؤ لاپروائی سے بولے اور مہریار کی موندی آنکھوں کا فائدہ اٹھا کر کشور کو تنبیہاً گھورا جو انہیں حیرت سے بات چھپاتا دیکھ رہی تھیں۔ چوہدری حاکم کے ہرکاروں کی گولی چھو کر گزری تھی۔ پٹی بندھی تھی بازو

پر جو لباس کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ یہ واقعہ نظر انداز کر دیا جاتا۔

''لیکن ابا! ایسے کیسے وہ ہماری زمینوں پر ہلا بول سکتے ہیں۔ یہ خاموش بیٹھے رہنے والا معاملہ نہیں ہے۔ میرا دوست ہے ڈی ایس پی، بات ہوئی ہے میری اس سے۔ شام کو پہنچ جائے گا یہاں تو سارا معاملہ خود دیکھے گا۔ چوہدری حاکم نے ہلکے میں لے لیا ہمیں بہت۔ اتنا آسان نہیں ہماری زمینوں پہ ہاتھ ڈالنا۔''

''بس بیٹا! یہ تیرے دادا جی اس کی بیٹی سے ویاہ کا شوشہ نہ چھوڑتے تو وہ آپے سے باہر نہ ہوتا۔ فساد کا شروع سے شوقین ہے تو اب تو پھر تیرے انکار سے اس کے ہاتھ میں وجہ آ گئی۔'' کشور نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے دھیرے دھیرے اس کی پیشانی مسلتے ہوئے کہا تو مہریار آنکھیں کھولتا ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتا ایسے رخ پہ بیٹھ گیا جدھر سے ماں اور باپ دونوں کے چہرے بخوبی دیکھ سکے۔

''میں تر نوالہ نہیں ہوں ماں جی، نہ ہی اب مہریار چودہ سالہ نادان کم سن لڑکا ہے اور نہ ستائیس سالہ ناتجربہ کار مرد جسے موم کی ناک بنا کے جدھر مرضی موڑ لیا جائے۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس کی آواز میں شکستگی تھی۔ حیات راؤ نے اسے تاسف سے دیکھا اور پھر فوراً بات بدلنے کے لیے بولے۔

''اچھا شہر کی بتاؤ۔ وہ چاروں کھوتے ٹھیک تو جا رہے ہیں نا؟ اب میرا شہر کا چکر لگتے کچھ دن لگ جائیں گے اوپر۔''

''آئے ہائے ایسے تو نہ کہیں انہیں۔ ایک تو میری ساری اولاد مجھ سے دور بٹھا چھوڑی ہے اوپر سے انہیں القابات دیتے رہتے ہیں۔ یہ کیا کم ہے ان کی جان سکھانے کو۔'' ان کا اشارہ مہریار کی طرف تھا جس نے ان کی بات سن کر انجان بنتے بھنویں اچکائیں۔ کشور نے بات جاری رکھی۔

''تو اور کیا۔ سب بتاتے ہیں مجھے داور اور یاور...... کیسے کیسے ظلم کرتے ہو ان پر۔ چھوٹے ہیں وہ بے چارے۔ اتنا کیوں مارتے ہو ان کو۔'' کشور نے گلہ آمیز انداز میں مہریار سے کہا تو وہ مارے حیرت کے کچھ بول ہی نہیں پایا۔ حیات راؤ کا ہنسنا البتہ ثابت کر رہا تھا کہ اس کے لیے کافی گراؤنڈ ہموار کی جا چکی تھی یہاں۔

"یہ سب آپ کو کون کہتا رہا ہے ماں جی۔ بکواس کرتے ہیں دونوں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کیسے سنبھالنا پڑتا ہے چاروں کو۔ ورنہ جوان کے حالات ہیں نا مجھے ہی کھڑے بیچ آئیں۔"

"لو بتاؤ...... ایویں...... اب خالہ پیاری تو جھوٹ نہیں بولیں گی نا...... انہوں نے بھی بتایا مجھے کہ کیسے تم ان چاروں پہ سختی کرتے ہو۔ میرے چندا ذرا خیال کرونا۔ بچے ہیں نا۔ عقل آتے آتے ہی آئے گی۔"

وہ کہتی جا رہی تھیں اور مہریار ششدر تھا کہ کیسی ڈپلومیسی سے کام لیا جا رہا تھا اس کی ناک کے نیچے۔ یعنی سب کے سب ملے ہوئے تھے اور نانی پیاری کیسے اس کے آگے ان چاروں کے رونے روتی تھیں۔ اس نے مدد طلب نظروں سے باپ کو دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ کھڑے کرتے بولے۔

"بھئی ان کو سمجھانا، توبہ کرو۔ میری تو ہڈیاں کڑک جاتی ہیں انہیں کسی بات کی وضاحت کرتے۔ اب یہ جو جیسا کہہ رہی ہیں سکون سے سنو اور سر دھنو۔" کشور نے حیات راؤ کی مبالغہ آمیز گفتگو پہ انہیں افسوس کی نظر سے دیکھا اور دونوں سے مخاطب ہوئیں۔

"کرلو باتیں دونوں جی بھر کے کرلو۔ انہیں تو پروا نہیں کہ سارا دن بیوی حویلی کی دیواروں سے ٹکریں مارتی پھرتی ہے اب تم اگر ستا ستا کے شکل دکھانے آ ہی گئے ہو تو ہو جاؤ کھڑے والد کی صف میں۔ میرا کیا ہے، میں تو نہ کل تین میں تھی نہ آئندہ تیرہ میں ہوں گی۔"

کشور کی بات سن کر مہریار پہلے تو چوکس ہوا۔ ایسا زبان و بیان وہ بھی اس کی سیدھی سادی بھولی ماں کا۔ اس نے اچنبھے سے حیات راؤ کی جانب دیکھا تو وہ مسکراہٹ دباتے صوفے کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے بولے۔

"بھئی برخوردار! اب اپنی کتابوں سے تمہاری ماں کو بھی فیض یاب کرتا ہوں۔ یہ سب انہی کا اثر ہے جو زبان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا میں کوئی اچھی چیز پڑھوں تو اسے سناتا بھی ضرور ہوں تو بس تمہاری ماں مجبوراً سنتی ہے لیکن صحبت رنگ لے ہی آتی ہے۔"

"واہ ماں جی واہ! آپ نے تو میرا دل شاد کر دیا۔ ایسی کی تیسی اس کی جو آپ کو تین میں رکھے یا

تیرہ میں۔ میں آپ کے کہنے پر پنچائیت لگوادوں گا، حکم کریں۔" مہر یار ماں کے گھٹنے سے جڑ کر ہلکے ہاتھوں سے دباتا دلجوئی کررہا تھا۔ کشور نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

"بس پھر میرے حکم کی بات ہے تو میری جان شادی کرلو۔ ہاں...... صدقے جاؤں۔ اب حکم دے رہی ہوں اسے بجالانا فرض ہے تم پر۔ لو تم بیٹھو میں ذرا کچن میں تمہارے لیے کچھ خاص بنانے کا کہوں۔"

وہ اپنا داؤ کھیل کر اسے ہک دک چھوڑتے ہوئے اٹھ کے چل دیں جب کہ وہ بے بسی سے باپ کو دیکھنے لگا جن کی ہنسی نکل رہی تھی۔

"یہ کیا ابا...... میرا پروگرام تھا ماں کو خوش کرنے کا لیکن یہاں تو پروگرام ہی جاری نہیں رہا۔"

"پروگرام تو ختم ہوگیا۔" حیات راؤ اور مہر یار نے بیک وقت بلند آواز سے کہا اور دونوں کے بے ساختہ قہقہوں نے حویلی کے در و دیوار میں جیسے تازگی بھر دی تھی۔ مردانہ ہنسی کی یہ بازگشت چوہدری شہاب الدین کے کمرے میں ان کی سماعتوں کو بھی جھنجھوڑ گئی۔ ان کو مہر یار کے آنے کی خبر ہوگئی اور اب ان کی بے صبر نگاہوں کو شدت سے اس کے اپنے کمرے میں آنے کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

رات کتنی ہی دیر تک وہ حیات راؤ کے ساتھ ان کے ڈیرے پہ موجود رہا تھا۔ اس کے آنے کی خبر پنڈ میں پھیلتے ہی سب اس سے ملنے کے لیے وہیں پہنچتے رہے۔ وہ صرف اپنے باپ کا منظور نظر نہیں تھا بلکہ سارے پنڈ کا لاڈلا تھا۔ پنڈ میں موجود واحد ہاسپٹل اسی کی مرہون منت تھا۔ وہاں موجود عملہ اور علاج کی سہولیات اسی کے طفیل مہیا ہوئی تھیں۔ وہ خود بھی جب ادھر آتا تھا تو اس کا بیشتر وقت وہاں گزرتا تھا لیکن چند ماہ سے اس کا اپنا چکر بھی لگ نہیں پایا تھا لہٰذا دن چڑھتے ہی اس کا مصمم ارادہ تھا ہسپتال کا چکر لگانے کا۔ ڈیرے پہ جیسے دن کا سماں تھا۔ بخشو چاچا جو اب بے حد ضعیف ہو چکا تھا جھکی کمر اور ملگجی بینائی کے ساتھ جب وہاں آیا تو مہر یار اٹھ کر انہیں ملا تھا۔ بخشو چاچا اس کا سراپا دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ بے اختیار اس کی زبان سے سرسراہٹ ہوئی۔

"پتر! تو اپنے چاچے جیسا دکھنے لگا ہے۔ تجھے دیکھ کر حسنات پتر کی یاد آجاتی ہے۔ وقت کتنا دور

لے جاتا ہے پیارے لوگوں کو۔"

مہریار نے کوئی جواب نہیں دیا بس محبت سے تسلی آمیز انداز میں ان کے کندھے سہلائے۔ وہ جواب بھی کیا دیتا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وقت کا پانسا ہی پلٹ دیتا اور سب پیارے رشتے اس کے قریب ہوتے لیکن حالات کے تھپیڑے سب کو اڑا کر دور لے گئے تھے۔ کسی خودرو پودے کے بیجوں کی طرح کوئی کہیں جا گرا تھا تو کوئی جڑ ہی نہیں پکڑ سکا تھا۔ وہ بخشو چاچا کو ایک چارپائی پہ بٹھا کر خود بھی سب کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ کافی دیر تک چوہدری حاکم کی ناقابل برداشت حرکتوں اور ان کے سدباب پہ گفتگو ہوتی رہی۔ پنڈ کے بیشتر افراد اس سے تنگ تھے۔ آئے دن اس کے ہرکارے منہ اٹھا کے کسی کی بھی فصل میں ٹریکٹر چلا دیتے تھے یا پانی کاٹ دیتے تھے۔ اور اب تو حد ہی ہو گئی تھی، چوہدری حیات راؤ کے مقابلے پہ تن کے آیا تھا۔ دادا گیری کر رہا تھا صاف صاف اور یہ بات کسی کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ مہریار کافی دیر تک سب کی باتیں اور آراء سنتا رہا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب خود چوہدری حاکم سے ملاقات کرے گا اور اس معاملے کو اپنے طور پر سلجھائے گا۔

☆......☆......☆

حویلی پہنچتے ہی وہ شدید تھکن کے باعث ماں سے مل کر سونا چاہتا تھا لیکن اندر جاتے مہریار کی کلائی حیات راؤ نے تھام لی اور بڑے مان سے اسے دیکھا۔ مہریار نگاہیں چرا گیا تو حیات راؤ التجائیہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"مہر......! میری خاطر...... میں نے کبھی تم سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی بیٹا، یہاں تک کہ تمہاری ہر تکلیف میں تمہارے ساتھ تمہارا باپ موجود رہا ہے۔ اپنے باپ کا مان سمجھ لو جو اسے تم پہ ہے۔ اس کی خاطر مل لو۔"

اور یہاں مہریار بے بس ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی سینڈل کی ٹو کو فرش پہ مسلتا رہا پھر سر اٹھا کر باپ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"آپ میری جان ہیں ابا اور آپ کے مان پہ میری جان قربان۔ آپ ماں کے پاس چلیں میں

مل کر وہیں آتا ہوں۔"

حیات راؤ سمجھ گئے کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا اس لیے مصلحت کے تحت اپنے کمرے میں چلے گئے جب کہ چوہدری شہاب الدین کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مہریار کے قدم منوں وزنی ہو رہے تھے۔ اس کے پیروں سے جیسے پتھر باندھ دیئے تھے کسی نے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے ایسے شخص سے ملنا اور گفتگو کرنا جس کی آپ شکل بھی دیکھنا نہ چاہتے ہوں۔ اسی کیفیت سے مہریار گزر رہا تھا۔ دروازے کی ناب پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس سینے میں بھرا اور اندر داخل ہو گیا۔ شرفو بیڈ کی پائنتی کے قریب کارپٹ پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی تیر کی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

مہریار نے سر کے اشارے سے اسے باہر جانے کا کہا اور خود شہاب الدین کے بیڈ کے نزدیک ہوا۔ چوہدری شہاب الدین کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ ایک شدید نفرت کی لہر مہریار کی رگ رگ کو بھگو گئی اس نے کس مشکل سے خود پہ ضبط کر کے اپنے آپ کو اس کمرے میں لانے پہ مجبور کیا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اس نے گلا کھنکار کر انہیں متوجہ کیا۔ چوہدری شہاب الدین نے سرعت سے آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پہ گویا بشاشت لوٹ آئی تھی۔ کڑیل جوان پوتے کو نگاہوں میں بھرے وہ سر سے پیر تک فدا ہو جانے والے انداز میں تک رہے تھے لیکن مہریار کو رتی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے نہ اپنے دادا کی محبت سے سروکار تھا نہ ان کے لگاؤ کی طلب۔ وہ یہاں محض باپ کی خوشنودی کے لیے آیا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی عمل حیات راؤ کی دل آزاری کا سبب بنے۔

چوہدری شہاب الدین نے اپنا بایاں ہاتھ پوری قوت سے ہلاتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکلنا شروع ہوئے۔

"کک...... کک...... کیسا ہے مم...... مم...... میرا ...... پپ...... پتر! ددد...... داددا تت...... تترس گیا تت...... تجھے دیکھنے کے لیے...... میرررررے گگ...... گگ...... گلے سے نہیں لگ...... گ گ...... گے...... گگ...... گاا......"

انہوں نے حسرت سے اسے اپنے گلے لگنے کی درخواست کی لیکن مہریار کے وجود میں چنداں جنبش نہیں ہوئی۔ وہ اسی انداز میں پشت پہ ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔اس کا تخیل اسے تکلیف دہ گرداب میں کھینچنے کو بے تاب تھا اور وہ خود کو بچانے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا اس سیاہ رات کو جب اس نے سامنے لیٹے وجود کو فرعون بنے دیکھا تھا۔وہ اور اس جیسی کئی سیاہ راتیں اس کا لڑکپن نگل گئی تھیں۔

اس نے جھر جھری لیتے خود کو کمپوز کیا اور بے تاثر لہجے میں گویا ہوا۔

''میں یہاں آپ کی حسرتیں مٹانے نہیں آیا۔بس اتنا کہنے آیا ہوں کہ چوہدری حاکم کے ساتھ مل کر آپ جو کھیل کھیلنا چاہ رہے ہیں اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تو بے کار کی کوششیں ترک کیجیے۔ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ مہریار کی ڈوریں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔وہ ہاتھ جنہیں آپ ہلا بھی نہیں سکتے۔کیا ابھی بھی آپ کے عبرت کا نشان بننے میں کسر باقی ہے چوہدری شہاب الدین۔''

اس کی زبان دادا کہتے کہتے ان کا نام لے گئی۔

شہاب الدین گنگ سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کوئی ان دیکھی طاقت ان کی مروجہ قوت سلب کر رہی تھی۔انہوں نے بے بسی کے احساس سے مغلوب ہوتے سائیڈ ٹیبل پہ دھرا سامان ہاتھ سے گرانے کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں دوائی پلانے کی غرض سے رکھا اسٹیل کا چمچہ فرش پہ گر کر آواز پیدا کرتا باہر کھڑے شرفو کو چوکنا کر گیا۔اس نے اندر جانا چاہا لیکن مہریار کی پشت دیکھ کر قدم واپس کھینچ لیے۔وہ مالکوں کی موجودگی میں ایسے اندر نہیں جا سکتا تھا جبکہ چوہدری شہاب الدین کی کوشش تھی کہ کسی طرح شرفو اندر آجائے اور مہریار کی زبان کے شعلے انہیں بھسم نہ کر سکیں۔

مہریار ان کی حرکت کا تناظر بھانپتے ہوئے استہزائیہ مسکرایا اور اطراف کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''اڑتی اڑتی خبر ملی تھی کہ آپ کو آج کل آپ کے مرحوم بھائی کی روح ملنے آتی ہے۔''

اس کی بات کے ردعمل میں شہاب الدین کے چہرے کا رنگ فوری متغیر ہوا تھا۔وہ بے چینی سے اب سر کو دائیں بائیں گھما رہے تھے۔

''اگر ایسا ہے تو چلیں آج کی رات بھی آپ کو ان کی ہم راہی میں چھوڑتا ہوں۔ لیکن دعا کرتا ہوں کہ وہ حساب بے باک کر جائیں۔ زندگی میں جو کھاتے کلیئر ہو جائیں بہتر ہیں، مرنے کے بعد اور بہت سے حساب کتاب ہیں...... چلتا ہوں دادا جی۔''

مہریار وہاں سے باہر نکلا تو شرفو نے اندر جانے میں عجلت دکھائی لیکن مہریار نے اپنا داہنا ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ کر اسے روک دیا۔ وہ سر جھکا کر ایک قدم پیچھے ہوا اور سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔

''اندر مت جانا...... دادا جی کو آرام کی ضرورت ہے۔ روح کا آرام سمجھتے ہو شرفو؟ بس وہی کرنا چاہتے ہیں وہ۔ تھوڑا وقت دینا انہیں...... سمجھے!''

شرفو سعادت مندی سے سر ہلاتا وہاں سے نکل کر برآمدے میں چلا گیا تھا۔ مہریار نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اندر چوہدری شہاب الدین کا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ ان کی نظریں سامنے دیوار کو توڑ دینے کے درپے تھیں۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن لاچاری ایسی تھی کہ پھڑ پھڑانا بھی محال تھا۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں خوف سے سکڑی ہوئی تھیں اور سامنے دیوار کے بالکل اوپر موجود روشن دان کو دیکھ رہی تھیں۔

عکس بنتے اور مٹتے چلے جا رہے تھے۔ دیوار پر جیسے ان گنت نوکیلے پنجے اگ آئے تھے جو کسی بھی وقت انہیں دبوچ کر اپنے اندر کھینچ لینے کو بے تاب تھے۔ خوف نے ان کی زبان گنگ کر دی تھی جو لفظ غراہٹ کی صورت نکلتے تھے وہ حلق سے نکلنے کو انکاری تھے۔ تب ہی روشن دان سے سیاہ ہیولا نمودار ہوا۔ اس نے اپنا جھریوں زدہ ہاتھ اندر ڈالا اور دیوار پہ دھپ کی آواز سے مارا جیسے جسم اندر لانے کے لیے سہارا لیا ہو۔ اس کے بعد اس ہیولے کا سر جو کثیف دھویں کی مانند غیر واضح تھا وہ اندر داخل ہوا رفتہ رفتہ سارا دھڑ اور پھر ٹانگیں اسی روشن دان سے اندر آئیں اور وہ ہیولا مکمل انسانی ہیئت میں ڈھل کر دیوار پہ مکڑی کی طرح نیچے اترنا شروع ہوا۔ شہاب الدین کا تنفس کسی بھی لمحے جیسے بند ہونے کو تھا اور اس وقت انہوں نے شدت سے خواہش کی تھی کہ ان کا سانس رک جائے۔ وہ مر ہی جائیں اب۔ اس روز

روز کی کربناکی سے جان تو چھوٹے گی۔ وہ اس خوف کو سہتے ادھ موئے ہو چکے تھے۔

اور پھر وہ ہیولا ان کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا۔ ایک گول دائرے میں چکراتا ایک دم ٹھہر گیا۔ شہاب الدین کی آنکھوں نے ایک بار پھر اس ہیولے کو آفتاب کے جثے میں بدلتے دیکھا۔ ہاں وہ آفتاب ہی تھا۔ ہو بہو وہی۔ لیکن آج وہ جلا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ جلا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم سے دھواں نکل رہا تھا جیسے تازہ تازہ جلے ہوئے جسم سے اٹھتا ہے۔

''مجھے تم نے جلایا تھا نا۔ آخر تم نے مجھے جلا ہی ڈالا نا۔ تم بھی جلو گے شہاب الدین۔ تمہاری قبر تمہاری آگ جمع کر رہی ہے۔ جیسے مجھے جلایا ویسے ہی تم بھی جلو گے۔''

وہ ہیولا بولتا جا رہا تھا اور شدت کرب سے چوہدری شہاب الدین کا تنفس بگڑتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے آفتاب کو اپنے قریب آتے دیکھا۔ وہ ان کے قریب آ رہا تھا اور اس کے جسم کی سرانڈ انہیں اتنے فاصلے سے ہی محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے جسم کا ماس لوتھڑوں کی شکل میں گرنے لگا تھا بالکل جیسے موم بتی کی موم قطرہ قطرہ گر کر اسی کے گرد جمع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہیولا ان کے نیم مردہ وجود میں مدغم ہوتا وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی جیسے سارا ماحول پرانی حالت میں لوٹ گیا۔ ہر شے ساکت ہو گئی۔ کمرا پرسکون ہو گیا۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ پاتی تو روشن دان میں ہلکی ہلکی سی دھند چکرا رہی تھی۔

☆......☆......☆

سب حویلی لکھاں کے صحن میں حسب معمول جمع تھے۔ شام کا وقت تھا اور موسم میں ہلکی سی تبدیلی کے باعث شربت لسی کے بجائے چائے اور قہوے کا دور چل رہا تھا۔ چوہدری شہاب الدین آج خلاف معمول چہک رہے تھے اور کبھی نہ موجود رہنے والا قاسم بھی آج یہیں بیٹھا تھا۔ آگے پیچھے پھپھو قدسیہ کے لڑکوں کو کبھی منہ نہ لگاتا تھا لیکن آج وہ سب کو حیران کر دینے پہ تلا تھا۔ پھپھو قدسیہ کا سب سے بڑا لڑکا مبشر گارمنٹس کا کام شروع کرنے والا تھا اور اس حوالے سے قاسم اس سے اتنی تفصیلی بات چیت کر رہا تھا کہ حسنات باقی سب لڑکوں کے قریب منہ لے جا کر بڑبڑایا۔

''او بھائیو...... مجھے چونڈی کاٹو...... ہو نہ ہو یہ قاسم بھائی کو سایہ ہو گیا ہے۔ ورنہ ایسی بہکی بہکی حالت تو بخدا آج تک نہ دیکھی اس بندے کی۔''

اس کی بات پر حیات سمیت باقی دونوں نے بھی ہنسی دبائی۔ کہہ وہ بالکل درست رہا تھا۔ حسنات کی دو دن میں واپسی تھی اس لیے اس کے جانے سے پہلے سکینہ کی خواہش تھی کہ شادی کی تاریخ پکی کر دیں تا کہ وہ اپنی اگلی چھٹیاں اسی حساب سے لے کر آئے۔ چونکہ خاوند کا مزاج اچھا تھا تو انہوں نے اسی موقع پر بات کرنے کی ٹھانی۔

''لو بھئی رقیہ اور بھرا آفتاب...... سیانے کہتے ہیں دھی کا دھن جتنی جلدی مالکوں کو دے دو، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مجھے بھی اپنی امانت چاہیے اب اس لیے تین مہینے بعد کی تاریخ دے دو مجھے ویاہ کی۔ میں اپنی دھی لے جاؤں آ کر۔ میرے حیات کی پڑھائی بھی مک گئی ہے اور اب وہ خیر سے باپ کے ساتھ ہی زمین داری میں ہاتھ بٹائے گا تو دیر کرنے کی تک نہیں بنتی۔ بس اب مجھے تاریخ دو اور گھر کی بات گھر میں ہی نمٹ جائے۔''

سکینہ بی بی کی بات پر جہاں سب کے چہرے کھل اٹھے تھے وہاں چند ایسے بھی تھے جو اتر سے گئے تھے۔ ان چہروں کے اترنے کے پیچھے پیچھے اپنی اپنی توجیہات تھیں۔ حمیدہ بی بی کو دیوارنی کی بیٹی بنا ہینگ یا پھٹکری کے ٹھکانے لگتی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

''ہونہہ...... نیچ ذات...... کوڑھ کرلی...... تیور تو دیکھو ذرا اس کے۔ سمجھتی ہے بیٹی بیاہ کے پردھان بن جائے گی۔ میں بھی اپنی جتی تلے نہ مسلتی رہی تجھے رقیہ تو حمیدہ نہ کہنا۔''

سنہری جو حسب معمول سب بڑی خواتین کے بیچ بیٹھی تھی، اسے حسد کی آگ زوردار کوڑا بن کے لگی تھی اور اثرات اس کے چہرے سے صاف جھلک رہے تھے۔

''میرا تعویز اس کم بخت حسنات نے نکالا تھا نا۔ ایک دن اسے اس حویلی سے نہ نکالا تو سنہری نام نہیں میرا۔ اور کشور تیرا جینا تو محال کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ جب تک میرا بس چلا میں یہ شادی روک کر رہوں گی۔''

وہ ایک نگاہ رقیہ پہ ڈالتی تو دوسری اپنے پورشن کے برآمدے کے ستون کی آڑ میں کھڑی کشور پر جو گلابی ہوتی رنگت کے ساتھ یہاں ہونے والی بات چیت سن رہی تھی جب کہ اسی برآمدے کی سیڑھیوں پہ رابی اور خانم بیٹھی پر جوش انداز میں ادھر کان لگائے ہوئے تھیں۔

قاسم کے اندر کشور کے ہاتھ سے جانے کا افسوس قلق بن کے جاگ اٹھا تھا اور اس زمین کے ٹکڑے کا بلا شرکت غیرے مالک نہ بن پانا کرب ناک تھا۔

''تایا بہت تیز نکلا۔ سب سمجھتا ہوں کہ جس سازش کا جال بن رہا ہے اسی جال کو جب کاٹ کے پھینکے گا تو ساتھ میرا ابھی پتا کاٹے گا۔ میں بھی کچی گولیاں کھیل کر نہیں بیٹھا تایا شہاب۔ چاچا آفتاب کی بیٹی نہ سہی، جائیداد کہیں نہیں جانے دیتا میں۔''

جبکہ چوہدری شہاب الدین کو آفتاب کے گھرانے کو اپنے سمدھیانے کے طور قبول کرنا بے حد دشوار تھا۔ محض زمین و جائیدادوں کے پیچھے کس کی کمین کو اپنا بیٹا دینا پڑ رہا تھا۔

''کوئی نا/تھوڑا چر (وقت) ہی ہے۔ پھر سارے رشتے ناتے کھو میں ڈال کر اوپر سے مٹی نہ ڈالی تو شہاب الدین نام نہیں میرا۔'' وہ دل میں سوچتے کینہ توزی سے حیات کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

''ایک اپنی اولاد میری نہ بن سکی۔ سانپ پال رہا ہوں۔ ہونہہ......''

چوہدری آفتاب نے سکینہ بی بی کی بات پر ایک نظر رقیہ کو دیکھا اور اس کے آمادگی بھرے اشارے پر بات شروع کی۔ اتنے میں رابی اور خانم قریب آ کر کھڑی ہوگئیں۔

''بھرجائی! آپ کی دھی ہے جب چاہیں لے جائیں۔ رب سوہنے کا شکر گزار ہوں کہ اتنی بختوں والی ہے میری کشور جسے آپ جیسی ساس اور حیات جیسا شریک سفر ملے گا۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ میری طرف سے جب چاہیں بارات لے آئیں۔ کیوں شہاب بھا......؟''

آفتاب نے بات کے آخر میں حقہ گڑگڑاتے اور کڑوی نگاہ سے انہیں دیکھتے شہاب الدین سے پوچھا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے، سدا کی بڑبولی رابی فوراً بیچ میں کود پڑی۔

''بھلا ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے شادی کا کیا مزا ماموں جی۔''

اس کی بات پر سب ہی چونکے۔ قدسیہ نے ناگواری سے اسے گھورا جبکہ باقی سب ناسمجھی سے دیکھنے لگے۔ بھلا ایک گھر میں رہتے ہیں تو ایک ہی گھر میں بارات آئے گی نا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا اور سب کے لیے مقام حیرت کہ شہاب الدین نے رابی کی بات کو آگے بڑھاوا دے دیا۔

"کہہ تو صحیح رہی ہے رابی پتر! ایک ہی گھر میں بھلا کیا مزا......"

سب ہی حیران پریشان سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ قدسیہ کے ساتھ ان کے بیٹوں نے بھی رابی کو گھورا جس نے یہ عجیب شوشہ چھوڑا تھا۔ وہ بے چاری کھسیانی سی ہو کر بغلیں جھانکنے لگی۔

اس نے تو یونہی چلبلے پن میں ایک بات کہہ ڈالی تھی۔

"چوہدری جی! بھلا یہ کیا بات ہوئی، اب کیا حویلیاں پٹ کھود کے دور دور لے جائیں۔ اتنا بڑا صحن ہے، باغ ہیں۔ چار چفیرے قناتیں تمبو لگ جائیں گے تو سارے پنڈ کے لوگ سما جائیں گے آرام سے۔"

"دیکھ چوہدرائن!" چوہدری شہاب سکینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے گویا ہوئے۔

"تو نے اپنے جی کی کر لی نا۔ اب میرا جی بھی کر رہا ہے کہ میں اپنے پتر کی جنج حویلی سے لے کر نکلوں تو سارا پنڈ دیکھے۔ اب سارا پنڈ پھرا کے میں واپس حویلی آؤں اور وہ بھی ووہٹی کے بنا۔ اکیلا لاڑا کیا اچھا لگتا ہے پاگلوں کی طرح جنج لے کر نکلے اور واپس آئے تو خالی ہتھ ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آفتاب اپنی دھی کا ویاہ یہاں نہ کرے۔"

چوہدری شہاب سکون سے بات مکمل کر کے حقہ گڑگڑانے لگے جبکہ ان کی بات کے ردعمل میں گویا سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ آفتاب جب یہیں رہتا تھا تو بیٹی بھی یہیں سے رخصت کرے گا تو اب یہ کون سا تماشا تھا جو چوہدری شہاب لگانا چاہتے تھے۔ حیات الگ متفکر سا اٹھ کر باپ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ حسنات اور باقی لڑکے بشمول قاسم بھی قریب آ گئے لیکن قاسم کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا تردد نہیں تھا۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ چوہدری شہاب یہی کرنے والے تھے۔ سب کے چہروں پہ پریشانی دیکھتے ہوئے چوہدری آفتاب نے سیدھے ہوتے ہوئے چوہدری شہاب سے استفسار کیا۔

"بھا شہاب! کھل کر بات کریں۔ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا کوئی نئی شرط ہے ویاہ کے لیے؟ میری دھی اگر یہاں سے رخصت نہیں ہو گی تو کیا اس کے نانکے پنڈ لے جاؤں؟" آفتاب کے لہجے میں معمولی سی طنز کی آمیزش نے چوہدری شہاب کے ماتھے پہ بل ڈالے تھے لیکن ابھی ضبط کا وقت تھا۔ وہ تلخی حلق میں اتارتے ہوئے جب بھائی سے مخاطب ہوئے تو ان کا لہجہ سادہ اور شیریں تھا۔

"تُو تو غصہ ہی کھا گیا میرا ویر...... میرے پہلے پتر کا ویاہ ہے اور میرے بھی ارمان ہیں۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ میرے پتر کی جنج حویلی کے اندر ہی گھوم پھر کر نہ آئے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ویاہ تک تُو اور بچیاں چھوٹی حویلی چلے جاؤ جو ابا جی نے تیری مرحومہ ماں کے نام کی تھی اور ظاہر ہے جواب تیری ہی ہے۔ وہ تھاں جگہ بھی کون سا بے گانی ہے، تیرا ہی گھر ہے۔ دھی کو یہاں سے رخصت کرے یا وہاں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کم از کم میرا اپنے پتر کو گج وج کے بیاہنے کا چاء تو پورا ہو گا نا۔"

چوہدری شہاب نے رسان سے سارا معاملہ درمیان میں رکھ کر جیسے سبھی کو ہم نوا بنا لیا تھا۔ وہاں موجود تمام لوگوں کے چہروں پہ اس بات کو لے کر آمادگی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ رابی اور خانم ابھی سے ہی مارے خوشی کے گلے لگ گئی تھیں جبکہ خواتین نے بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر حامی سی بھری تھی۔ البتہ چوہدری آفتاب کے ماتھے پہ شکنوں کا جال تھا۔ وہ تذبذب کا شکار تھے۔ انہیں اس میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ عجیب بے نام سا احساس بھی تھا۔ حسنات سب سے پہلے آگے بڑھا اور چاچا آفتاب کے گلے میں پشت سے بانہیں ڈالتا ہوا بولا۔

"مان جائیں چاچا جی۔ قسم سے مزا آئے گا۔ اگر ابا جی کی ہر بات ٹالی گئی تو وہ معاملہ بگاڑ دیں گے۔ پلیز چاچا جی۔"

وہ ملتجی لہجے میں محض اتنی آواز سے بول رہا تھا جو آفتاب کے کانوں میں بخوبی اتر سکے۔ جبکہ قاسم اور چوہدری شہاب اس کے التفات پہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے تھے۔ سنہری کی سانپ جیسی نگاہیں سب ہی کو سالم نگلنے کو الگ بے تاب تھیں۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ چوہدری آفتاب اس بات سے انکار کر دیں تو یہ رشتہ کھٹائی میں جا پڑے۔ وہ اور حمیدہ چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتی اس ماحول میں

اوپری سی لگ رہی تھیں۔ رقیہ کی منتظر نگاہیں خاوند پر تھیں کہ وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھیں تو وہ حامی بھر لینے کا اشارہ دے سکیں۔ سبھی اپنی اپنی جگہ اس فیصلے پہ اگر راضی تھے تو یہ فکر بھی تھی کہ کسی ایک فریق کے اڑنے سے بات ساری کی ساری بگڑ جائے گی۔

ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے چوہدری آفتاب نے جھکا سر اٹھایا اور تمام پہ اچٹتی نگاہ ڈال کر چوہدری شہاب کو دیکھا۔

"مجھے منظور ہے۔ جیسے بچوں کی اور آپ کی خوشی۔ لیکن پھر سال ہم وہیں نکالیں گے۔ چھ ماہ بعد واپس اپنی حویلی آ جائیں گے۔"

چوہدری آفتاب کے کہنے کی دیر تھی جیسے سکینہ اور رقیہ کا سانس بحال ہوا تھا۔ حیات نے الگ آنکھیں متشکرانہ میچی تھیں۔ خواتین زور و شور سے شادی کی تیاریوں کے حوالے سے گفتگو کرنے لگیں۔ لڑکے واپس جگہوں پہ جا ٹکے۔ رابی اور خانم نے اس خوشی میں پینگ کا رخ کیا تھا۔ وہ جھولا جھول کر اپنی خوشی منانے کی عادی تھیں۔

"لے یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔ تیرا گھر ہے سوہنیا۔ بلکہ تیری تو وکھری ہی موجیں ہیں۔ یہ بھی گھر تیرا، وہ بھی تیرا۔ تجھ سا بھی کوئی دھنی ہوگا کیا آفتاب......" چوہدری شہاب مطمئن سے کہتے چوہدری آفتاب کو طنز کرنے لگے تھے لیکن سارے میں اتنا خوش گوار سا شور اٹھا تھا کہ ہر آواز دبتی چلی گئی۔ دل میں اٹھتے اندیشوں کی بھی۔ حمیدہ اور سنہری نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حمیدہ کندھے ڈھلکا کر باقی سب کی جانب متوجہ ہو گئیں جبکہ سنہری نے سوچ لیا تھا کہ اسے کسی سنہری موقعے کی تلاش کرنا تھی۔

☆......☆......☆

حسنات واپس جا چکا تھا۔ اسے اب شادی کے قریب آنا تھا۔ رابی اور خانم کے پرچے ختم ہوتے ہی جیسے سب ہی میں شادی کی تیاریوں کے حوالے سے جوش و خروش بڑھ گیا۔ چوہدری آفتاب اور رقیہ چھوٹی حویلی کا چکر لگانے گئے تھے۔ وہاں جن جن مرمتوں کی ضرورت تھی ان کے لیے مزدور لگانے تھے۔ سالوں بعد یہ حویلی کھلی تھی۔ چوہدری آفتاب اندر داخل ہوئے تو باپ کی یاد کے ساتھ ماں

کے طور پر بڑی چوہدرائن ہی یاد آئیں۔ اپنی ماں کو نہ تو دیکھا تھا نہ لمس محسوس کیا تھا لیکن دہلیز پار کرتے ہی جب وہ چھت کو جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھے تو باپ کے بتائے الفاظ ذہن دہرانے لگا۔ چوہدری شجاعت نے انہیں بتایا تھا کہ ان کی ماں ان سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر گئی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر ان سیڑھیوں کو دیکھتے جا رہے تھے اور آنکھیں کب بھیگ گئیں پتا بھی نہیں چلا۔ انہوں نے اپنی ماں کی بے بسی کا سوچا جو ان لمحات میں انہوں نے محسوس کی ہوگی۔ رقیہ نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مسکرا کے اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ انسان کے دل میں موجود جذبات اور جسم میں جتنی بھی تبدیلیاں آجائیں لیکن ماں کی جگہ اور ضرورت کبھی نہیں بدلتی۔ وہ سر جھٹک کر اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ سارے گھر کو روغن کی ضرورت تھی۔ کچن اور ڈرائنگ روم کی کلی حالت بہتر ہونے والی تھی۔

''کچن میں بس دو چار خانے بنوا دیں چوہدری جی۔ مسالے وغیرہ اور ضروری برتنوں کے لیے۔ باقی چولہا تو وہی لے آوں گی۔ ہم نے کون سا سدا رہنا ہے یہاں۔'' رقیہ نے باورچی خانے کا جائزہ لے کر سرسری سا کہا تو چوہدری آفتاب دوٹوک بولے۔

''نہیں...... چولہا گیس والا لگے گا۔ سلنڈر قاسم شام کو ہی پہنچا دے گا رقیہ...... بھا شہاب نے سختی سے منع کرایا ہے کہ مٹی کے تیل والا چولہا نہیں استعمال کرنا یہ ساتھ والے پنڈ میں دو گھروں میں عورتیں مری ہیں چولہے پھٹنے سے۔''

''نا چوہدری جی۔ میرا ہاتھ بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں چلانا سلنڈر شلنڈر۔'' رقیہ متذبذب سی بولیں تو چوہدری آفتاب مسکرا دیے۔

''ڈر نکالے گی تو نکلے گا نا۔ جب استعمال کر لوگی تو ہاتھ بھی بیٹھ جائے گا۔ فکر نہ کرو۔''

وہ خاموش ہو گئیں۔ بحث کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ دونوں میاں بیوی گھوم پھر کر حویلی کا جائزہ لینے اور کچھ ضروری کاموں کے بعد شام تک واپس حویلی لکھاں کی حدود میں داخل ہوئے تو صحن کے بیچوں بیچ سر جوڑے بیٹھے قاسم اور چوہدری شہاب نے دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا اور پھر جب ایک دوسرے کو دیکھا تو ان کی نگاہوں میں شیطان رقص کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سنہری اپنے کمرے میں نیم اندھیرا کیے خون میں اٹھتے ابال پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی حربے سے حیات راؤ کو اپنے نام کرا سکتی تھی لیکن ہر بار اس کا داؤ ناکام ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تھا کہ اس سلطنت پہ تسلط جمانے کے لیے اسے کس سے شادی کرنا فائدہ دے گا۔

قدسیہ پھپھو کے تینوں لڑکے مبشر، زبیر اور عمیر بھی اچھی طرح جانچے تھے لیکن ان میں سب سے بڑے مبشر اور چھوٹے عمیر کی بات پکی ہو چکی تھی۔ چوہدری انور کے دور پار کے رشتہ دار تھے جن کی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ باقی رہ گیا زبیر تو سنہری کو لگتا تھا کہ اس کا شمار کسی گنتی میں ہی نہیں تھا۔ رہ سہ کر نگاہیں انہی دو بھائیوں پر آٹھہرتی تھیں جو پہلے دن سے اس کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئے تھے۔ حمیدہ تو اسے سوچتی ہی قاسم کے لیے تھیں لیکن وہ ایسی گھاگ تھی کہ نہ انہیں صاف انکار کہتی تھی نہ اقرار کرتی تھی۔ سنہری ہر ممکن حد تک جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ وہ اٹھی اور دراز سے ایک گلابی صفحوں والی کاپی نکالی۔ ڈھونڈنے سے ایک کچی پینسل ہاتھ آئی تھی، وہی پکڑ لی۔ سکون سے تپائی پہ کاغذ رکھا اور لکھنے لگی۔

”ہمارے ملن کے دن بہت کم ہیں۔ میرے من میں کچھ خدشات ہیں جو میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ ہو سکے تو رات گیارہ بجے کے بعد پچھلے باغیچے کی کوٹھری میں میرا انتظار کیجیے گا، میں ملاقات کے لیے پہنچ جاؤں گی۔ دیکھیے مایوس نہ کیجیے گا۔ آپ کے ساتھ کی خواہش مند......“

نیچے ایک بڑے دل کے گرد چھوٹے چھوٹے کئی دل بنا کر کچی پینسل سے رنگ بھر دیے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے اپنے پنڈ کی سہیلیوں کے گھر جمعرات وی سی آر پر فلم دیکھنے جایا کرتی تھی۔ یہ زمانے وہ تھے کہ پنڈوں میں خال خال ہی کسی کے گھر ٹیلی ویژن ہوتا تھا اور وی سی آر تو جیسے سوغات کی حیثیت رکھتی تھی۔ سنہری کی سنگت اپنے جیسی ذہنیت رکھنے والی لڑکیوں کے ساتھ تھی۔ چھپ چھپ کے فلمیں دیکھنے کا کمال تھا کہ خط لکھنا اس کے لیے ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ بے نام خط پڑھ کر ملاقاتی کوٹھری میں ضرور آئے گا۔

وہ چوکنی ہو کر کمرے سے نکلی۔ حمیدہ کے کمرے میں جھانکا تو دوپہر کی وقتِ معمول کی نیند لے

رہی تھیں۔ قاسم اس وقت ویسے ہی گھر نہیں ہوتا تھا۔ راہداریاں عبور کرتی وہ برآمدے میں نکلی اور پھر اس کا رخ حیات راؤ کی حویلی کی جانب تھا۔ وہاں بھی حسب معمول خاموشی کا راج تھا۔ حسنات کے جانے سے سب ہی آوازیں اور شور شرابا تھم گیا تھا اور اب سب کچھ پرانے معمول پر آچکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مرد اس وقت ڈیرے پر ہوتے ہیں لہٰذا وہ سیدھی حیات راؤ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک ستائشی نگاہ اس کے خوب صورتی سے سجے کمرے پہ ڈالی۔ دل میں کشور کے لیے حسد کے جذبات مزید سر اٹھانے لگے۔ وہ چلتی ہوئی سائیڈ ٹیبل کے قریب آئی اور بھاری بھرکم پتھر کے لیمپ کے نیچے وہ کاغذ دبا دیا یوں کہ دکھائی بھی دیتا رہے۔ جس خاموشی سے آئی ویسے ہی باہر نکل گئی۔ آنے والے وقت کا سوچ کر اس کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

☆......☆......☆

گاؤں کی نیم خنک رات شروع ہو چکی تھی۔ شام ڈھلتے ہی اب موسم سرد سا محسوس ہوتا تھا جبکہ دن ابھی بھی بھرپور گرم تھے۔ ویسے بھی پنڈوں میں راتیں عام طور پر ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ حویلی لکھاں کے مکین بھی رات نو بجے سونے کے عادی تھے اور اب تک تقریباً گھر کا ہر بزرگ کمرے میں نیم غنودہ یا مکمل نیند کے مزے لے رہا تھا جبکہ جوان پود بزرگوں کی نسبت کچھ دیر سے سونے کی عادی تھی۔ اور آج تو جیسے رات ہی خاص تھی۔

قاسم اپنے کمرے میں سیاہ شلوار قمیص زیب تن کیے پوری تیاری کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑا اپنا عکس دیکھتے ہوئے بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آج رات اس کی قسمت بدلنے والی ہے۔ وہ چاند جسے پانے کی جستجو دل میں دبائے وہ تمام عمر کسک سی لیے رہ جاتا آج جھولی میں گرنے والا تھا۔ اس نے سنگھار میز سے ایک قیمتی پرفیوم کی شیشی اٹھائی جو وہ شہر سے لایا تھا اور اپنے اوپر اچھی خاصی انڈیل لی۔ قریب ہی سیٹی سے شال اٹھا کر اپنے چوڑے کندھوں پہ سیٹ کی۔ خود کو جانچتی ناقدانہ نگاہیں یکدم توصیفی نگاہوں میں بدل گئیں۔

پوری حویلی میں مجھ سا بھلا کوئی ہو سکتا ہے۔ میں تو راہ چلتیوں کی سانسیں بند کر دوں تو پھر بھلا

حویلی لکھاں کی کڑیاں کیا شے ہیں۔ اپنی مغرور سوچ پہ نازاں وہ ایک گہرا سانس بھر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دھڑکنوں کا شور سینے میں دبائے اس نے خارجی دروازے کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

حیات راؤ بے چینی سے کمرے میں مسلسل ٹہلتے ہوئے ابا جی اور اماں کے کمرے کی بتی بجھنے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکے ہیں اس نے اپنے کپڑوں کی نادیدہ شکنیں درست کیں اور باہر نکلنے لگا لیکن یکدم کچھ خیال آیا تو فوراً کمرے میں موجود پی ٹی سی ایل کے پاس آیا۔ یہ فون سیٹ اس کے کمرے میں ہی موجود رہتا تھا کیونکہ حویلی کی عورتوں کو اجازت نہیں تھی فون اٹھانے کی اس لیے حیات نے اپنے کمرے میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے فوراً کسی کو کال ملائی۔ نمبر گھماتے اس کی انگلیوں میں بے چینی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈائل لمحے کے چوتھائی حصے میں گھوم کے واپس آئے اور وہ اگلا نمبر گھما سکے۔ جیسے ہی نمبر پورے ہوئے، دوسری طرف بیل جانے لگی اور کال پک ہوتے ہی وہ فوراً بولا۔

''میں تیار ہوں۔ بس آ رہا ہوں۔ جلدی پہنچو۔'' کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پہ ڈالا اور کمرے سے باہر نکل کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔

☆......☆......☆

آنکھوں میں ڈھیر سارا کاجل ڈالے، لمبے بالوں کو گلابی پراندے میں گوندھے چوڑی پاجامے کے اوپر لمبی گھیر دار قمیص زیب تن کیے وہ یوں نک سک سے تیار تھی جیسے ابھی مایوں بیٹھنے والی ہو۔ خود کو آئینے میں اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد الماری کے پٹ کھولے اور سب سے نچلے خانے سے رنگین دھاگوں سے مزین کھسہ نکالا اور پیروں میں سجانے کے بعد وہ دبے پیر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ خود کے کانوں میں دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اردگرد اچھی طرح نظریں گھما کر جائزہ لیا اور باہری دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

وہ خود کو پور پور سجائے ہوئے تھی لیکن ایک بڑی سی سیاہ شیشوں کی کڑھائی والی چادر سے اپنے حسین و رنگین پیراہن کو چھپائے کوٹھری کی جانب جا رہی تھی۔ آدھی خلقت تو ویسے ہی سو چکی تھی جو جاگ رہے تھے انہیں ہوش ہی کب تھا اور جنہیں ہوش تھا وہ بھی اس کی دانست میں بے خبر تھے۔

دبے پیر چلتی وہ جیسے ہی کوٹھری کے دروازے کے پاس پہنچی اس نے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور پیروں کی لرزش کو قابو کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن یہ مشکل امر تھا۔ پہلی بار انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمانے سے پہلے چادر سے دکھائی دیتی اپنی ایک آنکھ سے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

ٹانگوں کی کپکپاہٹ اتنی بڑھ گئی تھی کہ کھڑے رہنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ یہ پل ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی مردانہ خوشبو کا تیز جھونکا نتھنوں سے ٹکرایا تو دل بے ساختہ بلیوں اچھلا۔

حیات راؤ: اس کا محبوب وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ احساس ہی جاں فزا تھا۔ وہ چہرہ مخالف سمت موجود کوٹھری کی واحد سلاخوں والی کھڑکی کی جانب کیے ہوئے تھا جہاں سے پورے چاند کی روشنی اس کے جسم سے منعکس ہوتے اطراف میں پھیل رہی تھی۔

اس کا لمبا چوڑا شاندار وجود اس روشنی کے عکس میں خواب ناک سا لگ رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھی۔ ہلکی سی انگلیوں کی جنبش سے سر سے چادر کھسکائی، اسے ڈھیلا کر کے کندھوں پہ ڈھلکایا اور بے حد لگاوٹ سے حیات راؤ کے داہنے کاندھے کی پشت پہ سہلانے کے انداز میں ہاتھ رکھا اور اپنے ہاتھ پر

پیشانی ٹکادی۔

''مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔ میں جانتی تھی کہ میرے پیار کی کشش تمہیں بے چین کر کے رہے گی۔ آج سے مجھے تم اپنی غلامی میں سمجھنا کہ تم نے مجھے بے مول خرید لیا حیات راؤ!''

اس کے الفاظ کوٹھری میں گونجنے کی دیر تھی مقابل نے ایک جھٹکے سے رخ پھیر کر پلٹ کر دیکھا۔

''تم......'' حیرت کے مارے الفاظ گم ہو گئے جبکہ آنکھوں میں صدمہ بھی تھا۔

سنہری کی زبان گنگ تھی۔ وہ بس ششدر سی قاسم راؤ کو اپنے سامنے پہاڑ کی طرح ایستادہ تک رہی تھی جبکہ حواس جیسے شل ہو گئے تھے اور اگلے ہی پل پوری کوٹھری پیلے رنگ کی روشنی میں نہا گئی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا اور اندر آتے چہروں کو دیکھ کر صحیح معنوں میں سنہری اور قاسم راؤ کا رنگ فق ہوا تھا۔

قسط نمبر 10

شہاب الدین کی حویلی کے ہال کمرے میں پنچائیت لگی تھی اس وقت۔ حویلی کے تمام بڑے وہاں موجود تھے۔ قدسیہ پھپھو کے لڑکے اور حیات بھی ایک طرف چپ سادھے کھڑے تھے جبکہ لڑکیوں میں سے کسی کو وہاں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ قاسم کمرے کے بیچوں بیچ سینہ اکڑائے اور نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ غیض و غضب اور بے عزتی کے احساس نے اس وقت اسے جیسے مفلوج کر دیا تھا۔ ساری رات سے کوئی سو نہیں سکا تھا۔ بات چھوٹی بھی تو نہیں تھی۔ دن چڑھتے ہی چوہدری شہاب الدین کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے چہرے پہ شدید برہمی کے آثار تھے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ ان کی ناک کے نیچے ایسے کھیل بھی کھیلے جائیں گے۔ آج تک ان کی حویلی میں کسی بھی لڑکے لڑکی کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے کھلے عام بات چیت کریں۔ اور یہاں رات کے اندھیرے میں دو جوان لڑکا لڑکی باغیچے کی کوٹھری میں دھر لیے گئے تھے۔ وہ ہولناک منظر حویلی کے بزرگوں کے لیے دل دہلا دینے والا تھا لیکن جوان پود کے لیے سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ جس پر عمل درآمد کے لیے بے حد باریک بینی اور احتیاط سے کام لیا گیا تھا۔ حیات راؤ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے جبکہ نگاہیں فرش کو ٹٹول رہی تھیں۔ فرش جیسے اسکرین بن گیا تھا جس پہ گزشتہ دن کے تمام واقعات ایک تسلسل سے چلنے لگے تھے۔

وہ ضروری کام کی وجہ سے جلدی حویلی آ گیا تھا۔ اسے تیار ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ ابھی شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ وہ جلدی جلدی کمرے میں جا رہا تھا جب اپنے پیچھے رابی کی پکار پر وہ رکا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ راہداری کے کنارے پہ دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ حیات حیرت بھری مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھے گیا تو رابی نے اردگرد نگاہیں پھیر کر اسے ہاتھ سے

پاس آنے کا اشارہ کیا۔ حیات سمجھ گیا کہ اس پٹاخی نے کوئی نرالی کہانی سنانی ہو گی اور وہ رابی اور خانم کی بے سروپا گفتگو سننے کا شروع سے عادی تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا تو مزید حیرت کا جھٹکا اس کے پیچھے ایک طرف کو ہو کر کھڑی خانم کو دیکھ کر لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ عجیب ہوا ہے ورنہ بات کرنے کا ایسا طریقہ دونوں نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔

''اوئے شکلو۔ کیا بات ہے۔ ایسے کیوں کھڑی ہو دونوں۔ کیا کر کے آ رہی ہو اب؟''

حیات نے دونوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو رابی ہاتھوں سے ہوا میں دباؤ دیتے ہوئے اسے آہستہ بولنے کا اشارہ دے گئی۔ حیات نے اچنبھے سے اس کے پیچھے کھڑی خانم کو دیکھا جس کی رنگت اسے فق سی محسوس ہوئی۔ وہ واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے رابی...... گڈی...... جلدی بتاؤ مجھے پریشان کر رہی ہو اب۔''

''لالہ! یہ دیکھیں۔''

رابی نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اسے پکڑایا جسے حیات نے ناسمجھی سے تھام لیا۔ خانم کا چہرہ بلاوجہ تمتما اٹھا تھا۔ وہ رابی جتنی پر اعتماد نہیں تھی۔ حیات راؤ نے وہ کاغذ کھولا اور اسے پڑھتے ہوئے اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہونا شروع ہوئی اور آخر تک وہ غصے کی شدت سے لال ہوتی چلی گئی۔ اس نے کاغذ کو مٹھی میں بھینچا اور دبی آواز میں غرایا۔

''یہ سب کیا بے ہودگی ہے رابی...... اب کیا مذاق کی حد سمجھانی پڑے گی تم لوگوں کو!''

رابی نے گردن موڑ کر ایک نظر خانم کو دیکھا جو روہانسی ہو رہی تھی اور پھر مناسب الفاظ سوچتی واپس حیات سے مخاطب ہوئی۔

''لالہ! آپ نے پڑھا تو بنا سوچے سمجھے ہمیں ایسا کہہ رہے ہیں۔ سوچیں کوئی اور پڑھ لیتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا۔''

''رابی! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ اصل بات کی طرف آؤ۔'' وہ ابھی بھی تیوریاں ڈالے ہوئے تھا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا یہ سب۔

''یہ خط ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے آپ ہی کے کمرے سے اٹھایا ہے لالہ، سنہری نے رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے آئی تھی یہاں۔ اسے لگا اسے کسی نے نہیں دیکھا لیکن میں اور خانم پیٹیوں والے کمرے میں تھے۔ مامی جی نے رضائیاں نکال کر دینے کا کہا تھا۔ وہاں سے آپ کا کمرا نظر آتا ہے۔ کھڑاک ہوا تو میں نے باہر جھانکا۔ تبھی سنہری کو آپ کے کمرے میں چوروں کی طرح داخل ہوتے دیکھا۔ ہم دونوں بنا آواز وہیں دبکے ہوئے اسے دیکھتی رہیں۔ جب وہ باہر نکل کر واپس چلی گئی تو ہم آپ کے کمرے میں گئیں، وہاں سامنے ہی لیمپ کے نیچے یہ خط دبا ہوا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے وہ کشور آپا بن کر آپ سے ملے گی۔ خانم سکینہ مامی کے پاس جانے لگی تھی اسے لے کر، لیکن مجھے بہتر یہی لگا کہ یہ خط آپ کے حوالے کر دوں کیونکہ لالہ یہ لڑکی دن بدن زچ کرتی جا رہی ہے۔ سکینہ مامی ہو سکتا ہے بات دبا دیتیں کیونکہ ان کے سامنے سنہری کا سارا وقت نہیں گزرتا جبکہ ہم تقریباً سارا دن اس کی بے ہودگیاں برداشت کرتے ہیں اس لیے ہمیں پتا ہے کہ اسے اگر روکا نہ گیا تو وہ دوبارہ پہلے سے زیادہ خوف ناک حرکت کرتی ہے۔ اس کے اندر کیا چل رہا ہے یہ تو نہیں پتا لیکن لالہ، ذرا چیک کریں۔''

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور حیات کے ہاتھ میں پکڑے خط کی پرت کھول کر اس پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کو بلایا گیا ہے ملنے لیکن ملنے والی کا نام نہیں لکھا بس ابتدائی سطر سے مبہم سا اشارہ ملتا ہے جیسے بلانے والی کشور آپا ہیں۔ تو اس ساری گیم کا کیا مطلب ہوا لالہ......؟''

وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے پریشان کن تاثرات لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔ لیکن حیات کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ رابی اور خانم کو اس کا گیم سمجھ میں آیا یا نہیں لیکن وہ خود مکمل طور پر سمجھ گیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سنجیدگی سے خاموش رہنے کا کہہ کر واپس بھیجا اور خود سیدھا قدسیہ پھپھو کے گھر چلا گیا۔ مبشر کے ساتھ اس کی خاصی دوستی تھی۔ اس نے سارا معاملہ اس سے شیئر کیا تو وہ بھی بات کی تہ تک جا پہنچا اور پھر ہر پہلو سے سوچ بچار کر کے مبشر یہ خط بے حد احتیاط سے قاسم کی ڈریسنگ پر رکھ آیا اور نتیجتاً کوٹھری میں سے قاسم اور سنہری برآمد ہوئے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ سنہری کی حالت زیادہ بری تھی کیونکہ قاسم اس کی آخری چال تھی جو وقت سے پہلے چل دی گئی تھی۔ حیات اور مبشر حمیدہ چاچی سمیت تقریباً تمام بزرگوں کے ساتھ وہاں دھاوا بول بیٹھے تھے۔ حمیدہ کو جب بتایا گیا کہ قاسم اور سنہری کوٹھری میں ملاقات کی غرض سے موجود ہیں تو وہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے سب کو غلط ثابت کرنے کے لیے جوش میں سب سے آگے آگے تھیں۔ پیچھے شہاب الدین کی معیت میں بھی بے یقینی کی کیفیت میں وہاں چل پڑے۔ دھاڑ سے دروازہ کھولنے والی بھی حمیدہ تھیں جنہیں یہ یقین تھا کہ جب وہ دروازہ کھولیں گی تو وہاں کوئی بھی نہیں ہوگا اور وہ سب کو ذلیل کر کے رکھ دیں گی لیکن صورت حال ان کی توقعات سے بالکل الٹ نکل آئی تھی۔ وہاں نا صرف قاسم اور سنہری موجود تھے بلکہ قابل اعتراض حد تک ایک دوسرے کے قریب بھی کھڑے تھے۔ اندر ان دونوں کا لہو جیسے نچڑ گیا تھا اور باہر سے جھانکتی گردنوں میں سب سے پیچھے کھڑے حیات اور مبشر نے اطمینان سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ سانپ اور لاٹھی ایک ساتھ موجود تھے اور اب چاہے سانپ مارا جاتا یا لاٹھی توڑی جاتی دونوں صورتوں میں سنہری کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔

حیات کو اس لڑکی کی شکل سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ اگر دو کم سن بچیاں خط کی سنگینی بھانپ گئی تھیں تو بھلا وہ کیسے نہ سمجھتا۔ باشعور اور شہر میں کئی سال رہ کر پڑھائی کرنے والا زیرک ذہن تھا اس کے پاس۔ سنہری نے اپنا سنہرا جال اس پہ پھینکا تھا۔ وہ خط پڑھتے ہی سوچ لیتا کہ اسے کشور نے بلایا ہے۔ اور کشور کے ایسے بلاوے پر حیرت اور لاکھ ناگواری کے باوجود وہ کوٹھری میں کشور سے ملنے ضرور جاتا اور اس کے بعد وہ سنہری کے رحم و کرم پر ہوتا۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ وہ کرتی۔ اس چھوٹی سی چار دیواری میں وہ اپنے ناموس اور پندار کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھما کر ہی باہر آتا۔

اسے سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی تھی۔ کل جب اس نے مبشر کے سامنے سارا معاملہ رکھا تھا تو اس نے یہی رائے دی تھی کہ دونوں کو اکٹھا کر کے پکڑوا دیا جائے۔ لیکن نا جانے کیوں حیات کی ہمت نہیں بندھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے حویلی کی عزت پہ بٹا لگے گا۔ وہ کوئی ایسی راہ سوچنا چاہ رہا تھا جس سے معاملہ خود بخود اس نہج پہ پہنچ کر نمٹ جائے۔ ان کی کسی ترکیب سے پہلے ہی یہاں یہ منظر ترتیب میں آ چکا

تھا۔ لیکن یہ کمال کس کا تھا وہ دونوں لاعلم تھے کہ بس ایک دوسرے کو دیکھ کر نگاہیں اور کندھے اچکا کر رہ گئے تھے۔ سب گھر والوں کو وہاں بلا کے لانے والا کون تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کوئی نہیں تھا تو؟

حالانکہ یہ سب کچھ کرنے کا مشورہ مبشر نے دیا ضرور تھا، اسے بھی سنہری کی طرف سے خدشات لاحق تھے اور قاسم کے بارے میں بھی رائے حویلی کے کسی فرد کی اچھی نہیں تھی اس لیے اس نے حیات سے کہا تھا کہ

''یہ گند قاسم اور حمیدہ مامی لے کر آئے ہیں نا حویلی میں تو بہتر ہے کہ وہی سمیٹیں۔ سب ہی جانتے ہیں قاسم نے کشور کے لیے اپنا ذہن بنا رکھا تھا یہ تو سکینہ مامی نے وقت پر بات کر دی ورنہ ہوسکتا ہے آج تو قاسم کی برات کے دن گن رہا ہوتا۔''

اور حیات کا تن بدن جیسے اس سوچ سے ہی جھلس گیا تھا۔ وہ کشور کی عزت پہ ہلکی سی آنچ آنے نہیں دے سکتا تھا۔ تب ہی دونوں نے خاموشی سے خط جا کر قاسم کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ لیکن پوری حویلی کے بڑوں کو وہاں بلا لانے کا کارنامہ ان کا نہیں تھا۔

اب حویلی کے ہی لوگوں کی پنچائیت سجی تھی اور بیچ میں مجرموں کی طرح قاسم اور سنہری کھڑے تھے۔ قاسم کی نخوت سے تنی بھنویں اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتے اشتعال کو ظاہر کر رہی تھیں۔ یہ سب تو اس کے سان وگمان میں نہیں تھا۔ بھلا سنہری کو کب اس نے چاہا تھا کہ کوٹھری میں چلی آئے۔ وہ تو کشور کی توقع کر رہا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس کا دل بلیوں اچھلا تھا۔ خط کا متن پڑھ کر اسے لمحے کے چوتھائی حصے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خط کشور کی جانب سے رکھا گیا ہے اور جیسے سارا خون اس کے خوب صورت چہرے پر جمع ہوا تھا۔

یہ تو اس کی سوچوں سے ماورا تھا کہ وہ کشور جو اس کے ہاتھوں سے مچھلی کی طرح پھسل گئی تھی دوبارہ اپنی مرضی سے اس کی تقدیر بننے کو تیار تھی۔ اگر ایسا تھا تو وہ حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا لیکن کشور کو اپنے نام کروا کے رہے گا۔ بھلے کشور سے شادی کرنے کے پیچھے بڑی وجہ چوہدری آفتاب کی جائیداد تھی لیکن کشور کے لیے اس کے دل میں ہمیشہ سے خاص جذبات رہے تھے۔ اسے اگر حیات

راؤ سے شدید حسد تھا تو اس کے پیچھے ایک وجہ کشور بھی تھی اور کیسا لطف ہو گا جب حویلی والوں کو کشور کا انکار پہنچے گا اور وہ قاسم کی محبت کا دم بھرے گی۔ اس سوچ نے اس کے پورے وجود میں سنسنی بھر دی تھی۔ وہ بالکل ایسے تیار ہو کر گیا تھا کوٹھری میں جیسے اب سے پہلے کشور نے اسے دیکھ ہی نہ رکھا ہو۔

سلاخوں کے پیچھے سے دکھائی دیتے چاند کی اجلی روشنی کو تکتے وہ کشور کے آنے کا پل پل گن رہا تھا۔ جس وقت دروازہ کھلا تھا وہ چاہ کر بھی مڑ نہیں پایا تھا کیونکہ وہ اپنی ازلی انا کے ہاتھوں مجبور کشور کو اپنی بے تابی دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اگلے کچھ لمحوں میں وہ اپنی انا کے اونچے پیر کے نیچے دبا پڑا تھا جب اس کے کندھے پہ ایک نسوانی ہاتھ پھسلتا ہوا اوپر تلک آیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے دل کے مقام تک آتا، یکدم اس کے کانوں میں آنے والی کی مانوس آواز پڑی تھی اور پھر حیات کا نام اس نے سنا تھا لیکن عین اسی پل کوٹھری روشنی سے جگمگا اٹھی تھی۔ وہ بوکھلا کر پلٹا تھا اور اپنے سامنے پہلے سنہری کے وجود کو اور اس کے عقب میں حویلی کے بزرگوں کو دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا تھا۔ سنہری کے منہ سے نکلا حیات کا نام اس کے شعور سے محو ہو کر لاشعور میں چلا گیا۔ وہ اس وقت اپنی حالت زار پہ بھی غور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک نظر سنہری کو دیکھا جس کی جگہ وہ کشور کو تصور کر رہا تھا اور دوسری نگاہ ماں کے ستے چہرے پہ ڈالی تو جیسے یکدم عرش سے فرش پہ لا پٹخا گیا۔

شہاب الدین اسے متاسفانہ دیکھتے واپس مڑ گئے تھے اور باقی لوگوں نے ان کی تقلید کی تھی۔ پیچھے کوٹھری میں بس قاسم، سنہری اور حمیدہ رہ گئے تھے اور تینوں کی زبانیں جیسے وہ سب ساتھ لے گئے تھے۔

چوہدری شہاب الدین کے کھنکارنے پر وہ چونکا اور گزری شب کے اثرات سے خود کو بمشکل باہر نکالتا ذہن کو حاضر کیا۔

''بات چھوٹی تو نہیں ہے لیکن گھر کی عزت اچھالی نہیں جاتی اس لیے رولے غولے میں مت ڈلو سارے۔ گھر کے بچے ہیں، چھڈو مٹی پاؤ۔''

چوہدری شہاب الدین کی اس قدر سہل بیان بازی پہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ یعنی اتنا بڑا قدم اٹھایا گیا حویلی کے اندر اور وہ کہہ رہے تھے مٹی ڈالو۔ قدسیہ پھپھو کو بالکل یہ بات ہضم

نہیں ہوئی تھی۔

''ایسے کیسے مٹی پاؤ شہاب پائین۔ یہ کوئی معمولی گل ہے۔ اس مسئلے کا حل نکالیں۔ منڈا گھر کا ہے کڑی گھر کی نہیں ہے۔ اور ایک گندی مچھلی پورا تالاب گندا کر دیتی ہے۔ فیصلہ دیں آپ۔ مک مکا نہیں کریں۔''

وہ ذرا تیکھے لہجے میں جتاتے ہوئے سنہری کی جانب دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ پہلی بار تھا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا یا تھا تو زبان بندی اس وقت ضروری تھی۔ حمیدہ، قدسیہ کی بات پہ تاؤ کھا گئیں۔ فوراً اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی بولیں۔

''بچی بھی گھر کی ہے قدسیہ آپا...... خوامخواہ بات کو بڑھاؤ نہیں۔ میں تو اسے اس حویلی میں بیٹی بنا کر ہی لائی ہوں۔''

''تو پھر بیٹی سے بہو بنا لو اب۔'' یہ ٹھہری ہوئی آواز چوہدری آفتاب کی تھی جو اب تک خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی اس بات پر قاسم اور سنہری نے بیک وقت انہیں تلملا کر دیکھا تھا۔ باقی سب کے چہروں پہ تائید رقم تھی۔

''کل رات کو جو بھی ہوا اس کی گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب دھیوں بہنوں والے ہیں لیکن اب جب بات اس حد تک گئی ہے تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ اپنی پھپوی (بھانجی) کو اپنی بہو بنا لو۔ قاسم پتر کو چاہیے تھا کہ ایسی کوئی بات تھی تو کہہ دیتا۔ ہم نے کون سا اس کی بات موڑ دینی تھی۔ لیکن اب نموشی سے بچنے کے لیے معاملے کو سمیٹو حمیدہ بھر جائی۔ اپنی نوہ بناؤ تو بات ختم!''

چوہدری آفتاب دوٹوک کہتے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے بے لچک لہجے نے چوہدری شہاب کو بھی چپ کروا دیا تھا اور ویسے بھی مخالفت کس بنیاد پر کرتے۔ سب کچھ سامنے تھا۔ قاسم چاہ کر بھی فرار اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

''میں بھی یہی کہوں گی۔ آفتاب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں حیات کے ساتھ ہی دونوں کا ویاہ کر دیتے ہیں۔ رونق دگنی ہو جائے گی۔''

یہ سکینہ تھیں جنہوں نے ماحول کی سنگینی کو تھوڑا کم کرنے کی کوشش کی تھی ورنہ کمرے میں اس قدر سراسیمگی پھیلی تھی گویا دیگ کو دم آیا ہو۔

''نا بھرجائی...... اتنی کالی (جلدی) کیا ہے۔ اکو اک پتر ہے میرا۔ وکھرا ویاہوں گی۔ گج وج کے کلے کی جنج چڑھے گی۔ میں کیوں اپنے قاسم کا ویاہ رلے صلاحی کروں۔ سنہری میری نوہ ہی سمجھو سارے۔ حیات کے ویاہ کے بعد ہی اپنے پتر کا کروں گی میں......'' وہ نخوت ملے روہانسے لہجے میں جیسے مظلومیت ثابت کرنا چاہ رہی تھیں۔ ناک چادر کے پلو سے صاف کر کے اٹھیں اور سنہری کا بازو پکڑ لیا۔ اب کوئی میرے بچوں کو کٹہرے میں نہ کھلارے۔ ہوگئی غلطی بس۔ چل قاسم پتر۔ چل کے ناشتا کر۔ ساری رات کا جگراتا ہے تم دونوں کا۔''

حمیدہ نے دونوں کو بازوؤں میں بھرا اور یوں وہاں سے لے گئیں جیسے دونوں بے قصور دھر لیے گئے تھے اور جبراً وہاں لائے گئے ہوں۔ سکینہ نے انتہائی ناگواری سے ان کی اس حرکت کو دیکھا تھا۔ رقیہ اور قدسیہ بھی اس دیدہ دلیری پہ خاموش رہ گئیں۔ چوہدری آفتاب متفکر اور متاسف سے سر ہلاتے وہاں سے چلے گئے تو ان کے پیچھے پیچھے حیات اور مبشر بھی تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی قدسیہ نے رقیہ کو اشارہ کیا تو وہ بھی چل دیں۔ پیچھے سکینہ نے چوہدری شہاب کو حیرت سے دیکھا تھا جو کسی گہری سوچ میں کھوئے فرصت بھرے انداز میں حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ انہیں اس وقت اپنے خاوند پہ بے حد غصہ آرہا تھا۔ ان کا معاملہ کو ہلکا جان کر نظرانداز کرنا دل میں طرح طرح کے وسوسوں کو جنم دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

قاسم کمرے میں آیا تو وہاں موجود ہر شے جیسے اس کے عتاب کی زد میں تھی۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ یعنی چوہدری قاسم راؤیوں کمینوں کی طرح جواب دہ ہوگا۔ اسے یوں سب کے بیچ بے عزت ہونا پڑے گا اور یہ سب ہوا تھا اس خط لکھنے والے کی وجہ سے۔ اس کے دماغ کی رگیں یہ سوچ سوچ کر پھٹنے کو تھیں کہ آخر کس کی جرأت ہوئی تھی اس کے کمرے تک پہنچنے کی۔ کس نے اسے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔

اس کا جواب اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تو ابھی ہی مل جاتا لیکن فی الوقت اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اشتعال نے سلب کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی سنگھار میز پر موجود قیمتی پرفیومز کی شیشیاں ایک جھٹکے سے زمین بوس کی تھیں۔ سائیڈ ٹیبل کے لیمپ کھینچ کر زمین پر دے مارے تھے۔ بیڈ شیٹ تکیوں سمیت فرش کی زینت بنی پڑی تھی۔ ابھی نا جانے کتنا ہنگامہ مچانا باقی تھا لیکن حمیدہ وہاں چلی آئیں۔

"اماں! چلی جا یہاں سے۔ ابھی چلی جا۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے ورنہ کچھ بول بیٹھوں گا میں......"

وہ ماں کو انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے ہوئے بولا تو حمیدہ سپاٹ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتی کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی پہ ٹک گئیں۔ یعنی ان کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ قاسم نے دونوں ہاتھوں سے زچ ہوتے ہوئے سر جکڑا اور غرایا۔

"اماں! تجھے سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا؟ یا تو بھی دشمن بن گئی ہے میری۔"

وہ ماں سے بھی کھل کر نظر نہیں ملا پا رہا تھا کیونکہ رات اس نے ماں کی آنکھوں میں سب سے زیادہ افسوس دیکھا تھا۔ حمیدہ نے کرسی کی ہتھی پہ اپنی کہنی جما کر ہاتھ کی مٹھی اپنی تھوڑی کے نیچے رکھی، وہ بے حد ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"یہ سب جو کر رہا ہے اس سے تیرے متھے کا داغ دھل جائے گا۔ بول...... کہا نہیں تھا منہ سے کہ سنہری کے لیے مان جا۔ اس وقت تو بڑے بل پڑے تھے تیرے تو اب یہ ادھی راتی کیوں گل کھلانے کے لیے کوٹھری میں بلا لیا اسے قاسم......"

"نہیں بلایا میں نے اماں اسے۔ نہیں بلایا۔" قاسم چلتے سے ایک دم رکتا ہوا دھاڑا۔

"پاگل نہیں ہوں جو اسے ہی بلاؤں گا۔ مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا، آنا کسی کو تھا۔ آیا کوئی ہے اور ساتھ خاندان اٹھا لایا مجھے بے بس کرنے کے لیے۔ تیری پنیوی کو ہی بلانا ہوتا تو قاسم کو کسی کا ڈر نہیں پڑا ہوا۔ تیرے سامنے بیٹھ کر کہہ ڈالتا جو کہنا ہوتا۔ رونا تو اس بات کا ہے اماں، کہ میں نے کسی کو بلایا ہی نہیں لیکن مجھے وہاں ضرور بلایا گیا تھا اماں۔ اب بتا کس کا گاٹا پکڑوں بھلا؟"

اس کے اندر کا خلفشار اس کے انگ انگ سے عیاں تھا۔ وہ بناوٹ سے کام نہیں لے رہا تھا۔

حمیدہ کو اس کے ہر انداز میں سچائی محسوس ہوئی۔

''اب آگے کیا کرنا ہے پتر۔ باقی چھوڑ جو ہوا ہے۔ میں نے کون سا کسی کو کچھ کہنے دیا ہے تجھے۔ لیکن اب سنہری کے لیے ہاں کر تو میں اس حیاتے سے پہلے تیرا ویاہ نہ کراؤں تو ماں نہ کہنا۔''

''مجھے نہیں کرنی اماں سنہری سے شادی۔ زہر لگتی ہے وہ مجھے۔ رونا اسی بات کا ہے کہ اس کم بخت کو ہی وہاں آنا تھا۔ جس کے آنے کی چاہ تھی وہ آجاتی تو قاسم یہاں خون کی ندیاں بہا دیتا لیکن اسے کسی اور کا نہ ہونے دیتا۔ بس اک واری مجھے پتا چل جائے کہ خط کس نے لکھا تھا اور کس نے رکھا تھا، میں اسے چیر کے رکھ دوں گا۔''

''پتر! شادی تو تجھے کرنی پڑے گی۔ سنہری لاوارث نہیں، میری دھی ہے وہ۔ تو اس کے ساتھ کلے کمرے میں پکڑا گیا ہے۔ تیرا کچھ نہیں جانا لیکن وہ داغی ہو جائے گی۔ تجھے جس سے ویاہ کرانا تھا اس کے خواب دیکھنا چھوڑ دے اب۔ وہ اگر حیاتے کے ساتھ نہ بھی ویاہی جاتی تب بھی رقیہ کبھی میری نوہ نہ بناتی اسے۔ سوچ سمجھ لے اور دن دیہاڑ بتا دے مجھے اپنے آپ۔ جونسا کہے گا اسی دن سنہری سے نکاح پڑھوا دوں گی۔ لیکن مزید نموشی نہیں وارے میں میرے۔ سمجھا!''

حمیدہ اس وقت عقل سے کام لے رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر سنہری کے لیے قاسم نے ہاں نہ کی تو اس کا حویلی میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ اور سنہری کو وہ خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ کشور بھلے بیاہی جا رہی تھی لیکن انہیں فکر یہ بھی تھی کہ اگر ان کے اڑیل بیٹے کے دماغ میں خانم آسمانی تو کہیں اسی کے لیے ضد نہ پکڑ لے جبکہ ایک بار پہلے وہ اس کے لیے بھی رضامندی دکھا چکا تھا۔ اور حمیدہ دبی چنگاری کو ہوا نہیں لگوانا چاہتی تھیں۔ وہ دوٹوک کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھیں لیکن دل اندر سے اب بھی پریشان تھا۔ پیچھے قاسم نے نیم وا دروازے کو گھورا اور دونوں آنکھیں میچ کر بیڈ پر سیدھا یوں دراز ہو گیا کہ گھٹنوں سے نیچے ٹانگیں بیڈ سے لٹک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں شل دماغ کی سوزش ذرا دور ہوئی تو کانوں میں ایک فقرے کی بازگشت سنائی دی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ تو کیا سنہری وہاں اس کے لیے نہیں آئی تھی۔ کیا وہ بھی وہاں لائی

گئی تھی۔ اور سنہری کی اتنی مجال تھی کہ وہ اسے نظر انداز کرے۔ تانا بانا بنتے کئی گرہیں کھل رہی تھیں، الجھ رہی تھیں اور آخر میں اس کے انتہائی طیش کا رخ تایا شہاب کی جانب ہو گیا تھا۔

''اکیلے تو مزے نہیں لینے دے گا یہ قاسم تجھے تایا۔ تیرا ہی خون ہوں، خون کے آنسو رلا دوں گا۔''

وہ دونوں ہتھیلیاں جوڑے ہونٹوں سے لگائے قالین کو گھورتا سارے واقعے کو گہرائی سے سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

جلے پیر کی بلی کیا شے ہوتی ہو گی جو اس سمے سنہری تھی۔ اس کے سارے بدن میں شرارے دوڑ رہے تھے۔ کمرا بند کیے وہ بے حس و حرکت فرش پر لیٹی تھی۔ شاید فرش کی ٹھنڈک اپنے جسم میں جذب کر رہی تھی جو بھانبھڑ بنا ہوا تھا۔ دماغ میں بھسم کرتی سوچیں اور جسم میں ہلکورے لیتا آتشیں لہو ایک ساتھ اسے آتش فشاں بنائے ہوئے تھے۔ وہ ساکن و جامد دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر پکنے والا لاوا سب کی خوشیوں کو نگلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

حمیدہ کتنی بار دروازہ پیٹ چکی تھیں لیکن اس نے بھی آج قسم کھا کر کان بند کر رکھے تھے۔ ہارا جواری بھی ایسا محسوس نہیں کرتا ہو گا جیسا لٹا پٹا اس کا وجود پڑا تھا۔ چوپٹ کھلی آنکھوں کو چھت پہ گاڑ رکھا تھا جہاں رات کے مناظر سلوموشن میں سرکتے ہوئے اس پہ طعنے کس رہے تھے۔

کس مان اور تفاخر سے وہ کوٹھری میں داخل ہوئی تھی۔ اسے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ حیات راؤ وہاں موجود ہو گا اور آج کے بعد اس کا ہو گا۔ لیکن جس پل قاسم نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا تو پہلا خیال جس نے اس کی سوچ کو کوڑا مارا تھا وہ یہی تھا کہ کاش حمیدہ یہاں نہ پہنچیں۔ لیکن انہیں بلاوا تو خود اسی کے ایما پہ دیا گیا تھا۔ حویلی کی ملازمہ کو اسی نے تو چار نوٹ اور دو جوڑے پکڑا کر تنبیہ کی تھی کہ جیسے ہی وہ باغ عبور کر کے کوٹھری کی جانب بڑھے وہ بھاگ کر باری باری سب کو لیتی وہاں پہنچ جائے۔ ملازمہ تو اپنی ڈیوٹی احسن طریقے سے نبھا گئی تھی۔ اس نے ساعتوں کا فرق بھی پڑنے نہیں دیا تھا اور بھاگتی ہوئی سب سے پہلے شہاب الدین کا دروازہ دھڑدھڑایا تھا پھر پھپھو قدسیہ کو اٹھا لائی اور سب سے آخر میں

حمیدہ کو۔ ہنگامہ مچنے کے بعد چوہدری آفتاب اور رقیہ باہر آئے تھے دوسری طرف حیات کے علاوہ مبشر بھی نکل کر اس طرف چل دیے تھے جہاں ملازمہ اشارہ کر رہی تھی۔

''چور اے جی چور اے۔ میں اپنی اکھاں نال دیکھا ہے جی۔ پکا چور گھسا ہے اندر۔ زنانی بھی ہے ساتھ کوئی۔ جلدی کرو جی، ایس توں پہلاں کوئی واردات نہ کر دیں۔''

اور واردات تو پڑی، ایسی پڑی جس نے سنہری کا سب کچھ لوٹ لیا۔ وہ حیات کو اپنے ساتھ پکڑوانا چاہتی تھی لیکن یہاں قاسم کیسے آیا اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حیات کے ساتھ پکڑی جاتی تو دنیا کے آگے شور ڈال دیتی اور اسے تڑ کے ہی اپنے نام نہ کراتی تو سنہری نہ کہتا کوئی۔ لیکن قاسم تو اس کے آپشنز میں سب سے آخر میں پڑا ہوا تھا۔ بھلا یہ کارتوس اچانک سے یکلخت پہلے نمبر پہ کس نے چلا دیا تھا۔ اسے رنگین پیرہن میں پور پور سجے وہاں سب نے دیکھا تھا۔ وہ تل تل مری تھی لیکن جو استہزاء حیات اور مبشر کی آنکھوں میں اس کے لیے تھا وہ الگ ہی جان لیوا تھا۔ وہ دھر لی گئی تھی اور قاسم کے ساتھ نتھی کر دی گئی تھی۔ اب حیات اسے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کا روم روم بددعائیں دے رہا تھا۔

''ایسے نہیں سکون سے رہ سکو گے۔ کشور تجھے تو خوشیاں بھی دکھ کی چادر میں لپیٹ کر نہ دوں تو میرے ہونے پہ لعنت......''

خود پہ نفرین بھیج کر اس نے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا۔ وہ سکون سے کچھ پل نیند کے لینا چاہتی تھی۔ حمیدہ نے اس کا دروازہ ایک بار پھر پیٹ ڈالا تھا لیکن اس نے پروا کیے بنا خود کو نیند کے سپرد کر دیا تھا۔ لمبی دوڑ کے لیے راہ میں ستانا ضروری ہوتا ہے ورنہ منزل پہ پہنچنا ناممکن ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

چوہدری شہاب نے ڈیرے پہ قاسم کو بلوایا تھا۔ انہیں اپنے بھتیجے کے لیے افسوس بھی تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ اتنے کچے کام کی اس سے امید نہیں تھی۔ قاسم جب وہاں پہنچا تو اس کے چہرے پہ ہنوز خشونت برس رہی تھی۔ تیوریاں ماتھے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ حقہ پیتے شہاب الدین کو بھتیجے کے تنتناتے وجود پہ بے حد لاڈ آیا۔ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہو کر قاسم کو کھینچ کر فخریہ گلے لگایا۔

''ایک تو ہے جسے دیکھ کر مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میرے خاندان میں بھی کوئی ہے جو چوہدری شہاب کے طنطنے کو زندہ رکھے گا ورنہ میرے اپنے پتروں نے تو میرے سر میں کھے ڈلوادی ہوئی ہے۔ ہورے کیسی زنانی ہڈی ہے ان کی۔''

قاسم جواباً کچھ نہیں بولا بلکہ کھچا کھچا سا چارپائی کے کنارے ٹک گیا۔ چوہدری شہاب نے واپس جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور بولے۔

''دیکھ۔ ادھر ادھر کی نہیں کرتے۔ سیدھی بات پر آتے ہیں۔ جھلیا غلطی تیری ہے۔ تو اتنا اناڑی کیسے ہو گیا کہ اک کڑی کے بلانے پہ کوٹھری میں چلا گیا۔ اتنا جی دار تھا تو اپنے کمرے میں بلواتا نا تو سارا الزام اس پر آجاتا کہ لو جی کمرے سے پکڑی گئی ہے تو خود ہی آئی ہے نا، تو کوئی کھینچ کر تو نہیں لایا۔''

کمینگی اور پستی کی انتہا کا دوسرا نام شہاب الدین تھا اور یہ بات ابھی بیٹھے بیٹھے قاسم نے سوچی تھی۔ اسے تایا کی بات سے گھن سی محسوس ہوئی۔ کچھ بھی تھا وہ ہر طرح کی دو نمبریاں کرتا تھا لیکن لڑکیوں کے معاملے میں اس کا کردار صاف تھا اور اس کے پیچھے وجہ اپنی برتری کا زعم اور غرور تھا۔ اس نے نظریں ترچھی کر کے شہاب الدین کو دیکھا اور بولا۔

''قاسم ایسے کاموں میں ملوث نہیں ہوتا تایا جی، جن سے رائتہ پھیلے۔ میں اپنے ہاتھ گندے نہیں کرتا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے جو میں سنہری کو یوں ادھی راتی وہاں بلاتا۔ یہ سب جو بھی ہوا ہے اصل کی تہ تک میں پہنچ کر دم لوں گا۔ جس نے میرے نام کو وٹہ لگایا ہے اسے آرام سے جینے نہیں دوں گا میں۔''

''او بیبا! آرام کر اب، میں نے کون سا کوئی دفعہ لگنے دی ہے تجھ پر۔ بھلا تائے کے ہوتے تجھ پہ انگلی اٹھ سکتی تھی۔''

شہاب الدین نے ناک سے مکھی اڑائی۔ قاسم کا دل کیا، تائے کا ٹینٹوا آج دبا ہی دے۔ لیکن ابھی صبر کرنا تھا۔ سکون سے ٹھنڈی کر کے کھانا تھا۔ گرم گرم تو اسے شہاب الدین کے حلق میں انڈیلنا تھا تا کہ سڑ کے سواہ ہو جائے اور مزید کی طلب ہی مر جائے۔ وہ ایک گہری سانس سینے میں بھرتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں یہ کام کس کا ہے۔ لیکن اس کا بدلہ بھی میں چاہے آفتاب سے ہی چکتا کروں

گا۔ مجھے کسی کی نظر نے ایسے نہیں مارا جیسے چاچا آفتاب کے دیکھنے نے زمین میں گاڑا ہے۔ اور اب تایا جی مزید انتظار نہیں کروں گا میں۔ جلدی کرنا ہے جو بھی کرنا ہے۔''

''کرنا ہے، کیوں نہیں کرنا۔ حوصلہ پتر۔ شادی ہونے تو والی ہے اب۔ بس ادھر ویاہ ہوگا ادھر سارا پتلی تماشا ختم ہو جائے گا۔ بس ویاہ کے دن نکال میرے شہزادے۔''

''یہ دن نکالنے کون سا میرے لیے سوکھے ہیں تایا جی۔ چاہے ویاہ آپ کے وڈے پتر کا ہے لیکن میرا ذرا دل نہیں کہ میں ایک دن بھی شامل ہوں۔''

(سینے پہ سانپ بھی میرے لوٹیں گے اور زہر بھی مجھے ہی پینا پڑے گا) وہ دل میں سوچتا ترچھی نگاہ سے چوہدری شہاب کو دیکھ رہا تھا۔ چوہدری شہاب کوئی دودھ پیتے بچے نہیں تھے کہ سامنے کے پلے بچوں کے دل میں پلتے جذبات سے بے خبر ہوتے۔ انہیں سب معلوم تھا کہ قاسم کے دل میں کشور کے لیے کیا جذبات ہیں۔ وہ کوئی کچی گولیاں کھیل کر نہیں بیٹھے تھے۔

''دیکھ پتر قاسم! میں تو کہتا ہوں ماں کو راضی کرنے کے لیے سنہری سے ویاہ کر لے۔ اس میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ دیکھ نا شہزادے......'' وہ ذرا آگے کو جھکے۔ ''کشور کا ویاہ حیات سے ہونے لگا ہے۔ خانم ابھی چھوٹی ہے۔ وہ ویسے ہی تیرے جوڑ کی نہیں۔ اور تو جو مرضی کر لے آفتاب نے تجھے کڑی کوئی نہیں دینی اپنی۔ پرلے درجے کا کینہ پرور ہے۔ تیرے باپ کا سدا کا ویری تھا بھلا اس کے پتر کا سگا کیسے ہوگا۔ سنہری کے نام بھی زمینیں تو ہیں ہی نا۔''

قاسم نے یکدم چڑ کر خشونت سے چوہدری شہاب کو دیکھا تو وہ ذرا سٹپٹائے۔

''او مطلب چل ماڑی چنگی جیسی بھی ہے۔ اپنے نام کرا کے کل کو آفتاب والی زمین پہ ہی چار پیسے مزید لگا لینا۔ وہاں جو بھی کرنا ہے، کرنا تو میں نے اور میرے شہزادے نے مل کر ہی ہے نا۔'' انہوں نے دوبارہ قاسم کا گھٹنا خوشامدی انداز میں سہلایا اور سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔ ''چل یار منہ سیدھا کر لے اب۔ سوچ لے اچھی طرح۔ کم ماڑا نہیں۔ سنہری سے ویاہ کر کے کسی کی نظر میں نہیں آئے گا۔ تجھے اس بات کی باریکی سمجھ میں نہیں آ رہی ابھی۔ گھر جا اور سوچ اس پہ چنگی طرح۔''

قاسم دونوں ہاتھ باہم پھنسائے نگاہیں سکوڑے بے حد خاموشی سے تائے کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ چند پل یونہی گزر گئے تو یکدم اپنے چہرے کو بشاش بناتا ہوا بولا۔

''سوچتا ہوں تایا جی، اماں تو واقعی بہت ناراض ہے مجھ سے۔ بات آپ کی بھی درست ہے کہ خانم ابھی چھوٹی ہے اور مجھے بھلا ایک بچی میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے تایا جی، ہاں اگر کشور کے لیے تائی جلد بازی نہ کرتیں تو......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شہاب الدین کو دیکھا جنہوں نے معمولی سا سر کو خم کر کے بھتیجے کو تیکھے چتون سے گھورا اور پھر معنی خیزی سے مسکرائے۔

''دیکھ پتر قاسم۔ کشور تیرے بھرا حیات کی پسند بھی ہے وہ کلی تیری تائی کی مرضی نہیں۔ اس لیے کشور کا ویاہ حیات سے ہونا ہی طے تھا۔ بھلے میری مرضی نہیں تھی اس میں۔ لیکن دیکھ میں آخر تیرا تایا ہوں، جس مقصد کے لیے اس کا ویاہ کشور سے کروانا ہے اسے سیانے ہاتھوں سے ہی پورا ہونے دے۔ تو ابھی بچہ ہے اپنا، تجھے تو اس آفتاب نے انگلیوں پہ نچا دینا تھا۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ تایا جی۔'' قاسم دانت چباتا مسکراہٹ زبردستی سجاتا ہوا بولا۔ ''مجھے ابھی تک واقعی سمجھ نہیں آئی لیکن اب آپ کے ساتھ رہتے اچھے سے آنے لگی ہے۔ میں دو دن سوچ لوں تو دیتا ہوں اپنا فیصلہ۔'' قاسم کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔

''کون سا فیصلہ......؟'' شہاب الدین نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''یہی سنہری سے شادی کا فیصلہ تایا جی۔ آپ کی یادداشت تو ابھی سے کمزور ہو گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو زمین ہتھیا کے آپ بھول ہی جائیں کہ قاسم آپ کا بھتیجا ہے۔''

''چل اوئے جھلیا۔ بھلا اپنا ساہ لینا بھی کوئی بھولتا ہے۔ سچ پوچھ جھلیا تو زمین تو اصل تیرے لیے ہی مَل رہا ہوں ورنہ مجھ بڈھے نے کیا کرنی ہے۔ بس آفتاب کے پاس ایسی زمین ہو، تو اور میں منہ دیکھیں تو یہ کوئی مخول تو نہیں نا شہزادے......''

''سچ کہتے ہیں تایا جی۔'' قاسم کہہ کر سلام لیتا پلٹ گیا۔ چوہدری شہاب نے دور تک اس کی

چوڑی پشت کو گھورا اور ہنکارا بھر کر کامے کو آواز دے کر حقہ لانے کو کہا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ میں وہ سکون سے منصوبہ بندی کرتے تھے۔

☆......☆......☆

کمرے میں جامد خاموشی پھیلی تھی۔ اتنا سب کچھ ہو گیا تھا۔ سنہری کا کانٹا اپنے آپ راستے سے نکل گیا تھا۔ لیکن کچھ عجیب سی کھٹک تھی جس نے دل کو جکڑ رکھا تھا۔ نا سمجھائی دینے والی اور نا بتائی جا سکنے والی۔

کمرے کے اندر طویل و عریض کھڑکی کے سامنے مبشر اور حیات دونوں آمنے سامنے کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ گہری سوچ دونوں کے چہروں پہ عکس چھوڑ رہی تھی۔ بالآخر ایک طویل ہنکارا بھر کر مبشر سیدھا ہوا اور حیات سے بولا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے یار کس نے کیا ہے یہ سب کچھ؟''

''سچ بتاؤں یا قیاس بیان کروں؟'' حیات نے مستفسرانہ نگاہ مبشر پہ جمائے پوچھا۔

''قیاس بتاؤ مجھے معلوم ہے وہی سچ ہوگا۔'' مبشر نے اطمینان سے اس کا چہرہ جانچا۔

''دیکھو......'' حیات تھوڑا مزید آگے ہوا۔ ''تم نے اور میں نے بس سوچا تھا کہ سنہری اور قاسم کو ایک ساتھ پکڑوا دیتے ہیں لیکن ہمارا ارادہ بدل گیا تھا۔ اب ہم نے تو یہ کیا نہیں۔ حویلی میں کسی اور کو اس خط کا معلوم نہیں تھا۔''

''خانم اور رابی کو تو تھا یار!'' مبشر فوراً بات کاٹتا بولا۔

''پاگل ہو۔ اپنی بہنوں کا پتا نہیں کیا۔ رابی لاکھ لاابالی سہی، لیکن جب کسی بات کی سنگینی سمجھا دو تو عقل استعمال کرتی ہے اور گڈی......وہ تو ہے ہی ڈنگر دماغ۔ اس کو ایسی حرکت نہیں سوجھ سکتی۔''

حیات بولنے کے بعد خاموش ہو کر مبشر کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ چند پل اسی معنی خیز خاموشی میں گزر گئے تو یکدم مبشر اپنی جگہ سے اچھلا۔

''او تیرا بھلا ہو۔ یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ سنہری نے خود سب کو وہاں جمع کروا دیا۔ اللہ اللہ۔ نہ کر یار......یہ تو حد ہی ہو گئی حیاتے......'' مبشر دوستانے میں اکثر حیات کو اسی طرز پہ مخاطب کیا کرتا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ جو کیا ہے اس نیلی پیلی نے کیا ہے۔ اس نے تو خود بدنامی مول لی ہے لیکن مجھ پر اس کی ذہنیت مزید آشکار ہوگئی۔ سوچو کہ اگر قاسم کی جگہ میں ہوتا تو کیا ہوتا۔"

"توبہ ہے یار! کوئی اتنا گر بھی سکتا ہے۔ ایسی لڑکی تو دیکھی نہ سنی۔ اسے اندازہ بھی ہے کہ ساری عمر قاسم جیسے تنگ دل اور تنگ نظر انسان کے پلے پڑ گئی تو نتیجہ کیا نکلے گا۔"

"سچ پوچھو تو میں نہیں چاہتا مبشر کہ اس کی شادی قاسم سے بھی ہو۔ تمہیں لگتا ہوگا کہ بلا ٹل گئی لیکن درحقیقت حویلی پہ اس بلا کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ سوچو اگر قاسم کی بیوی بن گئی تو رہتے تو ہم سب ساتھ ہی ہیں نا۔ بظاہر الگ الگ گھر بنے ہیں لیکن ہیں تو سب اکٹھے نا اور ایسی فتنی خاندان میں آنے کا مطلب خطرناک ہوتا ہے۔ جس نے ایسی خوف ناک چال چل دی ہو کہ بڑے بڑے کانوں کو ہاتھ لگا جائیں۔ وہ لڑکی آنے والے وقت میں کیا کمال دکھائے گی جب کہ اب چاٹنے کو زخم بھی لگ گیا ہے۔"

حیات کی پر اثر تقریر پر مبشر فکرمندی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ سب اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ تو دل میں خوش ہوا تھا کہ چلو قاسم کے گلے پڑے ایسی آفت۔ لیکن حیات نے تو آنے والے وقت کا عجب ہی نقشہ کھینچ ڈالا تھا۔ ابھی تک حمیدہ اور شہاب الدین جیسی شخصیتیں ہونے کے باوجود خاندان جڑا ہوا تھا۔ سب برداشت اور تحمل کے ساتھ اچھے طریقے سے رہتے آئے تھے لیکن سنہری تو سیر پہ سوا سیر تھی۔ بہو بھی بنتی حمیدہ جیسی عورت کی اور بیوی بنتی قاسم جیسے کینہ پرور کی تو اینٹ سے اینٹ بجنے کے امکانات روشن تھے۔

مبشر خاموشی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملائے انہیں ہونٹوں سے جوڑے نظروں سے زمین کریدنے لگا تھا جبکہ حیات کو کشور کی فکر کھائے جا رہی تھی جو حویلی کی سب سے سادہ انسان تھی۔ وہ ایسی چالاکیوں کی متحمل کبھی نہیں ہو سکتی تھی اور ابھی تو وہ واقف بھی نہیں تھی کہ سنہری اس کے ساتھ کیسی بھیانک چال چلنے والی تھی۔ اگر ہو جاتی تو نا جانے اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ وہ ماتھے پہ تفکر کی لکیریں لیے آنے والے وقت کی سوچوں میں گم تھا۔ اسے آنے والے وقت سے اچھائی کی مہک نہیں آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

قاسم ڈیرے سے واپس سیدھا حویلی آیا تھا۔ پہلے پہل دل کیا تھا شہر کی طرف نکل جائے۔ وہاں کافی گہرے یارانے تھے اس کے۔ اکثر کسی یار دوست کے پاس چلا جایا کرتا تو دنوں واپسی نہیں ہوتی تھی۔ یار دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بنتا تو کبھی وہاں سے مری کا قصد کرتے۔ یہ وہ دور تھا جب سب سے بڑی اور بہترین تفریح مری جانا ہوتا تھا۔ وہ بھی وہاں جاتا اور خوب عیاشی کر کے واپس آیا کرتا۔ ایسے شوق حویلی میں بس اسی کے تھے۔ باقی لڑکوں میں سے کسی کے ایسے رجحانات نہیں تھے لیکن آج شہر کا منہ کرتے کرتے واپس حویلی آ گیا تھا۔ حالانکہ دل بے زاری کی انتہا پر تھا۔ سب کچھ تہس نہس کرنے کو دل کر رہا تھا لیکن برداشت کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ حمیدہ اس سے الگ بے زار اور ناراض ہوئی بیٹھی تھیں۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا تھا۔ اس کا دل ہی نہیں کیا کہ ماں سے بھی ملے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی حمیدہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"کیا اماں...... مجھ سے کسی بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ میرا سر پھٹ رہا ہے اس وقت، یہ نہ ہو کچھ اور نہ ملے تو دیوار میں سر دے ماروں۔"

"نا خیری صلا...... دیوار کو کیوں مارنا ہے۔ ماں ہے نا، اسی کو آ کے وج۔ آخر منہ تو میرا ہی کالا کرایا نا تُو نے۔" حمیدہ کو اس کی بات سن کر تاؤ آیا تھا۔

"اماں! میں نے نہیں، ذرا اپنی پھپھوی سے پوچھ کہ وہ عورت ذات ہو کر وہاں کیا کرنے آئی تھی۔ میں تو مرد تھا مجھے کون سا ایل میل لگ جانا تھا۔ اس سے پوچھ اماں کہ وہ کون سے تارے توڑنے آئی تھی؟"

قاسم بھی اسی کا بیٹا تھا۔ ادھار کب رکھتا تھا۔

"دیکھ قاسم! مجھے تو لگتا ہے اس نمانی کو پھنسایا ہے۔ اور اس سب کے پیچھے یہی میسنی رقیہ اور قدسیہ لگتی ہیں۔ ورنہ میری سنہری ایسی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے سب بہن بھائیوں میں سیدھی ہے پتر، بھولی ہے تب ہی اس سیاپے میں پھنسی ہے نا۔"

"ہاں ایسی بھولی ہے تبھی تو اس کے بہن بھائی اسے رکھتے نہیں۔ ایک سو ایک عذر کر کے یہاں پٹخ دیا۔"

''نا تو اور کہاں جاتی۔ اب اس کی ویاہی بہن اپنے پاس سسرالیوں میں کیسے رکھتی پتر اسے۔ پہلے ہی ماں پیو نہیں ہے، اتنی مشکل سے وس رہی ہے وہ بھی تو اسے کیسے ساتھ رکھ لیتی میرا پتر۔''

''او چھوڑ اماں...... مجھے نہ سنا یہ سب باتیں۔''

قاسم بے زار سا بیڈ کی پائنتی بیٹھتا پیروں سے کھیڑی اتارتے ہوئے بولا۔ گورے گورے پاؤں سرخ دبیز قالین پہ رکھے تو سکون محسوس ہوا۔ ساتھ ہی حمیدہ نے دل میں ماشاء اللہ کہا۔ بیٹا تھا تو لاکھوں میں ایک اور پھر وہ بھی ایک۔ اپنا دھیان وہاں سے ہٹا کر وہ اس سے دوبارہ مخاطب ہوئیں۔

''پتر! اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اس عمرے میرے سر میں کھے ڈلنی تھی ڈل گئی۔ اب سنہری کو ذلیل ہونے سے بچا ورنہ اس حویلی کی چنڈالیں اسے نگل جائیں گی پتر۔ تو جانتا نہیں کیا سب کو۔''

''او اماں، کن سوچوں میں ہے۔ سمجھ کیا رہی ہے اپنی پنیوی کو۔ چلتر ہے اماں چلتر۔ چبھ جائے تو رڑک نہیں جاتی اور نکالی بھی نہیں جاتی۔ فکر نہ کر اماں، وہ اگر اللہ نہ کرے تیری نوہ بن گئی تو اسے دبانے والا اس حویلی میں کوئی نہیں ہونا۔''

''اپنی ٹرٹر بند کر قاسم۔ کرتوت نہ بھول۔ صبح سب کے درمیان کھڑے تو بولتی بند تھی تیری۔ بس ماں کے آگے ہی زبان چلتی ہے۔'' حمیدہ کو اس کا سنہری کے بارے اس قدر صاف گو ہونا بھایا نہیں تھا۔ وہ پہلو بدلتے تپتے ہوئے بولیں۔

''کچھ بھی کہہ اماں، لیکن اماں! یہ سنہری سے شادی کا خیال نکال دل سے، میری جان چھڑا اس سے کسی طرح، میں ایک داؤ اور کھیل لوں خانم کے لیے۔ اگر چل گیا تو پھر تایا شہاب کو دن میں تارے دکھا دوں گا نہ چلا تو کر لوں گا تیری نام نہاد پنیوی سے شادی۔ لیکن یاد رکھیں اماں کہ رہے گی وہ میری نظر میں رہی سہی، کل کو دل کیا تو اپنی مرضی کا بھی کروں گا۔ سن لے تو!''

حمیدہ شانت سی ہوتے ہنکارا بھرتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں جس کے باہر کھڑی سنہری ایک جست میں سائیڈ پر ہوئی تھی۔ قاسم کا لفظ لفظ اس کے دل میں بھالے کی طرح اتر گیا تھا۔ وہ سنہری تھی جس کے پیروں کے نیچے لوگوں کی تقدیر مسلی جاتی تھی۔ کوئی بھلا اسے رہی سہی کیسے کہہ سکتا تھا۔ وہ

تنفر سے نتھنے پھلاتی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اندر قاسم خود نہیں جانتا تھا کہ وہ یہ دن کیسے نکالے۔ کشور کی پھانس دل میں گڑی تھی۔ زمین ابھی ہاتھ میں نہیں تھی۔ اور سنہری کی تلوار مفت میں سر پر آلٹکی تھی۔ پہلے نمٹے تو کس سے۔

☆......☆......☆

وہ تینوں مائی جی کی طرف سے واپس آ رہی تھیں۔ راستے میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑے ہوتے ہوئے رانی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس کا دماغ گزشتہ روز سے ہی خاصا خراب تھا اور لامحالہ اب غصہ کشور اور خانم پہ ہی اتار کر سکون آتا۔

''ایسے کیوں کھڑی ہو گئی ہو رابی، گھر چلو جلدی۔ آج ویسے ہی دیر سے آئے تھے اور اب واپسی پہ بھی دیر ہو رہی ہے۔''

خانم بھی اسی کے انداز میں ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ گھنے برگد کی چھاؤں تلے ہوا کی ٹھنڈی لہریں کپکپانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ موسم گو کہ اتنا سرد نہیں تھا کہ جرسیاں پہن لی جاتیں لیکن درختوں کی چھاؤں تو گرمیوں میں ٹھنڈی ہوتی ہے اب تو پھر موسم مائل بہ سردی تھا۔ کشور نے اپنے بازو سہلاتے ہاتھوں کو باہم ملایا اور پھونک مارتے ہوئے کہنے لگی۔

''رابی! میری جان غصہ جانے دو۔ بڑوں کی باتیں بڑے جانتے ہیں۔ انہیں بہتر پتا ہے کہ کس معاملے کو کیسے حل کرنا ہے۔ تم ابھی چھوٹی ہو لیکن اگر مجھ سے پوچھو تو میں چاہتی ہی نہیں تھی کہ یہ بات بڑوں تک پہنچے۔ سنہری بھی ہمارے جیسی لڑکی ہے۔ اس سے غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن ہے تو لڑکی نا۔ عزت ہے اس کی بھی۔ جتنا مرضی اندر گھسا کر جوتے مار لیتیں حمیدہ چاچی لیکن یوں مردوں کے بیچ نہیں کھڑا کرنا چاہیے تھا اسے۔''

''تو کون سا اسے کسی نے کچھ کہہ دیا کشور آپا۔ اور سب مردوں کو وہاں کوٹھری میں بلوانے والی بھی وہ خود لگتی ہے مجھے۔ ورنہ نجمہ جس نے شور ڈالا تھا وہ اس کی پکی گوڑی سہیلی بنی پھرتی ہے۔ اسے کیا موت پڑی تھی اپنی سنہری باجی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی۔ وہ بھی رات کے اس پہر۔ آپ کو بات سمجھ میں نہیں آ

رہی کیا؟ اتنی رات کو بھی نجمہ یا کسی اور ملازمہ کو دیکھا ہے آپ نے حویلی کے صحنوں میں پھرتے۔ اور پھر آپ کو موقع چاہیے سب کی ہمدردی کرنے کا۔ پوری بات کا نہیں نا پتا اس لیے ایسا بول رہی ہیں ورنہ سب سے پہلے آپ ہی اس کی چٹیا کاٹ ڈالتیں۔"

وہ نتھنے پھلائے بگٹٹ بولے جا رہی تھی جب سینے پہ ہاتھ باندھے خاموشی سے سنتی خانم نے آخری بات پہ نامحسوس انداز میں چٹکی کاٹ ڈالی۔ وہ بری طرح ہڑبڑائی اور زبان دانتوں تلے لیتی خانم کا اشارہ سمجھ گئی۔ حیات نے سختی سے منع کیا تھا ان باتوں کا کشور سے ذکر کرنے سے۔ لیکن ظالم نے چٹکی بہت زور سے کاٹی تھی، اس لیے بازو مسلنے سے نہ رہ سکی۔

"مثلاً کون سی بات کا مجھے نہیں پتا۔ حویلی میں رہتی ہوں میں بھی اور سوئی تو نہیں پڑی رہتی کہ مجھے نہیں پتا اور تم چھٹکیوں کو پتا ہے سب کچھ۔" کشور برا مانتے ہوئے بولی۔

"گھر چلیں آپا...... مجھے لگتا ہے درخت کے تنے میں کیڑے ہیں۔ کوئی کاٹ گیا ہے میرے بازو پر۔" وہ بازو مسلتے ہوئے ٹیک چھوڑتی بولی۔ اس نے بات بدلی تھی درحقیقت۔ کشور نے سر جھٹکا اور پگڈنڈی کی طرف چل دی۔ خانم، رابی کو گھورتی ہوئی اس کا ہاتھ تھامے پیچھے ہو لی۔

"آپا! ناراض ہو گئی ہو؟" رابی نے کشور کے ہم قدم ہوتے لجاجت سے پوچھا تو کشور نے سبک قدموں سے چلتے محبت سے اس کا گال تھپکا۔

"تمہیں پتا ہے رابی، مجھے تم خانم کی طرح پیاری ہو۔ بس ذرا زبان پر قابو پایا کرو۔ ایک بار تمہاری ہوائی اڑا دی نا کسی نے کہ تیز زبان ہو تو ساری عمر کے لیے ٹھپہ لگ جائے گا اور ہمارے گھرں میں ٹھپے ماتھے پہ لکھی تقدیروں کی طرح دائمی ہوتے ہیں۔ اس لیے احتیاط کیا کرو۔"

یہ وہ وقت اور ماحول تھا جب لڑکیوں کا چلبلا پن ان کا چلتر پن سمجھا جاتا تھا۔ شوخ اور چنچل لڑکیوں کو زبان دراز اور بدلحاظی کا تمغہ دیا جاتا تھا۔ خاندان کی بڑی بوڑھیاں اور قریبی بدطینت رشتے دار خواتین ہر جگہ ایسی لڑکی کا ڈھونڈورا پیٹنا فرض سمجھتیں اور نتیجتاً اس کی ریپوٹیشن یعنی ہوائی خراب ہو جاتی تھی۔ رشتے ناتے عموماً گھروں میں ہونے کی وجہ سے یہ ٹائٹل طویل عرصے تک اور بعض اوقات

ساری عمر ہمراہ رہتے تھے۔

''جانے دو آپا...... رابی ان باتوں کی بھلا کب سے پروا کرنے لگی۔'' اس نے سر جھٹک کر آسمان پہ تیرتے بادلوں پہ نگاہ دوڑائی۔ ''لیکن آپ کا کہا تو میں مانتی ہی ہوں آپا۔'' کشور کی ٹھوری پہ اس نے اسے تسلی دی جیسے۔

''لیکن آپا، ہم اب سنہری کو ساتھ نہیں لائیں گے اپنی مائی جی کی طرف۔ وہاں بھی وہ بدتمیزی کرتی ہے۔ آج تک کسی کی جرأت نہیں ہوئی ان سے بدلحاظی کرے کوئی لیکن یہ ان کی بھی شرم نہیں کھاتی۔''

خانم کو جس قدر سنہری پہ غصہ تھا اس کا اظہار وہ کرنے سے قاصر تھی وگرنہ اس خط کو اور اس کے حیات لالہ کے کمرے سے نکلنے کو خانم بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ اتنی بھی کم عقل نہیں تھیں کہ یہ جان نہ پاتیں کہ سنہری کا جھکاؤ حیات راؤ کی جانب ہے اور اگر انہوں نے سنہری کو دیکھ نہ لیا ہوتا تو کیا معلوم حیات لالہ چلے جاتے تو جو حالت اس وقت قاسم لالہ کی ہو رہی تھی اور ان کا رشتہ تقریباً سنہری سے طے پا گیا تھا تو یہ سنہری اگر حیات لالہ کے ساتھ پکڑی جاتی تب...... اور اس کے آگے خانم اور رابی کی زبان گنگ ہو جاتی تھی لیکن سوچیں نہیں!

''نہیں لے کر جائیں گے اب اسے۔ ویسے بھی حمیدہ چاچی نے اسے خود بھی منع کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم تینوں اس قابل نہیں کہ ان کی بھانجی ہمارے ساتھ کہیں جائے۔'' کشور نے مسکراتے شرارتی لہجے میں آنکھیں پٹپٹا کر بتایا تو رابی کو پتنگے لگ گئے۔

''اس کی ایسی کی تیسی۔ آپ کی تو ہونے والی ہے شادی آپا...... اس کے بعد ہمارا جانا کون سا بند ہو جانا ہے۔ دیکھنا یہ شرلی ہمارے ساتھ چلے گی ہی چلے گی۔ اس وقت ہم اسے چھٹی کرائیں گے۔ دفع ہوئے پھر۔''

کشور نے رابی کی بچکانا بات کے جواب میں تادیبی انداز میں پلٹ کر دیکھا لیکن وہ دونوں اب کانوں میں کھسر پھسر کرتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب متوجہ تھیں۔ وہ نظر انداز کرتی حویلی کی جانب تیز قدم اٹھانے لگی۔

سب کو لگتا تھا کہ اسے نہیں معلوم سنہری کی بدنیتی کا لیکن یہ صرف وہ جانتی تھی کہ آدھی راتوں کو وہ اٹھ اٹھ کر اپنے رب سے حیات راؤ کا ساتھ مانگتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ اس کے نصیب میں اس شخص کی دائمی رفاقت آجائے۔ شاید اسی کی دعاؤں کا حصار تھا جس نے سنہری کے شیطانی جال کو توڑ ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

قاسم بھرپور توجہ اور من لگا کر چوہدری آفتاب کی چھوٹی حویلی کا کام تقریباً مکمل کروا چکا تھا۔ وہ حویلی میں تازہ ہوئے واقعے سے پہلے بھی مسلسل یہاں آ کر کام کروا رہا تھا۔ درمیان میں دو تین دن کی بدمزگی کے بعد اس نے دوبارہ اس طرف دھیان دیا تھا کہ یہ سب مکمل ہونا اشد ضروری تھا۔ اس کے بنا تو ساری گیم الٹ جاتی جو اس نے چوہدری شہاب کے ساتھ مل کر کھیلنے کی تیاری کر رکھی تھی۔

شام ہوگئی تھی اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی مزدوروں کو فارغ کر کے حویلی کے سجے سجائے صحن کے بیچوں بیچ کرسی ڈال کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طائرانہ نگاہ اس نے سارے میں ڈالی۔ ہر شے کو تبدیل کیا گیا تھا۔ کچن کو وقت کے مطابق ضروری سامان سے لیس کیا گیا تھا۔ سلیبیں لگا کر کاؤنٹر بنوا دیے تھے۔ ایک طرف سنک بھی لگوا دیا تھا جہاں کھڑے ہو کر برتن دھوئے جا سکتے تھے ورنہ رقیہ کی حویلی کے باورچی خانے میں اب بھی پرانی طرز کا کھرا بنا ہوا تھا جہاں بیٹھ کر برتن دھلتے۔ قاسم نے ایک شیلف پہ شہر سے گیس والا چولہا منگوا کر سیٹ کرا دیا تھا جو سلنڈر سے چلتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ بغور نارنجی رنگ کے کہیں کہیں سے زنگ آلود سلنڈر کو دیکھا اور تسلی ہونے پر نگاہیں دوسری جانب پھیر لیں۔

تین کمروں، ایک بڑے سے ہال کمرے، ایک پیٹیوں والے کمرے اور ڈیوڑھی کے ساتھ کشادہ صحن والی یہ حویلی اتنی بھی بری نہیں تھی جتنی چوہدری شہاب کے لہجے سے محسوس ہوتی تھی۔ غسل خانہ اور لیٹرین صحن کے کونے میں تھے جن کو قاسم نے چوہدری آفتاب کے کہنے پر مہمانوں کے لیے تیار کروا دیا تھا لیکن انہوں نے اندر بھی بچیوں کی آسانی کے لیے کمروں سے متصل واش روم بنوا دیا تھا۔ وقت بدل گیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹیوں کو صحن میں راتوں میں آنے سے ڈر لگتا ہے اس لیے انہوں نے یہ سہولت اندر بھی فراہم کر دی تھی۔

قاسم نے چوں چراں کیے بنا ان کے کہے کے عین مطابق سب کچھ مکمل کروایا تھا۔ حالانکہ چوہدری شہاب کو اس بات پر سخت اعتراض تھا لیکن قاسم نے انہیں تسلی دے کر چپ کروا دیا تھا۔ وہ طائرانہ نگاہ چھت کو جاتی سیڑھیوں پہ ڈالتا اوپر منڈیر کے کنارے سے ٹکا گیا۔ اس کے ذہن میں چوہدری شہاب کی گفتگو گھومنے لگی۔

''پاگل ہو گیا ہے قاسم پتر۔ اتنا خرچا کیوں کر رہا ہے اس آفتاب پر۔ کون سا یہ حویلی اس کے استعمال جوگی رہنی ہے۔ خوامخواہ پلا لگا رہا ہے اپنا۔''

انہیں قاسم کا یوں بے دریغ پیسہ لگا کر چھوٹی حویلی سجانا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ دبے لفظوں میں کہہ بھی چکے تھے کہ سب بے کار جانے والا ہے۔ آفتاب نے کون سا یہاں سدا رہنا ہے لیکن قاسم نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ جب سے کشور کی طرف سے امید مکمل طور پر ٹوٹ گئی تھی اس کا ذہن ہر وقت خانم کو اپنانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ یہ سب کچھ کر کے آفتاب کی نگاہوں میں ستائش بھر دینا چاہتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ماضی میں اس کا رویہ بھی چوہدری آفتاب کے ساتھ کچھ اچھا نہیں رہا تھا۔ لیکن ابھی وقت تھا۔ وہ ازالہ تو نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے چوہدری آفتاب کی پروا ہرگز نہیں تھی لیکن وہ خانم کی خاطر راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔

چوہدری شہاب سے بالا ہی بالا اسے خانم کو یہاں سے نکالنا تھا۔ اسے وہ چوہدری شہاب کی کسی سازش کا شکار ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن شہاب الدین کو کیسے سمجھاتا۔ اس کے سامنے اگر خانم کا نام لیتا تو وہ ٹھٹک جاتے کہ ان کو بے خبر رکھ کر قاسم کوئی اور گیم کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور عین ممکن تھا کہ وہ قاسم کو ہی دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کرتے۔ وہ پرانے پاپی تھے اور ایک سو ایک گر آزمانا جانتے تھے جبکہ وہ خود ابھی نیا کھلاڑی تھا ہر پینترا آزمانا نہیں جانتا تھا۔ اس لیے سوچ سمجھ کر ہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔

چوہدری آفتاب آج کل میں یہاں شفٹ ہونے والے تھے اور اسے کشور کی شادی کے فوراً بعد خانم کو یہاں سے نکالنا ہی تھا لیکن کیسے......؟''

اگر اس سے شادی کا شوشہ ابھی چھوڑا تو سب اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ سنہری کے ساتھ سب کی ہمدردیاں ہونے کی پوری امید تھی۔ لیکن کشور کی شادی کے بعد اسے کچھ تو ایسا کرنا تھا کہ خانم سے نکاح ہو جائے۔ وہ سنہری کے ساتھ زندگی گزارنے کے تصور کو ہی محال محسوس کر رہا تھا۔ خانم کا غیر جانب داری سے تقابل کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے اس کے جیسی شریک حیات بہترین تھی۔ کم عمر، بلا کی حسین اور بے وقوفی کی حد تک سیدھی سادی۔ اسے اب سنہری اور خانم کی ادلا بدلی کرنی تھی۔ اس کا دماغ بڑی عرق ریزی سے سارے معاملے کو سوچنے اور نتیجہ نکالنے میں مصروف تھا۔ جبکہ نگاہیں آرائشی قمقموں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

حویلی لکھاں کی طرح چھوٹی حویلی کو بھی شادی کی غرض سے ان قمقموں سے مکمل آراستہ کر دیا گیا تھا اور چونکہ شام ڈھل رہی تھی اس لیے وہ جلتے بجھتے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ ان جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھ کر اس کے دل کو عجیب بے چینی گھیر رہی تھی۔ وہ کرسی چھوڑتا اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے نکل کر حویلی کا رخ کیا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر چاہ کیا رہا تھا۔ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا دماغ پہلے سے مزید الجھ کر اسے بھی الجھائے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں اندر باہر سے اچھی طرح سج گئی تھی۔ پھپھو قدسیہ کی حویلی سے لے کر آفتاب کی حویلی تک ایک سے انداز میں برقی قمقموں کی جھالریں لہرا رہی تھیں۔ شام ڈھلتے ہی جیسے ہی یہ روشنیاں جلتیں تو یوں محسوس ہوتا سارا جہان روشنی میں نہا گیا ہے۔

شہاب الدین کی حویلی کے زنان خانے میں ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ سہ پہر سے پنڈ کی بچیاں اور عورتیں جمع ہونا شروع ہوتیں اور پھر مقامی گیت اور پنجابی ٹپوں کی برسات شروع ہو جاتی۔ مسلسل ڈھولک پہ پڑنے والی تھاپ دل کو گدگدائے جاتی۔ خوامخواہ کا جوش چڑھ چڑھ کر بولنے لگتا۔ سکینہ تو جیسے بیٹے کی شادی کی رنجھیں اتار رہی تھیں۔ انہوں نے پنڈ کی ہر بچی اور عورت کا جوڑا بنایا تھا۔ روزانہ پچھلے باغ میں دیگیں چڑھ جاتی تھیں اور سارا پنڈ موجود ہوتا تھا کھانے کو۔ لوگوں کے رات کے چولہے

ٹھنڈے ہوئے پڑے تھے۔ حویلی سے وافر مل رہا تھا جو بھر بھر کر ساتھ لے جاتے اور اگلے دن کی دوپہر تک نمٹ جاتا۔

شادی میں بارہ تیرہ دن رہ گئے تھے اور دن بدن کاموں کا انبار اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سکینہ نے نت نئے اور اس وقت کے اعتبار سے جدید تراش خراش کے کپڑوں اور نفیس ڈیزائن کے زیورات کی بھرمار کر دی تھی کشور کے لیے۔ خاندانی زیورات کے علاوہ کتنے ہی نئے چمکتے دمکتے سونے کے زیورات کے ڈبے تیار ہو کر آئے تھے۔ رقیہ بیٹی کی قسمت پہ جہاں رشک کر رہی تھیں وہیں حمیدہ اور سنہری کے سینوں پہ سانپ لوٹ رہے تھے۔ ان کے اندر کی جلن اور حسد عیاں ہونے لگا تھا۔ ایسی سرد مہری دونوں کے رویوں میں در آئی تھی کہ سکینہ کسی معاملے میں چاہ کر بھی حمیدہ سے رائے طلب نہیں کر پا رہی تھیں۔ سنہری کو تو وہ بھی اب منہ نہیں لگاتی تھیں۔ حمیدہ نے جیسے قسم کھالی تھی کہ شادی کے دنوں کے علاوہ آگے پیچھے اپنے حصے سے نہیں نکلنا۔ باہر مشترکہ صحن میں اور شہاب الدین کی حویلی میں سب اٹھ بیٹھ رہے تھے، خوب رونقیں لگی ہوئی تھیں لیکن حمیدہ نے ایک طرح سے قطع تعلق کر رکھی تھی۔ اسے یہ قلق ہی نہیں جاتا تھا کہ اس کے گھبرو جوان اور اکلوتے پتر کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تھا۔

قاسم پہلے بھی حویلی کے دیگر معاملات سے دور رہتا تھا اب تو جیسے بالکل کٹ گیا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز فی الحال چوہدری آفتاب کی خاطر سجائی گئی چھوٹی حویلی تھی جسے رہائش کے قابل بنا کر شاندار طریقے سے سامان سجا دیا گیا تھا۔ کسی بھی دن چوہدری آفتاب اور رقیہ بچیوں کے ساتھ وہاں شفٹ ہونے والے تھے۔ قاسم نے اپنی نگرانی میں سلنڈر ریسٹ کروایا تھا اور رقیہ کو چلانا بھی سکھایا تھا۔ اضافی دو سے تین سلنڈر باہر صحن کے پہلو میں بنی چھوٹی سی ڈیوڑھی میں رکھوا دیے تھے۔ چوہدری آفتاب اس کی سعادت مندی سے مسرور تھے۔ قاسم نے انہیں بیٹے کی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی یہاں تک کہ قدسیہ پھپھو کے لڑکوں نے مدد کروانے کی کوشش کی بھی تو قاسم نے انہیں منع کر دیا۔ چوہدری آفتاب نے ہی بہانے سے بھانجوں کو سمجھا بجھا دیا کہ قاسم کے کندھوں پہ ہی ذمہ داری رہنے دو، دھیان بٹا رہے گا۔

خانم اور کشور دونوں اس حویلی میں آنے کو بے چین تھیں اور ان کے ہمراہ رانی بھی تیار ہوئی بیٹھی

تھی کیونکہ اس کے بقول وہ لڑکی والوں کی طرف سے تھی۔ ہر طرف رونقیں ہی رونقیں تھیں۔ حویلی لکھاں میں سب کو شدت سے حسنات کا انتظار تھا جو کسی بھی دن آسکتا تھا۔ وہ سدا سے ایسا تھا کبھی بھی اپنے آنے کی خبر نہیں دیتا تھا نہ کسی کو لینے آنے کے لیے بلواتا تھا۔ اب بھی کب کس دن آجائے وہی جانتا تھا۔

سب کے ساتھ سنہری کو بھی شدت سے اس کا انتظار تھا کیونکہ وہ اس حویلی میں رہنے کا اپنا آخری جواز کھونا نہیں چاہتی تھی اور اس کا دماغ عجیب سی چالیں بن رہا تھا جن سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ جس آگ میں وہ دن رات جل رہی تھی اس کی تپش وہ سب ہی تک پہنچانا چاہتی تھی۔ سب خوش رہتے تو وہ کیوں سوگ مناتی۔ اور اگر منانا ہی تھا تو سب ہی کا تھوڑا حصہ نکالنا تھا اسے۔ وہ اس حویلی میں داخل ہوئی تھی تو اس زعم سے کہ ایک دن یہ ساری حویلی اس کے قدموں کی دھول چاٹے گی لیکن یہاں وہ دھتکاری گئی تھی۔ اس کے دل کو حیات کا غم تو کھائے جا رہا تھا لیکن قاسم کے لہجے کی حقارت زخمی کر گئی تھی۔ وہ قاسم جس کے ساتھ وہ کوٹھری میں پکڑی گئی تھی، وہی قاسم اسے اس قابل نہیں گردانتا تھا کہ اس کے ساتھ شادی کر سکے۔ تو اب اسے اس حویلی میں اپنے قدم جمانے کے لیے حسنات کی ضرورت تھی۔ ہار مان لینا اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ اگر مہرے ہی چلنے تھے تو ٹھیک ہے، وہ چل دے گی۔ کیا پہلے والا تو کیا بعد والا، اسے غرض اپنے مہرے سے تھی تو اب بس اسے شدت سے حسنات کی واپسی کا انتظار تھا۔

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 11

سورج کی روپہلی کرنیں گاؤں کے سیاہ افق پر نمودار ہونے کو تھیں۔ فجر کے بعد کا وقت تھا اور ہر سو دن چڑھنے کی رونقیں پھیلی تھیں۔ تڑکے سب سے نمایاں رونق چڑیاں لگاتی ہیں جن کی آواز اپنی جگہ ایک الگ ہی تاثیر رکھتی ہے۔ جو روح کو شانت کرتی ہے۔

چھوٹی حویلی کی وسیع اور صاف ستھری چھت پر کشور مشرق کی جانب منہ کیے ہولے ہولے نپے تلے قدم اٹھاتی مسکراتی نگاہوں سے جلد ابھرنے والے سورج کو دیکھ رہی تھی جس کی کرنوں نے اپنا پلو چھڑا کر رونمائی کر دی تھی۔ ارد گرد بادلوں کی ٹکڑیوں کا ہجوم گلابی نارنجی رنگ جذب کیے قدرت کی عطا پہ نازاں تھا۔ فضا کی خنکی طبیعت پہ خوش گوار تاثر چھوڑ رہی تھی۔ دل ایک الگ ہی لے پہ دھڑکتا تھا۔ آج کل اندر دھیمے دھیمے سر بکھرتے تھے۔ من چاہا ساتھی مل جانا من کا نہیں، روح کا سکون ہوتا ہے۔ حیات کے خواب اس نے اب سے نہیں تب سے دیکھ رکھے تھے جب اسے نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ اس کے دل میں بستا تھا اور آج مقدر نے یاوری کی تو وہ اس کا گھر بسانے چلی تھی۔ جس وقت ان کا سامان چھوٹی حویلی جا رہا تھا وہ اداس سی اپنے برآمدے میں ستون کی آڑ میں بیٹھی موتیے کی باڑھ کو دیکھتی آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماں اور خانم رابی کے ساتھ چھوٹی حویلی میں تھیں جہاں کافی سامان پہنچ چکا تھا اور کچھ ہی رہتا تھا۔ اسے تو لگتا تھا جیسے وہ لوگ اب کبھی بھی حویلی لکھاں واپس نہیں آسکیں گے۔ اسے چوہدری شہاب کی اس شرط یا مانگ کی وجہ سے ایک عجیب سی پریشانی تھی جسے وہ لفظوں میں چاہ کر بھی ڈھال نہیں پا رہی تھی۔ سارا دن شادی کی تیاریوں میں اور حویلی سجانے میں گزر جاتا تھا تو کسی کے پاس اس قدر فرصت بھی نہیں تھی کہ باریکیوں پہ غور کرتا۔ ایک وہی تھی جسے آج کل

سب سے کم کام ہوا کرتا، کچھ رقیہ اس کا ہاتھ شادی قریب ہونے کی وجہ سے کسی کام میں ڈلوا ہی نہیں رہی تھیں۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس فضا کے سپرد کی اور حویلی کے پچھلی جانب چھت کی منڈیر تک چلتی ہوئی آئی۔ یہاں تا حد نگاہ سبزے اور درختوں کی بھرمار تھی جو نگاہوں کو تازہ دم کر دیتی تھی۔ وہ بغور سارا منظر دیکھتی مسکراتی واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ یکدم بری طرح ٹھٹکی اور منہ سے جیسے آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔ نیم کے بڑے سے پیڑ کے نیچے اس کے تنے سے ٹیک لگائے ایک گھٹنا موڑے پاؤں تنے سے ٹکائے حیات پورے دھیان گیان سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ کشور نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حیات اس وقت اسے یوں دکھائی دے سکتا تھا۔ جیسے ہی گمان نے یقین کا قالب ڈھالا کشور نے فوراً دوپٹے کے پلو سے چہرہ ڈھکا۔ اگلے ہی پل وہ پیچھے مڑنے لگی لیکن سامنے حیات تھا اور وہ کوئی ایرا غیرا یا عامیانہ مرد نہیں تھا کہ وہ اسے یوں ہی چھوڑ کر نیچے چلی جاتی۔ وہ اگر یہاں تک آیا تھا تو یقیناً کوئی وجہ رہی ہوگی۔ کشور نے جھجکتے ہوئے اس سے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ یہاں کیا کر رہے ہو؟

جواباً حیات نے بھی اسی کے انداز میں شہادت کی انگلی سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس کی جانب تو کشور سچ میں ٹپٹائی......

یعنی وہ اسے واضح پیغام دے رہا تھا کہ وہ یہاں اسے دیکھنے کے لیے آیا ہے۔

کشور کے گال تپ سے گئے۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں کیا کہے بس شرماشرمی ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگی۔

حیات نے مسکراہٹ ضبط کی اور ایک بار پھر اسے اشارے سے متوجہ کیا۔ اس بار وہ اسے جو کہہ رہا تھا اس نے کشور کے حواس سلب کر لیے۔ اس نے ہاتھ کی مدد سے ریسیور بنایا اور اسے کان سے لگایا تا کہ وہ سمجھ سکے۔ کشور کے مانو پیروں تلے زمین نکل گئی۔

ان کی چھوٹی حویلی میں بھی فون لگ چکا تھا اور حویلی لکھاں میں تو کب سے پی ٹی سی ایل فون کی سہولت موجود تھی لیکن حویلی کی لڑکیاں فون نہیں اٹھایا کرتی تھیں، نہ کرنے کی اجازت تھی۔ ایسے میں وہ

بھلا فون پہ کیسے بات کرتی۔ اس کی پیشانی اس خنک موسم میں بھی گیلی ہو گئی تھی۔ اس نے انکار کے لیے بغور حیات کا چہرہ دیکھا تو وہ انتہائی سنجیدہ دکھائی دیا۔ وہ ناچار رک گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حیات نے کچھ ضروری کہنا ہے ورنہ وہ ایسے مزاج کا نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کر کے اشارہ دیا اور پھر ہاتھ کا ریسیور بنا کر کان پر رکھا۔ یہ اشارہ تھا کہ دوپہر کے تین بجے وہ کال کر لے۔ اس وقت چوہدری آفتاب بھی گھر میں نہ ہوتے تھے اور رقیہ بھی حویلی کے صحن میں عورتوں کے جھنڈ میں بیٹھی شادی بیاہ کے سلسلے نمٹا رہی ہوتی تھیں۔

حیات نے ایک طویل سانس خارج کر کے اپنے اعصاب کو پرسکون کیا اور گہری محبت بھری نگاہ کشور پہ ڈالتا واپس ہو لیا۔

کشور دل تھامے اسے نگاہوں سے اوجھل ہوتا دیکھتی رہی جو دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے چلتا ہوا بھی نہایت دل آویز دکھتا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی حیات نے اس سے کیا کہنا تھا لیکن نا جانے کیوں اسے حیات کا یوں صبح صبح خاص اس کے انتظار میں کھڑے ہونا گدگدا گیا تھا۔ یہ احساس ہی کتنا جاں فزا تھا کہ وہ محض اس کے لیے کب سے یہاں کھڑا تھا۔ حیات سے ہوتے خیال سنہری والے واقعے کی جانب خود بخود چلا گیا۔ جب جب سنہری کا خیال آتا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ جو واقعہ حویلی میں رونما ہوا تھا وہ ہرگز معمولی نہیں تھا لیکن ایک بات تو اسے اچھے سے سمجھ میں آ گئی تھی کہ گھر کا سربراہ چاہے تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا دے۔

کیسے تایا شہاب نے اتنے بڑے واقعے کو کوے کا پر بنا دیا تھا۔ سب سوچتے ہی رہ گئے کہ یقیناً سنہری کے فتنے کا کچھ انجام ہونے والا ہے اور قاسم کی اکڑ کو بھی نکیل ڈل جائے گی لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔

تایا شہاب نے معاملے کو اتنا ہلکا پھلکا بنا دیا تھا کہ وہ دونوں پوری شان سے حویلی میں دندناتے تھے۔

قاسم تو چلو مرد تھا لیکن سنہری کی گردن کا سریا جیسے مزید تن گیا تھا۔

وہ سب کچھ اللہ کے بھروسے پہ چھوڑے حیات کے سپنے بن رہی تھی۔ تبھی چلتے چلتے منڈیر کے قریب آتے اس نے دور پگڈنڈی پہ نگاہ دوڑائی تو چوہدری آفتاب کو آتے دیکھا۔ فجر پڑھ کر ان کی مسجد

سے واپسی پو پھٹنے کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ آج تین دن ہو گئے تھے انہیں یہاں شفٹ ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی رابی بھی چلی آئی تھی۔ شام ہوتے ہی پنڈ کی لڑکیاں یہاں اوران کی مائیں حویلی لکھاں میں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ رونقیں عروج پہ تھیں۔ رقیہ کو بیٹی کے بیاہ کے ساتھ نئے گھر اور نئے اطوار الجھن میں ڈالے ہوئے تھے۔ باورچی خانہ تو جیسے ایک آزمائش تھا۔ جہاں چولہا جلانے سے پہلے گویا طوفان آتا تھا۔ چوہدری آفتاب مسجد جانے سے پہلے خود گیس والا چولہا جلا دیتے یا کشور یہ کام سرانجام دیتی۔ اس دوران رقیہ اپنی چادر کا پلو دونوں کانوں پہ رکھے سر اور گردن جھکائے یوں پرے ہو کر کھڑی رہتیں گویا ابھی زوردار آواز سے چھت سمیت سب اڑنے والا ہو۔ ان کو کافی وقت لگ جاتا اس سب کا عادی ہونے میں۔ وہ لکڑیاں جلا کر پکانے میں ہی برکت جاننے والی عورت بمشکل مٹی کے تیل والے چولہے تک پہنچی تھیں، اب یہ گیس کے سلنڈر پہ پکانا جیسے جوئے شیر نکالنے کے مترادف تھا۔ لیکن کرنا تو تھا۔ کچھ بھی تھا آسانی تو ہوئی تھی۔ وقت کی بچت تو تھی ہی، برتن بھی خراب نہیں ہوتے تھے۔ پہلے جتنا وقت ایک ہنڈیا بنانے میں لگتا تھا اب اس سے آدھا لگتا تھا۔ بس جتنی دیر اس چولہے پہ پکاتیں زبان پہ ورد جاری رہتا۔ کشور اور خانم کو ماں کی کیفیت بڑا لطف دیتی تھی۔ چوہدری آفتاب بھی رنگ اڑے چہرے کے ساتھ جب بیوی کو پکاتا دیکھتے تو حظ اٹھاتے۔

ویسے بھی ابھی ان کا چھوٹی حویلی میں دل لگتے وقت لگ جاتا۔ ساری عمر حویلی لکھاں میں گزار دی تھی۔ گو کہ وہ جانتے تھے کہ اس حویلی میں ان کی ماں بیاہ کر آئی تھی اور آخری سانسیں بھی یہیں لی تھیں لیکن ایک نامعلوم سی کسک اور تکلیف دل کو گھیرے رکھتی تھی۔

بھلا ان کو کون سا معلوم نہیں تھا کہ ان کی ماں کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ مری کیسے تھی۔ چھت کو جاتی سیڑھیوں کو وہ کبھی نگاہ بھر کر دیکھ نہیں پائے تھے۔ یوں لگتا جیسے خون کی دھار اوپر سے نیچے تک بہتی چلی آ رہی ہو۔ کوئی چوہدری آفتاب کے دل کو ٹٹولتا تو جانتا کہ کیسا عالی ظرف ہے اور معاف کر دینے کا جذبہ انہیں اپنی ماں سے ملا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چوہدری آفتاب جانتے ہیں کہ ان کی ماں کو شہاب الدین اور مہتاب نے دھکا دے کر گرا دیا تھا جس کے بعد زخموں کی تاب نہ لاتے وہ انہیں جنم دینے

کے بعد دم توڑ گئی تھی۔

یہ قصہ بھی ان پہ تب کھلا تھا جب بڑی چوہدرائن بستر مرگ پر تھیں۔

سکینہ بی بی ان کی بھرجائی کے روپ میں حویلی میں آچکی تھیں اور سبھی کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ چوہدری آفتاب کو ماں بن کر پالا تھا بڑی چوہدرائن نے اس لیے ان کی خدمت ایک بیٹے سے بڑھ کر کی تھی چوہدری آفتاب نے۔ ان دنوں بڑی چوہدرائن شدید بیمار تھیں اور چوہدری شہاب اور چوہدری مہتاب ماں کو وقت نہیں دیتے تھے۔ چوہدری شہاب کی کسر تو سکینہ پوری کر دیتی تھیں لیکن حمیدہ تو سرے سے زحمت ہی نہیں کیا کرتی تھیں۔ ان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا اور ویسے بھی ہواؤں میں اڑا کرتی تھیں۔ بڑی چوہدرائن نے چوہدری آفتاب کو بتا دیا کہ جب وہ پیدا ہونے والے تھے کس طرح شہاب اور مہتاب نے ان کی ماں کو سیڑھیوں سے لڑھکا دیا تھا۔ ماں تو ماں ہوتی ہے اس لیے یہ بتانے کے بعد انہوں نے چوہدری آفتاب کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ ان کے بیٹے اس وقت نادان اور بچے تھے اس لیے ہو سکے تو انہیں معاف کر دینا۔

چوہدری آفتاب نے بڑی چوہدرائن کے ہاتھ تھام کر پیشانی سے لگا لیے اور دل سے انہیں معاف کر دیا تھا۔

وہ اس ماں کو جس نے انہیں بے لوث چاہت اور محبت سے پالا تھا اس کا دل اس ماں کے لیے کیسے دکھا دیتے جسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ ان کا اپنا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ ان کے دل میں اپنی حقیقی ماں کی تکلیف زخم بنا گئی تھی۔

کیا اس عورت کا دل نہیں کرتا ہوگا کہ وہ اپنے بچے کو کھلاتی، نہلاتی، پہناتی لیکن اسے بنا کسی جرم کے ہی اس کی اولاد سے دائمی جدا کر دیا گیا۔ قدرت نے چوہدری آفتاب کو بہت بڑا ظرف عطا کیا تھا۔ جب انہوں نے معاف کیا تو دل سے کیا اور کبھی پلٹ کر اس واقعے کا تذکرہ تک کسی سے نہیں کیا۔ لیکن اب جب وہ اس حویلی میں موجود تھے جہاں ان کی ماں بیاہ کر لائی گئی تھی تو کئی زخم ہرے بھی ہوئے اور ادھڑ بھی گئے۔ وہ جب جب سیڑھیوں کی جانب دیکھتے انہیں ایک ہیولا سا سیڑھیوں سے لڑھکتا نیچے گرتا

دکھائی دیتا اور وہ جھر جھرا کر رہ جاتے۔

وہ فجر پڑھ کر آئے تھے اور وہیں بڑا سا صحن عبور کر کے ایک طرف بنے برآمدے میں بچھے رنگین پایوں والی چارپائی پہ جا بیٹھے۔ رقیہ کچھ ہی دیر میں ناشتا لیے وہاں آ جاتیں اور پھر شادی اور اس کی تیاری کی باتیں شروع ہوتیں جو ہوتے ہوتے سلینڈر پر جا رکتیں۔

وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سر پہ پہنی پگڑی اتار کر ایک طرف رکھی اور پرسوچ نگاہوں سے سارے صحن کو دیکھنے لگے۔ ہر شے مکمل تھی سب کچھ دو ماہ کے اندر مکمل تیار ہو گیا تھا۔ کسی کسی وقت انہیں اپنے اوپر ہنسی آتی تھی۔ ان کی چھٹی حس جانتی تھی کہ چوہدری شہاب کے انہیں چھوٹی حویلی بھیجنے کے پیچھے کوئی چال ہے لیکن وہ بنا چوں چرا کیے یہاں موجود تھے۔

وہ جانتے تھے کہ اس سب میں قاسم ان کے ساتھ ملا ہوا ہے لیکن وہ خاموش تھے۔ ورنہ اس بھتیجے کو بچپن سے دیکھا تھا نگاہوں کے سامنے پلا بڑھا تھا، اس کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھے۔ وہ قاسم کبھی بھی ان کے ساتھ اس قدر انسیت نہیں دکھا سکتا تھا کہ ایک ان کی یہ حویلی سجانے کی خاطر وہ دن رات لگا رہا تھا۔ کوئی کمی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ٹیلیفون کی تار لگنا آسان کام نہیں تھا لیکن یہ بھی اس نے اپنی جان پہچان لڑا کر کروا دیا تھا۔

رنگ روغن سے لے کر فرنیچر تک ہر شے اسی نے لا کر سجائی تھی۔ ان کے بارہا پیسوں کا حساب پوچھنے پہ بھی وہ کچھ نہیں بتاتا تھا اور پھر شادی کے لیے قمقمے تک لگوا کے وہ چابیاں چوہدری آفتاب کے حوالے کر کے گیا تھا۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود انہیں اس سب میں ایثار کی مہک نہیں آتی تھی بلکہ کسی وبال کا شاخسانہ محسوس ہوتا تھا۔

لیکن انہیں ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ رکھا تھا۔ وہ سب محسوس کرنے کے باوجود اور دل میں مسلسل کھٹک محسوس کرنے کے باوجود لاچار تھے کیونکہ ان کے ہاتھ کوئی سرا نہیں آ رہا تھا یا آ رہا تھا تو وہ پکڑنے پہ قادر نہیں تھے۔ یوں جیسے وہ خود مقتل میں چلے آئے ہوں جب کہ بھاگنے کی راہ بھی مسدود تھی۔

انہوں نے نیلے شفاف آسمان پہ تیرتی ایک دو سفید بدلیوں کو چاہت سے دیکھا اور دل میں بے

ساختہ اللہ سے عافیت طلب کی۔ جو چیز انہیں مفلوج کر رہی تھی اس خیال اور سوچ سے اپنے رب کی پناہ مانگی اور سب کچھ اس کے حوالے کر کے وہ اب شادی کے کھانے کا حساب کتاب سوچنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں میں الگ ہی رونقیں تھیں۔ ویسے بھی اس زمانے میں اصل رونقیں لڑکے والوں کی طرف ہی لگا کرتی تھیں۔ بیٹی والے تو شرم وحیا سے اس قدر پر ہوا کرتے کہ باپ بھائی ان دنوں بیٹی کے سامنے نہیں آیا کرتے تھے اور لڑکی خود بھی شرم وحیا کا پیکر بنی اندر کمرے میں چھپی رہتی۔ ڈھولک بھی اونچی آواز میں نہیں بجائی جاتی تھی کہ بزرگ عورتیں ساتھ ساتھ تانیں لگایا کرتی تھیں۔

''او شرم رکھو کڑی آلیاں دا کارا اے۔''

لڑکی والے چیخ چنگھاڑ کرتے بالکل نہیں جچا کرتے تھے۔ نہ ہی جوش وخروش دکھانا بھلا لگا کرتا تھا کیونکہ ودائی والا گھر ہوتا تھا۔ بیٹی بیاہنے کا سکھ ایک طرف لیکن نصیبوں کا اندیشہ بھی بڑا بھاری ہوتا تھا۔ سبھی لڑکے چونکہ حویلی لکھاں میں موجود تھے اس لیے شور وغل بھی یہیں تھا۔

چار حویلیوں پر مشتمل طویل وعریض حویلی لکھاں جب شام ڈھلے سے لے کر پو پھٹنے تک روشنیوں سے جگمگاتی رہتی تو رات میں بھی دن کا سماں پیش کرتی۔ اس قدر روشنیاں تھیں کہ محسوس ہوتا تھا ستارے اتر کر باراتی بنے بیٹھے ہوں۔ یہ چراغاں یہ چہل پہل اور رونق کچھ دلوں پہ بجلی بن کر گر رہی تھی۔

قاسم سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا کڑھتا اور آنے والے وقت کی پلاننگ کرتے گزارتا تھا۔ جس داؤ کو وہ کھیلنے جا رہا تھا اس میں معمولی سا جھول بھی ساری بازی پلٹ دیتا۔ وہ حمیدہ سے بھی زیادہ بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ شہاب الدین اپنے لاڈلے بھتیجے کو بلاتے تو وہ پھر بھی ان کی بات سننے نہ جاتا۔ عجیب قنوطی سی طبیعت ہو رہی تھی۔

ایک طرف کشور جیسی مکمل لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کا قلق اور حیات کی خوشی دل پہ سانپ بن کے لوٹتی تھی تو دوسری طرف خانم کی صورت میں ایک مہرہ ہاتھ میں آنے کا جوش بھی دل میں سر اٹھاتا لیکن سارا جوش جھاگ بن کر بیٹھ جاتا جب سنہری کا خیال آ جاتا۔ حمیدہ خانم سے زیادہ سنہری کو ترجیح

دیتیں اور سنہری اسے ایسا سنہری جال لگتی تھی جو اس کے اوپر ڈل گیا تو وہ اندر پھڑپھڑاتا رہ جائے گا۔ اس کی بے تحاشا گوری رنگت پہ چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی آنکھیں اکثر اسے بھی ہراساں کر دیتی تھیں۔ ایک ایسا ان کہا خوف جو بتایا نہ جا سکے بس سمجھنے والا سمجھ لے......!

دوسری طرف حمیدہ تھیں جنہیں یہ سب تام جھام ہی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ آخر ان کا بیٹا کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کو بھی گردن جھکانی پڑ گئی تھی۔ ان کی بھانجی سے ملزموں کی طرح باز پرس کی گئی تھی۔ بھلا انہوں نے کب ایسا سلوک سہا تھا۔ آئی وہ دیورانی بن کے تھیں حویلی لکھاں میں لیکن جب سے آئی تھیں انہوں نے سکینہ کو کبھی خاص گھاس نہیں ڈالی تھی اور نہ ہی جٹھانی والا رتبہ دیا تھا۔ برابری کی سطح پہ مطالبہ کرتی تھیں اور حکم صادر کیا کرتیں۔

سکینہ صلح جو اور نرم خو تھیں جو نبھتی چلی گئی ورنہ حمیدہ نے انہیں ہمیشہ حقیر ہی جانا تھا۔ رقیہ اور سکینہ کی شروع سے بنتی تھی۔ رقیہ جب سے بیاہ کر آئی تھیں سکینہ کو جیسے سہیلی مل گئی۔ رہی سہی کسر قدسیہ آپا پوری کر دیتیں جن کا دونوں بھابیوں سے بے حد دوستانہ تھا لیکن حمیدہ سے وہ چڑتی تھیں اور چونکہ عمر میں بڑی تھیں تو رعب بھی جما لیتی تھیں۔

رقیہ ہمیشہ عاجزی کا پیکر بنی رہیں۔ ان کی اور آفتاب کی طبیعت ایک دوسرے کا عکس تھی۔ دونوں ہی سب کا احساس کرنے والے اور ایثار کرنے والے تھے۔ اس لیے وقت نے ان کو حویلی لکھاں کے ستون کی حیثیت دے دی تھی۔ لاکھ شہاب الدین اور مہتاب کے دلوں میں کدورت رہی لیکن ان کی جگہ قدرت انہیں دلواتی چلی گئی اور وہ حیثیت کسی اور کو نہ مل سکی۔ بڑی چوہدرائن چوہدری آفتاب سے بے حد راضی گئیں جبکہ انہیں اپنے بیٹوں سے بے حد گلے تھے۔ لیکن مہتاب کی تو بیوی سے بھی وہ آزردہ خاطر رہیں۔

حمیدہ کو اس میں بھی رقیہ اور سکینہ کی چال دکھائی دی۔ وہ سدا انہیں گھنی میسنی سمجھتی رہیں جو ان کے خلاف ساس کو بھڑکاتی رہیں اور نتیجتاً وہ ان سے کبھی خوش نہیں ہو سکیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ خود بھی تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ وہ تو زیادہ اپنے کمرے سے باہر آیا ہی نہ کرتی تھیں۔

قاسم کی پیدائش کے بعد تو جیسے وہ اپنے ہی ہاتھ کا پھپھولا بن گئیں۔ چوہدری مہتاب کا اکلوتا پتر تھا اور وہ بھی بلا کا حسین......

حیات اور وہ ہم عمر تھے اور ان سے پہلے صرف چوہدری شہاب کی بیٹی تھی جو سب کی لاڈلی تھی۔ حیات اور قاسم آگے پیچھے پیدا ہوئے تھے۔ دونوں ہی بہت پیارے تھے لیکن قاسم کا رنگ بے حد گورا اور بال سنہرے تھے۔ آنکھوں کا بھی نرالا ہی رنگ تھا جبکہ حیات نمکین رنگ و روپ والا بے حد دل موہ لینے والا بچہ تھا۔ لیکن حمیدہ نے جیسے قاسم کو حویلی لکھاں کا کوہ نور نامزد کر دیا تھا جس کے جیسا کوئی تھا نہ آنے والا تھا۔

قدسیہ کے بھی دو بیٹے تھے پر حمیدہ اعلانیہ کہا کرتیں کہ میرے قاسم جیسا کوئی اک بھی نہیں۔ ایسے کہتے اور جتاتے انہوں نے کبھی باقی ماؤں کے جذبات کا خیال نہیں کیا تھا۔ بیٹے کسے پیارے نہیں ہوتے۔ اس بات پہ اکثر قدسیہ اور حمیدہ کی تلخ کلامی بھی ہو جاتی لیکن سکینہ قدسیہ کو خاموش کروا کے منظر سے ہٹا لیا کرتیں۔ وہ حمیدہ کی فطرت کی عادی ہو چکی تھیں۔ ان کے ساتھ بحث کر کے نہیں جیتا جا سکتا تھا۔

اس سے بس بے ہنگم شور پیدا ہوتا تھا اور نتیجہ صفر......

معاملہ جوں کا توں رہا کرتا......!

اب وہی قاسم تھا ان کا چاند سا پتر جس کے لیے وہ کشور کو مانگ نہیں سکی تھیں۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی کہ وہ بھی شروع دن سے کشور پہ نگاہ رکھے ہوئے تھیں لیکن موقع ایسا بنانا چاہتی تھیں کہ ان کی ناک اونچی رہے اور کشور ان کے بیٹے کے نام یوں لگے کہ محسوس ہو جیسے متھے ماری گئی ہے۔ حمیدہ صد احسان کرتے اس کو اپنی بہو بنائیں تو ان کی گردن تن کے مزید اکڑ جائے۔ رقیہ کی بیٹی تھی اور وہ مر سکتی تھیں لیکن رقیہ کو اہمیت نہیں دے سکتی تھیں۔ ان کے اندر کی گندگی کو صرف وہی جانتی تھیں کہ جس صورت حال میں آج سنہری اور ان کا بیٹا قاسم پھنسا تھا کبھی وہی حالات انہوں نے بنانے کا مصمم ارادہ کیا تھا لیکن کشور کے لیے......

وہ قاسم کے ساتھ کشور کو پکڑوا دیتیں اور پھر ہزار احسان کرتے ہوئے اسے اپنی بہو بنا لیتیں۔

لیکن سکینہ نے بھرے مجمع میں اس کا رشتہ مانگ کر ان کی امیدوں پہ پانی پھیر دیا تھا۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکی تھیں۔ رشتہ طے ہونے سے لے کر تاریخ طے ہونے تک سب کچھ پھرتی سے ہوا تھا۔ اوپر سے سنہری کی آمد نے بھی ان کا ذہن بٹایا ضرور تھا لیکن اگر سنہری یہ جان جاتی کہ اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا دل حمیدہ کا کشور کی جانب سے مکمل مایوسی کے بعد بنا ہے تو سنہری یقیناً سب سے پہلے اپنی ماسی کا گلا سوتے میں گھونٹ دیتی......

قدرت نے حمیدہ کی سوچی چال انہی پر لٹا دی بس فرق یہ تھا کہ اس منظر میں قاسم کے ساتھ کشور کی بجائے سنہری تھی اور یوں ان کے پاس چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ پاتیں۔ اس سب کے بعد حویلی میں پھیلا شور شرابا اور رونقیں ان کے اندر آگ جلا رہی تھیں جس کی تپش میں ان کا پور پور جھلس رہا تھا۔ وہ رقیہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اپنی بیٹی کو حویلی لکھاں کی سب سے بڑی بہو بنا کے وہ اتراتی تو ہوگی۔ ایسی ہی خود ساختہ سوچوں میں انہوں نے اپنا آپ زخمی کر رکھا تھا۔ کمرے میں بند وہ اپنے ہی وجود میں کھبے زہریلی سوچوں کے کانٹے اکھاڑ رہی تھی۔

سنہری نے حویلی لکھاں کی چھت کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ سارا سارا دن وہیں ٹہلتے گزر جاتا۔ کبھی اس منڈیر تو کبھی اس منڈیر...... وہ بس دور تک نظر آتے کھیتوں کو دیکھتی اور کبھی دور سے دکھائی دیتی چھوٹی حویلی کو دیکھتی جس کی اونچی چھت یہاں سے صاف نظر آتی۔ رات ہوتے ہی وہاں پہ جلنے والی روشنیاں سنہری کا دل جلا کر راکھ کر ڈالتیں۔ حمیدہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں۔

وہ چاہتیں کہ وہ سکون سے ان کے پاس بیٹھے، کوئی پلاننگ کرے۔ اور نہیں تو ایک پھیرا پھر سے اپنے پنڈ کا مار آئے چلو کاری نہ سہی، ہلکے والا ہی عمل کروا دے کہ کسی طرح یہ شادی رک جائے۔ لیکن سنہری اس وقت ناگن بنی بیٹھی تھی جو ڈسنے کے لیے موقعے اور وقت کی تاک میں تھی۔ وہ کسی کا سامنا کرنے سے خود بھی گریزاں تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ سنہری کی نگاہ نیچی ہوئی ہو۔ اس کو کوئی شرمندہ کر دے اور وہ خاموش بیٹھی رہ جائے لیکن پہلی بار تھا سارا بنا بنایا کھیل الٹ گیا تھا۔

قاسم کی اوقات وہ خود کچھ نہیں گردانتی تھی لیکن قاسم نے تو جیسے اسے پیروں تلے مسل ڈالا تھا۔

جسے وہ آخر آپشن پر رکھے ہوئے تھی وہ اسے ہی دھتکارے ہوئے تھا۔ اوئے ہوئے! کیسی جلن تھی جو اس کی رگوں تک کو جلائے جا رہی تھی۔ اسے یعنی سنہری کو قاسم رد کر دے تو باقی کیا بچتا تھا۔ قاسم میں تھا ہی کیا سوائے اچھی شکل کے اور قد کے۔ نہ اسے بولنے کا سلیقہ تھا جیسے حیات میں تھا اور نہ اس کے انداز واطوار دل موہ لینے والے تھے جیسے حسنات کے۔ لٹھ مار لہجہ اور جاہلوں والے انداز لیے وہ خود کو خود ہی توپ گردانتا تھا۔

سنہری کیسے سہتی بھلا۔ اس کا دل کرتا تھا کہ چھوٹی حویلی جائے اور کشور کو شادی کے جوڑے سمیت جلا کر راکھ کر دے۔ کاش اس نے تھوڑی سی بنا کر رکھی ہوتی تو آج اسے وہاں جانے میں جھجک نہ ہوتی۔ رابی نے تو اسے منہ لگانا ہی چھوڑ دیا ہوا تھا لیکن خانم بھی جیسے اسے اچھوت جان کر ملے بنا یہاں سے چلی گئی تھی۔

اسے ہونا تھا کشور کی جگہ...... اسے ہونا تھا بڑے چوہدری کی بڑی نوہ...... لیکن حیات ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کی عقل بہت سے معاملات حل کر رہی تھی لیکن کھوپڑی کے اندر۔ عملی طور پر اسے میدان ہموار چاہیے تھا جو ملنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان پہ اڑتے پرندوں کو دیکھتے اس کی چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی آنکھوں میں بلا کا حسد ناچ رہا تھا۔ طلب رقص کر رہی تھی سب تہس نہس کر دینے کی چاہ تھی، ایک جھٹکے سے سب کچھ پا لینے کی...... منڈیر کے قریب آتے اس نے شور سا سنا تو وہ تیز قدموں سے چلتی نیچے جھانکنے لگی۔ وہاں حیات کو مبشر کے ساتھ حویلی کے اندر آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری اور وہ تیزی سے نیچے کو لپکی۔

☆......☆......☆

چوہدری شہاب الدین ہال میں اکیلے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ان کا خاص ملازم منیر ابھی ابھی حقہ تازہ کر کے رکھ گیا تھا۔ شہاب الدین کے ماتھے پہ سوچ کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں۔ ان کے پہلے پتر کا ویاہ تھا یہ ان کے لیے خوشی کی بات ہوتی لیکن اگر کشور کے ساتھ نہ ہوتا۔ انہیں اس لڑکی سے

کوئی پرخاش نہیں تھی لیکن جس وقت آفتاب کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا ان کے لیے یہ سب خوشی لایعنی ہو جاتی تھی۔ آفتاب کو وہ کسی صورت اور کسی انداز میں برداشت نہیں کر پاتے تھے انہیں بس وہ ایک ہی صورت میں بھا سکتا تھا اور وہ تھی لاش کی صورت......

پھر بھی وہ اپنے بیٹے کی اور بیوی کی خوشی کی خاطر اپنی کدورت کو چھپائے ہوئے تھے کیونکہ جو ہونے والا تھا اس کے لیے لازم تھا کہ وہ مکمل پرسکون اور راضی دکھائی دیتے۔ اصل فکر انہیں حسنات کی تھی وہ چاہتے تھے کہ کچھ ایسا ہو اور حسنات اس شادی میں نہ آسکے۔ وہ ذہین اور زیرک تھا اور آفتاب سے بے حد قریب بھی۔ اس کا یہاں ہونا ان کے لیے بہت سے معاملات میں رخنے کا باعث تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹری کی سخت پڑھائی کی وجہ سے وہ بہت سے اہم موقعوں پہ بھی نہیں آپاتا تھا اور چوہدری شہاب چاہتے تھے کہ یہ اہم موقع بھی اس کے آئے بنا ہی گزر جائے۔ اس کی جانب سے دھیان ہٹا کر انہوں نے اپنی سوچوں کا رخ قاسم کی جانب موڑا جو کہ آج کل ان کے ہاتھ بالکل نہیں آرہا تھا۔ کتنی بار بلوا چکے تھے اسے لیکن ہر بار اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی عذر سننے کو مل جاتا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ آنے والے دن بے حد نازک اور سنگین تھے۔ معمولی سی غلطی سب کچھ تباہ کر دیتی۔ انہیں قاسم کے اٹھائے جانے والے ہر ہر قدم کی مکمل تفصیل چاہیے تھی۔

ناگواری سے انہوں نے منیر کو آواز دی اور اس کے آنے پر کڑک دار لہجے میں قاسم کو بلانے کا کہا اور خود اٹھ کر ڈیرے پہ جانے کے لیے تیار ہونے چل دیے۔ قاسم کو لے کر وہیں جانا بہتر ہوتا کیونکہ دیواروں کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔

☆......☆......☆

وہ مبشر کے ساتھ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو چہرہ دمک رہا تھا۔ دیدار میں بھی عجیب ہی مزا ہے۔ کشور کو اتنے دن بعد دیکھا تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے اعصاب پہ طاری سستی یکدم دور ہو گئی ہو۔ ذہن اور دل تازہ دم ہو گئے تھے۔ اسے خود پہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ بھلا وہ کب ایسی حرکت کا سوچ سکتا تھا جو ابھی کر کے آیا تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اس نے کشور کو فون کرنے کا اشارہ کیوں دیا تھا

اور اب جب کال کرے گا تو اسے کہے گا کیا......؟

بے اختیاری عمل تھا جس کی توجیہہ پاس نہیں تھی لیکن بس ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ چھوٹی حویلی کے باہر کھڑا تھا اسے یقین تھا کہ کشور لازمی چھت پر ٹہلنے آئے گی۔ مبشر کو وہ ڈیرے پہ جانے کا کہہ کر خود وہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ دل میں بے نام سی پکڑ دھکڑ تھی۔ کچھ تھا جو اسے باور کراتا تھا کہ کوئی سازش یا کوئی عداوت راہ دیکھ رہی ہے۔

سنہری کی جانب سے جب سے وہ حرکت ہوئی تھی وہ کشور کو لے کر بے حد حساس ہو گیا تھا اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ نکاح ابھی کے ابھی کر ڈالتا۔ سنہری کے شر سے اسے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ اور اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ فون پر کشور سے کیا کہنے والا ہے۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی مبشر اسے کسی بات کا جواب دیتا اپنی حویلی کی جانب چل دیا اور وہ خود ایک تفصیلی نگاہ سے ان چاروں حویلیوں کے مشترکہ باغ اور وسیع و عریض صحن میں لگے برقی قمقموں اور آرائشی فانوسوں کو دیکھنے لگا۔ جگہ جگہ نقلی پھولوں کے بڑے بڑے فانوس بھی برآمدے کی چھتوں اور ستونوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہی حویلی لکھاں کا حسن دیکھنے والا ہوتا جب سب کی سب روشنیاں جل اٹھتیں۔ اندر قدم بڑھاتے اس کی اگلی نگاہ چوہدری آفتاب کی خالی کی ہوئی حویلی پر ٹھہر گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی بارات واپس آئے گی وہ چوہدری آفتاب اور رقیہ کو واپس لائے گا۔ اسے اچھی نہیں لگتی تھی ان کی حویلی کی بے رونقی......

بچپن سے ہوش سنبھالتے انہیں یہیں دیکھا تھا۔ چاروں حویلیاں مکینوں سے پر رہا کرتی تھیں اور جب سے اباجی نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ ان کے پتر کی بارات سارے پنڈ میں گھومتی گھامتی چھوٹی حویلی جائے گی وہ اور سکینہ تب سے ہی بے چین تھے۔ دونوں کی مرضی نہیں تھی کہ چوہدری آفتاب اور رقیہ چھوٹی حویلی شفٹ ہوں لیکن خاموشی مجبوری تھی۔ جس بندے کو رشتے کے لیے مناتے ان کے دانتوں پسینہ آیا تھا تو اب ایک اور بار رد کر کے انہیں ضد دلانا خرابی کا باعث بنتا۔ چوہدری شہاب کی ہٹ دھرمی سے سارا زمانہ واقف تھا۔ انہیں تو سکینہ نے ایک ماہ شادی مزید تاخیر کرنے کا کہا تو وہ ہتھے

سے اکھڑ گئے تھے کیونکہ نمرہ کے ہاں سے کسی بھی وقت خیر کی خبر آسکتی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ وہ بھی بھائی کی شادی میں شریک ہو سکے لیکن شہاب الدین نے ہتھیلی پہ سرسوں جما رکھی تھی۔ انہیں شادی چاہیے تھی اور انہی دنوں میں چاہیے تھی۔ یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اتنی جلدی انہیں شادیانے بجوانے کی نہیں تھی، بلکہ ماتم منانے کی تھی۔

حیات چلتا ہوا اپنی حویلی کے برآمدے کا رخ کر رہا تھا کہ اچانک حسنات کا خیال آنے پر اس کے لب خود بخود مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ ابھی تو وہ لاعلم تھا کہ اس کے عزیز از جان چچا کو چھوٹی حویلی بھیج دیا گیا ہے۔ نہیں تو وہ یقیناً بے حد برا مناتا اور اظہار کرنے میں وہ بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ وہ تو چوہدری شہاب کے آڑے بھی آجاتا تھا اور چوہدری شہاب اس کے آگے خاموش بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اسی بارے میں سوچتا وہ ابھی برآمدے میں داخل بھی نہیں ہوا تھا جب اچانک سے سنہری ایک ستون کی آڑ سے نکلتی اس کے سامنے آئی۔ حیات نے فوراً اپنے قدموں کو روکا ورنہ ٹکرا جاتا۔ اس کے ماتھے پہ تیوریاں پڑ چکی تھیں۔ نخوت اور حقارت سے سنہری کو دیکھتے اس نے سوال کیا۔

"کیا ہے؟ یوں منہ اٹھا کر مت چلتی چلی جایا کرو...... مجھے پسند نہیں ہے یہ سب......"

"تو مجھے اپنی پسند جاننے کا موقع دو۔ جیسے چاہو گے ویسی ڈھل جاؤں گی۔"

وہ ادا سے اسے دیکھتی بولی تو ایک پل کے لیے حیات کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے اتنے بے باک انداز کی امید نہیں تھی سنہری سے۔ ابھی تک تو اسے نفرت تھی اس سے لیکن اب گھن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے قاسم پر بے ساختہ ترس آیا۔ وہ بھی ایسی عورت کے لائق نہیں تھا۔ یہ خطرناک حد تک کھلا ڈلا انداز کسی بھی مرد کو نہیں بھاتا۔

حیات نے اس کے چہرے پہ ایک نفرت آمیز نگاہ ڈال کر واپس پھیری اور بنا بات کا جواب دیے جانے لگا لیکن سنہری نے اگلا جملہ پھینک کر اسے روکنے کی سعی کی۔

"بڑے خوش نظر آرہے ہو چوہدری حیات...... کیا ملاقات کر کے آئے ہو کشور سے۔ ہاں جی حویلی کے لوگوں کے اپنے ہی پیمانے ہیں۔ تم ملاقات کرو تو حلال، کوئی اور کرے تو حرام...... حلال بھی تم

بناؤ اور حرام بھی تم بناؤ...... کیا کہنے حویلی والوں کے بھی!" بھرپور طنز سے کہتی وہ اسے سر سے پیر تک عامیانہ انداز میں گھورتے ہوئے بولی۔

حیات کے کانوں کی لویں تک سرخ پڑ گئی تھیں۔ اسے اتنا شدید غصہ شاید زندگی میں کسی پہ نہ چڑھا ہو۔ کوئی گراوٹ کی حد نہیں تھی اس لڑکی کی۔ وہ پلٹا اور اسے سپاٹ سرد انداز میں مخاطب کیا۔

"کاش! میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارا بوریا بستر لپٹوا کر واپس تمہارے پنڈ پھنکوا آتا۔ تم گھٹیا پن کی حد پار کرتی جا رہی ہو۔ بہتر ہوگا اپنی لگامیں خود ہی کس لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ ڈھیلی ہو کر حد سے تجاوز کر جائیں۔"

"تمیز سے بات کرو چوہدری حیات......!" سنہری ستون کے ساتھ بایاں کندھا ٹکاتے تھوڑا سا اٹھلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھ سے ایسے لہجے مہنگے پڑ جاتے ہیں سب کو...... ویسے بھی میں گھوڑی نہیں جس کی لگامیں کسنے کی نوبت آئے۔ سنہری ہوں سنہری...... میری چمک ہی آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔"

اس نے ہاتھ سے آگے پڑا پراندہ گول گھمایا اسی انداز سے آنکھوں کو بھی حرکت دی۔

"گھوڑی ہوتی نا تو گولی مار دی ہوتی۔ شکر کرو سنہری ہو اور تمہاری چمک نظر کا دھوکا ہے بس اور اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ دوبارہ میرے سامنے آنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

وہ اسے حقارت سے کہتا آگے بڑھا اور سنہری کے تن بدن میں الاؤ بھڑکا گیا۔

"گولی مار دی ہوتی......"

اُف! کیسا تحقیر آمیز جملہ تھا۔ یعنی اس کی وقعت اتنی بھی نہیں تھی کہ اسے سننے کے لیے دو منٹ رکا جاتا۔ کیا وہ دل موہ لینے والا حسن نہیں رکھتی۔ اسے تو یہی لگتا تھا کہ وہ کسی کو بھی پاگل کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن حیات اور اس کا بھائی دونوں اس قدر ٹیڑھی کھیر نکلیں گے، اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔

اس کی سانپ جیسی چھوٹی چھوٹی سنہری آنکھیں دور ہوتے جاتے حیات کی پشت کو گھور رہی تھیں۔

"میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی کشور۔ تم سکون سے نہیں رہ سکو گی اس حویلی میں۔" آخر میں اس کے غبار کی زد میں کشور ہی آتی تھی۔

سنہری وہ گھس بیٹھیا تھی جو پرائے گھر کو زبردستی ہتھیانے میں لگی تھی اور اسے مسند بھی سب سے اونچی چاہیے تھی۔

☆......☆......☆

کمرے میں آ کر وہ انتہائی غصے سے ٹہلنے لگا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سنہری کو کوئی بھی روکنے والا نہیں تھا۔ شتر بے مہار تھی۔ حویلی کے بزرگوں کے سامنے اس کے یہ والے لچھن نہیں آئے تھے ورنہ کوئی عملی قدم بھی اٹھایا جاتا۔ جو اس سے زچ اور پریشان تھے وہ سب نوجوانوں کی پود تھی۔ سبھی لڑکے لڑکیاں اس کی حرکتوں سے واقف تھے لیکن سوائے ملامت کرنے کے کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا۔

حیات کو معاملے کی سنگینی کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے ہوا تھا۔ اسے کشور کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ بھولی بھالی دل کی صاف لڑکی تھی اور سنہری کی چالاکیاں جیسے پھن پھیلائے ہوئے تھیں۔ کب کس کو کس مقام پر ڈس لیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی بے زار اور پریشان سا ٹہلتا رہا پھر نکل کر سیدھا سکینہ کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں چاشت کے نوافل ادا کرنے کے بعد تسبیحات پڑھنے میں مشغول تھیں۔ بیٹے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا کر اشارے سے اسے اپنے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود تسبیح مکمل کرنے لگیں۔ حیات ان کے قریب بیٹھ کر ان کے ایک گھٹنے پہ سر رکھے نیم دراز ہوا۔ سکینہ نے محبت سے اس کے بالوں میں فارغ ہاتھ کی انگلیاں چلائیں تو حیات نے سرور سے آنکھیں موند لیں۔ بھلا ماں کی گود کا بھی کچھ نعم البدل ہو سکتا ہے۔ سکینہ نے تسبیح مکمل کی اور دعا مانگ کر دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیرے اور بیٹے کے خوب صورت چہرے پہ دم کرنے کے بعد اپنے گریبان میں پھونک ماری۔

''کیا بات ہے آج میرے پتر کو۔ پریشان ہے، اداس ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے؟'' سکینہ نے چہرہ بھانپ کر بیٹے سے سوال کیا۔ حیات نے بند آنکھوں سے جواب دیا۔

''پریشان بھی ہوں، اداس بھی ہوں اور بھی کچھ ہے۔''

"پریشان سنہری نے کیا ہوا ہے۔ اداس چاچے آفتاب کے چھوٹی حویلی جانے پہ ہے اور باقی کچھ اور کے لیے حسنات کو آنے دے، وہ سب سنبھال لے گا۔" سکینہ نے دو جملوں میں ساری داستان بیان کر کے گرہ لگائی تو وہ ششدر سا اٹھ بیٹھا۔

سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

"اماں! آپ کو کیسے پتا مجھے سنہری کی طرف سے پریشانی ہے؟" اسے سب سے زیادہ اسی بات نے حیران کیا تھا۔

"ماں میں ہوں یا تو؟" سکینہ نے الٹا سوال پوچھا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"پتر! وہ برساتی ڈڈو ہے، ٹرٹرائے گی تو سہی نا، اور اس کی ان حرکتوں سے پریشان نہ ہو وہ پہلے ہی یہی چاہتی ہے۔ دیکھ نہیں رہا کیسے سب بڑوں کو بھی ہلکا لے رہی ہے۔ اس سے فاصلے پہ رہنا سب سے بہتر ہے جب تک کہ موسم گزر نہ جائے۔"

"اماں! وہ موسمی نہیں ہے۔ اس نے تو بے باکی کی حد کر دی ہے۔ شرم لحاظ چھو کے نہیں گزرا اور پھر وہ کشور کی جگہ لینا چاہتی ہے اماں! آپ کو نہیں معلوم کیسی واہیات گفتگو کرتی ہے......!"

"موقع کیوں دیتے ہو پتر......؟" سکینہ ترنت بولیں۔

"کیسا موقع اماں...... میں نے کون سا موقع دیا اسے بھلا؟" حیات برا مانتے ہوئے بولا۔

"راہ روکتی ہے تو تم رکو کیوں؟ بات کرتی ہے تو سنو کیوں؟ اکساتی ہے تو غافل کیوں ہوتے ہو؟ جب موقع ملے گا تو وہ شیر ہو گی نا پتر...... ابھی اسے ٹوکا نہیں جا سکتا۔ حمیدہ پہلے ہی زخمی شیرنی بنی ہوئی ہے۔ اس کی پنیوی کو اور پتر کو سب نے کٹہرے میں لا کھڑا کیا اور اب چور بھی مانا ہے کہ وہ چور ہے۔

لاکھ اس کے پتر میں عیب ہوں لیکن وہ کبھی مانے گی بھلا۔ کون مانتا ہے حیات...... ایسے میں سنہری کی شکایت کی تو وہ اس موقعے پر تو اس کو سنہری موقع ہاتھ آ جائے گا فتنہ پھیلانے کا۔ اس لیے پتر عقل مندی کا تقاضا ہے کہ یہ وقت نکال لو کسی طرح...... شادی بیاہ نصیبوں سے ہوتے ہیں اور جب گھر میں ایسی فطرت کے لوگ موجود ہوں تو جان بوجھ کے ان کے ساتھ اڈا نہیں لگانا چاہیے بلکہ معاملہ فہمی

سے وقت گزار لینا چاہیے۔

میں نے ساری عمر حمیدہ کے ساتھ نبھائی ہے تو اسی طرح سے کہ اسے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ میرے منہ لگے۔ جہاں جھکنے سے وقار سلامت رہے تو وہاں جھک جانا چاہیے پتر، ورنہ اکڑی گردنوں کو جھکنے کی مہلت نہیں ملتی، وہ ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ اگر حمیدہ کی عقل کام کرتی تو جو قاسم اور سنہری کی وجہ سے اسے شرمندگی اٹھانی پڑی ہے وہ اس کی اکڑ کا نتیجہ ہے۔ بنا کے رکھی ہوتی تو سبھی اس کے ساتھ ہمدردی کرتے۔ لیکن اتنا بڑا آنکھوں دیکھا منظر بھی اس میں لچک نہ پیدا کر سکا بلکہ وہ مزید غرور سے سب کو للکارتی وہاں سے دونوں کو لے کر چل دی۔ اس لیے پتر وقت پہ چھوڑ دو۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ لکھی نہیں ٹلتی کشور نے اس گھر میں بیاہ کر آنا ہے تو سنہری ہو یا چاندی کوئی بھی اسے ٹال نہیں سکتا۔ لیکن بس ایک بات میری پلّے سے باندھ لے حیات......" وہ تسبیح ہاتھ میں لپیٹے تھوڑا آگے کو جھکیں اور نہایت سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

"کبھی بھی کچھ بھی ہو جائے، سنہری کے منہ لگنے سے گریز کرنا پتر...... کچھ عورتیں ضد پہ آ جائیں تو اپنی عزت داؤ پر لگاتے نہیں چوکتیں، کسی مرد کی عزت کا کیا پاس کریں گی۔ سنہری ان ہی جیسیوں میں سے ایک ہے۔ کبھی بھی تنہائی نہ دینا اسے اور منہ نہ پڑنا ورنہ نقصان ناقابلِ تلافی بھی ہو سکتا ہے۔"

حیات جو چت لیٹا ان کی گود میں سر رکھے ہوئے تھا، چوپٹ آنکھیں کھولے اپنے مقابل دکھائی دیتا ماں کا الٹا چہرہ بڑے تفکر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کیفیت میں بھی وہ ماں کے انداز میں چھپی واضح تنبیہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نہج پہ ابھی تک اس کی سوچ نہیں گئی تھی۔ اسے لگتا تھا سنہری بس کشور کو زچ کرے گی اسے طعن کرے گی اس کا دل دکھائے گی لیکن جو رخ سکینہ نے اسے دکھایا تھا وہ اس کے گمان میں نہیں تھا۔ پہلی بار اسے سنہری سے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ اس نے بہت صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ محبت کی تھی تو کشور سے اور قدرت کی کرم نوازی ہوئی کہ زیادہ انتظار کیے بنا وہ اس کے نام کر دی گئی۔ لیکن آنے والا وقت ابھی آنا تھا اور وہ اپنے ساتھ کیا لاتا، اسے کیا خبر تھی بھلا......

کاش...... کاش...... کاش! ہم آنے والے وقت کو دیکھ پاتے یا کم از کم محسوس کر پاتے کہ اس

میں ہمارے لیے کیسے حادثے چھپے ہیں۔

کاش...... کاش! آنے والے وقت کو آئینے میں دیکھا جا سکتا۔ اس سے گرد صاف کی جا سکتی۔ دکھ مٹائے جا سکتے۔ حادثے چھپائے جا سکتے۔

☆......☆......☆

رابی اپنا سارا سامان سمیٹ کر چھوٹی حویلی میں براجمان تھی۔ اور اس بات پہ سکینہ نے مان بھرا غصہ بھی دکھایا تھا۔

"نا ایک تو نمرہ آ نہیں سکتی اور تو بھی ادھر چلی جائے گی تو اپنے لالے کی مہندی کون سجائے گا رابی پتر......! خانم کی تو مجبوری ہوئی اس کی سگی بہن اسے پہلے ہے لیکن تو تو ہر وقت حیات لالہ کی گردان لگائے رکھتی ہے۔"

"مامی جی! میں ہی سجاؤں گی آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں ادھر بھی پورا وقت دوں گی اور ادھر بھی۔ بس رات وہاں گزاروں گی نا۔ دیکھیں نا مامی جی، یہ خانم کے بنا بھی بھلا کوئی رونق ہے میرے لیے۔ اب رابی اور خانم کی جوڑی اللہ رلائی جوڑی ہے۔ میں اسے کیسے اکیلا کروں اس وقت۔ اس کی اکواک آپا، وہ بھی پرائی ہوئی جاتی ہے اور اوپر سے نئی حویلی، دل کیسے لگے گا نا اس کا......؟"

"پتر! بس تیرے ماما جی نے یہ شوشہ نہ چھوڑا ہوتا تو اسی حویلی میں بارات لے جا کر کشور کو لے آتی۔ لیکن تجھے تو پتا ہے ان سے ایک بات منواؤ تو دو ماننی بھی پڑتی ہیں۔ مردوں کی فطرت ہوتی ہے پتر!" سکینہ نے ہاتھ جھٹک کر گویا خود کو تسلی دی۔

لیکن رابی واقعی گھن چکر بنی کبھی حویلی لکھاں پہنچی ہوتی تو کبھی چھوٹی حویلی بیٹھی جوڑے ٹانک رہی ہوتی۔ رضائیاں، تلائیاں سب پیک کروائی تھیں اس نے کشور کے جوڑے یہاں کے بھی ٹانکے تھے اور بری کے بھی سکینہ اور قدسیہ کے ساتھ مل کر ٹانکے۔ مہندی اور ڈھولک کی تیاری الگ سے جاری تھی۔ خانم تو ویسے ہی اس کی مرید تھی جیسا وہ بتاتی جاتی ویسا کرتی جاتی تھی اس لیے اسے بھی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہر شے رابی سنبھال لیا کرتی تھی۔ وہ ایک وقت میں کئی کام شروع کر کے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا

ہنر رکھتی تھی۔ وہ اکتاتی تھی نہ بیزار ہوتی تھی بلکہ اسے اچھا لگتا تھا سب کا اس پہ بھروسا کرنا اور سب کے بھروسے پہ پورا اترنا۔ حیات کی جانب سے مہندی کی سبھی پلیٹیں اور تھال مکمل ہونے والے تھے۔ اسے پہلے کشور کی طرف مہندی کی تیاری پوری کروانی تھی اور پھر حویلی لکھاں جا کر وہاں کے معاملات نمٹانے تھے۔ کشور کی مہندی کی رسم کے لیے کرسی کو گیندے اور کاغذی پھولوں سے سجایا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب سب سے خوب صورت مہندی کی کرسی یا پیڑا ہی لگا کرتا تھا جس پہ چمک دمک بے تحاشا ہوتی تھی۔ دلہن کی مسہری کو سجانے والی لڑیوں اور جھالروں سے ہی کرسی کو سجایا جاتا۔ کشور کی کرسی بھی مکمل تھی اور خانم اور رابی نے جان لگا کر تیار کی تھی حالانکہ سکینہ نے منع کیا تھا کہ شہر سے بنی بنائی قدسیہ آپا کے لڑکوں میں سے کوئی لے آئے گا لیکن ان دونوں کو جنون سوار تھا ہر شے ہاتھ سے سجانے کا۔ بے حد چاؤ سے وہ ایک ایک چیز سنوار رہی تھیں۔ جس دن سے چھوٹی حویلی آئی تھیں رابی کو کم از کم ایک بات کا بہت سکون تھا کہ یہاں سنہری کا سایہ موجود نہیں تھا۔ ایک قلبی اطمینان کی کیفیت تھی جو اسے اور خانم کو محسوس ہو رہی تھی ورنہ اس کی موجودگی صرف طبیعت کو مکدر کیا کرتی تھی۔ بات بات پہ اسے طنز و تشنیع سے کام لینے کی عادت تھی جو ان دونوں کو نہایت ناگوار گزرا کرتی۔

وہ دونوں اس وقت ہال کمرے کے ساتھ متصل چھوٹے کمرے میں مہندی کی سب پلیٹوں اور تھالوں کو فرش پہ سجائے آخری ٹچ دے رہی تھیں۔ کشور ہر دوسرے منٹ بعد یہاں موجود ہوتی اور انگلیاں چٹخاتی انہیں بے چینی سے دیکھتی واپس ہو جاتی۔ پہلے تو وہ دونوں مگن سی مصروف رہیں لیکن رابی کی نگاہ سے کوئی کب تک بچ سکتا تھا۔ چوتھے سے پانچواں چکر ہوا تو رابی، کشور کے آنے سے پہلے ہی اٹھی اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خانم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کشور کا انتظار کرنے لگی۔ جیسے ہی وہ دوبارہ اندر داخل ہو کر بے قراری واپس مڑنے لگی رابی نے کلائی تھام کے مکمل اندر کیا اور دروازہ بند کر کے کمر پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی ہو گئی۔

"اپنے آپ بتائیں گی کشور آپا، یا ہم تحقیق شروع کریں کہ آپ کے اس کمرے میں اتنے ڈھیروں ڈھیر چکر کس لیے لگ رہے ہیں۔ آپ کو اگر مہندی کی پلیٹیں سجانی ہوتیں تو ہاتھ تو ایک چیز کو بھی

نہیں لگا یا آپ نے، کہ بندہ کہے لڑکی اپنی مہندی مایوں کے لیے اتاؤلی ہو رہی ہے تو اب سچ سچ بتا دیں کیا مسئلہ ہے۔ہم کس مرض کی دوا ہیں کشور آپا......؟"

اس کے دوٹوک پوچھنے پہ کشور کی رنگت فق سی ہوئی۔ وہ کیا جواب دیتی اس کی حالت تو پہلے ہی غیر تھی۔فون سیٹ اسی کمرے میں تھا۔حیات نے کال کرنے کا کہا تھا تب سے پیٹ میں گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ہوش وحواس ٹھنڈے ہو گئے تھے۔صبح سے اس کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی مبادا حیات کی کال آجائے اور کوئی اور اٹھا لے۔رابی اور خانم نے یہیں سارا سامان پھیلا لیا تو بالکل ہی ہاتھ پیر چھوٹ گئے۔فون کیسے اٹھائے گی؟ کہیں کوئی اور اٹھائے اور حیات کشور سمجھتے ہوئے بول نہ پڑے۔کہیں ابا کو پتا چل جائے کیا عزت رہ جائے گی بھلا اس کی۔ایسی سوچوں نے اسے ادھ موا کر رکھا تھا۔دل سے دعا کر رہی تھی کہ کاش حیات فون کرنا بھول جائے۔کاش اسے وقت ہی نہ مل سکے۔اب جو کمرے کے مسلسل چکر لگتے دیکھے تو رابی کا کھٹکنا عجیب نہیں تھا۔وہ کبھی بھی قیاس پہ داستان نہیں بناتی تھی بلکہ ہمیشہ حقائق کی بنیاد پر بات کرتی تھی۔جب کشور کو یقین ہو گیا کہ اس کی جان نہیں چھوٹنے والی تو وہ دھپ سے کرسی پہ بیٹھی اور اپنی پھولی سانسیں درست کرنے لگی۔اسے کہاں اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا اس لیے بتا دینے میں عافیت تھی۔

"وہ......انہوں نے کہا ہے فون کریں گے۔" جھجکتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے وہ ایسے بولی جیسے سامنے تھانیدار ہو۔

رابی اور خانم ایک جھٹکے سے اس کے قریب آئیں اور ایک ساتھ بولیں۔

"انہوں نے کنہوں نے کشور آپا......؟"

"انہوں نے......وہ......وہ صبح حویلی کے باہر آئے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔اشارے سے کہا کہ کال کریں گے۔ یقیناً کوئی اہم بات ہو گی ورنہ تم لوگوں کو پتا تو ہے کیسے مزاج کے ہیں۔ایسے شوخے تو کبھی بھی نہیں رہے نا وہ......!"

اتنی لمبی تمہید پہ مزید کریدنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کس کا فون آنے والا ہے اور کون شوخا نہیں تھا۔

رابی نے محظوظ نگاہوں سے پہلے خانم اور پھر کشور کو دیکھا اور بولی۔

''حیات لالہ کی بات کر رہی ہیں۔ سیدھی طرح بولیں کشور آپا...... تو یہاں یہ سین چل رہا ہے۔ ہماری کشور آپا کب سے بے قرار اور بے چین پھرے جا رہی ہیں اور میں اور خانم بے شرموں کی طرح اس کمرے میں ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہو گیا ہم سے......!''

''واہ کشور آپا! میں اماں کو بھی بلا لاتی ہوں۔ وہ بھی بات کر لیں گی۔'' خانم جوش سے کہتی باہر کی جانب چلی تھی کہ کشور کی چیخ نما آواز اور رابی کی دھاڑ پہ ایک دم سہم کے رکی۔

''پاگل ہو تم......'' رابی بگڑی۔ ''مامی کو کیوں بلا رہی ہو چھوٹی عقل...... سمجھ نہیں لگی کیا کہ حیات لالہ نے آپا سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں تو ایسے کیوں ڈانٹ رہی ہو دونوں مجھے۔ اماں کا بھی بہت دل کرتا ہے اس فون پہ بات کرنے کو...... سوچا وہ بھی شوق پورا کر لیں گی۔'' خانم منہ پھلائے سادگی سے بولی۔

''تمہاری اماں سے ماما جی بات کر لیں گے خانم! ابھی نکلو یہاں سے۔ کشور آپا کو بات کرنے دو پھر سارے محلے کی کراتے ہیں ٹھیک؟'' رابی نے اسے پچکارا تو وہ برا مانتی ہاتھ جھٹکتی دروازے کی جانب بڑھی۔

''خانم!'' کشور نے پیچھے سے پکارا۔

خانم نے گردن موڑی۔

''اماں کو نہیں بتانا ہے اس فون کا...... سمجھیں!''

لجاجت اور خفت سے درخواست کرتی وہ خانم کو بڑی پیاری لگی۔ تیزی سے قریب آ کر بہن کا منہ چوما جو دو دن کی مہمان تھی اب دونوں بہنوں کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ رابی نے اپنی آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑ کر زبردستی گیلا کرنے کی کوشش کی۔

''بس بس ڈیلے باہر آ جائیں گے میرے۔ نکلو چلو اب باہر، چل کر مامی کا دھیان بٹائیں۔ کہیں چھاپا نہ مار دیں۔''

وہ دونوں باہر نکلنے لگیں اور کشور فون کی ایک جانب رکھی کرسی پہ ایسے ٹکی جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ ہاتھ پیر مسلسل سنسناتے رہے تھے۔ کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ تجسس الگ جان نکال رہا تھا کہ آخر حیات کیا بات کرنے والا ہے۔ انہی سوچوں میں بے اختیار اس نے کریڈل اٹھا کر کان سے لگایا جہاں سے بس ٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''آپا! جب تک بیل نہ ہو تب تک آگے سے کوئی نہیں بولتا۔ آپ کہیں تو ہم کال اٹھانے میں مدد کرا دیں؟''

رابی دروازے میں سے منہ اندر کیے اسے ہدایت کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے اوپر خانم کا چہرہ جھلک رہا تھا۔ دونوں کے ہونٹوں پہ دبی دبی ہنسی بند توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھی۔ کشور جوان کی آواز سے بری طرح گھبرائی تھی یکدم سینے پہ ہاتھ دھرے سیدھی ہوئی اور جب ان دونوں کو دیکھا تو پاؤں میں پہنی چپل کھینچ کر دروازے میں دے ماری۔ دونوں نے چپل لگنے سے پہلے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔

وہ دھیمی سی شرمیلی مسکان لبوں پہ سجائے منتظر نگاہوں سے فون کو دیکھتی اپنی انگلیاں مسلنے لگی۔

جب عین اسی پل گھنٹی بجی اور مکمل ہونے سے پہلے ہی کشور نے فون اٹھا لیا۔

''ہے...... ہے لو......!'' پھنسی پھنسی اور ڈری سہمی آواز جس میں شرم اور جھجک نمایاں تھی۔ دوسری طرف یکدم حیات کی تمام کلفت دور ہوئی تھی۔ وہ جو سنہری کی بے باکی کی وجہ سے انتہائی بے زاری محسوس کر رہا تھا یوں لگا جیسے گھنی چھاؤں میں آ کھڑا ہوا۔

''میں ہوں حیات...... کیسی ہو کشور؟'' اس نے نرم لہجے میں کہا تو کشور کی بھیگی ہتھیلی سے کریڈل پھسلتے پھسلتے بچا۔

''میں اچھی ہوں......'' تھوک نگلتے بمشکل جواب دیا۔ ''کیا، کیا بات کرنی تھی، جلدی کہیں۔ اماں نہ آ جائیں کہیں!'' اسے کوئی ایک فکر تھوڑی تھی۔ ایک سو ایک تھیں۔

''اچھا اگر آ گئیں تو کیا کہو گی؟'' حیات نے شرارتاً پوچھا تھا لیکن اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میں رکھتی ہوں فون، مجھے واقعی نہیں پتا اماں کو کیا کہوں گی!''

''رکو رکو، ابھی نہیں رکھنا، بات سنو......'' وہ سنجیدہ ہوا۔ ''سچ کہوں کشور مجھے کچھ بھی نہیں کہنا تھا بس تمہاری آواز سننے کو دل چاہا تو یونہی فون کرنے کا کہہ دیا۔ مجھے بس تمہاری خیریت جاننی تھی۔ جب تک تم حویلی لکھاں سے باہر ہو، مجھے فکر رہے گی۔ جیسے ہی واپس یہاں چلی آؤ گی تو سکون آجائے گا مجھے۔''

وہ اتنی محبت سے بولا کہ کشور کو خود کے ہونے پہ فخر ہوا۔ کیسی عجیب پروا تھی اس کے لہجے میں۔ کتنا فسوں تھا اس کے انداز میں......وہ بس خاموشی سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اسے سنے گئی۔

''دوسری بات سنہری کی طرف سے ہوشیار رہنا تم تینوں......شادی کا موقع ہے وہ چھوٹی حویلی بھی چکر لگائے گی گاہے بگاہے۔ بس چوکس رہنا اس سے۔ اسے کوئی موقع نہ دینا کہ وہ تم تینوں میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچائے۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

کشور کو سمجھ میں تو آگئی تھی لیکن ایسا بھی کیا ہوا تھا جو یہ بات خاص طور پر کہی جا رہی تھی۔ اس سوچ نے اسے فکرمند بھی کر دیا تھا۔

''سمجھ گئی ہوں۔ دھیان رکھوں گی۔ اب میں رکھوں......؟''

''ہماری بھی بات کرا دیں کشور آپا......! ہم کیا پرائی ہیں؟ اپنے ہی لالہ ہیں، جان پہچان کرا دیں ہماری بھی......''

حیات کے جواب دینے سے پہلے ہی رابی اور خانم نے دروازے میں سے سر گھسایا اور للچائی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ دونوں کی آواز حیات نے بھی سن لی تھی۔ وہ مسکرا دیا اور آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ کشور کو ٹوں کی آواز سنائی دی تو ریسیور پٹخ کے بولی۔

''لو تم دونوں ارمان نکال لو، کسی وقت جان نہیں چھوڑتیں چڑیلیں۔''

ایک ادا اور اعتماد سے کہتی وہ دونوں کو راستے سے پرے کرتی کمرے سے چلی گئی جبکہ وہ دونوں ہک دک رہ گئیں۔

کشور آپا اور ایسے تیور کیا کہنے......! دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے، آنکھیں مٹکاتے واپس بکھرے سامان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

☆......☆......☆

قاسم مکمل تیاری کے ساتھ چھوٹی حویلی جانے کے لیے نکلا تھا۔ کڑک دار سفید لباس اور سیاہ جوتوں کے ساتھ اس کی اٹھان ہمیشہ کی طرح لاجواب تھی۔ سنہری نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا تو کچھ سوچتی فوراً باہر کو بھاگی۔ قاسم اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا اور گیٹ پہ موجود کامے کو کچھ ہدایات دینے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک دوسری جانب سے سنہری بنا اجازت آکر بیٹھ گئی۔

قاسم نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ......؟''

''بدتمیزی کیسے ہوگئی؟ ساتھ چلنا ہے مجھے بھی بس......'' وہ بھی سنہری تھی۔ لحاظ شرم اس میں بھی کب تھا؟

''مجھے کام سے جانا ہے سنہری...... فالتو نہیں جا رہا کہیں، اترو گاڑی سے۔''

''تو میں نے کب کہا فالتو جا رہے ہو۔ چھوٹی حویلی جا رہے ہو، مجھے بھی ساتھ جانا ہے۔''

''تمہیں کس نے کہا چھوٹی حویلی جا رہا ہوں؟ کیا اور کوئی کام نہیں مجھے ہو سکتا۔''

قاسم کو اس کے درست قیافے نے آگ لگائی۔ جواباً سنہری نے اسے سر سے دھڑ تک یوں گھورا کہ اس کا دل کیا الٹے ہاتھ کا ایک کھینچ کر اس کے منہ پر مارے۔ لڑکی تھی یا شیطان کی چیلی، نگاہ کے تیر سے شکار کر لیتی تھی۔

''ایسی تیاری کرنے کا بھلا اب کیا فائدہ تمہیں قاسم، جس کو متاثر کرنا چاہتے ہو وہ تو بس دو دن میں کسی اور کی ہونے والی ہے۔ پھر یہ کڑ کے شرٹ کے کس لیے بھلا۔ کہیں رابی پہ تو نہیں نظریں گاڑ لیں؟''

اس نے بات نہیں کی تھی بھالا اتارا تھا وہ بھی سیدھا دل میں۔ مطلب بنا تحقیق کیے یہ تو کچھ بھی بک دے اور کسی کا ستیاناس ہو جائے۔ اور یہ سنہری جانتی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر خانم کے بجائے رابی کا نام لیا تھا۔ قاسم نے دل میں اسے ایک موٹی گالی سے نوازا اور ایک طویل سانس خارج کر کے اسے مخاطب کیا۔

''دیکھو سنہری......! تمہیں پتا ہے نا اماں کیا سوچے بیٹھی ہیں تمہارے اور میرے بارے میں۔

میری ایک رتی مرضی نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم بھی راضی نہیں ہو۔ تو بہتر نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کام آجائیں۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے میری مرضی نہیں۔ تمہارے ساتھ کوٹھری میں پکڑی گئی ہوں، کوئی مذاق تھا کیا۔ مرضی نہ ہوتی تو کسی اور کے ساتھ پکڑی جاتی نا!"

یہ بات سنہری نے محض حفظ ماتقدم کے طور پر کہی تھی۔ وہ ہر صورت حال میں اپنے ہوش وحواس سلامت رکھتی تھی۔ ابھی بھی وہ بھولی نہیں تھی کہ قاسم اس کے لیے اس حویلی میں قدم جمانے کا آخری ذریعہ ہے۔ اگر اسے کہہ دیا کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہے تو وہ ایک مرد تھا اور مرد کو کسی عورت کی اپنے حوالے سے ناپسندیدگی کا علم بھی ہو تب بھی وہ اس کے منہ سے یہ بات سننا ہرگز پسند نہیں کرتا اور سنہری اس بے وقوف انسان کو بھتے سے اکھاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے کھونٹے سے باندھ کر وہ باقی جانوروں کے شکار پہ نکلی تھی۔

اس کے جواب نے قاسم کو حیرت میں مبتلا کیا۔ وہ آج بھی اس رات کو شد و مد سے دل میں دہراتا تھا تو اسے ایک بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی اور وہ تھا وہ لفظ جو اس کے قریب آتے سنہری کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔ جذبات کی شورش اور کشور سے ملاقات کے جوش میں وہ لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا ضرور تھا لیکن وہ تھا کیا، یہ اسے یاد نہیں آتا تھا۔

"تم مجھ سے ملنے تو نہیں آئی تھیں کوٹھری میں...... اور تمہیں کیسے پتا کہ میں وہاں آنے والا ہوں؟"

"کیوں کہ تمہیں وہاں میں نے ہی بلایا تھا قاسم!" اس نے قاسم کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گیا۔

"حیران کیوں ہو مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتے۔ میں نے تمہیں ماسی کے ساتھ باتیں کرتے سنا تھا۔ اس رات میں وہاں بس تم سے یہی کہنے آئی تھی کہ اگر تم نہیں چاہتے تو میں خود حمیدہ ماسی کو انکار کر دوں گی۔ لیکن جب تمہیں چاند کی روشنی کے سائے میں دیکھا تو یوں لگا جیسے کسی اور ہی مخلوق کو دیکھ رہی ہوں۔ جیسے کسی پری کو پرستان میں کوئی شہزادہ مل جائے۔ اس پل میں بے خودی

تمہارے قریب آئی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک دم اچانک سے وہاں سب چلے آئیں گے۔ لیکن اگر تم مجھے اتنا ناپسند کرتے ہو قاسم، تو میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کشور کو چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے جیسے تم خوش لیکن مجھ سے بدگمان نہ ہو۔ بس اتنا ہی کہنا ہے مجھے......!''

وہ بات مکمل کر کے چہرہ تھوڑا سیدھا کرتے ہوئے کن انکھیوں سے قاسم کا جائزہ لینے لگی جو اس کی بات سن کر خاموش ساونڈ اسکرین سے پار لان پہ نگاہیں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے مکمل تاثرات سنہری کی نگاہوں کی گرفت میں تھے۔ وہ قاسم کو گنگ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اپنی تعریف کسی مرد کو بری نہیں لگتی بھلے سے وہ کسی ناپسندیدہ عورت کی زبان سے نکلے۔

جواباً وہ آگے سے بے شک کہتا مجھے تم سے الفت نہیں یا تم بھاڑ میں جاؤ تو سنہری کو کون سا اس کی چاہ تھی۔ اس نے تو بس نیا بیج بویا تھا اور سابقہ کانٹا نکالا تھا۔ تا کہ آنے والے وقت میں اگر کچھ ایسا ہوتا ہے جو اسے اور قاسم کو اکٹھا کر دے تو قاسم کے پاس اس کی کوئی کمزوری نہ رہ جائے۔ وہ کون سا اس کے لیے مری جا رہی تھی لیکن ایک کمینی سی چاہ تھی کہ سب پاگل ہوں اور بس اس کے پیچھے پاگل ہوں۔ وہ جنونی سی ہو چکی تھی۔ اصل طلب حویلی لکھاں کی مالکن بننا تھا۔ یہاں راج کرنا تھا اور اس کے لیے وہ ایک ساتھ کئی رستے ہموار رکھنا چاہتی تھی۔

''دیکھو سنہری!'' قاسم نے اس کی جانب رخ موڑا تو اس کی آواز میں پہلے جیسی کرختگی نہیں تھی۔

''مجھے اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اماں کا دل نہیں توڑ سکتا اس لیے چپ ہوں۔ کشور اب مجھے نہیں مل سکتی لیکن جو چاہیے اس کے لیے میں پوری کوشش کروں گا۔ تم ہو سکے تو اماں کا ذہن خود بدل دو۔ تمہیں کوئی اچھا لڑکا مل جائے گا سنہری لیکن میرے لیے تم نہیں ہو۔''

(تو مجھے کون سا تم چاہیے ہو۔ مجھے بھی تو وہ چاہیے جو میرا نہیں ہو سکا۔ اور اچھا لڑکا تو مجھے ملے گا ہی، سنہری کون سا ہلکا ہاتھ مارے گی)

وہ دل میں سوچتی سپاٹ چہرے سے اپنی انگلیاں دیکھتی رہی۔

''اچھا مجھے بھی کشور کی طرف لے چلو۔ مہندی مایوں کی تیاری چل رہی ہے وہاں۔ میرا دل

اداس تھا تو سوچا وہاں چکر لگا لوں۔ اور تم فکر نہ کرو، میں ماسی کو سمجھا دوں گی۔ وہ تمہیں زور نہیں دیں گی۔"

اس نے ہلکے پھلکے دوستانہ لہجے میں کہتے بات سمیٹی۔ ماحول کا تناؤ یکدم کم ہوا تھا۔ قاسم کے ہونٹوں پہ پہلی بار اس کی خاطر مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ اس کے کام آسکتی تھی۔ وہ دل میں سوچتا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"چھوڑ دیتا ہوں۔ اب ماسی کی دھی ہو میری اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے کون سا تم سے کوئی دشمنی ہے؟" مسکرا کر کہتے اس نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی اور چھوٹی حویلی کی جانب جاتے رستے پہ ڈالی۔

سنہری نے اس کا موڈ اچھا دیکھا تو سمجھ گئی کہ کام بن گیا ہے۔ اسے اب قاسم کو میٹھی چھری بن کے ذبح کرنا ہوگا۔ وہ اس سے ہر کام اپنی مرضی کے مطابق نکلوائے گی لیکن قاسم کو لگے گا کہ اس نے جو بھی کیا ہے اپنی من مرضی سے کیا ہے۔ یہ آسان معاملہ تھا۔ قاسم کا ٹانکا کہیں فٹ کروانا ضروری تھا تبھی اس کی راہ کے کانٹے دور ہوتے۔ اس کا اگلا ہدف حسنات تھا۔ اسے حسنات کا انتظار تھا اور بے حد تھا۔

☆......☆......☆

ہال کمرا اس وقت بالکل خالی تھا۔ ابھی ایک منٹ پہلے ہی وہ کال بند کر کے بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں میں پھیرتا وہ مسکراتا صوفے کی پشت سے کمر ٹیک گیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے فون پہ بات کی تھی اور محض دو دن بعد وہ لڑکی اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی تھی۔

(کاش کبھی ایک آدھ بار اور بھی کی ہوتی اس سے بات، اس کا بھی ایک الگ ہی مزا ہے)

دل میں ایک بے ہودہ سا خیال آیا تو لاحول ولاقوۃ پڑھتا سر جھٹک گیا۔ سیدھی سادی زندگی گزاری تھی۔ ہاسٹل میں رہا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ پڑھا تھا لیکن کبھی کسی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ بات چیت کی کوشش ہی نہیں کی کہ کجا کسی کے ساتھ اتنا فری ہوتا کہ نوبت ٹیلی فونوں تک آتی۔ اب جب اپنی ہی منگیتر سے بات ہوئی تو افسوس سا لگ گیا کہ ایک دو بار پہلے بھی کال کر لیتا تو کیا حرج تھا۔ لیکن دوسرے ہی پل اپنی سوچ پہ نفرین بھیجتا آنکھیں موند کر کشور کی آواز یاد کرتا مسکرانے لگا۔

''ہمیں جگنوؤں کے، تتلیوں کے دیس جانا ہے۔''

وہ گنگناتا بہت کم تھا لیکن اس وقت موڈ اتنا اچھا ہو رہا تھا لگتا تھا اس کے سنگ سارا ماحول گنگنا رہا ہے۔ کشور سے اسے محبت نہیں عشق ہونے چلا تھا۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی پھر پیاری لگنے لگی، پھر محبت سی ہوئی اور اب بس اگلا مرحلہ طے ہونے کے قریب تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا جو خالی تھا۔ اپنی ٹانگیں سیدھی کر کے پیر سامنے میز پر رکھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسا کر سر کی پشت پر رکھ کر دوبارہ آرام دہ حالت میں بیٹھتے گنگنایا۔

''ہمیں تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے......''

''ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔''

اور ساتھ ہی اس کی کشادہ پیشانی پہ کسی کے بوسے کا لمس جاگا۔ حیات ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے حسنات کھڑا تھا اور اس کے پیروں کے پاس اس کا اٹیچی کیس رکھا تھا۔ وہ کب آیا اور کتنی دیر سے یہاں کھڑا تھا حیات کو ہرگز علم نہیں تھا۔

''اوئے چھوٹے! تو کب آیا؟'' وہ پورے جوش سے آگے بڑھ کر اس سے بغل گیر ہوتا ہوا بولا۔

حسنات نے اس سے بھی زیادہ بھرپور طاقت سے بڑے بھائی کو خود میں بھینچا۔

''تبھی جب آپ تتلیوں کے دیس چلے تھے اس سے ذرا پہلے تاکہ آپ کی ٹکٹ کاٹ سکوں۔''

وہ شرارتاً بڑے بھائی کے بالوں کو بگاڑتا ہوا بولا تو حیات نے جواباً اس کے بالوں کا حشر نشر کر دیا۔ اس کے ہلکے بھورے سلکی بال بکھر کر اس کی پیشانی پہ پھیلے تو وہ مزید دلکش لگنے لگا۔ حیات نے دل میں ماشاءاللہ بولا۔

''اور یہ میرے ماتھے پہ پیار کس خوشی میں کیا ہے۔ اتنے تم میرے ابے......!''

''آپ تتلیوں اور جگنوؤں کے دیس جا رہے تھے تو کیا آپ کے ماتھے پہ بوسہ بھی نہ دیتا...... ویسے بھی اگلا مصرعہ یہی تھا برادرم......!'' وہ بھی حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس سے جیتنا آسان تھا ہی نہیں۔

حیات اسے محبت سے دیکھتا وہیں صوفے پہ لے کر بیٹھ گیا اور ہاتھ تھام لیا۔

”اتنے دن کے چلے ہوئے ہو، آج پہنچ رہے ہو، شرم آتی ہے کہ نہیں۔ ایک ہی بھائی میرا اور عین شادی کے دن ٹپکا ہے۔“ حیات نے مان بھرا شکوہ کیا جبکہ ہاتھ ابھی بھی تھام رکھا تھا۔ حسنات ڈھیلا ہو کر اپنا وزن حیات کے پہلو پہ ڈال کر سکون سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”شکر کریں پہنچ گیا ہوں بھائی جی! دوسرا سال ہے میڈیکل کا یار...... اور یقین کریں میرے دماغ کی ہڈی، پسلی ایک ہو گئی ہے۔ لگتا ہی نہیں اس دنیا کا رہائشی ہوں اپنا آپ مردوں اور ڈھانچوں کے درمیان لٹکا محسوس ہوتا ہے۔“

”بکواس کروالو تم سے بس۔“ حیات نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پہ دھموکا جڑا۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ یقین مانیں دن رات بس پڑھو، پڑھو، پڑھو...... کسی کسی وقت تو میڈیکل رکھنے پہ پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ یہ اپنے ابا جی تھوڑا سا اڑا اور لگا لیتے نا کہ ”منڈیا تو ڈاکٹری نئیں پڑنی......“ تو یقین مانیں آج میں بھی مزے کر رہا ہوتا۔ ناحق ضد لگائی اور اب جان پھنسا کے بیٹھا ہوں۔ قسم سے بھائی وہاں سب کی بہت یاد آتی ہے۔ آپ، اماں، آفتاب چاچا، کشور آپا اور اپنی رابی، اور سب سے زیادہ مجھے اپنی پری کی یاد ستاتی ہے۔“

آخری فقرہ کہتے اس کی آنکھوں کی چمک کو حیات نے بغور دیکھا تھا۔ لیکن حسنات کے تاثرات نارمل تھے۔

”تو اب چھوڑ دو، کون سا کمی ہے میری جان ہمیں...... زمینداری کرو اور سکون سے اپنا دانہ پانی کھاؤ۔ پڑھنا ہی ہے تو سادہ بی اے، ایم اے کر لو۔“ حیات نے ہمیشہ والا مشورہ دیا۔ جب بھی حسنات اکتا جاتا تھا اس کا یہی مشورہ ہوتا تھا۔

”کمال ہے۔ ہاتھی ہے بھیا جی ہاتھی۔ سونڈ نکل گئی ہے۔ اب باقی بھی گھسیٹ لینے دیں۔ ورنہ دنیا کہے گی کہ بڑی بڑھکیں مار کر گیا تھا ڈاکٹری کرنے، دو سال میں واپس بھی آ گیا۔ نہ لالے، اس معاملے میں میرا دماغ تھوڑا دیسی سوچ کا ہے۔ جس کام میں ہاتھ ڈال لیا ہے اب اسے پورا کرنا ہے،

ناک نہیں کٹنے دینی......'' دونوں ہاتھ اوپر نیچے کرتے وہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولا۔

''اندر سے پینڈو ہی ہے میرا بھائی......!'' حیات نے اسے ہلکا سا دھکیلتے ہوئے اٹھایا۔''چل شاباش! اب اماں کے کمرے میں چل، کتنے دن سے یاد کر رہی ہیں۔اب بھی نہ آتے تو یقیناً مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیج دیتیں۔''

''کتنا ظلم ہوتا نوشے میاں پر۔میرے کالج بھی سب کو پتا چلتا کہ یہ جو لور لور پھر کر بھائی کو ڈھونڈ رہا ہے کل اس کی بارات ہے۔'' وہ کھڑا ہوا اور چلتے چلتے زوردار انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

حیات نے فوراً ٹوکا۔

''ہزار بار اماں نے منع کیا ہے کہ ایسے چلتے چلتے انگڑائی نہ لیا کرو۔پٹھا اکڑ جاتا ہے کوئی!''

''او لالے، نہیں اکڑتا۔ویسے جلدی مل کر اماں سے تو پہلے اپنی بھرجائی سے مل کر آؤں۔چاچا کو دیکھ آؤں اور پری کو دیکھے تو بہت دن ہو گئے۔رزلٹ آنے والا ہے ان نمونیوں کا۔دیکھیں کیا کارنامے سامنے آتے ہیں۔''

☆......☆......☆

''یہ کیا فضول بچ ہے اماں! مجھے نہیں معلوم میں ابھی کے ابھی جاؤں گا اور چاچا آفتاب کو یہاں لے کر آؤں گا۔بھلا یہ بھی کوئی شادی ہوئی۔دور دور کر دیا گھر کے بندوں کو ہی......کیا ایسے مزا نہیں آنا تھا بھلا۔سب ایک ہی جگہ اٹھ بیٹھ کے شادی کا لطف اٹھاتے اماں......بچپن سارا ادھر گزرا، جوانی سے بڑھاپا چاچا کا یہاں آیا تو اب انہیں الگ کر دیا ہے۔''

اس نے جب سے سنا تھا اسے ایک پل کو چین نہیں آ رہا تھا۔کمرے میں ٹہل ٹہل کر شگاف کرنے کے درپے تھا۔حیات البتہ سکون سے اماں کے پلنگ پہ نیم دراز اسے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکراتے دیکھ رہا تھا جبکہ اماں کو فکر یہ تھی کہ باپ کے منہ نہ جا لگے حسنات، تبھی رسان سے بولیں۔

''میرا شہزادہ اتنے دن بعد آیا اور ماں کی گود میں سر بھی نہیں رکھا۔بس اپنی ہی بولے جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے۔یہ ماں کا احساس ہے تجھے......''

حسنات کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ اپنے جذباتی پن میں وہ ماں کے جذبات کو مکمل نظر انداز کر گیا تھا۔

اسے بے حد افسوس ہوا اپنی حرکت پہ...... فوراً سے حیات کے پہلو میں کودا اور ماں کی گود میں چہرہ چھپاتا الٹا ہی لیٹ گیا۔ حیات نے بمشکل خود کو اس کے نیچے آنے سے بچایا تھا۔ اس نے ایک زوردار دھپ اس کی کمر پر رسید کرتے واپس ہاتھ سر کے نیچے باندھے۔

''دیکھ میرا پتر!'' اب اماں لائن پہ لانے کے لیے تیار تھیں۔ ''تیرے ابا کا مزاج کوئی نیا نہیں ہے۔ تجھے بھی پتا ہے مجھے بھی پتا ہے کہ شروع دن سے وہ تیرے چاچے کے ساتھ اللہ واسطے کا بیر پال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تجھے اندازہ نہیں کہ مجھے اور تیرے بھائی کو کتنے جتن کرنے پڑے ہیں کشور کے لیے منانے میں۔ پٹھے پہ ہاتھ رکھنے نہیں دیتے تھے۔ اور جب ایسا بندہ کوئی گل من جائے نا تو دو اس کی بھی ماننی پڑتی ہیں پتر...... دیکھ میں اگر چوکھا اعتراض کرتی نا تیرے باپ کا کیا تھا اگلا قدم پٹتے ہی رشتے سے نہ کر دیتے تو ہاں کرا کے دکھاتا پھر سارا زمانہ! دھی کا دھن ہے کشور۔ اس پہ چار حرف کس دیتے پنڈ والے۔ وہ تکلیف زیادہ بڑی ہوتی تیرے چاچے آفتاب کے لیے یا یہ چھوٹی حویلی جانے والی بڑی ہے۔ سچی کہوں تو وہ اتنا اداس بھی نہیں ہے پتر! اگر ہے تب بھی موقعے کی نزاکت کو سمجھو۔ باقی بچیاں بھی راضی خوشی گئی تھیں وہاں تو اس لیے سارے ہی چپ ہو گئے۔ تو جانا چکر لگا ایسا سوہنا سجایا ہے قاسم نے حویلی کو کہ یقین نہیں آتا یہ وہی حویلی ہے جو اتنے سالوں سے بند پڑی تھی۔ ایسی ٹور نکلی ہے، دور سے نظر ٹھہر جاتی ہے اس پہ۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ...... اماں!!'' وہ فوراً اٹھ کے بیٹھا۔ اچنبھے سے ماں اور بھائی کی شکل دیکھنے لگا۔ حیات کو اندازہ تھا وہ کیا کہنے لگا اس لیے مسکراہٹ دباتا بھنویں اچکا گیا۔

''یہ اپنا قاسم کس خوشی میں چھوٹی حویلی سیٹ کرا کے دے رہا ہے اماں؟''

''قاسم بھاء نہیں کہا جاتا، تجھ سے وڈا ہے۔ اس کی ماں نے سن لیا نا تو نیا پواڑا ڈال دے گی۔''

''او چھوڑیں بھاء شاہ کو اماں۔ میرا تو میٹر گھما دیا آپ نے۔ بھلا اسے کیا لگے چاچا آفتاب کے کسی

کام سے؟ آپ کو پتا بھی ہے کیسا کینہ پرور ہے اس کا دل۔ وہ اور چاچا کا کام کرے بنا مطلب کے! نہیں اماں! یہ نہیں ہوسکتا۔ اندر ضرور کوئی رولا ہے اماں۔ وہ ایویں نہیں چھوٹی حویلی سیٹ کر رہا اماں!''

''یا اللہ! حسنات پتر! میرے سے نہیں سوچی جاتیں ایسی سازشی باتیں۔'' سکینہ نے اکتا کر ہاتھ جوڑے۔ ان کا مزاج بہت دھیما تھا۔ ''پیڑا کرے گا تو بھی اپنے آگے آئے گا، اور چنگا کرے گا تو بھی پھل خود کھائے گا۔ ہمیں کیا پتر، خام خاہ کسی کی نیت پہ کیا شک کرنا پتر!''

''اونگھ نہیں رہا چھوٹے، سن رہا ہوں...... اور سنتا میں کانوں سے ہوں، آنکھوں سے نہیں!''

حیات جو واقعی اونگھ رہا تھا، بند آنکھوں سے بولا۔

''ہماری حویلی میں کچھ وقت سے کانوں کے ساتھ آنکھیں بھی کھلی رکھنے کی ضرورت پڑ چکی ہے لالے۔ خیر میں پتا لگا لوں گا کہ قاسم کس چیز کے پیچھے ہے۔ ابھی میں نہا دھو لوں پھر جا رہا ہوں چاچا کی طرف۔''

وہ جست لگا کر پلنگ سے اترا اور حیات کی بند آنکھیں دیکھ کر ایک جھٹکے سے اس کے پھیلے ہوئے پیروں میں سے ایک کو تھاما اور تلوے کو پوری طاقت سے گدگدا کر رکھ دیا۔ حیات اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور سکینہ بھی بری طرح بوکھلائیں۔ دونوں بھائی ایک ٹانگ چھڑانے میں تو دوسرا پیر گدگدانے میں کچھ دیر لگے رہے اور پھر حیات نے ایک جھٹکا دے کر ٹانگ کھینچی اور حسنات کے پیچھے بھاگا۔ حسنات کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ دونوں کے ہنسنے اور ایک دوسرے کو دھمکانے کی آوازیں اندر سکینہ کو سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مسکرا کر اپنی تسبیح تھامتے ہوئے ایک بار پھر دانے گرانے لگیں۔

☆......☆......☆

کشور کو بڑے کمرے میں سجے سجائے پیڑھے پہ بٹھا کر اس کے ہاتھوں پہ زبردستی پان کے تازہ پتے رکھے رابی اور خانم شگن کی مہندی لگانے کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ کشور بے زاری سی ان کی شکلیں دیکھ رہی تھی جنہوں نے دوپٹوں کو خالص دیسی پنڈ کی عورتوں کے انداز میں کانوں کے پیچھے اڑس رکھا تھا اور تھوڑا سا کنارہ ہونٹوں میں دبائے کشور کے اردگرد کھڑی باتیں مٹھار رہی تھیں۔

''ماشاء اللہ جی چوہدرائن! اللہ وڈی عمر کرے۔ اپنے حیات باؤ دے نصیب جاگ گئے۔ ایڈی سوہنی کڑی اوو ی سارے گناں والی......!''

رابی نے خیالی مہندی لگاتے ہوئے کشور کے برابر میں رکھے ایک خالی پیڑھے کو چوہدرائن بنا کر اسے مبارکیں دیں۔

کشور ہونٹ دبا کر ہنسی روکنے لگی۔ خانم کو اشارہ کیا تو وہ بھی رابی کی طرح بولنے لگی۔

''سچی گل ہے چوہدرائن جی...... اتنی پیاری نوہ ہے جی آپ کی...... آپ کے تو جی بھاگ جاگ گئے۔ کشور کو تو سارا پنڈ جانتا ہے جی، کیسی اچھی بچی ہے۔ اتنی اچھی کڑی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ دل کرتا ہے اپنے گھر سے کہیں جانے ہی نہ دوں۔''

خانم کے بے ساختہ اظہار پر جہاں رابی کا منہ کھلا رہ گیا وہاں کشور بھی حیران ہوتی اسے کھینچ کر سینے سے لگا گئی۔ پل بھر میں خانم کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھری تھیں اور وہ پھپھک پھپھک کر رو دی۔ کب سوچا تھا کہ بہن جو ماں جیسی محبت کرتی ہے جب پرائی ہو جائے گی تو دل پہ ایسے ہاتھ پڑے گا۔ ابھی تو رابی کے ساتھ اور ماں کے ساتھ مل کر شادی کی تیاریوں میں گم بس لطف اٹھا رہی تھی لیکن جیسے ہی دن آن پہنچے تھے تو یوں لگنے لگا تھا جسم کا ایک حصہ ہے جو جدا ہو گیا ہے۔ کشور تو اسے چاہتی بھی بچوں کی طرح تھی۔ گود میں کھلایا تھا۔ عمر کا فرق تھا اس لیے بھی لاڈ اٹھائے تھے اور خانم تو تھی ہی لاڈلا بچہ، کون تھا جو اسے چاہتا نہیں تھا۔ سب سے چھوٹی تھیں وہ اور رابی لیکن جو محبت خانم نے سمیٹی ویسی رابی بھی نہ سمیٹ سکی جبکہ وہ تین بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی اکلوتی بہن تھی۔ خود رابی بھی خانم پہ فریفتہ تھی۔ ایسی موہنی شکل تھی کہ اس سے نفرت کی جا ہی نہیں سکتی تھی اور جن کو وہ نہیں بھاتی تھی، انہیں اس سے عداوت تھی۔

عداوت بے وجہ ہوتی ہے۔ نفرت جب بھی ہوتی ہے کسی وجہ سے ہوتی ہے لیکن عداوت ایسا بیر ہے جس کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوتی۔ یہ بس ہوتی ہے تو ہمیشہ رہتی ہے اور جس سے ہو اس کی ہر بات ہر ادا بری ہی لگتی ہے کیونکہ عداوت رکھنے والا مقابل میں دیکھتا ہی عیب ہے اس کی اچھائی بھی اسے برائی کے سانچے میں ڈھلی دکھائی دیتی ہے۔

اور خانم سے بھی عداوت رکھنے والے حویلی لکھاں میں موجود تھے جن میں شہاب الدین سرفہرست تھے، حمیدہ ان کی مددگار تھی۔ اور اب ایک اور اضافہ سنہری کا بھی ہونے جا رہا تھا۔

کشور خانم کو دیر تک گلے سے لگائے نیر بہاتی رہی۔ رابی جو کبھی نہیں روتی تھی اسے بھی یہ منظر نم دیدہ کر گیا تھا۔ ابھی شاید یہ سب کچھ وقت مزید چلتا لیکن دروازے سے سنہری کا چہرہ نمودار ہوتے ہی جیسے سحر ٹوٹ گیا تھا۔ سارے منظر میں کڑواہٹ سی بھر گئی۔ وہ ان تینوں کو دیکھتی پراندہ جھلاتی اٹھلاتی ہوئی ان کے قریب آئی۔ وہ تینوں ایک پل کو گم صم سی ہو گئی تھیں۔ انہیں اس کے اس طرح اکیلے چھوٹی حویلی آنے کی امید نہیں تھی اور حقیقت یہ تھی حویلی لکھاں سے یہاں آ کر ایک واحد شے جو سکون کا باعث تھی وہ سنہری کا سامنا نہ ہونا تھا۔ آج اتنے دن بعد وہ یوں اچانک اٹھلاتی سامنے آ گئی تھی تو دو پل کو تینوں کو چپ لگ گئی تھی۔

"نہ سلام نہ دعا...... جان نکل گئی ہے کیا تینوں کی......" سنہری بولے اور کفن نہ پھاڑے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

"جان نکلے ہمارے دشمنوں کی اور دوستوں میں تم بھی نہیں آتیں ویسے......!" سب سے پہلے رابی کو ہوش آیا اور سنہری کی بات کا جواب دینا تو اس کا بھی فرض عین تھا۔

"امید نہیں تھی کہ تم لوگ ایسی بے مروت ہو گی۔ اتنا نہیں کیا جھوٹے منہ ہی بلوا لو۔ آخر کو سہیلیاں ہیں ہم......!"

سنہری چلتی ہوئی فرش کے اس حصے کے قریب آئی جہاں مہندی سے سجی پلیٹیں اور تھال رکھے تھے۔ درمیان میں سبھی پلیٹوں کے موم بتیاں کھڑی تھیں جنہیں وقت پہ جلایا جانا تھا۔ خانم اور رابی نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کشور کو جس نے رسان سے آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں کو تحمل سے کام لینے کا اشارہ دیا۔

"ہم تمہیں بلوانے ہی والے تھے سنہری۔ بس شادی کے کام کاج فرصت ہی نہیں لینے دیتے۔ تم آج آئی ہو ایسے ہی خود سے پہلے بھی آ جاتیں نا، تمہارا اپنا گھر ہے۔"

کشور نے خلوص سے بھرے لہجے میں کہا تو سنہری جو پیروں کے بل پلیٹوں کے پاس جھکی بیٹھی

تھی، اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اٹھا کر کشور کو عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''میرا گھر حویلی لکھاں ہے کشور...... یہ چھوٹی حویلی تم لوگوں کو ہی مبارک۔ سنہری نے وہاں ڈیرے جما لیے ہیں۔''

کشور کو اس کی آنکھوں سے وحشت سی ہوئی۔ اس نے جھرجھری لیتے خانم کو دیکھا اور اسے بہانے سے منظر سے ہٹانے کے لیے کہا۔

''خانم! جاؤ نا سنہری کے لیے شربت لاؤ، پہلی بار آئی ہے۔''

خانم نے منہ پھلاتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

مطلب صاف تھا کہ وہ نہیں جائے گی۔ رابی کا دل اکتا رہا تھا یہاں کھڑے...... اسے تھوڑی ہوا کھانی تھی تب ہی موڈ بحال ہوتا۔ اس لیے خود شربت لینے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی۔ سنہری کے منہ نہ لگنے کا ایک ہی حل تھا کہ اس کے سامنے سے ہٹ جایا جائے۔

سنہری مسلسل وہیں پلیٹوں کے پاس بیٹھی موم بتیوں کے ساتھ بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ کیے جا رہی تھی۔ خانم نے بے بسی سے کشور کو دیکھا کہ اسے روکا کیسے جائے۔ وہ موم بتیوں کی ترتیب خراب کر رہی تھی۔ کشور نے کندھے اچکا دیے۔ مہمان تھی کیسے ٹوک دیتی۔ شوق دکھا رہی تھی کیسے روکتی۔ اسی اثنا میں رقیہ کی آواز پڑی تو کشور ابھی آنے کا کہتی کمرے سے نکل گئی۔ خانم بھی چلی جاتی لیکن سنہری نے ایک دم اسے پکارا۔ اسے اپنے قریب بلایا۔

''یہ دیکھو ذرا! مجھ سے اس تھال کی موم بتیاں گر گئی ہیں۔ ان کو ٹھیک کرتی ہو ذرا...... اور ویسے مجھے ان کی پلیٹوں کی سیٹنگ مناسب نہیں لگ رہی، میں ان کی موم بتیوں کی ترتیب بدلنے لگی ہوں۔''

خانم کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ کس دھڑلے سے مان نہ مان، میں تیرا مہمان والا معاملہ تھا۔ ابھی ابھی آئی تھی اور بات ایسے کر رہی تھی جیسے تمام معاملات اس کے ہاتھ کے نیچے تھے۔ خانم کا جی تو کیا ٹکا کے جواب دے لیکن ڈرتی تھی کہ رابی پاس نہیں اور سنہری کا جوابی وار بہت خوف ناک ہوا کرتا تھا۔ خانم اسے پوری نہیں آ سکتی تھی لہٰذا خاموشی سے تھال اپنے سامنے کیا اور نیچے بیٹھ کر اس کی موم بتیاں درست کرنے لگی۔

سنہری نامحسوس انداز میں اس کی پشت پہ آ کھڑی ہوئی اور مہندی کی پلیٹوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی کن انکھوں سے خانم کی کمر پہ چھب دکھاتی لمبی سیاہ موٹے گھنے بالوں کی چوٹی کو حسد زدہ نگاہوں سے دیکھے گئی۔

نگاہوں کے پردے میں قاسم کے طور انداز جو خانم کے لیے محسوس ہوئے تھے، وہ لہرا گئے۔

کیا تھا آخر ان دونوں بہنوں میں جو پاگل بنایا ہوا تھا حویلی لکھا کے مردوں کو۔

اس کا دل چاہا کہ کاش اس کے بس میں ہوتا تو قینچی سے اس چوٹی کو کاٹ ڈالتی۔ نگاہ پھیرنی چاہی تو فوراً ماچس کی ڈبیا پہ ٹھہر گئی۔ دماغ شیطانی تھا۔ خناس بھرا رہتا تھا۔ ایک پل لگایا اور ڈبیا پکڑ کر اس میں سے ماچس کی ایک تیلی نکالی اور اسے ڈبیا سے احتیاط کے ساتھ رگڑا کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔

خانم کے بالوں کی چوٹی جو فرش کو چھونے کے قریب تھی، اس کے بالکل ساتھ مہندی سے سجی پلیٹ تھی جس میں خوب صورت ترتیب سے موم بتیاں سیٹ تھیں۔ سنہری اس جلتی تیلی کو موم بتی کے پاس لائی اور دوسرے ہی لمحے وہ تیلی خانم کی چٹیا کے بے حد قریب تھی۔ اتنی کہ بس کوئی پل جاتا تھا اور اس کا ایک بال بھی اس شعلے کی زد میں آ جاتا تو باقی آتے وقت نہ لیتے۔

خانم اپنے دھیان میں اب بھی تھال دوبارہ سیٹ کر رہی تھی، سنہری کے پاس سنہری موقع تھا۔ زیادہ نہ سہی، چلو یہ سیاہ چوٹی تو کٹ کے نابود ہو گی نا۔ دیا سلائی کو انگلیوں کی اوٹ میں کیے وہ اس کے بالوں کے قریب لا چکی تھی۔ جب اس کے اس ہاتھ پہ کسی نے اپنا جوتے سمیت پیر دھر دیا۔ سنہری کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور جلتی دیا سلائی اس کے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی میں جل کر بجھ گئی۔ غصے اور تکلیف سے اس نے پلٹ کر دیکھا تو زبان گنگ ہو گئی۔

”تم......!“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں زمانے بھر کا افسوس سمایا ہوا تھا......!

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 12

وہ چیخی تو یکدم خانم نے بری طرح بوکھلا کر رخ موڑا۔ عجیب ہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ حسنات خوب صورت آسمانی کرتے شلوار میں پورے کروفر سے کھڑا تھا اور اس کی کھیڑی کے نیچے سنہری کا ہاتھ دبا تھا۔ خانم کو گردن موڑتے دیکھا تو سنہری کے اپنے پیر کے نیچے دبے ہاتھ کو ذرا کی ذرا مسلا اور چھوڑ دیا۔

سنہری نے فوراً اپنا ہاتھ دیکھا جہاں ہتھیلی کے عین وسط میں اچھا خاصا سرخ نشان بن چکا تھا۔ امید واثق تھی کہ کچھ دیر میں یہاں چھالا نمودار ہو جاتا۔ سنہری کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی تپش اٹھی۔ اس نے سلگتی نگاہوں سے حسنات کو نیچے بیٹھے بیٹھے دیکھا جو نیم مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے مزا چکھانے والے انداز میں دونوں بازو سینے پر لپیٹے دیکھ رہا تھا۔

خانم جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی وہی چوٹی جو پشت پہ لہراتی دیکھ سنہری کو ہضم نہیں ہوئی تھی ایک دم کھڑے ہونے سے سامنے جھول آئی۔ وہ ناسمجھی اور ہونق چہرے سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

حسنات نے نگاہ بھر کر ان سیاہ بالوں کو دیکھا جو دور سے ہی اپنی نرمی اور چمک اس پہ ظاہر کر رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ بروقت یہاں پہنچ گیا تھا۔ سنہری پیچ و تاب کھاتی بولی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے ہاتھ پہ اپنا پیر رکھنے کی......!“

”جس دن تم نے حویلی لکھاں میں اپنا پیر رکھا تھا، اسی دن سے میں نے جرأت پیدا کر لی تھی۔ ابھی تو تمہارے دل پہ پیر رکھوں گا۔“ اس نے ناک پہ سے مکھی اڑانے والے انداز میں جواب دیا تو سنہری کو مزید آگ لگا دی۔

''کوئی مجھے بتائے گا حسنات لالہ کہ یہ کیا ہو رہا ہے...... اور آپ کب آئے اور اتنی دیر سے آ رہے ہیں۔ بارات پہ ہی پہنچ جاتے بھلا۔ ابھی سے کیوں چلے آئے......!'' خانم پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب بلا تکان بولتی جوش سے اس کے قریب چلی آئی تو وہ سنہری کے چہرے پہ نگاہیں گاڑے ہی بولا۔

''ذرا کمرے سے باہر جاؤ پری، ایک بات کرنی ہے چاچی حمیدہ کی اس مہمان سے......!''

خانم ہک دک رہ گئی تھی۔ حسنات نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ اس کا وفور شوق سے قریب آنا بھی نہیں دیکھا تھا۔ سارا جوش جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔ چھوٹا سا دل تھا اور دکھ گیا تھا اس لیے آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

اس نے شکوہ کناں نگاہیں حسنات پہ گاڑیں لیکن وہ اسے دیکھ ہی کب رہا تھا۔ اس کی پھاڑ کھانے والی نگاہ تو سنہری پہ جمی تھی جو خانم کو یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے مارے محویت کے ہٹنا بھول گئی ہو۔ اس کا دل جیسے ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔

اس نے ایک زخمی نظر حسنات پہ ڈالی اور دوسری سنہری پہ ڈالتی وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جاتے جاتے دروازہ زوردار آواز سے مارتی ہوئی گئی تھی جسے حسنات نے محسوس تو کیا لیکن پلٹ کر دیکھا نہیں۔

سنہری تن کر حسنات کے سامنے کھڑی ہو چکی تھی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے کو دبائے وہ شرربار نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی لیکن خانم کے باہر چلے جانے پہ چہرے کے تاثرات فوراً تبدیل ہو گئے تھے۔

''اچھا ایسا تھا کیا...... اکیلے میں ملنا تھا تو پہلے بتا دیتے، میں ملنے چلی آتی......'' سنہری نے اپنا پہلا داؤ کھیلا۔

''وہ تو مجھے معلوم ہے تم عادی ہو کوٹھڑیوں میں ملنے ملانے کی۔ یہاں آتے ہی تمہارے کارنامے سنائی دے گئے ہیں مجھے، لیکن مجھے ایسا شوق ہرگز نہیں۔ تمہاری اوقات ملاقات کی نہیں، بلکہ مکالات کی ہے لیکن میں عورت کو مارا نہیں کرتا۔''

اس نے سنہری کو بات نہیں لگائی تھی، آگ لگائی تھی۔

ایسی توہین......ایسی تضحیک......!

ایک ہی جملے میں اسے تاراج کر دیا تھا جیسے۔

''تم اپنی اوقات پہچانو چوہدری حسنات! تمہیں تو عورت ذات سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں۔ پوچھ سکتی ہوں کہ میرے ہاتھ پہ اپنا ناپاک پیر کس جرأت سے رکھا تم نے......؟''

''جس جرأت سے تم نے میری پری کے بالوں کو تیلی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ بس وہی جرأت میں نے پکڑ لی۔''

''تمہاری پری......! اچھا تمہاری پری کے پر کٹنے والے ہیں حسنات باؤ۔ ایک دیو لے جانے کو تیار بیٹھا ہے تمہاری پری۔''

سنہری تو ہر موقعے پر آگ لگانے کا ہنر جانتی تھی۔ اور یہ ہنر اس وقت کمال کو پہنچ جاتا تھا جب اسے خود کو آگ لگتی تھی۔ حسنات کو اس نے جلتے توے پہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے بنا لحاظ سنہری کا سامنے جھولتا ہوا پراندہ جھٹکے سے کھینچ ڈالا۔ نتیجتاً وہ جو اپنے چھوٹے بالوں کو لمبا دکھانے کے شوق میں پراندہ ڈالا کرتی تھی، وہی پراندہ بلوں سے نکل کر اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اس کے چھدرے ہلکے سنہری مائل بھورے بال پراندہ نکل جانے کے بعد انتہائی بے رونق اور خشک دکھائی دیے، ساتھ میں اسے مضحکہ خیز بھی بنا رہے تھے۔

سنہری کا جہاں مارے خفت کے رنگ سرخ ہوا وہیں حسنات کا ہنسی ضبط کرتے ہوئے۔ اس نے اس طرح کی توقع تو بالکل بھی نہیں کی تھی۔ یہ تو ایسے ہی ہو گیا تھا جیسے بچپن میں کھیلتے ہوئے بہنوں کی درگت بن جایا کرتی تھی اور بال کھینچنے کے بعد جو ان کی چڑیلوں جیسی شکل بنتی اس پہ وہ سب ہنس ہنس کے دہرے ہو جاتے۔ اس وقت سنہری کو دیکھ کر حسنات کو ویسے ہی ہنسی آ رہی تھی لیکن وہ لاکھ بدلحاظ سہی پھر بھی کہیں ایک حد ضرور تھی۔

''آئندہ اگر پری کے بارے میں بکواس کی نا تو تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یاد رکھنا...... سمجھیں!'' خود کو سنبھالتے اب سنہری کو انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے وہ غرایا۔

سنہری نے اپنے چھدرے بالوں کی آدھی ادھوری سی چوٹی پہ اپنا دوپٹا لپیٹا اور بولی۔

"اب تو جو ہوگا نا حسنات باؤ، اس کی سوچ بھی کہیں تمہارے دماغ میں نہیں۔ سنہری بس اچھوں کے ساتھ اچھی ہے اور جو اس کے ساتھ برے ہو جائیں وہ قبر میں جاتے دم تک سنہری کی مار نہیں بھولتے۔ تم نے ابھی جو میرے ساتھ کیا ہے، اچھا نہیں کیا۔ ایک ذرا سا شور مچا دوں تو یہاں سے منہ کالا کر کے نکالے جاؤ گے تم......!"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ یہاں سے کون نکالا جاتا ہے۔ تم فی الحال اپنی تیاری رکھو۔ تمہیں تو میں نے نہیں رہنے دینا اپنی حویلی میں۔ یہ حسنات کا تم سے وعدہ ہے اور یہ منہ کالا کرنے کی دھمکی تم کسے دیتی ہو...... میں سر پھرا ہوں بی بی، سر پھرا...... تم شور کاہے کو کرتی ہو؟ میں بلوا لیتا ہوں پورا پنڈ...... سب اکٹھے ہوں گے تو چار نظریں مجھ پر ٹکیں گی، لیکن دوسرے ہی پل سارا پنڈ تمہیں دیکھے گا کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ تم وہی ہو جس نے قاسم کو کوٹھڑی میں بلوایا تھا۔"

لمحے کے ہزارویں حصے میں سنہری کی طیش و غضب سے رنگت متغیر ہوئی۔ بڑی لمبی زبان تھی اس کی لیکن ایک واحد حسنات تھا جس کی زبان کا مقابلہ سنہری کے بس سے باہر تھا۔ ایسے تاک کر جملے مارتا تھا کہ رواں رواں سلگ اٹھے۔ اندر باہر تکلیف سے بلبلا اٹھے۔ اس نے ایک طویل سانس بھر کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ دماغ تنبیہ کر رہا تھا کہ عقل سے کام لے۔ سامنے کھڑا شخص ٹیڑھی کھیر تھا۔ اس سے پنگا لینے کا مطلب تھا اپنی ذلت و خواری...... جو بھی کرنا تھا حکمت عملی سے کرنا تھا۔

"بات ایسی ہے حسنات باؤ، کہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ تم چار دن کے مہمان ہو حویلی میں۔ سکون سے بھائی کی شادی دیکھو اور پھر واپس چلے جاؤ۔ تمہاری پڑھائی بہت مشکل ہے حسنات باؤ...... اس بار جا کر تمہیں جلدی واپس بھی آنا پڑے گا۔" وہ معنی خیزی سے کہتی آگے بڑھنے لگی جب حسنات اس کی راہ میں آیا۔

"میں ڈنکے کی چوٹ پہ بات کہنے اور سننے کا عادی ہوں، جو بکنا ہو کھل کر بکو۔"

"بکنا کیا ہے حسنات باؤ، بتایا تو ہے کہ تمہاری پری دیو کی قید میں جانے والی ہے۔ تم دیکھنے تو آؤ گے نا اپنی پری کو۔ کیونکہ دیو کی قید میں جانے کے بعد وہ تمہاری تھوڑی نہ رہے گی۔ تمہیں ہمیشہ کے

لیے بھولنا پڑے گا اپنی پری کو۔"

سنہری بغور اس کا چہرہ تکتی اس کی برداشت آزماتی کہتی جا رہی تھی لیکن حسنات کے چہرے کے تاثرات اس قدر نارمل تھے کہ اپنی بات کا فوری اثر اسے دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ وہ بل کھاتی مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

پیچھے حسنات نے زور سے فرش کو ٹھوکر ماری تھی جس کے نتیجے میں مہندی کی ایک پلیٹ اڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ اس نے افسوس سے اس تھالی کو دیکھا۔

کیسی منحوس تھی یہ لڑکی، کسی کی ذات اور عزت کا پاس نہیں تھا۔ کسی کے جذبات کا احساس نہیں تھا۔ مجسم شیطان تھی یہ اور اس شیطان نے ان کی حویلی لکھاں میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔

☆......☆......☆

باورچی خانے میں سلنڈر والے چولہے کے پاس کشور کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ صحن میں عورتوں کا تانتا بندھا تھا۔ شادی کی رونقیں عروج پہ پہنچ چکی تھیں۔ اب تو حسنات بھی آ گیا تھا تو جیسے سب مکمل ہو گیا تھا۔ آتے ہی سب سے پہلے کشور سے ملاقات ہوئی تھی اس کی۔ اور اس کی شریر نگاہوں کا مفہوم جان کر وہ مسکراتی رخ پھیر گئی تھی۔ لیکن حسنات نے وہیں کھڑے اس کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ ایسی ایسی کہانیاں شروع کر دیتا تھا کہ ان کا سر پیر ڈھونڈتے نانی یاد آ جاتی۔

"بھابھو! آپ کو پتا ہے اپنا لالہ حیات شادی کی خوشی ہضم نہیں کر پا رہا۔ پیٹ لوز ہو گیا ہے اس کا۔ دن میں دو وقت حکیم صاحب کی طرف جاتا ہے پھکی لینے، وہ بھی چورن دے کر واپس لوٹا دیتے ہیں۔ ہر وقت ٹہلتا رہتا ہے۔ بھلا بتاؤ، ایسی حالت تو لڑکیوں کی بھی نہیں ہوتی جیسی اپنے بھیا جی کی ہے۔ دعا کریں ڈائریا نہ ہو جائے۔"

اس کی باتوں پہ ہنسی دباتی سرخ ہوتی کشور نے دہل کر ہاتھ سینے پہ رکھا۔

"وہ بھلا کیا ہوتا ہے؟"

"یہ اپنا جب پھکیاں اثر کرنا چھوڑ جائیں اور شادی کی خوشی دماغ کو چڑھ جائے تو دماغ نیچے پیٹ

میں آجاتا ہے بھرجائی۔اب وہاں پہلے ہی معدہ بھی ہوتا ہے اور دماغ بھی منہ اٹھا کر دوڑ آتا ہے تو ٹھڈے مکے شروع ہوجاتے ہیں ایک دوسرے کو۔معدہ دماغ کو واپس اوپر چڑھاتا رہتا ہے اور دماغ اڑی کرتا ہے کہ نہ ہن مینوں کڈ کے وکھا......بس اسے ہی ڈائریا کہتے ہیں بھرجائی......اور علاج ہے اس کا چارپائی۔"

وہ جب سے میڈیکل کرنے لگا تھا حویلی کی لڑکیوں کو نت نئی اپنی ایجاد کردہ بیماریاں بتا کر یونہی پاگل بنائے رکھتا تھا۔لڑکے شہروں سے پڑھے ہوئے تھے لیکن لڑکیاں اور عورتیں بھولے دماغوں کی تھیں۔ایسی باتیں سنتیں تو اپنے پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتیں، یوں لگتا جیسے دماغ نیچے اتر آیا ہے۔

"تمہیں لگتا ہے میں تمہاری ان بے کار باتوں کا یقین کرلوں گی۔ ہرگز نہیں۔ ابا کہتے ہیں کہ تم پاگل بناتے ہو سب کو۔اس طرح کی کوئی بیماری نہیں ہوتی جیسی تم بتاتے پھرتے ہو، آئے بڑے......"

وہ اترا کے گردن اونچی کرتی بولی تو حسنات نے حیرت سے اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھا۔

"ارے واہ بھابھو! تمہیں تو بڑے پر لگ گئے۔واہ جی! لیکن یاد رکھنا مرغی اڑ نہیں سکتی۔"

"اوئے بدتمیز! مجھے مرغی کہتے ہو، بتاتی ہوں ابا کو۔"

"ابا سے یاد آیا۔ابا کی ایک اور بیٹی بھی ہے جس کو پر لگے ہوئے ہیں، وہ کہاں ہے؟"

"ہاں جی تمہاری پری......! وہ اندر ہال کمرے کے ساتھ والے کمرے میں ہے۔وہاں مہندی کا سامان شامان تیار کررہی ہیں رابی اور وہ......"

"لیں، میں اسے وہیں ملتا ہوں۔ذرا دیکھوں تو کر کیا رہی ہیں۔میری مدد کے بنا بھلا کر کیسے سکتی ہیں کچھ......!" وہ وہاں سے جانے لگا جب پیچھے سے کشور نے اسے تنبیہاً روکا۔

"سنو حسنات! رابی ابھی اندر نہیں ہے۔خانم کے ساتھ وہ ہے اندر......سنہری، ذرا احتیاط سے جانا۔"

خانم اکیلی تھی وہ بھی اس چڑیل کے ساتھ......! اس سوچ نے حسنات کے پیروں کو پہیے لگا دیے تھے۔وہ کشور کو نارمل پوز کراتا خود فکر مندی سے اندر کمرے کی جانب بڑھا تھا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سنہری کام دکھا رہی تھی۔

ایک پل کی دیر کی کسر تھی بس اور سنہری، خانم کے خوب صورت بالوں کو آگ دکھا چکی ہوتی۔وہ

اس لڑکی کی خباثتیں حویلی آتے ہی سن چکا تھا۔ حیات نے تو نپے تلے الفاظ ہی استعمال کیے تھے لیکن جب وہ چھوٹی حویلی آتے ہوئے کھڑے کھڑے قدسیہ پھپھو سے ملنے رکا تو مبشر اور اس سے چھوٹے بھائی مدثر نے اسے دو منٹ میں تمام معاملات گوش گزار کر دیے تھے۔ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ جب سے اس نے سنہری کو تعویز رکھتے ہوئے پکڑا تھا تب سے اسے یقین تھا کہ یہ لڑکی محض ایسے حربوں پہ نہیں رہے گی، یہ مزید چاند چڑھانے کی کوشش کرے گی۔ لیکن کسی کو آگاہ کیسے کرتا ہاتھ میں ثبوت نہیں تھا۔

اب جو منظر اس نے یہاں دیکھا تھا وہ اس کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ سنہری ابھی تو کمرے سے تن فن کرتی دفعان ہو گئی تھی لیکن وہ حویلی لکھاں سے کہیں نہیں جانے والی تھی۔ اسے خطرے کی بو صاف محسوس ہونے لگی تھی......!

☆......☆......☆

مسلسل سوں سوں کی آواز سے اکتا کر رابی نے خانم کے دوپٹے کا پلو تھاما اور اس کے منہ پہ اوڑھا دیا۔ وہ دونوں چھت پر بنی ممٹی کے شیڈ کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ خانم تو اسی وقت یہاں آ گئی تھی رونا دھونا کرنے، رابی البتہ اسے ڈھونڈتی ڈھانڈتی اوپر چلی آئی تھی۔ اور تب سے بس اسے روتا دیکھ رہی تھی۔

''او بہن، بے کار کیوں روتی ہو؟ ہو سکتا ہے حسنات لالہ کو کوئی پریشانی ہو۔ صبر تو کرو نا، ابھی پتا چل جائے گا۔''

''نہیں رابی، حسنات لالہ نے کبھی بھی میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا۔ وہ بھی سنہری کے سامنے۔ وہ بھی کیا کہتی ہوگی کہ یہ میری اوقات ہے۔ ہر وقت حسنات لالہ کرنے والی کی۔ کیسے...... کیسے رابی؟ کس طرح وہ مجھے اس چڑیل کے سامنے کمرے سے باہر بھیج سکتے ہیں، بھلا بتاؤ......!''

''سنہری کے ساتھ حسنات لالہ کا بیر پوری حویلی لکھاں کو معلوم ہے۔ مجھے تو لگتا ہے حسنات لالہ نے ابھی بھی اس کی خفیہ طور پر چوٹی ہی پٹنی ہوگی۔''

''بے کار باتیں نہ کرو۔ چوٹی پٹنی ہوتی تو آثار بھی تو دکھائی دیتے نا۔ تمہیں پتا ہے رابی......''

زور سے ناک سڑک کر اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ”حسنات لالہ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے نا سنہری کو...... ایسی نظروں سے وہ والی ہوتی ہیں نا جو...... وہی جو......“

”کھا جانے والی نظریں ہوتی ہیں۔“ رابی نے اس کے لیے آسانی کی۔

”نہیں رابی نہیں۔ وہ کھا جانے والی نہیں تھیں بلکہ...... بلکہ......“

”چیر دینے والی تھیں، عقل مند......“ پیچھے سے اچانک حسنات آیا تھا اور خانم کی بولتی بند ہوئی تھی۔

رابی نے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر تالی بجائی اور فٹافٹ بولی۔

”مجھے پکا یقین تھا حسنات لالہ، کہ آپ اسے چیر دینے یا کھا جانے والی نظروں کے علاوہ تیسری کسی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔“

”تمہیں تو یقین تھا لیکن ان میڈم کے اقوال زریں کچھ اور ہونے والے تھے ابھی۔“ حسنات خانم کے سرخ چہرے کو بغور دیکھتا ہوا بولا۔

چھوٹی سی ناک رو رو کر سرخ ہو رہی تھی۔ گالوں پہ بھی تمازت کے آثار تھے۔ آنکھیں بھی رو رو کر گلابی ہو رہی تھیں۔ حسنات نے نگاہیں چرا لیں۔ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ حسنات ہمیشہ سے اسے پری کہتا تھا لیکن آج اسے لگ رہا تھا جیسے مجسم دیکھ رہا ہو۔ وہ پشت پہ ہاتھ باندھے دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا اور پنجوں کے بل اس کے چہرے کی طرف منہ کیے بیٹھ گیا۔

”رونے کی وجہ بتاؤ گی پری......؟“ اس نے جھک کر اس کا جھکا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن خانم مزید اپنا سر نیچے کر گئی۔

حسنات کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”سر اتار کر پیروں میں ہی رکھ دو۔ میں تو اپنی پری کو بہت عقل مند سمجھتا تھا لیکن تم تو ایک دم بے وقوف نکلیں۔ چچ چچ......!“

”یہ تو آپ ایویں ہی کہہ رہے ہیں حسنات لالہ...... ورنہ آپ ہم دونوں کو بے وقوف ہی سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت عقل مند کہہ دیتے ہیں بس۔“ رابی پیچھے سے کمر پہ ہاتھ ٹکائے بولی تو حسنات

نے گردن موڑ کر اسے گھورا اور بولا۔

''بڑی باتیں کر رہی ہو۔ رک جاؤ چار دن ہی رہ گئے ہیں بس تمہارا رزلٹ آنے میں، دیکھو کیسے بولتی بند ہوتی ہے۔''

''نہیں ہوتی حسنات لالہ......! وہ ہم دونوں نے کتابیں گھول کر پی لی تھیں جیسے آپ نے کہا تھا۔ دیکھ لینا آپ کا بتایا نسخہ تھا بھلا فیل کیسے ہو سکتے ہیں ہم......!''

سامنے بھی رابی تھی جسے ہر سوال کا جواب وقت پر یاد رہتا تھا۔ حسنات نے ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور رعب سے بولا۔

''دو منٹ لگاؤ اور گرما گرم چائے بنا کر اوپر ہی لے آؤ۔ میری بھرجائی کو کہنا ان کا دیور بھوکا بھی ہے اس لیے کچھ کھانے کو بھی بھیج دیں۔ جلدی نکل لڑکی اور جلدی آ......!''

''بس مجھے تو کاموں کے لیے ہی رکھ چھوڑا ہے حویلی والوں نے۔ کبھی ان کے کام کرو تو کبھی ان کے۔ لیکن مجال ہے جو رابی کا احسان مانے کوئی......!'' وہ چڑ کر پاؤں پٹختی جانے لگی۔

''مانیں گے......مانیں گے۔ کیوں نہیں مانیں گے۔ پہلے کچھ کھلاؤ اور پلاؤ اور اس کے بعد تمہیں میڈل دوں گا۔''

''ہیں سچی......؟'' وہ خوش ہوتی وہیں رک گئی۔ ''کون سا لالہ......؟''

''وہی والا جو مجھے ایف ایس سی میں اسپورٹس ڈے پہ ملا تھا۔ آج سے وہ تمہارا، پکا......!''

رابی اس کے بے نیازی سے کہنے پہ منہ پھلائے چائے لینے چل دی تو وہ خانم کی جانب دوبارہ متوجہ ہوا۔

''ہاں جی، اب آپ منہ سے پھوٹیں گی کہ کون سا مسئلہ فیثا غورث آپ کے ساتھ بنا ہے؟''

''بات نہیں کریں حسنات لالہ، مجھ سے...... پکی دشمن ہے میری وہ سنہری کی بچی۔ ہر وقت ذلیل کرتی ہے مجھے اور رابی کو......اور آپ نے اسی کے سامنے مجھے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ کتنا خوش ہوئی ہوگی وہ......!'' وہ دوبارہ رو پڑی۔

ایک ساتھ کئی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے دیکھ حسنات کا دل کیا انہیں اپنی انگلیوں کی پوروں پہ چن لے۔ بمشکل دل کی خواہش پہ قابو پاتے اس نے دھیان ہٹایا اور موضوع پر آیا۔

"پری......!" اس نے رسان سے پکارا تو خانم کی گلابی ڈوروں سے مزین گھنی لمبی پلکوں والی آنکھوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

حسنات نے دل میں خود کو ڈپٹا۔

(ہوش کر، عقل کر، دماغ ٹھکانے پہ رکھ۔ یہ سامنے پری ہے۔ بچی ہے ابھی حسنات!)

"دیکھو پری! میں تمہیں ساری بات سمجھاتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کیا کر رہی تھی؟"

پری نے حیرت سے اسے دیکھا اور حسنات اس کے ادھ کھلے منہ کو دیکھتا اسے سنہری کی ساری کارستانی سناتا چلا گیا۔ خانم کا مارے صدمے کے منہ مزید کھل گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا سنہری اس قدر خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔

وہ تو دنگ تھی ہی، پیچھے پکوڑوں اور چائے کی ٹرے تھامے کھڑی رابی کا بھی مارے غصے کے برا حال تھا۔ اس نے ساری تو نہیں لیکن کافی بات سن لی تھی۔ وہ چلتی ہوئی آئی اور ٹرے فرش پہ رکھتے خود بھی چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور حسنات کو آستین سے پکڑ کر کھینچا جس سے وہ جو کب سے پنجوں کے بل بیٹھا تھا خود بخود غیر متوازن ہوتا فرش پہ بیٹھ گیا۔

"کیا ہے رابی...... نکمی ...... ہلکے رنگ کے کپڑے ہیں میرے۔ مٹی کے گندے نشان پڑ جائیں گے گدھی!" وہ تاسف سے اب چوکڑی مارتا ساتھ اپنے کپڑوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔

"کپڑوں کی پڑی ہے حسنات لالہ...... اور یہ جو آپ بتا رہے ہیں کہ سنہری خانم کے بالوں کو آگ لگانے لگی تھی یہ کیا معمولی بات ہے، مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔" اس نے بے یقینی سے کہتے خانم کو دیکھا تو اسے ڈپٹا۔ "تم تو اپنا منہ بند کر لو خانم!"

اس نے سلو موشن میں منہ بند کیا اور اپنے بالوں کی چوٹی پشت سے سامنے لاتی اسے محبت سے سہلاتے ہوئے حسنات کی جانب دیکھنے لگی۔

''آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں حسنات لالہ...... کیا واقعی سنہری ایسا کر سکتی ہے؟ یہ تو جان سے مارنے کی کوشش ہے حسنات لالہ...... آگ لگ جاتی تو وہ پھیل کر مجھے سارا جھلسا بھی تو سکتی تھی نا۔ کوئی ایسے کیسے کر سکتا ہے؟''

اس کی حیرت کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، یہی حال رابی کا تھا۔ وہ بھی آنکھوں میں فکر لیے خانم کے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ دماغ مسلسل اس منظر کو تراش رہا تھا جس کا تصور بھی جھرجھری لینے پہ مجبور کر دے۔

''میں مر گیا ہوں کیا۔ کسی کی کیا اوقات ہے جو تم لوگوں تک پہنچے۔ میں عین وقت پہ پہنچا نا......! ایسے ہی وہ کبھی بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ میں بس جو سمجھا رہا ہوں، اسے سمجھو اور عقل میں بٹھالو۔''

''کیا بٹھالیں۔ یہی کہ جب آپ واپس ملتان چلے جائیں گے تو پیچھے وہ کیا نہیں کرے گی۔ آج اس کی ہمت کھل گئی ہے حسنات لالہ...... ہمیں فوراً گھر کے سب بڑوں کو جمع کر کے یہ معاملہ بتا دینا چاہیے۔''

رابی کی بات ایک حد تک درست تھی۔ حسنات سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''نہیں! شادی گزر جانے دو۔ کیونکہ یہ شیطان لڑکی شادی ہی تو خراب کرنے کے درپے ہے۔ اس کی نیت شروع سے بد ہے۔ یہ جو کچھ بھی حویلی لکھاں میں ہو رہا ہے، اس کے آنے کے بعد سے...... ان سب کے پیچھے اس کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے حیات لالے پہ ہاتھ صاف کرنا۔ وہ ان سے شادی کرنا چاہتی ہے اسی لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈوں پہ اتری ہوئی ہے۔''

''توبہ میرے خدایا......! پھر تو ہمیں ایک منٹ دیر نہیں کرنی چاہیے حسنات لالہ......'' خانم کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

''او نہیں اوئے...... کہا تو ہے ابھی بتا دینا اسے موقع دینے والی بات ہے۔ سوچو جس نے ایسی جرأت دکھا دی ہو اس میں شرم حیا کا فقدان ہے۔ تبھی کیا نا ایسا۔ تو جس نے شرم نہیں کرنی وہ کسی بات کا لحاظ بھی نہیں کرتا۔ اس لیے ہم اسے پلیٹ میں رکھ کر حیات لالے کو کیوں دے دیں۔ اسے تو تبھی

چڑھی ہی نہیں، ہمارا تو نقصان ہو جائے گا نا۔ اس لیے بس تسلی اور اطمینان سے یہ دن گزارو۔ اس کے بعد دیکھنا اس کا پتا صاف کروا کر جاؤں گا یہاں سے۔"

اس نے سکون سے کہتے پکوڑا اٹھا کر منہ میں بھرا اور چائے کا مگ اٹھا کر اسی مگ کو ٹہوکا دے کر ان دونوں کو بھی کھانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں قدرے مطمئن تو ہو چکی تھیں کیونکہ حسنات کا آ جانا ہی ان کے لیے راحت کا باعث تھا۔ لیکن دل میں سنہری کا خیال بھی شرارے بھر رہا تھا۔ ایسی خطرناک، کینہ پرور اور بدطینت لڑکی جتنی جلدی ہو سکے بس یہاں سے چلی جاتی۔ ان دونوں نے بھی اپنے اپنے مگ اٹھا لیے اور اب رابی کے نہ ختم ہونے والے سوالات کا سلسلہ تھا اور حسنات کے پاس داستان ملتان تھی۔

دور افق پہ پرندے اس جگہ سے کوچ کر چلے تھے کیونکہ سیانے کہتے ہیں آنے والی آفت کی خبر سب سے پہلے بے زبان پنچھیوں کو ہو جاتی ہے۔

☆......☆......☆

سکینہ اور قدسیہ ہال کمرے میں بری کا سارا سامان پھیلائے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر پہلے حمیدہ بھی آ کر بیٹھی تھیں۔ انہیں بصد اصرار سکینہ نے وہاں بلوایا تھا۔ بار بار بلوا بھیجا تھا لیکن حمیدہ نے ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دی تھی اور جب وہ نہ آئیں تو سکینہ خود جا کر لے آئیں۔ قدسیہ نے روکا بھی کہ کیا فائدہ ایسے منہ کے ساتھ بٹھانے کا کہ جو نہ خود خوش ہو، نہ ہوتا دیکھ کر راضی ہو۔ لیکن سکینہ نے انہیں رسان سے خاموش کروا دیا تھا اور حمیدہ کو بلا لائی تھیں۔ وہ بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ ایک ایک جوڑا دیورانی کے آگے کرتی جا رہی تھیں اور ساتھ رائے بھی پوچھ رہی تھیں۔ حمیدہ کو ناچار ان کا شوق دیکھتے کچھ نہ کچھ کہنا پڑ رہا تھا۔ قدسیہ سب دیکھ رہی تھیں اور جی ہی جی میں کلس رہی تھیں۔ ان کے پہلے بھتیجے کی شادی تھی انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا شگنوں کے جوڑے کوئی ایسی رکھائی سے دیکھے لیکن سکینہ کی خاطر خاموش تھیں۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے وہ مردانہ جوڑوں کو خود ہی ٹانکنے لگیں۔

"اے بھرجائی! یہ بھلا تم کس کھاتے میں سبھی کے جوڑے بنا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ یہ تو لڑکی والے دیتے ہیں۔ شوہروں کے تائے، چاچے، مامے، پھپھیاں، ماسیاں...... سب ان کا سر درد ہیں۔ تم

خوامخواہ اتنا تام جھام کر رہی ہو۔" حمیدہ نے ایک زنانہ نرم اور ملائم کپڑے کا سادہ سرمئی جوڑا ہاتھ میں مسل کر اس کی نرمی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

جوڑے پہ خالہ حفیظاں ڈسکے والی ایک سفید چٹ پہ لکھ کر چسپاں کیا ہوا تھا۔ انہوں نے طائرانہ نگاہ سبھی جوڑوں پہ ڈالی تھی محض اپنا جوڑا ڈھونڈنے کے لیے۔

"لو بتاؤ بھلا حمیدہ! رقیہ اور ہمارے رشتے دار کوئی الگ الگ ہیں کیا۔ سانجھے ساک (رشتے دار) ہیں سانجھے جوڑے بن گئے اور کڑی والوں پہ پہلاں ہی کم بوجھ ہوتا ہے کیا......"

"نا تو کڑی والے جو ہوئے۔ ہوتے کس لیے ہیں۔ اللہ کی ونڈ ہے بھرجائی۔ جب رب نے دھی دی ہے تو اب اس کے سارے سیاپے پورے کرنے تو پڑیں گے۔"

اللہ کی پناہ! حد تھی غرور کی! اپنی بیٹی نہیں تھی تو سمجھتی تھیں کسی کی بھی بچیوں کے لیے کچھ بھی بولتی رہیں۔

قدسیہ کو تو شدید تاؤ آیا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ سکینہ نے فوراً ہاتھ دبوچ لیا۔ برا انہیں بھی بہت لگا تھا لیکن موقع معاملہ فہمی سے چلنے کا تھا۔

"ایسے نہیں کہتے حمیدہ! بیٹی کسے بری لگتی ہے۔ اللہ جس کو بیٹی دیتا ہے اسے سیانف بھی دیتا ہے اور اسباب بھی۔ اللہ بچوں کے اچھے نصیب کرے یہ تو مقدروں والوں کو ملتی ہیں۔"

حمیدہ کو جیسے آگ کی لپٹوں نے جا دبوچا۔ انہیں لگا کہ سکینہ نے انہیں بیٹی نہ ہونے کا طعنہ مارا ہے۔ اوپر سے برابر بیٹھی قدسیہ کی دبی دبی مسکراہٹ۔ ان کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ وہ جانے کا قصد کرنے ہی والی تھیں جب سنہری آتش فشاں بنی وہاں داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پراندہ پکڑ رکھا تھا اور سر کو دوپٹے سے اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا جو کہ خلاف معمول تھا۔ حمیدہ کے تو دل پہ ہاتھ پڑا۔

پہلا خیال یہی آیا کہ بال تو نہیں اتر گئے۔ پھر خود ہی رد کرتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ سنہری اسی جانب آ رہی تھی۔ چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ سارا راستہ پیدل چلتی آئی تھی۔ رقیہ نے روکا بھی تھا کیونکہ وہ صحن میں ہی تو عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں پر سنہری نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس حویلی پہنچ کر دم لیا تھا۔ بار بار نگاہوں کے سامنے اپنی تذلیل اور تضحیک گھوم جاتی تھی۔ کس طرح حسنات کے سامنے اس کا

پراندہ بالوں سے نکل گیا تھا اور وہ ہنسی جو اس کے ہونٹوں تک آئی لیکن وہ دبا گیا۔

کاش......کاش! وہ وہاں گئی ہی نہ ہوتی......!

حمیدہ سنہری کے اپنے قریب آنے سے پہلے خود ہی اس کی جانب لپکیں۔ اور سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

''کیا ہوا سنہری تجھے کہاں سے آ رہی ہے اور یہ پراندہ کیوں پکڑ رکھا ہے۔ بالوں کو تیلی تو نہیں لگ گئی تیرے؟''

اور یہ کہہ کر سنہری کو حمیدہ نے صحیح معنوں میں تیلی لگا دی تھی۔ یہی تیلی تو وہ خانم کو لگانے ہی والی تھی بس۔ کیسا لطف ہوتا جو خانم شادی کے سارے دنوں میں سر لپیٹے رکھتی۔ ساری برادری کو پتا چلتا کہ اسے بالچھڑ ہو گیا ہے کیونکہ سب کو ایسا سنہری بتاتی۔ لیکن اس لطف کا لطف کیا لینا تھا، حسنات نے دو سیکنڈ میں سارا کھیل الٹ دیا تھا۔

''بولتی کیوں نہیں میرے بچے......کیا کر آئی ہے بالوں کے ساتھ؟''

''اوہو! کچھ نہیں ماسی!'' اس نے ایک جھٹکے سے اپنی بانہیں حمیدہ کے ہاتھوں سے چھڑائیں۔

حمیدہ نے پل کے پل کھسیانی نگاہوں سے سکینہ اور قدسیہ کو دیکھا۔

''تمیز کر، تھوڑا عقل کو ہتھ مار...... یہاں پہلے ہی تو بدلحاظ مشہور ہے۔''

''بدلحاظ میں نہیں، ان کا پتر ہے ماسی۔ اس نے میرا پراندہ پٹا ہے۔ جرأت دیکھیں ذرا اس کی، سنہری کے بالوں پہ ہاتھ ڈالا ہے، سنہری کے......!'' اس نے سکینہ کو چبھتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا تو سکینہ کے دل میں خطرے کی بجتی گھنٹی کی دھمک میں مزید اضافہ ہوا۔

''کیا مطلب ہے سنہری پتر...... کس کی بات کر رہی ہے؟'' دل میں پہلا خدشہ حیات کی جانب سے آیا تھا کہ کہیں دوبارہ ٹاکرا ہونے پہ آپے سے باہر نہ ہو گیا ہو۔

''اس حویلی میں ایک ہی نیش ہے اور وہ جب بھی آ جاتا ہے مصیبت بن کے آتا ہے۔''

زہر اگلتی سنہری کو اگر کوئی اس وقت شیشہ دکھاتا تو یقیناً وہ اپنی ہی شکل دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر

لیتی۔ جیسے قدسیہ نے پھیرا تھا۔

"منہ سے نام بھی بکے گی یا نہیں، کس کی بات کر رہی ہے میری دھی؟ کس نے تیرے ساتھ ایسا کیا ہے۔ مجھے بتا دیکھ اس کو اس حویلی سے نکلوا نہ دیا تو ماسی نہ کہنا اپنی......"

"حسنات نے...... حسنات نے کیا ہے یہ سب میرے ساتھ۔" سنہری نے اپنا پراندہ ان تینوں خواتین کے سامنے لہرایا۔ انداز میں رنج، حقارت اور طیش تینوں عناصر شامل تھے۔

سکینہ کو تو زور کا چکر آیا تھا۔ انہوں نے پاس کھڑی قدسیہ کا بازو تھاما تھا۔ جس انداز میں سنہری اچھل اچھل کر بول رہی تھی ان کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔ کہیں ان کی اولاد سے کوئی بھیانک خطا تو سرزد نہیں ہو گئی۔ کہیں کوئی گناہ تو نہیں کر بیٹھا حسنات؟

قدسیہ نے سکینہ کو صوفے پہ بٹھا دیا تھا اور خود پورے ہوش و حواس سے سنہری سے نمٹنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ حمیدہ نے بھی سینے پہ دو ہتڑ مارے تھے اور وہیں نیچے فرش پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"دیکھ کڑیئے! بجھارتیں نہ بجھا۔ ایک پراندہ جھلاتی آ گئی اور رولا ڈال دیا کہ حسنات نے کیا ہے۔ یہ بتا کیا کیا ہے اور ہمیں اپنے پتر کا بھی پتا ہے اور تیرا بھی۔ چار دن نہیں ہوئے تجھے کوٹھڑی میں قاسم کے ساتھ پکڑا ہے۔ رج نہیں ہوا تھا کیا اس ایک بدنامی سے؟" آگے بھی قدسیہ پھپھو تھیں۔ وہ نہ دبتی تھیں نہ بلاوجہ کسی کو دباتی تھیں۔

لیکن ان کی بات نے حمیدہ کو پتنگے لگا دیے۔ وہیں سنہری ان کے دبنگ لہجے کی وجہ سے پینترا بدلنے کا سوچنے لگی۔

"زبان سنبھال اپنی قدسیہ آپا! میری پتیوی اور میرے پتر پہ الزام نہ دھر۔ اپنے منڈے کو بلاؤ اور پوچھو کیا کرتوت کھلاری ہے اس نے؟" حمیدہ نے فرش پہ زوردار ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ سکینہ کو تو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ ملازموں سے بھرا گھر تھا۔ ایک معمولی سی بھنک بھی کسی کے پڑ جاتی تو پر کا کوا بن جاتا۔

"سنہری! تو بتا کیا کیا ہے حسنات نے تیرے ساتھ؟" حمیدہ نے اب جوش میں سنہری سے ہی پوچھا۔

''میری پیاری چاچی! مجھ سے پوچھو، اسے کیوں تکلیف دیتی ہیں۔ یہ تو پہلے ہی بہت تکلیف میں حویلی پہنچی ہے چاچی!''

حسنات کی سرد اور سپاٹ آواز وہاں گونجی تو سکینہ کو گونہ گوں سکون سا آ گیا۔ ان کا دل مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کی اولاد ایسی نیچ حرکت کرے۔ حسنات کے لب و لہجے نے ہی انہیں باور کرا دیا تھا کہ سنہری کا بیان جھوٹا ہے۔ البتہ حمیدہ چیل کی طرح حسنات کی جانب جھپٹی تھیں۔ انہیں ویسے بھی اس سے پرخاش رہا کرتی تھی۔ حسنات تن کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ حمیدہ کے قریب آتے ہی کڑک دار لہجے میں بولا۔

''چاچی! حسنات ہوں میں، میرے گریبان پہ ہاتھ ڈالنا مذاق نہیں۔ ہوش سے کام لینا ورنہ آفت مچا کر رکھ دوں گا۔ کسی کا کانا نہیں ہوں جو ڈر جاؤں گا۔ یا آدھی رات کوٹھڑی میں نہیں پکڑا گیا جو سر جھکا لوں۔''

اور یہی بات جہاں حمیدہ کو آگ کا گولہ بنا دیتی تھی وہیں کس بل نکل بھی جایا کرتے تھے۔ وہ آنکھیں زور سے میچ کر واپس کھولتے ہوئے بولیں۔

''کیا کہا ہے تو نے میری دھی کو؟''

''کچھ وی نہیں۔'' دونوں ہاتھ ہوا میں کھڑے کر کے لاپروا انداز میں جواب دیا۔

''دیکھ حسنات! میری سنہری کوئی لاوارث نہیں کہ جس کا جب دل کرے منہ چکے اور کچھ بھی کہہ بول دے۔ سیدھی طرح بتا کیا کہا ہے اس کو تو نے۔ اس کا پراندہ کیوں اس کے ہاتھ میں ہے، چنی کیوں بے ترتیب ہے۔ ساہ (سانس) کیوں پھولا ہوا میری دھی کا؟''

''راستے میں کتے پڑ گئے ہوں گے چاچی! اور پراندے کی تو نہ ہی پوچھو۔''

اتنا کہتے ہی اس کے منہ سے فوارے کی طرح ہنسی چھوٹی اور وہ تھوڑا دہرا ہوتے ہاتھ رانوں پہ رکھے کھل کر ہنسا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ ہنسی بھی مصنوعی ہے اور ہنسنے کا انداز بھی۔

فاصلے پہ کھڑی سنہری کا چہرہ مارے ہتک کے گلنار رہا۔ وہیں قدسیہ پھپھو بھی پلو منہ پہ رکھے ہنسی دبانے لگیں۔ حسنات کا انداز تھا ہی اتنا مزاحیہ تھا کہ انہیں مزا دے گیا۔

لیکن سکینہ نے پر تاسف نگاہوں سے اسے گھورنے کی کوشش کی، پر وہ متوجہ ہی کب تھا۔ سنہری لپک کر حمیدہ کے قریب آئی اور چمک کر بولی۔

''دیکھا...... دیکھا ماسی! اسی ہاسے مخول میں یہ بات کو ٹال جائے گا ماسی۔ اس سے پوچھیں کہ اس نے مکئی کی فصل کے قریب میری چنی کیوں کھینچی تھی اور چنی کے ساتھ اس کے ہاتھ میں میرا پراندہ بھی آ گیا تھا۔ ماسی! وہاں سے بھاگی ہوں جان بچا کے میں۔ اک ماسا کو دیر ہو جاتی تو پتا نہیں کیسا ہنیر پڑ جاتا میرے ساتھ۔''

''اپنی بکواس بند کر گھٹیا لڑکی، ورنہ مجھے منہ توڑنے میں نہ افسوس ہوگا نہ شرمندگی۔'' ایسی للکار تھی حسنات کی آواز میں کہ سنہری کی بولتی بند ہو گئی۔ حمیدہ بھی خاموش ہو گئیں ایک دم۔ سکینہ کو لگا جیسے ان میں تازگی بھر گئی تھی۔ پہلی بار ان کے بھی کلیجے میں ٹھنڈ پڑی تھی کیونکہ سنہری کا یہ روپ تو انہیں بھی دنگ کر گیا تھا۔ ایسی چالاکی سے اس نے پینترا بدلا تھا کہ ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ کیا ہوتا جو حویلی کے مردوں کے کانوں میں یہ واویلا جا پہنچتا؟

''اگر میں تمہارا منہ اب تک توڑ کر ہاتھ میں نہیں دے بیٹھا تو صرف چاچی حمیدہ کا لحاظ ہے ورنہ جو تم پری کے ساتھ کرنے جا رہی تھیں اس کے بعد تمہارا ایک پیسے کا بھی لحاظ میں نہ رکھوں آئی سمجھ!''

خانم کے ذکر پر سکینہ اور قدسیہ دونوں کے دلوں پہ ہاتھ پڑا تھا۔ وہ تیزی سے حسنات کے قریب آئی تھیں۔

''کیا ہوا خانم کو...... کیا کیا ہے حسنات پتر، اس نے ہماری بچی کے ساتھ؟'' یہ قدسیہ پھپھو تھیں جو نگل جانے والی نگاہوں سے سنہری کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں تو یہ لڑکی پہلے دن سے نہ بھائی تھی۔

''میں آفتاب چاچا کے گھر سے ہو کر آ رہا ہوں پھپھو۔ شکر کریں وقت پہ پہنچ گیا تھا۔ وہاں پری اپنے دھیان میں مہندی کی پلیٹیں سجا رہی تھی اور یہ...... یہ

یہ پری کے پیچھے بیٹھی تھی اور اس نے ماچس کی تیلی جلا رکھی تھی۔ اس کا ہاتھ پری کی چٹیا سے بس اتنا دور تھا کہ اگر میں بروقت اس کی تیلی نہ بجھاتا تو پری کے بال آگ پکڑ لیتے۔ میں نے بہت شاندار

طریقے سے اس تیلی کو "تیلی" کے ہاتھ میں ہی بجھا دیا۔"

آخری بات کا لطف الگ ہی تھا۔ یہ حسنات کو معلوم تھا یا سنہری کو۔

سنہری نے بے اختیار اپنی ہتھیلی بھینچ لی جس کے وسط میں بنا چھالا اب کافی جلن دے رہا تھا۔

سکینہ اور قدسیہ تو حسنات کی بات سن کر دنگ رہ گئی تھیں۔ جیسے کہنے کو سوجھ ہی کچھ نہ رہا ہو۔

ایسی دیدہ دلیری، ایسی بے باکی...... مطلب یہ لڑکی کسی بھی حد تک چلی جائے اور اسے برداشت کیا جائے، کیوں آخر......؟

سب سے پہلے قدسیہ پھپھو نے تن کر حمیدہ کو تنبیہ کی۔

"اسے نکیل ڈالو حمیدہ! بھاء شہاب کی وجہ سے یہ ادھر ہے۔ بھاء شہاب تمہارا لحاظ کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی حویلی کی عزتیں داؤ پہ لگ جائیں تو کبھی جانیں۔ پوچھو ذرا اس سے کرتی کیا پھر رہی ہے یہ حویلیوں میں اور کس حیثیت سے؟ یہ پرائی چار دن کی آئی ہماری گھر کی بچیوں کے مقابلے پہ اترنے لگی ہے۔ ہونہہ!"

"بالکل پھپھو! یہی پوائنٹ میرا بھی ہے!" قدسیہ پھپھو نے ایک منٹ میں جس اوقات پہ سنہری کو لا کھڑا کیا تھا، اس نے حسنات کا دل راضی کر دیا۔ وہ تائید میں چمک کر بولا۔

سکینہ کو بھی قدسیہ پھپھو کے ایسے سخت جملوں پہ اعتراض نہیں ہوا تھا کیونکہ پانی سر سے اونچا ہونے چلا تھا۔ اب اس لڑکی کو روکنا اور حد دکھانا لازم ہو گیا تھا۔

"بہت افسوس ہوا حمیدہ، تمہاری پنیویں سمجھ کر عزت دی تھی اسے لیکن یہ تو اوچھی حرکتوں پہ اتر آئی ہے۔ خانم جان ہے حویلی والوں کی۔ اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو جاتا تو ساری حویلی دکھ میں ڈوب جاتی۔ باز کرواؤ اسے اور طور طریقے سمجھاؤ۔ بہتر ہو گا کہ ویاہ کے بعد اسے اس کے دادکوں (ددھیال) میں بھیج دو۔"

اتنا کہہ کر سکینہ رکیں نہیں بلکہ قدسیہ کو ابرو کا اشارہ کرتے وہاں سے لیے نکل گئیں۔ پیچھے حسنات کی جیسے بریکیں فیل ہو گئی تھیں۔ چال میں مستی اور ترنگ آ گئی تھی۔ اپنی جگہ جامد و ساکت سنہری اور

خاموش، ضبط سے کام لیتیں حمیدہ کو ایسی مسکراتی نگاہوں سے دیکھتا کبھی پلٹتا اور کبھی واپس مڑ کر دو قدم لیتا پھر شرارتاً پیچھے مڑ کر دیکھتا، وہ صاف چڑا رہا تھا۔ دروازے سے باہر نکل کر بھی اس نے اپنی گردن اندر کی اور سنہری کو ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کا دائرہ بنا کے دکھاتا یہ جتا گیا کہ اس کے ساتھ اب جو ہوا، کمال ہوا ہے۔ اس کے جاتے ہی حمیدہ نے پلٹ کر دو ہتڑ اس کے کندھے پہ مارے اور بولیں۔

''کہا تھا نا، نہ لے پنگے ذلیل کروا دیا نا مجھے ان کمینیوں کے آگے۔ ساری عمر انہوں نے تیری ماسی کو چین نہ لینے دیا۔ اب جوان کے ہاتھ میری کمزوریاں آتی جا رہی ہیں انہوں نے تو میرا دم گھونٹ کے رکھ دینا ہے سنہری، پتا نہیں کیوں تجھے چین نہیں؟ کس نے مشورہ دیا تھا اس کھسماں نوکھانی خانم کو تیلی لگانے کا......؟''

''تیرے پتر نے مجھے آگ لگائی ماسی، تو میں اسے تیلی بھی نہ لگاتی۔ تجھے پتا ہے کشور سے بات نہیں بنی تو اب خانم کے آرے (دھیان) لگانے لگا ہے۔ صاف میرے منہ پہ کہتا ہے ماسی، تیرا پتر کہ ویاہ کرے گا وہ خانم سے اور مجھے کہتا ہے کہ میں خود تجھے نہ کہہ دوں۔ مجھے بتا ماسی میں کیا اتنی لاوارث ہوں۔ کاش ماسی! میں کل کی مرتی آج مروں تو جا کے اماں کو بتاؤں کہ اس کی دھی کو اس کی بہن اور اس کے پتر نے رول دیا۔ اس کے سوہروں (سسرال) نے ذلیل کر کے رکھ دیا۔''

سنہری ہاتھ میں پکڑا پراندہ زمین پہ مارتی پھپھک کے رونے لگی تو حمیدہ کے دل پہ ہاتھ پڑا۔ مری بہن کو منہ دکھانا تھا۔ انہوں نے لپک کے سنہری کو سینے سے لگایا اور کمر سہلاتے ہوئے بولیں۔

''خیری صلا...... مریں تیرے دشمن میری بچی۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ میں تجھے اس حویلی کی نوبنا کے رہوں گی۔ قاسم کون ہوتا ہے فیصلے کرنے والا۔ کشور ہوتی تو اور بات تھی لیکن اس خانم کی بچی کو تو مر کے بھی اپنے پتر سے نہ بیاہوں۔''

''یعنی ماسی، تو بھی کشور کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہے۔ واہ ماسی! سب مجھ مسکین کو بے وقوف بناتے میرا استعمال کر رہے۔ جب کچھ نہ ملے تو سنہری ہی سہی۔ جانے دے ماسی، مجھے اپنے کمرے میں۔ اپنے نصیبوں کو رونے کے لیے کوئی تھاں تو ہو۔'' وہ کہتی ہوئی ہچکیاں لیتی وہاں سے چل دی تو حمیدہ نے اکتا کے اپنی پیشانی پہ ہاتھ مارا۔

"بھلا ایسا کہنے کی کیا لوڑھ تھی مجھے...... ایک تو ایسی اس ویاہ نے نحوست ڈال رکھی ہے ساری عقل بند ہوگئی ہے۔ اب اس کو منانا بھی ایک سیاپا ہے۔ جان کا عذاب!" حمیدہ بڑبڑاتے ہوئے وہیں بیٹھ گئیں۔

سنہری نے جان بوجھ کے قاسم اور خانم کا ذکر چھیڑا تھا تا کہ اگر ایسا ہو تب بھی حمیدہ کے دل میں ملال رہے کہ سنہری کا دل دکھا کے اپنے بیٹے کا بیاہ کر دیا خانم سے اور ایسا نہ ہو سکا تو قاسم اس کے لیے اس حویلی میں قدم جمانے کے لیے فالتو پرزے کے طور پر موجود رہے جو عین وقت پہ سنہری کے اپنے کام آسکے۔

حسنات کے لیے دل میں مزید زہر بھرے اس نے جلدی سے یہاں سے نکلنے میں عافیت جانی۔ ایک بات تو طے تھی کہ آنے والے وقت میں حسنات اور خانم بھی اس کے بدترین بدلے کی بھینٹ چڑھنے والے تھے۔

☆......☆......☆

باہر خنکی زوروں پہ تھی اور اندر بھی۔ کشور اور خانم رقیہ کی چارپائی پہ اس کی رضائی میں گھسی بیٹھی تھیں۔ رابی کو شام میں مبشر آ کر لے گیا تھا کیونکہ اس کے کپڑوں کا کچھ سامان لانے والا تھا۔ وہ صبح صبح واپسی کا وعدہ کرتی حویلی لکھاں چلی گئی تھی جبکہ کشور نے اسے خوب لتاڑ کے بھیجا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رابی محض سنہری کی حالت زار دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہ رہی تھی۔ اسے اس چیز کی بے حد خوشی تھی کہ حسنات نے اسے اچھا سبق سکھایا تھا۔ اور کشور نہیں چاہتی تھی کہ رابی چڑائے جس سے وہ مزید بدظن ہو کر خرافات کرتی پھرے۔ رابی نے وعدہ کیا تھا لیکن کچا...... اور لوگ تو پکے نہیں نبھاتے کچے کی فکر کون کرتا؟

رقیہ کی گود میں کشور کا سر تھا جس کے نرم ریشمی سیاہ بالوں میں رقیہ بے حد محبت سے انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ہلکے گلابی ڈوروں سے سجی اس کی آنکھیں جو نیند سے بوجھل تھیں، مدھم روشنی میں بے حد خواب ناک لگ رہی تھیں۔ رقیہ نے دل میں اس کی نظر اتاری۔ ساتھ جڑی بیٹھی خانم گود میں مونگ پھلی کو تام چینی کی پلیٹ میں ڈالے کم سے کم آواز پیدا کرتی کھا رہی تھی کیونکہ تھوڑے سے فاصلے پہ چوہدری آفتاب کی چارپائی تھی جس پہ وہ کروٹ لیے سو رہے تھے۔

''کیا بات ہے میری دھی، تھک گئی ہے نا!'' رقیہ نے کشور کے ماتھے کو محبت سے سہلاتے ہوئے پوچھا تو وہ نگاہیں اچکائے ماں کا محبت بھرا چہرہ دیکھ کر بھرائی آواز میں بولی۔

''میں نے کیا کیا ہے اماں، جو تھکوں گی۔ کام تو آپ کے نہیں ختم ہوتے سارا دن، کتنے دن بعد آپ کی گود ملی ہے۔''

''بیٹیوں کے بیاہ بڑے نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ مجھے بھی رب نے یہ وقت دکھایا ہے تو دل کرتا ہے کہ جی بھر کر چاؤ پورے کروں۔ تو تو میری پیاری اور نیک بچی ہے کشور۔ تیرے لیے تو دن رات دل سے دعا نکلتی ہے میرے......''

''اور میں نہیں اچھی...... مجھے روڑی سے اٹھایا تھا ماں......؟'' خانم مونگ پھلی چھیلنا بھول کر ماں کو ٹوک گئی۔ اسے فکر پڑ گئی کہ ماں اس سے کتنا پیار کرتی ہے؟

''یا اللہ! خانم، ہر بات پر جرح نہیں کرتے میری بچی۔ تو تو ہے، کشور کشور ہے۔ یہ بھی میرے دل کا ٹکڑا ہے، اور تو بھی۔ فرق کیا ہے کیا کبھی میں نے دونوں میں؟''

''ہاں ابھی کیا نا...... آپ اس وقت سے آپا کا سر گود میں رکھ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ مجھے ایک بار بھی کہا کہ خانم آ چندا! میری گود میں تو بھی سر رکھ لے۔''

خانم کے ناراض لہجے میں کہنے پر کشور دبی آواز میں ہنسی اور رقیہ کو بھی ہنسی آئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ گھر میں چھوٹی تھی اور سب کی لاڈلی تھی۔ ذرا سی توجہ ہٹی نہیں تو اسے فکر پڑ جاتی تھی کہ کہیں اس کی اہمیت ختم تو نہیں ہو گئی۔

رقیہ نے دوسرے گھٹنے پہ ہاتھ کا اشارہ کیا تو خانم جھٹ پلیٹ سائیڈ پہ رکھ کر ماں کی گود میں سر رکھ گئی۔ کشور نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ رقیہ نے دونوں بچیوں کا جھک کر باری باری ماتھا چوما۔

''کل کو اپنے گھر کی ہو جاؤ گی دونوں ہمیشہ ماں باپ کا سر اونچا رکھنا۔ کہیں کوئی ایسی بات نہ کہنا نہ ایسا کام کرنا جس سے تمہارے باپ کی عزت پہ حرف آئے۔ بہت مشکل سے عزتیں بنتی ہیں بیٹا! برداشت اور تحمل سے کام لینا ہمیشہ۔ کسی کی زیادتی سہہ لینا لیکن کیچڑ کے جواب میں کیچڑ کبھی نہ اچھالنا۔ لوگ ہر طرح

کے ہوتے ہیں اور اتنے سارے لوگوں میں تم دونوں کو کس طرح کا ہونا ہے اس بات کو ذہن میں رکھنا۔کل کو پتا نہیں کیا ہو، کیسے حالات ہوں، بس اتنا دھیان رکھنا کہ ماں باپ کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی اور جب ماں باپ کی دعا ساتھ ہو تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔سمجھیں میری بچیو!''

''اماں!'' خانم نے نیند سے بوجھل بند ہوتی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔رقیہ نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے انگوٹھے سے سہلاتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''اماں! یہ سب جو بھی کہا ہے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اماں! اتنی مشکل باتیں مجھ سے نہ کیا کریں۔''

رقیہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا اور اگلا خانم کے گال پہ مارتیں لیکن کشور نے محبت سے دھیما ہنستے ہوئے اس کے گال پہ پہلے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔رقیہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔پھر لمبی سانس بھر کر کشور سے مخاطب ہوئیں۔

''کل میری دھی کی ہمارے گھر آخری رات ہوگی۔اس کے بعد میری شہزادی سکینہ بھابھی کے گھر کی ملکہ بن جائے گی۔ہمیشہ ماں سی عزت دینا انہیں۔کبھی پلٹ کے جواب نہ دینا اس عورت کو جس کی وجہ سے رب نے ایسا ہیرا شوہر تمہاری جھولی میں ڈالا ہے۔''

کشور شرما کے کروٹ لے کر چہرہ چھپا گئی جبکہ خانم کو سوئے بھی پانچ منٹ گزر چکے ہوں گے۔رقیہ بہت چاہت سے دونوں کو محبت سے سہلا رہی تھیں اور یوں دیکھ رہی تھیں جیسے آنکھوں کی ساری پیاس بجھا لینا چاہتی ہوں۔

قریب چارپائی پہ کروٹ کے بل لیٹے چوہدری آفتاب کی آنکھوں سے خاموش آنسو نکل کر کنپٹی سے ہوتے تکیے میں جذب ہو گئے۔

بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ان سے تعلق بہت منفرد ہوتا ہے۔بیٹیوں سے روح جڑی ہوتی ہے۔کیونکہ وہ بن کہے روح میں اترنے کا فن جانتی ہیں۔پھر بھی کبھی کبھار لگتا ہے بہت سی ان کہی باتیں دلوں میں رہ جاتی ہیں اور وقت گزر جاتا ہے۔

☆......☆......☆

قاسم بے حد رعونت سے شہاب الدین کے سامنے اکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیرے پہ اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ شہاب الدین اتنے محتاط تھے کہ کسی ملازم کو بھی قاسم کی موجودگی میں ڈیرے پہ رہنے نہیں دیتے تھے۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس کے لیے تو وہ اپنے سائے پہ اعتبار نہ کرتے لیکن آج سامنے بھتیجا نہیں شریکا بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ شہاب الدین مسکرائے۔ انہیں قاسم کی یہی باتیں تو بے حد پسند تھیں۔ وہ کھڑک دار تھا۔ وہ اپنی ضد کے آگے کسی بڑے چھوٹے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنے مقصد کے حصول سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ شہاب الدین ترستے تھے کہ ایسی خصوصیات ان کے بیٹوں میں ہوتیں تو انہوں نے برادری کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہوتی۔

''میرا پتر! لگتا ہے اپنے تایا سے ناراض ہے۔ ذرا کم کم متھے لگتا ہے۔ کوئی گل ہے تو دل میں نہ رکھ پتر! تو مجھے ویسے بھی بڑا پیارا ہے میرے مہتاب کی نشانی ہے تو......''

قاسم کا دل تو چاہا کہ منہ پہ صاف سنا دے کہ اسے اپنے تائے کی نیت پہ شک ہو چکا ہے کہ وہ محض اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کا استعمال کر رہا ہے لیکن خاموشی میں مصلحت تھی۔

وہ ابھی کچھ باتوں کو پردے میں رہنے دینا چاہتا تھا۔ خانم کے لیے جو سوچ اس کے دماغ میں سرسرا رہی تھی اسے بھی زبان پہ نہ لانے میں بہتری تھی کیونکہ خانم وہ وار تھی جو اسے موقع پر چلانا تھا تاکہ خالی نہ جائے۔ اسے معلوم تھا تایا شہاب خانم سے شدید چڑ کھاتا ہے اس لیے ابھی سے وہ کوئی ذکر کر کے مفت کا بھاشن سننے کے موڈ میں نہیں تھا اور نہ انہیں ہوشیار کر سکتا تھا۔ یہ بات مصمم تھی کہ اسے اپنے قدم پکے کرنے کے لیے اور اس زمین کا مالک بننے کے لیے کشور یا خانم کا ساتھ چاہیے تھا۔ کشور تو حیات کی ہو چلی تھی لیکن خانم اسے ہر حال میں چاہیے تھی اور تایا شہاب ایسا ہونے دینے میں رکاوٹ ڈال سکتا تھا۔

''کچھ نہیں تایا جی، بس آج کل ابا جی بہت یاد آتے ہیں۔ سوچتا ہوں وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے کہ جس زمین پہ شروع سے ان کی نظر تھی وہ جلد ہی ان کے پتر کی ہونے والی ہے۔''

قاسم نے یہ کہہ کر کن اکھیوں سے شہاب الدین کی جانب دیکھا جو حقے کی نے منہ میں دیے

کھیتوں کی جانب بہت غور سے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی بات سے زیادہ اہم اس وقت یہی کام تھا۔ اسے تاؤ تو بے حد آیا لیکن برداشت کر گیا۔

''آپ مجھے کیوں بلوا رہے تھے، خیریت تھی تایا جی؟'' وہ مطلب کی بات پہ آیا تو شہاب الدین یوں چونکے جیسے نیند سے جاگے ہوں۔

''ہم......ہم......'' ہنکارا بھرا پھر ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔''انتظام مکمل ہیں پتر۔ کوئی کمی تو نہیں رہے گی نا؟''

''کس بات کے......؟ شادی کے یا زمین پہ ہوٹل بنوانے کے؟'' قاسم کے تجاہل عارفانہ سے پوچھنے پر پہلی بار شہاب الدین کو اس پہ غصہ آیا۔ وہ پر جلال لہجے میں گویا ہوئے۔

''پتر! مخول کرنے کا ویلا رہ گیا ہے کیا؟ کل ویاہ شروع ہے اور تو ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔''

''او......اچھا اچھا......وہ والا انتظام......'' قاسم کی اداکاری عروج پہ تھی یا شاید آج وہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ شہاب الدین کو زچ کرے گا۔

''آپ فکر ہی نہ کریں تایا جی۔ اس بار کسی بھی طرح کا کچا کام نہیں کیا میں نے۔ نہ ارادہ ٹوٹے گا نہ نشانہ چوکے گا۔ قاسم اب اتنا ہوشیار ہو گیا ہے کہ کس کو کیسے مات دینی ہے اور کس جگہ لا کر ہرانا ہے اسے سب اندازہ ہے۔ آپ فکر ہی نہ کریں تایا جی!''

اور پہلی بار ایک نامحسوس سی فکر سے تایا جی نے اپنے بھتیجے کو دیکھا تھا۔ قاسم کے لب و لہجے اور تیور دونوں تیورائے ہوئے تھے۔ وہ بات تو مناسب کر رہا تھا لیکن انداز میں کچھ ایسا تھا جو سمجھ میں تو آ رہا تھا لیکن جتایا نہیں جا سکتا تھا۔ شہاب الدین نے ایک آنکھ سکوڑ کر بھتیجے کا زیرک نگاہی سے معائنہ کیا تو کہیں اندر بغاوت کی رمق محسوس ہوئی۔ دنیا تو چوہدری شہاب الدین نے بھی برتی تھی۔ کون سا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، ادراک ہو جاتا تھا۔ یہ تو پھر اپنا خون تھا، ہاتھوں کا پالا ہوا سپنولیا تھا جسے خود انہوں نے سانپ بن کر پالا تھا۔ دونوں کی جبلت میں ڈسنا تھا۔ دونوں کو مفاد سے آگے کچھ عزیز نہیں تھا اور دونوں وقت پڑنے پر ایک دوسرے میں ہی اپنا زہر نکالنے پہ تیار بیٹھے تھے۔ منہ ملاحظے کی چاپلوسی کا

جلد ہی اختتام قریب لگتا تھا۔ شہاب الدین نے گلا کھنکار کر لہجے میں کھڑاک پیدا کیا اور بولے۔

''پٹواری سے کہہ مجھے ملے آ کر پتر، جلد از جلد زمین نام چڑھا دے میرے تو اچھا ہے۔ کسی کو کہنے جوگا تو ہوں کہ آفتاب نے اپنی مرضی سے مجھے دی تھی۔''

قاسم کو آگ لگ گئی۔ پہلے تائے کا ارادہ کشور کے جہیز میں اس زمین کا مطالبہ کرنے کا تھا۔ اب ایک دم سے بالا ہی بالا پٹواری سے ساز باز کر کے زمین اپنے نام چڑھانے لگا تھا۔

''سو پاپی مرے ہوں گے تو میرا یہ تایا جنما ہوگا۔'' قاسم نے دل میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلتا ہوں تایا جی، شادی کے ایک آدھ کام آفتاب چاچا نے ڈالے ہیں ذمے، وہ دیکھ لوں ذرا۔ کل پھر ویاہ شروع ہو جانا ہے۔''

کہہ کر وہ رکا نہیں اور سلام لیتا وہاں سے چل دیا۔ گاڑی میں بیٹھنے تک شہاب الدین اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتے رہے اور جب اس کی گاڑی دھول اڑانے لگی تو حقہ گڑگڑاتے ہوئے بڑبڑائے۔

''جو مرضی کر لے تو پترا! تیرا ویاہ نہ کشور سے ہونے دیا ہے نہ خانم سے ہونے دوں گا۔ اور نہ اس زمین تک تیرے ہتھ آنے دوں گا۔ تو ابھی اپنے تائے کو جانتا نہیں شہزادے...... دشمنی پہ آؤں تو اپنی سگی اولاد نہ دیکھوں، تو تو پھر میرا بھتیجا ہے۔ تیرے پر کترنا کون سا میرے لیے اوکھا ہے؟''

انہوں نے اطمینان سے کش لیا اور آنکھیں موند لیں۔ چہرے پہ رعونت، خباثت کے ساتھ گھل مل کر الگ چھب دکھلا رہی تھی۔

جب دلوں میں میل، طبیعتوں میں ضد اور لفظوں میں مقابلہ آ جائے تو یہ تینوں جیت جاتے ہیں، بس صرف تعلقات اور رشتے ہار جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں میں کمال خوشی کا دن چڑھا تھا۔ ہر طرف خوش گوار افراتفری پھیلی تھی۔ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا اور سب ایک دوسرے کی سنتے ہوئے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ آج حویلی لکھاں کی اگلی نسل کے پہلے سپوت کی شادی تھی۔

مہندی مایوں بھی ایک ہی رسم کو کہا جاتا تھا۔ جوان بچے بچیاں زیادہ خوش ہوتے تھے جبکہ بڑے بزرگوں کے لیے اگلے دو دنوں کی فکر زیادہ بھاری ہوتی تھی۔ انہیں کھانے پانی اور مہمانوں کے رہنے کی سہولتوں کی فکر رہا کرتی۔ لڑکی والے سارے پنڈ کے لاڈلے بن جاتے تھے۔ بیٹی سب کی سانجھی ہوا کرتی تھی۔ ہمسائے پل پل کی خبر گیری کرتے۔ کھانے پینے کی کسی چیز کی کمی سے لے کر بستروں کی فراہمی تک کا ذمہ اٹھا لیتے تھے۔ مہمان تقسیم ہو جایا کرتے۔ ہمسائے بخوشی کسی مامی، چاچی یا پھپھی کو رات ٹھہرانے اپنے ہاں لے جاتے اور اپنے مہمان کی طرح خاطر سیوا کرتے۔ سادے لوگ ابھی باقی تھے لہٰذا زمانہ سادگی کو ملحوظ رکھے ہوئے تھا۔

حویلی لکھاں کے مہمان تھوڑے وہیں اور تھوڑے چھوٹی حویلی میں تھے کیونکہ مشترکہ رشتے داریاں تھیں اور مرد حضرات ڈیرے پہ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ خوب رونق میلہ لگا تھا۔ لڑکیوں کی تیاریاں عروج پہ تھیں اور لڑکے بھی اسٹائل مارنے کے لیے پر جوش تھے۔

حسنات نے سب کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبھی پھپھو قدسیہ کی حویلی میں گھسا سب کے کان کھا رہا تھا تو کبھی چھوٹی حویلی پہنچا ہوتا تھا۔ اور وہاں بزرگ عورتوں کے درمیان بیٹھ کر ان سے گپیں لگاتا پایا جاتا۔ سبھی اس کی باتوں پہ خوب ہنستیں اور محبت سے اسے ہلکے ہلکے ہاتھ بھی جڑ دیتیں۔

رقیہ کب سے دیکھ رہی تھیں اس کی شرارتیں۔ خود وہ بھی مصروف ایک پاؤں پہ چکرا رہی تھیں۔ ان کی بیٹی کی مایوں تھی آج ان کا دل بیک وقت نرم گرم اور خوشی کے احساسات سے لبریز تھا۔ بار بار آنکھیں بھر آتیں لیکن وہ خود پہ قابو رکھے ہوئے تھیں۔ حسنات کو اشارے سے پاس بلایا اور کچن میں لے گئیں۔

”میرا پتر! کیوں مخول کر رہا ہے سب کے ساتھ۔ دیکھ کیسے نظریں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی ہیں ساری تجھے۔ اللہ نہ کرے نظر لگ گئی تو......! تیرا خون شروع سے ہلکا ہے میرا بچہ......!“

”چاچی! میرے رشتوں کی لائن لگنے والی ہے۔ دیکھنا کل تک یہ سب کی سب میرے لیے اماں کو رشتہ دیں گی۔“ حسنات نے اطمینان سے ماچس کے ساتھ چولہا جلایا اور پانی سے بھرا ساس پین اوپر رکھا۔ اسے یقیناً چائے کی طلب تھی۔

رقیہ کھلکھلا کے ہنسیں اور بولیں۔

''سکینہ بھرجائی کو بتاؤں گی ان کا پتر کیا گل کھلا رہا یہاں، تو دیکھو کیسے سارے رشتے ایک ساتھ ہی ہوتے تیرے......'' اور پھر دھیان آنے پہ اسے ٹوکا۔

''آرام سے جلایا کر پتر۔ یہ سلنڈر موئے بم ہوتے ہیں۔ بس پلے پڑ گئے ہیں ورنہ میرا جی کرتا ہے تیل والا چولہا ہی منگوا لوں واپس۔'' ملازمہ کو چائے کا کہہ کر اسے دوبارہ دیکھا جو سیلنڈر چیک کر کے تسلی کر رہا تھا۔

''کچھ نہیں چاچی! سب خیر ہے۔ اچھی نسل کے ہیں سلنڈر، کچھ نہیں ہوتا، کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں گھبراتی ہیں۔ شیر بنا کریں۔''

''میں چاچی ہی اچھی پتر، مجھے شیر نہ بنا۔ اور چل اپنے چاچے کے کمرے میں۔ ان سے مل کر وہیں ناشتا کر۔''

''میں اپنی بھرجائی سے ملوں گا پہلے۔ اس کے بعد سب سے ملاقات ہو گی چاچی۔ ویسے چاچا جی سے لمبی باتیں کرنی ہیں۔''

''او پتر! مایوں بیٹھی دلہن نہیں دیکھتے۔ کشور تو چار دن سے کمرے کے اندر ہے۔''

''توبہ ہے چاچی! اب کون سا زمانہ ہے ایسے ڈک (چھپا) کے رکھنے کا۔ میں تو ملوں گا اور ضرور ملوں گا۔ میری بھرجائی سے پہلے آپا ہے میری وہ۔''

اور وہ حسنات ہی کیا جو کسی کی پہلی بار میں سن لے۔ رقیہ آوازیں دیتی رہ گئیں اور وہ سیدھا کشور کے کمرے کی جانب نکل گیا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اس کے لبوں پہ مسکان تھی۔ خیال تھا خانم دروازہ کھولے گی اور آج اسے ستانے کا موقع بھی تھا دستور بھی۔ لیکن دروازہ رابی نے کھولا اور کھولتے ساتھ ہی بند کرنے لگی تھی کہ حسنات نے اپنا کھیڑی والا پاؤں دروازے میں دے کر اسے روک دیا۔

رابی چلچلاتی ہوئی بولی۔

''کیا حسنات لالہ! کوئی نہیں دیکھنا آپا کو۔ بھلا پردہ بھی کوئی شے ہوتا ہے۔''

''پردہ بھائی سے نہیں ہوتا، ہٹو پرے اور تم ابھی تو حویلی میں تھیں، ایک دم یہاں کہاں سے ٹپک پڑیں۔ چھلاوی......'' اسے باتوں میں لگا تا اندر داخل ہوا تو کشور نے جو ہلکے کچے پیلے دوپٹے کی بکل مارے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کا دروازہ کھولے ہوئے تھی حسنات کی آواز سنتے ہی اس کی طرف رخ کیے اسے اندر آتا دیکھ کر نفی میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو ''یہ باز نہیں آسکتا۔''

اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھتے حسنات لپک کر اس کے نزدیک آیا اور پاس پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ کشور اپنے آپ میں مزید سمٹ گئی۔ ٹھوڑی تھرکنے لگی جو رو دینے کی واضح نشانی تھی۔

''لو بھلا بتاؤ، میں اپنی آپا کو رلانے نہیں آیا۔ خبردار، جو میرے سامنے روئیں تو۔ میں تو بتانے آیا تھا کہ حیات بھاء کی شیروانی چھپا آیا ہوں۔ ساری حویلی میں ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے۔ اب آرام سے جب واپس جاؤں گا تو تھوڑی دیر سوؤں گا اور شام کے بعد نکال دوں گا پیٹی میں سے۔ سوچو آپا، اس وقت اپنے حیات لالے کا غصے اور پریشانی سے کیسا حشر ہو رہا ہو گا۔ تصور کرو بس۔ جیسے آپریشن کے دوران کسی مریض کو انیستھیزیا کا اثر ختم ہو جائے اور ہوش آتے ہی اسے پتا چلے کہ ابھی آپریشن چل رہا تھا۔''

روتے کو ہنسانا اور سوتے کو جگانا حسنات کو یہ ہنر قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ کشور اور رابی دونوں کھلکھلا کر ہنسیں۔ رابی تو حسنات کے پیروں میں چھسکڑا مار کر بیٹھ گئی تا کہ مزید خرافات سن سکے۔

''سچی حسنات لالہ، تباہی ہیں آپ تباہی۔ میں کہتی ہوں جس کی آپ سے شادی ہونی ہے اس نے روتے روتے ہنسنا ہے اور ہنستے ہنستے رونا ہے۔''

رابی کشور کے گھٹنے پہ کہنی ٹکاتی ذرا ڈھیلی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے آرام مل رہا تھا نہ نیند پوری ہو پا رہی تھی۔ چھوٹی سی لڑکی نے بیچ میں کئی ذمہ داریاں بانٹ رکھی تھیں۔ کشور نے محبت سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں کو اوپر کیا تو اس کی آنکھیں دوبارہ بھر آگئیں۔ حسنات نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور خانم کا پوچھا۔

''اپنی خانم زبیدہ خالہ کی بیٹیوں کے ساتھ چھت والے کمرے میں ہے۔ وہاں سبھی لڑکیاں مہندی لگوا رہی ہیں۔ نیچے مردوں کا آنا جانا ہے تو رقیہ مامی نے سب کو اوپر چڑھا دیا۔''

رابی کے مفصل جواب نے حسنات کو بدمزا کر دیا۔ وہ اپنی پری کو دیکھے بنا واپس حویلی چلا جاتا تو دن بھر بے چین سا رہتا لیکن اوپر بھی وہ نہیں جا سکتا تھا۔ دونوں سے دو باتیں مزید کرتا وہ چوہدری آفتاب کے کمرے کی جانب چل دیا۔ اندر داخل ہوا تو وہ مصروف سے کوئی رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ اسے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے ملے، زور سے گلے لگایا۔ ماتھا چوم کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کون سے کھاتے کھولے بیٹھے ہیں چچا!'' اس نے پیر لمبے کرتے ہوئے رجسٹر کو بغور دیکھا۔

''کوئی سے بھی نہیں۔ ایسے ہی کچھ حساب کتاب نمٹانے والے رہتے ہیں۔ وہ دیکھ رہا ہوں۔ کشور کی رخصتی سے پہلے پہلے انہیں چکتا کر دوں تا کہ اس بوجھ سے نجات ملے!''

''ایسی بھی کیا مجبوری ہے چچا، کہیں لے کر بھاگ رہے ہیں ہم کسی کے پیسے۔ سکون سے شادی کے بعد دے دیجیے گا۔ ابھی سو خرچے سر پر کھڑے ہیں ان کی فکر کریں۔ اس ادائی کو آپ کا جوائی دیکھ لے گا۔ اب وہی آپ کا بیٹا ہے۔''

چوہدری آفتاب نے نہایت محبت سے اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ ان کی پریشانی کو اپنی سمجھ کر پریشان ہوتا تھا۔ ہمیشہ ان کی ذمہ داریوں کو اپنا جان کر اٹھتا تھا اور یہ خوبی دونوں بھائیوں میں تھی۔ حیات کے انداز میں ڈھکا چھپا پن تھا اور حسنات کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ بس یہی فرق تھا دونوں میں......

''چچا!'' حسنات آگے کو جھک کر سنجیدہ انداز میں گویا ہوا۔ ''اس زمین کا پکا بندوبست کیا ہے آپ نے یا نہیں؟ میں نے پچھلی بار آپ کو بتایا تھا نا کہ قاسم اور ابا جی کی نیت ٹھیک نہیں اس کے حوالے سے۔''

چوہدری آفتاب اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ وہ کسی بیٹے کی طرح فکر مند تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتے کہ اس زمین کے لیے پٹواری بک چکا ہے۔ وہ زمین محض کاغذوں کی حد تک ان کے نام تھی وگرنہ اس کی نہایت خاموشی سے پیمائش کی جا چکی تھی۔ شہر سے ایک کنسٹرکشن کمپنی بھی اسے آ کر دیکھ کے جا چکی تھی۔ صرف کاغذات ہی تو تھے جن کو چوہدری شہاب حاصل نہیں کر پا رہے تھے ورنہ تو وہ ایک طرح سے قابض تھے۔ اور وہ کاغذات انہوں نے کبھی ہاتھ لگنے دینے بھی نہیں تھے۔ اتنا تو وہ جانتے تھے کہ چوہدری شہاب شادی کے ساتھ اس زمین کو مشروط کریں گے۔ لیکن وہ مصمم ارادہ کیے

ہوئے تھے کہ وہ جان کے بدلے بھی یہ زمین انہیں نہیں دیں گے جہاں انہوں نے اپنے ابا جی کے نام کا مدرسہ اور مسجد بنوانے کا عہد کیا تھا۔ وسوسوں نے دل و دماغ میں جو آج کل جنگ چھیڑ رکھی تھی اس کا کسی سے ذکر کرتے بھی تو کیا۔ بنا ثبوت کے بات کرنا خود کو ذلیل کروانے جیسا تھا۔ حالانکہ جو کچھ چوہدری شہاب اور قاسم کر رہے تھے وہ سب ان کے اوپر صبح روشن کی مانند آشکار تھا۔

''چچا!'' حسنات نے ان کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکے اور اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ حسنات کو وہ غائب دماغ سے لگے۔

''کیا بات ہے چچا! کچھ ہے تو چھپائیں نہیں۔ میں اور حیات بھاء آپ کے حق کے لیے جان لڑا دیں گے لیکن ابا جی کو کوئی غلط کام نہیں کرنے دیں گے۔ زمینیں جب حق مار کر غصب کی جاتی ہیں تو ان کے طوق کئی نسلوں کے گلوں میں پڑتے ہیں۔ اور میں آنے والے وقت میں یہ طوق اپنی اولادوں کے گلے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''نہیں میرا پتر! ایویں جذباتی نہیں ہوتے۔ رب اچھا کرے گا۔ مجھے بس تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیسی بات؟ جو کہیں گے کروں گا۔''

''ایک وعدہ کر میرے ساتھ۔''

''سو وعدے لے لیں۔''

''یہ ایک ہی سو کے برابر ہے حسنات پتر......!''

''میں پورا کروں گا۔''

چوہدری آفتاب کچھ دیر خاموش ہو کر اس کا چہرہ جانچتے رہے پھر اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر کچھ کہنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اپنی بات مکمل کرتے جا رہے تھے حسنات کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ وعدہ کر چکا تھا اور مرد وعدے نہیں توڑا کرتے۔

☆......☆......☆

کچھ راتیں اپنے ساتھ ایسی سیاہی لے کر آتی ہیں جو کسی اژدھے کی طرح سب کچھ نگل جاتی ہیں۔ رات جو جرم کی گواہ ہوتی ہے۔ رات جو مجرم کی پہچان رکھتی ہے۔ رات جو حادثے سینے میں چھپائے ہوتی ہے۔ جیسے ہی حالات سازگار دیکھتی ہے ان تینوں کو اکٹھا کر دیتی ہے اور پھر یک لخت سب بدل جاتا ہے۔ زندگیاں الٹ پلٹ جاتی ہیں۔ رونقیں چلی جاتی ہیں۔ شام غریباں مقدر بن جایا کرتی ہیں۔

لیکن یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ جرم کتنی بھی صفائی، احتیاط اور منصوبہ بندی سے کیا جائے، وہ چھپتا نہیں۔ جرم بولتا ہے اور اپنے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا کے دم لیتا ہے۔

❁ ❁

قسط نمبر 13

چوہدری شہاب الدین نے شہر سے ڈھول والے بلوائے تھے۔ اگر انہوں نے کہا تھا کہ گج وج کے بیاہ کرنا ہے تو وہ کر رہے تھے۔ اس قدر تام جھام اور ہنگامہ تھا کہ یوں لگتا پورا پنڈ ہی شادی کی تقریب بن چکا ہے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے افراد حویلی لکھا کے قرب و جوار میں لگے تمبو قناتوں کے اندر مسلسل پکنے والے پکوانوں اور ڈھولچیوں کی دھمالوں سے لطف اندوز ہونے وہاں موجود نہیں تھے۔ ہر کسی کو مصروف کر دیا تھا چوہدری شہاب الدین نے، سب پوری طرح تقریبات میں غرق تھے۔

آج چوہدری حیات کی مایوں تھی۔ اس کے شہر سے آئے دوست اور دور دراز کے کزنوں نے مل کر الگ محفل سجا رکھی تھی۔ سب باری باری بھنگڑے ڈالتے اور ایک دوسرے کو بازو اور ٹانگوں سے پکڑ کر فضا میں اچھالتے۔ قہقہوں اور خوشیوں کا طوفان تھا جو ابھی تھم نہیں رہا تھا اور اپنے بعد آنے والی خاموشی کا منتظر تھا۔ جوں جوں شام ڈھل رہی تھی، روشنیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ مووی بنانے والا شہر سے دو دن پہلے کا آ چکا تھا جسے صرف مردوں کی فلم بنانے کے لیے بلوایا گیا تھا۔

پنڈوں میں ابھی شادی کی مووی‌یوں کا رواج کم تھا، اس لیے مردوں کے لیے بھی یہ اچنبھے کی بات تھی۔ خاندان کے بزرگ توبہ استغفار کرتے اور اس کے حرام ہونے کے پر دلائل وعظ دے کر ادھر ادھر ہو جاتے جبکہ درمیانی عمر اور نوجوانی کو چھوتے لڑکوں کے لیے گویا اپنا ہنر آزمانے کا وقت تھا۔ اپنی خوب صورتی دنیا کو دکھانے کا وقت تھا۔ تیل سے چپڑے بال جو گردن تک آتے تھے اور انہیں نیچے سے کنڈل پڑتے تھے۔ سامنے سے سانولے ماتھے پہ تیل سے تر بتر پف پھینکا جا رہا تھا۔ تیکھے رنگ کے شلوار کرتے اور واسکٹیں پہنے گلے میں چیک والے مسٹرڈ یا کالے سفید مفلر لپیٹے گاؤں کے شوقینوں کی

ٹولیاں تمبوؤں کے اندر گویا فیشن شو میں حصہ لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔

پان سے ہونٹوں کے کنارے رنگین تھے اور اپنے تئیں یہ حسن کا موجب تھے۔ کچھ من چلوں نے سرمے کی دھاریاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ سب ہی گول دائروں میں گروپوں کی شکل میں سرخ ریگزین والی لوہے کی کرسیوں پہ بیٹھے بات بے بات ہنستے اور ایک دوسرے پر ٹھٹھے کستے خود کو دانش ور محسوس کر رہے تھے۔

کہیں بزرگوں کی ٹولیاں تہ بند، پگڑیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے چوہدری شہاب الدین کی عقل پہ ماتم کر رہی تھیں جسے شہر کی ہوا پنڈ بیٹھے لگ گئی تھی۔ بھلا پہلے کب کسی کی شادی میں مشین اٹھائے کوئی تصویریں بنانے پہنچے تھے۔ کئی تو اس شادی کے بعد باقاعدہ ناراضی کا اظہار کرنے والے تھے اور کسی کا خیال تھا کہ شہاب الدین جیسے اتھرے کے منہ کیا لگنا جس نے کبھی کسی کی نہیں سنی۔

ان میں زیادہ تر چوہدری آفتاب کی خاطر آئے تھے جن کی عزت پوری برادری کرتی تھی۔ پھر بیٹی کا دھن تھا جو سانجھا ہوتا ہے اور بیٹیوں والوں کے لیے تو پنڈ والے جان بھی دے دیتے۔ اچھے اور بھلے وقتوں کی سوچیں اور روایتیں تھیں جن میں سیندھ لگ چکی تھی لیکن ابھی پھیلی نہیں تھی۔

حویلی کے اندر معمول کی روشنیوں سے زیادہ چراغاں تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں چھوٹی حویلی مہندی لے جانے کو تیار تھیں اور سب نے ہی بھڑکتے اور چمکیلے لباسوں پہ چادریں برقعے اوڑھ لیے تھے۔ پردے والیاں پردے میں ہی وہاں جاتیں۔ جو پردہ نہیں کرتی تھیں، وہ بھی چادریں اوڑھ کر راستہ طے کرتیں۔ اگر چوہدری آفتاب چھوٹی حویلی شفٹ نہ ہوتے تو کسی کو دقت نہ ہوتی۔ اندر ہی ایک جگہ مہندی کا فنکشن نبٹ جاتا لیکن اب چونکہ راستہ طے کرنا تھا اور برادری کی عورتوں میں بزرگ عورتیں پرانے ذہن کی تھیں، اس لیے چوہدری شہاب الدین کی عقل کو کوس رہی تھیں۔

سکینہ خاموشی سے سب کے فضیحتے سن رہی تھیں۔ انہیں کون سا اچھا لگ رہا تھا یوں مہندی کے تھال اٹھائے چھوٹی حویلی جانا، لیکن بچیوں کا شوق تھا اور وہ کشور کی مہندی لے کر جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے اب اہتمام کے ساتھ عورتوں اور لڑکیوں کا ٹولہ نکلنے والا تھا۔ ساتھ گھر کے مرد بھی ہمراہ تھے جن میں

سرفہرست حسنات تھا۔ خالص عورتوں کی شمولیت کی رسم تھی لہٰذا حویلی کے مردوں میں سے صرف حسنات اور پھپھو قدسیہ کے دونوں چھوٹے لڑکے اور چند سمجھ دار اور سوبر سے برادری کے لڑکے تھے تا کہ راستے میں راکھی ہو سکے۔

رابی کی محنت کا منہ بولتا ثبوت اس وقت لڑکیوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں تھا۔ انتہائی نفاست اور خوب صورتی سے سجائی گئی پلیٹیں اور تھال لیے عورتیں بالکل تیار کھڑی تھیں۔ رابی نے وہ تھال پکڑ نا تھا جس میں کشور کا مہندی کا جوڑا اور ہار سنگھار کا سامان تھا۔ حمیدہ چاچی بھی مارے باندھے ساتھ ہو لی تھیں۔ بہترین شاموز سلک کا ہلکے جامنی رنگ کا جوڑا جس پہ تلے کا کام تھا، زیب تن کیے وہ پیشانی پہ ڈھیروں بل لیے برادری کی عورتوں کے بیچ کھڑے ہوئے اپنے سسرالی رونے رو رہی تھیں جو وہ سدا سے روتی آئی تھیں۔ موقع محل انہوں نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا تو اب تو موقع اور دستور دونوں ہی بر محل تھے۔ ان کی بے چین نگاہیں سنہری کو بھی ساتھ ساتھ ڈھونڈ رہی تھیں جس کو بے حد جتنوں سے انہوں نے ساتھ چلنے پہ آمادہ کیا تھا۔

رابی سب ہی لڑکیوں کی ترتیب درست کر چکی تھی۔ نارنجی اور گہرے جامنی رنگ کے گھاگرے کرتی کے ساتھ لمبا چوڑا پراندہ ڈالے آج رابی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ اپنی عمر سے بڑی بھی لگ رہی تھی اور بے حد حسین بھی۔ برادری ہی کی عورتوں نے اس پہ نگاہ رکھ لی تھی۔ تب ہی اچانک حمیدہ چاچی کے حصے سے سنہری برآمد ہوئی۔ تیز آتشی اور توتا رنگ کا شرارہ پہنے تیز میک اپ کیے، جس سے گالوں کا بلش آن زیادہ نمایاں تھا۔ توتے رنگ کا پراندہ آگے ڈال رکھا تھا۔ آتشی چوڑیاں اور آتشی ہی چمک دار درمیانی ہیل والے جوتے۔ کچھ ثانیے کے لیے سب ہی کی نگاہیں اس پر جم گئی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے جو رنگ استعمال کیے تھے، وہ اس قدر تیکھے تھے کہ وہ کہیں بھی کھڑی ہو جاتی مرکز نگاہ لازمی بنتی۔ لیکن رابی کی نگاہ کسی اور وجہ سے جمی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں وہ تھال تھام رکھا تھا جس میں کشور کے شگنوں کا سامان تھا۔

رابی کے تن بدن میں شرارے دوڑ گئے تھے۔ یعنی کہ جرأتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ اس کا دل

کرتا تو کسی بھی چیز پہ حق جما لیتی۔ یا کسی کی اجازت کے بنا کچھ بھی اٹھا لیتی۔ خانم کے ساتھ کی جانے والی حرکت کا غصہ ابھی دل میں ابل رہا تھا، وہ ختم نہیں ہوا تھا کہ سامنے ایسا منظر سہارنا ناقابل برداشت تھا۔ وہ تن فن کرتی اس کے سر پر پہنچی اور تھال کو ایک جھٹکے سے تھاما لیکن کھینچنے سے اجتناب کیا کیونکہ اس وقت سب ہی عورتیں سنہری کے زرق برق کپڑوں کو دیکھ رہی تھیں اور رابی کے قریب جانے سے لامحالہ سب کی نگاہیں اس کی جانب بھی ہو گئی تھیں اور وہ سنہری کو لڑنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

''ارے بہت اچھا کیا، میں بھی بس اسے ہی لینے اندر جا رہی تھی......'' رابی نے خوب صورت سنہری تھال جو رنگ برنگی جھالروں اور گوٹے اور شیشوں سے مزین تھا، تھام کر ایک ایک لفظ جیسے چبایا تھا۔ سنہری نے تھال نہیں چھوڑا بلکہ اسے مزید مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔

''یہ تمہارے لیے نہیں لائی۔ اسے میں لے کر جاؤں گی چھوٹی حویلی، چھوڑو اسے......''

''میں تمہارا منہ نہ توڑ دوں گی جو تم لے کر جانے کا سوچو بھی تو...... اپنے ناپاک ہاتھ اس سے دور ہی رکھو، سمجھیں!'' رابی نے تھال کو دوبارہ کھینچا لیکن سنہری کی گرفت سخت ہی رہی۔

''تھال تو میں ہی لے کر جاؤں گی، جو مرضی کر لو۔ میں بھی کزن ہی لگتی ہوں کشور کی۔ میرا بھی حق بنتا ہے کہ میں بھی ہر چیز میں سے حصہ لوں۔''

اس کے آخری جملے کی معنی خیزی پہ رابی تلملائی۔

''تمہارے حصے تو بس ذلالت اور رسوائی ہے سنہری، وہ تمہیں قسطوں میں ملتی رہے گی۔''

''اپنی بکواس بند کرو۔ یہ تو وقت بتائے گا میرا حصہ کس چیز میں ہے؟ تم لوگوں کے حصے میں کچھ آنے دیا، تب کہنا مجھے...... سنہری تو اپنے نام کی نہیں نکلی......!''

''لگتا ہے تمہیں قسطوں میں ذلالت نہیں بھا رہی، تمہارا حساب ایک ہی دفعہ میں چکتا کرنا چاہیے۔'' رابی نے دھیمے لہجے میں دھمکاتے ہوئے ایک دم گیٹ کی جانب منہ کیا اور اونچی آواز میں پکاری۔ ''حسنات لالہ......!''

تھال ایک دم سنہری کے ہاتھ سے چھوٹا اور رابی نے اسے فوراً اس سے دور کر کے اپنے اور اس

کے بیچ فاصلہ قائم کیا۔ سامان پہ پڑا خوب صورت مکیش کے کام سے سجا نارنجی دوپٹا اٹھا کر چیزوں کا معائنہ کیا اور فاتحانہ نگاہوں سے سنہری کو دیکھا۔

''اب ذرا پرے رہنا، ہم سے پنگے لوگی تو تمہاری اوقات یاد دلاتی رہوں گی تمہیں۔ اور تمہاری اوقات بس حسنات لالہ کے نام کی پکار سے ہی اپنا پتا دے دیتی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ تھال لے کر سب لڑکیوں کے بیچ میں جا ملی جو دلچسپی سے ان دونوں کے دبے دبے مکالمے کو دور سے دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھ میں رات بھر باتیں کرنے کے لیے موضوع آچکا تھا۔ سب لڑکیاں الرٹ پوزیشن میں نکلنے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

فاصلے پہ سنہری خون کے گھونٹ بھرتی رابی اور اس تھال کو بے بس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے خود پہ انتہائی غصہ آرہا تھا کہ حسنات نہ ہو گیا، بلا ہو گیا جو اس کے نام کی محض پکار نے اس کے ہاتھوں کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا۔

وہ نہیں جانتی تھی حسنات ہی وہ واحد بلا تھا جو اس کے پیچھے مرتے دم تک پڑا رہے گا۔

☆......☆......☆

چھوٹی حویلی کی رونقیں اپنے عروج پہ تھیں۔ چھت پہ مہمان خواتین کا جم غفیر تھا جو منڈیروں پہ کھڑے ہوئے آنے والی مہندی کا انتظار کر رہی تھیں۔ نیچے گیٹ سے لے کر دور کھوہ والی پگڈنڈی تک قناتیں لگا کر راہداری بنائی گئی تھی۔ بجلی کا ایک لمبا تار کھینچ کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیلے گول بلب روشنی کے مقصد سے لگائے گئے تھے۔ لڑکیاں، بچیاں اور درمیانی عمر کی عورتیں دونوں طرف قطار میں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں سے بھری پلیٹیں لیے کھڑی تھیں۔ تاکہ مہندی لانے والوں کا استقبال ہو سکے۔ سارے میں دھوم تو مچ چکی تھی کہ چوہدری شہاب الدین نے شہر سے کیمرے والا بلوایا ہے تاکہ پتر کے ویاہ کی فلم بنوا سکیں۔

یہاں موجود مہمان عورتیں زبان سے توبہ توبہ کر رہی تھیں اور دل میں کمینی سی خواہش سب ہی کے انگڑائیاں لے رہی تھی کہ کاش فلم والا ساتھ ہی آئے۔ اس چکر میں سب ہی اپنا ہار سنگھار ہاتھوں سے تھپتھپا

کے تسلی کر رہی تھیں۔ کیا پتا فلم والا سچ میں آ جائے اور ان کا چہرہ اسے ایسا بھائے کہ ساری فلم میں اوپر والے بائیں یا دائیں کونے میں ہر دو منٹ کے وقفے سے ان کی تصویر کسی پھول کی مانند کھلتی دکھائی دے۔

لیکن سب کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی جب عورتیں اور چند حویلی کے مرد بنا فلم والے کے آتے دکھائی دیے۔ ان میں محض حسنات، مدثر اور اس سے چھوٹا قدسیہ پھپھو کا بیٹا اور چند دیگر رشتے دار لڑکے تھے۔ راستے میں قاسم آملا تھا جو کہ خاصے اچنبھے کی بات تھی اور حسنات کو نہ ہضم ہو رہی تھی، نہ گوارا۔ مدثر بھی حیران تھا لیکن قاسم کا اور اس کی عمر کا فرق تھا اس لیے کوئی یارانہ بھی نہیں تھا لہٰذا اس کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔

سارے میں مہندی آنے کا شور مچ گیا۔ سب ہی نے پوزیشنیں تو سنبھال لیں لیکن اب میک اپ کی تہ اور کپڑوں کی شکنیں چیک کر کے کیا کرنا تھا۔

''شکر اے چنگا ہو گیا فلم والا نہیں آیا۔ پیو دے پیو تو پتا چلدا تے فلم توڑ دینی تھی اوناں نے......'' چیختے رنگ کا گولڈن لباس زیب تن کیے، پہلو میں بچہ اٹھائے اس عورت کے چہرے پہ سب سے زیادہ موٹی تہ تھی بیس کی اور گردن اور ہاتھوں کا رنگ سیاہی مائل بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔

''تے ہور کی میری تو نونذر (ناخن) بھی بنو کے ابا کسی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ فلم والا آتا تو انہوں نے اس کی آنکھیں نکال دینی تھیں۔''

دونوں خواتین دلوں میں فلم نہ بننے کے ملال کو حلال کر رہی تھیں۔ اتنے میں باہر قناتوں سے پرے پٹاخے اور انار پھوٹنے کا شور بلند ہوا۔ یکا یک سارا آسمان اور نیچے زمین گلنار ہو گئی۔ چھت پہ کھڑی عورتوں اور لڑکیوں کی موج لگ گئی۔ ایک ساتھ ایسے پٹاخے پورے پنڈ میں ابھی تک کسی نے پھوٹتے نہ دیکھے ہوں گے۔ سیڑھیوں پہ دگڑ دگڑ مچی اوپر جانے کے لیے۔ چھت پہ رش بڑھنے لگا۔ اور باہر حسنات نے مدثر وغیرہ کے ساتھ مل کر انار کی لمبی قطار کو آگ دکھا دی۔ سب ہی ایک ساتھ جل اٹھے اور یہ منظر اتنا حسین لگا کہ جنہیں یہ خرافات نہیں بھی پسند تھیں دو پل کے لیے ان کی آنکھیں بھی مبہوت ہو گئیں۔

مبہوت تو حسنات کی نگاہیں بھی ہوئی تھیں۔ جلتے اناروں کی روشنی کے پار ایسا حسین چہرہ دکھائی دے رہا تھا جس کے آگے ان اناروں کی روشنی پھیکی محسوس ہوئی۔ گہرے سبز اور سرخ رنگ کے امتزاج

کا شرارہ کرتی اور سر پر بے حد سلیقے اور خوب صورتی سے ٹشو کے سبز دوپٹے کا پلو پنوں سے سیٹ کیے اور دوسرا پلو سینے پہ پھیلائے اس پہ ایک جانب شیشوں اور گھنگھروؤں سے سجا پراندہ ڈالے ثانوی سے میک اپ میں کاجل کی موتی دھار سے آنکھوں کو جلا بخشے خانم کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اتنی ڈھیروں کانچ کی چوڑیاں تھیں کہ آستین تنگ ہو چکی تھی۔ پیروں میں کھسہ اور مہندی سے سجے ہاتھوں میں پھولوں سے بھری پلیٹ جس کی پتیاں اس نے شوق میں اپنے سر پہ بھی گرا رکھی تھیں۔

یہ اس کی پری تھی یا کوئی اپسرا...... حسنات کو بھول گیا تھا کہ اسے ابھی انار جلانے تھے۔ اسے یہ بھی بھول گیا تھا اسے یہاں سے سیدھا مردانے میں جانا ہے۔ وہ یک ٹک خانم کو دیکھتا ناک کی سیدھ میں اس کی جانب چلتا چلا گیا۔ مدثر اور دوسرے لڑکوں نے آواز بھی دی لیکن اس نے سنی کب تھی۔ رابی پہلے ہی خانم کے ساتھ کھڑی اس کے گلے مل کر اسے سراہ رہی تھی۔ وہ خانم کے قریب آیا تو کئی عورتیں اور لڑکیاں اس کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔ خانم کو اس کی آنکھیں عجیب لگیں۔ وہ جو جوش میں آگے ہو کر سلام لینے لگی تھی، وہیں تھم گئی۔

رابی بھی چونک کر حسنات کو دیکھ رہی تھی اور وہ رابی تھی۔ اسے ادراک ہو گیا تھا حسنات کی سٹی گم ہو چکی ہے اور اس لمحے جس بات کا اسے گمان تھا، وہ حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے تھی۔ پچھلے کئی مناظر یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے اس کے ذہن کے پردے پہ لہرائے جب اسے شک ہوا تھا کہ حسنات لالہ خانم کے لیے خاص جذبات رکھتے ہیں جو ویسے نہیں ہیں جیسے ایک بھائی کے بہن کے لیے ہوں یا ان کے رابی کے لیے تھے لیکن اس نے ایسی ویسی کوئی بات نہ منہ سے نکالی تھی نہ خانم کو کچھ محسوس کروایا تھا پر اس وقت جو وہ دیکھ رہی تھی، اس کے لیے ایکسرے کی ضرورت نہ تھی، سب کچھ بالکل واضح تھا۔

اسے حیرانی سے زیادہ سکتہ ہوا تھا۔ ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ہمیں کسی شے کے ہونے کا یقین ہوتا ہے لیکن جب وہ ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتی ہے تب ہمیں ایک بار دھچکا ضرور لگتا ہے۔ ایسا ہی دھچکا رابی کو لگا تھا اور اس دھچکے کے زیر اثر کتنی ہی دیر اس کی زبان گنگ رہی جب تک کہ حسنات

قریب آ کر خانم سے بولا۔

''پری! یہ کیا لگ رہی ہو تم۔ حد ہے...... کوئی بہن کی شادی پہ اتنا برا تیار ہوتا ہے کیا۔ مجھے امید تھی کہ پری آج اصلی والی پری لگ رہی ہو گی لیکن تم نے تو میری امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ چچ چچ چچ...... بھیانک بہت بھیانک......!''

کہاں کا جوش، کیسی خوشی...... خانم کا چہرہ جیسے کسی نے پل بھر میں نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس بری طرح سے دل ٹوٹا کہ زبان گنگ ہو گئی۔ آنکھیں پانیوں سے بھریں تو وہ اچٹتی نگاہ ارد گرد ڈالتی سر جھکائے فوراً وہاں سے نکل گئی۔

رابی پریشان سی منہ کھولے صورت حال ہی سمجھنے کی کوشش میں تھی۔ مطلب کیا واقعی حسنات لالہ نے خانم کو ایسے خاص موقعے پر رلا دیا تھا۔ حسنات نے جب خانم کو اندر کہیں گم ہوتے دیکھا تو اطمینان سے واپس پلٹنے لگا، تب ہی رابی نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

''محبت کرنے والے دل نہیں توڑتے حسنات لالہ......!''

حسنات کے قدم تھمے......

آنکھیں سکوڑیں اور مڑ کر رابی کو ٹٹولتی نگاہوں سے گھورا۔

''یہ کس ناول میں پڑھا ہے اور پہلے تو یہ بتاؤ ناول پڑھنے کب سے شروع کیے تم دونوں نے۔ کیا پری کو بھی یہ لت لگی ہوئی ہے؟''

''بات کو ٹالیں نہیں لالہ! آپ نے کیسے خانم کا دل توڑ کر رکھ دیا۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی وہ۔ آپ نے اس کی بہن کی شادی والے دن اس کا دل ایسے دکھا دیا۔ جس دن سے آئے ہیں، اسے رلا ہی رہے ہیں لالہ آپ...... جس سے محبت ہو، اسے رلانا اچھی بات تو نہیں ہے۔ یہ کسی ناول میں نہیں پڑھا میں نے، بلکہ ابھی ابھی آپ کی آنکھوں کی داستان سب مہمانوں نے پڑھ لی ہو گی حسنات لالہ۔''

دو پل کے لیے حسنات کی بولتی بند ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ بے خودی میں وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ برادری کی عورتیں تیتر کا بٹیر اور پر کا کوا بنانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ اس کی خیر تھی لیکن خانم ابھی بہت

چھوٹی تھی۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کرتا کہ اس کی جانب انگلی اٹھے۔ پہلی بار رابی اسے خود سے زیادہ عقل مند لگی۔ اس نے گردن سہلاتے ہوئے طائرانہ نگاہ ارد گرد روش پہ ڈالی جہاں اکثریت اسے ہی دیکھ رہی تھی، اور بڑبڑایا۔

''عقل ماؤف ہو گئی میڈیکل پڑھ پڑھ کر میاں تیری...... اب ایک بچی تجھے عقل کی باتیں سکھائے گی۔''

''بچی بچی مت کریں حسنات لالہ، نہ میں بچی ہوں کہ آپ کی دلچسپی نہ سمجھوں، نہ خانم بچی ہے کہ آپ کی نظریں نہ سمجھے۔ میں جا رہی ہوں اپنی سہیلی کو ڈھونڈنے...... پتا نہیں کس کونے میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہو گی۔''

رابی اپنا شرارہ سنبھالتی حسنات کو تادیبی نگاہوں سے گھورتی وہاں سے اندر چلی گئی۔ حسنات نے گلے میں لپیٹے پیلے اور نارنجی دوپٹے کو کھول کر اسے جھٹکا اور واپس گردن کے گرد ڈھیلے انداز میں لپیٹتا دوستوں کی جانب چل دیا جہاں ابھی بھی پٹاخے اور انار پورے زور و شور سے جلائے جا رہے تھے۔ وہیں اس نے قاسم کو دیکھا جو سینے پہ ہاتھ باندھے سنجیدہ چہرے کے ساتھ ایک جانب کھڑا گاہے بگاہے عورتوں کی جانب متلاشی نگاہ ڈال رہا تھا۔ حسنات کا رواں رواں سلگ سا گیا۔ اس کے دماغ میں سنہری کی بات گونجی۔ ایک متنفر نگاہ اس پہ ڈال کر وہ دوستوں کے بیچ آ کھڑا ہوا۔ لیکن نگاہوں کے پردے پر خانم کا دلکش روپ سرسرا کر دل گدگدا رہا تھا۔

جب لڑکوں نے خوب شوق پورا کر لیا تو اندر صحن میں کشور کی مایوں کی رسم کا آغاز ہوا۔ حسنات مدثر کے ساتھ بے حد چالاکی اور خاموشی سے پچھلی جانب سے کسی طرح چھت پہ پہنچ چکا تھا۔ سب ہی عورتیں اور بچے اب رسم کے لیے نیچے اتر چکے تھے اس لیے وہ دونوں تسلی سے بنیرے کی اوٹ میں بیٹھے اس کے بیچ بنی جھریوں سے نیچے جھانک رہے تھے۔ ویسے بھی نیچے اتنی روشنی تھی کہ اوپر وہ سیدھے بھی کھڑے ہو جاتے تو چکا چوند کی وجہ سے ان دونوں پہ نگاہ پڑنا مشکل تھا۔

کچھ ہی دیر میں سجے سجائے پیڑھے پہ کشور کو لا کر بٹھایا گیا اور بلاشبہ پیڑھے کو بہترین انداز میں

رابی اور خانم نے سجایا تھا۔ سب سے پہلے سکینہ نے اس کے ہاتھوں پہ مہندی لگا کے اور بالوں میں تیل مل کر رسم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس کے بعد بس کشور تھی اور لاتعداد ہاتھ تھے جو اسے مشق ستم بنائے ہوئے تھے۔ حسنات کو یہ سب دیکھنے میں خوب مزا آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مسلسل خانم کو ڈھونڈ رہی تھیں، تب ہی سنہری دکھائی دی۔ اس کی چمک بھڑک دیکھ کر اسے ہنسی آئی۔ وہ مدثر کو ٹہوکا مارتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھ چم چم، زہر میں ڈوبی ہوئی......!''

مدثر نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''قاسم بھاء سے ہمدردی ہوتی ہے مجھے۔ ایسی بلا وہ بھی راہ چلتے گلے پڑنی ہے ان کے......''

''دعا کر اسی کے پڑے۔ راہ چلتی کو وہ اور اس کی والدہ ماجدہ حویلی اٹھا کر لائے ہیں تو یہ راہ چلتی انہی کا راستہ کاٹے۔ باقی کسی پہ اس کا سایہ نہ پڑے۔''

وہ نخوت سے اسے بغور دیکھ رہا تھا کیونکہ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اور پھر ایک جانب دیکھتے سنہری کی باچھیں چر گئیں۔ حسنات نے فوراً اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خانم رابی کے ساتھ باہر آ رہی تھی لیکن سادے پیلے شلوار قمیص پہ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ۔ یہاں تک کہ چوڑیاں بھی اتار دی تھیں۔

حسنات کے دل کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اسے پہلی بار اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ خانم کو یوں دیکھ کر سنہری کیسی چہکی تھی۔ معلوم تھا نا کہ اس کی موجودگی میں خود کی دال گلنی ممکن نہیں۔ پر ابھی بھی خانم کے شفاف اور خوب صورت چہرے کو بہت سی نگاہوں نے اچھے سے دیکھا تھا۔

سنہری کا گھٹیا جگت نما ہنسی مذاق سارے صحن میں گونج رہا تھا۔ کچھ عورتیں اسے ناگواری سے دیکھ رہی تھیں تو کچھ لطف اٹھا رہی تھیں۔ نوجوان اور چلبلی لڑکیاں اس سے متاثر ہوتے ہوئے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی ہو چکی تھیں۔ اور اب وہ اپنی بے ڈھنگی اور فضول گوئی سے سب کے بیچ یوں گردن اکڑائے بڑکیں مار رہی تھی جیسے خاص اس کے دم سے تو سارے میں رونق تھی۔ رابی بھی خانم کی وجہ سے چپ چپ سی محسوس ہوئی۔

حسنات خود کو، اپنی خود غرضی پہ کوس رہا تھا۔ محض اس لیے کہ اس کی پری انتہا کی خوب صورت لگ رہی تھی اور اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ کوئی برادری کی عورت بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی، اس نے ایسی بات کہی کہ وہ نا صرف لباس تبدیل کر آئی تھی بلکہ چہرہ بھی دھو آئی تھی۔

پنڈوں میں ایک شادی کئی رشتے طے ہونے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اسے پری کو کسی کی نگاہوں میں نہیں لانا تھا۔ دوسرا اس نے اسے قاسم کی نظروں سے اوجھل کیا تھا۔ گو کہ وہ ہر دن ایسا کیسے کر سکتا تھا لیکن آج اگر داؤ لگ گیا تھا تو اس نے لگا لیا تھا۔ قاسم جو سوچ اس کی پری کے متعلق سوچ بیٹھا تھا، وہ اس کی جڑ کاٹ دینا چاہتا تھا۔ سنہری نے اپنی کمینگی میں اسے آگاہ کر کے بھلا کیا تھا۔ وہ ہوشیار ہو گیا تھا ورنہ اسے قاسم کی جانب سے ایسا کوئی گمان نہیں تھا کہ وہ خانم پہ نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

یہی سب اس کے دماغ میں چل رہا تھا جس کے زیر اثر اس نے خانم کا دل توڑا اور نتیجہ اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ چھوٹے سے دل کی اور چھوٹی سی عقل کی سادی لڑکی تھی۔ گہرائی میں جانے کی بجائے بس رونے دھونے والی...... یہ اور بات کہ اب اسے رہ رہ کر ملال ہو رہا تھا۔ اس نے خانم کی آج کی رات خراب کر دی تھی۔

☆......☆......☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پنڈوں دیہاتوں میں بارہ بج جانا سمجھو آدھی رات کا بیت جانا ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی زیادہ سے زیادہ دس گیارہ بجے تک سب کچھ سمیٹ سمٹا دیا جاتا تھا۔ چھوٹی حویلی میں سارے مہمان میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ تھکاوٹ نے سب ہی کو بستروں میں دبکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

رابی اور خانم چونکہ امتحانات کے دنوں میں بھی رات دیر تک جاگ کر پڑھا کرتی تھیں، اور سوئی ہوئی کشور کو جگا کر ترلے مار کر اس سے چائے بنوایا کرتی تھیں، اس لیے عادت کے مطابق دونوں پیٹیوں والے کمرے میں ایک مدقوق سا بلب جلائے پیٹی کے اوپر چڑھ کر بیٹھی تھیں۔ سامنے پلیٹوں میں مٹھائی اور چاول پڑے تھے جو رابی خانم کے لیے لائی تھی۔ جانتی تھی صبح کا ناشتا بھی اس نے ٹھیک

سے نہیں کیا تھا۔ چائے کے بھرے ہوئے مگ دیکھ کر خانم بھی رہ نہیں سکی اور بس وہی اٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی ساتھ آنسو پیتی رہی۔

رابی کو اس پہ ترس بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔ بلاوجہ دل برداشتہ ہو کر جگہ چھوڑ دینے والے لوگ اسے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ تو جب جب قدم اکھڑے تھے۔ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر کھڑی ہو جاتی تھی جبکہ خانم کو ایک ہلکا سا جھونکا ہی منظر سے غائب کرنے کے لیے کافی تھا۔

''شرافت سے کھانا کھالو ورنہ ابھی مامی جی کو اٹھا لاؤں گی خانم۔ بہت ہو گیا رونا دھونا بس کرو اب مفت میں اپنا فنکشن خراب کیا تم نے......!''

''مفت میں نہیں ہے رابی...... سوچو حسنات لالہ کو کتنی بری لگی میں کہ انہوں نے وقت اور موقعے کا بھی لحاظ نہیں کیا اور سب کے سامنے مجھے ایسے کہہ دیا۔'' زور سے ناک سڑک کر چائے کا گھونٹ بھرتے وہ بولی تو رابی چڑ گئی۔

''گندی! ایسے نہ کرو، اور حسنات لالہ کی چالاکی نئی تو نہیں ہے خانم! تمہیں ہمیشہ سے تنگ کرتے آئے ہیں۔ تھوڑی بڑی ہو جاؤ میری بہن۔ حسنات لالہ کو تم بری نہیں لگیں، بلکہ اتنی اچھی لگیں کہ انہوں نے تمہارے حسن کا سوا ستیاناس کروا دیا۔''

''کیا مطلب اچھی لگی؟'' خانم چڑی۔ ''اچھی لگی ہوتی تو انہوں نے میری تعریف کی ہوتی نا رابی! میں نے کتنے شوق سے شرارہ پہنا تھا رابی اور انہوں نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں۔''

''گدھی! وہ تمہیں ہی تو دیکھتے رہ گئے تھے اور جیسے خود دیکھتے رہ گئے ویسے کوئی اور نہ دیکھے اس لیے انہوں نے تمہیں حسب عادت دو باتیں لگائیں جو تم نے جھٹ کے دل سے لگا لیں اور جا کے منہ جھاڑ بن کے واپس آ گئیں۔ اپنا نقصان کیا تم نے......''

خانم بغور اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ دونوں کتنی ہی دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے خاموش راز کہتی رہیں، پھر رابی کے حلق سے تو قہقہہ نکلا لیکن خانم کھسیا کر گھٹنوں میں سر دبا گئی۔

''قسم سے بہت بڑا سیاپا پڑے گا خانم حویلی لکھاں کی دیواریں لرزنے والی ہیں۔ ماموں

شہاب کا بلڈ پریشر آسمان کو چھونے والا ہے۔ ایک تاریخ رقم ہوگی حویلی لکھاں میں اور وہ رقم کریں گے حسنات لالہ، جو سب سے ٹکرانے والے ہیں اپنی محبت کی خاطر......"

"منہ بند کرلو رابی......" خانم نے سہم کے فوراً اسے ٹوکا جس کی آواز جوش میں اونچی ہو چلی تھی۔

"کسی نے سن لیا تو ایک تاریخ پیٹیوں والے کمرے میں رقم ہو جائے گی۔"

خانم اس کے منہ پہ اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولی تو رابی نے اپنی آنکھیں پٹپٹا کے اسے حیرت سے دیکھا جیسے اسے ایسے جملے کی اس سے توقع نہ ہو۔ خانم شرمندہ سی ہوتی اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی اور پھر دونوں واپس اپنے دوپٹے کے پلو منہ میں دیے ہنستی چلی گئیں۔

"کمینی ہو بہت، میسنی، گھنی......" رابی نے ہنستے ہوئے اسے دھموکا جڑا۔ کچھ ہنسیاں کانچ کی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی فضا میں بکھرتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں۔ فنا ہو جاتی ہیں!

☆......☆......☆

اگلا دن چڑھ چکا تھا۔ رشتے دار احباب سویرے ہی اٹھ چکے تھے۔ میزبانوں نے مہمانوں کی خاطریں شروع کر دی تھیں۔ سب انتظامات بہترین تھے۔ شہاب الدین نے رات بھی اپنے ڈیرے پہ گزاری تھی اور ابھی تک وہیں تھے۔ طبیعت کی بے چینی انہیں سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ قاسم کا انتظار کر رہے تھے۔

جیسے ہی انہیں آتا دکھائی دیا وہ فوراً اٹھے اور ایک طرف بنے چھوٹے سے کمرے میں چلے گئے۔ قاسم بھی ان کے پیچھے اندر گھس گیا۔ کچھ دیر دونوں کے بیچ وہیں مذاکرات چلتے رہے پھر شہاب الدین قدرے متفکر سے باہر آئے۔

"گل تو وہی ہوگئی نا قاسم پتر...... دیہاڑی تو لنگ جانی ہے نا آج کی، اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔"

"تایا جی، پروہنوں کو نکلنے دیں۔ ورنہ ایک منٹ میں شک ہو جائے گا۔ ایسے تو سب کو لگے گا پروہنوں میں سے ہی کسی کا کام ہے۔ سانپ ماریں اور لاٹھی دفنا دیں تایا جی۔ ورنہ لاٹھی نہ بھی ٹوٹی نا تب بھی اس کا نظر آجانا ہی ہمیں پھنسا سکتا ہے۔"

''میں تنگ آ گیا ہوں پتر ا۔ کب اس سانپ کا سر کچلا جائے گا۔ جوانی سے بڑھاپا آ گیا ابھی تک کھا رہا ہے ہمیں اور تو ہے کہ اس کا مکو نہیں ٹھپ سکا۔''

''حوصلہ کر جائیں تایا جی۔ کل بارات کا دن نکل جانے دیں۔ آدھے سے زیادہ مہمان ٹرٹرا جائیں گے۔ چھوٹی حویلی تو بالکل خالی ہو جاتی ہے کیونکہ ولیمہ کھانے سب نے حویلی میں اکٹھے ہو جانا ہے۔ اس لیے وہ وقت بہترین ہوگا۔''

''پھر تو کہے گا ولیمہ بھی کر لیں......'' شہاب الدین بگڑے۔

''کر بھی لیں تو کیا حرج ہے تایا جی۔ آپ کے پہلے پتر کا ویاہ ہے۔ اس کا دل ٹوٹ جانا ہے جب اس کا دن دیہاڑ ایوں خراب ہوگا تو......''

''بک مت اوئے......'' شہاب الدین کو تو غصہ ہی آ گیا۔ قاسم نے بمشکل ضبط کیا۔ ''آگے کہہ دیکھیں کہ پہلا بچہ بھی ہو جانے دوں تب دیکھ لیں گے۔''

شہاب الدین کا بس نہ چل رہا تھا کہ قاسم کی ہی گردن مار دیں کس قدر ہلکا لے لیا تھا اس نے سارا معاملہ۔

''ہو جائے گا تایا جی، آپ کے پتر کو ولیمہ کرنا نصیب نہیں ہوگا میرا وعدہ ہے آپ سے......''

قاسم نے دوٹوک کہہ کر بات ختم کی اور چادر کا پلو جھٹک کر دوبارہ سے کندھے پہ پھیلایا۔ ایک گہری نگاہ نالے پہ ڈالی اور ایک جانب چلتا پگڈنڈی کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ کچھ فاصلے پہ جا کے وہاں کھڑا اس کا کاما اس کے ساتھ مل گیا۔

چوہدری شہاب الدین نے تنفر سے اس جانب تب تک دیکھا جب تک نگاہ تھک نہیں گئی اور پھر ملازم کو آواز دی۔ انہیں بھی اب کوٹھی واپس جانا تھا۔ سویرے ان کے پتر کی جنج تھی اور یہ کوئی عام موقع نہیں تھا۔ اس ایک جنج سے کئی سلسلے جڑے تھے۔ لالچ کے، حرص کے، طمع کے، ہوس کے، بے حسی کے، بدباطنی کے، ظلم کے اور کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کے۔

☆......☆......☆

وقت ایک ایسا چکر ہے جو کبھی نہیں رکتا۔ یہ چکر اپنے اندر سب کی زندگیاں لپیٹ کر لے جاتا ہے اور خود چلتا رہتا ہے۔ زندگیاں چکر میں پستے پستے سکھ دکھ سہتے معدوم ہو جاتی ہیں اور پھر نئی زندگیاں آتی ہیں اور وہ بھی مٹ جاتی ہیں۔ وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے اور تغیرات سہتے سہتے ان گنت زندگیاں وقت کے سینے پہ تمغوں کی مانند سجتی چلی جاتی ہیں۔ ایک دن ہم سب باری باری اس چکر کا حصہ بن جائیں گے اور ہمارے بعد آنے والوں کو ہمارا نام، مقام، کام کچھ یاد نہیں ہوگا۔ وہ دکھ جو ہم نے سہا، ہمارا ہی ہوگا اور وہ سکھ جو ہمارے نام کا تھا، اس میں بہت سے لوگ حصے دار کہلائیں گے......!

حویلی لکھاں ایک نئی تاریخ رقم کرنے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی چوہدری شہاب الدین جیسے لوگوں کو دیکھ کر خیال ضرور آتا ہے کہ فرعون کی باقیات جیسے ساری دنیا میں ان جیسے لوگوں کی صورت میں تقسیم ہو گئیں۔ جلاد صفت، خود غرض اور خود کو خدا سمجھ لینے والے متکبر لوگ جن کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے لیے اکثر مظلوم ہی زندہ نہیں بچتے لیکن جہنم میں اپنا نصاب پورا کرنے کے لیے یہ لوگ کئی سالوں جیتے ہیں اور سب کا جینا حرام کرتے ہیں......!

آج چوہدری حیات راؤ کی بارات تھی۔ کیسا کمال کا دن تھا سب کے لیے......سب خوش تھے اور اس کا اظہار اس طرح ہوا تھا کہ رات بھر کوئی مارے خوشی کے سو نہیں سکا تھا۔

لڑکوں نے ساری رات حیات کے کمرے میں غل غپاڑہ مچا کر رکھا تھا۔ حیات کے شہری دوست بھی موجود تھے جو اس کے اسکول کالج کے ساتھی تھے۔ اور شہریوں کے مزاج اور طرح کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کسی کو سونے نہیں دیا تھا۔ کبھی ڈیک لگا کر پنجابی گانوں پہ بھنگڑے ڈالے گئے تو کبھی نئے سرے سے کھانے پینے کے دور چلتے رہے۔

حیات بھی مخل نہیں ہو سکا کیونکہ وہ سب شہر سے خاص اس کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور سب اس کی خوشی میں حصہ لے رہے تھے۔ حسنات البتہ ایسے تماشوں سے بے حد راضی رہتا تھا۔ اس کا مزاج ہلے گلے والا تھا۔ وہ خود ناچنے کا شوقین نہیں تھا لیکن نچانے کا ضرور تھا۔ ایسی ہلا شیری دیتا تھا کہ سب ہی پاگل ہوئے ایک دوسرے پہ چڑھ چڑھ گئے اور خود وہ مبشر اور حیات کے بیچ بیٹھا

ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ اسے ہمیشہ اپنے وقار کا خیال رہا تھا۔ کبھی ایسا کام نہیں کرتا تھا جو سب ہی کر رہے ہوں اور وہ دوسروں کی نگاہ میں عامیانہ ہو۔ اس معاملے میں دونوں بھائی محتاط تھے۔

رات بھیگتی رہی اور رونقیں جوان ہو کر پگھلتے پگھلتے معدوم ہو گئیں۔ صبح تک پورا کمرا میدان جنگ لگ رہا تھا جہاں پیر رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہر طرف بندے اور گندے برتن پڑے تھے۔ سب سے پہلے حیات کی آنکھ کھلی تھی اور وہ وقت دیکھ کر چھلانگ لگاتا واش روم میں بھاگا تھا۔ فجر کی نماز کا تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا اور وہ نماز باجماعت پڑھنے کا عادی تھا۔ جیسے ہی وہ ٹوپی پہن کر باہر نکلا، گیٹ کی جانب اس کے بڑھتے قدم اچانک سے رکے تھے۔ قاسم اس وقت کسی کی جیپ سے اتر رہا تھا اور جیپ چلانے والا شخص حیات نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ فوراً اوٹ میں ہوا تھا۔ کھلی اور خاموش فضا تھی۔ اسے بس اتنی ہی سمجھ آسکی تھی کہ قاسم نے اسے کسی بات کے لیے تنبیہ کی تھی۔

”پیسوں کی طرف سے سکون کرنا ابھی اپنی زبان کے پکے رہو۔ ایک بار کام ہو گیا تو جتنے کہے ہیں، اس سے چار اوپر ہی دوں گا۔ اب نکلو یہاں سے۔ دن نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ، شکل نہ دیکھے کوئی تمہاری......!“

جیپ وہاں سے چلی گئی تھی اور قاسم بے حد محتاط سا اندر داخل ہوتا یہاں وہاں دیکھتا سیدھا اپنے حصے کی جانب چلا گیا۔ حیات کے ماتھے پہ تفکر کے بل پڑے تھے۔ کچھ تو ایسا تھا جو سامنے تھا لیکن پھر بھی دکھائی نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ بے حد تھکے اعصاب کے ساتھ مسجد کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

چھوٹی حویلی کے پچھلے لیکن سب سے بڑے کمرے میں بیٹھی کشور پہ ٹوٹ کے روپ آیا تھا۔ سرخ اناری رنگ کا لہنگا اور گھٹنوں کو چھوتی کرتی پہنے، ماتھے پہ چوڑا ٹیکا اور چوتھائی پیشانی کو ڈھکتا جھومر، ناک میں نتھ ڈالے جس کی موتیوں کی لڑی اس کے قرمزی گال کو چھوتی کان میں پہنے بڑے سے جڑاؤ جھمکے سے جڑی تھی۔ آنکھیں شرم و حیا اور افشاں سے بوجھل تھیں جن کے غلافی پپوٹوں پہ ہلکا سرخ اور سنہری رنگ مل کر انہیں مزید خوب صورت بنایا گیا تھا۔ کاجل اور لائنر کی دھاریاں اس کی

بادامی آنکھوں کو مزید جلا بخش رہی تھیں۔ گالوں پہ سرخ غازہ بے حد مناسب انداز میں بہار دکھا رہا تھا۔ ہونٹ سرخ لپ اسٹک سے رنگے تھے۔ خوب صورت گردن میں گلوبند کے ساتھ کی طرح کے دلکش ڈیزائن والی مالائیں اور رانی ہار نے جیسے اسے جواہرات میں پرو دیا تھا۔ بھر بھر کے کلائیوں میں سونے کی باریک کنگنیاں اور ان کے آگے پیچھے موٹے پیچ دار طلائی کنگنوں کی عجب چھب تھی۔ مخروطی انگلیوں والے گورے سپید ہاتھ پنج انگلے سے ڈھکے تھے اور ناخنوں کے اردگرد کی انگلیاں سرخ مہندی سے بجی انتہائی دیدہ زیب لگ رہی تھیں۔

پور پور وہ بہترین زیورات اور لباس سے بجی حویلی لکھاں کے چوہدریوں کی نئی پود کی پہلی تو وہ ہی لگ رہی تھی۔ اس زمانے میں جتنا بھی زیور چڑھایا جاتا وہ سب کا سب تن پہ سجایا جاتا تھا ورنہ برادری باتیں کرتی تھی۔ کشور کو بھی سکینہ نے سونے میں تول دیا تھا۔ اس قدر سونا اس نے پہن رکھا تھا کہ نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اس پر اس کا دو آتشہ روپ...... نگاہوں کو جھلاہٹ تھی کہ اس کی موہنی صورت دیکھیں یا سولہ سنگھار۔ شہر سے بہترین پارلر والی بلوائی گئی تھی جس نے کشور کو تیار کیا تھا۔ یہ بھی حویلی لکھاں کی بہو کے لیے پہلی بار ہوا تھا اور خوب ہوا تھا۔ کشور کے حقیقی حسن کو مصنوعی سنگھار نے چار چاند لگا دیے تھے۔ نگاہیں جھکائے جگہ جگہ سے افشاں سے چمکتے بالوں پہ کرن اور تلے کے کام سے بھرا دوپٹا سجائے وہ سیدھی نگاہوں میں اتر رہی تھی۔

بزرگ مہمان خواتین نے خود اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اس پہ ایک ہلکی سی چادر اوڑھا دی تھی تاکہ دلہن نظر بد کا شکار نہ ہو اور رقیہ کے نزدیک اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی آج خائف سی تھیں۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ کر مسل رکھا تھا۔ کشور کے کمرے میں بار بار آتیں اور اس پہ دم کرتیں اور پھر چلی جاتیں۔ خانم اور رانی کا آج پتا ہی نہیں تھا۔ کب سے ڈھونڈ رہی تھیں وہ انہیں لیکن یہ دونوں لڑکیاں آج ملنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ کتنے ہی چھوٹے چھوٹے کام ان دونوں کے ذمے تھے لیکن اپنی تیاری کی خاطر اڑن چھو ہو گئی تھیں۔ دل تھا کہ بھر بھر آ رہا تھا۔ انہیں شدت سے اپنے غم خوار کی طلب ہو رہی تھی۔

چوہدری آفتاب آج تڑکے سے ہی انہیں نہیں دکھائی دیے تھے۔ وہ اندر زنان خانے میں اس

وقت آتے جاتے ہوتے تو کتنی ہی دھیمی سی تسلیاں ان کے کانوں میں انڈیل چکے ہوتے۔ ان کے ہاتھ تھام کر حوصلہ دیتے اور ہمت بندھاتے، دل کر رہا تھا بس ایک بار وہ اندر آئیں اور انہیں دیکھ جائیں، یا وہ انہیں دیکھ لیں۔ عجیب ہی کیفیت تھی جسے وہ بیان نہیں کر سکتی تھیں۔ بس محسوس ہو رہی تھی اور بے طرح ہو رہی تھی۔

وقت بیت رہا تھا اور مہمانوں کا جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ لڑکیاں اپنے بہترین لباس پہنے دلہن کے کمرے میں جمع تھیں جسے آج چھوٹی حویلی کے سب سے بڑے کمرے میں اسی غرض سے بٹھایا گیا تھا کہ لڑکیوں نے باز تو آنا نہیں تھا کہ اسے تنہا چھوڑ دیتیں۔ لہٰذا کھلی اور کشادہ جگہ بٹھانے سے کم از کم کشور کی طبیعت مکدر نہیں ہو گی۔ آنسو مسلسل اس کی بھی پلکیں بھگوئے ہوئے تھے۔ ماں کا سینہ چاہیے تھا اور ماں کو ایک پل کی فرصت نہیں تھی۔

سب تیاریاں مکمل تھیں اور جیسے ہی عصر کی نماز ہوئی، سب میں جیسے جان پڑ گئی۔ مغرب ہوتے ہی بارات آ جانی تھی اور سب اب صحن اور باہر لگے تمبو قناتوں میں جمع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ بتیاں روشن ہونے لگی تھیں۔ حالانکہ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا۔ تب ہی چھت کی سیڑھیوں سے رابی اور خانم نیچے آتی دکھائی دیں۔ کتنی ہی گردنیں اوپر اٹھی تھیں۔ لڑکیوں کے سینے حسد اور رشک سے بھر گئے۔ وہ دونوں یوں لگ رہا تھا جیسے اپسرائیں اوپر سے نیچے آ رہی تھیں۔ اتنا تیار وہ دونوں ہی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

رابی نے گلابی اور فیروزی کے کنٹراسٹ میں کلیوں والا فراک اور چوڑی پاجامہ پہن رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کے میچنگ چوڑیاں اور ہلکا ہلکا سا میک اپ جوان کی عمر اور ماحول کے عین مطابق لگ رہا تھا۔ نوعمری کا حسن زیادہ آرائشوں کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ ساتھ اترتی خانم کی الگ ہی چھب تھی۔ میرون اور گہرے نیلے امتزاج کا لمبا کلیوں والا فراک اور ساتھ میرون چوڑی پاجامہ...... کلائیوں میں میرون چوڑیاں کانوں میں میرون آویزے...... بالوں کو آدھا باندھ کے گھنگھرو پرو رکھے تھے۔ لمبی سیاہ آبشار آج نرالی لے میں بہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیروں کاجل اور گالوں پہ ہلکی ہلکی سرخی، اس کے ہم رنگ ہلکے رنگ سے رنگے ہونٹ، گھنی اور لمبی پلکوں کو مسکارے نے مزید نمایاں

کر دیا تھا۔ آنکھیں اٹھ رہی تھیں تو کمال کر رہی تھیں، جھک رہی تھیں تو غضب ڈھا رہی تھیں۔ رشک و حسد سے بھری نگاہوں نے نیچے اتر آنے تک انہیں بغور دیکھا تھا۔

اگلا مرحلہ دونوں کے لیے ہمیشہ کی طرح الجھن آمیز تھا لیکن اس مرحلے سے گزرنا لازم و ملزوم ہوا کرتا ہے۔ وہ تھا سب بزرگ خواتین سے باری باری ملنا، حال احوال پوچھنا اور نئے سرے سے اپنا بھی بتانا۔ حالانکہ ایک رات پہلے بھی یہی خواتین تھیں اور انہی سے ملاقات بھی ہو چکی تھی لیکن دن اگلا تھا اس لیے ملنا بھی نیا والا تھا۔

اس بات کا احساس تھا کہ سب ہی کی نگاہیں ان دونوں پر ہیں، اس لیے خفت سے گال تمتما رہے تھے۔ شرم بھی آ رہی تھی اور کوفت الگ تھی لہٰذا دونوں جلدی جلدی سب سے ملتے ملاتے اندر کشور کے کمرے کی جانب بھاگیں۔ ان کے جاتے ہی جیسے فسوں ٹوٹا اور سب ہی حرکت میں آ گئیں۔ لڑکیوں بالیوں نے گروہوں کی صورت میں کونوں سے لگتے ان کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا شروع کیا۔

”توبہ.....کیسی تیز ہیں۔ ہمیں تو اماں نے کبھی ایسے کپڑے نہیں پہننے دیے۔“

”تو اور کیا......ابھی سے ان کو کتنی آخر نے اٹھایا ہوا ہے۔ عمریں دیکھو پندرہ کی نہیں ہوئیں پوری اور نخرے دیکھو......!“

”میں تو کہتی ہوں سب حویلی لکھاں کے مردوں کی چھوٹ ہے۔ ویسے یہ خانم والے رنگ کا جوڑا میں گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ پتا ہوتا تو لے آتی، ڈٹ کے پہنتی میں بھی......“

”میٹرک کا رزلٹ آ لینے دو پھر دیکھنا کتنے پر پرزے نکلتے ان دونوں کے۔ میری اماں تو کہتی ہیں وہ میرے بڑے ویر کے لیے خانم کا رشتہ مانگ لیں گی۔ جب ہمارے ہاں آ جائے گی تو تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔“

ایسی ہی ملتی جلتی گفتگو عورتوں اور بچیوں میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتی تھی اور شادی کی تقریب بھی مکمل ہو جاتی تھی۔

ہماری زندگی کا حصہ بن چکا ہے کہ ہمیں اگر چار بندوں میں کھڑے ہو کر اپنی اہمیت جتانی ہے تو

اس کے لیے کسی کی غیبت اور چغلی بہترین ہتھیار ہے ورنہ آپ اس گروپ میں کھڑے سب سے بے کار انسان ہیں۔ آپ کو موقعے کی مناسبت سے کسی کے بخیے ادھیڑنے آنے چاہییں ورنہ آپ کے خود کے سارے تروپے لوگ کھول کر رکھ دیں گے۔

کشور کے پاس الگ ہی رونق لگی تھی۔ رقیہ بھی وہیں تھیں اور قدسیہ پھپھو بھی موجود تھیں جو بیٹی کی ودائی کی وجہ سے رقیہ کے ساتھ موجود تھیں۔ انہوں نے ایسے حساس موقع پر لڑکی والوں کے ساتھ رہنا منظور کیا تھا۔

خانم اور رابی کو آتا دیکھ کر انہوں نے انگلیاں دانتوں میں دبالی تھیں۔ دوبار پلکیں جھپکیں تب یقین آیا کہ ایک ان کی اپنی بیٹی ہے تو دوسری خانم ہے۔ ایسی حسین لگ رہی تھیں کہ اپنی ہی نظر لگ جانے کا خدشہ ہوا تھا۔ فوراً اٹھیں اور ان کے پاس آکر بدبدائیں۔

''مرن جوگیو! کیوں انت نے اٹھایا ہوا ہے۔ نظریں لگ جائیں گی۔ شریکا سارا اکٹھا ہے تم دونوں کو باتیں کرے گا۔ جاؤ تھوڑا منہ متھا صاف کر کے آؤ مرجانیو......!''

''بالکل بھی نہیں اماں، آج تو بالکل بھی نہیں۔ جنہیں ہم اچھی نہیں لگتیں وہ ہمیں نہ دیکھیں نا!'' رابی اٹھلا کے بولی تو قدسیہ نے ایک دھپ رسید کی۔

''سب دیکھیں گے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔''

''پھپھو! نہ کریں نا، آج کتنے دل سے تیار ہوئے ہیں ہم دونوں، دیکھیں نا......سارا شوق مر مرا جائے گا ایک ہی تو آپا ہے ہماری۔ نمرہ آپا کی شادی پہ ہم دونوں چھوٹی تھیں۔ اب کشور آپا کی شادی کا شوق پورا کرنے دیں نا......'' خانم لجاجت سے بولتی انہیں اتنی پیاری لگی کہ آگے بڑھ کر منہ چوم لیا۔

''واہ اماں! میں سوتیلی ہوں۔ آج میں بھی اتنی اچھی لگ رہی ہوں لیکن میری تعریف آپ کبھی نہیں کرتیں۔''

رابی منہ بسور کر جانے لگی تو قدسیہ پھپھو نے اسے کہنی سے تھام کر واپس اپنی جانب پھیرا۔

''میری بیٹیاں اتنی پیاری لگتی ہیں کہ کہیں میری اپنی نظر نہ لگ جائے اس ڈر سے میں زیادہ

دیکھتی ہی نہیں۔ اللہ نصیب اچھے کرے میری بچیوں کے، شر سے بچائے!" رابی نے قدسیہ پھپھو کے جذباتی جملوں کے ساتھ ہی ان کی چھوٹی انگلی اپنی سرمے سے بھری آنکھ کی جانب جاتی دیکھی تو فوراً ان کی نیت بھانپ کر خانم کو جکڑا اور وہاں سے کھسکنے کی کی۔

"باقی سارے لاڈ بعد میں اماں، ابھی تو کشور آپا کو دیکھنے دیں۔ آج تو جیسے حور پری اپسرا سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے آپا نے......"

وہ دونوں آگے بڑھیں اور کب سے رشتہ دار لڑکیوں اور عورتوں کے جھنڈ میں گھبرائی سہمی سی بیٹھی کشور کے دائیں بائیں آٹکیں جس سے اسے تھوڑا حوصلہ ہوا اور لگا جان میں جان آئی ہو۔

کشور نے نگاہ اٹھا کے دونوں کو باری باری دیکھا تو آنکھوں میں بے تحاشا ستائش اور محبت ہلکورے لینے لگی۔ خانم کو تو بار بار دیکھا کہ اپنی گود میں کھلائی بہن ہے اور ایک دم ایسی بڑی کب ہوئی۔ کیا اماں ابا کو یہ بھی جلد چھوڑ جائے گی۔ کیا وہ ایسے ہی اکیلے رہ جائیں گے۔ دونوں مائی بابا ایک دوسرے سے ہی باتیں کر کر کے دن گزارا کریں گے اور بیاہی بیٹیوں کے آنے کا انتظار کیا کریں گے۔

ایک تصور تھا جو منظر کی صورت نگاہوں کے سامنے ابھرا تھا اور کشور کی آنکھوں کے گیلے ہوتے فرش پہ آنسوؤں کے فوارے ابل پڑے۔ اس کا رونا تھا کہ خانم اور رابی بھی اس سے لپٹ لپٹ کر رو دیں۔ قدسیہ اور رقیہ بھی شریک ہو گئیں تو برادری کی عورتوں کا تو اس شغل میں حصہ ڈالنا عین ثواب تھا۔

بیٹیاں پاس ہوں تب بھی سینے گیلی لکڑی کی طرح سلگتے ہیں اور دور چلی جائیں تو ایسی بھٹی بن جاتے ہیں جن میں بیٹیوں کے چھوٹے چھوٹے دکھ انگارے بن کے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سینوں کو قرار کبھی نہیں آتا۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں کا دولہا بڑی دھوم سے گھوڑے پہ نکلا تھا۔ ایسا سجیلا سفید گھوڑا تھا کہ حسنات کا دل کئی بار چاہا کہ بھائی کو اتار کر دو چکر پنڈ کے وہ خود لگا لے۔ سفید براق گھوڑے پہ سرخ شنیل کی رکاب اور گوٹے کناری سے مزین اس کی لمبی گردن پہ ڈلی چادر بہت دل فریب لگ رہی تھی۔ حیات نے گہرے

نیلے رنگ کی شیروانی پہنی تھی۔ اس پہ سرخ کلاہ...... اس قدر اٹھ رہا تھا کہ نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ وجیہ تو وہ ہمیشہ سے تھا آج اندرونی اطمینان اور خوشی چہرے کو دوچند کر رہی تھی۔ حاسدوں کی چالوں کے باوجود آج وہ اس کی ہو جاتی تو پھر کوئی فکر نہ رہتی۔ آخری پل تک اسے کبھی لگتا اباجی بازی پلٹ دیں گے تو کبھی لگتا قاسم کوئی چال چل دے گا۔

(کاش اسے اندازہ ہوتا اباجی بازی پلٹنے والے تھے اور چال قاسم اب بھی چل رہا تھا)

گھوڑے پہ سوار اس نے پورے پنڈ کے دو چکر لگائے۔ شہر سے بینڈ بلوایا گیا تھا۔ آگے آگے بینڈ بجاتے سفید کپڑوں والوں کا گروہ اور درمیان میں حیات کا گھوڑا۔ پیچھے ایک لمبی قطار باراتیوں کی۔ پہلے حیات کا خیال تھا کہ وہ کتنا برا لگے گا اپنے ہی پنڈ میں یوں گھومتا لیکن جب بینڈ کے ساتھ ناچتے یار بیلی اور پیچھے باراتیوں کا جوش و خروش دیکھا تو جیسے سارا افسوس جاتا رہا۔

حسنات نے نوٹوں کی کئی گڈیاں اچھالی تھیں۔ پنڈ کے بچوں نے چیلوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر لی تھیں۔ اس زمانے میں شادی بیاہ کا یہ لازمی جزو تھا اور آپ چاہے کتنے ہی پڑھے لکھے ہوں یہ سب رسومات اور دیہاتی کلچر کا حصہ گردانا جاتا تھا جسے پورا نہ کرنا جیسے شان کے خلاف تھا۔ حسنات بھی مبشر اور مدثر کے ساتھ مل کر بھرپور طریقے سے اس رسم کو پورا کر رہا تھا جبکہ پھپھو قدسیہ کا سب سے چھوٹا بیٹا یہی نوٹ چننے میں مصروف تھا۔

اسی رونق میلے میں بارات واپس حویلی لکھاں آ کر رکی اور پھر عورتوں کا جلوا اندر سے برآمد ہوا۔ ایک ترتیب اور احتیاط کے ساتھ سب بزرگ اور درمیانی عمر کی خواتین کے گھیرے میں لڑکیاں بارات کے ساتھ چھوٹی حویلی روانہ ہوئیں۔

نوعمری کا بانکپن سیانا نہیں الھڑ ہوتا ہے تب ہی اپنے تئیں بہترین تیار ہوئی لڑکیاں دوپٹے سروں پہ چوتھائی لیے ہوئے اور سامنے سے ماؤں کی نگاہ بچا کر دو دو لٹیں ماتھے پہ گرائے کن اکھیوں سے حویلی کے لڑکوں کو دیکھتی تھیں۔

کس کا دل نہیں کرتا سرا ہے جانے کو۔ خواب دیکھتیں لڑکیاں اور خواب میں یہ سوچتیں کہ کسی

شہزادے کو ہم اچانک سے پسند آ جائیں اور وہ پوری شادی بھول بھال کر بس ہمیں دیکھتا رہے۔ سب اس کے کندھے بازو ہلا ہلا کر متوجہ کریں لیکن وہ اپنے دل کی رانی کو دیکھنے میں ایسا مست و مگن ہو کہ رانی جی اپنا دل تھامے یہی سوچتی رہیں کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ میرے حسن نے ایسا دیوانہ بنا دیا کہ کسی کام کا نہ رہا۔ اب تو یہ شادی ختم ہوتے ہی ہمارے ہاں رشتہ آئے گا۔ میرا شہزادہ اڑ جائے گا کہ بس اسی کو چوہدرائن بناؤں گا حویلی کی۔

میں ڈری سہمی سب کی نگاہوں کی اور باتوں کی تختی سہوں گی اس آس پر کہ جب بیاہی جاؤں گی تو سب کو میری حیثیت کا ادراک ہو جائے گا۔ اپنے چھوٹے سے گھر کی بیٹھک کے مٹیالے صوفوں کے کشن جگہ جگہ سے ادھڑی حالت والے، دماغ میں سرسراتے ہیں۔

اللہ جی! رشتہ لے کر آ گئے حویلی والے تو کیسے بٹھاؤں گی۔ لیکن کشنوں کا حل کیا ہو بھلا۔ دماغ تیزی سے دوڑتا ہے اور اماں کی پیٹی میں رکھا فینائل کی خوشبو میں ڈوبا شنیل کا کھلا کپڑا یاد آ جاتا ہے۔ ماسی تاجاں کی بیٹی کو چپکے سے دوں گی کشنوں کے کور سی دے گی۔ جب بن کے گھر آئیں گے اور صوفوں پہ چڑھے آنکھوں کو بھلے لگیں گے تو اماں بھی میرا منہ ماتھا چومے گی کہ کیسی سگھڑ اور سیانی بچی ہے، بر وقت بنا لیے۔ عزت رہ گئی مہمانوں میں......

لیکن بیٹھک کا پنکھا نہیں چلتا۔ حویلی والے بھلا گرمی میں کیسے بیٹھیں گے لیکن نہیں نا...... جب تک رشتے پہ راضی ہوں گے تب تک گوڑی ٹھنڈ آ گئی ہوتی۔ پنکھا چلنا ہی نہیں، کام ختم...... بس چائے پانی کے پانڈے بہترین ہونے چاہئیں۔

ایسی کتنی ہی سوچوں کو بنتے فنکشن گزار دینا تھا اور گھروں پہ واپسی پر تائے چاچوں کے لڑکوں کے ساتھ نصیب جڑ جاتے تھے۔

لڑکپن کا بانکپن پانی پہ بنے نقش کی طرح ہوتا ہے، کبھی ٹھہرتا ہی نہیں......!

سارا رستہ بے حد مزے سے گزر گیا تھا۔ مردوں میں وہ شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بینڈ والوں کا شور اور ساتھ جوان خون کا شرابا...... پنڈ والوں کو چوہدری حیات کی شادی

ہمیشہ یاد رہنی تھی۔

بارات چھوٹی حویلی پہنچ چکی تھی۔ چوہدری آفتاب کے ساتھ قاسم جڑ کر کھڑا تھا جسے دیکھتے ہی حسنات کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ کب کیسے یہاں آ گیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اپنے پروگرام تو وہ ویسے بھی نہیں بتایا کرتا تھا لیکن حسنات اور مبشر وغیرہ نے یہی سمجھا تھا کہ وہ موڈی انسان شادی میں شرکت نہیں کرے گا شاید۔ خانم کا خیال فوراً دل کو جکڑ گیا۔

کہیں یہ اسے دیکھنے تو نہیں آیا۔ اس سوچ کے آتے ہی سارا موڈ ستیاناس ہو گیا۔ دور عورتوں کے جھنڈ میں حمیدہ چاچی اور سنہری نے بھی اسے دیکھا تھا۔ دونوں کے لبوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

حمیدہ کو تو پتر کا یوں ذمہ داری دکھانا جبکہ باقی سب لڑکے لفنگوں کی طرح ناچ رہے تھے، اس نے برادری کے سامنے چاچے کی بانہہ بن کے ان کا سر اونچا کر دیا تھا۔ بھلے چاچا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

لیکن سنہری کو اصل خوشی یہ ہوئی تھی کہ حسنات قاسم کو دیکھ کر جل بھن گیا ہو گا۔ دن رات جس بالن کو وہ اپنے اندر سلگاتی تھی رفتہ رفتہ اس کی تپش سے قرب و جوار جھلسنے والے تھے۔ وہ خاموش تھی اور زیرک نگاہی سے جائزہ لے رہی تھی۔ حسنات کے ساتھ کسی قسم کا پنگا اس کے حق میں مصیبت ہی بنتا اس لیے وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے موقع چاہیے تھا اور بس......

دھانی رنگ کے ویلوٹ کے سوٹ میں جو دبکے اور تلے کے کام سے بھرا تھا، اور اس کی بے تحاشا گوری رنگت پہ اٹھ بھی رہا تھا لیکن اس کا اوپرا سا میک اپ اور تیز لپ اسٹک اسے نئی نئی شادی شدہ ظاہر کر رہے تھے۔ حمیدہ تو واری صدقے ہوتی رہی تھیں لیکن سیانی خواتین کو وہ ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ ایسی پیڈی پاٹھی (پکی اور اپنی عمر سے بڑی حرکتیں کرنے والی) لڑکیاں اس دور کی سب سے ناپسندیدہ شے تھیں۔

سنہری نے حمیدہ سے ان کی دو سونے کی کنگنیاں لے کر کلائی میں ڈال لی تھیں جس کی وجہ سے وہ مزید معتوب ٹھہری تھی۔ لیکن سنہری کو پروا نام کی شے کی خبر نہیں تھی کہ وہ بھی وجود رکھتی ہے۔ جہاں عورتوں اور لڑکیوں کا دھیان اس کی جانب تھا تو اس کا حسنات کی جانب جو بن پانی کی مچھلی بنا ہوا تھا

قاسم کو دیکھ کر۔ اس کی ساری خوشی قاسم کو دیکھ کر کافور ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں کو ہی آگ میں جھونک دیا ہو۔

وہ حاسد نہیں تھا، نہ کسی سے بیر پالتا تھا لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج پہلی بار اسے ادراک ہوا تھا کہ حسد کرنے والے کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔ دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش آج قاسم کو کوئی آفت ٹوٹ پڑے یا خانم کو موچ آجائے اور وہ بستر پر پڑ جائے۔

حیات کی بارات کا استقبال بے حد شاندار تھا۔ اردگرد جتنے بھی گھر تھے سب پر بچیاں لڑکیاں اور عورتیں کھڑی پھول پھینک رہی تھیں۔ آگے آگے باراتی ناچتے سب ہی شوق و ذوق سے دیکھ رہے تھے۔ سب کچھ تھا اور بہترین تھا۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چوہدری شہاب الدین بارات کے ہمراہ نہیں تھے۔ چوہدری آفتاب کو استعجاب سے زیادہ افسوس ہوا تھا۔ انہیں چوہدری شہاب سے ایسی حرکت کی اسی فیصد امید تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ حویلی لکھاں میں اپنی نوہ اور پتر کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ کیونکہ وہ پنڈ کے بڑے چوہدری ہیں تو انہیں یہ جچتا نہیں کہ وہ یوں اونچا شملہ لیے بارات کے ساتھ لور لور پھرتے......

یہ سب باتیں قاسم ان کے کان میں انڈیل چکا تھا لیکن انہیں اپنے بڑے بھائی سے اس قدر لحاظ کی توقع تھی کہ وہ اس پتر کی بارات کے ساتھ لازمی آتے جس کی جنج پورے پنڈ پھرانے کی خاطر چوہدری آفتاب کو ان کے ٹبر سمیت حویلی لکھاں سے چھوٹی حویلی بھیجا گیا تھا۔

سکینہ بھرجائی بھی اپنے دیور دیورانی سے شرمندہ تھیں لیکن وہ دونوں ہی بے حد وضع دار تھے۔ انہوں نے رشتے داروں کی زبان بندی کی خاطر خود ہی شور ڈال دیا تھا کہ چوہدری شہاب کو جچتا نہیں کہ وہ پورے پنڈ کا پھیرا مارتے ہوئے چھوٹی حویلی پہنچیں۔ اور انہیں بھی واپس حویلی لکھاں کچھ دن بعد چلے تو جانا ہے تو سمجھو وہ وہاں موجود، سو یہاں موجود۔ لیکن برادری کے لوگ بھی خوب کائیاں ہوتے ہیں۔ چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں جو بالآخر اتنی شاندار رونق کے آگے دم توڑ گئیں۔

حیات اور حسنات کو بھی باپ کی اس حرکت کی تکلیف تھی لیکن حسنات اتنا بھار نہیں لے رہا تھا۔

وہ تو کئی بار حیات کے کان میں بھی کہہ چکا تھا کہ ابا جی کا نہ آنا نیک شگون ہی ہے۔ ان کا تو ہر وقت چچا آفتاب کے ساتھ نامناسب رویہ رہتا ہے۔ اچھا ہے رشتے داروں کی نگاہوں سے مخفی رہ گیا۔ لیکن حیات اس کی بات درست ہونے کے باوجود باپ کی اس بے حسی پہ دکھی تھا۔ یہی کرنا تھا تو اتنا سینہ تان کر کیوں کہا کہ پہلے پتر کا ویاہ ہے پورے پنڈ کے دو پھیرے لگاؤں گا۔ وہ دو پھیرے سب کے لگے تھے، بس انہی کے نہیں لگے تھے۔

نکاح کی رسم شروع ہوتے ہی حویلی لکھاں کے اندر کے بندے عورتوں کے حصے میں شرافت سے داخل ہوئے اور ناک کی سیدھ میں چلتے تمبو قناتوں سے سجی راہداری جو سیدھی چھوٹی حویلی کے گیٹ تک جا رہی تھی، عبور کرتے اندر داخل ہو چکے تھے۔ لڑکوں کو اپنی بھرجائی دیکھنے کا اشتیاق تھا تو حسنات کو صرف ایک ہی چہرہ دیکھنے کی چاہ تھی۔ رقیہ اور قدسیہ کے ساتھ سکینہ اور حمیدہ بھی وہیں موجود تھیں۔ سنہری بھی پوری طرح چوکس و چوکنا وہاں یوں کھڑی تھی جیسے کسی حادثے کی آس لیے ہو۔ حمیدہ کا ہمیشگی مقصد سسرال والوں کی رشتے داروں کے ساتھ برائی کرنا تھا اور کچھ کشور کو دیکھنے کا اشتیاق اسے کشاں کشاں لے آیا تھا۔ ورنہ وہ ان رشتے داروں میں سے تھیں جو عین وقت پہ کسی نہ کسی بات کو تنازعہ بنا کر فتنہ کھڑا کر لیتے ہیں۔ نیت ابھی بھی ایسی ہی تھی لیکن موقع نہیں بن پایا تھا۔

کچھ ہی دیر میں کشور کو باہری حصے میں لے جایا جانا تھا جہاں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ حیات کو وہیں بلوا لیا جاتا اور کچھ دیر دلہن کے ساتھ بٹھا کر لڑکیاں چھوٹی موٹی رسمیں کرتیں اور پھر بارات دلہن لیے واپس روانہ ہو جاتی۔

عورتوں میں باقی خاندان کے غیر مردوں کا آنا ممنوع تھا۔ صرف بے حد قریبی اور گھر کے افراد کو اجازت تھی۔ حسنات اور مبشر وغیرہ نے پوری کوشش کی کسی طرح بھرجائی کے کمرے میں جھانکا جائے لیکن سکینہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ایسی کراری نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا تھا کہ حسنات کو خاموشی سے واپس جانے میں ہی عافیت لگی تھی۔

مردانے میں فلم بنانے والا موجود تھا جو انتہائی بے دلی سے فلم بنا رہا تھا کیونکہ اس کے لیے یہ

پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے کیمرے میں کوئی میک اپ سے لتھڑا پری چہرہ فوکس نہیں کیا تھا نہ ہی دلہن کی جھلک دیکھنے کو ملی تھی نہ دلہن کی بہنوں سہیلیوں نے دیدار کروایا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ محض مردوں اور دولہے کی فلم بنانے کے لیے اسے ہائر کیا گیا ہے۔ حسنات اپنے ٹولے کے ہمراہ وہاں پہنچا اور مووی والے کو اپنی اور یار لوگوں کی مووی بنانے پہ لگا دیا۔ وقت گزاری کے لیے جتنے پوز اس وقت مشہور زمانہ تھے، وہ سب باری باری آزمائے جانے لگے۔ بالوں کا پف ماتھے پہ گرائے دونوں بازو سینے پہ باندھے تھوڑا ترچھا آڑا کھڑا ہو کر فضا میں غیر مرئی نقطے کو دیکھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنے تئیں سب ہی نے ماڈلنگ کے بھرپور جوہر دکھا دیے تھے۔

تبھی زنانے میں دلہن کے آنے کا غلغلہ اٹھا اور حسنات اور اس کے جتھے کی اس طرف دوڑ لگ گئی۔ یہ نہیں سوچا کہ جب حیات کو بلوایا جائے گا تو اس کے دائیں بائیں کسے کھڑا ہونا ہے۔ حسنات راہداری کے سامنے رکھی ایک کرسی پہ ڈٹ کے بیٹھ گیا۔ یہیں سے دلہن اور اس کو لانے والیوں کو گزرنا تھا۔ تبھی پریوں کو مات دیتی کشور اور اس کے ساتھ آتیں رابی اور سنہری پہ نگاہ پڑی تو جسم کی آنتیں تک کڑوی ہو گئیں۔ سارا وقت برباد ہوا تھا۔ جسے دیکھنے کی چاہ میں بیٹھا تھا وہ ہی ساتھ نہیں تھی۔ بے دلی سے پیچھے کمر ٹیک کر اپنی بھرجائی کے حسین چہرے کو شوق سے دیکھا اور پھر نگاہ دوبارہ سنہری پہ آرکی کیونکہ وہ ضرورت سے زیادہ اونچا بول بول کر شور مچا رہی تھی۔ خالصتاً متوجہ کرنے کے کوشش......

''لیکن پری کدھر ہے۔ یعنی پری ہی یہاں نہیں تو پھر کدھر ہے؟''

اچانک سے دماغ نے جھٹکا کھایا تھا۔ سنہری کی کوئی تک نہیں بنتی تھی کہ وہ کشور کو یوں تھام کر لاتی۔ اس بات پہ رابی کا بھی منہ پھولا ہوا تھا۔ اسے کون سا سنہری ایک آنکھ بھی بھاتی تھی۔ وہ بے چین سا اٹھ کھڑا ہوا۔ دلہن کے آنے نے سارے میں ہڑبونگ مچا دی تھی۔ سب ہی اٹھ اٹھ کر قریب آ کر کھڑے ہونے لگے تھے۔

دلہن دیکھنے کا اشتیاق بھی الگ ہی ہوتا ہے۔ اسے کبھی بھی کسی بھی دور یا وقت میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دلہن دیکھنا کل بھی پسندیدہ کام تھا آج بھی ہے اور یقیناً ہمیشہ رہنے والا ہے۔

حسنات نے رابی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی جو گاہے بگاہے انتہائی کینہ توز نگاہ سنہری پہ ڈال رہی تھی جو سب سے زیادہ دلہن کی قریبی اور سگی بننے کا دکھاوا کر رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اسے کوڑے دان میں پھینکوا دیتی۔

اسی اثنا میں رابی کی نگاہ اٹھی اور حسنات سے ملی جس نے ایک پل بھی ضائع کیے بنا ہاتھ کے اشارے سے خانم کا پوچھا تھا۔ رابی نے جواباً انتہائی غصیلے تیوروں سے اسے دیکھا اور کندھے اچکاتے غصے سے بھرا جوابی اشارہ کیا۔

جس کا مطلب تھا کہ اسے خود نہیں پتا خانم کہاں ہے۔ ساتھ ہی کٹیلی نظر سنہری پہ ڈال کر ایک اور اشارہ دیا جس کا مطلب تھا کہ اس مصیبت کو دیکھیں......!

حسنات نے نظر انداز کیا اور فوراً مردانے کی جانب جانے لگا۔

لیکن نا جانے کیا ہوا کہ پل کے ہزارویں حصے میں اسے کچھ سوجھی اور وہ بنا ساعت بھی ضائع کیے نظر بچاتا غیر محسوس انداز میں حویلی کے اندر چلا گیا۔ سنہری نے اسے جاتا دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے نے فوری رنگ بدلا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کشور کے لہنگے پہ لاشعوری طور پر سخت ہوئی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنا شروع ہوا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جس تیزی سے اندر داخل ہوا تھا راستے میں کتنی ہی چیزوں سے ٹکراتا آیا تھا۔ جگہ جگہ تو چارپائیاں بچھی تھیں۔ مہمانوں کے بیٹھنے، لیٹنے کے لیے...... دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا لگتا تھا ابھی حلق کے راستے باہر آئے گا۔ اندر سب کمروں میں خانم کو ڈھونڈتے اسے بمشکل دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے۔ خانم کہیں نہیں تھی۔

اس نے سوچا باہر نکلے اور رابی سے دوبارہ پوچھے کہ خانم کہاں ہے اور اس کے ساتھ باہر کیوں نہیں آئی۔ وہ صحن میں نکل آیا۔ باہر کا رخ کرتے کرتے اچانک نگاہ چھت کی جانب سیڑھیوں پہ گئی تو جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے قدم جکڑ لیے۔ اسے خوف سے اپنے چہرے کا سارا لہو نچڑتا محسوس ہوا۔

دوسرے ہی پل اسے ادراک ہوا کہ یہ وقت ہوش کرنے کا ہے۔ بے ہوش ہونے کا نہیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا تھا۔ممٹی کے نیچے ایک کمرا تھا جہاں کاٹھ کباڑ اور پرانی چارپائیاں وغیرہ پڑی رہا کرتی تھیں۔ وہ اردگرد کے گھروں کی چھتوں کو طائرانہ نگاہ سے دیکھتا آگے بڑھا۔مبادا کوئی چھت پہ چڑھا بارات کا نظارہ کر رہا ہو اور اب اس کی جانب متوجہ ہو جاتا۔

کمرے کے دروازے کے قریب آتے آتے ہی اس نے دیکھ لیا کہ اسے تو باہر سے کنڈا چڑھا ہوا ہے۔یعنی اندر کوئی بھی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کی تیز سماعت میں جیسے کسی کے سسکنے کی آواز سوئی کی مانند گھسی تھی۔باہر بارات کا غضب کا شور تھا۔کچھ فاصلے پر بینڈ بھی بج رہا تھا اور شاید کھانا کھل گیا تھا اس لیے فضا میں مزید ارمہک کے ہمراہ شور اور بھنبھناہٹ بے تحاشا تھی پھر بھی اس نے آواز سن لی تھی تو یہ اسی کا کمال تھا۔وہ سرعت سے قریب ہوا اور کنڈا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔وہاں ایک طرف ٹوٹی چارپائی پر خانم بیٹھی رو رہی تھی اور اس کے اچانک اندر داخل ہونے پہ بری طرح خوف سے اچھلی تھی۔اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی جس کا اس نے اپنا منہ دبا کر فوراً گلا گھونٹ دیا تھا۔

حسنات کے پیروں سے زمین نکلی تھی۔ایسا اذیت ناک منظر اسے دیکھنے کو ملے گا،اس نے کبھی گمان نہیں کیا تھا۔اس کا دل خانم کی تکلیف پر کٹ گیا تھا۔وہ کب سے وہاں بند تھی اور کیوں تھی اس پہ بحث بعد میں ہو سکتی تھی فی الحال تو وہ اپنا دماغ تیزی سے چلا رہا تھا۔یہاں سے نکلنا پہلے ضروری تھا۔جس نے بھی خانم کو یہاں بند کیا تھا بلا مقصد نہیں تھا۔اس نے آگے بڑھ کر فوراً اس کا ہاتھ تھاما لیکن زبان سے تسلی دینے کے لیے وقت نہیں تھا۔

''پری!چلو نیچے اور چہرہ صاف کروا پنا فوراً......''

خانم نے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور اس کے ہمراہ دروازے کی جانب بڑھی۔زبان گنگ تھی اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔حسنات اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر آتے دروازہ ایک جھٹکے سے باہر سے بند ہوا اور پھر کنڈا لگانے کی آواز سنائی دی۔حسنات کی صحیح معنوں میں سٹی گم ہوئی تھی۔اس کے سامنے ساری صورت حال واضح ہو رہی تھی۔کسی نے بہت خباثت

دکھائی تھی۔ یا خانم کے ساتھ اسے پھنسانا مقصود تھا یا پھر یہاں کسی اور کو آنا تھا جو چند منٹ دیر سے آنے پہ اب کنڈا لگا چکا تھا۔

حسنات فوراً دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ پہلے وقتوں میں چھت کے کمرے میں کھڑکیوں کی طرز پہ سیمنٹ کی جالی دار کھڑکی بنی ہوتی تھی جس کے چھوٹے بڑے سوراخوں سے ہوا کا گزر ہوتا تھا اور کمرے میں گھٹن کی وجہ سے سیلن نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرز کی کھڑکیاں اس کمرے میں بھی تھیں۔ حسنات نے ایک سیکنڈ کی دیر کیے بنا دروازے کے ساتھ والی جالی سے ایک آنکھ بند کر کے دوسری سے باہر جھانکا تو اسے ایک زنانہ آنچل سیڑھیاں اترتا دکھا اور اس آنچل کے پیچھے قاسم تھا۔ وہ بھی بہت تیزی سے نیچے اترا تھا۔ حسنات کو پورا کھیل سمجھنے میں پل بھی نہیں لگا۔ یقیناً وہ زنانہ آنچل سنہری کا ہی تھا۔ اور یہ سب کچھ جو ہوا تھا یہ سنہری اور قاسم کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ حسنات کے پاس وقت کم تھا۔ اسے جو کرنا تھا، فوری کرنا تھا۔

انیس بیس سالہ لڑکے کے دماغ سے زیادہ اس کا جسم پھرتیلا ہوتا ہے۔ حسنات کے پاس دونوں خوبیاں تھیں۔ اس نے ہوش کھوتی خانم کو خود سے فاصلہ رکھتے واپس چارپائی پہ بٹھایا اور دل میں پورے دل سے رب کو یاد کیا۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔ وہ صاف دکھائی دیتی بدنامی سے بچنے کی اللہ سے دعا کر رہا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی ہلکا کام نہیں کیا تھا جس کے لیے وہ شرمندہ ہوتا لیکن اس وقت جو صورت حال تھی وہ بے حد پریشان کن تھی۔ اگر ان کے یہاں سے نکلنے سے پہلے کوئی آ جاتا تو اس وقت دور و نزدیک کی ساری برادری جمع تھی۔ وہ اور خانم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

''ایک بار یہاں سے نکل لوں تمہیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو حسنات نام نہیں کالی چیلی...... کس غضب کا وار کر گئی یہ بے شرم لڑکی۔''

وہ دل میں اسے کوستا کمرے میں نگاہ دوڑا رہا تھا۔ تبھی اسے ایک کونے میں سریے دکھائی دیے۔ آفتاب چچا کے یہاں شفٹ ہونے سے پہلے مرمت کا خاصا کام ہوا تھا اس میں سے بچا سامان قاسم نے ہی یہاں رکھوا دیا تھا۔ وہی سریے اب حسنات کی مدد کرتے۔ اس نے سریا اٹھایا اور اللہ کا نام

لے کر پوری طاقت سے سیمنٹ کی جالی کو دے مارا۔ کچا سیمنٹ تھا دو ماریں مارنے سے وہ جالی ٹوٹ گئی۔ کچھ کو حسنات نے اپنے کھیڑی پہنے پیر کی ضربیں مار کر توڑا۔ اس نے پلٹ کر خانم پہ نگاہ ڈالی جو دیکھ تو اسی کو رہی تھی لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے حواس مکمل سلب ہو چکے ہیں۔ ادھ کھلے ہونٹ ہلکی لپ اسٹک لگی ہونے کے باوجود سوکھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

چہرے کی شادابی دہشت نے چوس لی تھی۔ آنکھوں کا کاجل پھیل کر اپنی قدر کھو چکا تھا۔

حسنات کو ایک بار پھر سنہری پہ تاؤ آیا جو نجانے یہاں بند کرنے سے پہلے کیا بکواس کر کے گئی تھی خانم سے جو وہ یوں مخبوط الحواس ہوئی بیٹھی تھی۔ اور خود اس نے اپنے حواس ہی تو سلامت رکھے تھے۔

وہ جس فیلڈ سے منسلک تھا اس میں ہوش و حواس قائم رکھنے بنیادی شرط تھی۔ بالآخر جالی مکمل ٹوٹ گئی تھی۔ وہاں سے وہ دونوں آرام سے نکل سکتے تھے۔ حسنات نے اس کا ہاتھ تھاما اور پہلے اسے باہر نکالنے کے لیے تقریباً دھکیلتے ہوئے ٹوٹی جالی تک لایا۔ اسی اثنا میں اسے سیڑھیوں کی طرف سے اوپر چڑھتے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک لمبی خوف سے لبریز سانس حسنات کے لبوں سے خارج ہوئی اور اس نے آنکھیں میچ لیں۔

”پری! شاید قسمت یاوری کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔“

اس نے کہا اور مڑ کر خانم کو دیکھا جو نفی میں بے بسی سے گردن ہلاتی اسے انتہائی قابل رحم لگی۔ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں اور حسنات کے حلق کی گلٹی مسلسل ڈوبتی ابھرتی اس کی کیفیت کو مکمل عیاں کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

مردانے میں حسنات کے نام کی ڈھنڈیا مچی تھی۔ نکاح ہو گیا تھا۔ چھوہارے بتاشے بٹ چکے تھے لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اب تو دیگیں بھی کھل گئی تھیں۔ مبشر نے مدثر کو بھگایا تھا اسے ڈھونڈنے کے لیے تب ہی وہ چھوٹی حویلی کے اندر داخل ہوا تو اس نے خاندان کے چند معتبر لوگوں کو قاسم کے ہمراہ چھت کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ ان میں سب سے پیچھے سنہری بھی تھی جو بڑی بے باکی

اور بے حیائی کے ساتھ خاندان کے بزرگوں کو اپنے تئیں کسی کے کالے کرتوت دکھانے قاسم کے ہمراہ اوپر لیے جا رہی تھی۔

مدثر کا استعجاب اور حیرت سے برا حال تھا۔ یعنی یہ تو کمال حد ہو گئی تھی کہ باہر کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں تھی کہ اندر کیا چل رہا ہے۔ چھٹی حس مدثر کو کسی شدید گڑبڑ کا اشارہ دے رہی تھی۔ وہ سنہری اور قاسم کے کوٹھڑی میں پکڑے جانے والے واقعے سے انجان نہیں تھا اور یہ بھی جانتا تھا سنہری کس قسم کی چلتر لڑکی ہے اور کن ہتھکنڈوں پہ اتری ہوئی ہے۔ اس نے جلدی سے صحن میں کشور کے شوقیہ رکھے مٹی کے گھڑوں میں سے ایک گھڑا اٹھایا جس میں پانی لبالب بھرا تھا اور اللہ کا نام لے کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔

”ہٹو بچو، ہٹو بچو...... چاچا جی راستہ دینا۔ ایک منٹ، ایک منٹ...... او گیا، او گرنے لگا ہے۔ ہٹو اک سیکنڈ بھئی......!“ کہتا کہتا مدثر سیڑھیاں چڑھ کر آخری زینے تک پہنچا اور اس نے ہاتھ سے یوں گھڑا چھوڑا جیسے پھسل کر گرا ہو۔ گھڑا ٹوٹنے سے سب ہی ایک طرف دیوار سے بھی لگ گئے اور پانی سارا سیڑھیوں میں بہتا نیچے چلا گیا اور ٹوٹے گھڑے کی کرچیاں عین پیروں میں ڈھیر ہوئی پڑی تھیں۔

قاسم کا دل کیا یہیں سے مدثر کو دھکا دے مارے اور اس کی گردن ٹوٹ جائے۔

”یہ کیا حرکت ہے مدثر...... کوئی لتھی چڑھی ہے تمہیں۔ خاندان کے وڈیرے اور سیانے بزرگوں کو بے عزت کر رہا ہے۔“

”او قاسم بھا، کب سے آوازیں لگا رہا تھا راہ دو، راہ دو۔ ہٹ جاتے نا راستے سے۔ چکنا گھڑا تھا ہاتھ سے چھوٹ گیا میرے۔ اب دیکھو نا ٹھنڈا پانی بھی ضائع ہو گیا۔“

مدثر افسوس سے سر ہلاتا نیچے تک جاتا پانی دیکھ رہا تھا جو سنہری کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گیا تھا۔ کچی مٹی کے لیپ والی سیڑھیاں تھیں، ان پہ گرے پانی نے کیچڑ تو بنانی تھی اور وہی چھینٹے سنہری کے کپڑوں پہ ڈیزائن بنا گئے۔ وہ اسے خون خوار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی لیکن خلاف معمول وہ خاموش تھی۔ شاید بزرگوں کا اتنا تو لحاظ آ ہی گیا تھا۔

”چل کوئی نہیں پتر...... اب تو جا نیچے، ہم ذرا ایک معاملے کو دیکھنے آئے ہیں۔“ ایک عمر رسیدہ

بابا جی جو شاید کسی چسکے کی خاطر اوپر چڑھے تھے وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے نیچے بھیجتے ہوئے بولے۔ باقی دو بھی ان بابا جی کے ساتھ آخری زینہ چڑھ کر پلٹ کر قاسم کو دیکھتے رہے جس پر قاسم نے انہیں ممٹی والے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور مدثر سے مخاطب ہوا۔

''اب جا بچے، کھڑا کیوں ہے؟ دفع ہو جلدی۔''

''کیوں میں کیوں جاؤں؟ میرے بھی مامے کا گھر ہے۔ میں بھی چھت پہ آ سکتا ہوں۔''

قاسم مکا بنا کے اس کی طرف بڑھا کہ ایک چاچا جی نے فوراً اسے روک کر عجلت میں پوچھا۔

''او پتر! اس کے آرے لگے رہو گے تو جو دکھانے لائے ہو، وہ کیسے دیکھیں گے ہم؟''

مدثر نے چاچا جی کے پوپلے منہ کو دیکھا جس میں سوائے ایک مکھڑے کے دانت اور نیچے والے تین دانتوں کے کچھ بھی نہیں تھا اور شوق کیسے رنگین تھے۔

وہ سب کے سب کمرے کی طرف چلے گئے لیکن ٹوٹی سیمنٹ کی جالی اور باہر گرا سریا قاسم اور سنہری کا منہ چڑھا رہا تھا۔

''یہ کیا......؟'' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سریا اٹھایا۔ ''نکل گئے دونوں۔ بزرگو! اسی لیے کہا تھا ذرا جلدی کریں۔ خاندان میں ایسے سنپولیے پھن اٹھانے سے پہلے کچل دینے چاہییں۔''

سنہری ایک جانب جا کر کھڑی ہو چکی تھی لیکن اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ قاسم پہ بلا کا اشتعال ہے اسے۔ مدثر نے اسے اتنی نفرت آمیز نظروں سے دیکھا کہ کوئی اور ہوتا تو زمین میں گڑ جاتا لیکن وہ تو گردن اکڑا اکڑا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے جتا رہی ہو کہ مدثر بھلا کس گنتی میں تھا۔

''کس کی بات کر رہے ہیں بھائی قاسم......؟ کچھ مجھے بھی بتائیں گے کیا کہ سب گھر والوں سے چھپ کر آپ بزرگوں کے ساتھ کون سی مہم پہ نکلے ہوئے ہیں؟''

مدثر پوچھے بنا نہ رہ سکا تھا حالانکہ سارا معاملہ بھانپنے میں اسے ایک پل لگا تھا۔ لیکن وہ ششدر تھا کہ قاسم اور سنہری ملی بھگت سے اتنا خوف ناک کام پایہ تکمیل تک پہنچانے والے تھے جس کے بعد ان کا پورا خاندان بدنامی کے دہانے پہ ہوتا۔ صرف ایک انسان کی بدنامی نہیں ہونی تھی جن حضرات کو وہ

اپنے ساتھ لایا تھا وہ اس زمانے کا دور درشن تھے۔

''تم ایک منٹ میں یہاں سے چلے جاؤ مدثر ورنہ اس سریے سے تمہارا سر کھول دوں گا۔ نکل میں کہتا ہوں......''

قاسم اسے دھمکانے کی خاطر ہاتھ میں تھاما سریا لیے دو قدم اس کی جانب بڑھا تو اسے یہاں سے نکلنے میں ہی عافیت لگی۔ ویسے بھی یہی تسلی کافی تھی کہ قاسم اور سنہری جس مقصد کے لیے یہاں آئے تھے وہ پورا نہیں ہوا تھا۔

''او پتر فکر نہ کر، اپنا شہاب الدین سے بات کریں گے۔ یہ کون سے طریقے ہیں بھلا۔ فیر پھڑ کتے جان گے۔ ایڈی کیہڑی گل اے۔ چلو آؤ بیلیو، وقت نہ برباد کرو ہن۔ روٹی کھلی ہوئی ہے۔ چھوٹے گوشت کا سالن بنوایا ہوا ہے آفتاب نے۔ چلو کدرے مک نہ جائے......'' پوپلے منہ والے بابا جی کو اب کھانے کی فکر ستانے لگی تھی۔ باقی دونوں بابے بھی بے زار تاثرات کے ساتھ سارے کمرے کو بغور دیکھتے ان کے پیچھے ہی نکل گئے۔

''ارے اپنا پتر......!'' ایک بابا جی تھوڑے فاصلے پہ کھڑی سنہری کے پاس آ کر رکے۔ ''تجھے پہلاں تو کبھی نہیں دیکھا شہاب الدین کی حویلی میں لیکن پتر تو جو بھی ہے، کبھی ہمارے خاندان کی لڑکیاں ایسی دیدہ دلیر نہیں ہوئیں کہ وڈے وڈیرے کا لحاظ کیے بغیر ایس قسم کے چھاپے مارنے ساتھ ہو لیں۔ کوئی حیا کو ہتھ مار کڑیے۔ پرو ہنی دھی ہے، کوئی چج کا کام سکھ......!''

اب اللہ جانے سنہری کی قسمت اتنی ماڑی تھی یا اسے ذلیل ہونے کا شوق تھا ورنہ جتنی وہ بے عزت ہو چکی تھی اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو حویلی لکھاں سے رخت سفر باندھ چکی ہوتی۔ جواب اس کی زبان کی نوک پہ موجود تھا لیکن خاموشی مجبوری تھی کیونکہ یہ تینوں ان کی برادری کے وہ معتبر افراد تھے جن کی شہاب الدین کو سننی پڑتی تھی ورنہ برادری انہی کا ناطقہ بند کر دیتی۔ تب ہی قاسم ان تینوں کو بے حد دماغ لڑا کر اوپر لایا تھا تاکہ یہ خانم اور حسنات کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں اور پھر اس کے بعد آگ کو ہوا وہ اور سنہری دیتے۔

ان تینوں کے نیچے جاتے ہی سنہری دروازے کے آگے کھڑے قاسم کو بازو سے پرے دھکیلتی اندر داخل ہوئی اور پورے کمرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں دیکھنے لگی جیسے کسی دیوار سے حسنات اور خانم کو باہر کھینچ لائے گی۔ قاسم بری طرح چڑتے ہوئے بولا۔

''اب نکلو یہاں سے، دیکھ نہیں رہی دونوں نکل بھاگے ہیں۔ یہ سیمنٹ کی جالی ساری ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ حسنات ہے سنہری، حسنات......!''

''اور تم قاسم ہو اور قاسم ہی رہو گے۔ مجھے آج معلوم ہو گیا کہ تمہاری مدد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ بپھری ہوئی اس کی جانب پلٹی تو ایک پل کو قاسم کو یوں لگا جیسے جنگلی جانور کا عکس اس کے چہرے پہ لہرایا ہو۔ اسے جھرجھری سی آئی۔

''کس سیاپوں سے خانم کو اس کمرے میں بند کیا۔ اسے بچہ بھیج کر حسنات کے بہانے اوپر بلایا۔ چار منٹ تو اس نے کمرے کے باہر ہی لگا دیے، حسنات لالہ حسنات لالہ کی گردان کرتے کرتے۔ خدا خدا کر کے اندر گھسی تب کہیں جا کر باہر سے کنڈا لگا سکی میں، تمہیں کہا بھی تھا قاسم کہ جلدی جاؤ کمرے میں۔ ایک بار سب نے تمہارے ساتھ خانم کو دیکھ لیا تو پھر تم دونوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا لیکن تم سے پہلے وہ منحوس حسنات اوپر پہنچ گیا اور تالا کھول ڈالا سب تلپٹ کر دیا قاسم تم نے......''

''میرا کیا قصور اگر وہ مجھ سے پہلے اوپر آ گیا۔ میں تمہارا اشارہ ملتے ہی آ گیا تھا۔ لیکن اندر اسے دیکھ کر مجھے اور کچھ نہیں سوجھا تو باہر سے کنڈا لگا دیا۔ اچھا ہی ہوا سنہری، جو وہ نکل گئے۔ اگر وہ دونوں پکڑے جاتے اور سب کہتے ان دونوں کا آپس میں نکاح کر دو تو ساری گیم کا مجھے کیا فائدہ ہونا تھا بھلا......!''

''ایویں ان دونوں کا نکاح کر دو۔ حسنات ابھی پڑھ رہا ہے، بیس کا نہیں ہوا پورا۔ ابھی وہ اس حیثیت میں ہے ہی نہیں کہ شادی وادی جیسی مصیبت گلے ڈالے جبکہ تم ہو...... وہ دونوں پکڑے جاتے۔ بدنامی ہوتی۔ آفتاب چاچا کی کھلی اڑتی، وہ مجبور ہوتے۔ حسنات اپنی پڑھائی داؤ پہ نہ لگاتا اور نہ تمہارے تایا شہاب نے خانم کو نوہ بنانا تھا اور پھر تم اپنا آپ پیش کر کے اچھے بن جاتے۔ تمہارا پیر سب کی گردن پہ بھی ہوتا اور خانم بنا کسی محنت کے تمہیں مل جاتی لیکن ایک معمولی سی دیر نے سب الٹ

کر رکھ دیا ہے قاسم......!"

سنہری افسوس سے ہاتھ مل رہی تھی۔ قاسم کو پہلی بار اس کی عقل پہ رشک آیا۔ ایسا پلان اس کے ذہن میں نہیں آیا۔

وہ تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوا۔

"فکر نہ کرو، خانم کہیں نہیں جاتی۔ میری ہی ہے...... ابھی تو ایک وار خالی گیا ہے۔ جنگ رات کو ہونی ہے اور اس جنگ کا فاتح میں ہوں گا۔"

قاسم کے مغرور لہجے کو سنہری نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے سنا اور بنا کچھ بولے پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ نیچے جا کر کم از کم کھانا تو سکون سے کھاتی۔ قاسم بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کی مسکراہٹ میں معنی خیزی تھی۔

ان کے جاتے ہی کمرے کے ایک انتہائی بوسیدہ کونے سے لکڑیاں ہٹا ہٹا کر حسنات باہر نکلا تھا اور نکلتے ہی اس نے دوسرے کونے میں پڑے مٹی کے بھڑولے کو کھولا تو اندر سے خانم نیم مردہ سی باہر نکالی۔ دو تھپکیاں اس کے چہرے پہ دیں اور سختی سے بولا۔

"پری! ہوش کا وقت ہے۔ عزت پیاری ہے تو عقل سلامت رکھو۔ سنو بات میری، اگر تمہارے کسی انداز سے کسی کو کچھ الٹا سیدھا محسوس ہوا تو آفتاب چچا اور رقیہ چاچی کی عزت خاک میں مل سکتی ہے......!"

اس کی کمزوری کو اجاگر کرتے وہ اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔ خانم کے ستے چہرے پہ کچھ آثار نمودار ہوئے تو وہ جلدی سے بولا۔

"اب فوراً نیچے اترو اچھے سے منہ ہاتھ دھو کر باہر پہنچو۔ اور سب کے درمیان یوں گھل مل جاؤ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ کسی کو اپنے ماں باپ پہ انگلی اٹھانے کا موقع نہ دینا پری۔"

خانم نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور تیز لیکن لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل کر فوراً سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

حسنات نے ایک لمبا سانس خارج کیا اور خود بھی ارد گرد ہوشیاری سے دیکھتا اپنے کپڑے جھاڑتا

منظر سے غائب ہو گیا۔ لیکن اس کا دل و دماغ جیسے دہکتے کوئلوں پہ آ گیا تھا۔ سنہری اور قاسم کی باتیں اس کی روح تک کو جھلسا گئی تھیں۔ اس نہج پہ آ گیا تھا معاملہ کہ پہلی بار اسے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی حل سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

یہ کیسا ہولناک کھیل تھا جو اکیلی سنہری کھیل رہی تھی اور باقی سب اس کے مہرے بنے اس کی انگلیوں پہ ناچ رہے تھے۔ وہ جس وقت جیسا چاہ رہی تھی ویسا فتنہ کھڑا کر رہی تھی اور کسی کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے اصل میں چاہیے کیا تھا۔ یہ سب محض حویلی لکھاں کی بہو بننے کے لیے تو نہیں ہو سکتا۔ وہ قاسم سے دھڑلے سے شادی کر کے بن سکتی تھی۔ اسے اونچائی پہ پہنچنا تھا۔ اسے چودھراہٹ چاہیے تھی۔

اکثر پست ذہنیت کے لوگوں کا ہدف محض اونچا مرتبہ ہی ہوتا ہے جس تک پہنچ جانا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے اور اس کے لیے کس کس کی گردن پہ پیر رکھنا ہوتا ہے یہ وہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں۔ وہ گردنیں اوپر نیچے تو ہو سکتی ہیں لیکن انہیں دبانا پیر کے نیچے ہی ہوتا ہے ورنہ اٹھ کھڑے ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے......!

☆......☆......☆

آدھی رات کو ٹوٹی ہوئی قیامت بھی اپنے اندر بہت بڑے عذاب سموئے ہوتی ہے۔ بے خبری کا عذاب، بے بسی کا عذاب، لامتناہی تکلیف کا عذاب، اپنے پیارے کھو دینے کا عذاب......!

آسمان کی بلندیوں کو چھوتی آگ کی لٹوں نے ایسی ہولناکی پیدا کر رکھی تھی کہ محض ایک پنڈ نہیں اگلے دو پنڈوں تک آگ کے دھوئیں دیکھے گئے تھے۔ سیاہ کثیف دھواں جس نے زندگیاں نگل کر مرغولوں کی صورت دھمال ڈالی تھی۔ نیلی پیلی اور سرخ آگ نے سیاہی کا روپ دھار کر یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ ماس ہڈی سب چھوڑ آئی ہے۔ پنڈ میں کمزور دل عورتوں کی آدھی رات کو گونجتی چیخوں نے قبرستان کے سناٹوں کو بھی دہلا دیا تھا۔ بھگدڑ سی مچی تھی۔ ہر طرف آہ و بکا تھی۔ کوئی آگ کی ہولناکی سے سہم رہا تھا اور کوئی ان جانوں کے ضیاع پہ دھاڑیں مار رہا تھا جن کو یہ آگ چٹ کر گئی تھی۔ ایسی تباہ کن آگ پہلے کبھی پنڈ میں دیکھی نہیں گئی تھی۔ یقیناً دردناک چیخوں کو بھانبھڑ کے شور نے دبا دیا ہوگا۔ آگ بجھانے

کے لیے پنڈ کے لوگوں نے دوڑیں لگائی ہوئی تھیں۔شہر سے گاڑی آتے نجانے کتنا وقت لگتا۔ پنڈ والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ڈول بھر بھر کے آگ پہ پھینکنے کی کوشش جاری رکھی تھی لیکن اونٹ کا پیٹ زیرے سے نہیں بھرا جاتا۔آگ لپیٹ لپیٹ کر دیواروں اور دروازوں کو کھاتی چلی گئی تھی۔

دس افراد لقمۂ اجل بنے تھے اور ان دس افراد کی لاشوں کی حالت پہنچاننے کی سعی کرنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ پو پھٹنے تک شعلے بجھ گئے تھے لیکن مدھم سی روشنی میں سیاہ دیواریں اور دھویں کے اٹھتے بادل دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ محض چھ گھنٹے پہلے ''چھوٹی حویلی'' کس شان سے کھڑی تھی اور اب وہاں سیاہ کھنڈر تھا جو سوختہ حال اور ماتمی پیرہن اوڑھے ایک تاریخ رقم کر چکا تھا۔

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 14

تجھ میں کتنا گم ہوں اور کتنا نظر آتا ہوں میں
آتا جاتا آئینوں کو منہ دکھا جاتا ہوں میں
اس کے بعد اگلی قیامت کیا ہے کس کو ہوش ہے
زخم سہلاتا تھا اور اب داغ دکھلاتا ہوں میں
نقش بر دیوار ہوں اور بات کر سکتا نہیں
ایسی حالت میں بھی جو کہتا ہوں منواتا ہوں میں
خاکساری ہی نہیں یہ غم گساری بھی تو ہے
پاؤں رکھتا ہوں جہاں مٹی اٹھا لاتا ہوں میں
حرف کے آوازہ آخر کو کر دیتا ہوں نظم
شعر کیا کہتا ہوں خاموشی کو پھیلاتا ہوں میں
دن ڈھلے کچھ دیر ڈھل جاتا بھی ہوں سورج کے ساتھ
شام ہوتے ہی چراغوں سے ابھر آتا ہوں میں

(شاہین عباس)

بہت ہی حسین منظر تھا۔ حیات کو زنانہ حصے میں لا کر کشور کے پہلو میں بٹھا دیا گیا تھا اور وہ بار بار کن انکھیوں سے گہرا گھونگٹ کھینچے بیٹھی کشور پہ نگاہ ڈالتا تھا لیکن رخ یار دکھائی نہیں دیا تھا۔ دور نزدیک کی رشتے دار لڑکیاں اور رابی وہاں رسم کرنے موجود تھیں لیکن رابی کی پریشان کن نگاہیں مسلسل خانم کو تلاش کر رہی تھیں۔ حمیدہ نے اس کی بے چینی بھانپ کر کر ہانک لگائی تھی۔

''آئے ہائے رابی! سکتہ ہو گیا ہے تجھے...... کر بھی چکو جو رسمیں کرنی ہیں۔'' حمیدہ چاچی کے کہنے پہ عورتیں بھی ان کی جانب متوجہ ہوئیں تو ان کا لہجہ مزید تیز ہو گیا۔'' وہ تیرا پراندہ کدھر گیا...... وہ خانم...... دم چھلا نہیں نظر آ رہا تیرا...... وے نی کڑیو! خانم کدھر گئی؟ وہ بہتی کی بہن ہے اور رسم سے ہی غائب ہے۔''

رابی کا چہرہ یکدم سرخ ہوا تھا۔ معلوم نہیں غصے سے یا خفت سے۔ اتفاقاً اسی سمے حیات کو دیکھا تو وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی تنبیہ کر رہا تھا۔ اس نے رابی اور خانم دونوں کو سمجھایا تھا کہ کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے بس دو بندوں کے منہ لگنے سے گریز کرنا۔ ایک حمیدہ چاچی اور دوسری سنہری...... اس لیے مجبوری تھی۔ اور رابی کو برداشت کرنا پڑا تھا کیونکہ حمیدہ چاچی تو موقع کی تاک میں تھیں...... اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے حمیدہ کی جانب دیکھا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

''مامی! خانم میرا پراندہ نہیں، میری بہن ہے۔ اور بہنیں تو ہوتی ہی ایک دوسرے کا دم چھلا ہیں۔ بس آتی ہی ہوگی...... اندر رو رو کر اس نے خود کو بے حال کر لیا تھا اس لیے اسے کہا کہ چہرہ ٹھیک کر کے باہر آئے ورنہ سب باتیں بنائیں گے۔''

مقابل رابی تھی۔ حمیدہ بھول گئی تھیں کیسا بھی عذر ہوتا وہ دس میں سے دو کے جواب تو دے ہی دیا کرتی تھی۔ حمیدہ نے سر جھٹک کر ہنکارا بھرا اور کسی کونے سے بوکھلائی الجھی سی نکلتی سنہری کو دیکھ کر آواز کسی۔

''میری دھی کدھر رہ گئی تھی...... ادھر آ کر رسم کر...... تیری ہی تو رونقیں ہیں۔ دیکھ ساری کڑیاں تیرا ہی تو پوچھ رہی ہیں۔ کیوں کڑیو؟'' انہوں نے رشتے دار لڑکیوں کی جانب دیکھ کر ہانک لگائی۔'' ہے نا میری سنہری کی الگ ہی چھب...... نہیں نا مزا آ رہا تھا تم لوگوں کو اس کے بغیر...... لو آ گئی ہے۔ اب کرو رسم...... میری سنہری ہے ہی ایسی بس جدھر کھڑا کرو، چھا ہی جاتی ہے۔'' اونچی اونچی کہتے ہوئے انہوں نے پہلو میں بیٹھی عورت کے کندھے پہ ہنستے ہوئے ٹھوکا مارا اور تائید چاہی۔ وہ خاتون تو شرما شرمی مسکرا دیں۔ لیکن لڑکیوں کو بھلا خود سے آگے کون دکھائی دیتا تھا...... ان کے منہ میں بھی زبان تھی۔ تبھی ایک

سنہری کو قریب آتا دیکھ کر جواباً بولی۔

''ارے ماسی! ہم کہاں جانتے ہیں آپ کی سنہری کو...... ہمیں تو بس رابی اور خانم کا پتا ہے۔ سنہری کو سب میں رچنے میں ابھی خاصا وقت لگنا ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ لڑکی واپس حیات اور کشور کی جانب متوجہ ہوگئی اور حمیدہ تو حمیدہ، سنہری کو بھی انگارے دکھا گئی۔ پنڈال کا شور الگ تھا اوپر سے اپنی اپنی بولی بول کر شور میں مقدور بھر حصہ ڈال رہی تھیں۔ سنہری اشتعال دباتی رسموں میں شامل ہونے آگے بڑھی تھی کہ خانم کے وہاں آنے پر ہلکا سا شور مچا اور سب ہی اس کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ پچھلے دن جیسا دھلا دھلایا چہرہ، میک اپ اور آرائش سے عاری لیکن قدرے زرد ہوتا، رقیہ کو کیا سکینہ اور قدسیہ کو بھی چونکا گیا۔ حیرت زدہ تو رابی بھی اسے دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن یہ وقت کریدنے کا نہیں تھا کیونکہ وہی جانتی تھی کہ پچھلے تقریباً گھنٹے بھر سے وہ غائب تھی ......اور جب برآمد ہوئی تو عجیب حال میں تھی...... زیادہ تر نے بہن کی جدائی پہ محمول کرتے اظہار ہمدردی کیا تھا لیکن رابی کو احساس ہوگیا تھا کہ یہ دگرگوں حالت کشور آپا کی جدائی کے باعث نہیں ہے۔

لڑکیوں نے بڑے چاؤ سے چھوٹی چھوٹی رسمیں کیں جن میں خانم بدقت خود کو مصروف کر پا رہی تھی۔ حیات کو بھی کسی گڑبڑ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے چہرے پہ بے زاری طاری کرتے ہوئے ماں کو اس انداز میں دیکھا جیسے رسموں سے اوب گیا ہو اور کھڑا ہوگیا۔ لڑکیوں میں شور سا مچا۔ سب شوخ ہوئے اس پہ جملے کسنے لگیں لیکن وہ حیات تھا...... سنجیدگی اور بردباری جس کا مزاج تھا۔ بنا کوئی جوابی تاثر دیے اس نے خاموش رہنے کو ترجیح دی اور مدبرانہ چال چلتا مردانے کی طرف چلا گیا۔ لڑکیاں مایوس ہوکر کشور کی جانب متوجہ ہوگئیں جو حسین گڑیا کی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔

سکینہ اور رقیہ نے آگے بڑھ کر اسے انتہائی چاہت اور محبت سے کھڑا کیا اور پھر اشکوں کی برسات اور دعاؤں کی چادر میں اس کی رخصتی عمل میں آئی۔ کشور کی رخصتی پر سکینہ اور قدسیہ دونوں ہی رقیہ کے گلے لگے بالکل ایسے روئیں جیسے اپنی بیٹی لے کر نہیں، دے کر جا رہی ہوں۔ رقیہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ہاتھ پیر کپکپا اٹھے، جسم ٹھنڈا پڑا تو وہیں بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ کرسی پہ بیٹھ گئیں۔ کوئی

بھاگ کر اسپرائٹ کی بوتل پکڑ لایا تو کسی نے لیموں پانی منگوانے مہمان بچی کو دوڑایا جو وہاں سے دکھاوے کو تو فوراً دوڑی لیکن ذرا دور ہٹتے ہی مہمانوں میں مدغم ہوگئی۔اب کون اندر کہیں باورچی خانے میں جاتا اور لیموں پانی لے کر آتا...... یہ مائیاں بھی نا جوان پود سے کچھ بھی کہیں ایسے بنا لانے کو کہہ دیتی ہیں جیسے منتر پڑھنا ہے اور چیز سامنے آجائے گی۔

خانم جب کشور کے گلے لگی تو دونوں کو الگ کرنا مشکل ہوگیا۔خانم اس قدر روئی کہ محسوس ہوتا تھا آج اس کی آنکھیں پگھل جائیں گی۔ بہت سے چہروں پہ بے زاری اور اکتاہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ کو ڈھکوسلہ لگا تو کئی ہمدردی سے اس کی پیٹھ سہلانے لگیں۔ کشور خود بھی خانم کے اس قدر رونے سے پریشان تھی۔ وہ اس کی ماں جائی تھی، اس کی رگ رگ سے واقف۔اس کے اندر باہر کی شناسا...... اسے معلوم تھا کہ خانم کب کیوں اس قدر رو سکتی ہے۔ یہ رونا محض اس کی رخصتی کے لیے نہیں تھا۔اس کے پیچھے چھپا درد کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔

قدسیہ اور سکینہ نے رقیہ سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے۔ اپنی ہی حویلی چلنا ہے، اپنا ہی گھر ہے اس حویلی میں۔ بس جس مقصد سے چھوٹی حویلی آئے تھے وہ پورا ہوگیا اب ساتھ ہی چلی چلو...... لیکن رقیہ گیلی آنکھوں سے مسکرادیں۔ مذاق تھوڑا ہی تھا۔ ایسے کیسے ہاتھ باندھے ساتھ چل دیتیں...... ساری برادری موجود تھی۔ بیٹیوں کے والدین کو جچتا ہے بھلا یوں بارات کے ساتھ ہی اس کے سسرال چلے جانا، سب ہزار باتیں بناتے...... رقیہ نے سہولت سے منع کردیا کہ شوہر سے پوچھے بنا بھلا کیسے چلی چلیں۔ سکینہ نے ان کی بات سمجھتے زیادہ اصرار تو نہ کیا لیکن خانم کو ساتھ ہی لے لیا۔

”تمہاری بات درست ہے رقیہ، لیکن خانم کو ان رسموں رواجوں میں نہ الجھاؤ...... چھوٹی سی بچی ہے کیسے رو رو کر ہلکان ہوگئی، اسے میں ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ کشور کو بھی آسرا رہے گا۔“

رابی کو اور کیا چاہیے تھا اسے تو پہلے ہی تجسس پیٹ میں گرہیں لگا رہا تھا کہ خانم کدھر غائب ہوگئی تھی۔اب ساتھ جاتی تو فرصت سے پوچھتی تو سہی......“

سنہری مسلسل چیں بہ چیں ہوتی خانم کو گھور رہی تھی اور خانم اس کے گھورنے سے سہمتی جا رہی

تھی۔ آج وہ سنہری اور قاسم سے بری طرح ڈر گئی تھی۔ اب سنہری کو کوئی ضرورت نہیں تھی اسے دھمکانے کی۔ وہ خود ہی ایسی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اسے یقین تھا وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ سکے گی۔ خانم ناچاہتے ہوئے بھی رابی کے ساتھ چل دی تھی۔ ایک عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اتنا خوف ناک وقت وہ اوپر مٹی والے کمرے میں گزار کر آئی تھی کہ اس کے اثرات ابھی تک اس کے چہرے پر نقش تھے۔ وہ چاہ کر بھی مسکرا تک نہیں پا رہی تھی۔

بارات دھوم دھام سے حویلی لکھاں پہنچی تھی۔ بینڈ باجا ابھی بج رہا تھا۔ چوہدری شہاب الدین ملازموں کے ہمراہ گیٹ پر موجود تھے۔ اونچے شملے والی پگ پہنے، کروفر سے گردن اکڑائے۔ ان کے ساتھ چوہدری انور کھڑے تھے اور شہاب الدین کا یہاں کھڑے ہونا بھی انہی کا کمال تھا۔ وہ رخصتی سے پہلے چھوٹی حویلی سے نکل آئے تھے اور سیدھا ڈیرے پہ جا کر چوہدری شہاب کو بے نقط سنائی تھیں۔ انہوں نے غیرت وحمیت پہ سیر حاصل وعظ کیا تھا۔ چوہدری شہاب الدین کو مجبوراً حویلی لکھاں آنا پڑا تھا اور اب وہ استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔ حیات کا اترا چہرہ اور حسنات کی بے رخی بھی انہیں چنداں فرق نہیں ڈال سکی تھی۔ عورتیں دلہن کو لیے اندر چلی گئیں تو چوہدری شہاب الدین نے مووی میکر کو آواز لگائی۔

''او منڈیا! اب بنا فلم، میرے پتر کی جنج ووہٹی لے کر آئی ہے۔ ایسی فلم بنا کہ اس فلم پہ فلم بن جائے۔ ہاہاہا!'' وہ بھونڈی ہنسی ہنسے جس کا ساتھ چند معتبر بندوں کو دینا پڑا۔ آخر کو چوہدری شہاب الدین تھے۔ ''اور سن، اپنے ڈبے سے میری پگ کی تصویر اچھی طرح لینا۔ اونچا شملہ دکھائی دینا چاہیے چوہدری شہاب کا۔ پتا لگے، لاڑے کا پیو ہوں۔''

وہ مووی میکر کو ہدایات دیتے حیات کے کندھے پہ بازو پھیلا کر اسے لیے اندر کی جانب بڑھے جہاں اتنا ضرور تھا کہ ایک زبردست انتظام کیا گیا تھا۔ شرما شرمی انہیں یہ تو کرنا ہی تھا۔ انہیں اس شادی سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن برادری یہ بات تو نہیں جانتی تھی۔ قاسم نے ہی انہیں عقل دلائی تھی کہ اگر انہوں نے اپنا شوق ظاہر نہ کیا تو آنے والے وقت میں سوالات کی انگلیاں ان کی جانب بھی اٹھیں گی۔

اس لیے مجبوراً ہی سہی، لیکن انہوں نے رات کے لیے ایسے شاندار کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ یقیناً سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ پوری حویلی لکھاں کا مرکزی وسیع و عریض صحن تکوں، کبابوں کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ ایسی دل لبھاتی خوشبوئیں تھیں کہ بھی رال ٹپکاتے کرسیاں سنبھالتے دکھائی دیے۔

یہ بات محض قاسم اور شہاب الدین کو معلوم تھی کہ کھانے میں بھنگ کی آمیزش اس طور کی گئی ہے کہ محسوس بھی نہ ہو پائے۔ تکے اور کبابوں کا اہتمام تھا ہی اس وجہ سے کہ اس کے تیز اور مرچیلے ذائقے کی وجہ سے کسی کو کچھ احساس نہ ہو سکے۔ قاسم نے اگر کہا تھا کہ وہ کوئی کسر نہیں چھوڑے گا تو اس نے واقعی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

کشور کو ہال کمرے میں بٹھایا گیا تھا اور وہاں پنڈ سے مخصوص رسموں کی ادائی جاری تھی۔ عورتوں کا شور اور بھانت بھانت کی بولیاں...... سب نے مل کر اتنے بڑے ہال کمرے کو کابک بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔

شوق شوق میں عورتیں کشور کے اوپر چڑھی جا رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں...... خانم اور رابی بھی وہیں موجود تھیں۔ خانم نے مسلسل کشور کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور یہی بات اندر ہی اندر کشور کو پریشان کیے ہوئے تھی کیونکہ یہ صاف نشانی تھی کہ خانم پریشان ہے۔ وہ پریشانی میں سہارا ڈھونڈتی تھی۔ بس ہاتھ بھی تھام لیتی تو اسے ڈھارس ہو جایا کرتی۔ کشور کیسے نا اس کے رنگ ڈھنگ جانتی۔ رابی اس کا دوپٹا ٹھیک کرنے کی غرض سے جھکی تو موقع ضائع کیے بنا کشور بدبدائی۔

"رابی...... خانم کو کیا ہے؟ ایسا دھلا لٹھے جیسا چہرہ...... اتنی حسین سجی سنوری ہوئی تھی، ایک دم سے کیا ہوا......؟"

رابی نے نگاہ چرا کے خانم کو دیکھا جو سختی سے ہاتھ تھامے عورتوں اور لڑکیوں میں سے بس کچھ فاصلے پہ کھڑی سنہری کو دیکھ رہی تھی۔ ایک سہمی ہوئی سی نگاہ...... رابی نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر سنہری کو دیکھا تو اس کی نگاہیں سانپ کی سی پھنکار لیے ہوئے تھیں۔ چھوٹی چھوٹی تیز سانپ جیسی آنکھیں۔ رابی جھر جھرا کے کشور کے کان میں جھک کر بولی۔

''خانم سے پوچھ لیں نا آپا...... ساتھ ہی بیٹھی ہے۔ آرام سے بتا دے گی۔''

''کبھی نہیں بتائے گی۔ بھلا پتا نہیں تمہیں اس کا......!'' اتنا کہہ کر کشور نے مایوسی سے چہرہ نیچے جھکا لیا۔ اس سے زیادہ بات چیت دلہنوں کے لیے معیوب تر تھی۔

بالآخر سکینہ نے عورتوں کو وہاں سے ہٹانے کی غرض سے حسنات کو بلوایا تا کہ اسے کھانا لگوانے کا کہہ سکیں۔ اتنے رش میں بچتا بچاتا حسنات کسی طرح وہاں پہنچا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی رونق کا نام ونشان نہیں تھا۔ چہرے پر بے زار تاثرات لیے وہ ماں کے پاس آیا تو نگاہیں فوراً کشور کے ساتھ جڑ کے بیٹھی خانم پہ اٹھ گئیں۔ دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ اس کی زندگی کی یہ انمول تقریب تھی جس کی تیاریاں وہ اور رابی کتنے وقت سے مل کر کر رہی تھیں۔ کل بھی وہ اس کی وجہ سے یوں ہی دھلے دھلائے چہرے سمیت مہندی میں موجود تھی اور آج بھی وہ ایسے ہی سادہ چہرہ لیے وہاں بیٹھی تھی۔ لیکن کل اس کے چہرے پہ اس کی اپنی قدرتی رعنائی اور خوب صورتی دکھائی دیتی تھی جبکہ آج زردی کھنڈی تھی۔ ہونٹ تک سفید سے پڑ گئے تھے۔

وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر رش سے نکالتا ہال کمرے سے باہر لے جانے لگا کہ راستے میں سنہری سے ٹکراؤ ہو گیا۔ سکینہ ساتھ ساتھ مہمانوں سے باتیں کرتی اس کے پیچھے تھیں اس لیے انہیں اس کا رکنا محسوس نہیں ہوا۔ ایک اس پل میں سنہری نے اسے ایسی شکست دیتی کاٹ دار نگاہوں سے گھورا کہ حسنات جو پہلے ہی دماغی طور پر خود کو مفلوج محسوس کر رہا تھا، بالکل ہی الٹ گیا۔ لیکن وہ حسنات تھا، اس کا دماغ اوروں سے چار ہاتھ آگے کام کرتا تھا۔ بائیں طرف سے گرم گرم سبز چائے کی بھاپ اڑاتی کیتلی اٹھائے پنڈ کی کمہارن چلی آ رہی تھی۔ کھانا لگنے سے پہلے عورتوں کو چائے کی شدید طلب جاگی تھی اس لیے سکینہ نے اسے سبز چائے لا کر مہمانوں کو پلانے کا کہا تھا۔ اس کے پیچھے کپوں اور پیالیوں سے بھری دوڑے اٹھائے دوسری ملازمائیں بھی تھیں۔ حسنات نے سنہری پہ ایک دم مسکراہٹ اچھالی۔

وہ جو ہر بار خود سے عہد باندھتی تھی کہ حسنات کے دام میں نہیں آئے گی ایک بار پھر اس کی مسکراہٹ کا جادو دل کو الٹ پلٹ گیا۔ ہاتھ سیدھا سینے پہ دھرا اور جوابی مسکراہٹ کے لیے اپنے ہونٹوں

کو تیار کرنے کی کوشش میں اس نے انہیں ایک رخ پہ ابھی پوری طرح پھیلایا بھی نہ تھا کہ اسے لگا جیسے اس کا وجود کسی نے دوزخ میں دھکیل دیا ہو۔ کوئی لاوا سا تھا جو اس کے پیروں اور پنڈلیوں کو جھلساتا سارے میں جا پھیلا تھا۔ حسنات نے کمہارن کو ٹانگ اڑا دی تھی۔ نتیجتاً وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتے سنبھالتے پوری کیتلی سمیت دھڑام سے گری تھی اور چائے سنہری کے پیروں اور پنڈلیوں پہ جا پڑی۔ غضب کا شور مچا تھا اچانک جس میں سب سے اونچا واویلا حمیدہ کا تھا جو سینے پہ دوہتڑ مارتے سنہری تک پہنچ جانا چاہتی تھیں لیکن پہلے بار بار رک کر سسرال والوں کو کوسنے دینے کا فرض پورا کرتی آ رہی تھیں۔

حسنات نے چونکہ یہ سب جان بوجھ کر کیا تھا اس لیے کمہارن کو اٹھانے کے لیے فوراً آگے بڑھا تھا۔ اسے سہارے سے اٹھاتے مکمل ہمدردی سے اس سے چوٹ کے بارے پوچھتا رہا۔ وہ بے چاری مالکوں کی ایسی پروا کو دیکھتے ہی بشاش بشاش سی واپس کھڑی ہو گئی۔ اس نے حسنات کو یقین دلایا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی پھر بھی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو کا کھرا نوٹ اس کے ہاتھ میں دبا دیا۔ بے چاری نے شرمندہ ہوتے سکینہ کی جانب دیکھا تو انہوں نے بھی متانت سے رکھ لینے کا اشارہ دیا اور اسے آرام کرنے کے لیے وہاں سے بھیج دیا۔ باقی ملازمائیں پھیلا گند سمیٹنے لگیں۔

حمیدہ خوب بولیں کہ کمی کمین کی اتنی فکر اور میری پنہوی کا کسی کو کوئی خیال ہی نہیں جس کو ساڑ کے سواہ کر دیا۔ سنہری کی ہائے وائے کے باوجود حسنات نے اس کی چنداں پروا نہیں کی اور اسے زہر خند نگاہوں سے دیکھتا وہاں سے بنا سکینہ کو لیے چلا گیا۔ اس کا دل کچھ حد تک ٹھنڈا تو ہو ہی گیا تھا۔ مزاج پہ اچھا اثر پڑا تھا۔

سنہری نے خاصے ضبط سے کام لیتے اپنے جلے پیر اور پنڈلیوں کو دیکھا اور ارد گرد نگاہ دوڑائی تو سبھی اس کے گرد جمگھٹا بنائے کھڑی تھیں۔ بہت سی نگاہوں میں تو حظ تھا۔ وہ جیسے تیسے اٹھی اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ مزید یہاں بیٹھ کر اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتی تھی۔ اسے صاف محسوس ہوا تھا کہ حویلی لکھاں کے مکینوں کو اس کی پروا تک نہیں تھی۔

سرسری سا اسے دوا لگانے کا کہہ کر واپس کشور کے قریب چلی گئی تھیں جہاں وہ اور خانم سراسیمہ سی سراچکا اچکا کر صورت حال سمجھنے کی کوشش میں تھیں جبکہ رابی سارا منظر آنکھوں کے رستے دل میں اتارتی اٹھلاتی ان کے قریب پہنچنے والی تھی تاکہ مکمل تفصیل دے کر انہیں بھی سکون مہیا کر سکے۔

سنہری وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ اپنا کمرا بند کیے ایک بار پھر اس نے اپنے پیر اور پنڈلیاں دیکھیں جو سرخ ہو رہی تھیں اور جگہ جگہ آبلے بن چکے تھے۔ یہ دوسری بار تھا حسنات نے اسے جلا کر تکلیف دی تھی۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر تازہ ہو گیا جب اس نے ٹانگ اڑا کر کمہارن کو گرایا تھا۔ جلن اوپر چڑھتی ہوئی دل کو چھو گئی اور آنکھوں کے رستے باہر نکلنے لگی۔ اس کے بہتے آنسوؤں میں حویلی لکھاں کے ہر مکین کا انتقام بہہ رہا تھا۔ اسے اس گھر کے بچے تک سے بدلہ لینا تھا۔ وہ اب کسی کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ وقت کی محتاج نہیں تھی بلکہ وقت اس کے ہاتھ میں خود اپنا آپ سونپے گا اور وہ سب کو بتائے گی کہ اس کی اہمیت و حیثیت کیا ہے؟

☆......☆......☆

''او مجھے تو لکھ سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میری نک کے نیچے ہو کیا رہا ہے؟ یہ چنڈالنیں سب کچھ کیے بھی جاتی ہیں اور جب پوچھوں تو بھولی مسکین بن جاتی ہیں۔'' ''آئے ہائے حمیدہ! بھلا تم سے چھپ کر کچھ ہو سکتا ہے حویلی لکھاں میں......!'' ''ناں مجھ سے پوچھ کر اپنے پتر کے لیے کشور مانگی تھی کیا؟ مجھے اس کے ویاہ کی تاریخ ڈالنے کا سنیہا دیا تھا کیا......؟ مجھے بتایا تھا کہ پہناؤنیوں کے جوڑوں میں میرا چوہے رنگ کا سوٹ ہونا ہے۔ جیہڑا میں تھوکنا بھی پسند نہ کروں۔ وہ تو میں نے اپنے نام کی چٹ بدل دی ورنہ کلیجہ سڑتا رہتا میرا اس جوڑے کو دیکھ کر۔ لکھ دی لعنت ایہو جئی دشمنی تے......بس حمیدہ سے دشمنی نبھائی ہے چاہے اوقات ہو نہ ہو......اور یہ قدسیہ! اس کے چانے (بال) تو میں ایسے پٹوں گی کسی دن کہ سر پولا نہ کر دیا تو کہے۔ مجھے مہنے مارتی ہے کہ ''حمیدہ! حویلی کے کاموں میں پروہنوں کی طرح نہ بیٹھا کر......اپنا سمجھ کر ہتھ پوایا کر...... بعد میں لاما دیتی ہو کہ کوئی پوچھتا نہیں۔'' لے دس......ہائے ہائے......ہائے!''

دل کا غبار نکال کر دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملتی حمیدہ اس وقت اپنے کمرے کے صوفے پہ دونوں ٹانگیں اوپر چڑھائے آرام دہ حالت میں بیٹھی تھیں۔ سامنے قاسم بیڈ کی پائنتی پہ کچھ پریشان اور کچھ اکتایا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اس کے ہر انداز سے بے چینی ہوا تھی۔ مسلسل سوچ کی لکیریں چہرہ پہ چھاپ چھوڑتے گم ہو جاتی تھیں۔ ہر دو منٹ بعد وہ اٹھتا تھا اور کمرے کی کھڑکی کے پردے کی درز بنا کر باہر باغیچے اور صحن میں جھانکتا تھا جس کا ایک چوتھائی حصہ یہاں سے دکھائی پڑتا تھا لیکن باغیچہ مکمل نگاہ کے حصار میں آجاتا تھا۔ وہ اپنی بے چینی کو دبانے کی خاطر ماں کے کمرے میں آیا تھا لیکن حمیدہ نے اپنے ہی قصے چھیڑ دیے تھے جنہیں وہ انتہائی بے توجہی سے سنتا حمیدہ کے غیض و غضب کو بڑھانے کا سبب بن رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں سب کو بے نقط سنا کر آئی تھیں۔ سنہری کے کمرے میں نہیں گئیں کیونکہ معلوم تھا انہی کی بھانجی ہے اس لیے پٹھے دماغ والی نے کمرا بند کیا ہو گا بلا وجہ کھڑکا کے وقت کیا ضائع کرنا۔

اپنے کمرے میں ابھی صوفے پہ بیٹھی ہی تھیں کہ قاسم داخل ہوا۔ انہیں لگا کہ یقیناً ان کا پتر ماں کی دلجوئی کی خاطر وہاں آیا ہے۔ آخر ان کی پاٹ دار آواز باہر مردانے میں اس کے کانوں میں تو لازمی پڑی ہو گی۔ کیسے ہو سکتا تھا ماں کی خبر نہ لیتا۔ لیکن کتنی دیر تک جب قاسم منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا رہا تو کبھی اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتا ان کے صبر کا پیمانہ لبریز کر گیا۔ وہ خود ہی اسے پوری کتھا سنانے لگیں۔ پر اتنا کچھ بول کر بھی اس کا دھیان ماں کے دکھوں کی جانب نہیں گیا تھا۔ حمیدہ نے غصہ پیتے ہوئے لہجے میں بلا کی یاسیت بھری اور بولیں۔

”آج میری نمانی پنیوی ساڑی ہے کل کو مجھے بھی ساڑ دیں گے، تب بھی گونگا بنا رہیں منہ چک کے کمرے کے پھیرے کا شتا رہیں۔“

سنہری کی بات پہ قاسم کے کام کھڑے ہوئے۔ وہ ابھی کھڑکی تک گیا تھا واپس بیڈ پہ آکر بیٹھا اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکاتے آگے ہو کر ماں سے سخت لہجے میں بولا۔

”کس نے ساڑا ہے اماں سنہری کو...... کیا بولے جا رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟ پوری بات بتا......“

اور یہ پہلی بار تھا حمیدہ کو آگ لگی تھی پتر کے سنہری کے لیے فکرمند ہونے پہ۔ نہیں کیا

مطلب...... وہ جھک مار رہی تھیں تب سے۔ ان کے رونے، رونے نہیں تھے کیا۔ چہرے کے تاثرات ایک پل میں کرخت ہوئے اور چمکتے ہوئے بولیں۔

''میریا پترا...... سنہری کی بڑی پیڑ ہوئی ہے میرے پتر کو...... ماں تیری پلاسٹک کی بنی ہوئی۔ کوئی بھی اسے مد (پیس) جائے تجھے فرق بھی نہ پڑے اور سنہری کا سنا تو کھلوتے سے فٹافٹ ایسے بیٹھا ہے جیسے پنچائیت کی کرسی ہو...... ہیں دس ذرا مجھے......!''

قاسم پہلی بار اس تمام عرصے میں کھل کر مسکرایا۔

''مجھے تیری پنیوی سے کوئی ہمدردی نہیں اماں...... بس جاننا ہے کہ وہ بھلا کیسے سڑ گئی وہ تو خود سب کو ساڑ بال کے بیٹھنے والی ہے، شیطان کی مشیر ہے تیری پنیوی اماں......!''

''نہ خیری صلا...... بکواس نہ کری جایا کر۔ حالات نے تیز بنا دیا ہے ورنہ بڑی بھولی ہے سنہری...... نازک ہے طبیعت کی، اس لیے بھی سہہ نہیں پائی۔ اب دیکھ ذرا، اس کلمو ہے حسنات نے اس کے اوپر چاء روڑھ دی۔ وہ کمہارن کی بچی لے کر آ رہی تھی، اللہ جانے اس نے کیا لچ تلا ہے ایسا کہ ساری چاء میری سنہری کے پیروں پہ گر گئی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو یہ خبیث اور اس کی میسنی ماں پاس کھڑے تھے۔ میں سکنڈوں پہلاں سمجھ گئی اسی کا کام ہے۔''

قاسم کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔ اسے شاید سنہری کے اوپر چائے گرنے کا افسوس نہ ہوتا لیکن چونکہ معاملے میں حسنات شامل تھا تو اس کا خون کھولنا لازم تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور ہاتھ کا مکا بناتا دوسری ہتھیلی پہ مار کر بولا۔

''دیکھنا اماں، اس حویلی کے مکینوں کو بڑی سخت سزا ملنے والی ہے۔ یہ سب روئیں گے۔ ان کی آوازیں سات پنڈ سنیں گے...... دیکھنا......!''

''آئے ہائے...... نہ سنیں سات پنڈ پتر...... مجھے ہی سنا دے تو، میرا تو کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ ورنہ عمر بیت گئی ان سب کو مجھے جلاتے کلساتے......''

''فکر نہ کر اماں۔ آج ہی سب جل جائیں گے۔ کچھ راکھ بن جائیں گے اور کچھ اندر سے جل کے

ختم ہو جائیں گے۔ جس طرح ہمیں ستاتے ہیں، اب ان کے ستائے جانے کا وقت ہے۔ قاسم بھی ان کو پوری خوشیاں منانے نہیں دے گا کبھی...... ہر خوشی ادھوری دوں گا میں انہیں......" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے حمیدہ اس کی پشت کو فخریہ دیکھتی رہیں پھر اس کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔

"شالا میرے پتر کو دشمنوں کی نظر نہ لگے...... رب حفاظت کریں میرے چن کی۔ اس کو اس کے مقصد میں کامیاب کرنا۔" وہ اس کی برائی کو اپنی دعاؤں سے مہمیز کر رہی تھیں۔

کچھ لوگوں کے برے اعمال ان کے سامنے اچھے کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اور وہ اسی دھوکے میں خود کو مبتلا رکھے عمر گزار دیتے ہیں۔

☆......☆......☆

قاسم سیدھا وہاں سے ڈیرے کی طرف نکل گیا تھا۔ راستے میں کچے پہ ایک جیپ کھڑی تھی جس میں دو آدمی پہلے سے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک اسے آتا دیکھ کر فرنٹ سیٹ سے پچھلی پہ آیا اور قاسم کے لیے جگہ خالی کی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور ڈیرے کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور وہی آدمی تھا جسے حیات نے پہلے بھی قاسم کے ساتھ دیکھا تھا۔ چہرے مہرے سے کھلا بدمعاش دکھتا تھا۔ ڈیرے پہ اترتے ہی ان دونوں کو رکنے کا کہہ کر وہ خود چوہدری شہاب الدین سے بات کرنے اندر چلا گیا۔ انہیں ڈیرے پہ پہنچے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ اتنے مہمانوں کو چھوڑ کر یہاں آنا بھی ان کی بدتہذیبی کا کمال تھا۔ لیکن جس قسم کا طعام و قیام وہ حویلی لکھاں میں مہمانوں کے لیے کیے بیٹھے تھے، اسی چیز نے سب کا منہ بند کرا دیا تھا۔ ان کے اس وقت ڈیرے پہ جانے کی وجہ سے حیات اور حسنات بھی پریشان ہوئے تھے لیکن دونوں کی طبیعت والد کے رویے کی وجہ سے بے زاری کی حد کو چھو رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سارا دن بدمزگی کا شکار رہے تھے۔

حیات کو تو محض باپ کی بے حسی کا گلہ تھا۔ اسے قلق تھا کہ اگر انہوں نے ایسا ہی کرنا تھا تو کیوں سارے زمانے میں ڈھنڈورا پیٹا کہ پتر کا ویاہ گج وج کے کروں گا اور پوری جنج کو پنڈ میں پھراؤں گا اسی چکر میں چاچا آفتاب کو بھی چھوٹی حویلی بھجوا دیا...... لیکن حسنات کو تو ساتھ قاسم اور سنہری کی طرف سے

بھی شدید پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔ خانم کے ساتھ آج جو ہوا تھا اور جو اسی تناظر میں اس کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اسے سوچ کر ابھی بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ قاسم اور سنہری نے کھلی دشمنی کی ابتدا کر دی تھی اور یہ یقیناً کسی کی شہ پہ کی تھی۔ ورنہ اتنی جرأتیں اس قدر بے باکانہ طرز عمل......

قاسم خاموشی سے اندر داخل ہوا تو چوہدری شہاب بڑے سے رنگلے منجے پہ کروٹ کے بل نیم دراز آنکھیں بند کیے اپنے مخصوص کامے سے کندھے دبوا رہے تھے جو نیم اونگھتا ہل زیادہ رہا تھا۔ قاسم کے اندر آتے ہی آنکھیں کھول کر اسے بغور دیکھا اور کامے سے مخاطب ہوئے۔

''گامو! جا باہر اور ذرا کچھ فاصلے پہ نظر رکھے کھڑا رہ۔ جب بلاؤں تبھی اندر آنا۔ ورنہ باہر ہی مرنا، سمجھا......!''

''جی سرکار......جیویں آکھو......(جیسا کہیں)!''

اس کے باہر جاتے ہی قاسم آگے بڑھا اور قریب رکھی کرسی پہ ٹک کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

''انتظامات مکمل ہیں۔ بس میرے حکم کا انتظار ہے انہیں......ادھر جو کھانا بھیجا تھا سب ہی کھا پی کے لڑھک چکے۔ ابھی بندہ بھیجا تھا میں نے......جھانک کے آیا ہے صحن میں گھپ خاموشی ہے اور برآمدے میں سب کمبل رضائیاں لیے سو رہے ہیں۔ جو اندر ہیں، وہ کون سا جاگ رہے ہوں گے۔ بس اب دیر نہیں کرتے۔''

''او پتر رک......'' چوہدری شہاب دھیمے لہجے سے بدبدائے۔ ایس پاسے بھی تو سب کو لم لیٹ ہونے دے۔'' ان کا اشارہ حویلی لکھاں کی طرف تھا۔

''کھانا کھل گیا ہوا ہے......کھا رہے ہیں سبھی......باغیچے میں عورتیں تو شاید فارغ بھی ہو چکی ہوں اور مردوں کا ٹڈھ اندھا کھوہ ہوتا ہے، وہ تو جب تک بھنگ دماغ کو نہیں چڑھتی ان کے منہ چلنے بند نہیں ہونے تایا......''

''اسی لیے کہا نا کہ بھر لینے دے ان کے پیٹوں کو پہلے......ملنے جوگے بھی نہ رہیں۔ پہلے ہی ان تکے کبابوں کی خوشبو نے تیرے تائے کا بھی منہ رسیلا کیا ہوا ہے۔'' چوہدری شہاب چٹخارہ بھرتے

ہوئے مکروہ سی ہنسی ہنسے......

''ہم کل اڑا لیں گے تکے تایا......اب تو تکے کباب ہی ہیں آگے پوری حیاتی......وہ بھی اپنے ہوٹل کے......''

''گل تو تیری ٹھیک ہے۔ چل پھر......کارروائی شروع کر شہزادے......لیکن دھیان رکھنا پھر بھی......ایک غلطی بھی وارے میں نہیں ہے اس بار......''

''فکر ہی نہ کریں تایا......!'' قاسم کھڑا ہوتے ہوئے بولا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ پیچھے سے شہاب الدین نے پکارا۔

''یہ گامو کو حویلی بھیج اسے کہہ کہ دیکھ کے آئے سب سٹرؤی سوں گئے ہیں تو چار کباب اور تکے میرے لیے بھی لے آئے۔ کوئی نہیں...... تھوڑا بھنگی تیرا تایا بھی بن جائے۔''

قاسم نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل کر فضا میں لمبی سانس چھوڑی۔

''سٹرؤی تو تجھے بھی سلاؤں گا تایا......بس ویلا چ ہاتھ لگ جائے میرے......''

اس نے تیزی سے قدم جیپ کی جانب بڑھائے جو گھنی جھاڑیوں کے پار رکی ہوئی تھی......دور کھڑے گامو پہ نگاہ ڈالی لیکن جان بوجھ کر اسے چوہدری شہاب کا پیغام نہیں دیا۔ ابھی جو کام کرنا تھا اس میں معمولی سی کوتاہی بھی اسے سولی پہ لے جاتی۔ پھر اس کی لاش پہ بھی تایا تکے ہی اڑاتا اور یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں میں سب باری باری بستروں میں گھستے چلے جا رہے تھے، کھانا کھایا جا چکا تھا۔ ملازم سمیٹنے کے ساتھ منہ چلاتے اور پیٹ بھرتے جا رہے تھے۔ ایسی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے جیسے سبھی کے سوتے جگا دیے تھے۔ جسے بھوک نہیں بھی تھی، اس نے بھی جی بھر کر کھایا تھا...... کہنے والے کہہ رہے تھے چوہدری شہاب الدین نے ایسا لذیذ کھانا تیار کرایا ہے کہ ہاتھ ہی نہیں رک رہا۔ جیسے جیسے سب کھانا کھاتے رہے آہستہ آہستہ حویلی کے مہمانوں کے لیے مختص حصے میں جاتے چلے گئے۔ کچھ

مہمان قدسیہ پھپھو کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے کچھ ایسی عورتیں جو برادری میں خاصا مقام رکھتی تھیں اور جن کے پاس خاندانی سیاستوں کی پٹاریاں تھیں، انہیں حمیدہ اپنے حصے میں لے گئیں۔

چوہدری آفتاب کی مکمل کوٹھی تو تھی ہی خالی اور باقی سبھی مہمانوں کا انتظام وہیں تھا۔ زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور مہمان سونے چلے گئے تھے۔ سکینہ اور قدسیہ نے گرما گرم سبز چائے ملازماؤں کے ہاتھوں سبھی کو ان کے بستروں میں دینے کی غرض سے بھجوائی تھی کہ ٹھنڈ کا اثر ٹوٹ سکے لیکن سب کی سب یونہی کپوں سے بھرے تھال اٹھائے واپس آ گئی تھیں۔

”وہ وڈی چوہدرائن جی! پروہنے تو سوسوں گئے ہیں جی...... ادے خراٹے مار رہے ہیں اور ادوں کے منہ ہی رضائیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ چائے پینے کی کسی کو ست (ہوش) ہی نہیں جی۔“

سب کا کم و بیش ایک سا بیان سکینہ کو حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔ لیکن وہ سمجھ سکتی تھیں کہ سارے دن کی تھکان نے مہمانوں کو لیٹتے ہی سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ خود ان کی آنکھیں بھی تو نیند سے بوجھل تھیں جنہیں وہ بمشکل کھولتے ہوئے کام نمٹاتے پھر رہی تھیں کہ وڈی چوہدرائن کا محض خطاب ان کے نام نہیں تھا، وہ پوری ذمہ داری سے حویلی لکھاں کا انتظام چلاتی تھیں۔ ابھی انہیں کشور کے کمرے کا بھی چکر لگانا تھا جس کا خیال آتے ہی ان کے چہرے پہ دھیمی میٹھی مسکان آ گئی۔

آج ان کے بیٹے کی چاہت اس کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ خوش تھا تو وہ بھی بے حد خوش تھیں۔ کشور جیسی لڑکی انہیں کہیں نہ ملتی۔ وہ ہر طرف کا چکر لگاتے ہوئے اسی جانب جا رہی تھیں اور حیرت کا شکار ہو رہی تھیں کہ تقریباً سبھی لوگ سو چکے تھے۔

قدسیہ کی کوٹھی کی اندرونی بتیاں بھی تقریباً بجھ چکی تھیں۔ حمیدہ کا تو خیر معاملہ ہی دوسرا تھا۔ انہوں نے حسنات کے کمرے میں جھانکا تو وہ بھی آڑا ترچھا سا بیڈ پہ سو رہا تھا اور اس کے ایک آدھ دوست اور مدثر بھی وہیں موجود تھے۔ سب کے بے فکر خراٹے کمرے میں دھمالیں ڈال رہے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر سب پہ دم کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عورتیں اپنے گھروں کے چار جوان بچے کہیں اکٹھے دیکھ لیتی تھیں تو انہیں یا تو ادھر ادھر کر دیتی تھیں یا ان پہ سورتیں پھونکتی رہتی تھیں کہ ایک ساتھ دیکھ کر کسی کی نظر نہ

لگے۔وہ خاموشی سے واپس پلٹ آئیں۔

راستے میں جو جو ملازمہ ملتی جا رہی تھی سب کو جلدی جلدی کام سمیٹنے کا کہتے اور سونے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ کشور اور حیات کے کمرے کی جانب بڑھیں لیکن ایک دم انہیں خانم کا خیال آیا، رک کر ملازمہ سے پوچھا۔

''میداں...... خانم کدھر ہے؟ کہاں سوئی ہے؟''

''وڈی چوہدرائن جی، وہ رابی بی بی انہیں اپنی کوٹھی لے گئی تھیں۔کھانا کھاتے ہی چلی گئی تھیں جی وہ......''

سکینہ اثبات میں سر ہلاتے آگے بڑھ گئیں۔کشور کے کمرے کے دروازے کا ہینڈل کھولنے کے لیے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔اندر روشنی مکمل تھی لیکن منظر نا قابل یقین تھا۔کشور دونوں تکیے کمر کے پیچھے لگائے سر بھی ان کے سہارے پیچھے گرائے سو رہی تھی جبکہ حیات اس کے پھیلے لہنگے پہ اسی کی جانب چہرہ موڑے ہوئے تھا۔بازو موڑ کر سر کے نیچے تکیہ کر رکھا تھا۔جوتے اتار رکھے تھے لیکن شیروانی ابھی تک زیب تن تھی۔کشور کی رونمائی کے کنگن اس کی کلائیوں میں تھے۔صاف پتا لگ رہا تھا کہ باتیں کرتے کرتے سو گئے ہیں۔لیکن سکینہ کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔انہیں تو یقین تھا کہ وہ اندر جائیں گی تو دونوں خوش گوار موڈ میں دھیما دھیما چہک رہے ہوں گے۔

حیات کے اندر جانے سے پہلے اسے رونمائی کے کنگن پکڑاتے انہوں نے بتا دیا تھا کہ کچھ دیر تک وہ چکر لگائیں گی کمرے کا۔ذہن میں یہی تھا کہ مبادا کمرے کا دروازہ بند ہو جائے۔ابھی بھی ایک نامعلوم سی جھجک نے ان کے پیروں کو باندھا لیکن وہ اندر داخل ہوئی تھیں۔دونوں کے قریب آ کر ان کی نیند سے گہری ہوتی سانسوں کی آوازوں نے لاشعوری طور پر انہیں مطمئن کیا تھا۔ورنہ دل کو اچانک سے ایسے وسوسے نے جکڑا تھا جس کو زبان پہ لانا تو دور کی بات، ذہن کے کسی گوشے پہ اس کا عکس بھی نہ بننے دیتیں۔

انہوں نے پائنتی پڑا لحاف دھیرے سے کھولا اور اسے بنا سرسراہٹ دونوں پہ ہلکے پھلکے انداز میں اوڑھا دیا۔آج کی رات اس قدر گہری نیند پہ ان کا اچنبھا شاید ساری عمر نہیں جانے والا تھا۔تبھی

حیات کروٹ سے سیدھا ہوا اور نیند سے بھری آنکھوں سے ماں کے چہرے کو دیکھ کر مسکرایا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ سکینہ کو اس پہ پیار آ گیا اور جھک کر بے حد محبت اور آہستہ آواز میں بولیں۔

''میرا پتر، اوپر ہو کر سیدھا ہو کے لیٹ جا دیکھ وہ بٹی بھی کیسی بے آرام سی سو رہی ہے۔ آج میرا چن بہت ہی تھک گیا۔ ہاں......! چل میرا پتر ٹانگیں اوپر کر اور سیدھا ہو کر سو جا۔''

انہیں موقع غنیمت لگا اور لگے ہاتھوں حیات کو ترتیب سے سلانے کی کوشش کر ڈالی تا کہ رات میں کشور کی آنکھ کھلے تو وہ بھی سیدھی ہو کر سو سکے۔ لیکن حیات نے جواب میں بس دو بار ''ہوں'' کی آواز نکالی اور پھر گہری نیند میں اتر گیا۔ سکینہ نے اس کی پیشانی پہ آئے بال محبت سے پیچھے کیے اور مجبوراً انہیں یوں ہی چھوڑ کر دروازے کی جانب پلٹ گئیں کیونکہ نیند سے ان کی اپنی حالت اس قدر بری تھی کہ لگتا تھا کسی بھی پل گر جائیں گی۔ انہوں نے زیرو کا بلب جو دیوار پہ اونچائی پہ لگا تھا، وہ جلایا اور کمرے کی بتیاں بجھاتے ہوئے دروازہ بند کرتے باہر چلی گئیں۔ اندر کمرے میں نیلگوں مدھم روشنی تھی اور سردی تھی جو موت کی طرح پھولوں سے مہکتے کمرے میں چکرا رہی تھی۔

☆......☆......☆

سنہری خاموشی سے اپنے بستر سے اتری تھی۔ اتنے دبے پاؤں چلتی وہ باہر آئی تھی کہ بلی کی چاپ کا گمان ہوتا تھا۔ بمشکل چپل پھنسا کے وہ تکلیف دباتی ٹھنڈے فرش کو اپنے پیروں تلے روندتی باہر تک چلی آئی۔ حویلی لکھاں کا وسیع و عریض صحن اس وقت بالکل ویران اور خالی پڑا تھا۔ کھانے کے میز کرسیاں موجود تھیں لیکن کچھ کرسیاں اوپر تلے رکھ کر ایک طرف سمیٹ دی گئی تھیں جبکہ باقی یوں لگتا تھا جیسے کرتے کرتے کوئی یوں ہی چھوڑ گیا ہو۔ چند میزیں جو قدرے اندھیرے میں گھنے درختوں کے نیچے تھیں، ان پہ سے برتن بھی نہیں اٹھائے گئے تھے۔ اسے تھوڑی حیرت ضرور ہوئی کیونکہ حویلی کے ملازم بے حد ذمہ دار اور مستعد تھے۔ وہ یوں آدھا ادھورا کام چھوڑ کر جا نہیں سکتے تھے تو اب یوں بکھرا ہوا صحن اسے متحیر کر گیا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی بھلے یہاں جو بھی ہوتا کیونکہ جو اس پہ بیت رہی تھی وہ اہم تھا۔ اس نے نیم اندھیرے میں اپنے پیروں پہ نگاہ ڈالی جہاں اس نے ٹوتھ پیسٹ لگا رکھی تھی۔ چپل کی

پٹیاں اسے تکلیف دے رہی تھیں لیکن وہ محتاط انداز میں قدم اٹھا رہی تھی۔ سارے پیر چھوٹے بڑے آبلوں سے بھر گئے تھے۔ چائے اس قدر شدید گرم تھی کہ زیادہ وقت نہیں لگا تھا کہ اس کے پیروں پہ چھالے سے نمودار ہو کر اس کی تکلیف میں اضافہ کر گئے تھے۔ پنڈلیوں کی جلن الگ سوا تھی۔ لیکن پنڈلیوں پہ کپڑا ہونے کی وجہ سے وہاں چھالے بننے کی بچت ہو گئی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر فضا میں پھیلی خوشبو کو محسوس کیا تو پیٹ میں اینٹھن سی اٹھی۔ بھوکی تو وہ تھی ہی لیکن کمرا بند کر کے جوں بیٹھی تو دوبارہ حمیدہ کے کہنے پہ بھی نہیں کھولا۔ اس نے مڑ کے ایک نظر حمیدہ کے حصے پہ ڈالی جدھر تمام بتیاں گل تھیں۔ وہیں کھڑے قدسیہ پھپھو کی کوٹھی دیکھی تو وہاں بھی ہو کا عالم تھا۔ چوہدری آفتاب کی کوٹھی میں ویسے ہی مہمان ٹھہرے تھے۔

وہ کچھ عجیب سا محسوس کرتی پچھلے باغیچے کی جانب چل دی...... ایسے لگتا تھا جیسے ساری حویلی اچانک سے خالی ہو گئی ہو۔ آدھی رات کا سماں تھا اسے خوف سا بھی محسوس ہوا کیونکہ یہاں اسے امید تھی کم از کم بانو ضرور مل جائے گی لیکن صحن سے بدتر حشر برپا تھا۔ وہ جلدی سے واپس مڑی پہلے تو تکلیف کے سبب لڑکھڑا رہی تھی لیکن اب واپس مڑتے انجان سایوں کا آسیبی خوف ہمراہ تھا۔ یہاں آتے لاشعور میں ملازموں کی موجودگی تھی لیکن اب یوں خالی اور ویران باغیچہ ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے کوئی تباہی ہو کر گزر گئی ہو...... واپسی کے لیے قدم اٹھاتے اس نے تقریباً خود کو بھگایا تھا۔ تکلیف کی شدت سے سسکاریاں نکل رہی تھیں لیکن وہ نادیدہ جنوں چڑیلوں کے خوف سے اندھا دھند چلتی چوہدری شہاب کی کوٹھی میں داخل ہو گئی...... خیال یہی تھا کہ یہاں جو بھی ملازمہ سامنے دکھائی دی، اسے ساتھ لے گی اور واپس حمیدہ کے پاس چلی جائے گی۔ لیکن ساتھ پلیٹ بھر کے تکے کباب لیتی جائے گی۔ یہاں بھی لگ بھگ وہی منظر تھا۔ سب سو چکے تھے اور ملازمائیں بھی بڑے سے اسٹور کے فرش پہ گدے بچھائے لحاف اوڑھے پڑی تھیں۔

سنہری کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا اٹھی۔ بھلا حویلی لکھاں کب سوئی تھی۔ یہاں تو رات کے وقت ملازم اکثر جاگتے ملتے تھے۔ سنہری کے پیروں کے آبلے ٹیسیں دینے لگے۔ بھوک الگ نڈھال

کر رہی تھی۔ جلدی سے کسی طرح کچن میں اور سلیب سے ایک پلیٹ بنا آواز کے اٹھاتی پتیلے کی جانب بڑھی۔ اس نے ڈھکن اٹھایا لیکن وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گرا اور منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی......ایک چھوٹی سی بھوری بلی جو نہ بچہ تھا، نہ بڑی بلی تھی پتیلے کے ساتھ جڑی پتا نہیں سو رہی تھی یا مر گئی تھی......اس کے آگے بوٹی موجود تھی جو آدھی سے زیادہ کھائی ہوئی تھی اور باقی ویسے ہی اس کے منہ کے قریب رکھی تھی......سنہری کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس کے پیروں سے صحیح معنوں میں زمین کھسکی تھی۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں سے پنجوں کے بل نیچے بیٹھی اور بلی کے جسم پہ محض دو انگلیاں رکھ کر اس کی سانس محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ اپنی تیز نظریں بھی اس کے پیٹ پہ گاڑ رکھی تھیں تا کہ اسے پھولتا پچکتا دیکھ کر تسلی کر سکے......صد شکر کہ وہ زندہ تھی لیکن ایسے کیوں تھی؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے پھٹنے کا قصد کیا اور اپنے ہاتھ میں تھامی پلیٹ کو سراسیمگی سے دیکھتی وہ جو سوچ رہی تھی اس پہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک دم سے پلیٹ کو واپس سلیب پر رکھا اور جھک کر پتیلے کے اندر موجود سارا کھانا چیک کیا......دوسرے پتیلے کا ڈھکن ہٹایا تو وہاں سیخ کباب تھے لیکن ان کی مقدار کم تھی۔

اس نے ایک کباب اٹھا کر اسے درمیان سے توڑا اور ناک کے قریب لا کر سونگھا۔ کچھ ہٹ کر محسوس نہیں ہوا۔ بے اختیار آدھا ٹکڑا اس نے منہ میں ڈال لیا۔ چٹپٹے، رسیلے، مزیدار کباب کا ذائقہ زبان سے حلق میں اترا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے ٹکڑے کو سنہری ہاتھ میں لیے کچھ پل دیکھتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اسے واپس پتیلے میں پھینک کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے کچن سے نکلتی چلی گئی۔ اس نے باری باری سب کے کمرے چیک کرنے شروع کیے۔ کوئی کمرا لاک نہیں تھا، سب یوں سو رہے تھے جیسے اس رات کے بعد دوبارہ سو نہیں سکیں گے۔ سب سے زیادہ حیرت اسے حیات اور کشور کو سوتے دیکھ کر ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ یہ حیرت نہیں خوشی کا احساس ہے۔ وہ خوش ہوئی تھی انہیں یوں بے حس و حواس سویا دیکھ کر۔ وہ جس طرح آئی تھی، ویسے ہی اپنے حصے میں چلی آئی۔ اس نے اپنی ماسی کے کمرے کا دروازہ کھولا تو انہیں بھی اسی حال میں سویا پایا۔ اب آخری کمرا قاسم کا تھا جسے اسے چیک کرنا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اندھیرے کمرے میں قاسم کے بیڈ کو

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

''قاسم......قاسم سو رہے ہو؟''

اس نے واپس پلٹ کر دیوار پہ سوئچ تلاش کر کے بٹن دبایا تو کمرے کی لائٹ جل اٹھی۔ قاسم کا بیڈ صاف ستھری حالت میں تہ شدہ لحاف کے ساتھ پڑا تھا۔ سنہری بے ساختہ تالی مارتی بولی۔

''یہ ہوئی نا بات......توتم اور تایا شہاب ہو اس سارے کارنامے کے پیچھے......سنہری کو بتایا تک نہیں تم نے بیٹے......واہ...... پر پرزے نکال لیے اور مجھ سے اڑنے کی اجازت بھی طلب نہیں کی......!''

اسے سارا کھیل سمجھ میں آ گیا تھا کیونکہ وہ سنہری تھی۔ شیطانی چالیں اس کے لیے نئی یا انوکھی نہیں تھیں۔ اس نے جب سکینہ تائی کے کمرے میں کچھ دیر پہلے جھانکا تھا تو وہاں تایا شہاب نہیں تھے۔ وہ یہی سمجھی کہ حسب معمول رات ڈیرے پہ ٹھہر گئے ہوں گے لیکن اب قاسم کا نہ ہونا اور ساری حویلی لکھاں کے مکینوں کا ہوش و خرد سے بے گانہ ہونا، خود بس انہی دو کا منظر سے غائب ہونا صاف ثابت کر رہا تھا کہ جو کھانا تایا شہاب نے اس قدر اہتمام سے باراتیوں کو کھلایا تھا، وہ کوئی سادہ کھانا نہیں تھا۔ پوری پوری دیگیں ساتھ والے دو پنڈوں تک بھی بھیجی گئی تھیں تو کیوں؟

اس لیے کہ اس کھانے کے اثرات کی وجہ سے جس قدر خلقت مدہوش ہو سکے، ہو جائے اور اس آڑ میں تایا شہاب اور قاسم جو کرنا چاہ رہے ہیں، وہ کر لیں۔

''لیکن آخر کھانے میں ہے کیا......؟'' وہ سرسراتی آواز میں کہتی ڈریسنگ کے ساتھ رکھی کرسی پہ ٹک گئی۔ دبیز قالین کی نرمی گرمی پیروں کو سکون دینے لگی۔ ''ایسا بھی کیا ہے جو ساری حویلی بھنگ پی کے سو گئی۔''

کمر ٹیک کے اپنی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر کے سوچنے کے انداز میں سارے کمرے میں نگاہیں گھمائیں اور ذہن میں جھماکا ہوا۔

''بھنگ......اوہو......ہوہو......بھنگ......اچھا جی......بھنگ کھلا دی اس تایا بھتیجے نے

سارے ٹبر کو...... او تیری خیر!'' نتیجے پہ پہنچتے ہی وہ ایک بار پھر ہاتھ پہ ہاتھ مارتی زوردار قہقہہ لگاتی ہنستی چلی گئی۔ سننے والا کون تھا۔ سارا پنڈ تو بھنگ کھا کے سویا پڑا تھا۔ وہ تا دیر تائے بھتیجے کی حرکت پہ ہنستی رہی تھی۔ پھر یکدم ہنسی کو بریک لگاتی ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

''کیا ہو جو آج رات کشور مر جائے۔ میں کشور کے گلے پہ چھری چلا دوں اور چھری پکڑا دوں حیات کے ہاتھ میں...... نہیں نہیں...... حسنات کے ساتھ کتے والی ہونی بنتی ہے۔ کل سارے زمانے کو پتا چلے شادی کی رات دیور نے سب گھر والوں کو بھنگ والا کھانا کھلا کر بھابھی کا گلا کاٹ دیا۔ ملزم اس شادی سے خوش نہیں تھا۔'' ایک بار پھر زوردار قہقہہ فضا میں پھیل کر ساری فضا کو مکروہ کر گیا۔ کوئی اچانک اسے یوں ہنستے دیکھتا تو مارے خوف کے تھر تھرانے لگتا۔

''چل سنہری...... قدرت نے موقع دیا ہے...... برباد نہ کر...... کچھ ایسا کر ساری حویلی یاد رکھے...... سنہری کو ستانے کا انجام سب کے دماغوں پہ نقش ہو جائے......'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''سوچ سنہری سوچ...... وقت کم ہے مقابلہ سخت...... ہمت کر اور کر جا جو کرنا ہے۔''

وہ اپنے پیروں کی تکلیف یکسر بھولتی کمرے سے باہر نکلی۔ واپس کچن میں جاتے اس کے پیروں میں نہ تو درد ہو رہا تھا نہ قدموں میں کوئی سستی تھی۔ اس نے دراز کھولی اور اچھی طرح اسے ٹٹولنے لگی۔ ہر سال جب بھی عید قربان پہ جانور ذبح ہوتے تھے تو ہمیشہ ٹوکے چھریاں اپنے ذاتی دیے جاتے تھے اور حمیدہ اس معاملے میں خاصی نکتہ چیں تھیں کہ قصائیوں کی چھریاں انہیں غلیظ لگا کرتیں۔ اس لیے سنہری جانتی تھی کہ یہیں کہیں چھریاں ٹوکے پڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑی تلاش بسیار کے بعد اسے مطلوبہ سامان مل گیا تھا۔ اس کے چہرے کی سفیدی میں بدباطنی کی سیاہی یکدم عود کر آئی۔ ایک پل کو اتنا بڑا چھرا تھامتے اس کے ہاتھ کپکپائے تھے۔

''ہمت کر سنہری...... کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں۔ آئے دن بندے قتل ہوتے ہیں، زنانیاں مر مرا جاتی ہیں۔ ایک حویلی لکھاں میں مر جائے گی تو کیسی آفت آ جائے گی۔'' وہ تھوک نگلتے خود کو تسلی دیتی اپنا خوف خذف کر رہی تھی۔ ''اور ایک کشور کے مر جانے سے کتنا سکھ ہو جائے گا۔ سب کو اپنی مرضی

کی شے مل جائے گی۔ قاسم کو خانم اور مجھے حیات...... کشور کا غم میں اسے رہنے ہی نہیں دوں گی۔ سب راضی خوشی رہیں گے۔ کیا جاتا ہے۔ بس ایک جی کی قربانی ہی تو چاہیے تو وہ کشور کیوں نہیں...... خانم کو تو میں سکون سے دبالوں گی۔ تائی سکینہ کے گھر پر بھی میرا راج ہو گا اور ماسی کا گھر بھی میری مٹھی میں رہے گا، میں ماسی کو خانم کو اہمیت دینے ہی نہیں دوں گی۔ جب سب کچھ مجھ سے پوچھ کر ہو گا تو خانم کی اوقات کبھی بننے ہی نہیں پائے گی۔ ساری حویلی لکھاں میرے ہاتھوں میں ہو گی...... اور اس قدسیہ پھوپھی کو تو میں مہینہ دو مہینہ میں اٹھوا کر ادھر سے پھنکوا دوں گی۔ حسنات کو کشور کے قتل کے الزام میں جیل ہو گی۔ یہ وہاں سڑے گا۔ بس اس کے لیے کشور کو مرنا ہو گا...... کیسے سب کچھ سکون سے ہوتا چلا جائے گا...... اور کشور بھی تو سکون سے مرے گی۔ بھنگ کھا کے ویسے ہی آدھی مری پڑی ہے...... چھری پھرنے کی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔"

اس کی پلاننگ کی خوف ناکی نے پورے ماحول کو لپیٹ میں لیا تھا۔ پہلے سے چھائی سراسیمگی میں یک بیک اضافہ ہوا تھا اور وہ اسی طرح ہاتھ میں چھرا تھامے وہاں سے باہر نکل آئی۔ ہر طرف ویسا ہی حال تھا جیسا وہ چھوڑ کر بھاگی تھی۔ سب مدہوش پڑے تھے۔

وہ چلتی ہوئی چوہدری شہاب کی کوٹھی کا رخ کر رہی تھی۔ اس کے قدموں میں جوش، دل میں خوف اور دماغ میں متزلزل خیالات تھے۔ بچپن سے جوانی تک ذلیل ہوتی آئی تھی۔ جب چھوٹی تھی سب مامے چاچے کے بچے اس سے چڑتے تھے۔ اس سے نفرت کی حد تک بے زار رہا کرتے، کوئی اپنے ساتھ کھلاتا نہیں تھا۔ جہاں سب بیٹھے ہوتے، اس کے آتے ہی چپ چھا جاتی۔ کوئی اپنی خاص بات اس سے نہ کرتا۔ ان سب میں اس کے اپنے بہن اور بھائی بھی شامل تھے۔ لیکن وہ اس سے عمر میں بڑے تھے اس لیے شروع سے ہی ان سے فاصلہ رہا تھا۔ آپا کی بہت چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی اور بھائی کی منگنی کر ڈالی۔ جس سے منگنی کی، سنہری اسے اور اس کے پورے ٹبر کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس سب کے پیچھے وجہ سنہری کی فطرت تھی۔ جو کسی بھی محفل کا حسن برباد کر دینے میں ثانی نہیں رکھتی تھی۔ کیسا ہی موقع ہوتا، سنہری نے وہاں بیٹھے بیٹھے ایسی آگ لگانی ہوتی تھی کہ سبھی جلتے بلتے تتر بتر ہو جاتے۔ باقی سب تو کبھی

کبھار کا ہدف تھے وہ تو ایسی با کمال تھی کہ اپنے اماں ابا کو ایک سیکنڈ میں لڑوا دیتی تھی۔

چاچے بابے سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ بڑی سی کوٹھی کے پورشن بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک ان کا تھا۔ باہر صحن مشترکہ تھا جس میں صبح سے رات ایک چارپائی اور کرسیاں بچھی رہا کرتیں جہاں سبھی دیورانیاں، جٹھانیاں سبزی کی ٹوکریاں لیے نکل آتیں اور پھر ہاتھوں سے زیادہ باتوں کا دور چلتا۔ وہیں قریب ہی زبردستی سب کے بیچ جگہ بنائے بیٹھی سنہری اپنی کسی کزن کے کام میں پھسپھساتی۔

''کی خیال اے...... جنگ پلاسی ویکھنی اے...... رک ابھی کرا کے آتی ہوں۔''

کزن کو وہ لگتی تو زہر تھی لیکن ایک مزے دار سا تجسس اسے اثبات میں سر ہلانے پہ مجبور کر دیتا کہ دیکھیں تو سنہری کرتی کیا ہے......؟

سنہری اٹھلاتی کسی تائی یا چاچی کے قریب جا بیٹھی...... اپنی سب کزنوں کے جھنڈ کو فخریہ دیکھتے آنکھ دبائی۔ ماں اور چاچی کو آپس میں باتوں میں مشغول پا کر تائی کے کان کے قریب منہ لا کر دھیرے سے بولی۔

''تائی امی......! چاچی کل اماں سے کہہ رہی تھی کہ تو ویاہ سے پہلے سے ہی روگی ہے...... بیماری ساتھ لائی تھی۔ جب ہی تو ساری اولاد بھی مریل جمی ہے تو نے......''

تائی گوبھی کاٹتے سکتے کے عالم میں ہاتھ میں چھری لیے دو منٹ آنکھیں چوپٹ کھولے بیٹھی رہیں اور پھر چاچی کو للکار کر کہا۔

''ہیں نی کھسماں نوں کھانیے پروین...... کون سے روگ دیکھے تھے تو نے میرے اندر جو طعنے مارتی ہے۔ اور تو مسرتے...... (اشارہ سنہری کی ماں کی جانب تھا) تو بھی اس کے ساتھ مل کر مجھ پہ بہتان باندھتی ہے۔ مار پوے تم دونوں پہ اللہ کی۔ میری ہی اولادوں سے رشتے جوڑ کے بیٹھی ہو اپنے بچوں کے اور انہیں ہی مریل کہتی ہو۔ ستیاناس جائے تم دونوں کا، اب تو میں چنگی طراں سوچوں گی پھر کروں گی ویاہ اپنی اولادوں کا...... دیکھ کیسے تلوے چٹواتی ہوں۔''

چاچی اور اماں دونوں پہلے تو ہک دک سنے جاتیں لیکن پھر جب بس ہو جاتی تو وہاں بھی آستینیں

کس لی جاتیں اور وہ گھمسان کا رن ہوتا کہ کانوں کو ہاتھ لگ جاتے۔ رات کو مرد گھر آتے تو بیویاں انہیں بھی لڑوا دیتیں۔ بھائی بھائی سے کتنے دن منہ پھیر کے نکلتا۔ یوں سنہری کی ایک پھلجڑی ایسا کمال دکھاتی کہ سب انگلیاں منہ میں داب لیتے۔

سنہری اپنی ان کزنوں کے سامنے ٹھٹھہ بنانے کی خاطر ایسا کرتی تھی لیکن جب تماشا لگنا ہوتا اس وقت سب اسے دبی دبی ہلاشیری دے دیتیں پر جب لگ چکتا اور نتیجہ خاصا خطرناک نکلتا تو سب کے دل سنہری سے مزید متنفر ہو جاتے۔ یوں کوئی بھی اسے اپنے قریب کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ لڑکے اس سے بری طرح چڑتے تھے اور لڑکیاں اس سے کوسوں دور بھاگتی تھیں۔ ماں اسے اپنی عادت بدلنے کی منتیں کرتی مر گئی...... بہن بیاہی گئی اور بھائی نے شادی سے پہلے باپ کو صاف کہہ دیا کہ میں اپنے گھر میں سنہری جیسی فتنی کو برداشت نہیں کروں گا اس لیے اس کا بندوبست کرو۔ باپ نے جھڑک کے چپ کروا دیا لیکن جلد ہی وہ بھی اللہ کو پیارا ہوا تو سنہری کا ناطقہ مکمل طور پر بند ہو گیا۔

بہن سسرال والی تھی وہ رکھ نہیں سکتی تھی۔ چاچے تائے اور ان کے گھر والے دیکھ نہیں سکتے تھے، کجا کہ اپنے گھر رکھ لیتے۔ مجبوراً بہن نے ہی ماسی حمیدہ کو فون کر کے اس کی حالت کی اطلاع دی۔ ماسی کو اپنی بھنیوی کی محبت اس کڑا کے کی جاگی کہ اگلے دن سب سے بڑی گاڑی پہ قاسم کو سنہری کو لینے اس کے پنڈ بھیج دیا۔ سب اس وقت کی پجارو کو دیکھ کر آنکھیں پھاڑے رہ گئے۔ لو بھلا بتاؤ وہ سنہری جسے کوئی نزدیک بٹھانا پسند نہیں کرتا تھا پجارو میں بیٹھ کر اپنی ماسی کے گھر چلی تھی اور وہ بھی اس قدر خوبرو مرد کے ساتھ بیٹھ کر۔

سنہری بھی اپنا پتا بوٹا یہاں سے سمیٹ کر لے گئی۔ جس وقت قاسم کے ساتھ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھی اس نے ایک متنفر نگاہ چھت کی منڈیر سے دیکھتی اپنی نام نہاد کزنوں پہ ڈالی جن کی نگاہوں سے رشک و حسد چھلکا پڑ رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے چہرہ موڑ کر اس نے سیدھا کیا تبھی گیٹ پہ کھڑی تائی چاچیاں لپک کر آگے ہوئیں مقصد قاسم کو قریب سے اچھی طرح دیکھنا بھی تھا۔

”اے سنہری پتر...... دل سوڑا کر کے نہ جا...... ہم تیرے اپنے ہیں۔ چار دیہاڑے رہ کر جب

رج جائے تو بشک واپس آ جانا۔ تیرے بھرا کو ہم سمجھالیں گے۔ تیری بھرجائی کی کیا مجال جو تیرے ساتھ اُچی نیویں کرے...... کیوں پتر......" چاچی نے اچھی طرح سنہری کو چوپڑ کر قاسم کو پکارا۔ "بڑا سجیلا پتر ہے تو حمیدہ کا...... یہ نکا سا تھا جب آیا تھا۔ چل آئیں گے کسی دن تیری ماسی سے ملنے، میری دھیوں کو بڑا شوق ہے حمیدہ کی حویلی دیکھنے کا۔"

قاسم نے اکتاہٹ بھرے انداز میں محض سر ہلا دیا جبکہ سنہری نے نہایت نخوت سے تھوڑا شیشے کی جانب جھک کر چاچی کو مخاطب کیا۔

"بوہتے خواب نہ دیکھ چاچی...... بلاؤں گی، بالکل بلاؤں گی حویلی لکھاں...... لیکن اپنے ویاہ پہ...... وہاں کی مالکن بن کے......" آخری فقرہ اس نے اس قدر آہستگی سے کہا کہ محض چاچی اور تائی سن سکیں اور حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ سنہری ان کے تاثرات سے حظ اٹھاتی سیدھی ہوئی اور بولی۔

"چلو قاسم...... ماسی میرا انتظار کر رہی ہوگی...... رب راکھا تم سب کا......"

پجارو سے باہر للچاتی نظروں سے کھڑے سبھی افراد کو وہ بے حد کروفر سے ہاتھ ہلاتی وہاں سے چلی گئی اور آج تک حویلی لکھاں میں موجود تھی اور اس ٹھسے سے موجود تھی کہ حویلی کے اپنے مکینوں کے پیر اکھڑنے کو تھے۔ اس نے تبھی عہد باندھا تھا کہ حویلی لکھاں کی مالکن بن کر اپنے ددھیال لوٹے گی اور سب کو اوقات اچھے سے باور کرائے گی اور پھر یہاں پہنچ کر عیش و آسائش دیکھ کر یہ ارادہ مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ معاملہ انا سے آگے نکل کر ضد میں ڈھل چکا تھا۔

وہ سنہری جس کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی تھی، وقت قریب تھا کہ سب پہ راج کرتی۔ اس سنہری نے کبھی نہیں سوچا اور سمجھا تھا کہ وہ کن وجوہات کی بنا پہ دھتکاری جاتی ہے۔ سب اس سے بے زار کس بات پہ رہتے ہیں۔ وہ کیوں شرانگیزی کی رسیا ہے۔ اس کا مطمح نظر بس مرتبہ اور جاہ و مقام تھا جسے اسے ہر قیمت پہ حاصل کرنا تھا۔ اور جب ضد کی لہر جنون کے کنارے سے ٹکراتی ہے تو وہ احساس رحم اور زود رنجی سب کچھ بہا لے جاتی ہے۔ سنہری کو بھی اس وقت اپنے مقصد کے سامنے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ آر یا پار دونوں صورتوں میں جیت اسی کی ہو ورنہ ایک بار پھر دنیا اس پہ ہنسے گی اور اب

جو قہقہے اٹھیں گے ان کی بازگشت اسے پاگل کر دے گی۔

وہ الجھی بکھری سوچوں میں غلطاں تیز تنفس اور جوش و خوف سے ملے سرخ چہرے کے ساتھ ایک بار پھر چوہدری شہاب الدین کی حویلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کا رخ حیات اور کشور کے کمرے کی جانب تھا۔ کسی کے اٹھنے کا ڈر اسے نہیں تھا کیونکہ سب اتنی گہری نیند سو رہے تھے کہ وہ چاہتی تو سب کی گردنیں مار جاتی، کسی کو خبر نہ ہوتی۔

وہ کمرے کے باہر پہنچی تھی اور ہینڈل پہ ہاتھ رکھتی بنا آواز دروازہ کھولتی اندر داخل ہوئی اور ناک کی سیدھ میں وسیع و عریض اور سجے سجائے خوب صورت بیڈ پہ نیم دراز کشور کو نفرت آمیز نگاہوں سے تولا۔ تصور میں اس جگہ خود کو بیٹھا دیکھا تو مزید شدت سے اس کو مار دینے کی خواہش مہمیز ہوئی۔ وہ دبے قدموں سے چلتی بیڈ کی جانب آئی جس کی پائنتی کی طرف حیات کروٹ کے بل تکیہ سر کے نیچے دبائے بے سدھ سویا پڑا تھا۔ سنہری نے کشور کے چہرے کو دوپٹے کی اوٹ سے نکالا اور اسے اپنی نگاہوں کے سامنے کیا۔ چھری کے دستے کو اس رخ میں تھاما کہ اس کا پھل نیچے کی جانب تھا۔

وہ مکروہ انداز میں مسکرائی اور تھوڑا سا کشور پر جھکتے ہوئے غرائی لیکن آواز دھیمی تھی۔

''چچ...... چچ...... چچ...... تم تو حیات کو ابھی جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکی ہو گی نا کشور...... دیکھو کیسے میرے ہاتھ میں تمہارا نصیب قید ہو گیا...... حیات میرا تھا، میرے پاس آ چلا ہے۔ تم اپنی قبر میں لیٹی اس کا انتظار کیا کرنا کہ کب وہ آئے اور فاتحہ پڑھ جائے...... میں کبھی کبھی بھیج دیا کروں گی...... تم مرنے کے بعد فکر نہ کرنا...... بس سکون سے مر جاؤ اب...... سمجھیں......؟''

کسی خونی بھیڑیے سی غراہٹ تھی جو اس کے حلق سے ابھر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر فضا میں اپنا ہاتھ بلند کیا...... دوسرا ہاتھ بھی اوپر اٹھے ہاتھ پہ مضبوطی سے جمایا۔ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھوں نے کشور کے سینے میں اتر جانے کا قصد کرنا چاہا تھا کہ اچانک پوری فضا زوردار دھماکوں سے گونج اٹھی یوں لگا جیسے قیامت کی منادی ہو گئی ہو۔ اس قدر ہولناک دھماکے ہوئے تھے کہ پنڈ کے پنڈ ہل کر رہ گئے۔

سنہری بری طرح خوف زدہ ہوتی ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی اور کرسی سے جا ٹکرائی۔ ہاتھ میں تھاما چاقو چھوٹ کر نیچے قالین پہ گرا۔ وہ اٹھانے جھکی تھی کہ فضا ایک اور دھماکے سے لرز اٹھی اور اس دھماکے نے حیات کو پوری طاقت صرف کر کے پلٹنے پہ مجبور کر دیا۔ سنہری کے پاس چاقو اٹھانے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ پل کی بھی دیر کیے بنا کمرے سے نکل بھاگی اور اتنی تیزی سے بھاگی کہ اس کے پیروں پہ پڑے آبلے چپل سے رگڑ کھا کر پھٹ گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ باہر صحن میں نکلتے ہی اس نے دور فضا کو دھویں سے بھرا دیکھا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح چلاتی اپنی حویلی کی جانب اندھا دھند بھاگی تھی۔

☆......☆......☆

تین دن بعد......

تم بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو شاید
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

سب کی یہی کہانی ہے! یہاں دودھ کا دھلا کوئی نہیں ہے۔ سب ہی کسی نہ کسی کے باب میں عہد شکن ہیں۔ سب ہی کسی نہ کسی کے قرض دار ہیں۔ کون ہے جو دعویٰ کر سکے کہ اس سے کبھی خطا نہیں ہوئی یا اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ اس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا یا کوئی اس کی وجہ سے دل شکستہ نہیں ہوا۔ یہ ایک چکر ہے جو دائرہ ہے جس میں سب موجود ہیں اور سب کے ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو کچھ نہ کچھ مل رہا ہے کبھی اچھا یا کبھی برا...... کبھی رلاتا تو کبھی ہنساتا۔ کبھی من بھاتا تو کبھی دل دکھاتا...... ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ جو جاتا ہے وہی آخر کار پہلے والے کے پاس لوٹ آتا ہے۔ یہی چکر ہے کہنے میں سیدھا سادہ ہے لیکن درحقیقت الجھا ہوا ہے۔ اس چکر میں کچھ لوگ بدبخت ہوا کرتے ہیں جو دوسروں کو محض تباہی بانٹتے ہیں۔ دکھ اور اذیت ہدیہ کرتے ہیں، ڈھیروں غم کا موجب بنتے ہیں۔ کبھی کوئی اچھائی یا بھلائی ان کے ہاتھ سے میسر نہیں آتی اور پھر چکر کے اختتام پر اپنے ہی ہاتھ کا دیا واپس ہاتھ میں آسماتا ہے۔ لیکن تب تک انسان بھول چکا ہوتا ہے کہ یہ وہی ہے جو اس سے دوسروں کو ملا تھا

تب وہ واویلا کرتا ہے بال نوچتا ہے کہ بھلا اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو اس کے حصے میں نارسائی آئی۔ کاش ماضی کا آئینہ ہوتا اس میں سب اپنی صورتیں دیکھ کر کرتوت دیکھ سکتے اور کوئی شکوہ نہ کر سکتا کہ اس نے آخر کیا کیا ہے؟

حویلی لکھاں بھی دھیرے دھیرے ایسے کرداروں سے بھرتی جارہی تھی جو اوروں کے لیے دکھ اور تباہی کا موجب تھے جن سے شر ہی پھیلا تھا ہمیشہ......

آج تیسرا دن تھا چھوٹی حویلی کو جل کر سیاہ ہوئے...... ابھی تک فضا میں جیسے جلنے والوں کی باس پھیلی تھی۔ ایسا ہولناک حادثہ تھا کہ ذہن و دل قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ تحقیق و تفتیش مسلسل جاری تھی لیکن کسی کو ہوش ہی کہاں تھا کہ کچھ بتاتا۔ عقلیں ماؤف اور دل جکڑے ہوئے تھے۔ حویلی لکھاں میں ایسا سوگ پھیلا تھا کہ آنے والی کئی نسلیں اس کا اثر محسوس کرتیں۔ ہال کمرے میں سفید چادریں بچھی تھیں جن کے وسط میں تپائی پہ سپارے رکھے تھے اور ایک طرف کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر تھا۔ وہاں جتنے بھی نفوس بیٹھے تھے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا اور ہاتھ مسلسل گٹھلیوں پہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔ کچھ عورتیں سپارے پڑھ رہی تھیں...... کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب کے ہونٹوں کو قفل لگ گئے تھے اور جسم یوں ادھ موئے تھے جیسے آسیب زدہ ہوں۔ ایک طرف سے مسلسل عورتیں آجارہی تھیں۔ یہ وہ طبقہ تھا جو کبھی مرگ پہ بھی خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ ان عورتوں کو ایسے مواقع پہ باتیں کرنا مرغوب رہتا تھا لیکن اس سانحے نے جیسے سب کو اپنی اپنی قبریں کھول کر دکھا دی تھیں۔ موت ایسی تلخ حقیقت ہے جس کی کڑواہٹ مرنے والے کے لواحقین کی زبانیں بھی چکھتی ہیں۔

یہیں ایک طرف سکینہ چرمرے کپڑوں میں ملبوس آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے ادھ موئی سے گٹھلیاں پڑھ رہی تھیں...... ہمیشہ سلیقے سے بندھے بال اور طریقے سے اوڑھا دوپٹا ان کی پہچان رہا تھا لیکن آج وڈی چوہدرائن کو پنڈ کی عورتوں نے بکھرے ملگجے حلیے اور الجھے بالوں میں بھی دیکھ لیا تھا جس کے پہلے پہلے پتر کی جنج صرف تین دن پہلے دھوم سے نکلی تھی۔ یوں جیسے نگاہ بد کا اژدھا ساری حویلی میں پھر گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی حیات سے بڑی نمرہ بیٹھی تھی جو اس حال میں بھی انتہائی وقت

سے پچھلی رات کو پاکستان پہنچی تھی کہ ایک ماہ کے وقفے سے اسے ڈاکٹروں نے تاریخ دے رکھی تھی لیکن اس اندوہ ناک حادثے کی خبر ملتے ہی وہ رہ ہی نہیں سکی تھی اور شوہر نے محض اس کی حالت کے پیش نظر جو اس صدمے کی وجہ سے بگڑنے کا اندیشہ پیدا ہو رہا تھا اسے فوری پاکستان بھجوا دیا تھا۔ وہ ماں کے پہلو سے لگی مسلسل آنسو بہا رہی تھی اور ساتھ ناکام دلاسا دے رہی تھی۔

سکینہ کے میکے کی خواتین بھی اردگرد بیٹھی تھیں اور قدسیہ کے سسرال کی عورتیں بھی موجود تھیں۔ تبھی اندر کسی کمرے سے بے حال سی قدسیہ آتی دکھائی دیں۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑی ستے چہرے کے ساتھ سکینہ کو دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی ان کی نگاہ قدسیہ پہ پڑی انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سکینہ نے ایک طویل آزردہ سانس خارج کی جس کے ساتھ ہی آنسو بھی نکلے اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ خواتین کو ابھی آنے کا کہتی وہ قدسیہ کے ہمراہ ہولیں۔ پیچھے پیچھے نمرہ بھی اپنا بھاری وجود لیے ساتھ تھی۔ حیات کے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے سکینہ کا کلیجہ منہ کو آیا۔ خوب صورت سجا سجایا بیڈ خالی پڑا تھا۔ بہترین فرنیچر سے مزین کمرا اور دبیز قالین سے سجا فرش صاف اعلان کر رہا تھا کہ یہ کسی کے لیے بے حد شوق اور ارمانوں سے سجایا گیا تھا۔ انہوں نے سارے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو خوب صورت منقش بھاری لکڑی سے بنی دبیز کرسیوں کے پیچھے انہیں کشور اور خانم بیٹھی دکھائی دیں۔ اگر ان میں اتنا رو رو کے معمولی سی بھی ہمت بچی ہوتی تو وہ ان دونوں بہنوں کی حالت دیکھ کر چیخیں مارتیں جو ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں بری طرح جکڑے پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو لیے پتھرائے چہروں کے ساتھ لاوارث اور بنجر وجود لیے بیٹھی تھیں۔

اللہ اللہ! کیسی دل شکستہ حالت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پورے جہان میں وہ دونوں بالکل اکیلی کسی انجان ویران مقام پہ بے یار و مددگار چھپی بیٹھی ہوں۔ سکینہ کا دل کٹ گیا۔ پہلے ہی کم چھلنی تھا اوپر سے دو دن کی بیاہی بہو اور بہو سے زیادہ لاڈلی خانم کو دیکھ کر جیسے کانٹوں پہ گھسیٹ لیا گیا۔ قدسیہ کان میں دھیمی آواز میں بڑبڑائیں۔

"دونوں ہی ہوش نہیں پکڑ رہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ رابی ابھی کھانے کی ٹرے

ویسے کی ویسے واپس لے گئی ہے۔اب دودھ منگوایا ہے ہلدی والا کسی طرح پلا دو بھر جائی۔''

سکینہ نے گردن موڑ کر بے بس نگاہوں سے قدسیہ کو دیکھا جیسے کہتی ہوں میں کیسے پلاؤں جب کہ اپنے حلق سے ایک گھونٹ نہ اترتا ہو۔ان دونوں بہنوں کا تو نقصان ہی بہت بڑا تھا۔سکینہ چلتی ہوئی کشور اور خانم کے قریب آئیں اور کرسی کھسکا کر قالین پر ان کے مقابل بیٹھ گئیں۔کشور کے گھٹنے پہ محبت سے ہاتھ رکھا جس نے دونوں بازوؤں میں خانم کو جھپٹنے والے انداز میں جکڑا ہوا تھا۔

''کشور میری دھی......تائی کی بات تو مان نا......کب تک بھوکی پیاسی رہے گی۔کچھ تو کھا......''

ان کے لجاجت بھرے لہجے کے باوجود کشور کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔رابی دودھ کے دو گرم مگ ٹرے میں لیے اندر داخل ہوئی تو قدسیہ نے اس سے تھام کر آگے بڑھ کر سکینہ کے قریب قالین پہ رکھے......اور ابروؤں سے انہیں دودھ پلانے کا اشارہ کیا۔سکینہ نے یاسیت بھرا اسانس خارج کیا اور مگ تھام کر کشور کے چہرے کے پاس لائیں۔دو پل اس کے پرسوز اور غم سے ڈوبے حسین چہرے کو دیکھا پھر خانم کے سرخ و سپید چہرے پہ نگاہ ڈالی جس کے رو رو کر جیسے تمام نقوش سوج سے گئے تھے۔تبھی انہوں نے کشور کو تھوڑے دوٹوک اور کھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

''کشور!تم کیا چاہتی ہو میری بچی......کیا خانم بھی مر جائے؟''

کشور نے پہلی بار بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

''کیا تمہارا بچ جانے والا اکلوتا رشتہ بھی مٹی نگل لے۔''

الفاظ تھے کہ بھالا......کشور کا ہاتھ سینے اور حلق کے درمیان ٹھہر گیا۔

''اگر چاہتی ہو کہ خانم زندہ رہے تو میری دھی کچھ کھا اور اسے بھی کھلا ورنہ قیامت کو ماں پوچھے گی نہیں کہ میری خانم کا دھیان کیوں نہ کیا؟''

کشور نے سکینہ کی جانب دیکھا اور پھر خانم کو جس کا سر اس کے کندھے سے لگا تھا اور بازو اس کے بازوؤں میں مدغم تھے۔

''کیا تم نہیں چاہتیں کہ آفتاب اور رقیہ کی نشانیاں باقی رہ جائیں۔یا سب ہی مر جائیں تا کہ ان

کا نام لینے والا نہ بچے......"

کشور کا سر زور زور سے نفی میں ہلا اور اس نے دودھ کا مگ پکڑ کر خانم کو پچکارا۔ یہ پہلی آواز تھی جو پچکار کی صورت ان دونوں میں اس کے لبوں سے نکلی تھی۔

"خانم! میری چندا دودھ پی لو پھر اماں ابا کی......" آنسوؤں نے جملہ بیچ میں ٹوک دیا۔ "ان کی قبر پہ چلتے ہیں۔"

رابی بری طرح بلک اٹھی۔ قدسیہ نے گھٹنوں کے بل آگے ہو کر کشور کا ماتھا چوما اور خانم کا گال سہلایا۔ خانم ماں باپ کی قبر کا سن کر سیدھی ہوئی اور سکینہ تائی کی آنکھوں میں دیکھتی مگ تھام گئی۔ ہونٹوں سے لگاتے اس کے کانپتے ہاتھوں سے دودھ کئی بار چھلکتے چھلکتے بچا۔ ہاتھوں میں جان ہوتی تو تب نا، جب کچھ کھایا پیا ہوتا۔ دو دن سے دونوں بہنیں چپ گم، روتی بلکتی بس بیتے سانحے کو سوچے جا رہی تھیں۔ روئے جا رہی تھیں۔ ایسا اندھیر مچا تھا کہ ان کی زندگیاں تاریک کر گیا تھا۔ کوئی ماں باپ ایسے بھی مرتے ہیں۔ یوں ہنستے بولتے محبت جتاتے ایک دم سے راکھ بن جائیں۔ کچھ کہہ کے بھی نہ جائیں کچھ بتائیں بھی ناں......بس پتا چلے کہ وہ تو مر گئے۔ یوں مر گئے کہ اپنا نشان بھی نہ چھوڑ گئے۔

زندگی کا سب سے تکلیف دہ احساس یہ ہے کہ آپ کسی کو الوداع بھی نہ کہہ سکیں اور وہ شخص تاحشر آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

کشور نے خانم کو دودھ پلا کر خود بھی بدقت دودھ کا مگ خالی کیا اور ملتجی نگاہوں سے سکینہ اور قدسیہ کو دیکھا۔

"اماں ابا کے پاس لے جائیں......" آواز میں درد اور لہجے کا سوز سکینہ کے دل کو چیر گیا۔ قدسیہ نے انہیں حوصلہ دیا اور کھڑا کر کے دونوں بہنوں سے مخاطب ہوئیں۔

"چلو دھیو! میں بھی چلتی ہوں۔ اپنے ویر اور بھرجائی سے مل کے آتے ہیں۔ تم دونوں بہنیں زیادہ رو کے انہیں تکلیف نہ دینا، اچھا ٹھیک ہے۔"

کشور اور خانم پھرتی سے کھڑی ہوئیں۔ رابی نے بھی جھٹ اپنا دوپٹا پھیلا کر سر پر اوڑھا بھلا وہ

کیسے نہ جاتی۔ رابی محبت سے دونوں کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر نکلتے ہی قدسیہ نے سکینہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"بھرجائی جانے والوں کا دکھ قبروں میں ساتھ جائے گا لیکن ان بچیوں کی خاطر ہمت پکڑو۔ ان کے ماں پیو ذمہ داری ڈال گئے ہیں ہم پہ...... نبھانی ہے اور اچھی نبھانی ہے بھرجائی۔ ہمارا دکھ ان سے بڑا نہیں لیکن ہم ان کے بڑے ہیں۔ ہم ان بچیوں کو دوبارہ زندگی کی طرف لائیں گے بھرجائی۔ ہمت پکڑو میں دونوں کو لے کر جاتی ہوں۔ جلدی واپس آؤں گی۔ آپ پروہنوں کو دیکھو تب تک......"

"مجھے یقین تو کرنے دو قدسیہ...... یہ ہوا کیا ہے۔ کیا واقعی یہ حادثہ ہمارے ساتھ ہو گیا ہے۔ ایسے حادثے تو سنے تھے بس کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اپنی حویلی میں لاشیں دیکھیں گے۔"

"قسمت بھرجائی قسمت...... ابھی تو مردوں کو سراہاتھ آنے دو بھرجائی۔ حادثے ایسے ہی نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے چال ہوا کرتی ہے۔ وہ چال کامیاب ہو جائے تو حادثہ بن جاتی ہے۔"

قدسیہ چلی گئیں۔ سکینہ نے اداس نظر اپنے بیٹے کے ارمانوں سے سجے کمرے پہ ڈالی، لائٹ بجھاتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

پنچائیت بیٹھی تھی۔ خوب ہاہاکار مچی تھی۔ پوری برادری کے علاوہ اردگرد کے پنڈوں کے بندے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ کوئی چھوٹا حادثہ تو نہیں ہوا تھا۔ ایسی تباہی اب تک پنڈ نے نہ دیکھی نہ سنی۔ نامی گرامی چوہدری اور اس کی بیوی جل کر مر گئے تھے اور پولیس اسے اتفاقیہ حادثے کا نام دے رہی تھی۔ سیانے اور زیرک افراد کی نگاہ میں یہ اتفاقیہ نہیں تھا، بلکہ سازش تھی۔ جو بھی ہوا تھا اتنا آسان نہیں تھا ہو جانا۔ چوہدری شہاب الدین چوڑے پایوں والی چارپائی پہ گاؤتکیہ کہنی کے نیچے پھنسائے اکڑ کر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ انہی کی چارپائی پہ قاسم بھی بیٹھا تھا۔ ایک طرف کرسیوں پہ چوہدری انور، حیات، حسنات اور مبشر بیٹھے تھے۔

چوہدری انور کا چہرہ رنج والم کی تصویر بنا اندرونی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے ایک

کبیدہ خاطر نگاہ چوہدری شہاب اور قاسم پہ ڈال لیتے اور سر جھکا کر ڈھلکے کندھوں کے ساتھ سرنفی میں ہلانے لگتے۔ ان کے یاران کے بیلی چوہدری آفتاب کو آگ نگل گئی تھی۔ ابھی تو وہ ان کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ بچوں کی، زمینوں کی، مدرسے اور مسجد کی اور پھر ایسا کیا ہو گیا کہ محض ایک گھنٹے کے اندر وہ جیتا جاگتا انسان خاک میں بدل گیا تھا۔ مبشر اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کی پشت پہ کھڑا ہو کر ان کے کندھے ہلکے ہاتھوں سے دباتے ہوئے انہیں دلاسا دینے لگا۔

چوہدری شہاب نے یہ منظر خشونت سے دیکھا اور حقہ تھوڑا آگے کھسکا کر 'نے' کو منہ لگایا۔ ایک آنکھ مکمل کھولے اور دوسری کو آدھا بند کیے اس سکون سے بیٹھے نیچے پھیلی کچی مٹی کو دیکھ رہے تھے جیسے یہی کرنے وہاں بیٹھے ہوں۔ حالانکہ ان کا کام اس وقت سب کو خاموش کروا کر پنچائیت کی کارروائی شروع کروانا تھا لیکن وہ جیسے اس سارے شور شرابے سے لاپروا بن بیٹھے تھے۔ بالآخر حسنات کو تاؤ آتا اور اس نے حیات کے کان میں کچھ کہا تو وہ سر ہلاتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہو کر تھوڑا آگے آ کھڑا ہوا اور پھر اس کی بھاری رعب دار آواز یکدم سارے میں ایک گونج کی صورت پھیلی ...... مجمع اچانک ساکت ہوا تھا۔

''خاموش ہو جائیں سب کے سب......''

جو جہاں تھا وہیں رک کر حیرت واستعجاب سے حیات کو دیکھنے لگا۔

''ابا جی صدمے کی وجہ سے بول نہیں پا رہے۔ ان کے لیے یہ چھوٹا سانحہ نہیں ہے، اس لیے میں آپ سب سے گزارش کرتا ہوں کہ اپنی اپنی جگہوں پہ تشریف رکھیے تاکہ گفتگو شروع کی جا سکے۔''

ایسی شستہ اردو اور شائستہ لہجہ بھلا پنچائیتوں میں کب روا رکھا جاتا ہے۔ چوہدری شہاب پیچ و تاب کھاتے بیٹے کو دیکھنے لگے۔ قاسم الگ نخوت سے دیکھ رہا تھا لیکن یکبارگی سب کے سب ایک ترتیب سے نشستیں سنبھالتے چلے گئے۔ ان کے چہرے بتاتے تھے کہ انہیں چوہدری حیات کے لب و لہجے نے متاثر کیا ہے۔ جیسے انہیں عزت و وقار سے نوازا گیا ہے۔ چوہدری انور نے نگاہ ملنے پر توصیفی انداز سے حیات کو دیکھا اور معاملہ آگے بڑھانے کو کہا۔ حیات پژمردگی کے ساتھ دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے سب سے مخاطب ہوا۔

''چچا آفتاب اور ان کی زوجہ کے گھر جو جان لیوا سانحہ ہوا ہے جب تک ثابت نہیں ہو جاتا کہ

اس کے پیچھے کوئی سازش ہے یا وہ محض اتفاق ہے تب تک آپس میں لڑنا بالکل بے کار ہے۔ اس سے محض کدورتیں بڑھیں گی۔ ہمارا نقصان تو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ جانے والوں نے واپس نہیں آنا لیکن ایسا کرنے سے ہم سب کا تماشا بن جائے گا۔ دوسری برادریاں ہم پہ تھو تھو کریں گی۔ یہ وقت ایک ہو کر معاملے کی تہ تک جانے کا ہے نہ کہ ایک دوسرے پہ کیچڑ اچھالنے کا۔ جیسے ہی معاملات صاف ہوں گے سب کچھ ہمارے سامنے آ جائے گا، لیکن ہمیں حوصلہ رکھنا ہوگا۔"

حیات کے ٹھہرے ہوئے انداز اور سلجھے لب و لہجے نے سب کو شانت کر دیا تھا۔ سب نے مکمل یکسوئی اور خاموشی سے اس کی بات سنی تھی اور کئی لوگوں نے سر دھنا تھا۔ ایک باریش بزرگ جواباً اسی کی طرح بردبار لہجے میں گویا ہوئے۔

"حیات پتر! بہت اچھے پترا...... تیری ساری گلاں سچیاں نے۔ لیکن ہماری مانگ بس اتنی ہے پتر کہ ساری تحقیق اور تفتیش میں ہر ایک پنڈ کا کھوجی بھی شامل کرو۔ ہمیں ان پلسیوں (پولیس والے) پہ اعتبار نہیں پتر، کھوجی چار دیہاڑوں میں سب کچھ پٹ کے باہر لے آئیں گے۔"

بات خاصے پتے کی تھی۔ بہت سے چہروں پہ تائیدی اثرات تھے۔ چوہدری شہاب اور قاسم نے پہلو بدلا تھا جو چوہدری انور کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ انہیں تو پہلے ہی ان دونوں پہ عجیب سا طیش تھا۔ جس کی وجہ ان کی بھی سمجھ سے باہر تھی۔ ان دونوں کے رویے اور اٹھنا بیٹھنا آج کل اس طرح کا تھا کہ نہ ان سے شکوہ کیا جا سکتا تھا نہ انہیں ٹوکا جا سکتا تھا لیکن وہ اپنے ہر عمل سے اپنی فطرت کو عیاں کر رہے تھے۔ چوہدری انور کو دبانا آسان نہیں تھا اس لیے دونوں ان کے سامنے محتاط تھے لیکن یہ طے تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو ان کا بھی مکو ٹھپ لیا جائے گا۔

چوہدری انور اپنی جگہ سے اٹھے اور حیات کے پہلو میں کھڑے ہوتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشیانہ بولے۔

"پتر! ان کی بات ٹھیک ہے۔ اگر نہیں مانی تو کم ودھ جائے گا۔ تیرا ابا اور قاسم پولیس کو نیڑے نہیں لگنے دے رہے اس بہانے سے کہ ہم اپنے مرے بھائی کا گھر پلسیوں کے حوالے کر کے اس کی روح کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ عقل میں سماتی ہے بھلا یہ بات......؟ ساری عمر آفتاب کو چین نہ لینے

دیا۔ زندہ انہیں وار انہیں کھا تا تھا اور اب مرے کی انہیں لاج شرم آ رہی ہے۔ کمال نہیں ہو گیا!''

بات تلخ تھی لیکن سچ تھی۔ حیات بلا وجہ شرمندہ سا گردن جھکا گیا۔ چوہدری انور دوبارہ حتمی لہجے میں بولے۔

''تو اعلان کر کہ جس جس کو اپنے کھوجیوں کو بھیجنا ہے بھیجے۔ ہم منع نہیں کریں گے۔ ورنہ پتر پنچائیت یہاں سے خلاف ہو کر اٹھی تو آنے والے وقت میں بہت سے معاملات خراب ہوں گے۔ ان کے بھی بندے مرے ہیں جو پروہنے بن کے چھوٹی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ان کا وساء کیوں کھائیں گے پتر......!''

حیات نے ایک طویل سانس سینے میں بھری اور پلٹ کر باپ پہ نگاہ کی تو وہ انتہائی خشمگیں نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ چوہدری شہاب کی آنکھوں کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ انتہائی ناخوش ہیں۔ اور اس سے اس معاملے کو رفع دفع کرنے کی توقع کیے ہوئے ہیں۔ حیات نے واپس مجمع پہ نگاہ ڈالی اور گلا کھنکار کر بولا۔

''جس کو اپنا کھوجی بلانا ہے بلا لے۔ جتنے دن تک تفتیش کرانی ہے کروا لے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ان کا خرچا پانی اور رہنے کا بندوبست سب حویلی لکھاں کے ذمے ہے۔ لیکن جو بھی معاملہ سامنے آیا اسے سب قبول کریں گے۔ اگر یہ اتفاقی حادثہ ہے تو صبر کریں گے اور اگر سازش ہے تو جیسا سب بزرگ فیصلہ کریں گے اسی پہ عمل ہو گا، کہیے منظور ہے؟''

اپنا دایاں ہاتھ اونچا کیے حیات نے سارے میں نگاہیں دوڑا کر تائید چاہی۔ کچھ پل کی خاموشی رہی اور پھر ہر طرف سے آواز آنے لگی۔

''منظور ہے، ٹھیک ہے، جیسے حیات پتر کہتا ہے ہم کرتے ہیں۔ اچھا فیصلہ ہے۔ ماشاءاللہ حیات باؤ چوکھا سیانا ہو گیا ہے۔ چوہدری شہاب کی پگ کا ول ودھ گیا جی...... بہت اچھے......!''

ملی جلی آوازوں میں توصیف و ستائش تھی۔ سبھی نے حیات کی معاملہ فہمی کی تعریف کی تھی۔ جب ہر طرف سے تعریفوں کے ڈونگرے برسنے لگے تو چوہدری شہاب کو بھی مونچھوں کو دو بل دیتے ہی بنی۔ قاسم البتہ نخوت سے چادر کا پلو جھاڑتا کھڑا ہوا اور سب کو کینہ توز نگاہوں سے بھسم کرتا پنچائیت سے نکل گیا۔

مجمع پر جوش ہو چکا تھا۔ چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ سب کو اس معاملے کی تہ میں جانے کی جلدی تھی۔ جن کے خاندان کے افراد ساتھ مرے تھے وہ اسے حادثہ ماننے سے انکاری تھے۔ تجسس کو ہوا لگ گئی تھی۔ سبھی کو جلد از جلد ٹوہ لگانے کی پڑی تھی۔ سب کو جاننا تھا کہ چھوٹی حویلی سے جس شام چوہدری حیات کی بارات ہنستی کھیلتی دلہن لیے واپس ہوئی تھی تو ایسا کیا اچانک ہوا تھا کہ وہاں آگ لگ گئی۔ اور آگ بھی ایسی بھیانک کہ جس نے ایک پتا بھی نہ چھوڑا۔ سب کچھ کھا گئی۔ سب کو نگل گئی۔ سب جل کر راکھ ہو گیا۔ اس راکھ کو کریدنے سے ہی معلوم ہونا تھا کہ یہ آگ لگی تو لگی کیسے اور کسی کو بھی اندر موجود افراد کو بچانے کا موقع کیوں نہ مل سکا......!

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 15

جسے تو قبول کرے وہ ادا کہاں سے لاؤں
ترے دل کو جو لبھائے وہ صدا کہاں سے لاؤں
میں وہ پھول ہوں کہ جس کو گیا ہر کوئی مسل کے
مری عمر بہہ گئی ہے مرے آنسوؤں میں ڈھل کے
جو بہار بن کے برسے وہ گھٹا کہاں سے لاؤں
تجھے اور کی تمنا مجھے تیری آرزو ہے
ترے دل میں غم ہی غم ہے، مرے دل میں تو ہی تو ہے
جو دلوں کو چین دے دے، وہ دوا کہاں سے لاؤں
مری بے بسی ہے ظاہر، مری آہِ بے اثر سے
کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اس کے در سے
جو مراد لے کے آئے وہ دعا کہاں سے لاؤں
(ساحر لدھیانوی)

سیاہ بختی کی آندھی تھی جس نے حویلی لکھاں پہ اپنی چھاپ مستقل چھوڑ دی تھی۔ ایسی دل چیرتی خاموشی اتر آئی تھی جس میں دراڑ ڈالنا کسی کے بس میں نہیں رہا تھا۔ بس چند دن پہلے یہاں وہ رونقیں تھیں جنہوں نے سالوں یادگار بن جانا تھا۔ لیکن ایک حادثہ رونما ہو کر سب کے دل و دماغ پہ اپنی الگ یادگار نقش کر گیا تھا۔ چوہدری آفتاب اور رقیہ اس دنیا سے جا چکے تھے۔ پولیس اپنی ابتدائی تفتیش اور

تحقیقات میں کچھ بھی پتا لگانے میں ناکام ہو گئی تھی۔ روز کوئی نہ کوئی قریبی تھانے سے چوہدری شہاب الدین کے ڈیرے پہ چلا آرہا تھا۔ گفت و شنید ہوتی اور تسلی دلاسے کے بعد واپس روانہ ہو جاتا۔ کبھی قاسم وہاں موجود ہوتا تو وہ ایس ایچ او کو اپنی جیپ میں بٹھاتا اور زمینوں کی سیر کروانے لے جاتا تاکہ اس حادثے پہ تسلی سے بات چیت ہو سکے۔ ان دو کے علاوہ حویلی کا کوئی مرد بھی کسی تھانیدار سے نہیں مل پایا تھا یا ملنے دیا نہیں جا رہا تھا۔ چوہدری آفتاب اور رقیہ سے محبت کرنے والے تمام لوگ پچھتاوے کا شکار تھے کہ کاش ان کو چھوٹی حویلی جانے سے روک دیتے۔

ملال، پچھتاوا، دکھ، کرب...... ان سب کو ایک ساتھ گھول کے گھونٹ گھونٹ جیسے سب ہی کو پلا دیا گیا تھا۔

کشور اور خانم کی حالت کا تو بیان ہی نہیں تھا۔ حیات خود کو کشور کا سامنا کرنے کے قابل نہیں پاتا تھا اور سکینہ نے دونوں بہنوں کو اپنے پروں میں لے رکھا تھا۔ جب سے نمرہ آئی تھی خانم اس کے ساتھ ہی لپٹی رہتی۔ نمرہ کی شادی سے پہلے وہ سب سے زیادہ اس کے قریب تھی یا یوں کہنا مناسب ہو گا کہ نمرہ نے اپنی چھوٹی بہن کے تمام شوق خانم سے پورے کیے تھے اور اسی لیے اس کی جان بند تھی خانم میں...... وہ اسے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی...... اس کی اپنی حالت اچھی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ ایک پل بھی خانم کو اکیلا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اسے باتوں میں لگائے رکھتی یا پھر کسی طرح قدسیہ پھپھو اور رابی کو بلا کر سکینہ کے ساتھ ہال کمرے میں جمع کر لیتی کہ سب ادھر ادھر کی باتیں کریں تو بچیوں کے دل بہلیں۔ لیکن باتوں میں اچانک خانم سوال پوچھ لیتی......

''تائی جی......'' وہ سکینہ کو مخاطب کرتی۔ ''اماں کو کتنا درد ہوا ہو گا؟ کیا انہیں جلنے کی تکلیف ہوئی ہو گی؟ انہوں نے چیخیں تو نہیں ماری ہوں گی نا تائی جی......!''

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتیں۔ کشور کی سسکیاں ایک بار پھر کانوں میں سوراخ بننے لگتیں۔ وہ بھی اذیت سے آنکھیں میچ لیتی اور بند آنکھوں سے اپنے بازو مسلنے لگتی جیسے نادیدہ آگ بجھاتی ہو۔

''ابا تو بہت بہادر تھے وہ ایسے کیسے چلے گئے تائی جی...... اماں کا کتنا دھیان رکھا کرتے...... ایک ذرا سی چوٹ لگ جاتی تو فکر کرتے رہتے...... اب جب اماں جل رہی ہوگی تو ابا کہاں ہوں گے؟''

سکینہ تائی آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے میں چھپا لیتیں کہ کسی طرح وہ خاموش ہو جائے لیکن ان کے سینے سے لگے اسے اماں کی خوشبو ستانے لگتی۔ سانس رکنے لگتا...... اماں کے لمس کی طلب سر اٹھاتی اور وہ واپس سر سیدھا کرتے پھر سے کرلا اٹھتی۔

''تائی جی! اماں پہلے فوت ہوئی ہوں گی یا ابا...... کاش تائی جی پہلے اماں مر گئی ہوں یا دونوں ساتھ ساتھ فوت ہو گئے ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے تائی جی...... اور اماں تو کتنا ڈرتی تھیں آگ سے...... وہ تو سلنڈر بھی اسی لیے کہتی تھیں کہ ہٹا دو حویلی سے۔ انہیں لگتا تھا کہ ایک دن یہ بم پھٹ جائے گا۔ اور پھر واقعی کیا ان کا وہم پورا ہو گیا تائی جی؟''

بے تحاشا ضبط سے سرخ بوٹی ہوتی اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں باری باری سب کے چہروں کو دیکھتی تھیں کہ کوئی تو کہہ دے کہ اس کے ماں باپ کو بالکل درد نہیں ہوا۔ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور ان کی روحیں اپنے ساتھ اڑا کے لے گیا۔ وہ تو دونوں اللہ کے نیک بندے تھے۔ لیکن تسلی کے سب الفاظ لایعنی ہو چکے تھے۔ کوئی جملہ کشور اور خانم کا وہ زخم نہیں بھر سکتا تھا جو ان کے دل پہ اپنا نشان ہمیشہ کے لیے ثبت کر گیا تھا۔

بے حد مضبوط عورت تھیں قدسیہ پھپھو لیکن خانم کی باتوں پہ کہیں آ کر ان کا بھی ضبط جواب دے جاتا۔ لیکن خانم کی باتیں سن کر وہ بے اختیار آواز کے ساتھ روئے جاتیں۔ اپنے بھائی آفتاب کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا جس نے ہمیشہ سگے بھائیوں سے بڑھ کر مان دیا تھا۔ ہر ہر موقعے پر وہ جان نچھاور کرنے کو تیار رہا کرتا۔ ان کی پیاری بھرجائی رقیہ جو اس حویلی میں بیاہ کے آئی تو بکری کی طرح سہمی رہتی۔ کسی نے اونچی آواز نکالی نہیں اور وہ خوف زدہ ہو کے ایک کونے پہ جا کے بیٹھی نہیں...... کبھی اونچی آواز نہ نکالی نہ کسی سے لڑائی منہ ماری کی۔

نمرہ کو کسی وقت حیات اور حسنات دکھائی دے جاتے تو ان کو لے کر بیٹھ جاتی۔ دونوں کو سمجھانے لگتی کہ کشور اور خانم کا دھیان بٹاؤ ورنہ پاگل ہو جائیں گی۔ پر دونوں ہی جیسے زبان گروی رکھوا آئے تھے۔

حیات کو سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ کس سے کیا کہے، کیا تسلی دے اور کشور کا سامنا کیسے کرے۔ صدمہ اس نوعیت کا تھا جس نے عقل ماؤف کر دی تھی۔ چچا آفتاب اور رقیہ چاچی نہیں رہے تھے، یہ جانکاہ اطلاع تھی لیکن وہ جل کر مر گئے تھے یہ خبر اس کی پوری زندگی کو گھیر کے بیٹھ گئی تھی۔ لوگ مر جاتے ہیں، سب نے جانا ہے لیکن کچھ رخصتیاں المیہ بن جاتی ہیں...... کرب و بلا میں لپٹی تاعمر سروں پہ منڈلاتی رہتی ہیں۔ بہت سے سوال تھے جنہوں نے اسے پاگل کر رکھا تھا لیکن زبان اور حالات موافق نہیں تھے۔ وہ اپنے باپ سے سوالات کرنا چاہتا تھا۔

وہ جو کچھ سوچ اور سمجھ رہا تھا اس کو نوک زبان پر لانے سے بچنا چاہتا تھا لیکن سب ابل ابل کر لاوے کی صورت بہنے کو بھی تیار تھا۔ مبشر کتنی بار دن میں اس کے پاس آتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے غیر مرئی نقطے کھوجتے اور پھر الگ ہو جاتے......!

خود پہ خود ہی ہنستا وہ اذانوں کے ساتھ ہی نماز کے لیے اٹھ گیا۔ کمرے میں آیا تو بدستور باسی پھولوں کی مہک اور الجھی ملگجی بیڈ شیٹ پہ باسی مسہری کی لڑیاں موجود تھیں۔ کسی کو صفائی ستھرائی کا ہوش ہی کب تھا اور اس کمرے میں سوبھی کون رہا تھا۔ کشور کو تو اس نے شاید تین چار دن سے نہیں دیکھا تھا اور خود وہ بھی رات ہال کمرے کے صوفے پر سو جاتا تھا۔ وحشت ہوتی تھی یہاں۔ کتنے ارمانوں سے سجایا تھا اس نے یہ کمرا لیکن اس کمرے کی مسہری کی لڑیوں کو دیکھتے ہی اسے کچھ خواب ناک سا عکس یاد آنے لگتا تھا۔ کوئی چہرہ...... کوئی بدنما مسکراہٹ لیے بدحواس چہرے...... کچھ بھیانک ارتکاب کرنے کی چاہ لیے کھڑا کوئی وجود...... اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا اس نے کسی دن کوئی خواب دیکھا تھا جس کی جھلک اسے پریشان کرتی ہے لیکن خواب یاد نہیں آتا تھا۔ یا پھر اس نے نیم غنودگی میں کسی کو دیکھا تھا جس کا عکس اس کے ذہن کے پردے پہ جما رہ گیا۔ اسے یہ بھی خیال آتا تھا، شادی کے کاموں کی تھکاوٹ اور پھر ہونے والے واقعات کی وجہ سے ذہنی پراگندگی نے اس کو الجھا رکھا ہے پر تب ہی اچانک اسے اپنی بارات کی رات دماغ میں سرسرانے لگتی۔ اس رات کچھ عجیب تر ہوا تھا۔ کہیں کچھ ایسا ہوا تھا جس کا سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ جس وقت وہ نیند سے جاگا تھا اسے ایسا کیوں محسوس ہوا تھا کہ یہ نیند نہیں

تھی اور اگر وہ ایسی گہری نیند میں تھا تو حسنات اور اماں کو اسے اٹھانا کیوں پڑا تھا۔ زندگی گزری تھی اماں کو کبھی نیند سے جگایا نہیں تھا۔ ہمیشہ جاگتی ملی تھیں اور مصروف ملی تھیں۔ اس رات اماں کو جگایا اور پھر حسنات کے کمرے کی طرف بھاگتے بھی اس کا ذہن سویا ہوا کیوں تھا۔ وہ چل پھر رہا تھا لیکن اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس کا عمل اس کی چاہ کے خلاف ہے۔ وہ کرنا کچھ چاہ رہا ہے لیکن اس کے اعصاب ساتھ دینے سے انکاری تھے۔

کشور کی ایسی گہری نیند کو اس نے عادت سے محمول کیا تھا کیونکہ وہ اس کے سونے جاگنے کی عادات سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اماں اور حسنات کا بے سدھ سویا ہونا اسے چونکا گیا تھا مگر سر پہ پڑی افتاد نے کچھ مزید سوچنے نہیں دیا تھا۔

وہ کمرے میں تھکے تھکے قدموں سے چلتا بیڈ کی داہنی طرف آ بیٹھا جہاں کشور سوئی ہوئی تھی۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ اس کا دل ہی نہیں کیا تھا بتیاں جلانے کو، نہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کرنے کو۔ وہ کچھ پل یونہی دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر آنکھیں موندے باپ کے رویے کو سوچتا رہا۔ اتنے دن ہو گئے تھے لیکن چوہدری شہاب نے کشور اور خانم کو ایک نگاہ دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ سارا دن ڈیرے پہ رہتے اور زیادہ تر شہر نکل گئے ہوتے۔ انہیں کوئی سروکار نہیں تھا کہ کھوجی چھوٹی حویلی کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ پنڈ کے پنڈ اس انتظار میں ہیں کہ کب اس حادثے کا ماخذ سامنے آئے گا۔ اسے یک بارگی باپ کے اس روپ سے نفرت محسوس ہوئی۔ وہ انہیں اس قدر بے حس نہیں سمجھتا تھا۔

وہ نماز کے لیے وضو کرنے کی غرض سے کھڑا ہونے لگا تھا کہ اچانک اس نیم اندھیرے میں نیچے قالین پہ کوئی چیز چمکی تھی۔ جھک کر اٹھایا تو چوڑے پھل والا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور نیم اندھیرے میں وہ اب واضح ہو رہا تھا۔ حیات گنگ سا خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ کس طرح آیا تھا؟ کب آیا؟ وہ تو ہرگز نہیں لایا تھا اور کشور تو ایسی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اول تو وہ نئی نویلی دلہن تھی اور پہلی رات ہی اس پہ ایسی افتاد ٹوٹی تھی کہ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

حیات نے تھوک نگل کر اپنی دھڑکتے دل کی دھڑکن کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ اچنبھے سے

آنکھیں بند کیں تو ایک بھیانک شبیہ سی لہرائی۔ایک لڑکی جس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔وہ اسے لہرا رہی تھی۔وہی خواب جو اس نے نجانے کب دیکھا تھا۔ہاں بالکل وہی خواب اور اسی خواب میں اس لڑکی کے ہاتھ میں چاقو تھا۔اسے اچانک یاد آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنی سوچ کو جھٹک گیا۔

اگر خواب تھا تو چاقو یہاں کیا کر رہا تھا......اس کے کمرے میں......!اس کے بیڈ کے اتنے پاس بھلا چاقو کون لے کے آسکتا تھا۔اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کیں۔دماغ پہ زور دیا۔اس نے شور کی آواز پہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔نیند سے بری طرح بوجھل پلکوں نے کھلنے سے انکار کیا تھا۔اس نے کروٹ سیدھی کرنی چاہی تھی تبھی اس کی نگاہوں نے کسی لڑکی کی شبیہ دیکھی تھی جس نے ہاتھ میں چاقو بلند کیا ہوا تھا اور پھر اچانک وہ بوکھلائی تھی۔پس منظر میں دھماکوں کی دور سے آوازیں بازگشت کر رہی تھیں۔اس نے ناسمجھی کی کیفیت میں اسے ٹپٹا کے وہاں سے بھاگتا محسوس کیا تھا۔وہ بے بسی سے دوبارہ آنکھیں موند گیا تھا اور اسے یاد تھا کہ کچھ ہی دیر میں اس کے چہرے پہ پانی کے چھینٹے مار کر مبشر نے اسے جگایا تھا۔اس کے پہلو میں پھپھو قدسیہ بھی کھڑی تھیں جن کے چہروں پہ ہوائیاں تو اڑ رہی تھیں لیکن ان کے چہرے صاف بتا رہے تھے کہ وہ گہری نیند سے اٹھا کر لائے گئے ہیں۔اور اس کے بعد بس پوری حویلی لکھاں چیخوں اور آہوں سے گونجتی چلی گئی تھی۔کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا تھا۔چھوٹی حویلی میں لگنے والی آگ کی اطلاع اور صدمے نے تکنیکی طور پر سب کی نینداڑانے کا انتظام کیا تھا۔وہ کمرے سے نکلا تو قالین پہ کسی کی نگاہ نہیں گئی تھی۔

سارے لمحات ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے جاگتے جا رہے تھے اور اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ہمت کر کے ایک بار پھر اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔وہ اس چہرے کو پہچاننا چاہتا تھا جس نے اس رات اس کے کمرے میں قدم رکھنے کی جرأت کی تھی۔اس کی لرزتی پلکوں کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔بہت جلد اس نے ہانپتے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں۔وہ شبیہ واضح ہو گئی تھی۔اس کا غم و غصے سے جسم کانپنے لگا تھا۔دونوں ہاتھوں سے بال جکڑتے اس نے خود پہ قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور وضو کر کے نماز ادا کی۔جائے نماز پہ سجدے میں سر

رکھتے ہی چچا آفتاب کا چہرہ نگاہوں میں گردش کر گیا اور بے آواز آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔

نماز سے فارغ ہو کر کتنی ہی دیر اس نے دعا میں آنسو بہائے تھے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ ہنستا کھلکھلاتا باپ سے زیادہ محبت کرنے والا انسان اس صفحہ ہستی سے ہی مٹ گیا ہے۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اچانک اس کا دل گھبرایا تھا اور وہ نا جانے کیا سوچ کر ہال میں گیا تھا۔ شاید دل کشور کو دیکھنے کی چاہ کر رہا تھا۔ وہ وہاں تو نہیں تھی۔ سکینہ کے کمرے میں تھی اور وہاں سے مسلسل آتی سسکیوں اور رونے کی آواز اور نمرہ کے دلاسوں اور نصیحتوں کی آوازیں سن کر اس کا جی اندر جانے کو نہیں کیا۔ وہ یہاں سے سیدھا چھت پر چلا گیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ کچھ دیر تو کہیں کھلی فضا ملے اور وہ سکون کا سانس لے سکے۔ اس نے چاقو اپنی جیکٹ کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں، شاید اکیلے میں دوبارہ اس کا اچھے سے مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ ذہن میں ابھی بھی اس کے متعلق سوالات گھوم رہے تھے۔ اس نے چاقو کو جس کے ہاتھ میں دیکھا تھا، وہ ہیولہ اپنا رخ واضح کر رہا تھا۔

چھت پر قدرے سکون تھا۔ ٹھنڈی ہوا دل کے جلتے الاؤ کو سرد کرنے لگی۔ اسے یک گونہ سکون ملا تھا۔ تب ہی اس کے پہلو میں کوئی آ کھڑا ہوا۔ حیات چونک گیا کیونکہ وہ اوپر آتے ہوئے کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس کا دل اکیلے رہنے کو ہی کر رہا تھا لیکن اپنے ساتھ کھڑے حسنات کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ اس نے شاید پورے ایک دن اور دو راتوں کے بعد اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی اور آنکھوں کے گرد تھکن کی وجہ سے ہلکی سوجن اس بات کی غماز تھی کہ وہ کتنے وقت سے سو نہیں پایا۔

''کیا ہوا لالے......؟'' حسنات نے مسکرا کر لہجے کو ہلکا پھلکا بنایا۔ ''مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہیں؟ میں آپ سے پہلے سے اوپر ہوں۔ آپ کی ریس نہیں کی میں نے......''

''ہاااااہ!'' حیات نے ایک لمبی سانس خارج کی اور دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کہنیاں منڈیر پر رکھیں۔ ''تم نے ریس بھی کی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے شہزادے......کوئی تو ہو جو اس وقت کسی کے سکون کا باعث بن سکے اور تمہیں دیکھ کر مجھے واقعی اچھا لگا۔''

"اتنا اچھا لگا تبھی کل کا سارا دن مجھے پوچھا تک نہیں کہ کہاں ہوں؟ کہیں چچا کے ساتھ ہی تو نہیں نکل لیا۔" حسنات اداس اور نروٹھے لہجے میں گویا ہوا۔

"بکواس نہیں کرو...... ابھی کوئی کسر رہ گئی ہے ایسی باتوں کی...... کیا ایک اور آسمان توڑنا ہے سروں پہ...... بس کردے یار...... اب تو لگتا ہے باری باری جیسے سب مرنے کے لیے لائن میں لگ گئے ہیں۔ جس کو پوچھو وہ زندگی سے جی اٹھا بیٹھا ہے...... میرا اپنا حال ایسا ہو رہا ہے حسنات، کہ دل جیسے مر گیا ہے۔ زندگی بے معنی ہوگئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مزید جینے کی چاہ ہی ختم ہوگئی ہے۔"

"ایسے نہ کہیں بھائی...... بہت بڑا صدمہ ہے، اتنا بڑا کہ دوبارہ کیسا بھی سانحہ ہو گیا نا ہماری حویلی میں تو ہمیں شاید ایسے نہ دہلا سکے جیسے یہ دہلا گیا ہے۔ لیکن لالے جینا چھوڑنے کی بات تو نہ کرو۔ بھرجائی کو دیکھیں۔ پری کا حال دیکھیں۔ اماں ہیں تو وہ جیسے ہمت توڑ کے بیٹھی ہیں، پھپھو کی طرف جاؤ تو وہاں بھی سب ایک دوسرے سے بےزار اور اداس تباہ کن حالت میں دکھتے ہیں۔ ہمت پکڑنی پڑے گی بھائی......"

"ہمم...... ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن مجھ سے کشور کا سامنا نہیں ہو رہا حسنات۔ مجھے شرمندگی ہے......"

"ہائیں......" وہ حیرت سے رخ پھیر کر حیات کو دیکھنے لگا۔ پھر جھجکا ہوا سا بولا۔ "کیسی شرمندگی بھائی۔ مطلب یہ سب جو ہوا ہے کیا آپ نے کرایا ہے، اور آپ بھرجائی کو ایسا سمجھتے ہیں، حیرت ہے یار......!"

"اس بارے میں بات نہیں کر رہا میں۔ یہ سب تو بعد کا معاملہ ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے حسنات......" حیات اب پورا گھوم کر حسنات کی جانب ہوا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں نہیں لگتا کہ اس رات کچھ عجیب تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تھا۔ سب ہی سوئے تھے۔ ایسی گہری نیند جیسے سویا ہوا محل ہو۔ ایک بات بتاؤ...... ہم میں سے کس کی نیند اتنی گہری دیکھی ہے کبھی تم نے کہ اتنے شدید شور شرابے پہ بھی نہ جاگے......"

"بھائی! کیا بات کر رہے ہیں۔ کھل کر کہیں...... مجھے خود کو اب ہر بات میں کچھ عجیب نظر آنے لگ گیا ہے۔"

''وہی نا...... اس رات حسنات ہم سب ایسی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ کسی کو بھی چھوٹی حویلی میں ہونے والے دھماکوں کی آواز تک نہیں آئی۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہاں دھماکے ہوئے ہیں؟''

''ہونہہ......'' حیات استہزائیہ ہنسا۔ ''دھماکے ہی تو ہوئے ہیں شہزادے...... چھوٹی حویلی انہی ''بموں'' سے اڑی ہے جن سے چچی کو ڈر لگا کرتا تھا۔ مبشر بتا رہا تھا کہ سلنڈر کو آگ لگی ہے اور جب وہ آگ پھیلی ہے تو پھر وہاں رکھے ساتوں سلنڈر ایک ساتھ پھٹے ہیں۔''

''اللہ اکبر...... کیا بات کر رہے ہو بھائی؟'' حسنات کا رنگ فق ہوا تھا۔ ''اللہ کی پناہ...... اتنا بڑا دھماکا ہوا ہوگا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔''

''یہی تو بات ہے حسنات کہ ہمیں پتا کیوں نہیں چلا۔''

''لالے...... مجھے تو یہ معلوم تھا وہاں بس ایک اضافی سلنڈر رکھا ہے جو نیچے ڈیوڑھی میں کونے پہ پڑا ہوا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ شادی والا گھر ہے اس لیے قاسم نے رکھوایا ہے لیکن یہ سات سلنڈر کب آئے، کس نے رکھے وہاں، چچا نے کیسے رکھنے دیے؟''

''بہت سے سوال ہیں حسنات...... بہت سے...... چچا کی تو بات ہی نہ کرو پیارے...... وہ بھلا مروت کے مارے کب کسی کو نہ کیا کرتے تھے۔ جس نے ایک سلنڈر رکھوایا وہی اتنے سارے لا کر رکھنے کا ذمہ دار ہے۔''

''یعنی قاسم......'' حسنات نے بلا جھجک نام لیا۔

حیات نے لمبی سانس خارج کی اور کندھے اچکا دیے۔

''پتا نہیں، ابھی کچھ پتا نہیں۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ پرت در پرت معاملہ کھلا تو اللہ جانے کس کس پہ سے پردہ ہٹے گا......!''

''او بھیا! میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟ یہ تو کوئی ہمیں کٹھ پتلی بنا کر انگلیوں پہ نچا رہا ہے۔ ہماری حویلی میں ایسے تانے بانے سے سازش بنی جاتی رہی ہے اور ہمیں خبر بھی

نہیں ہوئی۔ ایک طرف ابا اور قاسم مشکوک حرکتیں کرتے رہتے ہیں دوسری طرف چاچی حمیدہ نے جو ایک بلا حویلی میں لا گھسائی ہے، وہ جان کو آ چکی ہے۔ عجیب نیش چیز ہے۔ بدترین دماغ ہے اس کا۔ غلاظت بھری ہے دماغ میں اس کے......" حسنات سنہری کے بارے میں بات کرتے دانت کچکچا رہا تھا۔ حیات نے اسے بھنویں سکیڑ کر دیکھا اور پوچھا۔

"تم کیوں تپے ہوئے ہو اس سے اتنا...... کچھ کہا ہے اس نے دوبارہ تمہیں؟"

"کچھ...... لالے کچھ...... کیا کچھ نہ ہو جاتا اس کے کچھ کے پیچھے......!"

حسنات نے بارات کے دن کا ہوا سارا قصہ پوری جزئیات کے ساتھ کہہ سنایا۔ حیات کے ماتھے پہ پڑے بل اس کے اندر کے غم غصے اور جذباتی اتار چڑھاؤ کے غماز تھے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر خود پہ جیسے ضبط کر رکھا تھا۔ اس نے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

"مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آتا بھیا کہ اس سے جان کیسے چھڑائی جائے۔ اگر خدانخواستہ اس دن ہم دونوں کو کوئی اس کمرے میں پکڑ لیتا تو نا جانے کیسا اندھیر مچتا۔ کیا پتا بعد کے ہونے والے سانحے کو لوگ آفتاب چچا کی غیرت میں آ کر خودکشی کا نام دیتے۔ لیکن اب حد کو بات چھو چکی ہے لالے...... اس کا کچھ کرو۔"

"اس کا فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا حسنات...... کیونکہ بات حد کو چھو چکی ہے۔" حیات کے لہجے کا نڈھال سا دھیما پن حسنات کو بری طرح کھلا۔

"لالے! ہماری حویلی ہے، ہماری حویلی کی بچیاں ہیں جو اس کے زیرِ عتاب ہیں۔ وہ کون ہوتی ہے کچھ بھی کرنے والی......!"

"وہ بہت آگے جا چکی ہے حسنات...... ابھی فی الوقت خاموش رہ کر اس کی جڑیں ڈھونڈنی ہوں گی۔ اس کے بعد ان کا صفایا ممکن ہے۔ کیونکہ اس نے بس یہی نہیں کیا۔ اس نے وہ کام بھی کرنے کی کوشش کی ہے جو کوئی سوچ بھی نہ سکے......!"

حیات نے ایک دفعہ پلٹ کر ساری چھت پہ نگاہ دوڑائی۔ پوری چھت خالی تھی اس نے واپس حسنات کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور چاقو نکال کر حسنات کے سامنے کر دیا۔

حسنات اس کو دیکھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

''کس کے دل میں گھونپنے لگے ہیں لالے؟''

''یہ میں نہیں، وہ گھونپنے والی تھی میرے یا کشور کے دل میں...... جب عین وقت پر میری قدرت کی جانب سے آنکھ کھل گئی اور اس کا ارادہ ناکام ہو گیا۔ صرف یہی نہیں، وہ یقیناً کامیاب ہو جاتی کیونکہ میں جاگ ضرور گیا تھا پر حواس مختل تھے۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر بے بس نگاہوں سے۔ جسم میں جان نہیں رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے فالج زدہ جسم ہو اور بس آنکھیں حرکت کر رہی ہوں۔ مگر رب کو کچھ اور منظور تھا جو اسی وقت دھماکے ہوئے اور وہ ڈر کے مارے کمرے سے بھاگ نکلی۔ بوکھلاہٹ میں اس کے ہاتھ سے چاقو گر گیا تھا۔ پہلے میں اس سب کو خواب سمجھتا رہا لیکن جب یہ چاقو مجھے بیڈ کے قریب سے ملا تو یکدم وہ منظر واضح ہو گیا حسنات...... وہ اکیلی نہیں، اس کو کسی کی تو شہ ہے جو ایسی جرأت کر رہی ہے......!''

''بھائی! پولیس کو بتاتے ہیں۔ اس کو اندر کرا دیں، بہت ہو گئی۔'' حسنات جذباتی ہوتا ہوا بولا۔

''پاگل نہ بنو...... کون ہماری بات پہ یقین کرے گا۔ ثبوت کہاں ہے؟ وہ اس چالاکی سے یہ سب کر رہی ہے کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آنے دیتی۔ مثلاً تمہیں کیا لگتا ہے کہ اس رات پوری حویلی اتنی گہری نیند کیسے سو گئی۔ میری بارات تھی حسنات اور میں اس طرح سویا ہوا تھا جیسے نیند کی گولیاں کھالی ہوں۔'' اس کا قلق نہیں جاتا تھا۔ کھلے الفاظ میں بھائی کے سامنے مزید کیا کہتا۔ کتنی خوب صورت باتیں اسے کشور سے کہنی تھیں۔ اپنی محبت کا یقین اور مان بخشنا تھا لیکن سب ملیا میٹ ہو گیا۔

''گولیاں...... بھیا گولیاں......'' حسنات نے اچانک تالی مار کے اس کا ارتکاز توڑا۔ ''اس کا مطلب ہے اس رات ہم سب جو اتنی گہری نیند میں تھے تو اس کے پیچھے یہی نیند کی گولیاں تھیں۔ یہ تو ہم سب کی جان لینے کی بھی اضافی کوشش تھی لالے......!''

''ڈاکٹر بن رہے ہو...... عقل لڑاؤ حسنات...... گولیاں نہیں کھلائی گئیں۔ کچھ اور ہے جس کی وجہ سے سب گہری نیند میں چلے گئے تھے۔ بے ہوشی کی دوا بھی ہو سکتی ہے اس کی تحقیق بعد میں ہو جائے گی۔ اصل معاملہ ہے کہ ہم سب کا سو جانا۔ اتنے بڑے حادثے کا ہونا اور ہم سب کا بے سدھ سونا۔ یہ

سب کسی بہت بڑی پلاننگ کے تحت ہے حسنات...... اس رات تمہیں جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ مدثر اٹھانے کے باوجود نہیں جاگا۔ اماں کی آنکھیں باوجود اتنی ہولناک تباہی کے مسلسل بند ہو رہی تھیں تو اس کے پیچھے وجہ یہی تھی کہ جو کھانا ہم سب کو کھلایا گیا وہ نشہ آور تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کھایا نہیں۔ موڈ بے زار تھا لیکن اس قدر لذیذ کھانا تھا کہ میں نے اور تم نے بھی کھایا۔ مہمانوں نے جی بھر کے پیٹ بھرے۔ چھوٹی حویلی بھیجا گیا اور وہاں بھی یقیناً کھایا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب نیند میں چلے گئے سوائے......"

حیات تمام تر تفصیلی جزئیات کہنے کے بعد خاموش ہوا اور چاقو منڈیر پر رکھا۔

"سوائے کیا لالے......؟" حسنات پر تجسس تھا، رنگت بھی تپ رہی تھی۔ شاید غصہ آ رہا تھا اسے۔

"سوائے تین لوگوں کے حسنات...... وہ تین لوگ ابا، قاسم اور سنہری ہیں۔"

حیات نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔ حسنات خاموش ہو گیا۔ ایک دم گہری چپ دونوں کے مابین چکرانے لگی۔ قلعی کھلنے لگی تھی۔ پہیلی بوجھی جانے والی تھی لیکن بوجھنے والوں کا دل پکڑ میں تھا۔ کون کون گرفت میں آئے گا۔ دماغ سارے سیاق و سباق پہ غور کر رہا تھا۔ ایک ایک منظر ترتیب کے ساتھ نگاہوں میں دہرایا جا رہا تھا۔ حسنات پھنسی پھنسی سی آواز میں گویا ہوا۔

"آپ کو پکا پتا ہے بھیا؟ کہ یہی تین اس رات جاگتے رہے۔ کیا معلوم ابا ڈیرے پہ ہوں، قاسم حویلی آیا ہو لیکن کھانا نہ کھایا ہو۔ اور سنہری کے تو ویسے ہی میں نے پیر جلا دیے تھے۔ اس جلے پیر کی بلی نے کمرے سے باہر کیا نکلنا تھا......!"

"نہ تو ابا ڈیرے پہ سوئے تھے، نہ قاسم حویلی آیا تھا اور نہ جلے پیر کی سنہری کمرے میں بیٹھی تھی۔ تینوں اپنے اپنے ہدف پورے کرنے کے لیے کوشاں تھے اور مکمل کر لینے کے بعد سکون سے آ کر سو گئے تھے۔"

"آپ کو کس نے بتایا بھیا؟"

"بخشو بابا نے...... اب یہ نہ پوچھنا کہ اسے کیسے پتا؟ اسے سب معلوم ہے حسنات...... اس کی دی تفصیل واضح کرتی ہے کہ ابا اور قاسم نے مل کر چچا اور رقیہ چاچی کو مارا ہے۔"

ایک دبیز سناٹا جو وسیع و عریض چھت کو گھیر چکا تھا۔ اتنا دکھ، اتنی تکلیف...... ان کا باپ بھی ایسا کر سکتا تھا بھلا...... کب...... کب اتنی کدورت بھر گئی کہ جان سے ہی مار دیا...... اتنی قبیح دشمنی۔

”بخشو چاچا نے اس رات قاسم کو جیپ میں چچا آفتاب کی حویلی جاتے دیکھا ہے۔ اور جیپ سے دو آدمی اندر کودے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حویلی کے کسی کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر دھماکے کی نذر ہو گیا۔ سب جل کر راکھ ہو گیا۔“

حسنات کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی اذیت ناک موت دینے کی کیا وجہ تھی۔ مارنا ہی تھا تو گولی مار دیتے۔ اس طرح سے کیوں مارا۔ چچا آفتاب کے ساری عمر کے خلوص کو دھماکے کی نذر کر دیا۔ کیوں بھلا......

حسنات کا دل ہی نہیں چاہا کہ وہ پوچھے کہ سنہری کا کیا کردار رہا۔ سب کچھ اتنا گمبھیر تھا کہ کچھ بھی کسی جہت میں جاتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں بھائی انتہائی افسردگی اور نم ناک نگاہوں سے مشرق کی طرف نمودار ہوتے ستاروں کو دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ گہرے ہوتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی۔ ہر شے نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی۔ کچھ بھی دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔

انہیں اب روشنی کی ضرورت تھی لیکن روشنی ان کی پہنچ سے باہر تھی۔ روشنی کے پار ایسے چہرے تھے جن کو وہ دونوں لاشعوری طور پر پردے میں رہنے دینا چاہتے تھے ورنہ بہت خرابی ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

دن اسی مخصوص انداز میں گزر رہے تھے اور ان حالات کو ساتھ لے کر حویلی کے معاملات بھی چلنے لگے تھے۔ چوہدری شہاب الدین اور قاسم کی مصروفیت میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اگلے ہفتے پنچائیت بیٹھنے والی تھی۔ ایک بار پھر چھوٹی حویلی میں ہوئے حادثے کا ذکر زور و شور سے ہونے جا رہا تھا۔ کھوجیوں نے کھوج لگا لی تھی...... معاملات کو سامنے لانے کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ چوہدری شہاب الدین اور قاسم اندر خانے پریشان بھی تھے کہ کیسے اس مسئلے سے نمٹا جائے اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی تھا کہ اس نے جن کے ذریعے یہ ساری کارروائی کروائی تھی وہ روپوش ہو چکے تھے۔ عادی مجرم تھے اور ان کے

آئے روز کے کھیل تھے۔ اس سب کے باوجود چوہدری شہاب کو اپنی ساکھ کی بھی فکر تھی۔

دونوں اس وقت پچھلے باغ کے ایک کونے میں رکھے کین کے صوفوں پہ بیٹھے تھے۔ یہ کونا خاص طور پر عورتوں کے لیے سجایا گیا تھا۔ حویلی سے بالکل الگ تھلگ۔ بہت خوب صورت ہریالی اور درختوں سے گھرا ہوا حصہ تھا جس کے چاروں اطراف پھولوں سے لدی بیلیں تھیں اور ان کے وسط میں کین کے صوفوں اور میز سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ کبھی دل چاہتا تو یہاں حویلی لکھاں کی عورتیں اکٹھی ہو جایا کرتیں اور کھل کر ہنسا بولا کرتیں کیونکہ یہاں سے آوازیں ملازموں کے کانوں تک بھی جانا ممکن نہیں تھا۔ آج اپنی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قاسم اور چوہدری شہاب یہاں بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان میز پر کھانے پینے کا سامان اور چائے کے لوازمات رکھے تھے۔ ایک طرف چوہدری شہاب کا حقہ بھی موجود تھا۔ شامی کباب پورے کا پورا منہ میں ڈال کر قاسم نے چائے کا گھونٹ بھرا اور نیچی آواز میں تایا سے مخاطب ہوا۔

"کام سارا قابو میں ہے بس دعا کریں کہ کھوجی کچھ زیادہ ہی کھرے نہ نکال لائے ہوں۔"

"ایسی بات ہے تو کھوجیوں کے کھرے غائب کرا دے پتر......"

"کیسی بات کرتے ہیں تایا جی، سب کے منہ ہماری طرف پھر جائیں گے۔ کتے بن کر پیچھے پڑ جانا ہے سب نے۔ پہلے ہی دس لاشیں نکل آئیں چھوٹی حویلی سے دو کے چکر میں۔ فی الحال بالا ہی بالا معاملہ نمٹ جائے تو اچھا ہے۔"

"ہمم......" چوہدری شہاب نے ہنکارا بھرا۔ "مجھے کوئی پروا نہیں قاسم پتر...... اگر کل کو کوئی بات کھلتی بھی ہے تو میں سینہ تان کر کہہ دوں گا، ہاں مارا ہے میں نے آفتاب کو۔ وڈا ابھرا تھا اس کا، مار دیا اسے...... فیر کیہڑی گل ہو گئی......"

"او ہولے تایا جی......" قاسم بوکھلا گیا۔

چوہدری شہاب کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گئے تھے۔ لیکن وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ "میں ایسی غلطی نہیں کروں گا تایا جی...... آفتاب چاچا اور چاچی رقیہ سارے پنڈ کے پیارے تھے۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ کسی کو پتا چلے کہ وہ جلے نہیں جلائے گئے ہیں تو کیا آپ اور میں بچ جائیں گے۔ اور پھر نئے سرے سے

سارا کچھ ادھیڑ دیں گے سب۔ بات سب کے اس رات سونے پہ بھی آجائے گی کہ آخر سب ایسے کیسے مردوں جیسے سو گئے...... کسی کو خبر بھی ہو گئی نا تایا جی کہ اس رات کھانے میں افیم ڈلوائی تھی میں نے تو......"

"کیا کیا کیا...... کیا بولا تو...... افیم...... تو نے تو مجھ سے کہا تھا بھنگ ملائی ہے قاسم پتر......"

چوہدری شہاب کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ افیم کا مطلب اور مقصد تو وہ بھی بخوبی جانتے تھے۔

"اگر بتا دیتا کہ بھنگ نہیں افیم ہے تو کیا آپ اپنے ٹبر کو کھانے دیتے تایا جی...... آپ کو وساء نہ پڑا رہتا کہ ان میں سے کوئی سویا ہی نہ رہ جائے۔ اس لیے نہیں بتایا تھا۔ کوئی ایک بھی جاگا رہ جاتا تو آج اتنے سکون سے یہاں بیٹھے چائے شامی نہ کھا رہے ہوتے ہم......"

چوہدری شہاب کے ماتھے پہ بل پڑے تھے۔ انہیں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر افیم کی مقدار میں زیادتی ہو جاتی اور ان کے پتروں کو کچھ ہو جاتا۔ یا سکینہ کو کچھ ہو جاتا تو......؟ کچھ بھی تھا اپنے بیوی بچے پیارے تو تھے ہی، اپنے تھے نا......!

"آئندہ کبھی بھی ایسی حرکت کرنی ہو تو مجھے بتایا کر قاسم...... یہ افیم والا کام کچھ اچھا نہیں کیا تم نے......!"

"تایا جی! فی الحال ہوٹل کی تعمیر شروع کرانے لگا ہوں اگلے ہفتے۔ اس کی تیاریاں کریں اور خوشی منائیں۔ مرا تو نہیں نا افیم سے کوئی تو پھر کیوں رونا ڈال رہے ہیں۔ ابھی تک میری الماری میں پڑی ہوئی ہے۔ کیا پتا کس وقت دوبارہ ضرورت پڑ جائے۔"

"ہرگز نہیں پتر...... اب دوبارہ نہیں۔ تو اسے اپنی الماری سے بھی غنود (غائب) کر اور کل مجھے بھی ٹھیکیدار سے ملوا دے۔ اسے ڈیرے پہ ہی لے آنا، وہیں ساری بات چیت ہو جائے گی۔ گھر میں تو اللہ جانے کب تک ماتم چلنا ہے۔ میرے تو اپنے پتروں کے رونے نہیں مک رہے۔ ایسے سوگ کر رہے ہیں جیسے سگا باپ مرا ہو۔"

"ایمانداری کی بات ہے تایا جی...... وہ ایسے سوگ شاید آپ کے مرنے پہ بھی نہ کریں۔"

قاسم اٹھتے ہوئے بڑی سخت بات چوہدری شہاب کو لگا گیا۔

چوہدری شہاب کے دل کو دھکا سا لگا۔

قاسم کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر وہ یونہی غائب دماغی سے بیٹھے رہے اور پھر وہ اٹھ کے چل دیے تھے۔

ان کے جاتے ہی پچھلی بیلوں کے بیچ سے سنہری نمودار ہوئی تھی۔ اس کے مکروہ چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اتنے دن سے اپنے کمرے میں ہی وقت گزار رہی تھی۔ آج یہاں آئی تو قاسم اور چوہدری شہاب کو آتا دیکھ کر چھپ گئی تھی۔ اور اس کا وقت ضائع نہیں ہوا تھا۔ چھوٹی حویلی میں آگ لگی، اس کے پیچھے یہ دونوں تھے۔ چوہدری آفتاب کی زمین پہ کام شروع ہونے والا تھا۔ ہوٹل بننے کا ......اس کے پیچھے بھی انہی دونوں کا ذہن تھا۔ اس رات حویلی لکھاں میں کھلائے گئے کھانے میں افیم تھی اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اور وہ افیم ابھی بھی قاسم کے کمرے میں موجود تھی۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ لیکن کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ اس رات اس کھانے کو سنہری نے نہیں کھایا تھا اور چوہدری شہاب اور قاسم کی گفتگو کی چشم دید گواہ بھی سنہری تھی۔ ان کے ایک ایک کالے کرتوت کی گواہ سنہری تھی۔ سنہری کوئی مذاق تھی؟ سنہری کے ہاتھوں بہت سی زندگیاں مذاق بننے والی تھیں......!

☆......☆......☆

گو کہ کشور اور خانم کو چپ سی لگ گئی۔ قدسیہ نے بے حد محبت اور چاہت سے ایک دن کشور کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا تھا۔ اسے اس کے کمرے کی طرف متوجہ کیا تھا جسے سنوارنے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کمرے میں اس کا شوہر تھا جو اس کی توجہ کا طالب تھا۔ اس کا دھیان اور خیال اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی لیکن خانم کو محبت سے سمجھا کر نمرہ کو کمرے میں بھیج دیا تھا۔ خانم نمرہ کی شروع سے ہی بے حد لاڈلی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نمرہ اکیلے میں اسے محبت سے زندگی کی طرف موڑ لانے کی کوشش کرتی رہے گی گو کہ اس کی اپنی حالت کچھ اچھی نہیں تھی لیکن خانم کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ بڑی توجہ سے اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے تھی۔ اپنے ہونے والے بچے کے کپڑے اسے دکھاتی تھی۔ اور اتنے دن میں پہلی بار خانم نے کسی چیز میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ بچے تو اس کی کمزوری

تھے اور اسے نمرہ آپا کے بچے کا کتنی شدت سے انتظار تھا لیکن تمام شوق اور چاہتیں جل کر راکھ سی ہو گئی تھیں جیسے...... مسکرانے لگتی تو اماں کا تر و تازہ چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ بات کرنے لگتی تو ابا کا کوئی چٹکلہ بازگشت بن کر سماعت کھنگال جاتا۔ اذیت کا انت ہی نہیں تھا جیسے......

ابھی بھی دونوں بیڈ پہ بیٹھی پلنگ کے بیچ ننھے ننھے کپڑوں کا ڈھیر پھیلائے بیٹھی تھیں۔ خانم بہت سلیقے سے ہر چیز دیکھ کر اسے تہہ کر کے رکھتی جا رہی تھی۔ وہ نمرہ کی دس میں سے ایک بات کا جواب بھی دے دیتی تھی جو کہ تسلی بخش تھا ورنہ اس کے منہ سے زبان تو جیسے کھو ہی گئی تھی۔ رابی کو چائے لانے کا کہا ہوا تھا اسی کے انتظار میں نمرہ اسے بہلانے کے لیے کالج کی باتیں کرنے لگی۔ اس کی پسند کے مضمون اس سے پوچھنے لگی کہ کسی طرح اس کا دھیان بٹے اور اسے ادراک ہو سکے کہ ابھی اسے جینا ہے اور جینے کے لیے اسباب اختیار کرنے ہی پڑتے ہیں۔ وہ سادے لہجے میں اپنے شوق کے مضمون بتا رہی تھی کہ اچانک دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی اور نمرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جھٹ دروازہ کھلا اور سنہری اندر تھی۔

نمرہ نیم دراز تھی، اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور دل میں اس کے یوں اندر داخل ہونے پر الجھن کا شکار بھی ہوئی۔ اس نے خانم کی جانب دیکھا جس کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر فق ہوا تھا جو کتنی تگ و دو کے بعد تھوڑی نارمل حالت میں آسکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں موجود ڈر اور عجیب سی وحشت دیکھ کر نمرہ متعجب ہوئی تھی جو سنہری کے اندر آتے ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ سنہری بے حد فریش اور تازہ دم سی چلتی ہوئی ان کے قریب آئی اور بچے کے کپڑوں کو ٹٹولتی نگاہوں سے جائزہ لیتی ہوئی بولی۔

"میں سنہری ہوں۔ سوچا آپ سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی اس لیے آج مل لوں۔ دیکھوں تو سہی کہ ساری حویلی میں نمرہ نمرہ نام کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اس کا دیدار بھی کر لوں......!"

وہ ہلکا سا ہنسی تو نمرہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جملے میں تضحیک تھی یا تعریف اس نے جواباً مسکراتے ہوئے نا محسوس انداز میں بچے کے کپڑوں کو بائیں ہاتھ اور بازو کے گھیرے میں لے کر جیسے ایک ہی بار میں سمیٹ لیا اور سب کو بناتہ یونہی ان کے لیے مخصوص ٹوکری میں ٹھونس دیا۔ اسے سنہری کی نظروں سے عجیب الجھن ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ خاص نظر لگانے کے لیے ہر کپڑے کو بغور دیکھ رہی ہو۔

''آؤ بیٹھو سنہری......'' نمرہ نے اسے بیٹھنے کا کہہ کر اس کا ارتکاز توڑا۔ وہ بالکل خانم کی سیدھ میں یوں ٹک گئی کہ خانم اس کی نگاہوں کی تپش اچھی طرح محسوس کر سکے۔

''چاچی حمیدہ سے پوچھا تھا تمہارا، تم اتنے دن سے کچھ خاص دکھائی نہیں دیں۔ چھوڑی پہ بھی نہیں نظر آئیں۔ اس لیے دھیان نہیں آیا دوبارہ...... کب سے ہو یہاں؟''

گو کہ نمرہ کا لہجہ سادہ تھا لیکن سنہری کو طنزیہ بھی لگا اور زور کا بھی لگا۔

''چھوڑی میرے ماں پیو کی تھوڑی تھی جو میں دکھائی دیتی۔ یہ تو خانم اور کشور کا دکھ ہے نا تو انہی کو موقع ملنا چاہیے تھا وہاں بیٹھے رہنے کا۔ میں تو یہاں تمہارے آنے سے پہلے کی ہوں۔ کیونکہ یہیں کی ہوں نمرہ......!''

اس نے اس دھڑلے سے نمرہ کا نام لیا تھا کہ کچھ پل کو وہ گنگ ہو گئی تھی۔ یعنی وہ جو سب کی آپا باجی تھی۔ پوری حویلی لکھاں کا سب سے بڑا بچہ تھی۔ بیاہی جا چکی تھی۔ دوسرے بچے کی ولادت قریب تھی۔ چھوٹے بڑے سب عزت کرتے تھے تو یہ کشور سے چھوٹی کل کی آئی کتنے سکون اور اطمینان سے اسے یوں پکار رہی تھی جیسے اس کے ساتھ بے حد پرانی بے تکلفی ہو۔ نمرہ کے ماتھے پہ بل پڑے جنہیں اس نے چھپانے کی زحمت نہیں کی۔ اب اسے سمجھ میں آیا تھا کہ جب سے آئی تھی ایک اسی سنہری کو سبھی کو بلا کہتے کیوں سنا تھا۔ اس نے جس بدتمیزانہ انداز میں کشور اور خانم کے صدمے کو نشانہ بنایا تھا، یہ بھی اس سے ہضم نہیں ہوا۔

''چھوڑی پہ تو سنا ہے تم اپنے سگے ماں باپ کی بھی نہیں بیٹھی بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے رشتے داروں نے ہی تمہارے آگے ہاتھ جوڑ لیے تھے کہ تم نہ ہی بیٹھو۔ تو ایسی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی اور کے دکھ میں شامل ہو سکے۔

دوسری بات یہ کہ آئندہ میرے کمرے میں آؤ تو دروازہ کھٹکھٹا کے آنا، ورنہ باہر نکال کے دروازہ منہ پہ مار دوں گی۔ اور مجھے فرق تو نہیں پڑتا کیونکہ میرا کون سا تم سے کوئی قریبی تعلق ہے لیکن مجھے بڑے ہونے کی عزت نہ دے سکو تو مجھ سے بات چیت سے پرہیز ہی کرنا کیونکہ ایسے لوگوں کو میں

پسند نہیں کرتی جنہیں چھوٹے بڑے کا لحاظ نہ ہو۔''

ایسی کمال کی توہین آمیز گفتگو نے ایک منٹ کے لیے سنہری کے چودہ طبق روشن ضرور کر دیے تھے۔ اسے کچھ دیر جواب نہیں سوجھا تھا۔ وہ بس نمرہ کو تو کبھی خانم کو دیکھتی رہی جو سر جھکائے بیڈ شیٹ کھنگال رہی تھی۔ اس نے وتیرہ پکڑ لیا تھا کہ ایک دم سے دباؤ ڈالنے کی خاطر مقابل کو اس انداز میں مخاطب کرتی کہ وہ خود کو لاجواب محسوس کرتا۔ لیکن نمرہ نے ثابت کیا تھا کہ وہ حسنات کی بہن ہے۔ سنہری نے تھوک نگل کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور بولی۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ باہر رہتی ہو اس لیے نام سے بلانا پسند کرتی ہو گی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپا باجی میں پھنسی ہوئی ہو اب تک۔ خیر......'' سنہری جگہ سے کھڑی ہوئی۔ ''میں نے بھی کب سیکھا ہے کسی کی ماننا میرے بارے میں یہ بھی معلوم ہی ہو گا کہ مانی میں نے اپنے ماں پیو کی بھی نہیں تو یہاں تو ویسے ہی میری چلنے کے دن آنے والے ہیں۔'' وہ اطراف میں نگاہیں گھماتی کہہ رہی تھی اور نمرہ کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔ مطلب ایسی بے شرمی، ایسی ڈھٹائی، ایسی دیدہ دلیری......!

''چلتی ہوں......اگلی بار یہاں مرتے کو بھی دیکھنے نہیں آؤں گی نمرہ......''

اس نے نمرہ کے نام کو لمبا کر کے محض اسے چڑانے کی خاطر کہا تھا۔ خانم کو ایک بار پھر کاٹ دار نگاہوں سے دیکھتی وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

''یہ کیا ذلالت پھیلی ہوئی ہے حویلی میں خانم......''

نمرہ ششدر سی ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی تھی جو مکمل بند نہیں ہوا تھا لیکن بھڑا ہوا تھا۔

''یہ ایسی ہی ہے نمرہ آپا...... یہ اچھی نہیں ہے، بہت بہت بری لڑکی ہے۔ مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے۔'' وہ خوف زدہ سی کہتی نمرہ کے قریب کھسکی۔ اس کی رنگت پیلی تو پڑ چکی تھی اس وقت مزید پھیکی لگ رہی تھی۔ نمرہ نے اسے محبت سے ساتھ لگایا اور بولی۔

''اچھا! تم سو جاؤ کچھ دیر۔ اس کا بندوبست کرواتی ہوں میں، شیطان کی خالہ لگی مجھے تو یہ......!''

خانم جواب میں کچھ نہیں بولی اور سکڑی سمٹی سی لیٹ گئی۔ نمرہ نے فکرمندی سے اس پہ کمبل

اوڑھایا اور خود بھی نیم دراز ہوتے اس کے سر میں انگلیاں چلانے لگی۔ باہر دروازے کے ساتھ لگی سنہری تمام گفتگو سن کر چلچلاتے ذہن کو شانت کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

''چلو جی تم بھی شامل ہو گئیں میرے دشمنوں کی لسٹ میں...... ایک تو ساری حویلی کو سنہری سے پنگے لینے کا شوق ہو چلا ہے۔ لیکن سنہری کے ساتھ بیر باندھ کے تم بھی گھاٹے میں ہی رہو گی، نمرہ بی بی......!''

☆......☆......☆

کمرے میں پر سکون خاموشی تھی۔ پہلی رات کے بعد وہ آج دوسری بار یہاں داخل ہوئی تھی۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ باسی پھولوں کی مہک ابھی تک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں یکبارگی بھیگ گئیں۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی اپنی نئی زندگی کے حوالے سے کچھ خواب تھے لیکن قسمت میں ایسا جھٹکا لکھا تھا کہ سب ہی خوابوں پہ گرد سی پڑ گئی تھی۔ اماں ابا کا غم سینے پہ دھری وہ سل تھا جو سب مل کے ہٹانا چاہتے تھے لیکن وہ ہٹنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

''ہوتے ہیں کچھ غم جو پیارے ہو جاتے ہیں۔ مرہم رکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ مندمل ہونے لگیں تو کسی خوب صورت یاد کی نوک دار برچھی سے انہیں کرید دینا اچھا لگتا ہے۔ جب غم کی وہی کیفیت دوبارہ عود کر آئے تو نین نیر بہاتے ہیں اور دل کے نہاں خانوں میں آسودگی پھیل جاتی ہے۔ سکون آ جاتا ہے کہ وہ غم ویسے کا ویسا موجود ہے ہم سے جدا نہیں ہوا۔ ہم سے چھین نہیں لیا گیا۔ وہی تو ہمارا ہے جسے دل میں اتار کر اس سے منسوب وہ سب یادیں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ محفل سجی رہتی ہے۔ سنگت بنی رہتی ہے۔ آہ! یہ غم......! پیارا غم کسی کو لگے نہ کبھی...... اور لگ جائے تو چھٹے نہ کبھی، روح کے ساتھ مدغم ہو جائے......!''

وہ اماں ابا کی یاد کا ہوکا کمرے کی فضا کے سپرد کرتی ننگے تلے قدموں سے چلتی بیڈ کے قریب آئی اور ایک طرف لیٹی پڑی پھولوں کی مسہری کو حسرت سے دیکھا۔ کتنا حسین لگ رہا تھا اس رات یہ کمرا...... کیسے اس کا دل دھڑک اٹھا تھا یہاں قدم رکھتے ہی۔ بس چند ہی گھنٹے گزرے تھے اور پھولوں کی سیج سے جب پیر نیچے اترے تو قدم قدم کانٹے بچھ چکے تھے۔ اسے وہی اس رات والی شنیل کی ہلکی گلابی بیڈ شیٹ دیکھ کر وحشت ہوئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہوتی دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی اور پورے

کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ دماغ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اس رات وہ سو گئی تھی، اسے یاد تھا کہ بیٹھے بیٹھے وہ تھکنے لگی تھی اور تب ہی حیات اندر آیا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی اس کی حسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ لیکن ہر ذرا سی دیر میں نیند کا جھونکا سا اس کے حواسوں کو چھو کر گزر رہا تھا۔ وہ تھک بھی بہت گئی تھی اور اس نے کھانا بھی سارے دن کی بھوکی ہونے کی وجہ سے اتنا تو کھایا تھا کہ اس کا پیٹ بھرا تو نہیں تھا لیکن پہلے جیسی خالی پیٹ ہونے والی اینٹھن بھی نہیں تھی۔ حیات یہیں اس کے قریب آ کر بیٹھا تھا اور جان بوجھ کر محض اسے ستانے کی خاطر اس کے پھیلے لہنگے پہ بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہاں محبت کا ایک جہاں آباد پایا۔ اس کی کلائیوں میں بے حد چاہت سے دو کنگن سج چکے تھے اور میٹھی میٹھی باتوں کا رس اس کے کانوں میں گھل رہا تھا۔ تب ہی اسے نیند کے جھٹکوں نے پریشان کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور سر سن ہو رہا تھا۔ اس نے غائب دماغی سے اپنے لہنگے پہ کہنی کے بل نیم دراز حیات کو دیکھا تو وہ بھی باتیں کرتا کرتا اب بازو گرائے اس پہ سر رکھ چکا تھا اور مسلسل جمائیاں روکتا اس سے گفتگو کرتے رہنے کی کوششوں میں تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ سیدھے ہو کر طریقے سے سو جائے لیکن جھجک آڑے آ گئی اور اس کی اس گومگوں کیفیت میں حیات مکمل سو چکا تھا۔

اس نے زبردستی پلکیں جھپکیں اور حیات کا جائزہ لیا۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند میں جا چکا تھا تو اس نے بھی فوراً اپنی کمر کے پیچھے تکیے لگائے اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد اسے نہیں یاد تھا کہ اسے کتنی دیر لگی تھی گہری نیند میں جانے میں بس اس کی نیند میں خلل سا آتا رہا تھا جب اس نے اپنے چہرے کے بالکل پاس کسی کی سرگوشیاں سنی تھیں۔

وہ پہلی رات کی دلہن تھی کمرے میں اپنے دلہا کے ساتھ تھی جس کے ساتھ اب سے پہلے کبھی تنہائی نہیں ملی تھی۔ لاشعور میں کہیں یہ احساس غالب تھا کہ حیات کبھی بھی جاگ سکتا ہے اور اسے ایسا ہی لگا تھا کہ حیات نے شاید اسے نیند سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن نیند کا غلبہ شدید تھا اور وہ دوبارہ نیند میں اتر گئی تھی۔ ایک ہیولہ سا تھا

جو اس پہ جھکا کرخت لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید حیات اس کے سو جانے پہ غصہ تھا لیکن اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن اس گھڑی وہ مسلسل شل سی بیٹھی اپنے بیڈ کو دیکھ رہی تھی کیونکہ اسے اب اچھے سے یاد آ رہا تھا کہ اس پہ جھکا وہ ہیولہ حیات کا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جسے کشور نے اپنے حلق کے قریب محسوس کیا تھا۔ اس کے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ اس کے کمرے میں کوئی انجان وجود گھسا تھا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ حادثے کی نوعیت نے کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی اور ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ کر برسنے کو تیار تھیں کہ قدسیہ پھپھو کی ہدایات یاد آئیں جو انہوں نے بظاہر بڑی محبت سے لیکن ماں جیسے انداز میں تنبیہاً کی تھیں۔

وہ اٹھی اور سب سے پہلے اس نے کمرے سے باہر جا کر ملازمہ کو بلایا تھا اور اس کے ساتھ مل کر پورے کمرے کی صفائی کروائی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے خود نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے تھے۔ اپنے لمبے بالوں کو سنوار کر پشت پہ کھلا چھوڑا، وہ اپنے ڈریسنگ کی دراز کھولے کچھ ڈھونڈ رہی تھی کہ کمرے میں حیات کی آمد ہوئی۔ وہ چونکی اور شیشے میں اس کے عکس کو دیکھتی وہیں کھڑی رہ گئی۔ حیات نے اسے اچنبھے سے دیکھا اور پھر کمرے کو دیکھا تو ایک سکون بھرا سانس اس نے ناک کے رستے اندر کھینچا تھا۔ کتنے دن سے کمرے کی تباہ حالی پہ اسے الجھن ہو رہی تھی لیکن صفائی کروانے کی نوبت ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت معطر اور مہکتے ہوئے کمرے سے اس کے اعصاب کی کشیدگی ایک دم ختم ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور کشور کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اتنے دن بعد اسے دیکھا تھا اتنے قریب سے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے سے تھے لیکن وہ قدرے فریش لگ رہی تھی۔ دو قدم چلتے ہوئے حیات مزید قریب ہوا اور جھجکی سی کشور کو آرام دہ محسوس کروانے کے لیے اس کا رخ اپنی جانب کیا اور دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھے اسے ڈریسنگ اسٹول پہ بٹھایا اور خود نیچے قالین پہ پھسکڑا مار کر یوں بیٹھ گیا جیسے فرصت ہی فرصت ہو۔

کشور کو اچھا نہیں لگا اور اپنی جگہ چھوڑنے لگی تھی کہ حیات نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”بیٹھی رہو...... اچھا لگ رہا ہے تمہیں دیکھنا۔“

''لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا یوں بیٹھنا۔'' کشور منمنائی۔

''میں کون سا تمہارے قدموں میں بیٹھ رہا ہوں۔ یقین مانو یار، میرے جسم میں اتنی تھکان ہے کہ میں بے ارادہ ہی نیچے بیٹھ گیا ہوں ورنہ میرا موڈ تو تمہارے ساتھ ان کرسیوں پہ بیٹھنے کا تھا......!''

وہ مسکین صورت بنائے پیچھے رکھی کرسیوں کو ذرا کی ذرا پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

کشور ہنس دی۔ اتنے دن بعد اس کو یوں ہنستے دیکھ کر دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ کیسا نا قابل بیان اور نا قابل یقین حادثہ ہو کر گزرا تھا۔ کتنے ظالم نقوش چھوڑ گیا تھا۔ چہرے مستقل اتر گئے تھے۔ دل مسلسل اداسی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ روح گھائل الگ تھی۔ حیات کو بیک وقت اس پہ ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ تب ہی اپنے ہاتھوں میں دیے اس کے نازک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔ ٹھنڈی میٹھی سی انگلیوں کا لمس اس کی جلتی آنکھوں کو تراوٹ بخش گیا۔

''کشور......!'' اس نے پکارا تو کشور نے ذرا کی ذرا اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔

حیات کا دل ڈوب کر ابھرا۔ وہ دور سے زیادہ قریب سے دیکھنے میں حسین تھی۔ وہ دل ہی دل میں رب کا شکر گزار رہا۔

''تم اور خانم اس وقت جس صدمے سے گزر رہی ہو، اس کو دنیا کی ساری محبتیں بھی مل کر کم نہیں کر سکتیں لیکن ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ چچا اور چچی کی محبت کی تقلید کریں۔ ان کے جیسا خلوص اپنے رشتے میں پیدا کریں۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے سانس کے ساتھ سانس جوڑے جیتے رہے ویسی ہی ایک مثال ہماری بھی ہو۔ میرا دل کرتا ہے کہ ایک محبت کی داستان ہم بھی لکھیں، بالکل ان کے جیسی...... بے ریا، مخلص اور جان نثار محبت۔ ہماری بھی روحیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی رہیں جب تک جسم میں ہیں۔ اور جب جسم نہ رہیں تب بھی بندھی رہیں۔ میری محبت میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ میرے خلوص میں کبھی تم ملاوٹ نہیں دیکھو گی۔ لیکن کبھی اگر میں خفا ہوں تو مجھے بس اپنی ان پیاری پیاری آنکھوں سے دو بار پلکیں اٹھا کر پھر گرا کر دیکھنا، میری ساری ناراضی بھاپ بن کر اڑ جایا کرے گی۔''

کشور جو بہت محویت سے لالیاں بکھیرتے چہرے کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی، آخری

بات پہ اس نے پلکیں اٹھائیں اور حیات کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر وہ بھی ہنس دی۔ لیکن ہنستے ہنستے بھی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔

''خود کے ساتھ زبردستی نہ کرو۔ بس اتنا کرو کہ میرے ساتھ چل پڑو، قدم میں ملا لوں گا۔ مرہم میں بن جاؤں گا۔ ازالے میں کرلوں گا۔ درد کے کانٹے میری انگلیاں چن لیں گی۔ بس میرے ساتھ چلو کشور...... منزل تک...... آخر تک...... سانس ختم ہونے تک......!''

ایسا فسوں تھا اس کی آواز میں، ایسا سحر کہ کشور بے ساختہ آنکھیں موند کر جھکتی اپنی پیشانی اس کے ہاتھوں میں بند اپنے ہاتھوں پہ ٹکا گئی۔ اور اس کے خوب صورت ریشمی بالوں پہ حیات نے محبت سے اپنی پیشانی رکھ دی تھی۔ جمود پگھلنے لگا تھا۔ زندگی کو دھکا لگا تھا۔ گھسٹتے گھسٹتے چل پڑتی، چلتے چلتے دوڑنے بھی لگے گی اور ایک دن پرواز بھی پکڑ لے گی......!

زندگی تو کسی کے لیے نہیں رکتی...... آپ رک جائیں، یہ پھر بھی آپ کو زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لے جاتی ہے۔ آپ کو مہلت نہیں دیتی کہ آپ کہیں رک کر اپنے دکھوں کا ماتم کر سکیں۔ کہتی ہے کہ قدم نہ روکو چلتے چلو اور رونا ہے تو ساتھ آنسو بہا لو لیکن ٹھہرنا نہیں۔ کیونکہ ٹھہراؤ میری سرشت میں نہیں، میں کسی کے لیے نہیں رکا کرتی...... مجھے تمہیں بھی وہاں تک لے کر جانا ہے جہاں تک میرا تمہارا ساتھ طے ہے۔ وہ آخری کنارا جہاں تم سے تمہاری سانسیں اور مجھ سے تمہاری راہ جدا ہو جائے گی۔ عالم فنا سے عالم بقا تک کا سفر تمہیں میں نے ہی طے کرانا ہے تو چلو نا کہ تمہارے پاس ٹھہر کر سوگ کرنے کی مہلت نہیں۔ تمہیں رونا ہے رو لو، لیکن رکنے کی اجازت نہیں......!

☆......☆......☆

قاسم اپنے کمرے میں موجود تھا۔ آج کل وہ حویلی میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اسے جلد از جلد ہوٹل کی تعمیر مکمل کرانی تھی۔ کام شروع ہو چکا تھا۔ لیکن مکمل ہونے میں ابھی وقت لگتا۔ پر وہ چاہتا تھا جب تک سب چوہدری آفتاب اور رقیہ کے صدمے سے سنبھلیں، وہ کم از کم اتنا کام کرا چکا ہو کہ دیکھنے والوں کو مجبوراً اپنے منہ بند کرنے پڑ جائیں۔ حسنات اور حیات کی جانب سے اسے سب سے زیادہ

خطرہ تھا۔ وہ دونوں ناک تک چوہدری آفتاب کے صدمے میں ڈوبے پڑے تھے۔ اور پنچائیت کے فیصلے کا جتنی شدت سے ان دونوں کو انتظار تھا شاید خود پنچوں کو بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا پنچائیت لگنے سے پہلے وہ ابتدائی کام شروع کروا دے۔ یہاں سے سڑک سیدھی شہر کو جاتی تھی۔ اگر یہاں ہوٹل بن جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے۔ ہر بس، ٹرک یہاں سے ہو کر گزرتا تھا، ہر گاڑی کا یہاں لانگا تھا۔ اس کا ارادہ تو ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پٹرول پمپ کھولنے کا بھی تھا۔ اتنے تعلقات تو اس کے شہر میں تھے کہ وہ با آسانی یہ سب کرا سکتا تھا...... اندر دھڑکا محض چھوٹی حویلی میں ہونے والے حادثے کے ثبوتوں کا تھا۔ اس نے ہر ثبوت مٹا دیا تھا لیکن پنڈ کے کھوجی بہت کائیاں ہوا کرتے تھے۔ اسے ان سے خطرہ تھا۔ وہ محض بو سونگھ کر کھرا ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں اپنے بیڈ پہ بیٹھا سائیڈ ٹیبل کی درازیں کھنگال رہا تھا اور اس کے ماتھے پہ بل گہرے ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور الماری کی جانب بڑھا۔ وہاں لٹکے ہوئے کپڑوں کے نیچے کچھ تہ شدہ کپڑے تھے، اس نے ان کے نیچے ہاتھ پھیرا لیکن مطلوبہ شے برآمد نہیں ہو سکی۔ پریشانی سے اس نے اپنے ماتھے پہ انگلیاں مسلیں تب ہی دروازہ ہلکا سا بجا کر اندر سنہری داخل ہوئی جسے دیکھ کر اس کا دماغ سوا نیزے کی کھولن پہ کھول گیا۔ مطلب تمیز نام کی کوئی شے اس لڑکی میں نہیں تھی۔ ہلکا سا دروازہ بجاتی اور احسان کرتی اندر چلی آتی۔ شرم لحاظ نام کی کسی شے سے اس کا واسطہ نہیں تھا۔ وہ کچھ سخت سست کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے اور ساتھ لوازمات دیکھ کر اس کی زبان رک گئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اتنے دن کی بھاگ دوڑ اور افراتفری میں وہ ڈھنگ سے نہ کھا پی رہا تھا نہ چائے سکون سے نصیب ہو رہی تھی۔ وہ بادل نخواستہ خاموش رہتا چلتا ہوا کمرے میں رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر ٹک گیا۔

سنہری ذو معنی انداز میں مسکرائی اس کے قریب آئی لیکن برابر میں رکھی کرسی پہ بیٹھنے کے بجائے اس نے ٹرے چھوٹی سی شیشے کی سینٹر ٹیبل پہ رکھی اور اسے بیڈ کے نزدیک کھینچتی خود بیڈ کی پائنتی پہ ٹک گئی۔ قاسم نے اسے خاصے اچنبھے سے دیکھا۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس وہ اپنی سفید رنگت

اور متناسب جسامت کے باوجود ایک نا قابل بیان سی الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر اس کی موجودگی میں کیسی بے زاری ہے جو وجود پہ چھا جاتی ہے۔ دل چاہنے لگتا ہے کہ بندہ اسے کہے جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اور جب وہ سامنے نہیں ہوتی تھی تو کسی کسی وقت اس کا خیال بھی آ جاتا تھا اور بات کرنے کو جی بھی چاہتا تھا لیکن سامنے آتے ہی یکسر دل اوب جاتا تھا۔ وہ کبھی بھی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس وقت بھی اسے گھٹن شروع ہوئی تھی جو دل و دماغ کو اس سے متنفر کر رہی تھی۔ پھر بھی چائے کے گرم مگ اور لوازمات کی اشتہا انگیز خوشبو اسے کچھ سخت کہنے سے روک رہی تھی لیکن اسے حیرانی تھی کہ سنہری ہمیشہ اس کے قریب بیٹھا کرتی تھی۔ آج یوں اٹھ کر فاصلے پہ بیٹھنے کا مطلب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''بہت شکریہ...... چائے کی شدید طلب تھی۔ بھوک بھی لگی تھی......!'' یونہی بات کرنے کی غرض سے کہا اور آگے کو جھکا تاکہ چائے کا مگ پکڑ سکے۔ لیکن اس سے پہلے ہی سنہری نے مگ تھام کر اپنے قریب کیا اور بولی۔

''حوصلہ سرکار حوصلہ......'' وہ مسکرائی اور ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ قاسم کو برا لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتا، سنہری نے اپنے دوپٹے کے پلو میں سے ایک پڑیا نکالی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کو کھولا اور بڑی ادا سے اس میں موجود شے اس مگ میں انڈیلنے لگی۔

قاسم کے ہوش اڑ گئے۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ غرایا تھا اور اپنی جگہ سے وہ پڑیا جھپٹنے کے لیے اٹھا۔ ''ادھر دو مجھے، تمہارے پاس کیسے آئی، یہ میں کب سے ڈھونڈ......''

سنہری نے فوراً بند مٹھی اپنے پیچھے کی اور دوسرا ہاتھ کھڑا کر کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''کہاں سے آئی کیا مطلب قاسم صاحب...... تمہاری ہی الماری سے نکالی تھی۔ سو چا اب اس کی ضرورت مجھے بھی تو پڑ سکتی ہے نا۔ ویسے آدھی سے زیادہ تو کھلا چکے ہو تم...... میرا خیال ہے وہ اس دن شاید یہی ملائی تھی نا کھانے میں، وہی جس دن چوہدری آفتاب اور اس کی بیوی سڑ کے سوا ہوئے

ہیں......نہیں؟''

قاسم گنگ سا اسے دیکھے گیا۔ کیا جواب دیتا۔ عقل ماؤف سی ہوئی۔ سنہری کھل کر مسکرائی اور بولی۔

''بیٹھ جاؤ قاسم......بیٹھ جاؤ......میں کون سا کسی کو بتانے لگی ہوں پاگل۔ تم تو ایسے گھبرا گئے ہو جیسے ہم دونوں میں پہلے سے راز نہیں کوئی۔ اگر مجھے بتا دیتے تو کام ہی آتی لیکن چلو کوئی نہیں۔ ابھی بھی کون سا نہیں آسکتی۔ میں تو تمہارے لیے جی جان سے حاضر ہوں پیارے......!''

وہ واقعی اپنے اندر انتہا کا عامیانہ پن رکھتی تھی، آج قاسم نے مان لیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پیتا اسے خوں خوار نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''کام آنے کے بدلے تم نے یقیناً دسیوں سودے طے کر رکھے ہوں گے دماغ میں، تمہاری مدد کی ضرورت نہیں مجھے......!''

وہ آخری الفاظ اچھی طرح چبا کے بولا تو سنہری ہنسی اور دل پہ ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔

''ہائے ظالم......ایسے وار تو نہ کیا کرو۔ سنہری کا دل بہت نازک ہے، دکھ جاتا ہے۔ اور باقی رہ گئی میری مدد......'' وہ آگے کو جھکی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کے بنا تم اس حویلی کے اندر کچھ نہیں کر پاؤ گے چوہدری قاسم......کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ سنہری کبھی بھی کچے کام نہیں کرتی۔ جو کچھ تم نے اور تمہارے تائے نے کیا ہے اس کے تمام ثبوت میرے پاس ہیں اور وہ میں نے ایسے بندے کے پاس رکھوا دیے ہیں کہ اگر مجھے کچھ ہوتا ہے تو وہ تمام ثبوت سیدھے چوہدری حیات اور حسنات کے پاس جائیں گے۔ پھر پوترنا (بے قابو ہونا) تم تایا بھتیجا اچھی طرح......!''

''یہ کیا بکواس ہے۔ تمہیں کیوں کچھ کروں گا میں۔ اماں کی پنیویں ہو......!'' قاسم ڈھیلے لہجے میں بولا۔ لیکن اس کے دانت چبانے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سنہری کو ہی چبا رہا تھا۔

''جیسے چوہدری آفتاب کو کر دیا۔ وہ تمہارا چاچا تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم نہیں اپنا اور چاچے کا فرق......تم، تم ہو سنہری۔''

''اچھا جی......'' وہ کھلکھلائی۔ ''فرق صرف اوقات سے پیدا ہوتا ہے قاسم......ہر کوئی اپنی

اوقات کے حساب سے نوازا جاتا ہے۔''

''مجھ سے اتنی گوڑی باتیں نہ کیا کر سنہری، صاف بول کیا کرنا ہے اب......''

وہ ہار ماننے کے انداز میں بولا۔ اسے سنہری کی خباثت کا اندازہ اچھے سے ہو چکا تھا اور اتنا وقت بالکل نہیں تھا کہ اس سے الجھا جاتا۔ سنہری کو اپنے ساتھ ملا لینے میں مضائقہ بھی نہیں تھا۔ جو شیطان اس کے دماغ میں پلتا تھا وہ کسی وقت بہت کام آتا تھا۔

''میری دو شرطیں ہیں۔ دونوں ہی ماننی ہوں گی......!''

''مثلاً......؟'' اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

''پہلی یہ کہ جس زمین پہ تم ہوٹل بنا رہے ہو اس میں میرا بھی حصہ ہوگا!''

''پاگل ہوگئی ہو...... اور تمہیں کس نے کہا کہ میں کسی زمین پہ ہوٹل بنا رہا ہوں۔ بالکل بھی نہیں......!''

قاسم یکدم بھتّے سے ہی اکھڑ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ سنہری کو ہوٹل کی بھنک ہو چکی ہوگی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے منہ سے یہ ذکر سن کر اسے جھٹکا لگا تھا۔

''مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ چوہدری آفتاب کو مروایا گیا ہے۔ پتا ہے کیسے......؟'' وہ جھکی اور سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''ہومم...... ممم...... ایسے......'' دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی کلی بنا کے انہیں اونچا کر کے فضا میں کھولتے ہوئے وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے پھلجڑی چھوڑی ہو اور وہ ننھی بچی کی طرح اسے دیکھ کر خوش ہوئی ہو۔ قاسم ہک دک اسے دیکھتا نچڑا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ اچھا ایسے نہیں سمجھے......؟ تو چلو تمہاری آسانی کے لیے بتا دیتی ہوں کہ وہ جو اس رات اوپر تلے دھماکے ہوئے تھے، وہ سلنڈر پھٹنے کے، وہ خود کیے گئے تھے سوچ سمجھ کر۔ مطلب انہیں وہاں رکھوایا ہی اس لیے گیا تھا تاکہ وہ پھٹ سکیں نا...... ارے اتنی آسان بات تمہیں سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی قاسم...... مجھے تو پہلی رات ہی سمجھ میں آ گئی تھی!'' تجاہل سے کام لیتی وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھی بہت دانشور لگ رہی تھی۔

قاسم مان گیا تھا کہ اس کے سامنے ایک عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اسے دیکھتی سنہری بھی کھڑی ہوگئی تھی۔ قاسم بے حد شاک میں تھا اور وہ اس وقت اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ اس کی سانپ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اسے جھلساتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں کل پھر آؤں گی۔ تمہارا جواب جاننے۔ ابھی تو ایک شرط بیان کی ہے میں نے، دوسری میں تمہارا فائدہ زیادہ ہے۔ میرا اگلے ہاتھوں ہو جائے گا۔''

ناچاہتے ہوئے بھی قاسم پھر ٹھہر گیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ اس کی ہر بات سننے پہ مجبور کیوں ہے۔ اس کا منہ توڑ کیوں نہیں دیتا۔ وہ کون سی طاقت تھی جو اسے روکتی تھی۔

''جلدی بولو...... مجھے جانا ہے سنہری، پھوٹو اور نکلو یہاں سے......''

''مجھے بھی شوق نہیں ہے تمہارا وقت ضائع کرنے کا آخر تم بنارکے کام کرو گے تو ہوٹل بنے گا۔ ہوٹل بنے گا تو سنہری کا حصہ بنے گا اور سنہری کا مقدر سنہرا ہے۔ بہت قاسم...... اس لیے اصل بات پہ آؤ، موقع اچھا ہے۔ خانم بیمار پگلائی سی پھرتی ہے۔ ماں باپ دونوں مر مرا گئے ہیں۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے۔ کشور تو اپنے خاوند کو پیاری ہو چکی ہے۔ وہ اب سارا دن تو خانم کو اپنے گھٹنے سے لگائے نہیں بیٹھے گی نا۔ تو خانم اس کے سسرالی گھر میں کس رشتے سے رہے گی۔ اس مسئلے پہ اگر سکینہ تائی نے تم سے پہلے سوچ لیا تو بہت پچھتاؤ گے اور اس ہیرے کو پنا لے اڑے گا یعنی حسنات...... اس لیے جتنی جلد ہو سکے خانم کو اپنے نام کرواؤ۔ لوہا گرم ہے سارا ماحول افسردہ ہے۔ سب تتر بتر ہوا پڑا ہے۔ ایسے میں تمہارا ہمدردی دکھا کر یہ میدان مارنا آسان ترین ہے۔ دیر ہوتی گئی تو سب کی بند عقلیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔ یاد رکھو بیٹے قدسیہ پھپھو کے بھی ہیں اور خانم کے لیے ناں کسی کے منہ سے نہیں نکل سکتا۔ اب بولو کیا کہتے ہو......؟''

مکمل یکسوئی سے پوری پلاننگ اس کے گوش گزار کرتی سنہری کو یک ٹک دیکھتا قاسم جیسے سانس تک تھامے سن رہا تھا۔ یہ لڑکی نہیں، لاوا تھی۔

قاسم نے اپنا گلا کھنکارا اور تھوک نگلتے ہوئے گویا ہوا۔

''بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن خانم ابھی تو پندرہ کی ہوئی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں کون اس کی شادی کی طرف دھیان دے گا۔ دوسری بات یہ کہ اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تمہارا بھلا کیا فائدہ ہے اس میں سنہری......؟''

''کیا تمہارا فائدہ میرا فائدہ نہیں ہے قاسم......! اس کے آگے سنہری کچھ نہیں سوچتی، تم سنہری کو عزیز ہو، اس کی ماسی کے اکلوتے پتر ہو، تم خوش رہو گے تو سنہری خوش رہے گی۔ بس اتنا سا فائدہ ہے میرا......'' وہ پلٹ کر آواز میں مصنوعی آزردگی پیدا کرتے ہوئے بولی تو قاسم کو سمجھ میں نہیں آیا کہ متاثر ہو یا ہوشیار!

اور سنہری کے جال کو قاسم جیسے کوتاہ نظر کے دیکھنے کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بیک وقت کئی جگہ پہ چارے کا انتظام کیے ہوئے تھی۔ حسنات کے سامنے سے خانم کو ہٹا کر قاسم کے حوالے کرنا چاہتی تھی اور اس کی جگہ خود کو لانا تھا اسے......اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر بار کی طرح قاسم آخری مہرے کے طور پر اس کے ہاتھ میں رہتا۔ اس لیے قاسم کے دل میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کیے رکھنا بھی ضروری تھا۔ وہ پلٹی اور قاسم کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''میری فکر نہ کرو تم، مجھے اپنے سب معاملات کو دیکھنا آتا ہے۔ تم بس خانم کی فکر کرو جو کبھی بھی تمہارے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل سکتی ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔ میری دونوں شرطوں کو پورا کرنا تم پہ واجب ہے ورنہ وہ افیم بھی میرے پاس ہے اور اس رات کی چشم دید گواہ بھی میں ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہوٹل بنانے سے پہلے جیل میں چکی پیسو......!''

وہ چلتی ہوئی دروازے تک گئی، پلٹ کر اسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''چائے کا مزا لو لیکن دھیان سے، افیم والی چائے مت پی جانا۔ سوتے رہ جاؤ گے......''

وہ کہتی نکل گئی تو قاسم کے سکتہ زدہ وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ٹرے اور اس میں رکھے مگ کو دیکھا اور بیڈ کی پائنتی پہ ٹک کر سنہری کی باتوں کو سوچنے لگا۔ وہ حیران و ششدر تھا کہ اتنی سی لڑکی کے ہاتھوں میں کیسے آپھنسا تھا۔ ہوٹل میں سے اس کا حصہ دینا پھانس بن کر چبھا تھا۔ خانم کو اس کے

حوالے کر کے وہ خود کیا کرنے جا رہی تھی۔ اتنی ہمدردی اس سے کیوں ہو رہی تھی بھلا...... یہ سب سوالات اس کے دماغ کو پلپلا کر رہے تھے۔ سنہری کی سنہری سانپ جیسی چھوٹی بنا پلکوں کے آنکھیں یاد کر کے جھرجھری سی لی اس نے...... اس نے مان لیا تھا کہ حویلی لکھاں میں اس کی شکل میں ایک بلا آن گھسی تھی۔ وہ بلا جو سب کا باری باری خون چوسنے کے درپے تھی۔

☆......☆......☆

آج پنچائیت بیٹھ گئی تھی۔ حیات نے رات ہی باپ کے گوش گزار کر دیا تھا کہ کل صبح میں پنچائیت بیٹھے گی لہٰذا ڈیرے پہ نہ جائیں۔

"کس سے پوچھ کے تم نے کل کی دیہاڑی برباد کی ہے میری۔ میں نے کب کہا کہ پنچائیت بٹھا ابھی......!" انہیں پتا چلا تو وہ آگ بگولا ہوئے تھے۔

حیات حیران تھا کہ پنچائیت کا بیٹھنا تو طے تھا اور ابھی بھی معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا تو محض چوہدری شہاب کی سستی کے باعث اور اب باقی پنڈوں کے چوہدریوں کے دلوں کا غبار ان کی زبان کا غصہ بن کے نکلنے لگ گیا تھا۔ جس جس پنڈ سے شادی پہ پروہنے اکٹھے ہوئے تھے، وہ سب ہی فیصلہ چاہتے تھے۔ کھوجی اپنی کھوج مکمل کر چکے تھے اور اب سب کو فیصلے کا انتظار تھا۔ اسی لیے شہاب الدین فکر مند بھی تھے کہ اگر کھوجیوں کی کھوج ان کے اور قاسم کے خلاف چلی گئی تو معاملہ سنبھالا کیسے جائے گا۔

"ابا جی! آپ سے پوچھ کے ہی آج کی تاریخ دی تھی سب کو۔ ورنہ سب پچھلے ہفتے ہی اکٹھے ہونا چاہ رہے تھے۔ ان لوگوں کو کچھ ثبوت ملے ہیں کہ چچا آفتاب کی حویلی میں جو بھی ہوا تھا وہ صرف حادثہ نہیں بلکہ انہیں قتل کرنے کے لیے باقاعدہ حادثے کی شکل دی گئی تھی۔"

چوہدری شہاب کا رنگ متغیر ہوا اور وہ رخ موڑ گئے۔ انہیں قاسم پہ جی بھر کر غصہ آیا کہ اس کی لاپروائی کی وجہ سے یقیناً کوئی ثبوت کھوجیوں کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھاتے سوچنے لگے تھے کہ یہ معاملہ کیسے ٹالا جائے لیکن آثار نہیں لگ رہے تھے۔

"تم چلو، پہنچتا ہوں میں بھی......"

انہوں نے رخ موڑے ہی حیات سے کہا تو وہ ان کی پشت دیکھتا تاسف سے سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ خود چوہدری شہاب نے اپنی تیاری مکمل کی اور خاصا وقت لگا کر سرکاری اسکول کے میدان میں پہنچے۔ میدان میں جم غفیر تھا جو آج امڈ آیا تھا۔ چوہدری شہاب الدین دل میں قاسم کو کوستے اپنے منجے پہ آبیٹھے۔ کاما حقہ لاکر رکھ گیا۔ چوہدری شہاب کے بیٹھتے ہی سب ہی بزرگ اور مرد حضرات بھی جگہ سنبھالنے لگے۔ شہاب الدین کے چہرے کا تنفر سب کو صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیات اس بات کو لے کر جز بز بھی تھا۔ اس نے اپنے پھوپھا چوہدری انور کو دیکھا تا کہ وہ مجمع کو پرسکون کر سکیں۔ چوہدری انور نے کھڑے ہو کر سب کو مخاطب کیا۔

''میرے پراؤتے بیلیو...... ! جیسا کہ آپ سب کو پتا ہے کہ چوہدری آفتاب کی حویلی جس طرح آگ کی لپیٹ میں آئی تھی آپ کے ساتھ مجھے بھی شک تھا کہ اسے جان بوجھ کر پھونکا گیا ہے۔ ہم نے سب ہی پنڈوں کے کھوجیوں کو اس کام پہ لگایا تھا اب جو بھی کھرے نکالے ہیں وہ سب کو پتا چل جائیں گے۔ بختو کھوجی کو بھی جانتے ہیں اور اس کی گل کبھی غلط نہیں ہوتی۔ وہ سب کی طرف سے جو بتائے گا اگلا فیصلہ اسی کی بنیاد پہ کیا جائے گا۔ سب حوصلہ جمع رکھ کے بیٹھو تے کھپ رولا نہ پاؤ۔''

چوہدری انور کے کہتے ہی مجمع میں باوجود منع کرنے کے ایک بار پھر شور برپا ہوا۔ چوہدری شہاب کی نگاہیں مسلسل قاسم کو ڈھونڈ رہی تھیں جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے اندر ایک نامعلوم سا خوف سر اٹھانے لگا تھا۔ وہ پہلو پہ پہلو بدلتے جا رہے تھے اور قریب کھڑا کھوجی مسلسل ان کی حرکات وسکنات کو نوٹ کر رہا تھا۔ بختو کھوجی دوسرے پنڈ کے چودھری کے ساتھ کھڑا کچھ بات کر رہا تھا جیسے ہی چوہدری انور نے بات مکمل کی وہ تیزی سے چلتا ایک مرکزی مقام پہ آ کر کھڑا ہوا اور اس کی آواز بلند ہوتے ہی سارے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''میرے سجنوتے مترو...... ساڈے پنڈ دی تریخ (تاریخ) میں آج تک ایس طراں کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ چوہدری آفتاب کی حویلی میں جو آگ لگی ہے وہ وہاں پڑے گیسی سلنڈروں کے پھٹنے سے لگی ہے۔ ساڈے کھوجی پراواں نے جو کھرے لبھے ہیں وہ صاف بتاتے ہیں کہ اس رات چوہدری

آفتاب کی حویلی میں دو بندے کند (دیوار) ٹپ کے اندر گئے ہیں۔ چوہدری آفتاب کی حویلی میں جتنے بھی جی تھے سب ہی کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ ان سب ہی کو افیم کھلائی گئی تھی کیونکہ جو بچا کھچا کھانا وہاں سے ملا ہے اس میں افیم ملی ہوئی تھی۔ بڑے حکیم جی نے بھی اس گل کی تصدیق کی ہے۔ اس افیم کی وجہ سے سب کو پہلاں بے ہوش کیا گیا ہے اس کے بعد وہاں آگ لگائی گئی ہے۔ اصل رولا یہ ہے کہ چوہدری آفتاب کی حویلی کے وڈے کمرے میں سارے گیسی سلنڈر رکھے گئے ہیں اور دو سلنڈر بار لے ویڑے میں تھے جو سب کے سب اس سے پہلاں ڈیوڑھی میں تھے۔ ان کو وہاں چیچا (خاص طور پر) لایا گیا ہے اور یہ کم ان ہی دونوں بندوں کا تھا جو اس رات حویلی کے اندر وڑے تھے۔ جس وقت آگ لگی ہے وہ پھیلتے پھیلتے ان سلنڈروں کو بھی پکڑ گئی اور سبھی پاٹ (پھٹ) گئے۔ ککھ وی نہیں بچا پچھے۔"

سارا مجمع جو چپ سادھے سن رہا تھا، وہاں یکدم آسمان کو چھوتی ہاہا کار مچی تھی۔ اسی اثنا میں قاسم بھی وہاں آ کر خاموشی سے بیٹھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پہ پراسراری مسکراہٹ کو حسنات نے بغور دیکھا تھا لیکن اس قدر شور مچ گیا کہ دھیان بٹ گیا تھا۔ سب ہی لوگ غم و غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ حیات لب بھینچے مٹھیاں کسے کڑی سے کڑی جوڑ رہا تھا...... بلکہ جوڑ چکا تھا۔

اس کا چہرہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ ان کی حویلیوں میں پرائے بندے گھس آئیں اور ان کے گھر کے جی جلا کر راکھ کر دیے جائیں۔ چوہدری انور بھی ششدر سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ بہت سی گرہیں کھل رہی تھیں۔ افیم والی بات نے جیسے دماغ کے سارے تار ہلا دیے تھے۔ پنڈوں کے چوہدری اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے گھروں کے کتنے بندے تھے جو پروہنے بن کر حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے، جن میں تین عورتیں بھی شامل تھیں، سبھی آگ کا ایندھن بن گئے تھے۔ کسی کی لاش پہچاننے میں نہ آئی تھی۔ اندازوں سے پہچان کر دفن کیا گیا تھا۔ ان کا غم و غصہ قدرتی تھا۔

حسنات سب کے بپھرنے پہ پریشان سا کبھی باپ کی صورت دیکھتا تھا تو کبھی بھائی کی جو خود سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔ چوہدری شہاب کے گرد معتبر بندے ٹولے کی صورت میں اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ قاسم البتہ پرسکون سا سارے پہ سرسری نگاہ ڈالتا اپنی گھڑی دیکھتا تھا۔ کھوجی حضرات کا ٹولہ

ابھی بھی کھسر پھسر کرنے میں مشغول تھا۔ تبھی بختو کھوجی دوبارہ مرکزی جگہ پہ آ کر کھڑا ہوا اور پورے حلق سے سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"سجنو تے بیلیو، ذرا ذرا رولا کم کرو۔ اک اہم گل کرنی باقی ہے۔"

ذرا وقت لگا تھا اور سب ہی مجبوراً خاموش ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر سب ہی متوجہ ہوئے تھے۔

"بیلیو! جس وقت چھوٹی حویلی میں آگ لگی تھی، وہاں دس جی تھے جو پروہنے تھے۔ جن میں ست بندے تے تن زنانیاں شامل تھے۔ اس کے علاوہ چوہدری آفتاب اور اس کی گھر والی۔ کل ملا کر بارہ جی موجود تھے۔ لیکن اک اہم گل یہ ہے کہ جتنی لاشیں ملی تھیں وہ کل ملا کے گیارہ تھیں۔ جب کہ بندے بارہ تھے۔ اک لاش یا تو پوری سڑ کے سواہ ہو گئی تھی جس کا بقایا ککھ نہیں بچا یا پھر وہ غیب ہو گئی ہے۔ چاچا نا تو بھی چوہدری آفتاب کی حویلی میں رکا تھا اور سب جانتے ہیں کہ وہ سدا کا چھڑا چھانٹ، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، نہ آلی نہ موالی...... اس لیے کسی نے اس کا کھیڑا (پیچھا) نہیں کیا۔ لیکن اب جو کھرے سامنے آئے ہیں ان سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ویلے وہاں بارہ جی تھے جبکہ سڑے ہوئے جو دفنائے گئے ہیں، وہ گیارہ ہیں۔ اس لیے ابھی مزید تفتیش کو لوڑھ ہے۔ یہ معلوم کرنا پڑے گا......"

مجمع بات پوری سنے بنا ایک بار پھر بپھر گیا تھا۔ سب ہی اب اپنی اپنی جگہیں چھوڑ چکے تھے۔ یہ کیسا اندھیر مچا تھا۔ کیسی ظالمانہ بات تھی۔ کوئی کیسا بھی ظالم ہو، کیا اتنا بھی ہو سکتا تھا۔ حیات کا سر جیسے پھوڑا بن رہا تھا۔ حسنات کا جی کر رہا تھا کہ سارے جگ کو آگ لگا دے۔

چوہدری انور بپھرے ہوئے لوگوں کو کیا روکتے، انہیں خود ان کے بیٹے تھامے کھڑے تھے۔ ان کا یار تھا آفتاب۔ ان کا محبت کا رشتہ تھا اس سے، وہ بنا کچھ کہے سنے چپ چپیتے چلا گیا تھا تو مان لیا رب کی مشیت تھی، لیکن کوئی ایسے ظلم سے مارے گا۔ یہ کیوں ہونے دیا جاتا بھلا، کبھی نہیں۔ انہوں نے پلٹ کر انتہائی غیض و غضب سے چوہدری شہاب اور قاسم کو دیکھا تھا جن کے چہروں پہ کسی قسم کا غم و افسوس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک قاسم تھا جو اتنی افراتفری شور شرابے میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اپنی کالی کھیڑی والا پیر جھلا رہا تھا اور اس کا ذہن ایک منظر بن رہا تھا۔

چھوٹی حویلی میں ہوئی واردات کا منظر......

اس رات کا منظر جب رشتوں نے خون کی حرمت بھلا کر سفا کی کی قبا اوڑھی تھی۔

وہ رات جس کا وہ گواہ تھا۔

وہ رات جس رات دو جنے نہیں، تین جنوں نے حویلی کے اندر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ تیسرا جس کا کھرا مٹانے کے لیے اور اس بارہویں جی کا نام و نشان معدوم کرنے کے لیے اس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ مطمئن تھا۔ وہ مطمئن تھا کیونکہ وہ بارہواں بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور بازی بھی......!

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 16

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شب غم مختصر نہیں ہوتی
میں ان شیشہ گروں سے پوچھتا ہوں
کہ ٹوٹا دل بھی جوڑا ہے کسی نے
اپنی کہانی کیسے کہیں گے
دلِ امید توڑا ہے کسی نے
سہارا دے کے چھوڑا ہے کسی نے
اپنی کہانی کیسے کہیں گے
اپنی کہانی کیسے کہیں گے
پیار کی آگ میں جلتے رہیں
نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے
کہاں پہ لا کے چھوڑا ہے کسی نے
دلِ امید توڑا ہے کسی نے

رات بے حد گہری تھی۔ گاؤں میں کہرا شام ڈھلے ہی پھیل جاتا ہے۔ اس دھند کی دبیز چادر میں بہت کچھ دھندلا جاتا ہے۔ کچھ نہ دکھائی دینے والا دکھائی دے جاتا ہے اور کچھ دکھائی دے جانے والا ان دیکھا ہو جاتا ہے۔

ایسی ہی ایک کہرے میں ڈوبی وہ رات تھی جب تین اونچے لمبے لحیم شحیم وجود چھوٹی حویلی کی پچھلی دیوار سے اندر کودے تھے۔ پہلے دو نے اندر چھلانگ لگائی تھی جبکہ تیسرا دیوار کے اوپر ہی بیٹھ گیا تھا اور اپنے جوتے اتار کر دیوار پر رکھ دیے تھے۔ وہاں کچا فرش تھا۔ ان کے قدموں کے نشان مٹی نے جذب کیے تھے۔ دونوں چلتے ہوئے چھوٹے سے چبوترہ نما برآمدے تک آئے تھے۔ ایک اس پر اوپر چڑھا اور اپنے پیروں سے جوتا اتار کر دوسرے کو پکڑایا۔ دوسرے نے وہی جوتا اپنی دونوں ہتھیلیوں پہ چڑھایا اور پیروں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو کچی زمین پر رکھے خود جس طرح قدم قدم واپس دیوار کے پاس آیا، ویسا ہی ہاتھ بھی جوتوں سمیت چلاتا ہوا لایا۔ دیوار کے پاس کھڑے ہو کر وہ سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پہنے جوتے دیوار کے اوپر بیٹھے بندے کے پیروں میں خود اپنے ہاتھوں سے پہنائے۔ انہیں پہنے اس شخص نے کچے پہ چھلانگ لگائی اور چلتا ہوا چبوترے تک آیا۔ باقی دو نے احترام سے اپنے سامنے کھڑے چوہدری قاسم کو دیکھا اور اجازت طلب نظریں اس پہ جمائیں۔ قاسم نے سر کے اشارے سے انہیں بھیجا اور خود حویلی کے اندر والے حصے کا رخ کیا، جبکہ باقی دو نے بیرونی گلی سے حویلی کے مرکزی گیٹ کا رخ کیا جہاں ڈیوڑھی تھی اور گیس کے سلنڈرز رکھے تھے۔

پوری چھوٹی حویلی نیم اندھیرے اور نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تینوں نے اپنے چہرے چادروں میں چھپا رکھے تھے۔ اندر ہو کا عالم تھا۔ قاسم نے باری باری بنا آواز کے سب ہی کمروں میں جھانکا۔ سب خالی تھے سوائے تین کے جن میں سے ایک میں مہمان خواتین سو رہی تھیں، جبکہ دوسرے میں مرد تھے اور تیسرے میں رقیہ اور چوہدری آفتاب موجود تھے لیکن وہ بھی گہری نیند میں لگتے تھے۔

سب پر وہنے لحاف اوڑھے گہری نیند میں تھے۔ کسی کے وجود میں جنبش تک نہیں تھی۔ چوہدری قاسم چلتا ہوا داخلی دروازے کی اور گیا اور اسے بنا کھٹکے کے کھول کر باہر جھانکا۔ باہر موجود دوسرے دو نے کچھ فاصلے سے اسے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا اور قاسم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اندر بلایا۔ دونوں نے محتاط انداز میں گیس کے سلنڈر اٹھائے اور باری باری اندر لا کر مختلف مقامات پر رکھنے لگے۔ کل سات سلنڈروں میں سے دو کو وہیں ڈیوڑھی میں رہنے دیا اور بقایا پانچ حویلی کے مختلف حصوں میں لا کر رکھ دیے۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کر انہوں نے سب ہی سلنڈروں کے وال کھول دیے اور باورچی خانے میں رکھے سلنڈر کا پائپ چولہے سے الگ کیا اور اسے ایک نے ماچس کی تیلی جلا کر آگ دکھا دی۔ پائپ کے دہانے پہ آگ جل اٹھی۔ اس آدمی نے قریب پڑی لکڑی کی پیڑھی اس کے اوپر رکھی تو آگ نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا۔ پیچھے کھڑے دوسرے نے بھی اردگرد سے چیزیں اکٹھی کر کے اس آگ پہ ڈالنی شروع کیں اور کچھ کپڑوں کو سلنڈر کے اوپر ڈال دیا۔ آگ بالآخر ان کپڑوں کو چھوتی تو سلنڈر بھی ممکنہ حد تک آگ پکڑ کر ان کا کام آسان کر دیتا۔ دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے قاسم نے سرگوشی کی۔

''جلدی کام ختم کر کے پچھلے دروازے پہ مجھے ملو۔ جلدی کرو، اس سے پہلے کہ گھٹن زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی جاگ جائے۔ میں تم لوگوں کو وہیں ملوں گا۔''

اتنا کہہ کر قاسم اسی رستے سے واپس ہو لیا، جہاں سے آیا تھا۔ اسی انداز میں دیوار پہ چڑھا اور اپنے پیر سے جوتا اتار کر چبوترے پہ اچھال دیا تاکہ آنے والوں میں سے ایک اسی کو پہن سکے۔ انہیں ہر صورت میں یہی ثابت کرنا تھا کہ آنے والے دو تھے، تین نہیں۔ وہ دیوار کے اوپر رکھا اپنا جوتا پہن کر دوسری طرف چھلانگ لگا گیا، جہاں خودرو گھاس اور جھاڑیوں کی کثرت تھی۔ یہاں پیروں کے کھرے ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کچھ فاصلے پہ کھڑی جیپ کی طرف چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں حویلی کے ایک کونے سے دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس دھویں میں آگ کی پیلاہٹ بھی شامل تھی۔ یعنی شعلوں کو ہوا مل گئی تھی۔ اب انہیں سارے کو اپنی لپیٹ میں لینا تھا۔

وہ مسکراتے چہرے اور کمینی نگاہوں سے یہ منظر دیکھنے لگا تھا۔ ایک پل کو دل کے کسی کونے میں ملال نے سر اٹھایا تھا لیکن پھر بہت سے خوش آئند خیالات نے اس ملال کا سر کچل ڈالا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باقی دونوں بھی باری باری دیوار پھاندتے حویلی سے باہر نکل آئے۔ ان کے سانس بری طرح پھول رہے تھے۔ اس کے قریب آ کر وہ دونوں گھٹنوں پہ جھکے اور اپنا تنفس درست کرنے لگے۔ پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

''کم ہو گیا قاسم باؤ۔ اب بس کسی بھی ویلے سلنڈر پاٹ جائیں گے۔ سب ہی کی گیس نکل رہی ہے۔ ہن بس چھیتی نال ادھر سے نکلو۔''

''تم لوگ جیپ میں بیٹھو، میں ابھی رکوں گا۔''

قاسم نے اپنے آدھے چہرے کو چادر سے نکال کر جواب دیا۔ وہ دونوں جیپ میں جا بیٹھے جبکہ قاسم پورے انہماک سے بڑھتی آگ ملاحظہ کرنے لگا۔ دھواں ساری حویلی میں بھر چکا تھا۔ آگ باورچی خانے سے نکل کر یقیناً باہر تک پھیلنے لگی تھی۔ کھڑکیوں سے نکلتا دھواں اس بات کا غماز تھا کہ سوئے ہوئے لوگوں کا عنقریب دم گھٹنے سے انتقال ہونے والا تھا۔ بے ساختہ لبوں پہ مسکراہٹ ابھری جس کو اس نے روک لیا۔ اس کا چاچا آفتاب اتنا تو حق دار تھا کہ اس کے مرنے پہ مسکرایا نہ جاتا۔ وہ جاتے جاتے بھی ان کے کتنے کام آیا تھا۔ وہ صرف ایک زمین تھوڑی دے کر جا رہا تھا۔ اس کا جو بھی تھا، وہ قاسم کو ہتھیانا تھا۔ انگلی ٹیڑھی تو کر لی تھی اب اس انگلی پہ لگے گھی کے حصے دار گھٹانے تھے۔ نگاہوں کے پردے پر چوہدری شہاب کا چہرہ لہرایا تو دل میں خواہش ابھری کہ کاش اس حویلی کے اندر اس کا بھی وجود ہوتا۔

''ایک دن ایسی ہی رلی ملی موت تجھے بھی دوں گا تایا......!'' وہ خود سے بڑبڑاتا اپنے تائے کو دھمکا رہا تھا۔

گزرتے لمحات تیزی سے آگ کو ہوا دے رہے تھے۔ اس کے کان دھماکے کے انتظار میں وہیں لگے تھے۔

☆......☆......☆

گرمی، تپش یا گھٹن، شدید دباؤ...... نا جانے کس احساس کے تحت ان کی آنکھ کھلی تھی۔ رات سے طبیعت میں شدید بے چینی تھی جسے انہوں نے بیٹی کی رخصتی پر محمول کیا تھا۔ کشور ان کی پہلی اولاد تھی، ان کی لاڈلی اور سیانی بیٹی۔ وہ ان کی ایسی اولاد تھی جس پہ وہ آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے تھے۔ انہیں رقیہ سے زیادہ کشور کی صلاحیتوں پر بھروسا رہا کرتا تھا۔ رقیہ رقیق القلب اور جلد گھبرا جانے والی تھیں لیکن کشور کو ان کے مزاجوں کے حساب سے لے کر چلنے کا ہنر آتا تھا اور یہ عادت اس نے اپنے والد سے لی تھی۔

انہیں معلوم تھا کہ حویلی لکھاں ان کا جدی پشتی ٹھکانہ ہے لیکن نا جانے کیسا احساس تھا جس نے دل و دماغ کو لپیٹ میں لے لیا تھا جیسے بیٹی رخصت کرنے کے بعد اب ان کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ ایک جھجک ایک ان دیکھی رکاوٹ جو بس انہیں دکھائی دے رہی تھی، وہ کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ ارادہ کر چکے تھے کہ اب وہ چھوٹی حویلی میں ہی قیام کریں گے کم از کم تب تک جب تک خانم بھی اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی۔ رات دیر تک وہ انہی سوچوں اور ماضی کی کچھ تلخ و شیریں یادوں کو دہراتے رہے تھے۔ انہوں نے حویلی لکھاں سے آیا کھانا سب پروہنوں کو کھلایا تھا۔ رقیہ نے ملازماؤں کے ساتھ مل کر سارا انتظام کیا تھا۔ کھانا تو آ گیا تھا اور مہمانوں نے جی بھر کر کھایا تھا۔ لذیذ رسیلے تکے کباب اور چانپوں کا سالن۔ کون تھا جو ہاتھ کھینچ سکا تھا۔ چار خواتین تھیں، مل ملا کر جنہوں نے اندر بڑے کمرے میں کھانا کھایا تھا جبکہ مردوں نے برآمدے میں بندوبست کر لیا تھا۔ چوہدری آفتاب عشاء پڑھنے مسجد گئے تھے تو کچھ کھانا امام مسجد کے گھر والوں کے لیے بھی لے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آئے تو رقیہ ملازماؤں کے ساتھ سب کچھ سمیٹ کر انہیں کھانا دے کر فارغ کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر مہمان مردوں کے ساتھ بیٹھے رہے تھے لیکن سارے دن کی تھکاوٹ اور بھاگ دوڑ نے ان میں آرام کی طلب جگا دی تھی۔ وہ کمرے میں چلے آئے تو پیچھے پیچھے رقیہ کھانے لیے ساتھ تھیں۔

"کب سے اڈیک رہی ہوں۔ بھلا پہلے کھانا ہی کھا جاتے چوہدری جی کتنے دن ہو گئے آپ نے رج سے کچھ نہیں کھایا۔ اب تو اللہ نے کرم کیا ہے اور دھی رانی اپنے گھر کی ہو گئی ہے آج تو سکون سے کھانا کھالیں اور چین کی نیند لے لیں چوہدری جی!"

"تو نے کھا لیا نا میرے بنا ہی......" چوہدری آفتاب اپنی لوئی اتار کر سرہانے کے ساتھ رکھتے ہوئے شرارتاً بولے۔ ٹانگیں اوپر کر لیں اور لحاف بھی کھول کر ٹانگوں تک کھینچا۔

"خیری صلا چوہدری جی مجھے کیا پتا تھا آپ کھائے بنا ہی مسیتے نکل جائیں گے ورنہ کبھی کھایا ہے آپ کے بنا؟" وہ شکوہ کناں سی انہیں دیکھتی کھانے کی ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

چوہدری آفتاب نے بغور کھانے کو دیکھا اور بولے۔

”سمجھ سے باہر ہے کہ بھلا یہی کھانا ویسے کا رکھ دیتے پاء جی۔ جس جس نے کھانا ہے اس کی طبیعت ڈک ہو جاتی ہے۔ بھلا کیسے ہضم ہو گا ادھی راتی؟“

”اب کھانا نہ کھانے کے بہانے نہ بنائیں چوہدری جی۔ تھوڑا سا کھائیں پھر سو جائیں، سویرے اللہ خیر کرے، بہت کام ہونا ہے۔“

”او بھلیے لوکے...... کم تو مک گئے اب، اب ہمارے کڑم (سمدھی) جانیں اور ان کے کم جانیں۔ ہم تو سویرے سکون کریں گے۔“

انہوں نے کباب توڑ کر اس کا لقمہ منہ میں رکھا۔ نان کھانے کا دل نہیں چاہا کیونکہ جانتے تھے رات کو انہیں نان ہضم نہیں ہوگا۔ محض رقیہ کا دل رکھنے کی خاطر کھانا کھا رہے تھے وگرنہ ان کی طبیعت ہرگز مائل نہیں تھی۔ رقیہ سامنے والے پلنگ پہ بیٹھ کر انہیں شوق سے دیکھ رہی تھیں لیکن آنکھوں میں بلا کی نیند بھری تھی۔ چوہدری آفتاب نے بمشکل ایک کباب کھایا اور ٹرے پرے کھسکاتے ہوئے بولے۔

”اللہ کی بندی تو تو سو جا۔ دیکھ تو کیسے ڈول رہی ہے نیند سے۔ اور یہ ٹرے ابھی ادھر ہی رہنے دینا، میرا دل کیا تو سرگی ویلے تھوڑا سا کھا لوں گا ابھی اور نہیں کھایا جا رہا۔“

انہوں نے محض رقیہ کے آرام کی خاطر کہا تھا تاکہ اس وقت وہ باقی بچا کھانا باورچی خانے رکھنے نہ جائیں ورنہ ان کا کھانے کا ارادہ نہیں تھا۔ رقیہ لحاف اوڑھ چکی تھیں، شکر گزار نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

”اتنی کاکی نہیں میں چوہدری جی! اتنا لمبا ساتھ ہے میرا آپ کا۔ بھلا جانتی نہیں کہ مجھے پھیرا نہ پڑے، اس لیے کہہ رہے ہیں ایسا ورنہ آپ نے کھانا ہوتا تو ابھی کھا لیتے۔“

”ہاں جی اتنا لمبا ساتھ ہے ہمارا، بھلا تو مجھے نہ جانے گی تو کون جانے گا؟ تو تو میری اوکھے وقتوں کی ساتھی ہے رقیہ۔ مجھے رب نے انعام کی شکل میں تجھے دیا تھا۔ اللہ تجھ سے راضی ہو۔ چل سو جا اب......!“

”بڑی پیاری دعا دی آپ نے مجھے چوہدری جی۔ جے قورے (قبر) پڑ گئی تو میرے کم آئے گی آپ کی دعا۔“

''اچھا اب خیر بول اور سو جا، فجر میں اٹھا دوں گا۔''

رقیہ محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے نیند میں گم ہو گئیں جبکہ وہ بھی جماہی روکتے خود کو تھوڑا سا نیچے کھسکاتے سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کی نیند ایسی ہی ہوتی تھی، مکمل آرام دہ حالت میں جسم کو نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ایسی حالت میں نیند لیا کرتے تھے جس سے جلد حواس چوکنے ہو جائیں۔ اس لیے معمولی سے کھٹکے سے بھی جاگا کرتے تھے لیکن آج رات پیٹ میں کم سہی لیکن وہ لقمہ جا چکا تھا جس میں افیم تھی۔ کھانے نے سب مہمانوں کو سلا دیا تھا۔ ملازم اور کام کرنے والی عورتیں اپنے گھروں کو کھانا لے کر جا چکی تھیں۔ مکمل چھوٹی حویلی سکوت میں ڈوبی تھی۔

اندر خاموشی تھی، باہر کہرا تھا۔ نا جانے کتنا وقت بیتا تھا انہیں نیند میں ڈوبے جب ان کی حس شامہ میں تحریک پیدا ہوئی۔ وہ نیم دراز سے یوں لیٹے تھے کہ ان کا سر پلنگ کی پشت کو لگا تھا جبکہ تکیہ گردن اور اس سے نچلے حصے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں لیکن پلکیں بے حد بوجھل ہو رہی تھیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کا سر بھی درد سے پھٹ رہا ہے۔ پپوٹے جل رہے تھے، سانس لینے تک میں دشواری تھی۔ حلق سوکھ رہا تھا اور خراش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ متعجب تھے لیکن حیرت کا اظہار کیسے کرتے۔ جسم جیسے بے جان ہو رہا تھا۔ انہوں نے ناک کے رستے سانس کھینچا تو ایک بدبو سی ان کے حواس جھنجھنا گئی۔ انہوں نے پورا زور لگا کر خود کو جاگنے پر مجبور کیا۔ وہ کہنی کا سہارا لیے کروٹ کے بل ہوئے اور کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ یوں لگا جیسے بادلوں میں تیر رہے ہوں۔ منظر دھندلایا ہوا تھا۔ انہوں نے سر جھٹکا ایک بار، دو بار، سہ بار...... لیکن سب ویسے کا ویسا رہا تو اچانک سے ان کا دل سکڑ سمٹ گیا تھا......

یہ دھواں تھا۔

ان کے کمرے میں دھواں بھر رہا تھا، کیوں؟ کہاں سے؟ انہوں نے بمشکل حواس قابو میں کرتے عقل دوڑائی تو جیسے پورے جسم کے مسام کھڑے ہو گئے۔ ایک ہی لفظ سانپ بن کے پھن اٹھائے ذہن میں ڈنک مار گیا۔

آگ......!

ان کی حویلی میں آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے پہلو میں جڑے پلنگ پہ رقیہ کو سوتے دیکھا تو وہ جیسے بالکل بے سدھ سو رہی تھیں۔ بے حس و حرکت...... انہوں نے بے چینی سے بیوی کو آوازیں دینا شروع کیں۔ لیکن رقیہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ وہ سیدھے ہوئے اور 'اللہ اکبر' بلند آواز میں کہتے پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خوف کی سرد لہر ان کو اپنے اندر لپیٹ چکی تھی۔ انہوں نے خود کو حواسوں میں رکھنے کی کوشش جاری رکھی، رقیہ کو جھنجھوڑ کر اٹھایا لیکن وہ اب بھی نہ ہلی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ دھواں اپنا اثر دکھا چکا ہے۔ رقیہ پہ بے ہوشی طاری ہو چکی ہے۔ سر لگتا تھا کسی بھی پل بم کی طرح پھٹ جائے گا۔ ایسی شدت کی تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے قدم گھسیٹے اور دروازے تک پہنچے۔ کھولتے ساتھ ہی ایک دھواں دار ہوا کا ریلا سا کمرے میں بھر گیا۔ انہیں کھانسی لگ گئی۔ رکوع کی حالت میں جھکے انہوں نے کھانس کھانس کر خود کو بے حال کر لیا۔ دل میں خیال آیا کہ اس طرح وہ کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ واپس مڑے، اپنی لوئی پکڑی اور اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹی ناک منہ کو کس کے لپیٹ لیا۔ کمرے سے باہر نکلے اور آگ کے ماخذ کو ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی کیونکہ باورچی خانہ مکمل بھڑ بھڑ آگ میں جل رہا تھا۔ یہاں سے وہاں کا منظر مکمل واضح تھا۔ چولہا، پیڑھے، لکڑی کی چھوٹی میزیں، برتن، پونے، رومال سبھی کچھ جل رہا تھا۔ تب ہی ان کی نگاہ سلنڈر پہ پڑی جو آگ پکڑ چکا تھا۔ ان کے اوسان بری طرح خطا ہوئے۔ وہ تیزی سے واپس مڑے اور رقیہ کے چہرے کو بری طرح تھپتھپایا کہ ان کے گال سرخ ہو گئے۔ ان کا دماغ جاگنا شروع ہو گیا تھا لیکن دھواں پھیپھڑوں میں بھر رہا تھا اور وہ دماغ کو بھی بوجھل کر رہا تھا جو پہلے ہی بیدار ہونے کی تگ و دو میں تھا۔ ان کے سر کا درد بھی مانع تھا۔ وہ بمشکل رقیہ کی گردن میں بازو ڈالتے انہیں اٹھا کر بٹھاتے ہوئے مسلسل بول رہے تھے۔

"رقیہ...... رقیہ......! ہوش کر بی بی ہوش کر۔ حویلی کو آگ لگ گئی ہے۔ ہوش کر...... اٹھ نکلنا ہے یہاں سے رقیہ......!"

وہ بے ربط سی آوازیں دے کر جگا رہے تھے۔ نتیجتاً اتنا ہوا کہ رقیہ کسمسائی تھیں۔ ان کو ہلتا دیکھ

چوہدری آفتاب نے فوراً ان کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے گھسیٹیں اور انہیں سہارے سے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ رقیہ نے آنکھیں کھول لی تھیں لیکن ان کی گردن لڑھک رہی تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نہ اپنے حواس مجتمع کر پا رہی ہیں نہ ان کے جسم میں چلنے کی سکت ہے۔ چوہدری آفتاب نڈھال ہو رہے تھے۔ وہ ہانپنے لگے تھے۔ کسی طرح وہ نیم مردہ رقیہ کو کمرے سے باہر نکال کر ہال کمرے تک لانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن یہاں بھی صورت حال ابتر تھی۔ آگ پھیل چکی تھی۔ دھواں بری طرح بھر چکا تھا اور حلق میں خراشیں ڈال رہا تھا اور آنکھوں میں گھس کر شدید جلن پیدا کر رہا تھا۔ کسی اونچی کراہ کی آواز نے چوہدری آفتاب کے اعصاب کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک جھٹکے سے انہیں یاد آیا کہ حویلی میں پروہنے موجود ہیں جو ان ہی سامنے کے دو کمروں میں تھے۔

ایک میں عورتیں تھیں وہ وہاں جاتے کیسے؟ انہیں بھلا نکالتے کیسے؟ ان کی آنکھوں میں بے بسی کی شدت سے آنسو آ گئے۔ انہوں نے نیم جان لیکن کھلی آنکھوں والی رقیہ کو فرش پہ ڈالا تو وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح بکھر گئیں۔ پھر انہوں نے سامنے مردوں کے کمرے کا رخ کیا تھا کہ نگاہ اچانک ہال کمرے کے دو الگ کونوں پہ رکھے سلنڈروں پہ جا پڑی۔

جھٹکا......اور جھٹکے کے نتیجے میں سکتہ...... اس کیفیت کو چوہدری آفتاب نے خود پہ بیتتا محسوس کیا تھا۔

کس نے لا کر رکھے یہ سلنڈر یہاں؟ رات تک تو یہاں نہیں تھے کون آیا تھا...... آگ لگ چکی تھی اور سلنڈر یہاں ہونے کا مطلب صاف تھا۔

وہ دکھتے پھٹتے سر کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ ایسا اندھیر کون مچا سکتا تھا؟ اور اپنے آپ سے کیے اس سوال پہ انہیں ہنسی آئی۔ چوہدری شہاب اور قاسم کے چہرے بیک وقت نگاہوں میں گھوم گئے۔ ظلم......اور ایسا قبیح ظلم...... ظالم مارنا تھا تو گولی مار دیتا۔ زہر دے دیتا، بے ہوش جو کیا تھا تو کیا مشکل تھا زہر دے دینا۔ جلا کر مار دینے میں اپنے کلیجے کو کون سی ٹھنڈ پہنچانی تھی فرعون......!

انہوں نے دکھ، رنج اور نفرت سے مغلوب ہو کر سوچا۔ اپنی فکر نہیں تھی لیکن جان سے پیاری بیوی کو ایسی اذیت کی موت مرتے دیکھنا اور پھر مہمان جوان کے گھر ٹھہرے تھے، ان کی جانوں کے

امین تھے وہ ان کے گھر وہ سب جل جاتے، تو یہ کیسی بدنامی تھی جو ان کی روح تک کو جھیلنی تھی۔

آگ بڑھ رہی تھی اور دھواں اب ناقابل برداشت حد تک مفلوج کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کریں تو کیا کریں۔ چھٹی حس مسلسل ٹھوکے دے رہی تھی کہ جلد از جلد باہر نکلو۔ جو سلنڈر اندر لا کر رکھے گئے تھے وہ جلد ہی آگ پکڑ لیتے تو ساری حویلی دھماکے سے اڑ جاتی۔ وہ ایک الوداعی نگاہ سب پہ ڈالتے وہاں سے نکلے اور ساتھ کے کمرے میں جہاں عورتیں سو رہی تھیں وہاں قدم رکھا۔ شرم اور ندامت کے احساس سے مغلوب وجود زمین میں گڑا جاتا تھا۔ تینوں بے ہوشی میں آدھی چارپائی پہ اور آدھی فرش پہ لڑھکی تھیں۔ انہوں نے انگیٹھی کو دیکھا جو بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔ شاید اس کی آگ تو تقویت ملی تھی جب ہی اس کے شعلے اونچے ہو چکے تھے اور کھڑکی کے پردے کو آگ لگا چکے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آج یہاں اس حویلی میں ان کی مہمان داری داغ دار ہونے والی تھی۔ اگر وہ اور رقیہ یہاں سے بچ کر نکلتے تو اپنے مہمانوں کی موت کا کیا عذر دیتے اور اگر یہیں مر جائیں تو ان کے قاتل ان کی بیٹیوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ان کو کامیاب کیسے ہونے دیں۔ رقیہ کو ایسی اذیت ناک موت نہیں دے سکتے۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئے تو ہال کمرے میں آگ پہنچ چکی تھی اور وہاں رکھے سلنڈر آگ پکڑ چکے تھے کیونکہ ان کی گیس پہلے ہی کھلی تھی۔ ہر طرف آگ تھی اور وہ خود اور فرش پہ پڑا رقیہ کا نیم مردہ وجود درمیان میں تھا۔ یعنی اب وہ دونوں بھی مکمل طور پر آگ کے سپرد تھے۔ وہ جھکے اور خود کو ڈھیلا چھوڑتے فرش پہ دھپ سے بیٹھے۔ رقیہ کا سر گھٹنے پہ رکھا۔ ان کی سانسیں اکھڑ اکھڑ کر چل رہی تھیں۔ وہ یاسیت اور محبت کے ملے جلے احساس کے تحت ان کی پیشانی چوم کر رو دیے۔ رقیہ نے اپنی آنکھیں وا کیں تو سوکھے لبوں سے ایک ہی جملہ نکلا جسے چوہدری آفتاب نے بمشکل ہی سنا تھا۔

"مجھے بچا لیں چوہدری جی...... میں...... جل کے نہیں مرنا مم...... مجھے بچا لیں۔"

اس جملے کے مکمل ہونے کی دیر تھی چوہدری آفتاب اللہ اکبر کہتے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور رقیہ کو کمر سے سہارا دیتے مکمل زور لگاتے کھڑا کیا۔ انہوں نے بھی کچھ ہمت دکھائی تھی اور ان کے کندھوں پہ بازو پھیلائے قدم قدم چلتی مرکزی دروازے سے چند قدم کی دوری پہ تھے جب اچانک

کچن سے بے حد اونچی تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ آواز اس قدر ہولناک تھی کہ وہ رک کر گردن موڑے دیکھنے لگے لیکن سارا باورچی خانہ مکمل آگ کی لپیٹ میں تھا اور سلنڈر بھی جل رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آواز یقیناً اسی کی تھی۔ ہال کی چھت کو چھوتی اس کی لپیٹیں انہیں ایک قدم دور ہونے والے حادثے کا پتا دے رہی تھیں۔ وہاں رکھے سلنڈر بھی کسی بھی وقت پھٹ سکتے تھے۔ ان کے پاس وقت کم تھا یا شاید نہیں تھا۔ وہ رقیہ کا دل رکھنے کو مرکزی دروازے تک پہنچے تھے لیکن دروازہ مکمل آگ میں چھپا ہوا تھا۔ اسے کھولنا ناممکن تھا۔ وہ کوشش کر بھی لیتے......

تب ہی اچانک رقیہ ایک دم چیخ مارتی ان کے سینے میں چھپنے لگیں۔

''چوہدری جی بس ہماری اتنی ہی تھی۔ مجھے لکا (چھپا) لیں چوہدری جی۔ یہ والی موت بڑی ڈاہڈی ہوگی۔''

چوہدری آفتاب نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنے سینے سے لگا ان کا سیاہ بالوں سے بھرا سر دیکھا جس میں کہیں کہیں سفید تار تھا اور اپنی لوئی کو کھول کر خود کو اور رقیہ کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اپنا سر ان کے سر سے جوڑا اور رقیہ سے بولے۔

''کلمہ پڑھ رقیہ...... اللہ آسانی کرے گا۔''

اتنا کہنا تھا کہ کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا تھا جس کا مرکز باورچی خانہ تھا۔ وہ اور رقیہ اڑ کر دیوار کو یا دروازے کو لگے تھے۔ پرخچے اڑے تھے یا چیتھڑے فضا کی نذر ہوئے تھے۔ لیکن ہال کمرے کے سلنڈر پھٹنے تک وہ دونوں خاک وخون میں لپٹے بری طرح جھلس چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے جدھر جدھر سلنڈر رکھا تھا سب پھٹتے چلے گئے اور چھوٹی حویلی تنکوں کی صورت بکھرتی چلی گئی۔ کسی تندور کے بالن کی طرح بھڑ بھڑ جلتی چلی گئی۔ ایسی تباہی تھی جس نے ایک ایک چپہ جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ بے جان پڑے پروہنے جھلس کے پہچان کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ رقیہ اور چوہدری آفتاب ایک دوسرے سے دور فاصلے پہ اکڑوں پتلوں کی مانند پڑے تھے۔ پل میں سب کا سب خاک ہو گیا تھا۔ کچھ دور اپنی جیپ کے پاس کھڑا چوہدری قاسم مسکراتے چہرے سے چھوٹی حویلی کا نام ونشاں مٹتے دیکھ رہا تھا۔

اتنا سہانا منظر تھا کیسی شاندار آتش بازی تھی۔ سارا آسمان سیاہ اور زرد ہو گیا تھا۔ وہ کبھی آسمان کو دیکھ رہا تھا تو کبھی چھوٹی حویلی کی چھت پہ بنی اس ممٹی کو جو باہر سے دیکھنے پہ بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی پورے اہتمام سے جل رہی تھی۔ وہ لامحدود مدت کے لیے وہاں کھڑا حویلے کے شعلے گنتا رہا تھا۔ پیچھے جیپ میں بیٹھا ایک ڈشکرا اترا اور قاسم کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اپنے پیچھے اسے محسوس کر کے وہ بولا۔

''کم تو شاندار ہو گیا ہے تنویرے...... تایا بڑا راضی ہوتا جو یہاں کھڑے ہو کر اس بھانبڑ کو بلتے دیکھتا۔ چل کوئی ناں...... اس کے حصے کا سواد بھی میں ہی چکھ لیتا ہوں۔''

''اب آگے کیا کرنا ہے چوہدری جی۔ نکل چلیں اب یہاں سے کہ ابھی نہیں؟ ویسے کھرے میں مٹا تا آیا ہوں احتیاطاً......!'' مونچھوں کو تاؤ دیتا وہ جلتی حویلی کو بڑے انہماک سے دیکھتا پوچھ بھی رہا تھا اور بتا بھی رہا تھا۔

''مٹایا نہ مٹا تنویرے...... قاسم کا پکڑے جانا کوئی خالا ئی دا گھر اے (خالہ جی کا گھر ہے)!'' وہ مکروہ مسکراہٹ سے آنکھیں چھوٹی کیے آگ کے شعلوں کو بصارت میں جذب کر رہا تھا۔

''ابھی ذرا رک...... اندر جاؤں گا ابھی میں، اک پھیرا مارنا پڑنا ہے اندر کا۔ ذرا مرے ہوئے چہرے ویکھ لیں اور کوئی مرنے سے رہ گیا ہے تو وہ بھی پتا چل جائے۔''

''جیسے آپ کی مرضی چوہدری جی...... بس ذرا چھیتی کریں۔ سورج نکلن سے پہلاں میں اور دلاور نکل جائیں گے سرحد کے لیے۔'' (اس وقت خیبر پختون خواہ کو سرحد کہا جاتا تھا)

قاسم نے کوئی جواب نہ دیا، بس خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ اور کچھ ہی دیر مزید گزری تھی کہ وہ چادر کا پلو جھٹکتا حویلی کی جانب چل پڑا۔

''دلاور کو میرے پیچھے بھیج، میں اندر چلا ہوں۔''

قاسم سہج سہج قدم اٹھاتا دور ہوتا چلا گیا اور تنویر نے دلاور کو آواز دے کر جیپ میں سے باہر نکالا جو تھکا ماندا نیم غنودگی میں تھا، وہ بری طرح چڑتا ہوا باہر نکلا۔

''کی مصیبت اے یار، چنگا سیاپا گلے ڈالا ہے۔ ایس پایئے نے وی جان ٹنگ کے رکھ دی

ہماری، جلدی جان چھڑا اور نکل سرحد کی طرف پہنچتے پہنچتے بھی اگلی رات آ جاتی ہے۔"

"بک بک بند کر، پہلے اندر جا، بلا رہا ہے تجھے۔ دھیان سے جانا، اور کوئی مسئلہ ہو تو اس کو وہیں چھوڑ کر خود نکل آنا، میں جیپ چالو رکھوں گا سمجھا۔"

دلاور سخت بے زار سا حویلی کی جانب چل دیا۔

انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ کوئی چھوٹا کام نہیں تھا جو یہاں پڑا تھا۔ سارا پنڈ کھانا کھا کر بے ہوش پڑا تھا تو بچت تھی ابھی تک، کسی وقت بھی کوئی آ جاتا تو وہ دونوں سب سے پہلے دھر لیے جاتے۔

اندر داخل ہوتے ہی قاسم کا دم بری طرح گھٹ کے رہ گیا تھا۔ دیوار، چھتیں ہر شے کالک میں اٹی تھی۔ باورچی خانے کی چھت اور ہال کی چھت اڑ چکی تھی اور ملبہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایسا ہوش ربا منظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کھڑکیاں دروازے سب اڑ گئے تھے۔ اتنے سلنڈر پھٹے تھے کہ انہوں نے پوری حویلی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ اندر موجود انسانی جانوں کی خستہ حال لاشوں کے جلتے گوشت کے مساموں سے ابھی تک آگ جھانک رہی تھی۔ اتنی زبوں حالی تھی کہ آگ گوشت چیرتی اندر تک اتر چکی تھی اور سلگ سلگ کر ماس کو سلگانے کا کام کیے جا رہی تھی۔ اسے ابکائی سی آئی۔ سرانڈ، وحشت، ہولناکی، تباہی......جہنم!

وہ جو دیکھنے آیا تھا وہ دیکھ کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دلاور اس کے پیچھے تھا اور اپنی چادر کی بکل میں منہ دے کر ابکائیاں روک رہا تھا۔ تمام کمروں میں جھانکتے وہ چارپائیوں اور مردہ جسموں میں فرق تلاشتا رہا اور آخر میں بڑے کمرے میں آ گیا۔ دو لاشیں یہاں بھی موجود تھیں۔ لاشعوری طور پر وہ چوہدری آفتاب اور رقیہ کی موت کی تصدیق چاہتا تھا لیکن پہچان ہی نہیں تھی۔ گھبراہٹ کے مارے وہ باہر نکلنا چاہتا تھا کہ اسے کسی کراہ نے جکڑ لیا۔ اس قدر درد میں ڈوبی اور تکلیف سے پر کہ وہ لرز سا گیا۔ ایسی تباہ کن حالت میں بھی کوئی زندہ رہ گیا تھا۔ کون؟ وہ چلتا ہوا اس کراہ کے تعاقب میں گیا تو ملبے کے ڈھیر اور مرکزی دروازے کی بھاری لکڑی کے نیچے ایک انسانی وجود دکھائی

دیا۔جس کی ہاتھ کی انگلیاں معمولی سا جنبش کر رہی تھیں اور ہونٹوں کی لرزاہٹ کراہوں کو خارج کرنے کا سبب بنی ہوئی تھی۔

وہ دھیرے سے چلتا قریب آیا اور جھک کے اس وجود کو دیکھا تو جھٹکا کھا کر واپس سیدھا ہو گیا۔

اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ گئی تھیں۔ یہاں سب کو مر جانا چاہیے تھا۔کوئی ایک بھی زندہ رہ جاتا تو ان کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔وہ دوبارہ جھکا اور جلے انسانی وجود کی دھڑکنیں چیک کرنے کے لیے بے حد محتاط انداز میں ہلکے ہاتھ سے ٹٹول کر نبض تلاش کی۔ دھڑکنیں سست پڑ چکی تھیں۔کوئی پل جاتا تھا کہ سامنے ڈھیر ہوا وجود مر جاتا۔ویسے بھی وہ اس قدر جل چکا تھا کہ بچنا محال لگتا تھا۔اس نے سوچا یہاں سے جلد از جلد نکلنے کی کی جائے۔وہ سیدھا ہوا لیکن اس سے پہلے کہ پلٹتا اس کے پیر پہ ایک نیم جھلسا ہاتھ آ کر ٹھہر گیا۔اس کی خود سے یکدم حالت غیر ہوئی اور وہ پیر کھینچ گیا۔اس وجود کے سیاہ ہو چکے چہرے پر دو آنکھیں زندگی کی جوت لیے اسے تک رہی تھیں۔

اس نے دل میں سوچا، بھلا یہ میرے کس کام کا...... بچا بھی لوں تو کس لیے، گھوڑی پالنے کا بھی کوئی فائدہ ہے بھلا اور حالت الگ بگڑی ہوئی ہے......!''

انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ کسی کمرے کی چھت گرنے کی زوردار آواز نے اس کے حواس مختل کر دیے۔دلاور جو بمشکل کچھ فاصلے پہ اس سے کھڑا تھا، بری طرح ڈرا تھا اپنے اوپر کی چھت کو دیکھتا وہ منمنایا۔

''نکل چلو چوہدری جی، اس سے پہلے کہ اپاں یہیں مر مرا جائیں۔چھت گر گرا گئی تو صبح قیمہ ملے گا یہاں سے ہمارا۔''

قاسم خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن دماغ میں کھچڑی پک رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دلاور کو دیکھا اور دوسری سے اس بھاری بھرکم لکڑی کے نیچے دبے وجود کو۔ نفی میں سر ہلاتے وہ کوئی فیصلہ لینے والا تھا کہ ہال کی چھت تڑتڑانے کی آواز نے ان کے مزید اوسان خطا کر دیے۔اس نے دلاور سے کچھ کہا تھا اور پھر وہ دروازے کے نیچے دبا زخمی جھلسا ہوا وجود وہاں سے گھسیٹ لیا گیا تھا۔

یہ پنڈ کی ایسی رات تھی جس رات کی صبح میں فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی کیونکہ امام مسجد اور ان کا گھرانہ گہری نیند میں ڈوبارہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

پنچائیت کے فیصلے کے مطابق چھوٹی حویلی میں لگنے والی آگ اتفاقیہ نہیں تھی، اسے لگایا گیا تھا۔ لہٰذا قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے تمام پنڈوں کے چوہدریوں کو متفقہ فیصلہ لینا تھا۔ سب اس بات پہ آمادہ تھے کہ شہر سے پولیس بلوائی جائے تا کہ قاتل تک پہنچا جا سکے۔ سوائے چوہدری شہاب الدین کے، جو پنچائیت کو اپنا فیصلہ سنا آئے تھے کہ وہ کوئی قانونی کارروائی کر کے اپنے مرحوم بھائی کی روح کو اذیت نہیں دے سکتے۔ اس لیے ان کی طرف سے صاف نہ ہے۔ یہ بہت جگ ہنسائی والا معاملہ ہو گیا تھا۔ سب لوگ اس معاملے کو اعلیٰ سرکاری سطح تک لے جانا چاہتے تھے لیکن شہاب الدین نے قسم کھائی تھی کہ ایسا ہونے نہیں دیں گے۔

چوہدری انور نے کھل کر ان سے متھا مار لیا تھا۔ وہ باقی سب کے ساتھ تھے۔ ان کی وہی رائے تھی جو دوسروں کی تھی لیکن ساری دنیا جانتی تھی کہ شہاب الدین کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ جو پنچ اور جے کار اس کی تھی، کسی اور کی نہیں تھی۔ اس کا رضا مند ہونا لازم تھا ورنہ کوئی سرکاری افسر اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتا۔ حیات اور حسنات نے کھل کر چوہدری شہاب کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی جس کے نتیجے میں انہوں نے حویلی لکھاں کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔

''یہ اولاد ہوتی ہے۔ اس سے اچھا تو میں بے اولاد رہتا۔''

''اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتے ہیں چوہدری جی!'' سکینہ کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔ ان کا تسبیح پڑھتا ہاتھ سینے پہ تھا اور آنکھوں میں ویرانی جمع تھی۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔ ذلیل کرا دیا اس اولاد نے۔ کاش اس سے اچھا تو قاسم میرا پتر ہوتا۔ کیسا تن کے میرے آگے آیا ہے وہ کہ بس جو تایا جی نے کہہ دیا، وہی ہو گا میں کوئی آواز نہ سنوں!''

''ظاہر ہے وہ کیوں کہے گا ابا جی۔'' اچانک حیات وہاں داخل ہوا تھا۔

شہاب الدین کا تمتماتا وجود مزید شعلہ زن ہوا۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور بولے۔

''آجا...... آجا اب تو اس میں کیڑے نکالنے۔''

''کیڑے نہیں نکالتا میں سچ بیان کرتا ہوں۔ وہ کیوں مخالفت کرے گا ابا جی جبکہ شک کے دائرے میں وہ خود بھی آرہا ہے۔''

''کیسا شک...... کس بات کا؟ جو چاہو بنا لو بس جب دل کرے باپ کو بھی گھسیٹ لینا اس سارے میں۔''

''جو قصوروار ہوگا وہ ضرور گھسیٹا جائے گا ابا جی۔ دنیا میں نہ سہی، دنیا کے بعد سہی۔ اور قاسم کو چھوڑیں، اس حویلی کے اور بھی بندے اس لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ چھوٹی بات نہیں ہے کہ پوری حویلی کو بے ہوشی کی نیند سلا دیا گیا۔ میرے پاس پکے ثبوت ہیں کہ اس رات قاسم نہ بے ہوش تھا نہ حویلی میں تھا۔''

''کیوں؟ مفت میں آرہا ہے وہ شک کے دائرے میں، اس نے بھلا اس منحوس کو مار کر کرنا کیا تھا؟'' ان کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

حیات کے چہرے پر تاسف اور ملال پھیل گیا۔ ایسا سنگین لب ولہجہ، دل کھاتا انداز وہ بھی چلے جانے والوں کے لیے۔ سکینہ نے بھی تکلیف سے ایک ہوکا بھرا تھا۔

''ہوٹل بنانا تھا اس نے چچا کی زمین پر اور کیا کرنا تھا ابا جی۔''

وہ بولا تو چوہدری شہاب کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور دوسرا گیا۔ وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ انہیں خاموش دیکھ کر حیات دوبارہ گویا ہوا۔

''شک کے نہیں، یقین کے دائرے میں آتا ہے وہ۔ جب بھی معاملہ کھلا وہ صاف دکھائی دے گا ابا جی۔ اس رات کی بازگشت ہماری نسلوں تک جانے والی ہے۔ اور ایک بات یاد رکھیں چاچا آفتاب منحوس نہیں تھے بلکہ وہ رشتے منحوس ہیں جنہوں نے انہیں اپنا نہیں جانا۔''

وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ وہاں سے نکل گیا تھا۔ چوہدری شہاب پیچ و تاب کھاتے کمرے میں

چکرانے لگے۔ وہ مسلسل بولے جارہے تھے۔ ان کے اندر کی فکر اور پریشانی ان کی زبان پہ کڑواہٹ بھر رہی تھی اور یہی چیز سب کو ان کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

سکینہ کا دل بھر آیا تھا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھیں، اس لیے نمرہ کے پاس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ خانم بھی وہیں تھی۔ اس بچی کو وہ ماں بن کے دیکھ رہی تھیں۔ سائے کی طرح رابی اور نمرہ بھی اس کے ساتھ رہا کرتیں۔ نمرہ کے دن کم تھے، وہ جیسے ہی فراغت پاتی، چلہ نہا کر واپس چلی جاتی۔ اس کے بعد خانم کا کیا بنتا، یہ الگ دردسر تھا وہ اکیلی بچی اتنی بڑی حویلی میں بولائی پھرتی۔ سکینہ کمرے سے نکلنے لگیں تو چوہدری شہاب پیچھے سے پکارے۔

سکینہ تھم گئیں لیکن پلٹی نہیں۔

''تو بھی گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہتی ہے نا چوہدرائن سب سمجھتا ہوں میں۔ اولاد کو شہہ نہ دے۔ تیرے ہی منہ کو آئے گی۔ عقل کو ہتھ مار اور بند کر ان دونوں کے لیے دیدے پھوڑنا۔ مر گئے، گل مک گئی۔ اپنے پتر کو بھی سمجھا زنانی کی بیٹھک (بیٹھک) نہ بیٹھے۔ پیو ہوں اس کا، اپنی آئی پہ آ گیا تو لحاظ نہیں کروں گا میں۔ بند کرے یہ پنچائیتوں کے تماشے ہونہہ آیا وڈا تھانیدار......!''

سکینہ ان کی بات مکمل ہوتے ہی کمرے سے نکل گئیں۔ انہیں چین اب بھی نہ پڑا تو قریب پڑی تپائی کو کھسہ پہنے پیر کی ٹھوکر رسید کی اور الٹاتے ہوئے تنفر سے بولے۔

''جورو کا غلام...... پاء نہ پڑھی تے وخت نو پھڑی۔ مجھے سکھائے گا زمانے کا گر۔''

اندر اندر انہیں فکر لاحق ہو چکی تھی کہ کہیں کوئی سرا ان حویلی والوں کے ہاتھ نہ آ جائے۔

☆......☆......☆

زندگی معمول پہ نہیں آئی تھی لیکن روزمرہ کے کام انجام دینے کا اہتمام ہونے لگا تھا۔ حیات اور کشور کے بیچ محبت کی کونپلیں پھوٹتی سکینہ کے دل کو راحت دینے لگی تھیں۔ کشور حویلی میں اپنی ذمہ داری کو سمجھنے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ خانم کا بھی مکمل دھیان رکھتی تھی۔ نمرہ آپا کے لیے وہ بھی بے حد حساس رہا کرتی۔ ان کے ہاں بچے کی ولادت کا وقت قریب تر تھا اس لیے ان کی خدمت بھی

کرتی اور ساتھ ہی احسان مند بھی رہا کرتی کیونکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ خانم کا بے حد خیال رکھتیں۔ اسے بالکل کسی چھوٹے بچے کی طرح سے سنبھالتیں۔ اپنی حالت اور طبیعت کے پیش نظر نہ اس سے چڑتی تھیں اور نہ ہی اکتاتی تھیں بلکہ جب بھی باہر سے ان کے خاوند کا فون آتا یا وہ خود کال بک کرواتیں تو اپنے چھوٹے سے توتلی زبان میں بات کرتے بیٹے سے جسے وہ وہیں شوہر اور ساس کے پاس چھوڑ کر آئی تھیں اس سے خانم کی خاص طور پر بات کراتیں۔ اس سے بات کرتے ہوئے خانم مسکراتی تھی اور اس کے انداز میں سوال پوچھتی تھی۔ تین سے پانچ منٹ کی کال میں سے ڈیڑھ دو منٹ وہ دونوں اوٹ پٹانگ بول کر وقت ضائع کیا کرتے لیکن نمرہ آپا بالکل بے زار نہ ہوتیں۔ اگر کسی وقت آرام کرنے لگتیں تو کشور کے بجائے رابی کو بلواتیں کہ وہ یہاں آئے اور خانم کے ساتھ وقت گزارے۔ گو کہ وہ پہلے بھی زیادہ وقت یہیں پائی جاتی تھی لیکن رہا سہا بھی گزار جاتی کہ کسی طرح خانم کا دل لگا رہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو خشک ہو سکیں۔ غم کی کیفیت سے نکلنے میں انسان کا اختیار نہیں، اسے جتنا بھی ہنسانے کی کوشش کی جائے، جیسے بھی سکھ آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائیں، وہ غم اس کی متاع ہے تو ہے۔ وہ غم اس کے جینے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی دھڑکنوں کو بحال رکھتا ہے۔ اس کی حیات بن جاتا ہے۔

خانم کے لیے اماں ابا کی یاد ایسا ہی غم تھا جس سے پہلے اب کچھ قیمتی نہ رہا تھا اور جس کے بعد کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ کشور کے دل کو یہی تکلیف لاحق تھی کہ کوئی بھی ابھی تک خانم کو مکمل صدمے سے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ اسے اماں ابا کی یاد ستاتی تھی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا کرتی تھی۔ ابا کو آوازیں دیتی تھی۔ حویلی میں موجود اپنے حصے میں اکثر منڈلاتی انہیں پکارا کرتی۔ اس پکار کو سنتا وہ بھی خالی ڈھنڈار حویلی میں دل چیر دیتا تھا۔ خانم کی فکر کرنے والا اس کے لیے مسلسل سوچتے رہنے والا حسنات بھی تھا۔ وہ واپس جانے والا تھا۔ مزید نہیں رک سکتا تھا۔ کچھ معاملات تھے جن کو وہ سب کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک حیات کو بھی نہیں بتا پایا تھا کسی اور سے کیا کہتا۔ اسے خانم کی فکر تھی۔ وہ حساس تھی اور اس قدر تھی کہ اسے بھی اب آ کر معلوم ہوا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی

میں سنہری اور قاسم اسے کوئی نقصان نہ پہنچا ئیں۔ رابی پہ پورا اعتبار تھا لیکن سو رابی بھی پیدا ہو جاتیں تب بھی سنہری کی مکاریوں کا مقابلہ ممکن نہیں تھا۔ اور حویلی لکھاں کوئی چھوٹی حویلی نہیں تھی۔ دشمن تاک میں ہو تو گھیر کر کسی بھی جگہ زک پہنچا سکتا ہے۔ وہ کس کس کو پکڑ پکڑ کر صورت حال سمجھاتا کہ ان دونوں کے ساتھ سنہری اور قاسم کس حد تک گئے تھے اور کیا کرنے والے تھے۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ خانم کو مضبوط کرتا۔ اسے سمجھاتا...... وہ اس وقت ڈری ہوئی بھی تھی اور خود کو بے بس اور لاچار بھی محسوس کر رہی تھی۔ سب کی توجہ اسے ناکافی تھی کیونکہ اس کا دل اپنے ماں باپ کی طلب میں تڑپ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے ہوش دلائے تاکہ وہ کسی کے ہاتھوں استعمال نہ ہو سکے، ورنہ اسے اندیشہ تھا کہ اس کی ذہنی خستگی سنہری کو مہمیز کرے گی۔

اس نے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔ اگلی صبح فجر کی نماز کے ساتھ وہ نکل جاتا۔ اسے خانم سے بات کرنی تھی اس لیے وہ اسے ہر جگہ ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ حویلی میں کہیں نہیں ملی۔ وہ پریشان ہو چلا تھا۔ باری باری لہجے اور تاثرات کو نارمل رکھتے وہ سب سے پوچھ چکا تھا تاکہ کوئی بھی اس کے چہرے سے بے چینی کا اندازہ نہ لگا سکے۔ سب کو یہی گمان تھا کہ وہ باغیچے کی طرف نکلی ہوگی رابی کے ساتھ کیونکہ آج کل رابی اسے وہیں لے جایا کرتی تھی لیکن وہ وہاں بھی دیکھ آیا تھا مگر خانم کہیں نہیں ملی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ دماغ بار بار قاسم اور سنہری کی جانب چلا جاتا اور اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا۔ اس کی پڑھائی کا بے حد حرج ہو چکا تھا، مزید وہ نہیں کر سکتا تھا۔ جانے سے پہلے اسے خانم کو بہت کچھ سمجھانا اور بتانا تھا لیکن وہ اللہ جانے کہاں جا کے چھپی بیٹھی تھی۔

کشور سے بس پوچھنا رہ گیا تھا لیکن ارادہ بدل دیا۔ وہ بلاوجہ پریشان ہو جاتی اور اس کے ساتھ ہی ڈھونڈنے میں لگ جاتی۔ ساری حویلی چوکس ہو جاتی۔ اس نے بس خاص نمرہ سے پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ شاید باغ کی طرف گئی ہے کچھ فریش ہونے کے لیے لیکن وہ وہاں بھی نہیں ملی تھی۔ خانم کی ذہنی حالت بھی اچھی نہیں تھی لیکن پھر اچانک اسے سجھائی دے گیا کہ خانم کہاں ہو سکتی ہے۔ وہ جلدی سے چچا آفتاب کی حویلی کی جانب گیا اور وہاں داخل ہو گیا۔ ساری حویلی سامان سے بھری تھی

لیکن یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے وہاں کوئی بسا نہیں تھا اور یوں بھی لگتا تھا جیسے چپے چپے پہ یادیں باتیں بسی ہیں۔ قدم قدم پہ کوئی بازگشت چہچہاتی سنائی دیتی تھی۔ حویلی میں گرد پڑ چکی تھی۔ کئی دن سے یہاں کسی نے صفائی ستھرائی نہیں کی تھی۔ وہ چلتے چلتے باورچی خانے میں آیا۔ وہاں جھانکتے اسے رقیہ چچی کی ہنستی آواز سنائی دی جو اس کا چہرہ دیکھتے ہی پکار لیا کرتی تھیں۔

''آمنڈیا! ناشتا تیار ہے جلدی سے آجا۔''

اور وہ بھی فوراً سے پیڑھی کھینچ کے بیٹھ جاتا۔ اس کی ایک اداس سانس خارج ہوتی فضائی سیلن میں گم ہوئی۔ چچا آفتاب اور رقیہ چچی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے پلنگ کے ساتھ نیچے ٹیک لگائے فرش پہ خانم بیٹھی تھی۔ گالوں پہ بہتا سیل رواں اور آنکھوں کی سرخی اس کی شدت غم کی گواہ تھی۔ وہ ماں باپ کی یاد میں یہاں آبیٹھی تھی۔ اس کا جھٹکے کھاتا وجود حسنات کے دل کو جھٹکا دے گیا۔ وہ فوراً آگے بڑھا اور اس کے قریب ہی ٹھنڈے فرش پہ چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

''یوں کیوں بنا بتائے یہاں چلی آئی ہو پری۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم یہاں ہو۔ اگر روتے روتے یہیں بے ہوش ہو جاؤ تو جن بھوت ہی تمہیں اٹھاتے پھر......''

بات کو ہلکا پھلکا رنگ دیتے اس نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دونوں گھٹنے سینے سے لگائے ان کے گرد بازو لپیٹے ساکت بیٹھی رہی۔ بس آنسو تھے جو اس کے ہوش میں ہونے کا پتا دے رہے تھے۔

''پری! تم کیوں ایسے کر رہی ہو پری؟ کب تک چچا اور چچی کی روح کو اذیت دیتی رہو گی۔ کیا وہ اپنی زندگی میں تمہیں روتا دیکھ سکتے تھے۔ تم چاہتی ہو کہ ان کی روح تمہیں روتا دیکھے اور اگلے جہان میں بھی وہ تمہاری طرف سے دکھی رہیں۔''

خانم نے پلکیں اٹھائیں اور حسنات کا دل بیٹھ گیا۔ خانم کچھ بولی نہیں، لیکن اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ کر چہرہ موڑ لیا یوں جیسے سبھی سے ناراض ہو۔ حسنات کو دکھ ہوا۔

''ایسے مت کرو پری۔ تم چچا اور چچی کو دکھ دے رہی ہو۔ تم اماں کو دکھ دے رہی ہو۔ بھرجائی کو

تکلیف دے رہی ہو، نمرہ آپا جو دن رات تمہارے ساتھ لگی رہتی ہیں ان کی صحت کا سوچو۔ اور پھر تم مجھے دکھ دے رہی ہو۔ مجھے دکھی کر کے بھیجو گی ملتان؟“

”آپ ملتان جا رہے ہیں۔ حسنات لالہ......!“ یہ پہلی بات تھی جو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلی تھی اور حسنات نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

”ہاں جانا تو ہے نا اپنی پری کا علاج نہیں کرنا کیا میں نے۔ پڑھ لکھ کے ڈاکٹر بنوں گا تو تمہارے اور رابی کے دماغ کا علاج کروں گا نا......!“

لیکن وہ جیسے کچھ سن نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی۔ وہ یکدم شدید بے چین اور پریشان دکھائی دینے لگی۔ حسنات نے پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے پری۔ اتنی کیوں پریشان ہو گئی ہو۔ کیا نہ جاؤں؟“ اس نے ایویں دل رکھنے کو کہا تھا لیکن پری کا جواب حیران کن تھا۔

”ہاں مت جائیں۔ آپ جائیں گے تو میں اکیلی ہو جاؤں گی حسنات لالہ......آپ بے شک میرے پاس نہیں ہوتے لیکن مجھے تسلی ہوتی ہے کہ آپ حویلی میں تو ہیں نا......آپ کی سنہری اور قاسم لالہ پہ نظر تو ہے نا، کسی اور کو پتا ہی نہیں سنہری کتنی بری ہے۔ وہ......وہ!“

”سب کو پتا ہے پری۔“ خانم سے فقرہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے پہلے ہی حسنات نے تسلی آمیز لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا۔

”سب جان چکے ہیں کہ وہ کس قدر بری ہے۔ نمرہ آپا تک کو معلوم ہو چکا ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ حیات لالہ کو بتا دیا ہے میں نے، جو کچھ اس نے کیا تھا وہ سب کچھ......!“

”سب کچھ......!“ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہوا تھا۔ بھلا کیا سوچتے ہوں گے حیات لالہ اس کے بارے میں۔ سامنے حسنات تھا جو اسے اس سے بھی زیادہ جانتا تھا۔

”کچھ بھی نہیں سوچا ہو گا حیات لالہ نے۔ بے فکر رہو۔ انہیں میرے بتانے سے پہلے سے سنہری اور قاسم کی کرتوتوں کا علم ہے۔ اور کیا تمہیں جانتے نہیں وہ کہ کیسے مزاج کی ہو۔“

وہ جانتا تھا کہ اس کا حساس دل فوراً جوڑ توڑ شروع کر دے گا کہ کہیں حیات لالہ اسے ہی غلط نہ سمجھ لیں۔ حسنات اس کی اسی عادت سے پریشان تھا۔ وہ چھوٹی سی بات پہ ہاتھ پیر چھوڑ دیا کرتی تھی اور وہی اس کی کمزوری تھی۔ جس کا فائدہ مقابل اٹھا جاتا تھا۔ وہ بہادر نہیں بنی تھی کبھی اور نہ ارادہ ظاہر کرتی تھی۔ رابی کا آسرا تھا ورنہ نا جانے کیا حالات بنتے۔ اسے دبانے کے لیے دبکانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ محض نظروں کی تیزی اسے اس کی جگہ چھوڑنے پہ مجبور کر دیا کرتی تھی۔

''پری......!'' حسنات نے نرمی سے اس کا نام لیا۔

خانم کی پلکوں میں لرزش ہوئی۔ ذہن میں رابی کے قیافے سرسرائے۔ عارضوں پہ ہلکا سا گلال چھایا تو حسنات کو سکون ملا کہ کچھ احساسات کی رمق باقی تھی۔

''کاش! میں اتنا بااختیار ہوتا کہ تمہیں ابھی اپنے نام کرا لیتا۔'' اس نے دل میں سوچا، کہا نہیں حالانکہ کہنا چاہتا تھا۔ خانم نے دوبارہ اس پہ سوالیہ نگاہ ڈالی۔

''وہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اب ملتان جا رہا ہوں تو کم از کم تین چار ماہ واپس نہیں آسکوں گا۔ تم دونوں کا رزلٹ بس آنے والا ہے۔ حیات لالہ تم دونوں کی فرسٹ ایئر کے کورس کی کتابیں ارینج کر دیں گے۔ تمہیں بس یہ کرنا ہے کہ محنت سے پڑھائی شروع کرنی ہے اور کسی دوسری بات کی طرف دھیان نہیں دینا۔ کوئی کچھ بھی کہے پروا نہیں کرنی۔''

''کوئی کچھ کہے گا کیا؟'' اس کے لہجے میں اندیشے بول اٹھے۔

''کوئی کچھ کہہ کے تو دیکھے......'' وہ تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو پری! چچا اور چچی چلے گئے ہیں اور جو لوگ کسی کو پسند نہیں کرتے نہ وہ کبھی نہیں چاہتے کہ اچھے لوگوں کی یاد بھی باقی رہ جائے۔ تم اور کشور بھر جائی چچا آفتاب اور چاچی رقیہ کی یادیں ہو۔ ان کی بوئی وہ فصلیں ہو جن کو لہلہاتے دیکھنا اس کا خواب تھا لیکن قسمت بہت طاقت ور شے ہوتی ہے۔ وہ ہمارے جذبات اور چاہت نہیں دیکھتی ہے۔ چچا آفتاب اور چاچی رقیہ کے دشمن کبھی نہیں چاہتے کہ تم دونوں بہنیں خوش رہو اور تم دونوں نے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دینی۔ تمہیں مضبوط بننا ہو گا پری۔ تم کسی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے

دو گی۔ نمرہ آپا آج یہاں ہیں کل نہیں۔ رابی بھی سدا تمہارے ساتھ نہیں...... تمہیں خود اپنا سہارا بننا ہوگا ورنہ اکیلی رہ جاؤ گی اور کوئی بھی تمہیں نقصان پہنچاتے ہچکچائے گا نہیں......"

"کیا آپ بھی میرے ساتھ نہیں رہیں گے؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ "کیا آپ بھی مجھے چھوڑ جائیں گے؟"

حسنات کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ساری دنیا فنا ہو جائے...... کچھ باقی نہ رہے...... تم اکیلی رہ جاؤ تو اس لٹی پٹی دنیا میں بس حسنات بچا ہوگا جو اپنی پری کے لیے موجود ہوگا۔ سب ختم ہو جائے لیکن حسنات کا پیار اپنی پری کے لیے ختم نہیں ہوگا۔"

وہ اپنی جھونک میں بولے گیا تھا اور پری کے گال تمتما اٹھے تھے۔ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں وعدہ کرتی ہوں حسنات لالہ، کہ میں اپنا دھیان رکھوں گی۔ میں پڑھوں گی۔ میں دل لگانے کی کوشش کروں گی۔" وہ تیز تیز بولتی ان لمحوں کا فسوں توڑنا چاہ رہی تھی۔

حسنات بھی مسکراہٹ ضبط کرتا کھڑا ہو گیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم ایک ذہین لڑکی ہو اور ویسے بھی تمہیں ڈاکٹر بننا ہے نا، بس ایف ایس سی کرو اچھے نمبروں سے اور پھر میں اپنے ساتھ ملتان لے جاؤں گا...... کیسا؟"

وہ اسے اکسانے کے انداز میں کہتا خوش کر رہا تھا لیکن خانم بدک گئی۔

"نہ نہ...... ناں...... میں نے ایف ایس سی نہیں کرنی۔ مجھے نہیں اچھی لگتی اتنی مشکل پڑھائی۔ ایف اے کریں گی ہم دونوں۔ میں اور رابی......"

وہ اب ہلکے پھلکے لہجے میں بتا رہی تھی جبکہ حسنات باتیں کرتا اسے ساتھ لیے حویلی سے باہر آ رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے دھیان میں کہتی جا رہی تھی اور وہ خوش ہو رہا تھا کہ اس کا دل کسی بات میں تو لگا۔ چوہدری آفتاب کی حویلی سے نکل کر اپنی حویلی میں جانے تک خانم کی آواز چہکار میں بدل چکی تھی جسے سن کر کہیں سے رابی بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوئی تھی اور اس کی بلائیں لینے لگی تھی۔

''واہ جی واہ! کمال نہیں ہو گیا۔ خانم جی ہنس ہی دیں۔ اللہ کسی کی نظر نہ لگائے۔ میری سہیلی تو جیسے گم ہی ہو گئی تھی۔ بہت شکریہ حسنات لالہ۔ اب آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں سنبھال لوں گی۔'' اس نے خانم کو گلے لگایا اور اس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھرتی ہوئی بولی۔ ''ادھر آؤ تمہاری ساری بلائیں میں لے لوں۔''

اس کے انداز پہ حسنات کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ جبکہ خانم خفیف ہوئی۔ رابی خود بھی ہنس دی۔

حمیدہ چاچی کی حویلی کے دالان میں کھڑی سنہری نے یہ منظر دیکھا اور اپنا پراندہ جھلاتی خانم کو سر تا پیر دیکھتی بولی۔

''ہرنی اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل ہی آئی۔ بے چاری کو اندازہ نہیں کہ جتنی مرضی بلائیں اتروا لیں۔ سنہری نامی بلا تو اب مرتے دم تک مسلط رہنے والی ہے۔''

اس کی چلبلاتی نگاہیں حلق پھاڑ کر ہنستے حسنات کو بھی تول رہی تھیں۔ اسے جلد از جلد قاسم کو اپنے استعمال میں لانا ہی تھا۔

☆......☆......☆

حسنات جا چکا تھا اور خانم کی چپ کو رابی کے حوالے کر گیا تھا۔ جیسے بھی ہو سکتا تھا وہ اسے ماحول اور حالات سے ہم آہنگ کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا اپنا بھی ایک گھر تھا۔ اس کی اپنی بھی حویلی تھی جو حویلی لکھاں کا ہی حصہ تھی۔ پھپھو قدسیہ کی اکلوتی بیٹی تھی، تین بھائیوں کی ایک ہی بہن۔ اس کے اوپر اب گھر کے کاموں کی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ پھپھو قدسیہ خانم سے بے حد محبت کرتی تھیں لیکن اسے نرمی و محبت سے ڈھکے چھپے الفاظ میں باور بھی کراتی تھیں کہ اب اسے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ان کا گھر تین جوان جہان لڑکوں والا تھا۔ بے شک مبشر اور اس سے چھوٹے مدثر کی وہ اپنے سسرال میں بات پکی کر چکی تھیں لیکن وہ نہیں چاہتی تھیں کہ حمیدہ جیسی دماغی طور پر بیمار عورت کو بات کرنے کا موقع ملے گا۔ ماں باپ کا دم غنیمت ہوتا ہے۔

والدین ایسی ترپال کی مانند ہوتے ہیں جو اولاد پہ تنی رہتی ہے جو دھوپ، بارش، گرمی، سردی

کے اثرات سہتی اپنی اصل رنگت تک کھو دیتی ہے لیکن نیچے پلتی کھیلتی اولاد کو بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اب بارش ہے...... ہاں اب دھوپ ہے...... اب گرمی کا زور ہے یا سردی کی تیزی ہے۔ جیسے ہی یہ ترپال پھٹ جائے یا سرک جائے تمام موسم اپنے تلخ ذائقوں سمیت سارے میں پھیل جاتے ہیں۔ زندگی کی سختی اپنا پتا دینے لگتی ہے۔ وہ رشتے دار جو ماں باپ کی موجودگی میں آتے جاتے اولاد کے سر پہ محبت سے ہاتھ رکھتے ہیں، وہی سب سے پہلے آنکھیں نکالتے حاکم بن کر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد ہوتا ہے کہ اب ان کی رائے اور مرضی کے بنا یہ بچے سر بھی نہ اٹھائیں۔ ماں باپ کی دولت انمول ہے۔ ان کی محبت وہ جوتا ہے جو کسی دوسرے کے پیر میں پورا آ ہی نہیں سکتا۔

حمیدہ کی زبان کو بھی کانٹوں نے ڈھانک لیا تھا جب سے کشور اور خانم کے سر سے ماں باپ کا سایہ ہٹا تھا۔ کشور تو گھر بار والی تھی لیکن خانم ایسا ہدف تھی جو بیک وقت بہت سے نشانوں پہ تھی۔ حمیدہ اسے پھپھو قدسیہ کے گھر کا رخ کرتے دیکھ لیتیں تو اسے طعنے دینے لگتیں، عقل سکھانے لگتیں، شرم و حیا کے لیکچر ملتے۔ جنہیں خانم کئی بار سمجھنے سے قاصر رہتی اور اگر سکینہ کے ہاں دکھائی دیتی تب بھی کچھ نہ کچھ ایسا لازمی کہہ جاتیں کہ وہ سہم کے کسی کمرے میں جا چھپتی۔

قدسیہ تو قدسیہ سکینہ بھی اس صورت حال سے پریشان تھیں۔ ابھی تک نمرہ یہاں تھی۔ خانم اس کے پاس سوتی تھی۔ وہ چلی جاتی تو خانم اکیلی کیسے رہتی۔ کس طرح اور کس کے ساتھ سوتی۔ اسے اکیلے سونے کی عادت تھی ہی نہیں۔ بڑی حویلی میں وہ ویسے ہی گھبرا کے ماں باپ کو یاد کرتی رونے لگتی تھی۔ پھر تھک کے کشور کے کمرے کا رخ کرتی اور کشور ماں کی طرح اسے سینے سے لگا لیتی۔ اس کی ذہنی، جذباتی حالت وہ مکمل سمجھتی تھی اس لیے اسے کسی قسم کا تردد نہیں تھا۔ حیات کو بھی اس سے بے حد محبت تھی کیونکہ وہ لاڈلی اور ان کے ہاتھوں کی پلی تھی، وہ ہرگز برا نہیں مناتا تھا خانم کی اپنے کمرے میں موجودگی پر۔ لیکن سکینہ کی دور اندیشی بہت کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ آنے والے وقت کی چاپ سن رہی تھیں اگر یہی ماحول بنا رہتا تو زبانوں کی لگام میں کسنا مشکل ہوتا جاتا تھا۔ انہیں کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ جو راستہ تھا وہ دل میں تھا، زبان پہ لاتے جھجک تھی۔

خانم اب اتنی بچی بھی نہیں تھی، وہ حویلی میں اپنے وجود کو لے کر سب کی آنکھوں میں موجود پریشانی دیکھتی تھی۔ وہ کشور اور حیات کے رشتے کی نزاکت کو سمجھتی تھی اور اپنی حیثیت کا ادراک بھی رکھتی تھی۔ لیکن ایک سہم جو اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا وہ تنہائی کا تھا۔ وہ اکیلی پڑتی جا رہی تھی۔ رابی ہو یا کشور، نمرہ ہو یا پھر سکینہ تائی۔ سب اپنی اپنی جگہ اسے بھرپور توجہ دے رہے تھے لیکن ان سب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کی ایک الگ فیملی نہ ہو۔ بہن بھائی، ماں باپ یا اولاد سب کے پاس اس کی ذات سے ہٹ کر بھی کچھ مصروفیت تھی لیکن خانم کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نہ ماں باپ رہے تھے نہ بہن میسر رہی تھی نہ رابی باوجود کوشش کے ہر وقت اس سے چپکی رہ پاتی تھی۔ اگر اماں ابا زندہ ہوتے تو وہ بھی تو دن کا کچھ مخصوص وقت ہی ان رشتوں کے ساتھ بتاتی اور باقی وقت تو والدین کے ہمراہ بیتا کرتا وہی صورت حال اب سب کے ساتھ تھی سوائے اس کے۔ اکیلی وہ تھی اور اکیلا پن اس کے ذہن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس کے اندر بے بنیاد خوف کو حقیقت میں منتقل کر رہا تھا۔

وہ دکھی دل کے ساتھ پچھلے باغ میں بیٹھی تھی۔ رابی کے بھائی کے سسرالی آنے والے تھے، وہ انہی کے استقبال کی تیاریاں کرتے قدسیہ پھپھو کے ساتھ مشغول تھی۔ ان دونوں نے اسے بھی بلایا تھا بلکہ رابی نے اس کا ہاتھ تک جکڑے رکھا تھا لیکن نا جانے کیوں کچھ ہی دیر میں اسے اپنا آپ غیر ضروری سا محسوس ہوا اور وہ وہاں سے چلی آئی۔ کچھ ہوتا تھا قدسیہ پھپھو کے رویے میں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ نہ ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا ہوتی تھی لیکن ان کے رویے سے صرف اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اسے مزید یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ مدثر...... اس کے ساتھ ساتھ رہا کرتا تھا یہ بھی حقیقت تھی لیکن اس حقیقت سے کوئی واقف نہیں تھا کہ اس کا خیال رکھنے کے لیے حسنات نے اسے کہہ رکھا تھا۔ وہ اپنے تئیں اس کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن پھپھو قدسیہ لاعلمی میں اس معاملے کو کسی اور جانب جاتا دیکھ رہی تھیں۔ مدثر کی بات ان کے سسرال میں طے تھی۔ کوئی اونچ نیچ ان کا سر نیچا کر سکتی تھی، اس لیے وہ اندیشوں میں گھری ایسا ماحول بنا دیتیں کہ خانم کو ہی ان کی حویلی سے جانا بہتر لگتا......!

حسنات کو گئے لگ بھگ ایک ہفتے سے اوپر ہو چکا تھا اور اس ایک ہفتے میں اس کا سامنا سنہری

سے بار ہا ہوا تھا لیکن وہ اتنا سرسری تھا کہ اس کا خوف زائل ہونے لگا تھا۔ اسے لگا کہ شاید سنہری نے اب حالات کو نارمل کرنے کا سوچ لیا تھا۔ ایک لاشعوری بے فکری نے جب اسے مطمئن کیا تو وہ آرام سے اکیلے بھی حویلی لکھاں میں چکراتی رہتی تھی۔ پچھلے باغ میں بیٹھے ابھی اسے کچھ ہی دیر گزری ہوگی۔ ماضی کی یادیں اسے کچوکے لگا رہی تھیں لیکن وہ خود کو رونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ کچھ دیر وہ ان یادوں کے ساتھ بتانا چاہتی تھی تب ہی حویلی کی ملازمہ زرینہ اس کے پاس چلی آئی۔

”خانم بی بی...... وڈی چوہدرائن نے آپ کو بلایا ہے جی۔“

وہ سکینہ تائی کا حوالہ سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کدھر ہیں وہ......؟“ چلتے چلتے سرسری سا پوچھا۔

”وہ جی شاید آپ کی حویلی کی طرف گئی ہیں جی...... ہورے صفائی شفائی کرانی تھی، کل سے کہہ رکھا تھا۔“

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پہ رونق لوٹ آئی۔ اپنی حویلی میں تو اس کا دل ہر وقت اٹکا رہتا تھا۔ وہ ملازمہ کو سراہتی تیز قدموں سے اس جانب چل دی۔ وسیع برآمدے کے داخلی جالی دار دروازے کو دیکھتے وہ تھوڑی اچنبھے کا شکار ہوئی کیونکہ اندر داخل ہونے والا اس دروازے کو لازمی کھلا رہنے دیتا تھا۔ یہ ایک اصول کی مانند تھا۔ لیکن وہ دروازہ بھی بند تھا۔ وہ اندر داخل ہوگئی لیکن اپنے پیچھے دروازہ کھلا رہنے دیا۔

”تائی جی...... تائی جی میں آگئی ہوں۔ کہاں ہیں؟“ اس نے سکینہ کو آواز دی تھی تو کونے والے اسٹور سے زنانہ کھنکار کی آواز سنائی دی۔ وہ سکون کا سانس خارج کرتی وہاں چلی گئی۔ تسلی ہوگئی کہ تائی سکینہ وہیں ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بولی۔

”تائی جی...... مجھے صبح ہی بتا دیتیں آپ کہ آج صفائی وغیرہ کروانی ہے میں آپ کے ساتھ ہی چلی آتی۔“

وہ کہتی متلاشی نگاہیں اسٹور روم کے بائیں جانب پھیرتی ابھی دائیں جانب تک نہیں پہنچی تھی کہ پیچھے اچانک سے دروازہ بند ہوا تھا اور ساتھ ہی لاک لگنے کی کلک کی آواز سنائی دی۔ وہ پلٹ نہیں سکی۔

خوف نے اس کی ٹانگوں کو سن کر دیا۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ وہ دھیرے سے پلٹنے کی کوشش میں تھی جب اچانک سے ایک وجود اس کی پشت سے آلگا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی جسے عقب میں کھڑے وجود نے اپنا ہاتھ فوری اس کے ہونٹوں پہ رکھ کر سختی سے دبایا۔

''اب اگر تیری آواز نکلی تو تجھے بھی تیرے ماں باپ کے ساتھ اسی قبرستان میں گاڑ دوں گی...... سمجھی......!''

سنہری کی غراتی آواز اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کے دام میں پھنس گئی تھی۔ کیسے......؟ بھلا کیسے اس نے نہیں سوچا کہ وہ ابھی بھی تاک میں ہے۔ کیسے اتنی بے فکر ہو گئی تھی وہ۔ اس کا بند ہوتا دماغ ان دو چار سوچوں کے تانے بانے بننے لگا جب سنہری نے ایک زوردار گھٹنا اس کے گھٹنے کی پشت پہ مارا۔ وہ پوری طاقت سے یوں گھٹنوں کے بل پکے سیمنٹ کے فرش پہ گری تھی کہ یقیناً اس کے گھٹنے چھل گئے تھے۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ سنہری نے تھوڑا آگے کو جھک کے اس کے چہرے کو جانچا۔ ابھی حواس کچھ سلامت تھے اور مزید خوراک دینے کی ضرورت تھی۔ وہ مسکراہٹ ضبط کرتی بولی۔

''تجھے پتا ہے میں نے تجھے یہاں کیوں پھنسایا ہے؟'' وہ اس کے کان کے قریب بڑبڑائی۔ ''بتا نا......چل میں بتاتی ہوں۔ تیرے پیر توڑنے کے لیے۔ اوہ نہیں، پیر نہیں پر...... آج انہیں کتر دینا ہے میں نے۔ تھوڑا تھوڑا، آرام آرام سے۔ تاکہ تجھے بہت درد رہے اور مستقل رہے۔''

خانم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سنہری نے اس کا دوپٹا ایک جھٹکے سے پلو سے تھاما اور اسے بڑی سرعت کے ساتھ اس کی نازک سپید گردن کے گرد پھندے کی طرح لپیٹنا شروع کیا۔ پہلے بل میں ہی خانم کا دم جیسے بری طرح الجھا۔ اس کی آنکھیں بے بسی سے پھٹنے کو تھیں اور دماغ میں بس ایک سوچ چکرا رہی تھی کہ یہ سب واقعی اس کے ساتھ سنہری ہی کر رہی ہے۔ کیا وہ مرنے والی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی۔ نگاہوں کے سامنے اماں اب کے چہرے، کشور کا حسین مکھڑا اور پھر حسنات کا سراپا ایک ہی جھلک میں پھر گئے۔ اس نے

آنکھیں موند لیں اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج اس کا آخری وقت آ چکا ہے۔ گھٹتے حلق سے اس نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے کی کوشش کی۔ مسلسل کی۔ اس کی نگاہوں نے دیکھنا بند کر دیا۔ یک دم سب سفیدی سی پھیل گئی۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک جھٹکے سے وہ بل سنہری نے اس کی گردن کے گرد سے کھول دیا۔ خانم ایک جھٹکے سے منہ کے بل فرش پہ جا گری۔ لمبے لمبے سانس کھینچتے ہوئے اسے بے انتہا تکلیف ہوئی۔

"کیسا لگا موت کا ذائقہ؟" سنہری اس کے قریب دونوں ہتھیلیاں فرش پہ ٹکاتے تھوڑا جھکتی ہوئی بولی۔ "ابھی ٹھیک سے چکھا ہی کہاں تم نے خانم، چکھنا چاہو گی......؟"

"تم...... تم مجھے مار...... مار ہی دو۔ سنہری...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے نہیں ڈرتی۔" پتا نہیں کتنی ہمت مجتمع کر کے اس نے کہہ دیا۔ جواب میں سنہری کی ہنسی اس کی سماعت پہ بے حد بھاری گزری۔

"لگے گا خانم...... بہت سخت ڈر لگے گا۔ ابھی جو کیا ہے وہ موت تھوڑی تھی۔ اصل موت کا روپ تمہیں میں اب دکھانے لگی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں مجھ سے مرتے دم تک شدید ڈر لگے گا۔"

خانم نے اٹھتے ہوئے اپنی گردن کو جو بری طرح سرخ ہوئی پڑی تھی اور اس پہ خراشیں صاف دکھائی دے رہی تھیں، مسلتے ہوئے الجھن آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ سنہری سیدھی ہوئی اور خانم کو بھی بازو سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

"وہ دن یاد ہے تمہیں خانم...... جب تم اور حسنات مٹی والے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔"

خانم کا چہرہ تپش اور خفت سے سرخ ہوا لیکن وہ خاموش رہی۔

"اس دن جب تم دونوں باہر نکلے تھے تو تمہیں کیا لگا کہ میں تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ کر چلی گئی۔ نہ...... نہ...... خانم...... بالکل نہیں۔ تم دونوں کے کمرے سے باہر نکلنے سے لے کر تمہارے سیڑھیاں اترنے تک کی کئی تصاویر بنائی ہیں اس دن میں نے۔ وہ کیمرا یاد ہے جو حیات کے ماموں کے بیٹے کے ہاتھ میں تھا؟"

اس نے بھنویں اچکاتے اسے گھٹیا طرز پہ پوچھا تو خانم کے بدحواس ذہن کو یاد آیا کہ اس دن چند ہی لوگ تھے جن کے ہاتھ میں کیمرے تھے۔ شہروں میں نوے کی دہائی کی ابتدا میں ذہن وافکار میں بھلے تبدیلی آچکی تھی لیکن پنڈوں میں کیمرے اور مووی والوں کو معیوب ہی سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی اونچے لوگوں کی شادیوں پہ چھڑے چھانٹ لوفرانہ سوچ کے حامل لڑکے داؤ لگا لیتے تھے۔ اس دن بھی حسنات کے ایک ماموں کے بیٹے کے ہاتھ میں کیمرا تھا اور وہ چونکہ قریبی ترین رشتے دار تھا اس لیے آنے بہانے عورتوں میں بھی پایا جاتا دکھائی دیا تھا۔ اس نے بہانے سے خانم اور رابی کی تصاویر اتارنے کی کوشش کی تھی اور یہ بات دور سے دیکھتی سنہری کی شاطرانہ نگاہیں کیسے نہ بھانپتیں۔ خانم اور رابی دونوں کو اس لڑکے سے پرخاش تھی لیکن رشتے داری کا معاملہ تھا اس لیے خود ہی محتاط رہی تھیں، کسی سے شکایت نہیں کی تھی۔ سنہری اسی لڑکے کا حوالہ دے رہی تھی۔ خانم نے سہم کے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال سنہری کے لیے پڑھنا مشکل نہیں تھا۔

"تھا...... تو...... میں کیا کروں......؟"

"آئے میری شہزادیئے......" اس کے گال پہ زوردار چٹکی بھری۔ "تو نے کچھ تھوڑی نہ کرنا ہے۔ وہ تو میں نے کر دیا تھا جو کرنا تھا۔ تیرے کرنے کا کام...... ابھی آگے آنے والا......"

"کھل کے بات کرو...... پہیلیاں نہ بجھواؤ۔"

"لے پھر سن......" سنہری ایک دم ایسی سنجیدہ ہوئی کہ اس کی نگاہیں خانم کو اپنے وجود کے اندر تک گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ "جس وقت تو اور حسنات کمرے سے باہر آئے تھے میں نے اس لڑکے کے ساتھ مل کر تیری بہت سی تصویریں اتاری تھیں۔ ایک ایک قدم جو تو نے اٹھایا تھا وہ سب اس کے اندر ہے۔" اس نے اس کی نگاہوں میں نگاہیں گاڑے ہی اپنا پلو آگے کیا اور اسے کھول کر ایک فلم رول نکالا۔ اسے خانم کے سامنے کیا۔

"یہ...... یہ ثبوت ہے اس دن تیرے اور حسنات کے کرتوتوں کا۔ سوچ اسے دھلا کے سب کو دکھا دوں اور نیگٹو سارے خاندان میں بٹوا دوں تو تیرا کیا بنے گا۔ سوچ......؟"

خانم کے اڑتے رنگ کو اور عرق عرق پیشانی کو دیکھتے وہ سمجھ گئی کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔

''نہیں سمجھ آئی کہ کیا بنے گا۔ میں بتاتی ہوں...... حللللوہ......'' اس نے حلوے کی لام پہ دبا کے زور ڈالا اور کھل کر ہنسی۔ ہنستے ہنستے دہری ہوئی پھر بولی۔ ''خانم کے جلوے کا حلوہ......!''

وہ ہنس رہی تھی اور خانم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسی شے ہوتی جس سے وہ اس کا کام تمام کرتی یا اپنا...... وہ مرنے کے قریب تھی۔ خوف سے اس کے ہونٹ تک نیلے پڑنے لگے تھے۔ بدنامی کا خوف، لوگوں کی نگاہوں میں گرنے کا خوف...... خاندان میں رسوائی کا خوف...... وہ ٹھٹھری آنکھوں سے اس کی دو انگلیوں میں دبا وہ رول دیکھ رہی تھی جس کے اندر اس کی رسوائی کا تماشا بند تھا۔

''اب کیا ہوگا۔ اگر سکینہ تائی نے دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کریں گی۔ نمرہ آپا مجھ پہ تھوکیں گی۔ کشور آپا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ تایا شہاب مجھ سے مزید نفرت کریں گے۔ پھپھو قدسیہ دھتکار دیں گی۔ رابی دوستی توڑ دے گی۔ حویلی کے سب لڑکے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھیں گے اور حسنات لالہ میری بدنامی کی وجہ سے ملتان ہی رہ جائیں گے۔''

اتنا کچھ اچانک سے اس کے کچے ذہن پہ وارد ہوا کہ اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ سنہری نے جو چال چلی تھی وہ اچھی طرح سے کھیل لی گئی تھی۔ اس نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کی تصاویر نہیں تھیں۔ اس نے ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ یہ رول تو اسے شادی کے موقع پر اسی لڑکے کے کیمرے کے پاس پڑا ملا تو اپنی گندی عادات کے زیر اثر اس نے محض مزے کی خاطر اٹھا لیا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ یوں اس کے کام آئے گا۔ اگر خانم تھوڑی سی ہوشیاری دکھاتی یا عقل ماؤف نہ ہو جاتی تو اس جھانسے میں نہ آتی لیکن نہ تو وہ سنہری جیسی چالباز تھی نہ زیرک...... وہ فوراً اس کے اس حربے کا شکار ہوئی تھی۔

اور یہ وہ دور تھا کہ اس دور میں بہت بڑی بدنامی کا سبب ہوتا تھا کسی غیر اخلاقی تصویر کا بزرگوں کے سامنے آ جانا اور غیر اخلاقی کے زمرے میں کسی لڑکے اور لڑکی کا قریب کھڑے ہونا بھی ہوتا تھا۔ خانم بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ سنہری کو لگا بے ہوش ہو جائے گی۔ بدنامی کا ڈر اس کے پورے جسم پہ

چھا گیا تھا۔ سوکھے ڈال سے اترے پتے جیسی حالت لگ رہی تھی۔ یہی موقع تھا اپنا اگلا قدم اٹھانے کا۔ وہ دوزانو اس کے قریب ہوئی اور اس رول کو مٹھی میں بھینچے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

"یہ چاہیے...... میں دے دوں گی۔ قسم سے سچی...... لیکن میری بس شرطیں مانتی جاؤ...... اگر مان لوگی تو یہ رول تمہارا اور نہ مانو گی تو سارے پنڈ کا۔"

اس وقت شیطان کا انسانی روپ سنہری لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے چھاتے اندھیرے کو بمشکل پرے دھکیلتے اس نے سنہری کے مکروہ چہرے پہ نگاہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن سماعت بصارت اور گویائی جیسے سب حسیات سلب ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے کپکپاتے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کھڑے کیے اور انہیں جوڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لفظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ بجھائی تک نہیں دے رہے تھے۔ سنہری نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور بولی۔

"چچ چچ چچ...... نہ بھئی ایسے تو نہ کرنا شہزادیے...... اب ترس تو نہ دلانا......" کہتے ساتھ ہی ایک زوردار ظالمانہ جھٹکا اس کے ہاتھوں کو دیا کہ دونوں پوری قوت سے پکے فرش سے ٹکرائے اور کلائی میں پہنی کانچ کی چوڑیاں جو کلائی کے جوڑوں پہ ٹکی ہوئی تھیں ایک دم سے ٹوٹ کر چبھ گئیں۔ خون کی موٹی موٹی بوندیں نمودار ہوئیں اور سنہری کو لطف اندوز کر گئیں۔ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے غرائی۔

"میری شرطیں مانے گی تو یہ تصویریں تیری۔ بس اتنا کہنا ہے۔ دوسری بات نہیں۔ جلدی بول وقت نہیں ہے۔ میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ مزید یہ نہ ہو تھک کے کسی دن حیات کے حوالے کر دوں اور وہ اس کو دھلوا لے۔ یا حیات کو کیوں کسی پنڈ کے منڈے کو دوں گی، شہر سے دھلوا لائے۔ واپس آتے آتے سارے پنڈ کو دکھاتا لائے گا۔ اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ رول چاہیے یا بات ماننی ہے۔"

چند ثانیے بعد اس نے بے چارگی سے سر ہلا دیا تھا۔ سنہری طیش سے نتھنے پھلائے بولی۔

"منکا نہ ہلا...... منہ سے پھوٹ۔"

"مان...... ن...... مانوں گی۔"

"یہ کی نا عقل مندوں والی بات...... بس اب جیسا میں تجھے کہوں گی ویسا ہی کرتی جانا۔ تیرا مستقبل میرے ہاتھ میں ہے خانم...... اس لیے مجھے ہاتھ دکھانے کی کوشش نہ کرنا کبھی......"

وہ بے بسی کے ساتھ بہتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اتنی بڑی حویلی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی کہ خانم کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ وہ اس وقت کس قیامت سے گزر رہی تھی۔ اس کی شخصیت کی کیسی اندرونی اور بیرونی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ وہ اپنا اعتماد کھو چکی تھی، وہ اعتبار کھو چکی تھی۔ اس وقت وہ جس ذہنی حالت میں تھی اسے کسی پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس وقت اس کا دل پوری حویلی لکھاں کو دوشی سمجھ رہا تھا۔ وہ دکھی تھی، وہ تکلیف میں تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کا دل اور شخصیت مسلی جا رہی تھی۔

لیکن ازالہ کرنے والا کوئی نہیں تھا......!

قسط نمبر 17

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی
فکر یہ تھی کہ شب ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی
شوق یہ تھا کہ محبت میں جلیں گے چپ چاپ
رنج یہ ہے کہ تماشا نہ دکھایا کوئی
شہر میں ہم دم دیرینہ بہت تھے ناصرؔ
وقت پڑنے پہ میرے کام نہ آیا کوئی

(ناصر کاظمی)

جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے پلو سے ان گنت آزمائشیں باندھ لاتی ہے۔ایک کے بعد ایک گرہ کھلتی جاتی ہے اور آزمائش پھن پھیلائے لہرا کے باہر نکلتی ہے۔ایک درد کا زہر بدن سے ختم نہیں ہونے دیتی کہ دوسری کا وقت آجاتا ہے۔

خانم اس رات کہاں تھی؟ حویلی لکھاں کے اندر موجود چار حویلیوں کے افراد اس بات سے بے خبر رہے کہ خانم کا دھان پان سا وجود کہاں کھویا رہا تمام رات...... جب کبھی کوئی حادثہ ہوتا ہے تو وہ ہر زاویے سے ہی حادثہ ہوتا ہے۔جس پر بیتتی ہے اس کے ساتھ حادثہ...... جو بیتی دیکھنے پہنچ نہیں پاتے ان کے ساتھ الگ حادثہ، جو بیتی دیکھنے پہنچ جایا کرتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے ایک حادثہ اور جو بس

سنتے ہیں ان کی سماعت کے لیے ایک حادثہ......!

خانم کو سنہری نے اسی اسٹور روم میں بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ خوف اور اس کے کیے گئے ذہنی اور جسمانی تشدد کے باعث نیم بے ہوش خانم کتنی ہی دیر ٹھنڈے یخ فرش پہ خستہ حال پڑی رہی تھی۔ پہلے پہل اسے لگا کہ سنہری باہر سے تالا ڈال کر نہیں گئی لیکن جب اس نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بند تھا۔ پھر اسے لگا کچھ دیر میں اسے آ کر کھول جائے گی لیکن اسٹور روم کے اونچے روشن دان سے شام کو رات میں ڈھلتے اس نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

سردی سے زیادہ اکیلے ہونے کے خوف نے اس کی جان نکال رکھی تھی۔ اسٹور میں پیٹیاں تھی اور اماں نے پیٹیوں میں رضائیاں اور تلائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بستر بھی تھے جو فنائل کی خوشبو میں بسے تھے۔ چھوٹی حویلی جاتے رقیہ کتنا ہی سامان یہاں چھوڑ کر گئی تھیں۔ خانم نے ایک پیٹی کا کواڑ اٹھایا اور اسے اونچا کر کے اس کا کنڈا اٹکا دیا تا کہ اندر سے دونوں ہاتھوں کا استعمال کر کے بستر وغیرہ نکال سکے۔ ابھی اس نے ایک روئی کا گدا کھینچ کر اوپر کیا ہی تھا کہ اس اٹکے کنڈے کو اپنی ہی کہنی لگی اور وہ ہٹ گیا۔ کواڑ ایک جھٹکے سے واپس گرا اور خانم کے آدھے اندر اور آدھے باہر بازوؤں پہ آ گرا۔ ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور پوری حویلی کی خاموش فضا میں معدوم ہوگئی۔ اس کی آنکھوں نے جھر جھر دوبارہ بہنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ پل بعد دانستہ ایک بار پھر زوردار آواز میں چلائی لیکن دور دور تک کسی کے قدموں کی آہٹ نہ ابھری۔

ملال، دکھ، غم، صدمہ...... یہ تمام جذبات ایک جذبے کے زیر اثر آتے جا رہے تھے اور وہ تھا غصہ...... اسے پوری حویلی لکھاں کے مکینوں پہ غصہ تھا۔ مانا وہ یتیم ہوگئی تھی، وہ لاوارث ہوگئی تھی لیکن کیا وہ ایسا غیر ضروری پرزہ تھی جس کی کمی محسوس تک نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دوپہر سے اب تک کہاں تھی کوئی نہیں جاننا چاہ رہا تھا کیا؟

کیا کشور آپا بھی اتنی مگن ہو چکی تھیں کہ انہیں خانم کی غیر موجودگی کا علم نہیں ہو سکا تھا؟ رابی بھی کیا اسے ڈھونڈتی نہیں پھری ہوگی؟ ایسے کتنے ہی سوال جنم لے رہے تھے اور اس کے دکھ میں اضافہ کر

رہے تھے۔کاش وہ مر جاتی۔یا اب مر جائے۔اس سوچ کے آتے ہی ایک بار پھر خود ترسی نے اس کو گھیرا تھا۔اس نے اپنے بازوؤں کی تکلیف کو نظر انداز کرتے دوبارہ سے کواڑ ہٹایا اور اس بار ذرا احتیاط سے گدا بھی باہر نکالا اور لحاف بھی۔اپنے بازوؤں کو دیکھا تو وہاں پیٹی کا کواڑ گرنے کے باعث سرخ گولائی میں نشان واضح تھا۔وہ یاسیت سے مسکرائی۔آج تو وہ پور پور زخمی تھی لیکن کوئی نہیں تھا جو اس کے زخموں پہ مرہم رکھتا۔اس کے درد کی دوا کرتا۔وہ گدا بچھا کر بازو سر کے نیچے دبائے اچھی طرح لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔صد شکر تھا کہ اسٹور کی لائٹ اندر سے کھلتی بند ہوتی تھی ورنہ سنہری یقیناً اسے باہر سے آف کر کے ہی جاتی اور اندھیرا خانم کی حتمی موت ثابت ہوتا۔

وہ ان باتوں کو سوچتی ایک بار پھر اس تصویروں کے رول کے متعلق سوچنے لگی تو خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ریڑھ کی ہڈی تک جھرجھرا گئی۔کیا ہوگا جو سنہری نے رول دھلوا دیا۔سب وہ تصویریں دیکھ لیں گے۔وہی سوچیں دوبارہ ناگن بن کر اس کی نگاہوں کے آگے لہرانے لگیں۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔وہ سو جانا چاہتی تھی۔اسے ڈر تھا کہ کہیں لائٹ نہ چلی جائے۔اور اگر لائٹ چلی جاتی تو اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا خود کو جن بھوتوں سے بچانے کا۔اس کا کچا ذہن اندھیرے میں بھوت ہی دیکھتا تھا۔اسے بھی جنات سے ڈر لگتا تھا۔وسوسے اندیشے رات کی خاموشی میں اس کے گرد سرسرانے لگے۔پیٹ میں بھوک کے مارے گرہیں پڑنے لگیں۔وہ دہری ہوئی ایک بار پھر آنسو بہاتی آنکھوں کو زور سے میچ گئی۔لحاف سر تک تان کر اس نے اپنے ٹھٹھرتے وجود کو سلانے کی کوشش جاری کی۔روتے کرلاتے، سہمتے ڈرتے وہ نا جانے کب نیند میں اتری تھی، اسے اندازہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کا سمے تھا۔آج دھوپ بھی خوب نکلی ہوئی تھی۔کشور آج خاص باورچی خانے میں گھسی سب کا من پسند کھانا بنانے میں جتی تھی۔حیات کو نہاری پسند تھی اور بے حد تھی۔اس نے سکینہ سے پوچھ کر چوہدری شہاب الدین کی پسند کا مٹن کا سالن بھی بنایا تھا۔سکینہ کی پسند ہمیشہ سے وہی تھی جو ان کے

گھر کے مردوں کو بھاتا تھا۔ نمرہ آپا کو پوچھا تو ان کا دل کچھ چٹپٹا اور کرارا سا کھانے کو تھا اس لیے ان کے لیے اس نے توابوٹی بنائی تھی۔ خوب مرچ مسالہ ڈال کر اور کوئلے کا دھواں لگا کر۔ اسے یقین تھا کہ وہ روٹی کے بنا ایسے ہی بخوشی کھالیں گی۔ اور پھر کشور نے اپنی لاڈلی کے لیے میٹھا بنایا تھا۔ گاجر کے حلوے کے لیے اس نے سب سے پہلے دیگچا چولہے پہ چڑھایا تھا۔ خانم دیوانی تھی حلوے کی اور اسی بھاگ دوڑ میں اس نے معلوم کروانا چاہا کہ وہ کہاں ہے تو ملازمہ نے کبھی بتایا کہ رابی کے ہاں تو کبھی معلوم ہوا کہ نمرہ آپا کے کمرے میں ہے۔ وہ اطمینان اور سکون سے کام میں لگی رہی تھی۔ حیات کو شام میں آنا تھا اور اسے اس کے آنے سے پہلے باورچی خانے سے فارغ ہو کر نکل جانا تھا۔ نمرہ کو عجیب بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔

اس کا دل گھبرایا تو وہ پچھلے باغ کی طرف چل دی اور وہیں کچھ دیر میں رابی پھولتی سانسوں کے ساتھ بھاگی آئی۔

''نمرہ آپا...... نمرہ آپا...... خانم کدھر ہے؟'' دونوں گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے وہ سانس متوازن کرنے کو جھکی۔

''یا اللہ خیر! کیوں ایسے بھاگی آئی ہو؟ خیر ہے نا۔ کیا ہوا ہے؟ اور کہاں ہے خانم...... ٹھیک ہے نا؟''

''ارے اسی کا تو معلوم کر رہی ہوں آپ سے۔ کب سے نہیں دکھی مجھے۔ اماں نے مجھے اپنے ساتھ کچن میں لگا رکھا تھا اور وہ جناب وہاں سے چپ چپیتے نکل آئی۔''

''مجھے تو خود نہیں معلوم کہاں ہے۔ میرا خیال ہے وہ کشور کے ساتھ باورچی خانے میں۔ اگر وہاں نہیں تو اماں کے پاس لازمی ہوگی۔ جاؤ وہاں دیکھ لو۔''

''نہیں، ابھی اندر گئی تو اور دیر ہو جائے گی۔ بس اسے بتادیں کل ہمارا رزلٹ ہے اور میں مبشر بھائی کے ساتھ پھپھو کی طرف سے ہو کر آئی۔ ان کی بیٹی آئی ہے کویت سے اور انہوں نے بلوایا ہے۔ اماں مجھے بھی زبردستی گھسیٹ رہی ہیں۔ رات تک واپس آجاؤں گی، اسے کہنا گھبرائے نہیں۔''

''آئی بڑی......'' نمرہ آپا نے محبت بھری دھونس سے اسے گھورا۔ ''ہمیں اس کی فکر نہیں کیا۔

میں اپنی خانم کو کیوں گھبرانے دوں گی بھلا۔ تم رات تو کیا، صبح واپس آنا تمہیں خانم ہنستی بولتی کھلکھلاتی ملے گی کہ رابی کے بغیر اس کی رات بنا سر درد کے کٹ گئی۔"

"ارے واہ! مجھ سے ساڑ نمرہ آپا۔ یہ کوئی اچھی گل نہیں۔" رابی نے مزے لینے والے انداز میں بھنویں اچکائیں پھر بولی۔ "اچھا چلیں ویسے دھیان رکھ لیجیے گا اس کا۔ آپ کو پتا تو ہے نمرہ آپا، آج کل وہ جلدی گھبرا جاتی ہے۔ اور اسے بتا دینا کہ رات کو واپس آجانا ہے میں نے۔"

"بتا دوں گی، بابا بتا دوں گی۔ جاؤ اب کہ پھپھو ادھر آ کر دو لگاتے ہوئے لے کر جائیں گی تب اچھی رہو گی؟" نمرہ پیار بھرے لہجے میں آنکھیں مسلتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ اس کے انداز میں تھکن نمایاں تھی۔ رابی نے اس کے قریب آ کر اس کے کندھوں پر دو مٹھیاں بھریں۔

"اور آپ اپنا دھیان بھی رکھیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بن رہے ہیں۔"

"اچھا میری اماں..... جاؤ اب۔ میں بھی اندر ہی چلی ہوں، خانم کو دیکھ لوں گی۔ ویسے بھی اب خنکی بڑھ رہی ہے باہر۔"

رابی چلی گئی تو دو تین منٹ بعد تک نمرہ بھی اٹھی اور خانم کو دیکھنے کے لیے ہی اندر کا رخ کیا۔ وہ ابھی اپنی حویلی کے برآمدے تک نہیں پہنچی تھی کہ حمیدہ چاچی کی حویلی کی طرف نگاہ گئی تو ان کے چوڑے گول بڑے بڑے ستونوں والے وسیع برآمدے کو پار کرتے ہوئے جالی دار دروازے پر جا کر ٹھہر گئی۔ ایک سایہ تھا جو اسے دیکھ کر تیزی سے پرے ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کون ہو سکتا تھا۔ سنہری! اس نے سر جھٹک کر گزر جانا چاہا کیونکہ وہ اس بدتمیز لڑکی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن دوبارہ وہ سایہ اسے دکھائی دیا اور اس بار وہ اس کے دیکھنے کے باوجود کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔

اسے حیرت ہوئی تھی۔ ایسا کرنے کی بھلا کیا تک تھی۔ حمیدہ چاچی کے گھر انجان شخص نہیں ہو سکتا تھا اور کوئی ملازمہ تھی تو وہ بھی ایسی حرکت کیوں کرے گی۔ سنہری بے باک اور منہ پھٹ تھی وہ سامنے آ کر کہنے سننے والی لگتی تھی۔

اس نے غیر ارادی طور پر قدم اس جانب بڑھا دیے۔ اپنی بھاری جسامت کے ساتھ برآمدہ

عبور کر کے وہ جالی والے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوئی تو آنکھیں روشنی سے اندھیرے میں آنے کے باعث چندھیائی سی تھیں۔ وہ دو قدم مزید چلی تو وہی سایہ تیزی سے ہال سے دوسرے کمرے کی جانب بھاگا تھا۔

''ارے رکو، کون ہو تم اور حمیدہ چاچی کہاں ہیں؟'' وہ آنکھیں زور زور سے جھپکتی اس سائے کو تلاشتی آگے بڑھی۔

''حمیدہ چاچی......!'' ساتھ ہی حمیدہ چاچی کو آواز دینا مناسب لگا اور تیسرے قدم پر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے پیر کس چیز سے اٹکے تھے۔ وجود نے قلابازی کھائی تھی اور وہ منہ کے بل پختہ چپس والے فرش پہ آ گری تھی۔ ایک ہولناک چیخ تھی جس نے فضا میں شگاف کر دیا تھا۔ اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے اسی سائے کے قدم اپنی جانب آتے دیکھے تھے۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اسے بس اتنا یاد تھا کہ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا سوائے ایک آنکھ کے۔ چھوٹی سانپ جیسی آنکھ!

☆......☆......☆

ساری حویلی میں ہنگامہ مچا تھا۔ نمرہ کو گاڑی میں ڈال کر فوری طور پر ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ سکینہ اور کشور ساتھ گئی تھیں۔ دوسری طرف فون کر کے قدسیہ پھپھو کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ اپنی نند کے گھر سے ہی ہسپتال کے لیے نکل گئی تھیں۔ پیچھے صرف ملازم تھے یا حمیدہ کی حویلی میں وہ خود اور ایک سنہری نامی بلا جو سارے میں اپنا پراندہ جھلاتی منڈلاتی پھر رہی تھی۔

چوہدری شہاب الدین بھی ڈیرے سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی قاسم کی خبر تھی۔ انور پھوپھا اور ان کے بیٹے اپنی حویلی میں تھے جس کا فاصلہ باقی تین سے نسبتاً زیادہ تھا۔ لہٰذا اس رات کسی کو خبر نہ ہو سکی کہ چوہدری آفتاب کی حویلی کے اندر ٹھنڈے یخ اسٹور میں فرش پہ گدا ڈالے لحاف اوڑھے بھوک اور خوف سے دہری ہوئی پڑی خانم موجود ہے جس کا دل شکوؤں سے پُر اور خود ترسی سے معمور ہو چکا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیسی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ وہ اندر گھٹ گھٹ کر یہی سوچ

رہی تھی کہ اب وہ اتنی فالتو ہو چکی ہے کہ سب اسے مرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تب ہی کسی نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ وہ آنسوؤں کی لکیریں لیے سو چکی تھی۔

باہر حویلی لکھاں کی پر سکوت فضا میں صبح فجر کے بعد گاڑی رکنے کی آواز پھیلی تھی۔ سکینہ کی واپسی ہوئی تھی۔ بے حد تھکی ہوئیں لیکن مطمئن۔ نمرہ کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور بہت مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ ساری رات رب کے حضور گڑگڑاتے نکل گئی تھی۔ پیچھے کی ہوش ہی کسے تھی۔ جیسے ہی زچہ بچہ کی خیریت کی اطلاع ملی سب کی جان میں جان آئی تھی۔ انہوں نے زبردستی سب کے کہنے پہ کچھ دیر کے لیے واپسی کا قصد کیا تھا۔ وہ حویلی کی بڑی تھیں۔ انتظامات ان کے ہاتھ میں تھے۔ ایک ان کے ادھر ادھر ہو جانے سے بہت فرق پڑتا تھا اور پھر چوہدری شہاب الدین بھی لامحالہ بیٹی کی خیریت جاننے کے لیے فکر مند تھے۔ وہ حویلی پہنچتیں تو انہیں ڈیرے پہ اطلاع پہنچا پاتیں، اس لیے وہ واپس آئیں اور پھر ان کے وہاں پہنچتے ہی حمیدہ اور سنہری نے انہیں گھیر لیا تھا۔ سوالات کی بوچھاڑ اور کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو کیا ہوتا کے نتائج کا نقشہ کھینچ کر ان کی حالت خراب کر دی تھی۔ ان کے کاموں میں زبردستی ہاتھ بٹوا کر بہت اصرار کے ساتھ حمیدہ نے انہیں لٹایا تھا کہ کم از کم ایک دو گھنٹے کی نیند لے کر واپس ہسپتال جائیں۔

وہ محض اس خیال کے تحت لیٹی تھیں کہ بڑی مشکل سے حمیدہ کا مزاج درست رہا کرتا تھا اگر اس وقت ان کی نہ مانی تو پھر منہ سجانے میں دیر نہیں کریں گی۔ لیٹتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی تھی اور اس موقع کو غنیمت جانتے سنہری، چوہدری آفتاب کی حویلی بھاگی تھی۔ اس کا خیال تھا اسٹور کا دروازہ کھولتے ہی سامنے اکڑی ہوئی خانم ملے گی لیکن دو منٹ تو وہ اس کی عقل کو داد دیتی رہ گئی جس نے پورے انتظام کے ساتھ نیند لی تھی۔ ایک زوردار ٹھوکر مارتے اس نے اسے نیند سے اٹھایا تھا۔ اور حیرت کا مقام تھا کہ بجائے خانم بوکھلا کر اٹھ جاتی اس نے آہستگی سے لحاف سے آنکھیں باہر نکالی تھیں اور سنہری کو دیکھا تھا جس کی وہی شاطر شکل اس کے سامنے تھی۔ اس کی مکروہ مسکراہٹ اضافی خوبی تھی۔ وہ دھیرے سے سپاٹ چہرہ لیے اٹھ بیٹھی اور بیٹھ کر اپنے گھنے چمکیلے بالوں کو ہاتھوں سے سنوار کر کھڑی ہو گئی۔

''خیر ہے، تیور بڑے خطرناک لگ رہے ہیں شہزادی کے۔ کہیں ارادہ تو نہیں بدل گیا۔ اگر

بدل گیا ہے تو سمجھو میرا ابھی بدل گیا ہے کہ میں تجھ پہ رحم کھاؤں۔''

''نہیں بدلا...... مجھے وہ رول چاہیے سنہری۔ بدلے میں تم جو کہو گی وہ میں کروں گی۔ اگر کہو گی تو میں حویلی لکھاں چھوڑ کر اپنے نانکے پنڈ چلی جاؤں گی۔ اماں کے بھائی بہن میں سے شاید کوئی مجھے رکھ ہی لے۔''

اس کے دماغ میں یہ ہی آیا تھا کہ سنہری کا مقصد اسے بس اس حویلی سے نکلوانا تھا اور اس کی رات کے جس جس پہر آنکھ کھلی تھی، یہی سوچا تھا کہ وہ یہ حویلی چھوڑ دے گی۔ ویسے بھی یہاں اس کی ضرورت کسے تھی۔ جیسی یہاں گزر رہی تھی ویسے ہی وہاں گزار لے گی پر کسی قسم کی بدنامی مول نہیں لے گی۔ جیسے ہی تصویر والے رول کا خیال ذہن میں آتا اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جسم کا سارا خون یکلخت خشک ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن سنہری کا دماغ اس کے دماغ سے کہیں آگے بھاگتا تھا اور اس بات کا اندازہ اسے جلد ہو جانے والا تھا۔

''رول تو تجھے مل جائے گا لیکن اس حویلی سے کیوں جائے گی بھلا تو...... خیری صلا......''

اس نے اس کا گال چھونے کی کوشش کی تو وہ گردن جھٹک گئی۔

''دماغ ٹھیک رکھ اپنا خانم...... تپ نا چڑھا۔ چل اب نکل یہاں سے۔ چپ کر کے باہر اپنے ماں پیو کے کمرے میں جا اور سو جا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ تو رات بھر کدھر رہی ہے۔ لیکن جانے سے پہلے سن لے کہ تجھ سے مجھے چاہیے کیا؟''

خانم کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا جسے وہ چھپانے کی حتی المقدور کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آخری بات سنتے ہی یہ کپکپاہٹ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ چکی تھی۔

سنہری کو اس کا یہی ڈر اور خوف چاہیے تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کے بال مٹھی میں پکڑے اور ان کو گردن سمیت جھٹکا دیتی اپنے قریب لے آئی۔

''اب سن میری بات...... وہ بھی پورے دھیان سے۔ اگر کسی ایک جگہ بھی گڑبڑ کی تو تیری بدنامی کے جھنڈے پورے پنڈ میں گڑوا دوں گی۔ سمجھی!''

سنہری کی دھمکی، خانم کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مسلسل گرنا اور ماحول کی سراسیمگی۔ سب نے مل کر خانم کی ذہنی حالت تباہ کر دی تھی۔ رات بھر اس نے جو اذیت کاٹ لی تھی اس نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ سنہری کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اگر اس نے کہہ دیا ہے کہ اسے بدنام کر دے گی تو وہ کر دے گی۔ اور اگر وہ کہتی ہے کہ اسے بچا لے گی تو بچا لے گی۔ وہ اس کی ہر بات مانے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

☆......☆......☆

نمرہ گھر واپس آ گئی تھی۔ گود میں گل گوتھنا بچہ لیے...... ساری حویلی کے لیے خوشی کا سماں تھا۔ اس کے شوہر کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ اب انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا اور جلد از جلد نمرہ کی ٹکٹ کنفرم کروا کر اپنے پاس بلانا چاہ رہا تھا جبکہ سکینہ کی خواہش تھی حسب روایت چھلہ گزار کر نمرہ حویلی سے نکلے۔ فی الحال تو سب اس بات پہ شکر ادا کر رہے تھے کہ وہ بخیر و عافیت تھی۔ اس دوران کشور گھن چکر بنی رہی تھی۔ قدسیہ پھپھو نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ مسلسل مل کر مہمان داری نبھائی تھی۔ ہسپتال میں بھی کشور کو خانم کا خیال ستا تا رہا تھا۔ وہ اسے رات ملے بنا اور کچھ بتائے بنا نکل آئی تھی۔ اس بات نے اسے بے چین کیے رکھا تھا۔ لیکن صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ ایک پل کو رکنا محال ہو گیا تھا۔ اب حویلی آتے ہی کشور کو خانم کا خیال آیا تھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ سارا دن مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ پنڈ کی عورتیں آتی رہیں۔ رش کا یہ عالم تھا کہ صحن سے لے کر پچھلے باغیچے تک عورتیں اور بچے بچیاں بھرے پڑے تھے۔ ایسے میں کشور کو ایک پل کی فرصت نہیں مل سکی تھی کہ خانم کو دیکھ لیتی۔ اس لیے جیسے ہی اسے رابی نظر آئی فوراً اسے پاس بلا لیا۔

”رابی، خانم کہاں ہے؟ اسے لے کر آؤ میرے پاس۔ مجھے دکھائی ہی نہیں دے رہی۔ دل کو گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔“

”میں تو خود صبح سے اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں آپا۔ مجھے بھی کہیں نظر نہیں آئی۔ اوپر سے اماں کے کام ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔ ہمارا رزلٹ بھی نکل آیا ہے۔ مدثر بھائی پتا کر کے آیا ہے اور ہم دونوں کی فرسٹ ڈویژن ہے۔ یہی تو خاص خبر تھی جو خانم کو دینی تھی لیکن اللہ جانے کہاں چھپی ہوئی ہے؟“

''ارے ماشاء اللہ! میری خانم میٹرک پاس کر گئی۔'' کشور فوراً آبدیدہ ہو گئی۔ ''اماں ابا ہوتے تو دونوں بہت خوش ہوتے۔ اماں تو پلو کھول کر شکر ادا کرتی کہ یہ نکل تو گئی اور ابا...... ابا اسکا ماتھا چومتے، اس کے لیے گلگلے لاتے۔ اسے بہت پسند ہیں نا۔ وہ فخر سے اپنی خانم کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے۔''

آنکھ میں ٹھہرے آنسو یکدم بہہ نکلے اور رابی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئی تھی۔ چوہدری آفتاب اور رقیہ سب کے دلوں میں بستے تھے۔ انہیں بھولنا آسان تھا ہی کب۔

''اچھا، آپ اب مہمانوں کو دیکھیں۔ میں خانم کو دیکھ کر آتی ہوں۔''

وہ وہاں سے نکلی تو سیدھا چھت پر گئی۔ سارا چھت خالی ڈھنڈار پڑا تھا۔ جبکہ اسے امید تھی یہاں وہ یقیناً مل جائے گی۔ اب تو اسے فکر ہونے لگی تھی۔ نیچے اتری تو اسی شش و پنج میں تھی کہ سب کو بتائے خانم نہیں مل رہی تب ہی اچانک سنہری کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ اپنی جھونک میں چلتی جا رہی تھی بمشکل اس سے ٹکراتی بچی تھی۔

''اندھی ہو یا جان کے کرتی ہو۔ ہٹو سامنے سے۔''

وہ کترا کے گزرنے لگی کہ سنہری نے بازو پھیلا کر اس کا راستہ روکا۔

''خانم کو ڈھونڈ رہی ہو؟''

رابی چونکی لیکن بولی کچھ نہیں۔ اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجی۔

''مجھ سے پوچھ لو کہاں ہے۔ ایویں گواچی گاں کی طرح بھاگ رہی ہو۔''

''اپنی زبان منہ کے اندر رکھا کرو سنہری۔ کسی دن کٹوا ہی نہ لینا۔''

''میری زبان کو چھوڑو...... فی الحال خانم کے پر کاٹنے کی کرو۔ بہت اونچی اڑان بھرنے والی ہے وہ۔''

''کیا مطلب؟'' اسے شدید کوفت ہونے لگی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی بکواس سن کیوں رہی ہے۔

''سب پتا چل جائے گا۔ پریشان کیوں ہو جاتی ہو ذرا سی بات پر۔ ایسے کیسے زندگی

گزرے گی۔ حوصلہ کیا کرو پیاری۔"

اس کے اس میٹھے کم زہریلے لہجے نے رابی کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دانت پیسنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"سو کمینے مرے ہوں گے تو تمہاری پیدائش کی تصدیق ہوئی ہو گی سنہری۔ تم میں لحاظ، مروت اور اخلاقیات نامی کوئی شے نہیں۔"

"نہ نہ...... کمینے نہیں، زہریلے...... زہریلے کہو۔ میرے اندر زہر ہے رابی۔ کمینگی کب دکھائی ہے میں نے۔ کسی دن زہر دکھاؤں گی اپنا پوری حویلی لکھاں کو نیلا کر دے گی سنہری!"

"اللہ کرے اس دن سے پہلے تم خود اپنے زہر سے مر جاؤ سنہری۔ کون سی منحوس گھڑی تھی جب تم اس حویلی لائی گئی تھیں۔ کاش ماسی حمیدہ کو اب بھی عقل آ جائے۔"

"اپنی ماسی کی عقل سب سے پہلے چاٹی تھی میں نے اسی لیے تو اب اس کی "سی" بھی نہیں نکلتی۔"

"دفع ہو میرے سامنے سے، مجھے خانم کو ڈھونڈنا ہے۔" وہ سائیڈ سے نکلنے لگی تھی۔ مزید اس کی بکواس سننے کا یارا نہ تھا۔

"جاؤ جاؤ...... لیکن سیدھے اس کے مرے ماں پیو کی حویلی میں جاؤ...... وہاں ملے گی تمہیں وہ۔ جب سنہری کہے گی تو وہاں سے باہر آئے گی۔"

رابی متنفرانہ انداز میں پلٹی تھی کہ اس سے پوچھے ایسا کیوں؟ لیکن سنہری کہتے ساتھ ہی چلی گئی تھی وہاں سے۔ اور رابی کا ہرگز دل نہیں تھا کہ اسے آواز لگائے۔ وہ سر جھٹک کر چوہدری آفتاب کی حویلی میں داخل ہوئی تو وہاں نیم اندھیرے ہال میں خانم ٹھنڈے فرش پہ صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے دونوں گھٹنے سینے سے باندھے بیٹھی تھی۔ رابی تقریباً بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی تھی۔

"خانم! خانم کدھر ہو تم کل سے......" وہ وہیں فرش پہ خود بھی بیٹھ گئی لیکن جسم کپکپا اٹھا۔ اپنے ہاتھ خانم کے سرد یخ ہاتھوں پہ رکھتے ہوئے وہ فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"خانم! کیا ہوا ہے؟ کیا سنہری نے کچھ کہا ہے۔ کیا ہوا بولتی کیوں نہیں ہو۔ اور تم یہاں کیوں آ کر بیٹھ گئیں۔ کسی کو بتایا بھی نہیں...... نہ کسی کو پتا ہے۔"

''کل بھی کسی کو نہیں بتایا تھا نہ کسی کو پتا چلا تھا۔'' خانم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کیا نہیں بتایا اور کیا پتا نہیں چلا۔ خانم! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیوں دل کو ہولا رہی ہو میرے...... ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ ہوا کیا ہے؟''

''میرا ابھی ہولتا رہا ہے۔ ڈرتی رہی ہوں اور بہت کچھ ہو گیا ہے۔''

''دیکھو خانم! میں سب کو بلا لاؤں گی یہاں۔ سب پریشان ہو جائیں گے تمہارے لیے...... کشور آپا بھی......''

''کوئی نہیں آئے گا خانم کے پیچھے۔ کوئی پریشان نہیں ہوگا، نہ ہی کشور آپا......''

وہ کٹھور لہجے میں بولی تو رابی دنگ سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی جہاں بے حد تھکن ملال اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ اس کے یوں دیکھنے پہ خانم جیسے پھٹ پڑی۔ وہ چلا کر بولی۔

''کیوں آئی ہو میرے پاس۔ جاؤ یہاں سے...... چلی جاؤ تم بھی......'' اس نے دونوں ہاتھوں سے زوردار دھکا دیا اسے۔ بمشکل رابی نے خود کو پیچھے الٹنے سے بچایا۔ ''کوئی میرے پاس نہ آئے۔ کسی کو میری پروا نہیں۔ سب دھوکے باز مطلبی ہو گئے۔ خانم یتیم کیا ہوئی سب نے اسے لاوارث سمجھ لیا۔ اب جس کا دل جیسے چاہے گا میرا استعمال کرے گا اور میں استعمال ہونے کے لیے تیار ہوں۔ میں روز روز ڈر ڈر کر مرنا نہیں چاہتی۔ ایک ہی دفعہ موت چن لی ہے میں نے اور وہ مجھے ایک ہی دفعہ مارنے والی ہے۔''

خانم نجانے کیا اول فول بولے جا رہی تھی، رابی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس دل و دماغ جیسے ہچکولے کھا رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کل کچھ بہت غلط ہو چکا ہے جس کا کسی کو علم نہیں۔ اس نے مختصر ترین پلوں میں کل کے واقعات ذہن میں دہرائے تو خیال آیا کہ اس کے اپنی پھپھو کے گھر جانے کے بعد پیچھے خانم حویلی میں تھی اور پھر کشور آپا اور سکینہ مامی کا نمرہ آپا کو لے کر ہسپتال جانا...... دوبارہ خانم کا پیچھے اکیلے ہونا۔ اور اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ سنہری کے رحم و کرم پہ تھی۔ اور کچھ ایسا ہو چکا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نہایت تیزی سے رابی نے ساری جمع تفریق کی تھی اور اس کا دل کیا خود کو ساری حویلی لکھاں کے مکینوں سمیت کو سنے دے۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟

"اٹھو، اٹھو خانم...... اٹھو یہاں سے۔ نکلو جلدی۔ چلو میرے ساتھ۔ مجھے چل کر ساری بات بتاؤ...... کیا ہوا ہے۔ اٹھو میری بہن......"

اس نے فوراً کھڑے ہوتے اسے بھی بازو سے اٹھانا چاہا لیکن خانم نے جھٹکے سے خود کو چھڑاتے غصے سے کہا۔

"نہیں جاؤں گی میں، کہیں نہیں جاؤں گی شام سے پہلے۔ اس نے کہا ہے شام سے پہلے اگر میں یہاں سے نکلی تو سب تباہ ہو جائے گا۔ جاؤ یہاں سے تم، چلی جاؤ۔ شام کو وہ نکال لے گی مجھے یہاں سے۔" کہتے کہتے اس کا لہجہ نقاہت زدہ ہوتا گیا۔

رابی نے جان لیا کہ وہ واقعی نہیں اٹھے گی۔ وہ اسی تیزی کے ساتھ وہاں سے بھاگی تھی اور اس کا رخ اپنی حویلی کی جانب تھا۔ کچھ بہت غلط ہو چکا تھا اور کچھ بہت غلط ہونے والا تھا جسے روکنا ضروری تھا۔

☆......☆......☆

سارا دن خانم اپنی حویلی سے باہر نہیں آئی تھی۔ سب نے اس کا پوچھا تھا۔ رابی نے سب کو جھوٹ کہہ دیا تھا کہ وہ میرے کمرے میں ہے۔ بخار چڑھا ہے اسے۔ کھانا کھلا کر اور دوائی دے کر سلا دیا ہے۔ سکینہ فکر مند ہو گئی تھیں۔ انہیں ملال جاگ رہا تھا کہ کل سے بھاگ دوڑ میں وہ اس کی خبر نہیں لے سکی تھیں تب ہی انہوں نے کشور کو سب کام چھوڑ کر خانم کے پاس بھیجا تھا۔ مہمانوں کا تانتا بندھا تھا اس لیے رابی نے زبردستی کشور کو روک دیا تھا کہ خانم بہت مشکل سے سوئی ہے اس کی نیند خراب نہ کریں تو وہ بھی مہمانوں کا زور دیکھ کر اور خانم کی جانب سے تسلی ہوتے رک گئی تھی۔ ملازماؤں کے ساتھ مل کر اس نے بہترین انتظام سنبھالا تھا۔ رابی نے اسے تو ٹال دیا تھا لیکن اپنے دل کو پنکھے لگے تھے۔ اگر اس کا جھوٹ پکڑا گیا تو؟ اگر سب کو معلوم ہو گیا کہ خانم اس کے کمرے میں نہیں بلکہ اپنی حویلی میں ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ عجیب پریشانی سی پریشانی تھی۔ وہ کشور کو بتا کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس طرح کا خانم کا رویہ تھا کشور یقیناً گھبرا بھی جاتی اور بوکھلا بھی جاتی۔ حویلی مہمانوں سے بھری تھی اور وہ بڑی چوہدرائن کی بڑی بہو تھی اگر وہی منظر سے غائب ہو جاتی تو چہ مگوئیاں ہونے لگتیں۔ رابی کو شام

ہونے کا انتظار تھا کہ آخر شام کو ایسا کیا ہونے والا تھا جس کا حوالہ خانم نے بھی دیا تھا۔ رابی نے سارا دن سنہری کا بھی بھرپور مشاہدہ کیا تھا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر خود نمائی میں مصروف دکھی تھی اور اوپر سے اس کا ضرورت سے زیادہ چہکنا دماغ کی چولیں ہلا رہا تھا۔ رابی کا بس چلتا تو اس کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیتی، اس قدر زہر لگنے لگی تھی۔

شام ہوئی اور چوہدری شہاب بھی حیات کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئے۔ ان کے کچھ ہی دیر بعد قاسم بھی حویلی میں آچکا تھا جو کہ خلاف معمول تھا۔ اس کے آتے ہی سنہری کے ہاتھ پیروں میں تیزی سی آ گئی۔ وہ بار بار حمیدہ کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں نا جانے کون سی شیطانی پر تجسس حرکات جاری تھیں جن کا اندازہ رابی کو نہیں ہو پا رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا تھا اسے گاہے بگاہے خانم کے پاس جاتے، اس کی منتیں ترلے کرتے کہ وہ کچھ تو منہ سے بولے۔ بہت مشکل سے پیر پڑ کر اسے تھوڑا سا کھانا کھلایا تھا اور فرش سے اٹھا کر بستر پر بٹھایا تھا کم از کم جسم کو کچھ گرمائش تو ملے ورنہ تو وہ اکڑی ہوئی زندہ لاش کی طرح بیٹھی دل کو ہولا رہی تھی۔ بہت کوشش کی تھی اس نے کہ اسے وہاں سے باہر لے آئے لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی شام سے پہلے نہیں آئے گی۔ اب جب سب حویلی کے مرد موجود تھے اور شہاب الدین کی حویلی کے ہال کمرے میں رونق لگی تھی۔ خاندان کی بزرگ خواتین بھی ابھی یہیں رکی ہوئی تھیں، حمیدہ ایک دم سے اٹھیں اور سکینہ کے پہلو سے لگ کر جا بیٹھیں۔ قدسیہ نے بغور ان کی اس حرکت کو دیکھا اور ٹھٹک گئیں۔

''بھرجائی سکینہ! مجھے بھائی جی شہاب کی موجودگی میں تم سے اور بھائی جی شہاب سے ایک شے مانگنی ہے۔''

سب کا دھیان اچانک سے اس طرف ہو گیا۔ کشور جو گرم گرم چائے لا کر رکھ چکی تھی اور ایک مگ حیات کی جانب بڑھاتی وہ بھی متوجہ ہوئی تھی۔ حیات نے مگ تھام کر اسے اپنے پہلو میں ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی قاسم یہاں موجود تھا جو کہ اب سے پہلے شاذ و نادر ہی ہوا کرتا تھا۔

''بھائی جی شہاب! میرے دل کا تو تم سب لوگوں کو پتا ہے۔ سکینہ بھرجائی کے ساتھ عمر لنگائی

ہے میں نے ، کبھی جو اُچی نیوی بولتی رہی ہے بھر جائی تو اُف نہیں کی میں نے ۔ دل میرا بڑا ہولا ہے۔ منہ ماری نہیں کی جاتی مجھ سے۔ ساری عمر میں نے سر نیوا (نیچا) کر کے لنگا دی۔ کیا کیا نہیں کیا بھر جائی نے اور قدسیہ آپا نے میرے ساتھ۔ حق ہاہ۔"

ایک لمحے کا توقف کیا اور اس لمحے میں قدسیہ کا دل کیا کہ حمیدہ کے خوب لتے لیں لیکن سکینہ کی بولتی نگاہوں کے اشاروں نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ برادری کی بزرگ عورتوں کا لحاظ لازمی تھا۔ حمیدہ جیسے کسی غم کی یاد سے باہر آئیں۔

"خیر...... میں بھی کن باتوں میں پڑ گئی۔ بس یہ پرانی یاداں بھلدیاں تو نہیں نا۔"

"او حمیدہ...... کیوں گل کو لیر کی طرح کھینچے جا رہی ہے۔ مکا جو مکانی ہے۔" چوہدری شہاب کون سے لحاظ مروت والے تھے۔ کوفت زدہ لہجے میں بولے۔

قاسم نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"دیکھو بھائی جی، میرا جی ہے بہت نرم، میں کسی کی یتیمی یسیری نہیں دیکھ سکتی۔ جب سے آفتاب اور اس کی زنانی مکیں ہیں میرا دل بہت سوڑا (تنگ) ہوا رہتا ہے۔"

کشور کو ان کے الفاظ بہت اذیت دے رہے تھے۔ بے اختیار آنکھیں جھلملا گئیں لیکن سر جھکائے چائے کا مگ چہرے کے آگے کر لیا۔

"اب کشور تو بن گئی آپ کی نوہ...... لیکن وہ جو دوسری ہے وہ ایسے ہی شتر بے مہار پوری حویلی میں منڈلاتی ہے۔ منڈے بھرے ہوئے ہیں حویلی میں، چنگا تو نہیں نہ لگتا، مج ہو یا بکری، گلے سے بجی (بندھی) اچھی لگتی ہے۔ ورنہ کبھی اس بوٹے پہ منہ مارا تو کبھی اس بوٹے پہ۔ خوامخواہ جگالی کی عادت پڑ جاتی ہے۔"

"بس کر دے حمیدہ......" قدسیہ پھپھو اب کے واقعی جلال میں آ گئیں۔ "یہ کس قسم کی بے سر پیر کی باتیں کیے جا رہی ہے تو...... بڈھی ٹھیری ہو گئی ہو لیکن بات کہنے کا چج (طریقہ) نہ آیا۔ گھر کی بچیاں نپنے (تولنے) سے پہلے ذرا اپنی گود کی چڑھی کو بھی تک (دیکھ) لینا تھا۔ اب مطلب کی بات کرو ورنہ

ہم جائیں اپنے گھر۔ نماز کا چر (وقت) ہونے والا ہے۔"

پھپھو قدسیہ کے پاس ان کی اس بات کے جواب میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن چوہدری شہاب ان کے بڑے بھائی تھے اور ان کی موجودگی کا انہیں ہمیشہ لحاظ رہا تھا۔ کشور کو بہت اچھا لگا پھپھو قدسیہ کا یوں جرح کرنا اور سکینہ کے چہرے پہ بھی سکون لہرا گیا۔ چوہدری شہاب پہلو پہ پہلو بدلنے لگے تو حمیدہ کو عافیت اسی میں دکھی کہ اصل مدعا بیان کیا جائے۔ اب باقیوں سے تو وہ بعد میں بھی نبٹ سکتی تھیں۔

"گل صاف ہے۔ مجھے خانم کا رشتہ چاہیے اپنے قاسم کے واسطے...... اور ویاہ بھی چھیتی چاہیے۔ ہونہہ...... طریقے سے گل کرنی تو اج تک حویلی لکھاں والوں کو راس ہی نہیں آئی۔ اب بھائی جی مجھے کڑی دیں میرے منڈے کے لیے اور اس یتیمنی کا بھار اتاریں اپنے سر سے۔ بھلا میرے قاسم سے ودھ (بڑھ کر) کون ہونا ہے۔ ایسا منڈا تو اس کے مر کے بھی نصیبوں میں نہ ہوتا۔ چھیتی فیصلہ دیں مجھے!"

سب ہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ حیات اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کشور کا رنگ الگ فق پڑا تھا۔ ایسا تو اس کی سوچوں میں دور دور تک نہیں تھا کہ اس کی پندرہ سالہ بہن کو ایسے انداز میں کہا سنا جائے گا۔ لفظ یتیمنی نے جیسے اسے کانٹوں پہ گھسیٹ لیا تھا۔ کیسا سخت دل تھا چاچی حمیدہ کا۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔ سکینہ بھی ہک دک خاوند کو دیکھ رہی تھیں جبکہ قاسم، حیات کو کھڑا دیکھ کر خود بھی اکڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے وہ گردن اکڑائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ برادری کی بوڑھی بزرگ عورتیں حمیدہ کے تیور از حد حیرت سے دیکھتے خاموش تھیں۔ چوہدری شہاب کو بھی کچھ دیر کے لیے چپ لگ گئی تھی۔ ذہن تیزی سے جمع تفریق کرنے لگا تھا۔ قاسم سے انہیں اس چیز کی توقع تو تھی لیکن اتنی جلدی ہرگز نہیں تھی۔ خانم کا رشتہ دے دینے کی صورت میں نقصانات کا سوچتے تو وہ فائدوں سے زیادہ تھے۔ انہیں اپنے بیٹے حیات کا بھی پتا تھا کہ کس مزاج کا ہے۔ بیوی پہ آنے والے وقت میں اس کے حصے کی زمینیں ہڑپنے کی کوشش تو وہ مر کر بھی نہیں کرے گا، لیکن قاسم کا انہیں یقین تھا کہ اس کے لیے ایسا کر گزرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ان کا تو سدھایا ہوا تھا وہ...... چال چلنا اور موقعے کی مناسبت سے مار مارنا اسے خود سکھایا تھا۔ خانم کی عمر چھوٹی تھی اور اس کے حصے کی زمینیں کم

نہیں تھیں۔ کوئی تو ایسی تھیں کہ ان کی اپنی نظروں میں سمائی ہوئی تھیں اور ہوٹل کی تعمیر کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اس طرف دھیان دیں گے لیکن فی الوقت قاسم ایک بہت بڑی آزمائش بن کے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ قاسم کے انداز و اطوار بے مروت ہوتے جا رہے تھے۔ سر جھکائے وہ انہی سوچوں میں تھے جب ان کے کانوں پہ حمیدہ کی پاٹ دار آواز خاصی گراں گزری۔

''لے دس...... سپ کیوں سنگھ گیا ہے بھائی جی، سب کو...... میں نے کوئی وٹہ تو نہیں کھینچ مارا۔ میرا پتر دیکھیں اور میری مانگ دیکھیں۔ جگرا تو میرا ہوا نا...... پتر داؤ پہ لگائے جاتے ہیں بھلا......''

قدسیہ پھپھو کو تو تاؤ ہی آ گیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح حمیدہ کو یہاں سے غائب کر دیں۔ ان کی شکل سے بھی نفرت محسوس کر رہی تھیں وہ۔

''حمیدہ...... میری سن گل...... بات کرتے کبھی ساری عمر نہ سوچیا تو نے...... کب کہاں کس طراں بولنا ہے لیکن جب تک ہم زنانیوں کا معاملہ تھا جیسے بھی ہوا وقت نکالتے آئے ہیں پر اب بات لے آئی ہے تو ہماری بھتیجیوں پہ۔ نہ تو کشور اور خانم یتیمنیاں ہیں نہ لاوارث...... نہ رشتہ منگنے کا یہ انداز ہوتا ہے۔ جو ویاہ سے پہلے ایسے ظالم مہنے (طعنے) مار دے وہ بعد میں کیا نہیں بولے گی۔ ایس واسطے گل کو ٹھپ کر واب۔ ویسے بھی خانم نکی سی ہے ابھی، ابھی تو اسے اپنی ہوش نہیں کرنی آئی اور تو رشتہ مانگنے نکل کھڑی ہوئی۔''

ایسا کرارا انکار حمیدہ کو صرف قدسیہ ہی کر سکتی تھیں۔ سکینہ کو کچھ بولنے کی حاجت ہی نہ ہوئی۔ انہوں نے بے چین کھڑی کشور کو آنکھوں سے تسلی دی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن حیات چونکہ کھڑا تھا اس لیے وہ بھی نہیں بیٹھی۔ قاسم قدسیہ پھپھو کی بات پہ پیچ و تاب کھاتا بولا۔

''پھپھی! بوہتی نہیں ہو گی ویسے...... نا اب ہمیں ہمارے شریکے سکھائیں گے کہ رشتہ کیسے مانگنا ہے۔ میری ماں کو ساری عمر رلایا ہے ایسی باتوں سے تم لوگوں نے۔ اب میں اسے رونے نہیں دوں گا۔ یہ رشتہ تو ہو کر رہے گا پھپھی......''

''کھلو اوئے منڈیا......'' قدسیہ پھپھو بری طرح غصہ کھاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اپنی زبان اور انداز

کو لگام ڈال۔ تم دونوں ماں پتر ساری عمر آپے ظالم اور آپے مظلوم بنے رہے ہو۔ جہاں تک بات رہ گئی خانم کی تو ابھی تو کیا اگلے چار پانچ سال اس کے رشتے کی گل نہ کرے کوئی۔ وہ ابھی پڑھے گی۔ سمجھا؟"

وہ چوہدری شہاب کی جانب دیکھتی ہوئی بولیں۔

"کیوں بھائی جی، ٹھیک کہاناں میں...... آپ بھی کچھ بولیں۔ دیکھیں تو سہی کل کا منڈا کیسے منہ کو آرہا ہے۔"

"ہونہہ...... تایا جی نے کیا بولنا ہے۔ ان کی تو اپنے منڈوں کے آگے نہیں چلتی۔ میں کسی کا لے کر نہیں کھاتا پھپھی......" قاسم کی بدتمیزی عروج پہ تھی۔ حیات غصے میں دو قدم آگے بڑھا لیکن شہاب الدین کی دبنگ آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"حمیدہ...... تیرا پتر کج زیادہ ہی آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ ذرا تھم دے اسے۔ صبر کا ساہ لو دونوں ماں پتر۔ ایسے کیسے نکی سی کڑی کا ہتھ دے دوں۔ چللو...... دو چار ورے بعد جب خانم ویاہ کے قابل ہو جائے گی تو تب دیکھیں گے کیا کرنا ہے؟"

یہ شہاب الدین نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی لیکن حمیدہ کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہوئے۔ قاسم بھی نتھنے پھلاتا مٹھیاں بھینچتا شہاب الدین کو تنفر سے دیکھنے لگا۔

"عمر کی کون سی گل ہے بھائی جی، اب اتنی بھی نکی نہیں ہے خانم...... جو اتنی نکی ہوتی تو مجھے بھلا یہ رشتہ مانگنے کی کیا لوڑ تھی۔ اس کی مرضی کے بغیر کر سکتی تھی میں یہ......"

حمیدہ نے بم پھوڑا تھا۔ سب ہی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایک دوسرے کے چہروں کو ہونقوں کی طرح دیکھتے بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش میں لگے تھے کہ سنہری عین اس وقت اپنی سنگت میں خانم کو لیے وہاں داخل ہوئی۔ سب سے ہٹ کر بازو باندھے فکرمندی سے کھڑی رابی ایک دم سیدھی ہوئی۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا خانم کو سنہری کے ساتھ آتا دیکھ کر۔ اسے نہیں معلوم تھا سنہری یوں اسے یہاں لے آئے گی۔ وہ تو خانم کی بات سے یہ سمجھی تھی کہ اس پہ سنہری کے خوف کا اثر ہے لیکن اندازہ نہیں تھا کہ وہ جو بول رہی ہے وہ سب سچ تھا۔

کشور نے بھی حیرت سے رابی کو دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں سوال تھے کہ خانم تو بقول رابی کے اس کے کمرے میں سو رہی ہے لیکن وہ یہاں کیسے؟

رابی کھسیانی سی کندھے اچکا گئی۔ خانم کانپتے وجود کے ساتھ وہاں آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی، ہونٹ خشک، چہرہ زرد اور مدقوق...... آنکھوں کے نیچے حلقے جو اس وقت بہت واضح ہو رہے تھے۔ اس کی سپید رنگت پہ...... کشور اور سکینہ دم بخود سی اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اس ساری صورت حال پہ یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

حیران تو قدسیہ پھپھو بھی تھیں۔

ساری بازی جیسے الٹ کر رہ گئی تھی۔ حمیدہ اور قاسم گردن تانے سب کو محکوموں کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

''لو آ گئی خانم...... مرضی لو اس سے بھائی جی، اگر نہ ہو تو میرے سر پر جتیاں مارنا سارے......''

''خانم۔ گڈی......!'' کشور اور حیات بیک وقت آگے بڑھے تھے لیکن حمیدہ درمیان میں آ کھڑی ہوئیں۔

''نا نا نا...... اینج نہیں ہُن، پہلے بچی کی مرضی سب کے سامنے آئے گی اس کے بعد کوئی اس کے نیڑے لگے گا۔ پوچھو بھائی جی خانم سے۔ وہ اس رشتے پہ راضی ہے یا نہیں۔''

چوہدری شہاب کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس وقت حمیدہ اور قاسم سارے ماحول پہ چھائے ہوئے تھے اور خانم سر جھکائے اس کی بغل میں کھڑی تھی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے مجبوراً بولے۔

''کیا پوچھوں...... یہ بھی ویلا دیکھنا تھا ہم نے۔ ایسی بے ہدایتی کڑی کو میں تکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ خود ہی اس سے پوچھ لو۔''

''ہاں خانم! بتا سب کو۔ تجھے میرے قاسم کا رشتہ منظور ہے کہ نہیں۔ تیری مرضی ہے کہ نہیں۔''

حمیدہ نے پاٹ دار آواز میں خانم سے پوچھا تو وہ مزید کانپنے لگی۔ سنہری جو اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اسے ایک زوردار چٹکی بھر گئی اور خانم کی زبان چل پڑی۔

''ج......ی......میری مرضی ہے تایا جی۔ مجھے بالکل منظور ہے، جیسے حمیدہ چاچی کہتی ہیں ویسے ہی کریں۔''

''خانم! پاگل ہوگئی ہو۔'' کشور چلا سی اٹھی۔

اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دماغ جیسے بند ہونے کو تھا۔ حیات بھی ششدر تھا لیکن اس کی عقل سلامت تھی۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑنے کی سعی کر رہا تھا۔ اسے واضح گڑبڑ دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا خانم کی غصیلی لیکن کپکپاتی آواز ابھری۔

''پاگل ہی تھی ابھی تک۔ سوچتی تھی کہ میری پروا ہے سب کو لیکن خانم کی کسی کو پروا نہیں۔ آپ کو بھی کشور آپا......سب نے خانم کو چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھ سے سوال جواب نہ کریں۔''

بیتی رات کا غصہ اس کے لہجے سے بولنے لگا تھا۔ رابی نے تاسف سے اسے دیکھا۔ سارا معاملہ ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ کشور بھی ٹھٹکی تھی۔ سنہری کی شاطرانہ مسکراہٹ بہت سے معاملات عیاں کر رہی تھی لیکن خانم کو غصہ تھا تو اس کے اظہار کا یہ کیسا طریقہ تھا۔ وہ اپنا مستقبل کیوں داؤ پر لگا رہی تھی۔

''مجھے قاسم لالہ کا رشتہ منظور ہے۔ جو حمیدہ چاچی کہیں ویسا ہی کریں۔''

اتنا کہہ کر خانم وہاں سے تقریباً بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔ سب کو ہکا بکا چھوڑ کر۔ یہ سب اچانک ہو کیا گیا تھا۔ کوئی سر پیر سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ خانم کا انداز اتنا پراسرار اور خودسر کیوں تھا۔ بہت سی سوچیں سب کے دماغوں میں ہلچل مچا رہی تھیں لیکن زبانیں جیسے بند ہوگئی تھیں۔ خانم نے تو لکیر پھیر دی تھی۔ اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ کسی کو کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ کشور شرمندگی سے گڑ جانے کو تھی۔ اس نے رابی کو ملامتی نگاہوں سے دیکھا تو جواباً رابی نے اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تنبیہ کی کہ جو دکھ رہا ہے ویسا نہیں۔ مسلسل نفی میں ہولے ہولے سر ہلاتی وہ اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔ سنہری کی نظریں اسی پر تھیں۔ وہ طنزیہ مسکرائی اور حمیدہ سے بولی۔

''ماسی! کڑی راضی ہو تو دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تاریخ مانگو سیدھی طرح ویاہ کی۔''

اتنے بڑوں کی موجودگی میں اس کا بولنا سبھی کو ناگوار گزرا۔ قدسیہ پھپھو اسے کھا جانے والے

لہجے میں بولیں۔

''اے...... اپنا منہ بند رکھ تُو...... کل کی آئی ہمیں متیں (عقلیں) نہ دے۔ تیرا کیا لاگا داگا ہے یہاں بھلا۔ ایویں منہ اٹھا کر گھس نہ آیا کر ہمارے معاملوں میں۔''

حمیدہ چاچی کو اپنی بھانجی کی بے عزتی برداشت نہ ہوئی تو چمک کر بولیں۔

''ایسا کچھ نہیں کہہ دیا میری پنیوں نے۔ سچ ہی تو کہا ہے۔ کڑی کے منہ سے سن کر تسلی نہیں ہوئی کیا بھائی جی...... تاریخ طے کریں ویاہ کی۔ بس ابھی کے ابھی...... مجھے اپنی زندگی میں اپنے پتر کا ویاہ کرنا ہے۔ ہور کتنے دن رہ گئے میری حیاتی کے۔''

حمیدہ نے آنکھوں پہ پلو رگڑ کر نادیدہ آنسوؤں کو رندھی آواز میں رگڑا۔ چوہدری شہاب کو قاسم سے خطرے کی بو آرہی تھی جو انہیں یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی کوئی مرضی کے خلاف فیصلہ ہوا تو وہ ان کا لحاظ بالائے طاق رکھ دے گا۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے بیٹھے سب کے صبر کا امتحان لیتے رہے اور پھر بولے۔

''ٹھیک ہے کل برادری کے بندے بلا کر نوے (نئے) چن کی پہلی تاریخیں رکھ لو۔ تب تک جو چار دیہاڑے ہیں ان میں زنانیاں تیاریاں کر لیں گی۔ اب مزید کچھ نہ ہو۔ بتھیری کر لی، جو کہا ہے ویسا کرو بس۔ ہونہہ اس ذلیل پودنے تو منہ دکھانے جوگا نہیں چھوڑا۔''

وہ دبنگ انداز میں کہتے وہاں سے غصے میں نکل گئے تھے۔ قاسم گو کہ اس دیر پر راضی نہیں تھا لیکن خاموش ہو گیا تھا۔ اتنا کم تھا کہ معاملہ اس کے حق میں چلا گیا تھا۔ اس کی تاریخ پکی ہو گئی تھیل۔ خانم اب اس کی تھی۔ گو کہ دل کو دھڑکے ابھی بھی تھے لیکن خانم اب اس کی منگ تھی۔ اب کوئی انکار کرتا تو فساد ہی برپا ہونا تھا۔ وہ تن فن کرتے حیات کا چہرہ دیکھتے ہوئے استہزائیہ مسکرایا اور اپنی چادر کا پلو ہوا میں جھٹکا۔ حیات کا دل کیا اس کا منہ توڑ دے لیکن سکینہ پہلے ہی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھیں تا کہ وہ ٹھنڈا رہے۔

''پتر! ہوش میں رہنا۔ دونوں ماں پتر یہی چاہتے ہیں اور آگ کو ہوا دے گی یہ سپنی جو حمیدہ کی آستین میں ہے۔ دیکھنا حمیدہ کو اسی نے ڈسنا ہے۔ حوصلہ کر، مجھے خانم سے بات کرنے دے۔ دیکھنے دے کہ اس بے ہدایتی نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟''

وہ اسے تحمل میں رہنے کا کہتے ہوئے اپنے ساتھ ہی لیے وہاں سے باہر نکل گئیں۔ انہیں بھی خانم پر غصہ تھا لیکن معاملہ فہم خاتون تھیں بلا وجہ واویلا کرنے کی عادت نہیں تھی۔ قدسیہ کب کی جا چکی تھیں اس لیے پیچھے اب حمیدہ، قاسم اور سنہری ہی کھڑے تھے۔ سنہری فاتحانہ انداز میں پراندہ جھلاتی قاسم کے قریب آئی اور اس شاباش دیتی نگاہوں سے دیکھا۔

''حق ہاہ۔ کتنا چاہ تھا میرا۔'' حمیدہ نے دونوں کو ساتھ کھڑے دیکھ کر ہوکا بھرا تھا۔ ''لیکن واہ ری قسمت...... میرے حصے میں یہ رقیہ کی جوٹھ ہی آنی تھی۔ قاسم سوچ لے چنگی طراں...... کاکی کھڈانے سے چنگا ہے سیانی بیانی سے ویاہ کر جو حویلی کو سانبھے۔''

''ماسی! تجھے کس نے کہا خانم نے حویلی کو سانبھنا ہے۔'' سنہری ذو معنی لہجے میں بولی۔ ''یہ تجھے وقت بتائے گا کہ حویلی کو کون سانبھتا ہے۔ تو بس اپنے پتر کی خوشی دیکھ ماسی۔ دیکھ کیسے لال سوا ہو گیا ہے تیرا پتر ویاہ کے نام پر۔''

اس نے قاسم کی جانب حمیدہ کا دھیان کرایا جو بے حد سرخ سفید چہرے کا مالک تھا لیکن آج اس کے چہرے کا گلال الگ تھا۔ وہ کشور کے بعد خانم کو ہی اپنی بیوی کے خانے میں فٹ دیکھتا تھا۔ حمیدہ نے بلائیں لیں اور پتر پہ واری صدقے جانے لگی۔ جبکہ قاسم کے چہرے کی خوشی سنہری کے سینے پہ انی کی طرح گڑ گئی تھی۔ اس کے اندر کا حسد انگڑائیاں لیتا اسے باور کرا رہا تھا کہ اس کے ساتھ شادی کرنا قاسم کی کبھی بھی چاہت نہیں تھی۔ اور آج جس سے اس کی بات طے ہو گئی تھی وہ قاسم کی پسند تھی۔ یہ تڑپ اور خوشی اسے اپنے لیے چاہیے تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ قاسم کو اس سے شادی نہ کرنے کا افسوس رہ جائے۔ اسے نہیں معلوم تھا آنے والے وقت میں قاسم کو کتنی ہی باتوں کا افسوس رہے گا!

☆......☆......☆

کشور حال سے بے حال ہوتی گھٹنوں کے بل خانم کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں اور زبان جیسے بے بسی کے احساس سے بند ہو گئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے خانم بیٹھی تھی۔ اپنے گھٹنے موڑے ان کے گرد اپنی بانہیں لپیٹے۔ سپاٹ بے تاثر چہرہ لیے۔

یہ چوہدری آفتاب کی حویلی کا وہی کمرا تھا جہاں وہ صبح سے محبوس تھی۔ سنہری نے اسے یہاں سے نکلنے سے منع کیا تھا سو وہ نہیں نکلی۔ اور جب وہ خود اسے لینے آئی تو روبوٹ کی مانند اس کے ساتھ ہو لی تھی۔ جو جیسا اس نے کہا تھا ویسا ہی خانم نے کہہ دیا تھا۔ انجام سے بے پروا اور معاملے کی گہرائی سے بے خبر۔ دماغ میں بس وہ تصویروں والا رول گھومتا تھا جس میں اس کی حسنات کے ساتھ تصویریں تھیں اور سنہری نے کہا تھا وہ سارے پنڈ میں ان تصویروں کو پھیلا دے گی۔ سنہری نے کہا تھا اسے یہ رول صرف اس شرط پہ مل سکتا ہے کہ وہ خود اپنے منہ سے قاسم سے شادی کی ہامی بھرے اور اس کے بعد اپنی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر لے۔ جیسے ہی شادی کے دن طے ہو جائیں گے اسے یہ رول حوالے کر دے گی۔ اگر اس دوران اس نے اپنی زبان کھولی تو انجام دن چڑھنے سے پہلے دیکھ لے گی۔ بس اس کے آگے خانم کی بس تھی۔ اس نے اپنا منہ سی لیا تھا۔ اپنے کان اور آنکھ بند کر لی تھی۔ اپنے جذبات اور احساسات کو اسی پیٹی والے کمرے میں لحافوں تلے دبا دیے تھے جس میں اس نے پچھلی سرد رات گزاری تھی۔ اس رات کی وحشت و خوف بھی اتنا نہیں تھا جتنا سنہری کا اس کے دل میں بٹھایا گیا خوف۔ اپنی کردار کشی کا خوف، اپنی عزت خراب ہونے کا خوف!

خانم کے یہاں آنے کے فوراً بعد ہی کشور، رابی کے ساتھ اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ رابی نے ہی اسے بتایا تھا کہ وہ کدھر تھی۔ رابی سے باز پرس کو کشور موقوف کرتی فی الحال خانم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ رابی اس کے ساتھ ہی اندر آنا چاہتی تھی لیکن کشور نے التجائیہ اسے روک دیا تھا۔ وہ اس سے کچھ دیر اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے قریب بیٹھتے ہی اور محبت سے ہاتھ لگاتے ہی خانم جیسے پھٹ پڑی تھی۔

”ہاتھ نہ لگانا کشور آپا مجھے۔ اور کیوں آئی ہو یہاں۔ چلی جاؤ ادھر سے۔ جدھر کل رات تھیں وہیں چلی جاؤ۔ دو دن اور ایک رات سے میری خبر نہیں لی آپ نے اور اب آپ کو خانم یاد آ گئی۔ جاؤ واپس۔“

اکھڑا بے لحاظ لب ولہجہ......دل چیرنے والا انداز۔

آخر ہوا کیا تھا۔ کشور ششدر تھی اور خانم دوٹوک۔

"خانم مجھے بتاؤ گی گڑیا کہ ہوا کیا ہے۔ نمرہ آپا کا بیٹا ہوا ہے چندا۔ ہم ان کے ساتھ ہسپتال میں تھے۔ اللہ نے بہت دعاؤں سے جان رکھی ہے ان کی۔ مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں تمہیں بتائے بنا نکل گئی۔ بس اچانک ہی نمرہ آپا کو لے جانا پڑا۔ وہ گر پڑی تھیں۔ مجھے کچھ تو بتاؤ ایک رات میں تمہیں ایسا کیا ہوگیا ہے جو اتنا بڑا فیصلہ اپنی آپا کو بتائے بنا لے رہی ہو۔ قاسم کے بارے میں جانتی نہیں ہو کیا۔ اور حمیدہ چاچی۔"

"اچھی ہیں بہت۔" وہ اچانک کشور کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "کم از کم انہیں اور سنہری کو میری خبر تو تھی۔ انہیں بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ نہ ہوتا تو رات میری ویسی تو نہ گزرتی نا جیسی گزر گئی۔ سنہری کو میرا احساس تھا نا کہ میں اکیلی ہوں اور اس اکیلے ہونے کا خمیازہ میری تقدیر میں لکھا گیا ہے آپا......"

پچھلی رات کے اسٹور میں گزرے وقت کے تمام مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ بے اختیار ہاتھ اپنی گردن تک گیا جہاں ابھی بھی دوپٹے کی وجہ سے آئی خراشیں موجود تھیں۔

کشور اسے نا سمجھی کے عالم میں دیکھتی بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن اسے بات شروع کرنے کے لیے سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اپنا قصور سامنے تھا۔ کوئی اور سمجھتا یا نہیں سمجھتا، کیا اسے خانم کو بتائے بغیر جانا چاہیے تھا؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ پوری حویلی میں بس خانم اور ملازمائیں ہی ہیں یا پھر حمیدہ چاچی کی حویلی میں سنہری اور وہ خود۔ قدسیہ پھپھو بھی ہسپتال میں تھیں اور انہوں نے صاف بتایا تھا کہ رابی اپنی پھپھو کے ہی گھر میں ہے۔ ایک دم سے شدید ترین ملال نے کشور کو ندامت سے شرابور کر دیا تھا۔ اتنی بھیانک غلطی۔ ایسی ہولناک کوتاہی۔ کیسے کر دی اس نے۔ خانم تو چڑیا سا دل رکھتی تھی۔ وہ تو اونچی آواز نہیں سہہ سکتی تھی پیچھے ایسی ڈھنڈار حویلی میں کیسے رہی ہوگی۔ جبکہ اس کی ذہنی حالت اماں ابا کے جانے کے بعد سے مستقل پراگندی کا شکار تھی۔ کشور کی نگاہیں جھکیں تو اٹھ نہ سکیں۔

"یہاں سے جاؤ آپا...... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ خانم اب بچی نہیں ہے۔ بڑی ہو چکی ہے۔ دیکھا نہیں شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے میری۔ خانم کو اب کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس حویلی

میں اماں ابا کے جانے کے بعد میرا کوئی بچا ہی نہیں۔ اور رات میں نے یہ بات اچھی طرح سے ازبر کر لی ہے۔ جاؤ آپ کے کام آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"خانم......میری گڈی......!" کشور نے بھرائی آواز سے اسے پکارتے ہاتھ بڑھایا لیکن خانم نے دور سے ہی جھٹک دیا۔ "ایسی مار نہ مارو خانم...... مجھ سے غلطی ہوگئی میری جان۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ اپنی آپا کو پہلی اور آخری دفعہ معاف کر دو۔ میں...... تمہاری شادی قاسم سے نہیں ہونے دے سکتی۔ اماں ابا کو کیا جواب دوں گی۔ وہ اچھا نہیں ہے، چاچی بھی اچھی نہیں ہیں۔ اور وہ سنہری۔ وہ تو تمہیں کچا چبا جائے گی۔"

"چبا چکی آپا......" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"کیا مطلب؟ مت کرو ڈھکی چھپی بات۔ مجھے کھل کر بتاؤ کیا ہوا ہے خانم...... ورنہ یقین مانو میرا دل پھٹ جائے گا۔ مجھ سے نہیں سہا جا رہا تمہارا رویہ۔ مجھے بتاؤ خانم کل کیا ہوا ہے؟"

وہ اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے بولی تو اچانک دل میں ایک خدشہ سرسرایا جس نے اس کا سارا خون نچوڑ دیا۔ اسی کے زیر اثر وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"کچھ ایسا ویسا تو نہیں ہوا خانم جس کی وجہ سے تم قاسم سے شادی کے لیے منہ سے کہہ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے اس نے تمہیں کل...... مطلب کوئی بدتمیزی، کچھ گھٹیا حرکت......!"

اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس کی بہن تو چھوٹی تھی۔ اسے کیا پتا تھا ان باتوں کا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کل کی رات اس کی عمر کے کئی سال کھا گئی تھی۔

"کچھ نہیں کہا کسی نے مجھے۔ بس کر دو۔ جاؤ اب۔ میں کل رات اکیلی تھی بس اتنا یاد رکھنا چاہتی ہوں۔ اس بھری دنیا میں نہ مجھے کوئی پوچھنے والا ہے نہ فکر کرنے والا۔ مجھے یہی یاد رکھنا ہے۔ کوئی بھی نہیں جو موجود ہوتا میرے لیے تب بھی جب ساری دنیا فنا ہو جائے، تباہ ہو جائے لیکن کوئی ایک ایسا ہو جو میرے لیے میری خاطر ہو۔ کوئی نہیں تھا۔"

وہ کھوئے لہجے میں حسنات کی بات یاد کرتی اسی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ آنکھیں آنسو برسانے

لگیں۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن گزشتہ رات کبھی بھول بھی نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ ہو کر گزرا تھا وہ اس کی پوری زندگی کی بدنما ترین یاد بن گیا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پہ رکھ لیا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی۔ آنسو نکلنے دینا چاہتی تھی۔ اماں یاد آ رہی تھیں، ابا یاد آ رہے تھے۔ ان کے سینے کی گرمی کے لیے وہ ترس رہی تھی۔ کتنی جلدی وہ لاوارث ٹھہری تھی کہ جس کا دل کر رہا تھا اسے دھتکار رہا تھا اور جس کا دل کر رہا تھا اس کا ہاتھ مانگنے کھڑا ہو گیا تھا اور جس کا دل کیا اسے اپنے نام کر بھی چکا تھا۔ لیکن کسی کو کچھ پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیوں اور کیا ہو رہا تھا۔ عجیب کسمپرسی تھی۔

کشور جانتی تھی کہ اس کے جھکے سر کے نیچے بے تحاشا آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ رو رہی ہے شدت سے۔ اس نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی غرض سے اس کے سر کو اوپر اٹھانا چاہا لیکن اس کا بڑھتا ہاتھ ہوا میں ہی کسی نے روک لیا۔ اس نے ٹھٹک کر گردن موڑی تو حیات پیچھے کھڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پہ رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے آنکھوں سے اسے باہر بلایا اور خود دبے قدموں بنا چاپ باہر چلا گیا۔ کشور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چلی گئی تھی۔ اپنے اردگرد خاموشی محسوس کر کے خانم نے سر اٹھایا تو وہ وہاں اکیلی تھی۔ ایک بار پھر نا صرف اس کمرے میں بلکہ اپنی حویلی میں اکیلی تھی۔ خود ترسی، مظلومیت کا احساس دو چند ہوا اور وہ آواز کے ساتھ بلک بلک کر رو دی۔ ماں باپ کو پکارتی اذیت کی شدت کو دباتی یونہی بیٹھے بیٹھے وہ نجانے کب نیند کے پروں پہ سوار ہوئی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

کاش کوئی ایسا منتر ہو جو بچھڑوں کو موڑ لائے۔ دنیا میں جدائی سے بڑی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ وہ بیج ہے جو دل کی گہرائی میں جڑ پکڑتا ہے اور اس کی شاخیں اندر ہی اندر سارے جسم کو لپیٹ لیتی ہیں۔ خار ہی خار نسوں میں گھونپ دیتی ہیں۔ چھلنی ہو کر وجود اندر سے تار تار ہوتا ہے لیکن دکھائی کسی کو نہیں دیتا۔ دل دکھ کا پیالہ بن جاتا ہے جس میں ہوکے، آہیں اور سسکیاں بھرتی رہتی ہیں اور جب بوجھ بہت بڑھ جائے تو وہ پیالہ چھلک جاتا ہے۔ سب کچھ رگوں میں بھرتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ سارا وجود کینسر بن جاتا ہے۔

☆......☆......☆

کمرے میں عجیب سی خاموشی تھی۔ سردیوں کی راتیں تھیں اور پنڈ کی سردی تو کہرے اور دبیز اسرار کا مسکن ہوا کرتی ہے۔ ایک طرف سلنڈر کی مدد سے ہیٹر جل رہا تھا۔ پر حدت کمرا مونگ پھلی اور چلغوزوں کی کچر کچر سے گونج رہا تھا یا کسی وقت ریوڑیاں چبانے کی آواز اٹھتی تھی۔ زبانیں بند تھیں کیونکہ سوچنے کو اس وقت بہت کچھ تھا۔ حمیدہ کے چوڑے پلنگ پر رومال بچھائے سنہری اور وہ خود مونگ پھلی اور چلغوزے ٹونگ رہی تھیں جبکہ پلنگ کے قریب رکھے کرسی پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا قاسم گود میں پلیٹ رکھے بیٹھا تھا۔ حمیدہ اور سنہری اس کے لیے گاہے بگاہے چھلی ہوئی مونگ پھلی اور چلغوزے پلیٹ میں ڈال رہی تھیں اور وہ نوابوں کی طرح دانہ دانہ ٹونگتا آنکھیں سکوڑے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ہونٹوں میں کسی کسی وقت ہلکی مسکان چھب دکھا رہی تھی۔ یعنی سوچوں میں اس وقت اضطراب نہیں تھا بلکہ وہ خوش کن بھی تھیں۔ سنہری مونگ پھلی چھیلتی مسلسل اسے نگاہوں کی زد پہ رکھے ہوئے تھی۔ دل میں عجیب سی کھد بد بھی تھی جس نے بے چین کر رکھا تھا۔ معلوم تھا کہ خانم کا خیال ذہن پہ چھایا ہوا ہے لیکن اعتراض کیسے کرتی کہ یہ کھیل اس کے اپنے ہاتھ کا سجایا ہوا تھا۔ اب اپنی اپنی باری پہ سب ہی کو کھیلنا تو تھا۔ حمیدہ بھی بیٹے کی مستی خوب اچھے سے ملاحظہ کر رہی تھی۔ سنہری پر بھی تادیبی نگاہ ڈال رہی تھی کیونکہ خانم کے لیے اسے منانے والی وہی تھی۔

''کن سوچوں میں گم ہے قاسم پتر۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو گل کر ابھی کے ابھی رشتہ مک جائے گا پتر۔ ہم کون سا کڑی والے ہیں۔'' حمیدہ نے چھلے ہوئے چلغوزے تھوڑا آگے ہو کر قاسم کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ جواباً اس نے ناگواری سے ماں کو دیکھا تھا۔

''اماں! کیا بار بار ایک ہی بات کیے جاتی ہے۔ خانم کے ساتھ ویاہ میری چاہ سے زیادہ لوڑ بھی ہے۔ پہلے کشور کا کہتا رہا تو نے لمکا (لٹکا) ہی دیا کام، اب خانم نہ ہاتھ سے نکال دینا میرے۔''

''نا ایسی کون سی تھوڑ ہے قاسم تجھے...... کہ پوں چوں (رہ سہہ) کے تجھے اس کالے کرموں والی رقیہ کی دھی ہی چاہیے۔'' حمیدہ کا بغض رقیہ سے کبھی ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ بھلے وہ قبر میں اتر گئی تھی۔

''اماں......'' قاسم ٹانگیں سیدھی کرتا آگے کو ہو کر بیٹھا۔ پلیٹ بھی پلنگ پہ رکھ دی۔ اس دوران

سنہری نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، وہ بس خاموشی سے سن رہی تھی۔

''دیکھ اماں! چاچے آفتاب کی زمین تجھے پتا ہے کتنی ہے؟ اماں جتنی ہماری بھی نہیں۔ ابا نے اپنی کتنی ہی زمین بیچ باچ دی تھی۔ پیڑے کاموں میں پھنس کر برباد کر دی ساری۔ چاچے آفتاب کی زمین تائے شہاب کے برابر سمجھ۔ کیونکہ تائے نے کم دھاندلی نہیں کی ہوئی۔ کتنی ہی مَل (قبضہ) مار کر بیٹھ گیا تھا ابا کے ہوتے ہوئے ہی۔ اب اس کی نظریں چاچے آفتاب کی زمینوں پہ ہیں اور کشور سے حیات کا ویاہ بھی اسی چکر میں ہوا ہے اماں ورنہ تایا شہاب، چاچے آفتاب کے گھر کی اٹ بھی اپنے گھر نہ لگائے۔ ہاں! زمین ہتھیا سکتا ہے وہ اور بات ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ ہلکی آواز کا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ حمیدہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی جبکہ سنہری ہنوز آنکھیں سکوڑے اسے اور حمیدہ کو دیکھتی چلغوزے کھا رہی تھی۔

''تو پتر! آفتابے کی زمین نری خانم کی تو نہیں نا...... اس پہ کشور کا بھی تو حق ہے۔ برابر کی ونڈی پڑے گی دونوں بہنوں میں۔''

''کیوں برابر کی ونڈی پڑے گی اماں...... منڈے تھوڑی ہیں جو ساری جائیداد ان دونوں میں ہی چلی جائے گی۔ تو اس چکر میں نہ پڑ بس اتنا یاد رکھ کہ تیرا پتر سب کچھ خانم کے نام لگوا کے ہی بیٹھے گا۔ کشور خود سارا کچھ اپنی نکی بہن کے نام کرے گی۔ یہ جو تایا سوچ کر بیٹھا ہوا ہے نا ساری جائیداد ہتھیا لے گا تو ویسا میں ہونے نہیں دینے والا بس اک واری میرا ویاہ ہونے دے خانم سے۔ پھر اس پورے پنڈ تو کیا اگلے سات پنڈوں تک تیرے پتر جتنی زمین کسی کی نہیں ہونی۔''

''اک گل میری سن لے فیر...... مجھے خانم وڈیاں (ٹکڑے ہوئی) اچھی نہیں لگتی۔ کل کو دوجا کرواؤں گی میں تیرا۔ یاد رکھ میری۔''

''او اماں بے کار کا ویر (دشمنی) نہ پال۔ کیا کہتی ہے تجھے۔ چار پورے (نوالے) روٹی کے مانگے گی بس۔ تو اپنی خوشی کے لیے دو اور گھٹیا دیئیں۔ لیکن ویاہ میرا خانم سے ہو کر رہے گا یہ میں کہہ رہا ہوں اماں۔ لے میں آیا ذرا......''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ویسے بھی بحث طوالت کی طرف جا رہی تھی اور وہ اپنا دماغ بے کار باتوں پہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ہوٹل کا کام زوروں پہ تھا اور اسے حیات کے تیور بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ بات کھل چکی تھی کہ چوہدری آفتاب کی اس زمین پہ ہوٹل بننا شروع ہو گیا تھا جس پہ انہوں نے اپنے والدین کے نام سے مدرسہ اور مسجد بنوانی تھی۔ اس سے پہلے کہ چوہدری انور اور اس کے لڑکے بھی منہ زور ہوتے سامنے آتے وہ تعمیر جلد از جلد مکمل کروا لینا چاہتا تھا۔ بعد میں نمٹنا آسان ہوتا۔ ابھی تک سب کو وہی دکھائی دے رہا تھا کہ ہوٹل والی زمین اس اکیلے نے ہتھیائی ہے کسی کو علم نہیں تھا کہ چوہدری شہاب بھی اس میں شامل ہیں۔ اور اصل بات یہی تھی کہ وہ اب چوہدری شہاب کا نام آنے دینا ہی نہیں چاہتا تھا تاکہ کل کو جیسے ہی ہوٹل شروع وہ چوہدری شہاب کو سکون سے تمام معاملے سے الگ کر سکے۔

قاسم کے کمرے سے نکلتے ہی حمیدہ سنہری کی جانب متوجہ ہوئی جو سیاہ لباس میں سیاہ شال اوڑھے اپنی سفید رنگت اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے ساتھ حمیدہ کے دل میں اتر رہی تھی۔ اس نے پیار سے اس کی جھولتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا اور پچکارتی ہوئی بولی۔

''میری بچیے، میں سب جانتی ہوں کہ تو کس دل سے قاسم کا ویاہ خانم سے کروانے پہ راضی ہوئی ہے۔ اپنی ماسی کو معاف کر دے سنہری۔ میں نے اپنی نوہ کے روپ میں بس تجھے ہی دیکھا ہے یہ کمبخت خانم تو میری بلا سے مرے پاویں جیے۔ تو ابھی بھی مان جا تو میں تیرا ویاہ ڈنکے کی چوٹ پہ قاسم سے کرواؤں گی۔ ایسی دھوم دھام ہو گی کہ کل کو تمہاری اولادوں کو ویاہ کے قصے پنڈ والے سنایا کریں گے۔''

حمیدہ کو اب بھی یہی لگتا تھا کہ سنہری محض قاسم کی ضد سے ہار کر اس کا ویاہ خانم سے کروانے پہ راضی ہوئی ہے۔ اس لیے اسے منانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اندر کی گیم سے وہ لاعلم تھی۔ اور سنہری اپنی ماسی کی ہمدردی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی سب مہرے ہاتھ سے نکال دینے کی عادی تھی تب ہی چہرے پہ بلا کی یاسیت طاری کرتے ہوئے بولی۔

''چھڈ نا ماسی...... میں کیا اور میری خوشی کیا۔ میرا کیا ہے ماسی، میں تو کل بھی لاوارث تھی آج بھی

ہوں۔ اور ایسے ہی مرمرا جاؤں گی۔ تیرے مجھ پہ احسان ہیں بہت۔ تو نے مجھے اس حویلی میں بلا کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے تجھے خود نہیں معلوم ورنہ سنہری نے لکھ کا ککھ ہی رہ جانا تھا۔ تو میری فکریں نہ پال......بس قاسم کی خوشی کا سوچ ماسی۔ وہ خوش ہوگا نا تو میں بھی خوش ہی ہوں گی۔ اپنا دل مارنا تو میں نے بچپن سے سیکھا ہوا ہے ماسی۔"

وہ چھلے ہوئے چلغوزوں کا پھکا مارتی ہوئی دل سوزی سے بول رہی تھی۔ حمیدہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ سنہری نے اپنے کلیجے پہ پیر رکھ کر قاسم کی خاطر خانم کے رشتے کی بات مانی ہے۔ ورنہ وہ خود بھی قاسم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

حمیدہ نے ایک ہاتھ سے اس کے چہرے پہ پیار کیا اور دوسرے ہاتھ سے ریوڑیاں اٹھا کر محبت سے اس کے منہ میں ڈالیں۔

"کتنا وڈا دل ہے میری شہزادی کا۔ کوئی نا...... تیرا نصیبا بہت اونچا ہے سنہری۔ یہ خانم تو بس لا کر کھڈے ڈال دینی ہے میں نے۔ اصل تو راج کرے گی راج۔ بس تیرے کہنے پہ چلنی ہے میری حویلی سنہری۔ ہاں کہہ دیا ہے میں نے۔"

لگاوٹ سے کہتی حمیدہ کو کن اکھیوں سے دیکھتی سنہری دل میں سوچ رہی تھی۔

"صرف تیری حویلی ہی تھوڑی میرے کہنے پر چلنی ہے ماسی۔ اس پوری حویلی لکھاں کو میرے آگے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔ یہاں سنہری کا سنہرا سکہ چلے گا۔ سب کی گردنوں پر میرا پیر ہوگا ماسی۔ میرا......!"

اپنے دھیان میں مونگ پھلی اور چلغوزے کھاتی حمیدہ اگر جو اس سے سنہری کے تاثرات دیکھ لیتی تو آنے والے وقت میں اپنے ہونے والے بھیانک انجام سے شاید بچ جاتی۔ سنہری کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سانپ کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور سانپ اپنے دودھ پلانے والے کو سب سے پہلے ڈستا ہے۔

☆......☆......☆

سکینہ آدھی رات کو کشور اور حیات کے کمرے میں موجود تھیں۔ چہرہ پریشانی اور دکھ کا غماز تھا۔ ایک تکلیف تھی جو سب ہی کے سینوں پر لوٹ رہی تھی۔ کشور کی سوجی سوجی آنکھیں اس کے تادیر رونے کا پتا دے رہی تھیں۔ البتہ حیات گو کہ پریشان تھا لیکن خود کو پرسکون ظاہر کر رہا تھا۔ یہ سارا معاملہ افراتفری یا شور شرابے میں حل ہونے والا نہیں تھا۔ نہ ہی گریبانوں میں ہاتھ ڈالنے سے کچھ حاصل ہونے والا تھا۔ قاسم کے طور اطوار ہرگز ایسے نہیں تھے جس سے ثابت ہو کہ وہ کچی گولیاں کھیل رہا ہے۔ جو بھی شام کو ہوا تھا اس کے لیے زمین پہلے سے ہموار کی گئی تھی۔ کھلاڑی طے کیے گئے تھے۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا حیات کہ نہ مجھے آفتاب کی حویلی جانے دے رہا ہے تو نہ خانم کو زبردستی یہاں لاتا ہے۔ کم از کم مجھے ایک بار صورت تو دکھا اس کی۔ کیا ہوگا۔ غصہ کروں گی اس پر ناراض ہوں گی لیکن سینے سے بھی تو لگاؤں گی۔ پوچھوں گی بھی تو سہی کہ کیوں کیا اس نے ایسے۔ کون سی شکایت پیدا ہوئی بچی کو جس کا یہ نتیجہ نکلا۔ نمرہ الگ پریشان پڑی ہے کمرے میں۔ اسے تو پہلے ہی خانم کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ کل کی پوچھ پوچھ کے تھکتی نہیں۔ اسے لگتا ہے کہ کچھ ہوا ہے خانم کے ساتھ ایسا ہماری غیر موجودگی میں جو وہ ہمیں بتا نہیں رہی۔''

سکینہ کے فکر میں ڈوبے لہجے اور جھکے سر کو حیات نے گہری نظر سے دیکھا۔ کشور کی نظر بھی اس سے ملی اور حیات نے تنبیہاً اسے اشارہ کیا تاکہ وہ کچھ بھی کہنے سے رک جائے۔ جبکہ کشور چاہتی تھی کہ ساس کے سامنے ساری بات رکھے کہ خانم کے ساتھ کل کوئی حادثہ ہوا ہے جس نے اسے سب سے بدظن کر دیا ہے لیکن شوہر کی بات رد نہیں کر سکتی تھی لہٰذا ناچار خاموش رہی۔

''اماں......!'' حیات آگے ہو کر بیٹھا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ رات نکالیں کسی طرح۔ صبح تک گڈی (خانم) کو وقت دیں سوچنے کا۔ ورنہ کل خود پوچھ لیں گے ہم کہ اسے مسئلہ کیا ہے۔ لیکن آج رات آپ اسے ایسے ہی رہنے دیں۔''

''کیسے رہنے دوں حیات...... بچی اکیلی اپنی خالم خالی حویلی میں پڑی ہے۔ نہ کوئی پاس ہے نہ روٹی پانی کھائی ہے اس نے۔ کس طرح کی بات کرتے ہو۔''

"فکر نہ کریں آپ۔ قدسیہ پھپھو کی ملازمہ اور اس کی بیٹی دونوں کے بستر کشور نے وہیں ہال میں کروا دیے ہیں۔ وہیں دونوں سو جائیں گی۔ اور کھانا بھی بھجوا دیا ہے۔ بھوکی ہوئی تو ضرور کھائے گی گڈی لیکن کل سے پہلے کوئی اسے کریدنے کی کوشش نہ کرے۔"

وہ اللہ جانے کیا سوچ بیٹھا تھا۔ اس کی سوچتی نگاہیں فرش کو گھور رہی تھیں اور لہجہ بے تاثر سا تھا۔ سکینہ کو غصہ آ گیا۔

"ناں...... کل تک کون سا آسمان ڈھے جانا ہے۔ اتنا ہلکا کیوں لے رہا ہے پتر۔ ادھر وہ ماں پتر ویاہ کی تاریخ طے کر بیٹھے ہیں۔ کل اگر خانم کو لگتا ہے کہ اس نے جذباتی ہو کر یہ باتیں کہی ہیں تو منگ چھوڑے گا قاسم اپنی۔ وہ تو پہلے ہی ایسا اتھرا ہے ماں کے ہاتھ نہ آئے۔ سب کو تارے دکھا دے گا دن میں اگر اب یہ ویاہ نہ ہوا تو۔ بات پکی ہو گئی ہے پتر۔ تیرے ابا جی نے زبان دے دی ہے حمیدہ کو۔ تو ون سوتی باتیں کر رہا ہے۔"

"آپ کو جو کہہ رہا ہوں ویسا کر لیں نا اماں...... کل تک کا وقت دیں گڈی کو۔ اچھا ہی ہو گا ان شاء اللہ۔ اور رہی قاسم کی بات تو اس کا مچ مر جائے گا فکر نہ کریں۔ سارے کس بل نکل جائیں گے اماں......"

"یا اللہ!" سکینہ بے بسی اور غصے سے مغلوب ہوتے کھڑی ہو گئیں۔ کشور نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

"تم کل کے بچے اتنے سیانے ہو گئے کہ کسی بڑے کو تم لوگوں کی باتیں پلے نہ پڑیں۔ کیا کل قاسم کی یادداشت چلی جانی ہے یا حمیدہ نے حاجن بن جانا ہے۔ حیات! میری گل سن لے پتر، یہ سب اچھا نہیں ہو رہا۔"

وہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئی تھیں۔ پیچھے کشور نے غصیلی نمناک نگاہوں سے خاوند کو دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔

کشور کی ایک زوردار "ہونہہ" کمرے میں گونجی اور حیات کا دھیما لیکن جاندار قہقہہ...... اتنے وقت میں پہلی بار احساس ہوا کہ ماحول کی کثافت چھٹ سی گئی ہے۔

☆......☆......☆

رابی کی آنکھوں سے نیند جیسے اڑ گئی تھی۔ اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ اس کی اتنی جان سے پیاری سہیلی اسے بتائے بنا یا مشورہ کیے بنا ایسا غلط فیصلہ لے سکتی ہے۔ شادی اور وہ بھی قاسم سے۔ کوئی اسے زہر کھانے کو کہتا اور قاسم سے شادی کرنے کو تو وہ زہر کھانے کو ترجیح دیتی۔ اور پھر اتنی جرأت وہ بھی خانم میں، یہ بات پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ تو خود سے پینسل ربڑ تک خریدنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی اس کی کشمکش ہی نہیں جایا کرتی تھی کجا کہ یہ فیصلہ لینا کہ وہ شادی کرے گی وہ بھی محض پندرہ سال کی عمر میں اور سونے پہ سہاگہ قاسم سے......

لاؤنج میں یہاں سے وہاں ٹہلتے اس کے پیر شل ہونے کو آئے تھے۔ پہلے اپنے کمرے میں تھی اور کھڑکی سے چوہدری آفتاب کی حویلی کی جانب دیکھتی رہی تھی جہاں سے اندر جلتی بجھتی بتیوں سے پتا چلتا تھا کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے۔ خانم جس کمرے میں تھی وہ تو نہیں دکھتا تھا لیکن اس نے اپنی ملازمہ اور اس کی بیٹی کو کھانے کی ٹرے لیے اندر جاتے اور پھر ہال کمرے میں بستر کرتے دیکھا تو سکون سا آ گیا۔

خانم نے انہیں وہاں رکنے سے منع نہیں کیا تھا یہ بھی کافی تھا۔ دل تو اس کا بھی تھا کہ وہ اس کے پاس زبردستی رات رکے لیکن قدسیہ نے اسے سختی سے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ انہیں خانم پہ از حد غصہ تھا۔ وہ مکمل طور پر اس سے برگشتہ ہو چکی تھیں۔ رابی کے لاکھ سمجھانے پر بھی کہ اسے کوئی دھمکا رہا ہے اور کل حویلی والوں کی غیر موجودگی میں یقیناً کچھ ایسا ہوا ہے جس نے اسے اس قسم کا غیر معمولی قدم اٹھانے پہ مجبور کیا ہے لیکن قدسیہ ماننے سے انکاری تھیں۔ ان کے خیال میں جب ارد گرد سب ہی اپنے ہوں تو کوئی لاکھ دھمکائے وہ سب کے درمیان میں اس کا بھانڈہ پھوڑ دے۔ بتائے سب کو کہ ایسے اسے دھمکایا جا رہا ہے اور یہ فیصلہ اس سے دھونس میں کروایا جا رہا ہے تو کس کی جرأت ہے جو اتنے بڑوں کی موجودگی میں اسے گردن سے پکڑ لے گا۔

اب وہ اپنی ماں کو کیا سمجھاتی کہ سنہری کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ اس کے جیسا شیطانی دماغ سو میں سے ایک کو حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنا مقصد پانے کے لیے کس حد تک جا سکتی ہے اس بات سے وہ اور خانم دونوں بخوبی واقف ہیں۔ لیکن بزرگوں کو سمجھانے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا وہ خاموشی سے قدسیہ کے سونے کے بعد ہال میں آ کر وقت گزارتی اس معاملے کا حل سوچنے لگی تھی۔ کڑی سے کڑی جوڑتی

کیسے......؟ کیونکہ پہلی کڑی اسے خانم سے چاہیے تھی، اس کے بعد کا پزل حل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا لیکن خانم تو جیتے سے اکھڑ پڑی تھی وہ کسی سے بات کرنا تو در کنار نگاہ سے نگاہ ملانے سے بھی کترا رہی تھی۔ اس کا دل کیا تھا کاش یہاں حسنات لالہ ہوتے تو سب کو لگ پتا جاتا۔ یہ گتھی سلجھنے میں چنداں وقت نہ لگتا۔ لیکن حسنات یہاں نہیں تھا جب ہی تو سنہری اور قاسم فائدہ اٹھا گئے تھے۔

یونہی ٹہلتے ٹہلتے سر درد سے پھٹنے لگا تو چائے بنانے کچن کا رخ کرنے لگی۔ سامنے سے مدثر اپنی رضائی اوڑھے اپنے کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ اسے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا قریب آیا اور آواز دھیمی رکھتے ہوئے بولا۔

''تم بھی جاگ رہی ہو۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ خانم کی فکر ہو رہی ہے۔ حسنات مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہہ کر گیا تھا بلکہ اس نے مجھے تنبیہ کی تھی کہ میں قاسم اور سنہری کی طرف سے ہوشیار رہوں گا، مجھ سے چوک ہو گئی اور رابی...... یہاں تو ساری گیم ہی الٹ گئی ہے۔ بہت فکر ہو رہی ہے مجھے۔ حسنات آئے گا تو میرا اگلا پکڑے گا۔''

وہ صوفے پر بیٹھتا ہوا رضائی میں بھالو لگ رہا تھا۔ رابی کو ہنسی آئی لیکن ہنسنے کا دل بھی نہیں تھا۔ وہ بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا حسنات لالہ کو اس طرح پس پردہ کھیلنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ اگر کھل کر سب کو بتا دیا ہوتا تو یہ نوبت نہیں آتی نا۔ خانم کو گھیرا گیا ہے مدثر بھائی۔ وہ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں رہی۔ اور آپ......'' وہ ایک دم جارحانہ تیوروں سے اسے دیکھتی بولی۔ ''آپ کو اب خیال آیا کہ حسنات لالہ کہہ کر گئے تھے خیال رکھنے کو۔ اتنا ہی حسنات لالہ کی بات کا خیال تھا تو کل سو گئے تھے۔ حویلی میں رات کیا ہوا خبر رکھتے نا۔ اگر خانم کی فکر ہوتی تو آپ ہی کم از کم حویلی میں رکتے۔''

''اب مجھے کیا پتا تھا ایک رات کے لیے میں نہیں ہوں گا تو پیچھے سب کا دماغ ہی الٹ جائے گا۔ لیاقت نے مجھے بلایا تھا اس کی امی سیڑھیوں سے گر گئی تھیں۔ انہیں لے کر جانا پڑا مجھے ساتھ۔ اس کے گھر میں وہ اکیلا مرد ہے۔ بے چارہ مجھے بلا ہی بیٹھا تو باتیں تو نہ کرو۔'' مدثر برا مناتا ہوا صوفے پر نیم دراز ہوا۔

''ہاں ساری دنیا کو اسی رات ہسپتال جانا تھا۔ مجھے تو رات نیند آنے والی نہیں۔ خانم اللہ جانے

کیا کر رہی ہوگی اس وقت۔ وہ پہلے ہی بدگمان ہے اور ضد میں ہے۔ ابھی بھی اگر ہم نے اسے رات اس کے حال پہ چھوڑا تو وہ پکی ہو جائے گی نا کہ کسی کو اس کی پروا نہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں چپ کر کے ماموں آفتاب کی طرف چلی جاؤں۔ امی تو ویسے ہی سو رہی ہیں صبح فجر سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

"نہیں خیر، چل تو گیا ہے بہنا۔" مدثر کی نیم غنودہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چونکی۔ وہ بند ہوتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے بھنویں اچکا کر اسے پیچھے دیکھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ رابی نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو قدسیہ کھڑی تھیں۔

"میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی جو گھر سے باہر نکلی تو۔ یہ جو تجھے خانم کی ہمدردی کا بخار چڑھا ہے نا اسے اتار لے خود ہی ورنہ مجھے دو چھتر ہی لگانے پڑیں گے تو اتر جائے گا۔"

"اماں! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ کی بھتیجی ہے کیوں ایسے سلوک کر رہی ہیں۔" رابی کو واقعی دکھ ہوا تھا جبکہ قدسیہ کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہوئے۔

"وہ اسی کی مستحق ہے۔ یہ صلہ دیا ہے سب کی محبتوں کا اس نے۔ یہ رویہ رکھا جاتا ہے سب کے ساتھ؟ کیسے اتنی سی بچی اپنے منہ سے رشتے کا بک رہی تھی۔ اچھی لگ رہی تھی کیا؟"

"اماں! اس کے ساتھ مسئلے چل رہے ہیں۔ وہ دکھی ہے۔ اور سنہری نے کوئی تماشا کیا ہے ہمارے پیچھے سے اس کے ساتھ۔ ایسے ہی نہیں وہ اس طرح کر رہی۔"

"کوئی تماشا نہیں ہو یا پتر جی۔ بہانے ہیں سب اور تو اپنا منہ بند کر ورنہ تیرے پیو کو بتا دوں گی۔ چپ کر کے دونوں اٹھو اور کمروں میں دفع ہو۔ سویرے گل ہوگی اب۔ خبردار جو وہاں جانے کی تو نے سوچی تو......"

وہ کہہ کر واپس مڑ گئیں اور رابی نے بے بسی سے مدثر کی طرف دیکھا تو وہ سو چکا تھا۔ اس نے صوفے کا بھاری کشن اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا اور وہاں سے نکل گئی۔ پیچھے مدثر ارد گرد دیکھتا اپنا جبڑا سہلا رہا تھا۔

رابی جا چکی تھی اور اس کے منہ پر زوردار کشن نجانے کس نے مارا تھا۔ ہوائی مخلوق کے ڈر سے وہ

بنا لاؤنج کی لائٹیں بند کیے وہاں سے بگٹٹ بھاگا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہونے میں ابھی وقت تھا جب اس کی آنکھ لگی تھی۔ رات روتے گزر گئی تھی۔ وہ اپنی قسمت پہ روتی یا دنیا کی بے رخی پر۔ اس کے سر سے ماں باپ کا سایہ چھن چکا تھا۔ اس کا درد سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ بہن کو وہ بتاتی تو کیا۔ اس تصویروں والے رول کو بھلا سنہری سے چھیننے کی طاقت کس میں تھی۔ اس ڈھائی انچ کے رول میں اس کی عزت بند تھی۔ جس کا ڈھونڈورا سنہری پیٹنے کو تیار بیٹھی تھی۔ وہ کسی کو بتاتی تو کن الفاظ میں۔ ہر بات کے آگے سوالیہ نشان بن کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔

انہی سوچوں میں گھری وہ نا جانے کب سوئی تھی اسے خبر نہیں تھی۔ پیٹ خالی تھا اور اس کی گڑگڑاہٹ اسے سکون سے گہری نیند سونے نہیں دے رہی تھی۔ لیکن کھانے کو دیکھنے کا دل بھی نہیں کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کروٹ کے بل سوتی جاگتی سی پڑی رہی جب رات کے کسی پہر اسے اپنے کمرے میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے حواس نیند سے مغلوب تھے اس لیے فوری ردعمل نہیں دیا لیکن وہ آہٹ آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی چلی گئی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول لیں مگر جسم میں جنبش بھی نہیں ہونے دی۔ ہلنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی کیونکہ خوف نے اسے یکدم مفلوج کیا تھا۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی لیکن طاقت نہیں تھی۔ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز بند تھی۔ اسٹور روم میں گزری رات اور سنہری کا کیا تشدد نگاہوں کے سامنے چکرانے لگا۔

کیا سنہری ہی آئی ہے دوبارہ اس کے پاس؟ اس سوال کے ابھرتے ہی اس کا دل چاہا کہ یکدم پلٹ کر اسے جھپٹ لے۔ اتنا مارے، اتنا مارے کہ وہ مر جائے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت ہوتی تو اسی دن نہ دکھا دیتی۔ اسے اپنے اکیلے یہاں سونے پہ افسوس ہوا تھا۔ کیا تھا جو کشور آپا کو یا رابی کو بلا لیتی۔ لیکن سنہری کی دھمکی جو اس نے اس کی گردن دبوچتے ہوئے دی تھی وہ اچانک یاد آ گئی۔

”تم خود سب سے کہو گی کہ اکیلی یہاں رہنا چاہتی ہو۔ اگر کسی کو میں نے تمہارے آس پاس منڈلاتے دیکھا تو یقینا کرو خانم، میں تمہیں دھمکانے نہیں آؤں گی، سیدھا یہ رول لے کر پنڈ کے سب سے سیانے منڈے کے پاس جاؤں گی۔ سورج چڑھنے سے پہلے تمہاری عزت کا چن چڑھ چکا ہوگا۔ سمجھی۔“

اس کے بعد وہ کس طرح کسی کو اپنے پاس روکتی۔ اس نے کرختگی اختیار کی اور سب سے روٹھ کر خود کو اکیلا کر لیا۔ اس کی قسمت کا فیصلہ سنہری کو کرنا تھا جو وہ چاہتی ویسا ہی ہونا تھا تو کیا فائدہ کسی کو اپنی تکلیف کہہ دینے کا، جب سنہری نے طے کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ خاموشی سے آنے والے وقت کا نزدیک ہوتی آہٹوں کے ساتھ انتظار کرنے لگی۔ چاپ قریب آتی گئی اور وہ ساکت پڑی سرد ہوتے وجود اور چوپٹ کھلی آنکھوں کے ساتھ مخالف سمت لی کروٹ کے بل پتھرائی آنکھوں سے آنسو گرا رہی تھی۔ جو بہتے ہوئے اس کی کنپٹی کی طرف جا رہے تھے۔ تب ہی اچانک کسی نے اس کے قریب ہوتے کان کے پاس اپنی سانس کا لمس چھوڑا۔ خانم نے لب بھینچتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"اے...... اٹھو، جاگو۔" اس کی سماعت میں یہ آواز پڑی اور وہ اتنی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھی کہ آنے والے کے ناک سے ٹکرائی۔ مقابل اپنی ناک پکڑ کر دہرا ہوتا پرے ہوا۔ اور پھر چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا کہ کہیں خون تو نہیں نکل آیا۔ خانم نے منہ پہ ہاتھ رکھتے چیخ روکی اور کپکپاتے جسم اور پھٹی آواز کے ساتھ اس کے لب سرسرائے۔

"آپ...... یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یہاں آنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ سب جانتے تھے کہ وہ اکیلی تھی یہاں۔ اسے لگا کہ ابھی کسی کونے سے سنہری نکل آئے گی اور اسے شور مچا کر رسوا کر دے گی۔ ایک نیا کھیل کھیلے گی اور جیت جائے گی۔ مقابل نے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ خانم کو یقین ہو گیا کہ اس رات کی صبح اس کے نصیب میں نہیں......!

ناول گنوا کے دل و جاں ہم کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 18

میں نفرتوں کے جہاں میں رہ کر، جدا رہوں گا تو کیا کروں گا
یہ ٹھیک کہتے ہو بے وفا ہوں، وفا کروں گا تو کیا کروں گا
بس ایک تو ہی تو رہ گیا ہے، جہاں سارا تو کھو چکا ہوں
تجھے بھی اپنی انا میں آ کر، خفا کروں گا تو کیا کروں گا
ہزار سجدے تو کر چکا ہوں، قضا تمہاری محبتوں میں
میں اب دکھاوے کا کوئی سجدہ ادا کروں گا تو کیا کروں گا
بغیر پانی بھی کوئی مچھلی بھلا کبھی رہ سکی ہے زندہ
میں تجھ کو کھو کر، کسی کا ہو کر، بتا کروں گا تو کیا کروں گا
(محسن نقوی)

حویلی لکھاں کی فضا میں نامانوس سی خاموشی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بس کوئی طوفان آیا سو آیا۔ سردیوں کی ٹھنڈی برف، کہرے میں ڈوبی راتیں تھیں اور دن بھی دھند لکے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا سست روی سے گزر جاتا تھا۔ جوڑوں میں گھستی ٹھنڈ سب کے لیے امتحان بنی رہتی تھی۔ جگہ جگہ جلتی انگیٹھیاں بھی تپش پیدا کرنے میں ناکام رہتی تھیں۔ اسی صورت حال میں دن سے رات ہوتی تو لحافوں میں گھس کر ہی سکون آتا تھا۔ ایک باورچی خانہ واحد جگہ تھی جہاں ہر وقت موجود رہنے والی حدت بہت اچھی محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج حویلی لکھاں کی صبح کسی راز کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پردہ پڑا، ہٹنے کو ہے۔

کشور اور سکینہ ستے چہرے لیے نمرہ کے کمرے میں موجود تھیں۔ نمرہ کے لیے خاص خوراک کا اہتمام سکینہ خود کرتی تھیں اور کشور نہایت دل جمعی سے ٹرے سجا کر اس کے لیے لایا کرتی تھی۔ لیکن آج یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں کوئی موجود ہی نہیں۔ کسی کسی وقت نمرہ کے پہلو میں لیٹے اس کے بچے کے کسمسانے کی ننھی سی آہٹیں سنائی دیتیں اور نمرہ دھیرے سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پچکار دیتی۔ اکتا کر اس نے گود میں رکھی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ساتھ ہی کرسی پہ بیٹھی ماں کو دیکھا۔ سکینہ تسبیح کے دانے گراتے کسی گہری سوچ میں گم تھیں اور کشور، نمرہ کی پائنتی سر جھکائے بیٹھی کارپٹ کو گھورتی الگ ہی دنیا میں کھوئی تھی۔

"اماں! مجھے ایک بات کہنی ہے۔"

سکینہ ایک دم چونکیں اور استفہامیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ کشور نے بھی نڈھال ہوتی پلکیں اٹھائیں۔ نمرہ دونوں کے چہرے جانچنے لگی۔ آیا جو کہنے لگی ہے، کہے یا نہ کہے۔

"کیا ہوا میری بچی؟" "کچھ چاہیے تو بتا نا؟ کشور ابھی بنا لاتی ہے۔" سکینہ نے سائیڈ پہ رکھی ٹرے دیکھ کر کہا جس میں سے نمرہ نے کچھ خاص نہیں کھایا تھا۔

"نہیں اماں، ابھی کچھ دیر تک یہی ختم کروں گی، مزید کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے ویسے ہی بات کرنی ہے۔ لیکن بغیر رولے رپے کے سننا اماں...... بات ابھی یہاں سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

نمرہ کا انداز سکینہ کے دل میں گرہیں ڈال گیا۔ پہلے کم ہول پڑ رہے تھے جو اب ایک اور بلی تھیلے سے باہر آنے کو بے تاب تھی۔ سکینہ لاچاری سے بولیں۔

"کہہ لے تو بھی...... کہہ لے نمرہ۔ اس حویلی کو تو نظر ہی کھا گئی ہے۔ آفتیں جیسے کرلیوں (چھپکلیوں) کی طرح اینٹوں کی کھڈوں سے باہر نکل رہی ہیں۔ ایسے سیاپے میں زندگی آئی ہے کہ حرام ہے جو کوئی دن سکون کا لنگے۔"

''اچھا تو میں نہیں بتاتی اماں۔ میری بات سن کر آپ پریشان ہی ہوں گی۔ چھوڑیں دفع کریں۔''

''مجھے بتائیں نمرہ آپا۔ مجھے سننی ہے۔'' کشور جھٹ سے بولی مبادا نمرہ ارادہ بدل لے۔

نمرہ نے دوبارہ ماں کو دیکھا تو ان کے چہرے پہ بھی آمادگی کے تاثرات تھے۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے ذہن میں الفاظ اکٹھے کیے۔

''اماں! اس دن جس وقت میں بے ہوش تھی مجھے کدھر سے اٹھایا تھا آپ لوگوں نے؟''

''آئے ہائے......!'' سکینہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ''میرا تراہ ہی نکال دیا تو نے نمرہ۔ جب میں پہنچی تھی اس وقت تو باہر صحن میں منجی پر تھی۔ حمیدہ کی کام والی زرینہ اور دوسری جو ہے وہ کیا نام ہے اس کا جسے ابھی چار دن ہی ہوئے ہیں لگے ہوئے، ہاں نصرت......انہوں نے بتایا کہ تو صحن میں منہ بھار (منہ کے بل) گر گئی تھی۔ دونوں نے اٹھا کر منجی پہ ڈالا۔ اس کے بعد ہم سیدھے تجھے ہسپتال لے کر بھاگے۔ شکر میرے رب کا اللہ نے کسی بڑی مشکل سے بچا لیا۔''

سکینہ تفصیلاً جواب دینے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑے شکر ادا کرنے لگیں۔

نمرہ نے افسردہ مسکراہٹ لیے ماں کو دیکھا اور بولی۔

''اماں......! میں وہاں صحن میں بے ہوش نہیں ہوئی تھی، حمیدہ چاچی کی راہداری میں گری تھی اور مجھے گرایا گیا تھا اماں...... مجھے کوئی چیز اڑا کر گرایا گیا تھا اماں، اور جب میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اس وقت میرے پاس چلتا ہوا پتا ہے کون آیا تھا؟''

''ک......کک......کون......؟'' سکینہ کی آواز لڑکھڑائی۔ ان کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔

کشور بھی منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی حیرت پہ قابو پا رہی تھی۔

''سنہری...... مجھے سنہری نے گرایا تھا اماں۔ اور وہی اس وقت منہ ڈھانپے کالی چادر کے ساتھ چلتی میرے پاس آئی اور پھر چادر ہٹا کر اتنے سکون سے پراندہ جھلاتی میرے قریب کھڑی ہوئی تھی اماں، کہ ایک منٹ کے لیے مجھے لگا کہ مجھے قتل کرنے والی ہے۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے

اماں، انہوں نے مجھے میری تکلیف بھلا دی تھی۔ اس قدر سفاکانہ، اس قدر ظالمانہ کہ ابھی بھی سوچوں تو جھرجھری آتی ہے۔ اس بے رحم نے میری گردن پہ اپنا پیر رکھا اور دباؤ ڈالا اماں...... میرا دم پہلے ہی گرنے کی وجہ سے الجھا ہوا تھا۔ اس وقت تو یوں لگا جیسے نکل ہی چلا ہو۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو اللہ کا شکر ہے میرا بچہ خیریت سے تھا۔''

نمرہ کی آنکھیں نم ہوئیں اور وہ دکھ اور سکون بھرے تاثرات لیے اپنے پہلو میں لیٹے بچے کو دیکھنے لگی۔ سکینہ کے جسم سے جیسے سارا لہو نچڑ گیا تھا۔ کشور بھی ایک لفظ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ یہ تو صاف قاتلانہ حملہ تھا۔ نمرہ کی جان لینے کی مکمل کوشش یا پھر اس کوشش کے پس پردہ کچھ اور ترتیب دیا گیا تھا۔ کشور ایک دم سے منہ پہ دوپٹا رکھے پھپھک پھپھک کر رو دی۔ سکینہ نے اٹھ کر اسے سینے سے لگایا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ اسے بھی یقین ہو گیا ہے کہ خانم کے ساتھ ہوئے سارے معاملے میں سنہری کا ہی ہاتھ ہے۔ وہ اس کے نرغے میں پھنس چکی ہے۔ اس دن نمرہ کے ساتھ ہوئے اس حادثہ کی ذمہ دار سنہری تھی تو سب کے ہسپتال جانے کے بعد اس کریہہ اور مکار لڑکی نے خانم کے ساتھ کیا نہیں کیا ہو گا۔ سکینہ کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ کشور کو دلاسا دیتے خود بھی نڈھال سی کرسی پر ڈھے گئیں۔

''اماں! کشور...... ! ایسے پریشان ہونے کے لیے نہیں بتایا میں نے آپ کو۔ بلکہ اس لیے بتایا ہے کہ جو کہانی آپ سب مجھے سنا رہے ہیں کہ خانم نے یہ کر دیا، وہ کر دیا۔ قاسم کے لیے ہاں کر دی۔ کسی سے کلام نہیں کر رہی۔ کسی کی شکل نہیں دیکھ رہی تو انہی سب باتوں کو سننے کے بعد آپ کو یہ بتایا ہے کہ خانم کے ساتھ سنہری اور قاسم کوئی بہت بڑی چال کھیل گئے ہیں جس میں حمیدہ چاچی بھی شامل ہیں۔ ورنہ کیا ہمیں نہیں معلوم اپنی خانم کا جو خود سے جوڑا نہیں چُن سکتی، بر چنے گی۔ اور دکھ تو یہ ہے کہ آپ سب ہی اس سے بدظن ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ نہیں بولتی، نہ بولے...... نہیں شکل دیکھتی، نہ دیکھے...... آپ لوگ اس کے گرد تو رہتے نا۔ اسے یہ سوچنے کا موقع کیوں دیا کہ جو وہ سوچ رہی ہے وہی حقیقت ہے۔ اس کے وہموں کو سچ کر دیا سب نے۔ وہ چھوٹی سی نازک سی بچی کیا زبردستی دھونس سے سینے سے لگائی نہیں جا سکتی تھی۔ اسے کوئی تو اپنے سینے کی گرمی دیتا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو لیتی۔ اپنا غبار نکال لیتی تو

سارا سچ فرفر اس کی زبان سے نکل آنا تھا۔ لیکن آپ لوگ اسے حویلی میں اکیلا چھوڑ آئے۔ کاش میں چل کے جاسکتی تو ایک منٹ نہ ٹھہرتی۔ اماں......" نمرہ کو سانس چڑھ گیا تھا لیکن اس کے پاس ابھی کہنے کو بہت کچھ تھا۔ سکینہ سے مخاطب ہوئی۔ "ایک بار دل پہ ہاتھ رکھ کر کہیں کیا مجھے ایسے تنہا چھوڑ سکتی تھیں آپ، چاہے آپ کو ابا بھی منع کرتے۔ بتائیں؟"

اور سکینہ کے پاس اس کی بات کا جواب ہوتے ہوتے ہوئے بھی وہ لاجواب ہو گئیں۔ یقیناً تب ان کا ردعمل کچھ اور ہوتا۔ ان کے ماتھے پہ نمی چمکی۔ ان کا سر جھکنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے کرسی کو تھام کر مٹھیاں بھینچ لیں یہاں تک کہ انگلیوں میں دبے تسبیح کے دانے خون کی گردش واضح کرنے لگے۔

نمرہ نے کشور کو دیکھا تو اس کے لبوں کا ارتعاش ہی اس کا جواب تھا۔ پھر بھی نمرہ اس سے بولی۔

"کشور......! تم نئے رشتے میں جڑی ہو۔ تمہیں ہر وقت فکر رہتی ہے کہ کہیں کوئی تم سے ناراض نہ ہو۔ حویلی کی بڑی نوہ ہونے کے ناتے ہر ذمہ داری تم اچھے سے پوری کرسکو۔ سب کا خیال رکھتی ہو، میرے لیے بھی جان مار رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اگر ابھی تم اپنے میکے میں ہوتیں اور خانم ایسی حالت میں تمہاری سامنے ہوتی تو کیا تم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آجاتیں۔ کیا اس کو کریدے بنا اس کے پاس سے ہٹ جاتیں...... کبھی نہیں نا......؟ تو اب سوچو کہ خانم کے اس طرزِ عمل کے پیچھے ہم سب کے سب کہاں کہاں قصوروار ہیں؟ جس سنہری نے میرے ساتھ اتنا بڑا حادثہ کر دیا، جسے پہلے دن دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ حویلی لکھاں کو سیندھ لگ گئی ہے، اب یہ لڑکی اس حویلی کا چین و سکون غارت کر کے رہے گی۔ اس نے مجھے مار دینے میں کسر کوئی نہیں رکھی تو خانم اس کے پاس پیچھے بالکل اکیلی تھی۔ اتنی اکیلی کہ اس کا سایہ بھی اس سے کوسوں دور تھا تو ایسے میں اب یہ صرف سنہری کو پتا ہے یا خانم کو کہ پیچھے کیا ہوا اور کس بات نے خانم جیسی چڑیا سا دل رکھنے والی کو ایسی بات کہنے پہ مجبور کر دیا۔"

نمرہ تھک گئی تھی۔

اس نے پیچھے ٹیک لگالی اور اپنے بچے کو اٹھ کر گود میں بھر لیا۔ اس دن کا اپنے گرنے کا منظر اب بھی اس کے پورے جسم میں جھرجھری پیدا کر دیتا تھا۔

سکینہ خاموشی سے اٹھیں اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ ٹوٹے قدموں سے کمرے سے چلی گئیں۔ کشور بھی جانے لگی تو نمرہ نے پکارا۔

"کشور! سیدھی خانم کے پاس جاؤ اور جیسے تیسے اسے وہاں سے نکالو۔ جب تک اس کا اعتماد بحال نہیں ہوگا کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اور وہ سب سے متنفر ہو جائے گی۔"

کشور نے سر ہلا دیا اور وہاں سے چلی گئی۔ نمرہ تاسف سے اپنی ماں کی خالی کرسی کو دیکھنے لگی۔ اس کے اندر آنے والے وقت کی فکر گھر کر گئی تھی۔ اسے تو یہاں سے چلے جانا تھا چند دن میں لیکن پیچھے یہ سنہری کیا کچھ کرنے کے درپے تھی اس کا خوف ابھی سے اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

پوری حویلی لکھاں میں کہرام مچا تھا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ ملازماؤں کے کانوں تک پہنچنے سے بچانے کے لیے جتنا ہو سکے بات کو دبایا جا رہا تھا لیکن کب تک...... آخر انہیں ہی کہنا تھا کہ وہ پوری حویلی چھان ماریں اور خانم کو ڈھونڈیں۔ خانم پوری حویلی میں کہیں نہیں تھی۔ ہر طرف ڈھنڈیا مچ گئی تھی۔ قدسیہ پھپھو کی حویلی میں بھی دوڑ لگ گئی تھی۔

رابی سب سے پہلے ہلا بولتی حمیدہ کی جانب آئی تھی۔ اس کے ہر شک کی بنیاد ہی یہیں پہ دفن تھی۔ کشور پہلے ہی اس کی طرف سے دکھی تھی اس وقت اس کی مزید حالت بگڑ رہی تھی۔ رہ رہ کر خانم کا ستا ہوا نڈھال چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا اور اسے اذیت کے سمندر میں غرق کرتا جا رہا تھا۔ اس نہج پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا جس طرف زندگی اسے گھسیٹ لائی تھی۔ اس کی اپنی بہن اس قدر تکلیف میں تھی اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ ہر طرف ڈھونڈ لیا تھا لیکن خانم نہیں مل رہی تھی۔ قدسیہ پھپھو کے بیٹے بھی حویلی میں نہیں تھے ورنہ انہی کو دوڑایا جاتا تو وہی ڈھونڈتے۔ حیات بھی پنڈ سے باہر گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس سے کہا جائے کہ خانم لاپتا ہے۔

تھک کر سب عورتیں سکینہ کی طرف ہال کمرے میں جمع ہو گئی تھیں۔ شہاب الدین بھی ڈیرے سے لوٹ آئے تھے اور مرکزی پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے طرے سے بیٹھے تھے۔ ان کی

مونچھوں کو بل دیتی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ آنکھوں میں ناقابل فہم سے تاثرات تھے۔ نہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مسکرا رہے ہیں نہ محسوس ہو رہا تھا کہ سنجیدہ ہیں۔ عجیب گومگوں سا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ حمیدہ بڑھ چڑھ کر بولتے سب کے کانوں میں سوراخ کیے دے رہی تھیں۔

''مینو پتا سی۔ یہ سب ہونا ہی ہونا ہے۔ حمیدہ کوئی کام شروع کرے اور میرا شریکا اسے توڑ (مکمل) چڑھنے دے۔ لگا دی نا میرے منڈے کی خوشیوں کو نظر...... لچھن تو اس حرافہ کے کبھی اچھے نہیں تھے پھر بھی...... پھر بھی میں نے اس پر ترس کھایا۔ اس یتیمنی کو اپنے گھر کی عزت بنایا۔ لیکن ناں جی...... میری بھل (بھول) تھی جی...... کبھی آسمان کو بھی ٹاکی لگی ہے۔ دکھا گئی ہتھ۔ لگا گئی چوہدریوں کی پگ کو داغ...... ہائے میرے پتر کو کہیں منہ دکھانے جوگا نہیں چھوڑا۔''

حمیدہ کے نوحے عروج پر تھے۔ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر خانم کو کوسنے دیتے سب ہی کو زہر سے بری لگ رہی تھیں۔

قدسیہ ہر بار کی طرح یقیناً اس کا منہ توڑتیں لیکن طبیعت اس قدر اچاٹ تھی کہ جی ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی کے منہ لگیں۔ خانم کی فکر نے انہیں بھی ہراساں کر دیا تھا۔ دل کو ملال نے گھیر لیا تھا۔ نا جانے اکیلی بچی پہ رات کیا بیتی، کہاں چلی گئی وہ۔ اگر انہوں نے رابی کو اس کے پاس جانے دیا ہوتا تو دوسرا بات رہتی۔ وہ سر جھکائے خانم کے ملنے کی دعا کر رہی تھیں۔

سکینہ الگ سر ہاتھوں میں گرائے ہوئے تھیں۔ پنڈ میں بات پھیلتے وقت نہیں لگتا تھا۔ اگر کسی کو پتا چلا تو بات دوسرے پنڈوں تک جائے گی۔ اور حویلی لکھاں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کیا جائے۔ اسی ادھیڑپن میں حمیدہ کی بک بک کو کوئی درخور اعتنا نہیں جان رہا تھا۔ سب ہی کو اس وقت خانم کی فکر تھی۔ تب ہی قاسم وہاں داخل ہوا۔ غصے سے لال بھبوکا چہرہ لیے اس کا جارحانہ انداز جہاں سب کو ٹھٹکا گیا، وہیں حمیدہ شیر ہو گئیں۔

''آ پتر، بڑے ویلے پر آیا ہے۔ نس گئی وہ کرم سڑی۔ یا انہوں نے نسا دی۔ ساری حویلی پھرول لی ہے لیکن کہیں نہیں ہے خانم کمینی۔'' ان کے جملے کے ہر لفظ میں خانم کے لیے زہر بھرا تھا۔

قاسم نے انہیں اپنے ساتھ لگا کر دلاسا دیا اور شہاب الدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا بالکل سامنے رکھی کرسی پر ٹک گیا۔

''ہاں تایا......'' انداز تخاطب انتہائی بے ادب تھا۔ شہاب الدین نے پہلو بدلا۔ ''کیا کہا تھا میں نے......؟ بولا نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہتھ نہ دکھانا ورنہ میں تارے دکھا دوں گا۔ کہا تھا نا تایا؟''

شہاب الدین کا دماغ پہلے ہی گرم تھا۔ بغیر لحاظ کے بولے۔

''مجھے تارے دکھانے کے بجائے اپنی فکریں کر قاسم۔ بہتیری دیکھ لی تیری ٹیں...... تجھے عزت دی تھی میں نے لیکن راس نہیں آئی اور جو میرے دیے کی قدر نہ کرے اس سے میں وہ چیز واپس کھولیتا ہوں۔''

''او آپ کی عزت کی ایسی کی تیسی تایا...... میں نے کہا تھا خانم کے ساتھ ویاہ ہوگا میرا، تو ہوگا۔ وڈی کی باری میں خاموش رہ گیا، اب نکی کی دفعہ بھی مار میں ہی کھاؤں؟ وجہ...... کس کھاتے سرکار......''

سب حیران پریشان تایا بھتیجے کی گفتگو سن رہے تھے۔ جس میں ایک دوسرے کا لحاظ تھا ہی نہیں۔ یوں کہا سنا جا رہا تھا جیسے ہم عمر ہوں۔

''کون سی مار کھائی ہے تو نے پتر......؟ تیری ہی تو ساریاں گھی میں ہیں۔ گھی کا پیالہ ڈیٹھ (پی) کر بھی بُل تیرے سوکھے کے سوکھے ہی ہیں۔''

قاسم ایک دم آپے سے باہر ہوتا کھڑا ہوا۔ ادھر چوہدری شہاب الدین بھی کھڑے ہو گئے۔ عورتوں کے منہ سے ہلکی پھلکی چیخیں نمودار ہوئیں سوائے حمیدہ کے جو قاسم کو ہلاشیری دینے کے لیے اس کی پشت پر آ کھڑی ہوئیں۔

''میرے پتر کو اکیلا نہ سمجھنا بھائی۔ یہ کلا تم سب ہی پہ بھاری ہے۔ بتا پتر، ذرا اپنے تائے کو کہ قاسم کس کا خون ہے؟''

سکینہ نے تاسف سے حمیدہ کو دیکھا جو بجائے بیٹے کو عقل دینے کے اس کی کم عقلی کو ہوا دے رہی تھی۔ وہ شدت سے دعا کر رہی تھیں کہیں سے حیات آ جائے۔

''شیر کو اپنی نسل بتانے کے لیے دھاڑنا نہیں پڑتا اماں...... یہ تو لگڑ بھگوں کا کام ہے جو پیچھے

سے وار کر کے اپنے کم نسل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔"

"اوئے بے ہدایتا......"

چوہدری شہاب الدین غصے سے چنگھاڑتے اس پر پل پڑے۔ جواباً وہ بھی تائے کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے والا تھا کہ عین اسی وقت سب کے سروں پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ دونوں کے عین درمیان پیروں کے بیچ کسی نے پوری طاقت سے سنہری کو لا پٹخا تھا۔ جس کا سوجا ہوا منہ اور ماتھے سے رستا خون سب کے ہوش اڑا گیا تھا۔ خود وہ سامنے کی جانب بندھے ہاتھوں، انتہائی بدبودار اور غلیظ لباس کے ساتھ عبرت بنی بے بس نظروں سے قاسم اور حمیدہ کو تکے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

"ایک رات پہلے......"

خانم متوحش سی یک ٹک سامنے کھڑے حسنات کو دیکھے جا رہی تھی جو آنکھوں میں حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات لیے اپنی پری کی خستہ حالی دیکھتا دنگ تھا۔ ایسا تو نہیں چھوڑ کر گیا تھا وہ اسے۔ کس مشکل سے چپ کی بکل سے نکال کر گیا تھا۔ کیا پتا تھا واپسی پہ وہ شہر خموشاں کی باسی دکھائی دے گی۔

خانم پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب پر سکون تھی۔ لاشعوری طور پر حسنات کو دیکھ کر دل کے اندر تک اطمینان گھر کر گیا تھا۔ اچانک سے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا محافظ آ گیا تھا۔ وہ تیور بگاڑتے ہوئے واپس بستر پر بیٹھ گئی اور لحاف اپنے ایک کندھے پہ اوڑھتے ہوئے حسنات سے روکھے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں...... چلے جائیں یہاں سے ابھی کے ابھی......نہیں ملنا میں نے کسی سے۔" اس کی آواز ٹھنڈ اور جذبات کی یورش کے باعث کپکپا رہی تھی۔

حسنات سنبھلتے ہوئے آگے بڑھا اور پنجوں کے بل بیٹھ کر اپنا وزن ایک پنجے پہ ڈالتا ہوا بولا۔

"مجھ سے بھی نہیں ملنا؟ اتنی دور سے آدھی رات کو آیا ہوں تو تم مجھے کہتی ہو ملنا نہیں۔ واہ واہ......! تم نے کہہ دیا پری یہ......تم نے......چلو کوئی بات نہیں۔ چلا جاتا ہوں واپس ابھی کے ابھی۔ صبح

کسی سے نہ کہنا کہ حسنات آیا تھا۔ جس خاموشی سے آیا ہوں، ویسے ہی جا رہا ہوں۔ اللہ حافظ!'' وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہتے گھٹنوں پہ زور دیتا کھڑا ہونے لگا تھا کہ اچانک خانم بول پڑی۔

''رکیں......''

حسنات تھم گیا اور بھنویں اچکاتا اسے دیکھنے لگا۔ خانم کو سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ جب الفاظ نہیں ملے تو ایک دم دونوں ہاتھ آنکھوں پہ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنا تکلیف سے روئی کہ حسنات کی آنکھیں بھر آئیں۔ آیا وہ اتنے کرب سے گزر رہی تھی۔ اس کا رونا عام رونا نہیں تھا۔ ایسا رونا کسی لاچار و بے بس کا ہوتا ہے۔ کسی بے آسرا کا ہوتا ہے۔ کسی مظلوم کا ہوتا ہے یا پھر کسی تنہا کا۔

اس نے کچھ دیر اسے رونے دیا اور جب خانم رو رو کر تھک گئی تو ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلتی شکایتی نگاہوں سے حسنات کو دیکھنے لگی جو ابھی بھی اسی پوزیشن میں بیٹھا اس کے متورم اور مدقوق چہرے کو دیکھ کر ضبط کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ وہ خانم کے یوں بے حال ہونے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن چاہتا تھا خانم خود منہ سے بولے مگر اس کے لب محض کپکپا کر رہ جاتے تھے۔ حسنات کو رتی بھر وقت درکار نہیں تھا یہ سمجھنے میں کہ خانم کی یہ حالت کیوں اور کس وجہ سے ہے۔ وہ اس کے ملگجے حلیے سے نگاہ چراتا صرف دو لفظ بولا۔

''پری...... سنہری نا؟''

خانم نے جواباً گیلی بھرائی نگاہوں سے اسے دیکھا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ حسنات کو اتنا بھی پوچھنے کی حاجت نہ تھی لیکن حجت تمام کرنا لازم تھا کیونکہ اب جو وہ کرنے والا تھا، سنہری کے ساتھ...... اس پر وہ پچھتانا نہیں چاہتا تھا۔

''مجھ سے کچھ بھی مت چھپانا پری...... مجھے ایک ایک پل جاننا ہے کہ تم پر کیسے بیتا......؟''

اس کے لہجے میں سختی اور تنبیہہ تھی۔ وہ سرد انداز لیے اسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا کہ خانم چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لبوں کو حسنات کی وہاں موجودگی نے جرأت دے دی تھی۔ اور رات بھیگنے سے پہلے خانم اسے ہر بات بتا چکی تھی۔ اس کی پیشانی کی پھولی رگیں اور چہرے کی پر جلال

رنگت اس کے ضبط کا پتا دے رہی تھی۔ وہ اگر جان سے مار دینے کا اختیار رکھتا تو قاسم اور سنہری کو آگے پیچھے کھڑا کر کے ایک ہی گولی سے بھون دیتا۔ اس نے خانم کو اپنے واپس آنے تک وہیں رکنے کا کہا اور خود خاموشی سے تاریکی میں باہر نکل گیا۔

یہ رات کتنے دن بعد ایسی نصیب ہوئی تھی جب خانم سکون سے سو گئی تھی۔ اچھی طرح سر تک لحاف اوڑھنے کے بعد اسے چند لمحے لگے تھے اور وہ نیند کی وادی میں اتر گئی تھی کیونکہ اسے علم تھا وہ اب محفوظ ہے۔ حسنات اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

☆......☆......☆

وہ گہری نیند سو رہی تھی جب اس کے دروازے کو ہلکے ہاتھوں سے کسی نے بجایا۔ پہلے اسے اپنا وہم لگا لیکن حواسوں میں آنے تک دستک تیز ہو گئی تو وہ تیر کی طرح اپنے بستر سے نکلی اور دروازے کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''کون ہے؟'' اس کی آواز ہلکی تھی۔ دل کو یقین تھا قاسم آیا ہو گا۔ کمینی سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ آدھی رات کو بھی قاسم کو اپنے مسائل کے حل کے لیے وہی یاد آتی تھی، اس کی ضرورت تھی۔ باہر سے زنانہ آواز میں دروازہ کھولنے کا کہا گیا تو اس نے حیران ہو کر چٹخنی اتاری اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ایک طرف زرینہ کھڑی ہاتھ مسل رہی تھی اور چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔

''بی بی جی...... وہ خانم نے لگتا ہے کچھ کھا لیا ہے جی، وہ ہل ہی نہیں رہی۔ ایسے موئی پڑی ہے جیسے مردار ہو۔ نہ کھانا کھایا رات کو...... مجھے تو لگتا ہے کم پے گیا ہے بی بی جی۔''

''کیا بکواس کر رہی ہے تو......؟ اتنی جلدی نہیں مرنے والی...... اس کی ہڈی اتنی نرم نہیں۔ دو تھپڑیاں لگانی تھیں، اٹھ جاتی۔'' سنہری کا موڈ بیڑا غرق ہو گیا۔ غصے سے غراتی ہوئی بولی۔

''بی بی جی، کیا لگاؤں جی، وہ تو جی کھلی آنکھوں سے پڑی ہے۔ پلک تک نہیں جھپک رہی۔ سانس تک نہیں نکلتی محسوس ہو رہی ناک سے۔ جلدی چلیں بی بی جی، میں ماڑا بندہ ہوں میرے پہ نام آ گیا تو کس سے کہوں گی؟''

سنہری کے دل میں فکر سی جاگی لیکن ظاہر نہیں ہونے دی۔ اکتاہٹ اور بے زاری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ واپس مڑی اور چپل پہنتے ہوئے بولی۔

"وقت سے پہلے ہی مر مرا تو نہیں گئی کمین۔ ابھی تو کام باقی ہے۔ ایویں ڈرامے کر رہی ہو گی۔ شوقین بہت ہے سکتے میں جانے کی۔"

کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ بند کرتی زرینہ کو آہستگی سے پیچھے آنے کا اشارہ دیتی بے پیر حویلی سے باہر نکلی اور چوہدری آفتاب کی حویلی کا رخ کیا۔ باہر کڑاکے کی سردی تھی اور دھند اتنی شدید تھی کہ ادھ فٹ تک کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سنہری کو بے حد اچنبھا ہوا کہ زرینہ ایسی اندھی دھند اور کڑاکے کی سردی میں آئی کیسے تھی۔ اس میں تو مزید آگے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور بولتی ہوئی زرینہ کی طرف پلٹی۔

"آگے لگ زرینہ......اتنی سخت دھند اور ایسا گہرا اندھیرا......"

بقایا الفاظ منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ زرینہ وہاں نہیں تھی۔ ایک پل کو سنہری کی چھوٹی سانپ جیسی آنکھیں پھیلی تھیں۔ خوف نے اسے بری طرح جکڑا تھا۔ پیروں میں ہلنے تک کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرنا چاہ رہی تھی کہ اس وقت کسی نے پیچھے سے بے حد موٹا بدبودار ترپال اس کے اوپر ڈالا اور وہ بری طرح اس میں جکڑی سٹپٹانے لگی۔ ایسی خوف ناک صورت حال تھی جیسے اسے زندہ قبر میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس نے ہاتھ مار مار کر کوئی سرا تلاشنا چاہا لیکن کسی نے اس کی ٹانگ کو زوردار ٹھوکر مارتے گرا دیا تھا اور پھر اسی ترپال کے ساتھ اچھی طرح لپیٹنا شروع کیا۔

سنہری چلا بھی نہیں پا رہی تھی کیونکہ ترپال اس کے چہرے کے گرد خوب کسا ہوا تھا۔ اس میں سے آتی مرے ہوئے جانور کی بدبو اس کا دم گھونٹ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ الٹی کرنے والی ہے۔ آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں۔ ایسی ہیبت دل پہ طاری ہوئی کہ اس کے حواس گنگ ہو گئے تھے۔ تب ہی کوئی اسے پیروں سے گھسیٹنے لگا۔ اس کا زور جیسے سلب ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک گھسٹتی رہی لیکن اسے سانس جیسے آ ہی نہیں رہا تھا۔ ترپال میں محض تعفن نہیں تھا، وہ غلیظ اور گیلا بھی تھا۔ سنہری کو اپنا

آپ گندے نالے میں ڈوبتا لگ رہا تھا۔ گھسیٹتے گھسیٹتے کوئی اسے کمرے تک لے آیا تھا کیونکہ اندر داخل ہوتے اسے کمرے کی دہلیز کی بنی کمر میں زوردار طریقے سے لگی تھی۔ ایسی تکلیف ہوئی کہ وہ چلا اٹھی۔ لیکن چلانے سے اس کے منہ میں جیسے گند بھرتا تھا۔ ترپال سانس کے زور پہ اس کے منہ میں کھنچتا تھا اور اس کی زبان اس کا ذائقہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس قسم کی سخت ترین حالت کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا سنہری نے۔ وہ سردی اور خوف کے باعث شل ہو رہی تھی جب کسی نے اس کی ٹانگ پورے زور سے زمین پر دے ماری۔ پکا فرش تھا اس کا پیر زمین سے ٹکرایا تو لگا چور چور ہو گیا ہے۔ بلا کی اذیت اٹھی کہ بلبلا کر رہ گئی وہ...... آنکھوں سے بے تحاشا آنسو گرنے لگے تھے۔ ہاتھوں کو حرکت دیتے وہ پاؤں ٹٹولنے لگی تھی لیکن ترپال کے اوپر کسی نے اسے رسی سے لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بدحواس ہوتی کسی بھی بات کی پروانہ کرتی چلائی......

"نہیں...... نہیں...... کھولو...... اللہ کا واسطہ کھولو...... مت باندھو...... میری سانس بند ہو رہی ہے۔ کھولو...... اللہ کا واسطہ......"

لیکن وہ بندھ چکی تھی۔ اس کا پیر شاید ٹوٹ گیا تھا یا سخت ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے چوٹ زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ جسم کو کپکپی لگی تھی۔ کوئی اسے باندھ کر اب کرسی گھسیٹتا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ اسے صاف محسوس ہوا تھا۔ پہلی بار اسے اپنی جان اور عزت دونوں کا خطرہ محسوس ہوا تھا۔

"کک...... کون ہو تم؟ کیا چاہیے...... مم...... مجھے کھولو...... جو چاہیے وہ بتاؤ لیکن مجھے کھول دو۔ میری سانس رک جائے گی۔ اس میں...... اس کی بدبو بہت سخت ہے۔"

"ہو گی تو سہی...... آخر باڑے کا ترپال ہے۔ وہیں جہاں مجیں، کھوتے اور ڈنگر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ ترپال ان کے اوپر سے ہی اٹھایا ہے میں نے...... گیلا بھی تھا کیونکہ بے چارے اپنے نیچے دبائے بیٹھے تھے۔ ان کا گوبر، لیدیں سب ہی کچھ ملے گا تجھے اس میں......"

اس آواز کو سنہری پل کے ہزارویں حصے میں بھی پہچان سکتی تھی۔ ایک ہراس سے پُر اور خوف زدہ سانس اس کے حلق میں آن پھنسی تھی۔

''حسنات......'' اس کی آواز مدھم تھی لیکن حسنات نے سن لی تھی۔

''حسنات نہیں...... تیری موت......'' وہ غرایا۔

اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی وہ زندگی میں کسی عورت ذات سے اس لہجے میں مخاطب ہوا ہو۔ یہ نہ اس کی تربیت تھی نہ مزاج...... لیکن سنہری کی حرکتیں معاملات کو اس نہج پر لے آئی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی اس سے نرمی برتنے پہ خود کو مائل نہیں کر سکتا تھا۔ حیات اور رابی کی کال سن کر جب وہ ملتان سے چلا تھا تو اس نے سوچا نہیں تھا کہ معاملہ اس حد تک بگڑا ہوگا۔ فکر ضرور لگی تھی جب ہی فوراً نکل پڑا تھا لیکن خانم کو دیکھ کر وہ جس دکھ میں گھرا تھا بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود ابھی اپنے تئیں وہ خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھا ورنہ جو روداد وہ خانم سے سن چکا تھا اس نے اس کی رگوں میں بہتے خون کو پارہ بنا دیا تھا۔ اب سنہری کا سر کچلنا لازم ہو گیا تھا اور وہ یہی کرنے اسے یہاں گھسیٹ لایا تھا۔

''تم ذلیل کمینے انسان...... تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے ساتھ ایسا کرو۔ تمہیں کتوں کے آگے ڈلواؤں گی میں، مجھے ذرا نکلنے دو۔''

سنہری کی ترپال کے اندر سے گھٹی گھٹی آواز باہر سنائی دی تو حسنات کو ہنسی آگئی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھل کر نہیں بول رہی کیونکہ ترپال اس کے منہ کے ساتھ لپٹا تھا۔ وہ بولتی تو سانس کے ذریعے ترپال کی غلاظت اس کے حلق میں اترتی۔

''میری جرأتیں آج رات تم اچھی طرح دیکھو گی سنہری۔ سب سے پہلے اتنا ذہن میں رکھو کہ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے اگر شرافت سے میری بات مانتی رہو گی تو تم بچ جاؤ گی ورنہ صبح مری ہوئی اور اکڑی ہوئی یہاں سے ملو گی تو سب بنا فاتحہ کے دفنا دیں گے تاکہ بدنامی نہ ہو۔''

حسنات کے ایسا کہنے پہ سنہری کے طبق روشن ہوئے تھے۔ اس کا ذہن آنے والے وقت کا ادراک کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن حسنات اسے سوچنے سمجھنے کی فرصت نہیں دینا چاہتا تھا۔

''تم کر لو جو کرنا ہے۔ سنہری اتنی کچی نہیں کہ ایسے ہتھکنڈوں سے ڈر جائے۔ کیا ہوگا۔ باندھا چھوڑ جاؤ گے۔ جاؤ...... مجھے پروا نہیں لیکن سنہری کو دھمکانا اتنا ہلکے میں مت لو......''

''پگلی ہے کیا، تجھے بندھا تو چھوڑوں گا لیکن سانپ نیولوں کے ساتھ۔ ایسے اکیلے تو نہیں چھوڑوں گا نا۔ اکیلے تو وقت ہی نہیں گزرے گا۔''

سنہری بری طرح جھٹپٹائی۔ خوف کے مارے اس نے خود کو پیچھے کی طرف سرکانا شروع کیا۔

''حسنات...... تجھ پر اللہ کی مار۔ کیوں میرے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ یتیم یسیر ہوں، حیا نہیں آئی تجھے......''

''تجھے آئی تھی......؟'' وہ پھنکارا۔ ''خانم کے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے جو ان تین دنوں میں کیا۔ بول...... آئی تھی؟''

''کک...... کیا کیا ہے میں نے......؟ بکواس کرتی ہے۔ تو اور تجھ جیسے جتنے بھی آجائیں میرا بگاڑ نہیں سکتے کچھ۔''

''ٹھیک کہتی ہو سنہری۔ اسی لیے تو جانوروں کی مدد لینی پڑی ہے وہ بھی تمہاری نسل کے۔ سانپ، بچھو جیسے نا......''

سنہری غصے میں کچھ کہنے لگی تھی کہ اسے کوئی شے سوئی کی تیزی اور ٹیس کے ساتھ بازو میں چبھی۔ وہ حلق کے بل چلائی۔ حسنات نے باہر سے ہی ہلکے ہاتھ کا تھپڑ مار کر منہ بند کروایا۔

''حسنات...... مت کر ایسا۔ مجھے کاٹا ہے کسی نے...... مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ مجھے کاٹا ہے۔'' وہ بوکھلانا شروع ہوگئی تھی۔

''ارے ابھی کب...... سانپ نہیں تھا۔ ٹیکا لگایا ہے۔ اس سے کچھ دیر میں تمہارا سارا جسم سن ہو جائے گا، پھر تمہیں سانپ بچھو نیولے جہاں چاہیں گے کاٹیں گے، تمہیں پتا نہیں چلے گا۔ ورنہ چلا چلا کر وقت ضائع کرو گی۔''

''تم جو بھی کر لو حسنات، میں منہ کھولنے والی نہیں...... اور نہ میں تم سے ڈر رہی ہوں۔''

حسنات ہنس دیا کیونکہ وہ ڈر رہی تھی اس کی آواز گواہ تھی کہ وہ ڈر چکی تھی پھر بھی حسنات نے پاس کسی کو آواز دی۔

''چاچا...... وہ اپنا بانکا سا نیولا پکڑا ہوا تھا تم نے ...... وہ تو لاؤ ذرا......''

سنہری کا دم ہوا ہو گیا۔ اس کی بس ہو چکی تھی اب۔ مگر انا ظالم بہت زوردار تھی۔ چاچا کون تھا پاس اور کیا لایا تھا لیکن چند پل بعد اس نے اپنے ترپال کے اندر کسی لجلجی شے کو محسوس کیا تھا۔ گندے غلیظ ترپال میں ابھرتی سنہری کی چیخیں آسمان کو بھی نہیں چھو سکتی تھیں کیونکہ وہ اندر ہی مدغم ہو رہی تھیں۔ اس کے چھٹپٹانے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ حسنات نے اندر جس شے کو بھی چھوڑا تھا اس کا لمس سنہری کی جان ہوا کر گیا تھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی لیکن ترپال اس انداز میں اس کے گرد لپٹا تھا کہ وہ بے بسی سے بالآخر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''حسنات...... اللہ کا واسطہ مجھے نکالو...... اس نیولے کو مجھ سے دور کر دو۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔''

''ابھی رکو ذرا...... ابھی تو ٹیکے کا اثر ہونے دو۔ پھر اس نیولے کے ساتھ سانپ چھوڑوں گا۔ تمہیں پتا ہے نا سانپ اور نیولے میں کیسا یارانہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو لپیٹنے کے چکر میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ بس ذرا ٹیکا تمہیں مفلوج کر دے تو اس تماشے کی بھی شروعات کرتا ہوں۔''

''نہیں نہیں...... حسنات...... مجھے معاف کر دو، مجھے نکالو اس سے...... مجھے بچاؤ۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ مجھے سانس نہیں آ رہا۔ مجھے مرنے سے بچا لو۔ ٹیکے کا زہر میرے جسم میں پھیل جائے گا حسنات......''

''کیا خانم کو رلاتے ہوئے تمہیں اس پہ ترس آیا تھا سنہری؟'' اس نے سنہری کا سر دبوچ کر زوردار جھٹکا دیتے ہوئے کہا تو سنہری بلکتے ہوئے بولی۔

''معاف کر دو...... اب کبھی نہیں ہو گا۔ میں...... میں خانم سے دور رہوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ میں اپنے دادا کے پنڈ چلی جاؤں گی۔ مجھے نکالو......'' اس کی کمر پر اسی شے کے لمس میں شدت آئی اور وہ بری طرح چھٹپٹاتے ہوئے چلائی۔ ''حسنات! نکالو اسے...... وعدہ ہے۔ وعدہ...... پکا والا......''

''جو پوچھ رہا ہوں بتاتی جانا...... تمہارے پاس وقت کم ہے۔ ٹیکے کا زہر اثر کرنا شروع ہو چکا ہے۔ نیولے کا منہ ابھی بندھا ہوا ہے۔ جیسے ہی کھلا، تمہیں نوچ گا یہ...... اس لیے وقت کم ہے بس اپنی زبان چلانے پہ دھیان دینا سمجھی۔''

حسنات کے ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس نے اس کا ریکارڈنگ کا بٹن دبایا اور بولا۔

''شروع کرو۔ الف سے یے تک سب کچھ......''

اس کے بعد سنہری کی زبان رکی نہیں تھی۔ خانم کے ساتھ جو کیا سو کیا، وہ اس قدر خوف کا شکار تھی کہ نمرہ کے ساتھ کی حرکت کا بھی اقرار کر کے حسنات کا دماغ بھک سے اڑا گئی۔ وہ سرخ آنکھیں اور پھولی رگیں لیے بے حسی سے اس کا تڑپنا دیکھتا رہا اور سب سنتا رہا۔ یہاں تک کہ نفسیاتی اثر اور خوف نے مل کر سنہری کے دماغ کو گرفت میں لیا تھا اور وہ بات کرتے کرتے لڑھک کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

حسنات نے میکانکی انداز میں ٹیپ کا بٹن بند کیا اور چاچا بخشو کو اشارہ کر کے قریب بلایا۔

''چاچا! اس کا ترپال کھول دو اور اس کتورے (کتے کا بچہ) کو نکال دو باہر۔ منہ کھولو بے چارے کا۔ مفت میں اس بے زبان کو اذیت دی ہم نے۔ اس عورت کی نحوست سے تو جانور بھی محفوظ نہ رہے۔''

چاچا بخشو مسکراہٹ ضبط کرتا آگے بڑھا اور احتیاط سے سنہری کے گرد لپٹا ترپال کھول دیا۔ ترپال کھلتے ہی وہ کٹی پتنگ کی طرح فرش پہ گری تھی۔ چاچا بخشو نے فوراً کتے کا پلا اٹھایا اور اس کے منہ پہ بندھا کپڑا کھول دیا۔ وہ بے چارہ چوں چوں کرتا ایک طرف بیٹھ کر اپنا جسم چاٹنے لگا۔ سنہری بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی رنگت زرد ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی یعنی مکمل خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑی گئی تھی۔

حسنات نے آگے بڑھ کر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے انتہائی کراہیت کے ساتھ اس کی نبض کو ٹٹولا اور حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

''کاش......کاش......''

اس کے بے ہوش چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھی اسے رتی برابر اس پر ترس نہیں آیا تھا۔ اپنے ہاتھ میں مقید ٹیپ ریکارڈر کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ اتنی تکلیف دی تھی اس نے پری کو...... اتنی اذیت...... اتنا ذہنی تشدد...... جذباتی اور جسمانی اذیت...... نمرہ آپا کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ

ہوا جس کی ذمہ دار یہ تھی۔ ان کی جان جا سکتی تھی۔ کیا کیا نہیں کیا تھا اس پرائی لڑکی نے جو خدا جانے کہاں سے آ کر حویلی لکھاں کا سکون درہم برہم کر چکی تھی۔

کبھی کبھار ہمیں ایسے لوگ نقصان پہنچاتے ہیں جو ہمارے قریبی نہیں ہوتے۔ نہ دوست، نہ احباب، نہ رشتے دار، نہ تعلق دار...... لیکن ہمیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی چوٹ اور سب سے بڑا سبق انہی سے ملتا ہے۔ وہ زبردستی ہماری زندگیوں میں سر گھسیڑنے والے وہ گھس بیٹھیے ہوتے ہیں جو راہ چلتے ہماری پرسکون زندگیوں میں خلل ڈالنے چلے آتے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں چاروناچار اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔ چاہے وقتی ہی سہی۔ لیکن حسنات نے سوچ لیا تھا کہ اس گھس بیٹھیے کو وہیں گھسانا ہوگا جو اس کو سب کے سر منڈھنے کے ذمہ دار ہیں۔

☆......☆......☆

کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں...... چالیں چلنا مہارت نہیں بلکہ چال کو انت تک لے جانا کمال ہے۔ سنہری کو لگا تھا کہ وہ جس طرح چاہے گی سب کی ڈوریں ہلائے گی اور سب کٹھ پتلی بنے اس کی انگلیوں پہ ناچیں گے لیکن وہ یہ بھول گئی تھی اس کے ایک شیطانی دماغ کو حویلی لکھاں میں موجود اتنے افراد میں سے کوئی تو ہوگا جو مات دے گا۔ اور حسنات نے اسے آسمان سے زمین پہ لا پٹخا تھا۔ سنہری اگر بلا تھی تو حسنات اس بلا کا رد تھا۔ وہ سیر تھی تو حسنات ڈھائی سیر تھا۔ سنہری نے غلط شخص کا انتخاب کیا تھا اپنے مقصد کے لیے۔ جس کو سیڑھی بنا کر اوپر چڑھنا چاہا تھا اس نے سیڑھی نہیں کاٹی تھی، سنہری کے پیر توڑ ڈالے تھے۔ اور اب حویلی لکھاں کے سب ہی مکینوں کے بیچوں بیچ خستہ حال، بدبودار حالت میں پڑی سنہری سب ہی کے لیے باعث حقارت و عبرت تھی۔

تمام معاملہ جاننے سے پہلے کچھ دل تھے جو بے حد ٹھنڈے ہوئے تھے سنہری کو اس حال میں دیکھ کر اور قدسیہ پھپھو ان میں سرفہرست تھیں۔ ویسے تو نمرہ بھی شور سن کر کمرے سے نکل آئی تھی اور اس کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ بے حد اچھا محسوس کر رہی ہے۔

''آئے ہائے میں مری...... یہ کس ظالم نے کیا ہے میری دھی کے ساتھ۔''

سب سے پہلے حمیدہ کا سکتہ ٹوٹا تھا اور وہ سنہری کی طرف لپکی تھیں لیکن جیسے ہی جھک کر اسے گلے لگانا چاہا بدبو کا بھبکا ان کی ناک سے ٹکرایا۔ بے اختیار چادر کا پلو ناک پہ دھرے انہوں نے اونچی آواز میں للکارا۔

''کس نے کیا ہے میری سنہری کا یہ حال...... ہائے میری دھی۔ میری پھلاں ورگی دھی...... جاؤ حویلی لکھاں والو...... تمہارا ککھ نہ رہے۔''

حمیدہ دونوں ہتھیلیاں ملتی دہائی دے رہی تھیں۔ ہاتھ بار بار سنہری کی جانب بڑھتے لیکن اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر وہ واپس کھینچ لیتیں۔ سنہری ابھی تک سر جھکائے دو زانو نیم سجدے کی حالت میں ہی تھی۔ اس کا سر اٹھتا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب سر اٹھانے کا وقت گزر گیا ہے۔ قاسم خود ششدر سا کھڑا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ اس کی چھٹی حس بہت کچھ غلط ہو جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ کہیں دل کے کسی کونے میں آواز ابھر رہی تھی کہ منظر سے غائب ہو جائے۔

''مجھے بتاتا کیوں نہیں کوئی۔ کیا کیا ہے میری سنہری کے ساتھ کسی موئے نے۔ اک واری دسو مینو میں اس کے ڈکرے کر کے باہر نالی میں بہا دوں گی۔''

''ہیں چاچی...... قسمے...... لے پھر کر میرے ڈکرے۔''

عقب سے حسنات کی آواز ابھری جس کے ساتھ پہلو بہ پہلو مدثر اور مبشر بھی تھے۔ سکینہ کے دل کو ہاتھ پڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور بیٹے کو لپٹ گئیں۔ ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے حمیدہ کو گھورا جس نے بات کرنے سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ عوام میں واحد حیات تھا جو پرسکون کرسی سے ٹیک لگائے ہتھی پہ کہنی جمائے بند مٹھی پہ ٹھوڑی رکھے ساری کارروائی فرصت سے دیکھ رہا تھا، جبکہ اس کے پیچھے کھڑی کشور کا منہ ادھ کھلا تھا اور ساتھ کھڑی رابی کو ہنسی آ رہی تھی اور اس نے منہ کو دوپٹے کے پلو سے ڈھک رکھا تھا۔ وہی تھی جس نے حسنات کو فون کر کر کے بلایا تھا اور بلانے کے بعد حیات کو مطلع کر دیا تھا۔ حمیدہ طیش میں کھڑی ہوئیں اور حسنات کی اور لپکی تھیں۔

''مینو یقین تھا۔ ہو نہ ہو، ایس طراں دی حرکت تیرے سے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ گل سن

میری حسنات...... جے تو میری کڑی کے ساتھ ٹُو نے کوئی گلط کم کیا ہے تو اج کے اج ابھی کے ابھی نکاح پڑھواؤں گی۔'' حمیدہ نے جوش میں سینے پہ ہاتھ مارا تو حسنات بھرپور مسکراہٹ لیے بولا۔

''بالکل چاچی...... اج کے اج ابھی کے ابھی ہی ہوگا نکاح...... مٹھائی کا کہہ دے مدثر، بشیرے حلوائی کو۔''

حمیدہ ٹھٹکیں۔ قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو، پھر سنہری کو دیکھا۔ قاسم نے آگے بڑھ کر حسنات کا گریبان جکڑنا چاہا تو اسی لمحے حیات اپنی کرسی سے اٹھا اور اسے پشت سے کالر تھام کر واپس کھینچ لیا۔

''حوصلہ کر شہزادے...... کیوں مچل جاتا ہے بات بات پہ......؟'' گردن اور سینے سے جکڑتے ہوئے وہ اس کے کان میں غرایا تھا۔ قاسم کو اپنا آپ ڈھیلا چھوڑنا پڑا۔

''ہاں بی بی...... تم خود بولوگی یا ریکارڈر بولے؟''

حسنات نے یہ سوال سنہری سے کیا تھا۔ سنہری کے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ سب ہی پر واضح تھی۔

''حسنات...... یہ سارا کیا رولا ہے، پرائی بچی ہے۔ پتر! ایسا سلوک کیوں کر رہا ہے؟''

شہاب الدین کو اب حقیقتاً کوفت بھی ہوئی تھی۔ دوسرا وہ قاسم کے تیوروں سے لاشعوری طور پر خائف تھے۔ لامحالہ انہیں حمیدہ اور قاسم کی طرف داری کرنا ہی پڑی تھی۔

''ابا جی، ڈرامہ نہیں ہو رہا کوئی۔ ابھی آپ کو پتا چل جاتا ہے۔ پہلے تو آپ یہ کریں کہ پری کا اور قاسم کا رشتہ جو طے کرنے کی غلطی کی ہے اسے ختم کریں۔'' حسنات بے حد مطمئن انداز میں قاسم کی چولیں ہلا گیا۔

''بند کراوئے بکواس۔'' قاسم کو پتنگے لگے۔ وہ دوبارہ جھپٹنے پہ تیار تھا لیکن حیات ابھی بھی اس کی پشت پہ چوکس کھڑا تھا۔

''بکواس وہ تھی جو کل تم نے کر کر کے خانم سے رشتہ طے کروایا ہے پتر جی۔ ابھی جو ہوگا وہ بکواس کی چھانٹی ہوگی۔''

اس کے بعد وہ سنہری کے قریب گیا اور پنجے کے بل بیٹھتے ہوئے اس سے بولا۔

''ہاں بھئی سنہری بی بی! ذرا اپنے منہ سے بتانا شروع کرو کہ خانم کو اس رشتے پہ منانے کے لیے تمہیں کس حد تک گرنا پڑا ہے۔ اتنا یاد رکھنا تمہارے پاس صرف ایک سے دو گھنٹے کا وقت ہے اس کے بعد تمہاری باقی کی زندگی بستر پہ اپاہجوں کی طرح گزرے گی اور اتنا تو تمہیں بھی پتا ہوگا کہ اپاہج لڑکی کو سگی ماسی بھی نہیں سنبھالتی۔''

آخری دو باتیں حسنات کو آواز دبا کے کہنی پڑی تھیں کیونکہ اس نے سنہری کے دل میں ٹیکے کے مضر اثرات کا خوف بٹھایا تھا۔

سنہری نے اپنے سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے نگاہیں اٹھا کر ارد گرد کھڑے سب ہی لوگوں کو دیکھا۔ وہاں حویلی لکھاں کی تینوں حویلیوں کے نفوس موجود تھے حتیٰ کہ ملازماؤں کے چہرے بھی کونے کھدرے سے جھانکتے دکھائی دیے۔ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ زمین کی نذر ہو جائے کیونکہ اعتراف کے بعد رد ہونے کی ذلالت اس کے منہ پہ کالک کی طرح تھپنے والی تھی۔ کاش حسنات اسے زہر کا ٹیکا لگا دیتا۔ اس نے حسرت سے سوچا تھا۔ آنکھیں بند کر لیں اور پھر اس کی زہریلی زبان رک رک کر چلنے لگی۔

''میں نے پرسوں نمرہ کو ہسپتال لے جانے سے پہلے خانم کو چوہدری آفتاب کی حویلی کے اسٹور میں بند کر دیا تھا۔ میں نے......''

وہ بولتی جاتی تھی اور وہاں موجود سب ہی کے چہرے اشتعال، غم، غصے، صدمے کی کیفیات اوڑھنے لگے تھے۔ سب ہی کے دلوں کی دھڑکنیں معدوم ہو کر ابھرتی تھیں اور خانم کے درد کو محسوس کرتے شرمندگی اور دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ کیسی غفلت ہوئی تھی۔ کیسا اندھیر مچ گیا ان کی ناک کے نیچے۔ ان کی آنکھوں پہ ایسی پٹی کیسے بندھ گئی تھی۔ نمرہ کے آپریشن کی ذمہ دار بھی سنہری تھی، اس بات نے لہو میں مزید شرارے دوڑا دیے۔ اور سنہری کی اس تمام چال کا علم حمیدہ اور قاسم دونوں کو تھا، یہ بات تابوت میں آخری کیل کی طرح ٹھک گئی تھی۔ حمیدہ کا مچلنا اور قاسم کا تاؤ کھانا کسی کام نہیں آنے والا تھا۔ چوہدری انور پہلے ہی قاسم سے برگشتہ تھے انہوں نے بڑھ چڑھ کر معاملے

کو سامنے آنے کا موقع دیا تھا۔ رہی سہی کسر، سنہری کے اعتراف کے باوجود مبشر نے وہ ٹیپ ریکارڈر چلا دیا تھا جس میں وہ سب بھی تھا جو سنہری بتانے میں بھول گئی تھی۔

چوہدری شہاب الدین کو قاسم پہ بری طرح تاؤ آیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قاسم ان کی اولاد پہ بھی وار کر سکتا ہے۔ نمرہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اگر اسے کچھ ہوتا تو وہ داماد کو کیا جواب دیتے اور اسے کچھ ہونے کا سوچ کر ہی ان کا لہو جوش مارنے لگا تھا۔

مختصر ترین وقت میں انہوں نے سارا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ نتائج کو سوچا تھا اور وہ خود اس نتیجے پہ پہنچے تھے کہ ہوٹل گیا بھاڑ میں۔ قاسم انہیں پہلے ہی کنارے لگا چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اپنا حق نہیں جتا پا رہے تھے۔ اس سے اس حوالے سے بات چیت کرنا کب کی ترک کر چکے تھے کیونکہ وہ انہیں کسی معاملے میں شامل ہی نہیں کرتا تھا۔ رہ گیا چوہدری آفتاب کی موت کا معاملہ تو اس کی چھان بین اگر ہوتی تو وہ صاف بچ جاتے تھے۔ اگر کوئی قابو آتا تھا تو وہ قاسم ہی تھا۔ قاسم کے پاس کم از کم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ چوہدری آفتاب اور اس کی بیوی کو مروانے میں ان کا ہاتھ بھی تھا سوائے اس کے جو زبانی کلامی گفتگو دونوں کے بیچ رہی لیکن اس کا گواہ کون تھا؟

ان تمام ضروری نکات کو سوچتے شہاب الدین نے اس قضیے کو ختم کرنے کی ٹھانی۔

''سب خاموش ہو جاؤ...... چپ کرو سارے کے سارے۔''

ہال کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کو کھانے کو پڑ رہے تھے۔ خاص طور پر قاسم جس کا بس نہیں چلتا تھا حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ حمیدہ الگ سنہری کے پاس بیٹھے سینہ پیٹ رہی تھیں۔ ان سے اپنی بھانجی کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اور وہ رو رو کر اسے سب کچھ اگل دینے کے طعنے بھی دے رہی تھیں۔ عجیب مچھلی منڈی بنی تھی جب چوہدری شہاب الدین نے سب کو چپ کروا دیا۔

''تایا جی! میرے ساتھ انصاف سے کام لینا ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے سب ہی کو۔''

قاسم کا لہجہ ابھی بھی دھمکی آمیز تھا۔

''وہ تو تمہی کو پڑنے والے ہیں۔ خانم کو دھمکانا بعد کا معاملہ ہے۔ اس سے پہلے چاچا آفتاب کی زمین ہتھیانا، ان کی اچانک حادثے میں موت ہونا...... چھوٹی حویلی میں سلنڈروں کا ڈھیر لگانے والے تم ہی تھے نا۔ بات نکلی تو بہت دور تک جائے گی قاسم اور تمہارے ساتھ تمہاری خالہ زاد بھی رگڑی جائے گی۔'' حیات نے بنا لگی لپٹی رکھے اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔

قاسم لاجواب ہوا تو حسنات نے دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

''اس بار تم نے غلط وقت پہ غلط قدم اٹھالیا قاسم۔ تمہیں کیا لگا ہر بار ہم سوئے رہ جائیں گے۔''

یہ ایسی بات تھی جس پر سب ہی نے چونک کر حسنات کی جانب دیکھا تھا لیکن شہاب الدین کے گلے میں کچھ اٹک گیا تھا۔ ان کو کھانسی لگی اور سکینہ نے قریبی میز سے پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر انہیں تھمایا۔ دو گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے حتمی طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے مکمل طور پر لاعلم اور لاتعلق ہو جائیں گے۔ اگر قاسم ان پر بات لایا تو...... ویسے بھی اس کے لیے انہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا جو قاسم سے قطع تعلقی ہو جاتی۔ اب وقت آگیا تھا کہ اسی میں بہتری تھی۔

''قاسم کے وار ابھی تم نے دیکھے ہی کہاں ہیں حسنات...... ابھی تم دودھ پیتے بچے ہو۔ اوزاروں سے کھیلتے ہو، ہتھیاروں سے نہیں۔ خانم کے لیے تایا جی نے مجھے زبان دی ہے۔ بھری محفل میں بات طے ہوئی ہے۔ رشتے داروں میں بات جا چکی ہے۔ اب تو نکاح ہو گا اور ابھی ہو گا۔''

''حوصلہ کر یار۔ نکاح ہو گا اور آج ہو گا ابھی ہو گا۔''

مبشر اور حیات ایک ساتھ بولے تو قاسم کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہوئے۔ اس نے چوہدری شہاب الدین کی جانب امید افزا نگاہوں سے دیکھا لیکن انہوں نے بے مروتی سے نگاہیں پھیر لیں۔

''تایا جی......'' قاسم نے دانت پیسے۔

''ابا جی......'' اس کی دیکھا دیکھی حیات اور حسنات نے باپ کو پکارا اور اس پکار میں تنبیہ تھی۔

چوہدری شہاب الدین برے پھنسے تھے اس لیے انہوں نے وہ کرنے کا فیصلہ کیا جو ان کے حق میں بہتر تھا۔

''قاسم کا نکاح ہوگا اور ابھی ہوگا۔''

حمیدہ اور قاسم دونوں کے چہروں پہ اطمینان چھلکا۔ ایک دوسرے کو تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ فرش پہ ٹھٹھری پڑی سنہری اس وقت کسی کو یاد نہیں تھی۔

''حیات پتر......'' چوہدری شہاب حیات سے مخاطب ہوئے۔ ''مولوی صاحب کو بلا۔ اور پنڈ میں خبر دے دے کہ چوہدری قاسم کا نکاح ہے حمیدہ کی بھتیجی سنہری کے ساتھ۔''

قاسم اور حمیدہ کے سروں پہ بم پھٹا تھا۔ اس طرح کی دغا اور وہ بھی عین موقعے پر۔ چوہدری شہاب رعونت سے دونوں ماں بیٹے کو دیکھتے موچھوں کو بل دے رہے تھے۔ قاسم کی نگاہوں سے نگاہیں ملی ہوئی تھیں۔ ایک کی نظر دھمکی دے رہی تھی تو دوسرے کی اسے للکار رہی تھی جا کر لے جو کرنا ہے۔ حسنات نے مدثر کے ساتھ دوڑ لگا دی تھی انتظامات کے لیے۔ مبشر اور حیات چوکس کھڑے قاسم کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ پھپھو قدسیہ نے ترس کھا کر رابی اور کشور کو اشارہ کیا تو وہ دونوں آگے بڑھیں اور سنہری کو اٹھا کر اندر لے گئیں۔ لیکن دونوں کے انداز میں شدید نفرت اور کراہت تھی۔

ایک بھاگ دوڑ سی مچی رہی تھی کچھ دیر اور پھر اگلے پونے گھنٹے تک سنہری کا نکاح اس کے خالہ زاد چوہدری قاسم کے ساتھ اس حال میں کرا دیا گیا تھا کہ سنہری کے کپڑے بدبو سے اٹے تھے۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ سفید رنگت پھیکی پڑ رہی تھی اور آنکھیں سوج کر مزید چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ قاسم نے انتہائی بے بسی سے ماں کو دیکھا تھا اور حمیدہ کے اشارہ کرنے پر اس نے مجبوراً اس نکاح پر حامی بھر لی تھی۔ سنہری اب اس کی منکوحہ تھی۔ ان دونوں کے ساتھ وہ ہو گیا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ نکاح کے بعد چوہدری شہاب کی جانب سے اگلا اعلان انتہائی غیر متوقع تھا جس کی کسی کو بھی امید نہیں تھی۔

''میں چوہدری شہاب الدین حکماً اپنے بھرا کے پتر چوہدری قاسم کو کہتا ہوں کہ اپنی ماں اور زنانی کے ساتھ دو دیہاڑوں کے اندر اس حویلی کو چھوڑ دے۔ جب تک دلوں میں آئی میل دھل نہیں جاتی۔ میرے بھرا چوہدری مہتاب کی گوانڈی پنڈ میں کوٹھی ہے وہاں چلا جائے اور جب عقل ٹھکانے

آئے اور اپنی زنانی کو حویلی کے طور طریقے سکھالے تو واپسی کا سوچ......"

حمیدہ کو تو غش ہی آ گیا تھا لیکن قاسم سپاٹ انداز میں سنتا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی عقل ماؤف ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور آناً فاناً ہوا تھا کہ وہ سنبھلنا تو دور کی بات، اپنے بچاؤ کا فیصلہ تک نہیں کر پایا تھا۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو گیا تھا۔ اس قدر اچانک بازی پلٹ گئی تھی کہ اس کے مہرے پٹے نہیں تھے بلکہ بساط سے اکھاڑ دیے گئے تھے۔

سنہری کو اپنی بیوی کے روپ میں دیکھنا موت کے مترادف تھا اور اس وقت وہی اس کے پہلو میں موجود تھی۔ خانم، جس کو پانے کے لیے وہ سنہری کے ساتھ مل کر یہ سارا کھیل کھیلتا رہا اسے بے حد عمدگی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے اچک لیا گیا تھا۔ وہ بند ہوتے ذہن کے ساتھ حسنات، حیات اور مبشر وغیرہ کے مسکراتے چہرے دیکھ رہا تھا۔ حمیدہ اس کا بازو دبوچے وہاں سے لے جانے کے لیے کھینچ رہی تھیں جبکہ وہ ایک نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے دل میں عہد باندھ رہا تھا کہ خانم کو سدا کسی کا نصیب بننے نہیں دے گا۔

☆......☆......☆

وقت اپنی اڑان بھرتا ہے تو سب کے پر کاٹ جاتا ہے۔ حویلی لکھاں کا موسم بھی بدلا تھا۔ کئی سال بے حد سبک روی سے یوں گزرے تھے کہ سب ہی اپنے اپنے مقام پر منتھی ہوتے چلے گئے۔ کچھ نئے چہروں کا اضافہ ہوا تھا اور کچھ پرانے گرد اوڑھ کر سو گئے تھے۔

سکینہ اپنی ڈھیروں خوب صورت یادیں اولاد کو ہدیہ کر کے دنیا سے جا چکی تھیں۔

پھپھو قدسیہ کے دو بیٹوں کی شادی ہو گئی تھی جبکہ مدثر ابھی کنوارا تھا۔ رابی کا رشتہ چوہدری انور کے بے حد قریبی رشتے داروں میں اچانک ہوا اور آناً فاناً شادی ہونے کے بعد وہ جرمنی جا چکی تھی۔ چوہدری شہاب الدین سکینہ کے جانے کے بعد خاموش ضرور ہو گئے تھے لیکن طبیعت کا طنطنہ برقرار تھا۔ کشور اور حسنات کا ایک خوب صورت پھول چار سالہ مہریار سب ہی کی جان تھا۔ خاص طور پر چوہدری شہاب الدین اسے پہلو سے لگائے رکھتے تھے۔

کشور اب وڈی چوہدرائن کے منصب پہ فائز تھی لیکن اس کے اندر اپنی ساس جیسی عاجزی

موجود تھی۔ وہ احساس کرنے والی پہلے بھی تھی اور ابھی بھی وہ سب کا اسی طرز پہ خیال رکھتی تھی۔

خانم بی اے پرائیوٹ کر چکی تھی۔ انٹر اس نے اور رابی نے ایک ساتھ کیا تھا۔ پڑھ آگے رابی بھی رہی تھی لیکن رشتہ طے ہونے کے بعد اس کی پڑھائی ادھوری چھوٹ گئی تھی جسے اس نے ہر حال میں شادی کے بعد پورا کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ تو پیا سنگ جا چکی تھی لیکن خانم نے پڑھائی نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی مدد کرنے کے لیے حیات موجود تھا اور کتابوں اور نوٹس کی فراہمی کے لیے حسنات خدمات انجام دیتا تھا جس کا ہاؤس جاب مکمل ہو چکا تھا۔ خانم کو زندگی کی طرف لانے میں اہم کردار ادا کرنے والا حسنات خود عنقریب ایک قابل ڈاکٹر کے روپ میں حویلی لکھاں لوٹنے والا تھا۔

سب کچھ ایک ترتیب میں آئے لگ بھگ چار ساڑھے چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن یہ سب تب ممکن ہوا تھا جب قاسم اور سنہری یہاں سے چلے گئے تھے۔ سکون، آرام اور اطمینان حویلی لکھاں میں ایک بار پھر در آیا تھا مگر کسی کونے کھدرے سے کوئی آفت، کوئی بلا، کوئی آزمائش باہر نکلنے کو بے تاب تھی۔ وہی ہوا تھا۔

چوہدری شہاب الدین نے دو دن پہلے سب کو بتایا تھا کہ قاسم اور حمیدہ واپس آنے والے ہیں۔ حمیدہ کو فالج ہو چکا تھا اور وہ حویلی لکھاں میں مرنا چاہتی تھیں۔

قاسم نے چوہدری شہاب الدین کو منا کر رام کیا تھا اور ان سے اپنے سابقہ رویوں کی معافی تلافی کرنے کے بعد ان سے حویلی آنے کی اجازت طلب کی تو وہ انکار نہیں کر سکے۔ ویسے بھی قاسم کے جانے کے بعد انہیں بہت اکیلا پن محسوس ہوتا تھا کیونکہ وہ واحد تھا جو ان کی فطرت سے مطابقت رکھتا تھا۔ وہ اسے یاد تو کرتے تھے لیکن بلانے سے مجبور تھے۔ تب ہی حمیدہ کی بیماری کا بہانہ ہاتھ آیا تو وہ سب کو بتا کر، بے چین کرنے کے بعد خود اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے رہے تھے۔

اس خبر سے سب سے زیادہ اذیت خانم کو ہوئی تھی جس کے سامنے چار سال پہلے کے مناظر گشت کرتے تو وہ آج بھی بے حال ہو جایا کرتی تھی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے حیات کو ایک بار پھر حسنات کو فوری بلانا پڑا تھا۔ ویسے بھی وہ آنے والا تھا، اس لیے اسے دقت نہیں ہوئی تھی۔

ٹھیک تین دن بعد حویلی لکھاں کے گیٹ سے سنہری کے قدم اندر داخل ہوئے تھے اور وہیں حسنات کی جیپ ہارن بجاتی اندھا دھند پھاٹک پار کرنے کو بے چین جیسے سب کو روندتی ہوئی اندر آ کر رکی تھی۔ سنہری کو فوری پرے ہونا پڑا تھا ورنہ اسے یقین تھا حسنات اسے روند ڈالتا۔ اپنی گاڑی سے اترتا قاسم دانت پیستا اسے گھورتا رہا تھا اور سنہری کی ڈبڈبائی آنکھوں نے اسے پلٹ کر مظلومیت سے دیکھا تو دل چاہا ساری مروت بالائے طاق رکھ کر حویلی لکھاں کو پھونک ڈالے۔ اندر جیپ سے اترتے حسنات کو سنہری اور قاسم نے چار سال بعد دیکھا تھا۔ وہ ایک بھرپور جوان اور چوڑے قد کاٹھ والے مرد کا روپ دھارے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

جب سے قاسم کو حویلی لکھاں سے الگ کیا تھا تب سے اتفاق تھا کہ ان کی ملاقات حسنات سے نہیں ہو سکی تھی کیونکہ وہ چند دن کے لیے آتا تو حویلی میں وقت گزار کر چلا جایا کرتا تھا اور اب جو وہ سامنے تھا قاسم کا رواں رواں حسد میں جل اٹھا تھا۔ وہ حیات سے زیادہ خوبرو تھا اور اس کی اٹھان قاسم کو اپنے سے زیادہ مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔

سنہری نے حسرت زدہ نگاہیں حسنات پر گاڑیں تو دل میں ہوک سے زیادہ اشتعال نے سر اٹھایا تھا۔ ولایتی طرز کے کپڑے جو سدا سے سنہری کی کمزوری رہے تھے۔ اس پر کالا چشمہ اور بالوں کا ماتھے پہ گرتا لپف جبکہ کنپٹیوں سے بھی بال بھاری تھے۔ شہری ہیئر اسٹائل تھا، پورا بابو بنا وہ سنہری کے دل پر چھریاں چلا گیا۔ وہ نا جانے کیا سوچ کر قاسم کے قریب ہوئی اور اس کے کان میں کچھ بدبدائی جس کے بعد قاسم چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتا اس کے قریب گیا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ حسنات نے قاسم کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ابا نے خوش آمدید کیا ہے قاسم۔ باقی افراد کے نزدیک تم اور تم سے متعلقہ کوئی بھی شخص اہمیت کھو چکا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اپنی حد پہچان کے رہو۔"

اتنا کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل مڑا اور حویلی کے اندر جانے والی روش پہ چلتا اوجھل ہو گیا۔

قاسم نے پلٹ کر سنہری کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور واپس گاڑی میں آ کر بیٹھا جس کی پچھلی

سیٹ پر لاغر و بیمار حمیدہ ٹیڑھے منہ سے رالیں گراتے ہوئے ناقابل فہم آوازیں نکال رہی تھیں۔ انہوں نے بھی حسنات کو دیکھ لیا تھا اور ناپسندیدگی کے تاثرات ان کی آنکھوں میں واضح تھے۔ جلی رسی کے بل قائم دائم تھے۔ قاسم گاڑی حویلی کے اندر لے آیا اور خود اتر کر سیدھا چوہدری شہاب الدین کے حصے کی جانب چلا گیا۔ پیچھے سنہری نے زہر میں بجھی سانس خارج کی اور آگے بڑھ کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بولی۔

''اتر پچھل پیری۔ پتا نہیں کب مغروں لتھنا ہے تُو نے۔ نا جانے ماں پتر میرا خون چوسنے جوگے ہی بنے تھے شاید......''

حمیدہ کو سہارا دے کر اتارتی وہ مسلسل کوس رہی تھی۔ جبکہ حمیدہ غوں غاں کرتے اسے گالیاں دے رہی تھیں۔ ان کا بایاں حصہ مفلوج تھا دایاں نہیں، اور اس ہاتھ سے وہ سنہری کو دبوچتے ہوئے نوچنے لگیں۔ جواباً سنہری نے انہیں زوردار جھٹکا دیا جس سے ان کا فالج زدہ وجود لہرا کر رہ گیا۔ وہ گرتے گرتے بچیں کیونکہ سنہری نے جھٹک کر چھوڑا نہیں تھا۔

''اندر مر واب ماسی......زیادہ جان نہ کھا تا میری۔ ورنہ سب سے پہلے تیری گچی مروڑوں گی۔ سمجھی......حویلی لکھاں واپس آئی ہوں۔ یہاں سب کا سکون دیکھ کر میرا دماغ گرم ہوتا رہے گا یہ نہ ہو کہ سارا غصہ تجھ پر اتاروں۔ لحاظ نہیں کروں گی تیرا، لولی (لنگڑی) نہ ہو تو......''

وہ بے نقط سناتی انہیں سہارے سے اندر لے جانے لگی تھی۔ ساتھ ساتھ نظروں سے اردگرد دیکھتی حالات کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گزارے تھے اس نے چار سال۔ ایک ایک پل انتقام کی تسبیح رولی تھی اس نے۔ اندر اتنا زہر جمع ہو گیا تھا کہ ہر وقت اس امید پہ وقت گزارا تھا کہ جس دن سنہری کی واپسی حویلی لکھاں میں ہو گئی سب ہی کو بن موت مارے گی۔ اب اس کی مات کا نہیں، جیت کا وقت قریب تھا۔

☆......☆......☆

ایک بار پھر جیسے چار سال پرانا منظر تھا۔ سب ہی موجود تھے سوائے سکینہ کے اور ان کی جگہ اب کشور ویسی ہی عزت و احترام قدسیہ کو دیا کرتی تھی۔ بظاہر مقام کشور کے پاس تھا لیکن اسے بزرگوں کے

مراتب کا احساس بھی تھا۔ وہ حویلی کے ہر فیصلے میں قدسیہ کی رائے کو فوقیت دیا کرتی تھی۔

حسنات نے آتے ہی سب کو بڑے کمرے میں جمع کر لیا تھا۔ وہ ابھی ٹھیک سے مل بھی نہیں پایا تھا کسی سے کیونکہ جو تکلیف اور اذیت قاسم اور سنہری کو دیکھ کر اس کے دل میں اٹھی تھی اس نے اسے انتظار کرنے سے روک دیا تھا۔ ایک بار پھر قاسم اور سنہری جیسے شیطان حویلی میں واپس آ چکے تھے تو وہ اپنے اگلے لائحہ عمل کے لیے مزید نہیں رک سکتا تھا۔ چوہدری شہاب الدین مہریار کو گود میں لیے ماتھے پہ تیوریاں ڈالے پلنگ پہ موجود تھے جس کے گاؤ تکیے ان کی کمر سے لگے تھے۔ اور مہریار ان کی گود میں بیٹھا سب کو شوقین نگاہوں سے دیکھتا چوہدری شہاب الدین کے حقّے کی نے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھا۔ حیات کے چہرے کا جوش بتاتا تھا کہ اسے آنے والی صورت حال کا علم ہے۔ حسنات اس کے ساتھ ہی کرسی پہ کروفر سے بیٹھا سب سے منفرد اور خوبرو دکھائی دے رہا تھا۔ جب سے وہ ڈاکٹر بنا تھا پورے پنڈ اور حویلی لکھاں میں اس کی قدر و منزلت میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ چوہدری انور نے حسنات کو دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بھئی ڈاکٹر صاب...... بڑی پسوڑی ڈالی تسی۔ کون سی بات کہنی ہے شہزادے...... جو آتے ساتھ سب کو جمع کر لیا؟''

حسنات تھوڑا آگے کو جھکا اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ جماتے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملاتے ہوئے بولا۔

''بات ایسی نہیں ہے جو آپ لوگوں کے علم میں نہ ہو پھوپھا جی۔ سب جانتے ہیں کہ ابا جی نے قاسم کو دوبارہ حویلی میں لا گھسایا ہے۔ ساری دنیا اس پر اعتبار کرے سو کرے مجھ سے مر کر بھی نہیں ہو سکتا۔ جن حالات میں ان لوگوں کو یہاں سے نکالا گیا تھا وہ مجھے بھولے نہیں۔ اب جب ابا جی نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ ان فتنہ پروروں کو ایک بار پھر حویلی میں گھسانا ہے تو میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔''

سب ہی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا سوائے حیات کے۔ اس کے یوں اچانک آ جانے پر حیران تو سب ہی تھے لیکن اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ناپسندیدگی چھپانے میں بغض

سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اسی اثنا میں دروازے سے قاسم اور اس کے عقب میں سنہری اندر داخل ہوئے۔ دونوں کو دیکھتے ہی قدرتی طور پر سب کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ کوئی بھی ان کے آنے کو مثبت انداز میں نہیں لے رہا تھا۔ سوائے شہاب الدین کے جو اٹھے اور آگے بڑھ کر قاسم کو گلے لگاتے ہوئے بولے۔

”کوئی نہیں میرا پتر...... سب بھول بھال جائیں گے۔ میں سب کے مڑنگے (مزاج) ٹھیک کر لوں گا۔ تو بس اپنے تائے کی طرف سے دل صاف کر۔ قسمے بہت یاد کیا میں نے اپنے مہتاب کی نشانی کو۔“

وہ بول رہے تھے اور آواز اتنی ہلکی تھی کہ کسی کو واضح کچھ سمجھ میں نہیں آسکا تھا سوائے اس کے کہ ان کی خوشی دیدنی تھی۔ حیات اور حسنات نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تاسف سے سر مارا اور حسنات دوبارہ گویا ہوا۔

”ابا جی! بہتر ہوتا کہ میری بات کے درمیان میں غیر ضروری لوگوں کی موجودگی نہ ہوتی لیکن اب آ ہی گئے ہیں تو میں یہاں سب بڑوں کی موجودگی میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں پری سے میرا مطلب خانم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

چوہدری شہاب ایک جھٹکے سے مڑے تھے۔ ان کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ حسنات خانم کا بھی نام لے سکتا ہے۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ ان کے دونوں بیٹے خانم کو بہن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس طرح اس کے لاڈ اٹھاتے تھے اور اس کا خیال رکھتے تھے ان کے دماغ میں ایسا خیال کبھی گزرا ہی نہیں تھا اور تو اور وہ سمجھے بیٹھے کہ قدسیہ اپنے مدثر کے لیے خانم کو سوچے بیٹھی ہے۔ لیکن ان کی اولاد ہمیشہ انہیں حیران ہی کرتی آئی تھی۔ وہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھے اور خشمگیں نظروں سے حسنات کو گھورا۔ کن انکھیوں سے قاسم کے تاثرات بھی دیکھے جو اچھے ہرگز نہیں تھے۔ سنہری کو دیکھنے کی کسی کو فرصت نہیں تھی جس کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے تھے۔

”تجھے کس نے کہا کہ تو مجھے یعنی چوہدری شہاب الدین کو اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے۔ ہاں ہوں کیا۔ مجھے نہیں منظور تیرا فیصلہ۔“

''کیوں منظور نہیں۔'' چوہدری انور نے بروقت مداخلت کی۔ قدسیہ پھپھو بھی ان کی ہمنوائی میں دکھائی دیں۔ ''اگر تم بال نہیں ہو چوہدری، تو حسنات بھی بال نہیں ہے۔ اس نے بہت اچھا فیصلہ لیا ہے۔ ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔''

''بالکل...... مجھے بھی بہت خوشی ہے۔ میری دونوں پتریاں (بھتیجیاں) درانی جٹھانی بن جائیں گی اس سے اچھی کیا بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھیں گی۔''

کشور کے ہونٹوں پہ بھرپور آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی جس نے سنہری کے اوپر تپتا سیال پھینک دیا۔

''کیوں، کیا میری کوئی مرضی نہیں۔ میں پیو نہیں کیا۔ آفتابے کی کڑیاں ہی رہ گئی ہیں میرے شیر جوانوں کے لیے۔'' شہاب الدین پھنکارے۔ نفرت ان کے انگ انگ سے ٹپکنے لگی۔ خانم تو انہیں کبھی بھائی ہی نہ تھی۔ کجا کہ اپنا اتنا لائق فائق بیٹا اس کے حوالے کرتے۔

''آپ کی مرضی اپنی جگہ ابا جی۔'' حیات کا دبنگ لہجہ گونجا۔ ''لیکن جو چلے گئے ہیں ان کی مرضی بھی دیکھ لیا کریں۔ حسنات کا ویاہ خانم سے ہو، یہ خواہش چاچا آفتاب کی تھی اور انہوں نے خود اس کا اظہار اپنی زندگی میں حسنات کے سامنے مجھ سے کیا تھا۔''

حیات نے جان بوجھ کر محض بات میں وزن پیدا کرنے کی خاطر اپنا نام لیا تھا وگرنہ بات تو حسنات سے ہی کی تھی۔ اور چوہدری شہاب کے اگلے سوال نے اس کی بروقت تک بندی کو ٹھیک ثابت کر دیا تھا۔

''اچھا...... تو مجھے کیوں نہ بتایا تو نے......؟ باپ کو کبھی زندگی میں اہمیت دی ہوتی تو اج میری پگ کا شملہ بھی اُچا ہوتا نا۔''

''ابا جی! آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ خانم اس وقت بہت چھوٹی تھی اور حسنات بھی پڑھائی کر رہا تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں مرحوم بھائی کی محبت جوش مارے اور آپ اسی وقت دونوں کی شادی نہ کرا دیں نا...... اس لیے۔ ورنہ آپ کو بھلا کیوں نہ بتاتے ہم۔'' کمال کا پینترا کھیلا تھا حیات نے۔

چوہدری انور چہرہ جھکا کر مسکراہٹ ضبط کرنے لگے۔ مبشر بھی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ملتے

ہوئے مسکراہٹ چھپا گیا۔ جبکہ قاسم کا ضبط اس وقت حدوں کو چھو رہا تھا۔ اگر اس کے پاس اسلحہ ہوتا تو یقیناً سب کو بھون ڈالتا۔ اس کے پلے سنہری کو ڈال کر اب حسنات خانم سے شادی کرے گا۔ کلیجہ ابل ابل کر باہر آنے کو تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان بندی اس کی مجبوری تھی۔ حالات فی الوقت اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے منہ سے نکلا ایک لفظ بھی ان لوگوں کو دوبارہ حویلی سے باہر کر سکتا تھا اور اس بار وہ ایسی نوبت آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''اچھا اچھا...... گل ٹھیک ہے ویسے۔ لیکن میں کوئی دشمن تھوڑی تھا تم لوگوں کا یا آفتاب کا۔''

ان کی نگاہ ایک پل کو قاسم سے ملی جسے وہ فوری چرا گئے اور بولے۔ ''سوچنے کا وقت دو مجھے۔ ابھی تو حسنات پتر، تُو آیا ہے۔ تو نے ڈاکٹری کی دکان بھی کھولنی ہے ابھی پنڈ میں۔ پہلاں اس پر دھیان دے پھر دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے معاملہ ٹالنے کی خاطر حسنات کی توجہ اس کے مقصد کی جانب مبذول کروائی۔

''ابا جی...... کلینک بھی کھل جائے گا وقت آنے پر۔ لیکن فی الحال میں اسپیشلائزیشن کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں اور جانے سے پہلے میں چاچا آفتاب کی خواہش لازمی پوری کروں گا۔ کیونکہ حویلی میں چند لوگ ہیں جن پہ میں کبھی بھروسا نہیں کر سکتا۔''

وہ قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نڈر انداز میں بولا۔ قاسم کی برداشت جواب دیتی اور وہ اٹھ کر دست و گریبان ہوتا، اچانک سنہری درمیان میں کود پڑی۔

''تایا جی، ہم آپ کے بچے ہیں۔ ہم سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی سزا ہم نے بھگت لی ہے۔ چار سال ہم نے پنڈ میں رہتے ہوئے بھی سب کی شکل تک نہیں دیکھی۔ کسی نے ہمیں پوچھا تک نہیں کہ ہم پہ کیا بیت گئی۔ ہم کس حال میں ہیں؟''

''ہونا کس حال میں ہے کڑیے۔ قاسم نے ہوٹل بنا لیا جو وا وا چلتا ہے۔ دو گڈیاں اور لے لی ہوئیں۔ اپنا الگ ڈیرہ بنا لیا جہاں بیٹھا بندوق دکھاتا رہتا ہے پنڈ والوں کو۔ آئے دن ڈیرے پہ ناچنے والی بلواتا ہے۔ ہور وی کچھ سننا ہے تو بول۔''

پھپھو قدسیہ نے سنہری کے بے چارگی بھرے لہجے کو تین جملوں میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ

مزید بھی بولتیں لیکن شوہر کی گھوری پہ خاموش ہو گئیں۔ یہ وہ وقت تھے جب عورتیں عمر کے ہر حصے میں گھر کے بزرگ مردوں کا احترام کیا کرتی تھیں۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا پھپھو جی، کہ ہمیں بھی اپنی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع دیں۔ ماسی بھی اب ٹھیک نہیں رہتی۔ اس کا دل اداس رہتا تھا ہر وقت۔ اسے آپ لوگوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ماضی کے طعنے دینے بند کر دیں تایا جی۔''

اتنا کہہ کر سنہری نے پلو آنکھوں پہ رکھ کر انہیں مسل کر سرخ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ کامیاب بھی رہی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سب یکجان ہو کر دوبارہ سے انہیں حویلی لکھاں سے دور نہ کر دیں اور اس کا حویلی میں رہنا بے حد ضروری تھا۔ معاملات اس کے ہاتھ سے نکلنے کے قریب تھے اگر وہ اصل گڑھ سے دور رہتی تو اپنی جڑ کھو دیتی۔ اس لیے اسے آنے والے وقت کی خاطر یہاں قدم جمانے تھے۔ بس حکمت عملی تبدیل کرنی تھی۔ شہاب الدین کا دل کسی اور پر پسیجتا یا نہیں، قاسم پہ لازمی پسیجتا تھا۔ وہ ہنکارا بھر کر بولے۔

''اب چھڈو سب پرانی باتوں کو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ کوئی جان سے تو نہیں مرا۔''

اتنا کہنا تھا کہ سب ہی نے ایک ساتھ شہاب الدین اور پھر قاسم کو دیکھا تھا۔ قاسم ایک پل کو بوکھلا سا گیا۔ یوں لگا سب ہی اسے چوہدری آفتاب کا قاتل کہہ ہی نہ دیں۔ سنہری الگ چور سی نگاہ ساروں پہ ڈال کر رہ گئی۔

''میری دھی کو رب نے ایک پتر اور دے دیا باہر جا کر۔ جان ساہ سلامت لے کر گئی تھی۔ بس اب چھوڑو ان باتوں کو اور ٹھیک ہے میں حسنات اور خانم کے رشتے کے لیے تیار ہوں۔''

انہوں نے سب کا دھیان ثمرہ کی جانب مبذول کروا دیا تھا جو کہ سنہری کی وجہ سے مرتے مرتے بچی تھی۔ وہ بے حد کائیاں تھے اس بات کا اندازہ ان کی اولاد کو بھی تھا۔ فی الحال ان کے مان جانے پر سب ہی میں سکون کی لہر سی دوڑی، خاص طور پر حسنات جس کا چہرہ اندرونی خوشی سے چمک اٹھا تھا۔ خوبرو اور دلکش چہرہ مزید کھل اٹھا تھا۔ پھپھو قدسیہ نے کشور کو آواز لگائی۔

''خانم کو لے آ پتر...... رابی ہوتی تو چھلانگیں مارتی اس کے پاس نکل گئی ہوتی۔ اب تو جا اور تو اسے لا یہاں، اپنی ساس کی تھاں نیگ دے۔ اب تو نے ہی ان ریتی رواجوں کو دیکھنا ہے۔''

کشور مسرت آمیز چہرہ لیے اٹھی اور مہریار کو حسنات کی گود میں دے کر خود خانم کو لینے چل دی۔

کیسا دل چیرتا احساس تھا سنہری اور قاسم دونوں کے لیے۔ ایک دوسرے سے نگاہ ملانا بھی چاہتے تھے اور مل بھی نہیں پا رہی تھی۔ ایک طرف رکھی کرسیوں پر بیٹھے اوپرے سے لگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے کانٹے تھے۔ دونوں گزرے وقت ایسی سازش رچا چکے تھے جو کہ دہراتے شرم آئے۔ دونوں ہی خانم اور حسنات کو پانا چاہتے تھے اور دونوں اب انہیں ایک ساتھ دیکھنے والے تھے۔ سنہری کو حسنات چاہیے تھا اور قاسم کو خانم...... تقدیر کا ہیر پھیر تھا جس نے دونوں کو ایک دوسرے کے سر منڈھ دیا تھا اور خانم اور حسنات ایک ہونے جا رہے تھے۔

اپنی اپنی سوچوں میں گم سارے ماحول میں پھیلی خوش کن آوازوں کو سہتے دونوں بس جذبات قابو کیے ہوئے تھے تب ہی ایک طرف سے خانم، کشور کے پہلو میں سبک خرامی سے چلتی آتی دکھی۔ سب کی گردنیں ادھر مڑیں تو دور سے ہی خانم کے چہرے پہ یکدم پھیلنے والے گلال نے سب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

وہ گھبراہٹ کا شکار تھی، یہ واضح تھا اور حسنات اسے دیکھنے کے بعد ارد گرد بھلائے بیٹھا تھا۔ بھول تو قاسم اور سنہری بھی گئے تھے۔ چار سال بعد دیکھ رہے تھے۔ سفید دوپٹا جس کے کناروں پہ کروشیے کی بیل بنائی گئی تھی۔ میرون لمبی قمیص اور میرون شلوار...... قمیص کے دامن، گلے اور آستینوں پر بھی کروشیے کا کام تھا اور یہ کمال خود خانم کے اپنے ہاتھوں کا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی کلائیوں میں درجن درجن میرون چوڑیاں تھیں۔ سر کے اوپر سفید دوپٹے کے نیچے درمیان سے نکالی مانگ چمک رہی تھی۔ لمبی سیاہ چوٹی پشت پہ جھولتی دوپٹے کے نیچے سے بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ روشن کشادہ پیشانی اور خوب صورت ابروؤں کے نیچے غلافی حسین آنکھیں جو لمبی اور مناسب گھنی پلکوں سے مزین تھیں۔ چھوٹی سی ناک جو کنارے سے بے حد معمولی سی مڑتی تھی اور اس ناک میں باریک سے نگ والی لونگ...... کتابی چہرہ اور خوب صورت لبوں کے پیچھے جھانکتے موتیا رنگ کے حسین دانت......

سامنے چلی آنے والی خانم تھی، اس کا یقین کرنا سنہری اور قاسم دونوں کے لیے مشکل تھا۔خوب صورت تو وہ چار سال پہلے بھی تھی لیکن اب تو شاید وہ دریائے حسن میں غوطہ لگا کر نکلی تھی۔ قاسم کا دل شدید بے چین ہوا۔بس چند قدم کے فاصلے پر تھی خانم اس سے اور اس کے پلے کیا آ پڑی۔ چھوٹی چھوٹی سانپ سی آنکھوں والی سنہری جو اپنی بے حد گوری رنگت کے باوجود اس کے دل میں کبھی گھر نہیں کر سکی تھی لیکن وہ اس کے گلے کی ہڈی ضرور بن چکی تھی جسے وہ نہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔

سنہری کن اکھیوں سے مسلسل قاسم اور حسنات کو دیکھ رہی تھی جن کے چہروں کے تاثرات گو الگ الگ تھے لیکن تھے خانم کے لیے اور خود اس کے دل کو جیسے کسی نے انگاروں پہ سینک دیا تھا۔ایسا حسن شاید چار سالہ بے خوف وفکر زندگی نے عطا کیا تھا۔وہ کسی بھی زاویے سے چار سال پرانی خانم نہیں لگتی تھی جسے مار مار کر اس نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔گو اس وقت گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس کی چال میں پر اعتمادی جھلک رہی تھی۔

اندر حسد کا سانپ سنہری کو ڈسنے لگا تھا۔اس کا رواں رواں نیلگوں ہو رہا تھا۔

دوسری طرف حسنات پہلی بار خانم کو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن آج اس کے سامنے جیسے حقیقی پری مجسم ہو کر آ گئی تھی۔چینی کی مورتی، مصری کی ڈلی یا پھر حسن کی شاخ پہ جھولتی رس بھری۔کوئی استعارہ ہوتا جو وہ اس کے لیے ڈھونڈ لاتا۔اس کا دل ہر مثال کی نفی کرتا خانم کے قدموں میں جھک گیا تھا۔کیونکہ اس کا یار بے مثال تھا!

ان کی پوچھ مت نزاکت محسنؔ
سانس لیتے ہیں تو تھک جاتے ہیں

❁ ❁

ناول **گنوا کے دل و جاں ہم** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 19

یہ ہانڈی ابلنے لگی
یہ مٹی کی ہانڈی ابلنے لگی ہے
یہ مٹی کی دیوانی ہانڈی ابلنے لگی ہے
ہزاروں برس سے مری آتما اونگھ میں پھنس گئی تھی
جب انسان دو پتھروں کو رگڑ کر کہن سال سورج کی سرخ آتما کو بلانے لگا تھا
مگر تیز آنچ اور بہت تیز بُو نے جھنجھوڑا تو اب آنکھ پھاڑے ہوئے
دم بخود ہے
ابلنے لگیں سبزیاں، پھول، پھل، گوشت، دالیں، اناج
ابھی شوربے کے کھدکنے کی آواز چھائی ہوئی تھی
ابھی سانپ چھتری لگائے ہوئے بھاپ نیلے خلاؤں کی جانب رواں ہے
وہ جس کی ضیافت کی تیاریاں تھیں، کہاں ہے
مری آتما جاگ کر چیختی ہے
یہ ہانڈی ابلنے لگی ہے
یہ مٹی کی ہانڈی ابلنے لگی ہے
یہ مٹی کی دیوانی ہانڈی ابلنے لگی ہے

(عمیق حنفی)

زندگی سہل ہو تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ سکھ، سکون اور راحت انسان کو ہر طرف سے بے فکر کر دیتے ہیں۔ اسے لگتا ہے جیسے اب کوئی تکلیف اس کے قریب نہیں آئے گی کیونکہ وہ سہہ چکا جو اسے سہنا تھا اور اب جو اطمینان ہے وہ اس کے ظرف کے امتحان کے بعد ملنے والا انعام ہے۔ لیکن خسارے میں رہنے والا بشر یہ نہیں سوچتا کہ اکثر ٹنڈ منڈ پگڈنڈی کے بعد آنے والا ہموار راستہ اندھی کھائی کی طرف لے جاتا ہے۔

عشق و مستی کے ہنڈولے جھولتے ابھی محض آٹھ سال بیتے تھے اور یہ آٹھ سال خانم نے زندگی نہیں خوشیوں کو جیا تھا۔ سینچی ہوئی تمناؤں کو پنپتے دیکھا تھا۔ دکھ اور درد کو کوسوں دور پایا تھا۔ محبت کے میٹھے امرت کے ہولے ہولے جرعے بھرے تھے لیکن پیمانہ لبریز ہی رہا تھا۔

حسنات کی چاہت اس کا وہ خواب بن گئی تھی جس سے وہ جاگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ساتھ اس کے لیے آب حیات تھا جسے پی کر اس کی محبت کو جاودانی عطا ہوئی تھی۔ جس مشکل اور اتار چڑھاؤ کے حالات میں ان کی شادی ہوئی تھی اسے حسنات نے محفوظ رکھنے کے لیے پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا۔ حیات کو اعتماد میں لے کر اس نے بے حد خاموشی سے خانم کے ویزے اور ٹکٹ کا بندوبست کیا تھا اور جس دن اسے خود کو امریکا فلائی کرنا تھا اسپیشلائزیشن کے لیے تو اس وقت اس کے پہلو سے لگی خانم بھی اس کے ہمراہ جانے کو تیار تھی اور اس بات نے پوری حویلی لکھاں کو ششدر کر دیا تھا کیونکہ کسی کے علم میں بھی حسنات کا یہ پلان نہیں آ سکا تھا۔

کشور نے پرسکون کھڑے حیات کی جانب دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس سب کے پیچھے اس کا بھی ہاتھ ہے تب ہی اس سے شاکی بھی ہوئی تھی۔ ناراض تو وہ خانم سے بھی ہوئی تھی کہ وہ اسے اپنی آپا ہونے کے ناتے کچھ تو بتاتی لیکن خانم کو حسنات نے سختی سے منہ بند رکھنے کا حکم دیا تھا۔

کسی کو کچھ خاص اعتراض نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ بزرگوں کے علم میں یہ بات لائی جاتی لیکن چوہدری انور کی بروقت مداخلت نے سب ہی کی ناراضی کا رخ مثبت جانب موڑ دیا تھا۔ ماضی میں

ہوئے معاملات اور موجودہ حالات کے پیش نظر حسنات نے اگر اس بات کو چھپایا تھا تو اس میں یقیناً بہتری ہی تھی۔ چوہدری شہاب الدین خوب گرجے تھے اور ان کی گرج چمک سے دلوں میں نفرت کا ناسور پالے بیٹھے قاسم اور سنہری اپنے بلوں سے پھن پھیلائے نکل آئے تھے۔ وسیع و عریض صحن میں حسنات کے ساتھ خانم کے سوٹ کیسوں نے جیسے انہیں تپتے تندور میں جھونک دیا تھا۔

یہ ہو کیا رہا تھا آخر......؟ جو داؤ کھیلتے تھے الٹ جاتا تھا۔ جس بازی کو مارنا چاہتے تھے ہار جاتے تھے اور جو تدبیر کرتے تقدیر اس کا توڑ کر ڈالتی تھی۔ کن جتنوں سے دونوں سینڈھ لگانے دوبارہ حویلی لکھاں میں داخل ہوئے تھے لیکن جن کو برباد کرنا تھا وہی رخت سفر باندھے روانہ ہو رہے تھے۔ پہلے حسنات کی خانم سے شادی ہوتے دیکھی اور ایسی دھوم دھام حیات نے کی کہ ماضی میں ہوئی اس کی اپنی شادی کا چرچا دب گیا۔ سنہری، خانم کا روپ سروپ دیکھ دیکھ کر کلیجہ چھلنی کرتی تو کبھی حسنات کی شان اور اٹھان اس کا رواں رواں سلگا ڈالتی۔ چاند سورج کو شرماتی جوڑی تھی جو پنڈ والوں کے لیے گویا مثال بن گئی تھی۔

حیات اور مبشر نے پوری شادی میں قاسم کو کونے سے لگائے رکھا۔ کسی قسم کا مشورہ لینا تو درکنار اس کی خود سے کی گئی پیش قدمی کو بھی مکمل نظر انداز کر کے محض اس جانب دھیان دیا کہ قاسم کوئی بھی مشکوک حرکت کرتے پایا جائے اور اسے دھر لیا جائے۔ اس بات نے اسے چوکنا رکھا تھا اور وہ دل مسوس کر سارے انتظامات ہوتے دیکھتا رہا تھا۔

حسنات دلہا بنا ایسا شاندار لگتا تھا جیسے کسی ریاست کا شہزادہ ہو اور سنہری کے منہ سے خانم کے حسن کے زہر میں بجھے قصیدے بھی وہ سن چکا تھا۔ بے بسی سی بے بسی تھی جو دونوں جی سہہ رہے تھے۔ مارنے آئے تھے لیکن تل تل مرنا خود کو نصیب ہو گیا تھا۔ یہاں تک تو تھا سو تھا لیکن اب حسنات خانم کو لے کر ملک سے باہر چلا جاتا، کیا یہ ستم بھی باقی تھا۔

سنہری جس جگہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی وہاں کبھی کشور تو کبھی خانم دکھائی دیتی تھی۔ کشور جس انداز میں پوری حویلی پہ حکومت کر رہی تھی یہی کچھ اس نے چاہا تھا۔ چلو یہ نہیں ملا تو اب جو خانم ایسے خوبرو اور

انتہائی پڑھے لکھے شوہر کے ساتھ جہاز میں روانہ ہونے والی تھی تو یہ بھی تو اس نے مانگا تھا۔ کیسا اندھیر تھا اس کے ساتھ...... جس شے کو چاہتی تھی وہی چھین لی جاتی تھی، جو دعا مانگتی تھی رد ہو جاتی تھی۔ کاش اس نے اس رات خانم کو اسٹور میں زہر دے دیا ہوتا۔ بس یہی خیال رہ رہ کر اسے آتا اور تصور میں خانم کا مرا ہوا نیلا وجود سوچ کر سینے میں ٹھنڈی پڑتی لیکن محض چند پل یہ خوشی رہتی اور کافور ہو جاتی۔ اب جو سامنے تھا وہی حقیقت تھی جہاں خانم سرخ پشواز میں ہلکے پھلکے زیور کے ساتھ بے حد ہلکے سے میک اپ میں اوپر سیاہ بڑی سی چادر اوڑھے اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ پھپھو قدسیہ ہر دوسرے منٹ اس پر پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ کشور الگ اس کے گلے لگ لگ کر اس کا ماتھا چومتی کان میں ہدایات جاری کر رہی تھی۔ ساتھ بار بار اس کی چادر سر پہ اس جانب سے سرکا کر آگے کر دیتی جہاں سنہری اور قاسم کھڑے تھے تا کہ ان دونوں کی زیادہ نگاہ اس پر نہیں پڑ سکے اور یہ بات سنہری کو مزید اشتعال میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے قاسم کو ٹہوکا دے کر چوہدری شہاب الدین کو اکسانے کے اشارے دیے۔

قاسم کی معمولی سی ہلا شیری پہ چوہدری شہاب الدین بہت بھڑکے تھے لیکن حیات نے انہیں جیسے تیسے ٹھنڈا کیا تھا۔ چوہدری انور اور قدسیہ پھپھو بھی خانم کے مستقبل اور حفاظت کی خاطر حسنات کے ہم نوا ہو گئے۔ چوہدری شہاب الدین شور مچانے کے باوجود بے بسی سے دیکھتے رہ گئے تھے اور حسنات پوری شان سے خانم کو لیے امریکا چلا گیا تھا۔ حویلی لکھاں ان کے وجود سے خالی ہونے کے باوجود پرسکون رہی کیونکہ وہاں سب ہی چاہتے تھے کہ حسنات اور خانم، قاسم اور سنہری سے فاصلے پر ہو جائیں اس لیے جیسے ان دونوں کے محفوظ ہو جانے کے یقین نے سب کے اندر اطمینان بھر دیا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی دن کے پہر آٹھ ہی ہوتے ہیں جو گزر ہی جاتے ہیں لیکن جب سکھ ہی سکھ اطراف میں اڑتے ہوں تو ان کے پروں کے رنگ دکھوں کی سیاہی پی جاتے ہیں۔

خانم بھی دکھ کا ذائقہ بھول چکی تھی۔ آزمائش کی کڑواہٹ بھول گئی تھی۔ جب آٹھ سال بعد اس نے حسنات کے ساتھ وطن واپسی کا قصد کیا تھا تو اس کی بانہوں میں پانچ سال کی چاندی کی گڑیا تھی۔ وہ خوش تھی اور بے حد خوش تھی۔ حسنات کی مرضی اور مزاج کے برخلاف وہ واپس لوٹ رہی تھی۔ وہ

اسپیشلائزیشن کے بعد بھی ابھی مزید وہیں سیٹل رہنا چاہتا تھا۔مزید کورسز کرنا چاہتا تھا لیکن خانم تھک گئی تھی اپنوں سے دور رہ کر۔ پردیس میں اپنی بہن کے ہاتھ کے ذائقے کو ترس چکی تھی۔اس کی گود میں سر رکھ کر نیند لینے کو دل چاہتا تھا۔حویلی لکھاں کے چوبارے اور دالان ستاتے تھے۔اپنی حویلی کی ویرانی یاد آتی تھی تو دل چاہتا تھا کہ اڑ کر جائے، اسے کھول کر دھوپ کو اندر آنے دے۔اماں ابا کی آوازوں کو دیواروں کی درزوں سے باہر نکلنے دے۔سیلن زدہ چھتوں کی اداسی دور کر دے۔جتنی وہ خوش تھی، حسنات اتنا ہی بے زار اور فکر مند تھا۔

ان آٹھ سالوں میں اس نے اپنی زندگی نہیں جی تھی بلکہ خانم کو اپنے حصے کی بھی جینے کے لیے دے دی تھی۔وہ خوش ہوتی تو وہ بھی مسکرا دیتا، اداس ہوتی تو دل سکڑ جاتا، سوتی تو جاگتا رہتا مبادا کوئی آہٹ خانم کی گھبراہٹ کا سبب بن جائے۔جاگ جاتی تو وہ سنگ سنگ پھرتا اس کا دل بہلاتا۔کام پر جاتا تو مسلسل رابطے میں رہنا عادت بنالی۔خانم کی خوشی اور خانم کی ہنسی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔وہ کبھی پاکستان نہ پلٹتا جو خانم کی ضد نہ ہوتی۔اس نے محض دو ماہ کے لیے واپسی کا کہا تھا، اس کے بعد وہ پھر دوبارہ امریکا آجاتے کیونکہ حسنات کو واپس آکر چند ضروری کورسز کرنے تھے۔

خانم کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اسے اس کی خاطر پاکستان لے کر جا رہا ہے۔سنہری اور اس کا خوف زائل ہو چکا تھا۔وقت نے جہاں اتنی بہت سی چیزوں پر گرد ڈال دی تھی تو یقیناً اس کی بدفطرتی کو بھی بدل دیا ہوگا۔وہ دشمنی بھلا چکی تھی۔ماضی بچپنے کے غلاف میں لپٹا ایک ڈراؤنا خواب لگتا تھا اور خواب ٹوٹ جائیں تو بھول بھی جاتے ہیں۔لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ کچھ لوگ آپ کی زندگی کو دیمک کی طرح لگ جاتے ہیں۔ایک طرف سے ہٹاؤ تو کسی دوسرے کونے سے سر نکالتے ہیں اور رفتہ رفتہ سارا وجود کھوکھلا کر کے دم لیتے ہیں۔

جہاز تیزی سے اسے اپنوں کے قریب کر رہا تھا لیکن قسمت اسے اپنوں سے دور کرنے کا انتظام کیے ہوئے تھی۔

☆......☆......☆

آٹھ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ وقت بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ افکار و نظریات بدل جاتے ہیں۔ جذبات بدل جاتے ہیں۔ خیالات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سانپ بھی اپنی کینچلی بدل لیتا ہے پر وہ اپنی کینچلی بدل بھی لے، تب بھی سانپ رہتا ہے۔ زہر، امرت نہیں بنتا اور آگ پانی نہیں بنا کرتی۔ کچھ چیزیں قدرت نے فطرتاً ودیعت کر دی ہوئی ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ زمانے کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اپنی اصل نہیں کھوتیں۔

سنہری بھی اپنی فطرت بدل نہیں سکتی تھی لیکن انداز تبدیل کر سکتی تھی۔ اس نے انگلیاں ٹیڑھی کر کے بہت وقت ضائع کیا تھا، اب انگلی سیدھی کر کے وہ اپنے مقصد کے قریب تھی۔ یہ کیا برا تھا بھلا؟ اسے بس خود پہ ضبط رکھنا تھا۔ ایک چولا اوڑھنا تھا جسے تب تک اوڑھے رکھنا تھا جب تک وہ سب حاصل نہ ہو جاتا جسے پانے کی چاہ میں وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ قاسم ہزار اکتاہٹ اور بےزاری کے باوجود اب تک اس کے ساتھ تھا۔

حویلی لکھاں کے اندر ہر جگہ اس نے اپنا اثر چھوڑ دیا تھا۔ وہ میٹھی چھری بن چکی تھی۔ اس نے اس انداز میں سب کو رام کیا تھا کہ اس کی ہر چال سمجھنے کے باوجود اسے رفع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حویلی لکھاں اندر سے تبدیل ہو چکی تھی۔

پھپھو قدسیہ اور چوہدری انور یکے بعد دیگرے چل بسے تھے۔ ان کے تینوں بیٹوں کی شادی ان کی زندگی میں ہو چکی تھی لیکن بدقسمتی سے سنہری وہاں موجود تھی اور آنے والی تینوں بہوئیں اس کی فطرت سے انجان...... اس نے تینوں سے رفتہ رفتہ نزدیکی بڑھائی۔ سنہری تینوں کی بہترین دوست بن گئی۔ ہمدرد، غم گسار جو انہیں سسرال کے گھٹے ماحول سے نکلنے کے گر سکھاتی تھی۔ تینوں کی آپس میں ان بن شروع ہوئی اور جب تک اس پر قابو پایا جاتا معاملات اس حد تک بگڑ گئے کہ بزرگوں کے بیچ میں آنے کا وقت بھی گزر گیا۔ پھپھو قدسیہ کا منجھلا لڑکا بیوی کی شہ پر یورپ چلا گیا۔ عین جس دن جانا تھا، اس دن سب کو بتایا۔ ایک بار پھر وہی رسم نبھائی گئی جو حسنات نے ادا کی تھی۔ چوہدری انور نے ناراضی دکھائی تو اس کی زبان پہ ایک ہی جملہ تھا کہ اگر حسنات کا ساتھ دیا جا سکتا ہے تو مجھ سے بیر کیوں؟

وہ ٹھیک ہو سکتا ہے تو میں کیوں نہیں......؟ پھپھو قدسیہ کلیجہ پکڑے دیکھتی رہ گئیں اور بیٹا بیوی کی کلائی تھامے حویلی کی دہلیز پار کر گیا۔

اپنی حویلی کے دالان میں سے یہ منظر دیکھتی سنہری چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کمینگی لیے پراندہ جھلاتی رہی۔ اس نے مالا توڑ دی تھی۔ ایک موتی نکل گیا تھا باقی بھی بہت جلد بکھرنے لگتے۔ پھپھو قدسیہ بیمار ہو گئیں تو چوہدری انور کو ان کی طرف سے ایسا دھڑکا لگا کہ ان سے پہلے خود اللہ کو جان دے دی۔ قدسیہ پھپھو کو بیٹے کا غم لگا تھا، اب خاوند کی جدائی بھی سل کی طرح سینے پر آ پڑی۔ بہت جلد اس سل نے ان کے سانس روک دیے جب ایک دن مدثر اور مبشر اپنی زمینوں پہ بری طرح لڑ پڑے۔ لڑائی اس حد تک بڑھی کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ مجبوراً حیات کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موقع پر پہنچنا پڑا لیکن معاملہ حل تو تب ہوتا جب دونوں کا آپسی ہوتا۔ یہ آگ تو دونوں کی بیویوں نے ان کے دلوں میں بھڑکائی تھی اور اس آگ کو ایندھن فراہم کیا تھا سنہری نے۔

مبشر کی بیوی بہت عرصہ اس کے ہاتھ نہیں آسکی تھی لیکن کب تک۔ اس کے بدلے پینترے نے آخر کار کام دکھا دیا تھا۔ اسے سنہری اپنی ہمدرد لگی تو اندر کی باتیں بھی کھول دیں۔ سنہری نے ایسی گرہ دماغ میں لگائی کہ مدثر نے پہلے ایک بھائی کو تو حویلی سے نکالا تاکہ اس کی زمینیں ہڑپ سکے اور اب مبشر کی زمینوں پر نظر ہے اور اس کی بیوی اس کے کان بھرنے میں پیش پیش ہے۔ دوسری جانب مدثر کی بیوی سے یہی بات کہی تو دونوں نے اپنے شوہروں کو ایک دوسرے سے ہی لڑوا دیا۔ سنہری کے رستے کے کانٹے بنا چنے نکلنے کو تھے۔ حیات دونوں بھائیوں کو سمجھانے کے جتن کر رہا تھا۔ اسے اپنی پھپھی کی حالت دل پر گراں گزر رہی تھی۔ چوہدری شہاب الدین سے بات کی تو انہوں نے ہاتھ جھاڑ دیے تھے کہ وہ کل کے بچوں کو اپنے منہ نہیں پڑوا سکتے لیکن درپردہ وہ قاسم کے سمجھانے پر اس معاملے سے دور ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر ان کی نکیل قاسم کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ حیات کو حویلی لکھاں کا شیرازہ بکھرتا نظر آ رہا تھا اور زیادہ دن بھی نہیں گزرے مدثر نے شہر جانے کا قصد کیا۔ پڑھا لکھا تھا، وہاں کاروبار بھی کر سکتا تھا، نوکری بھی۔ جب دلوں میں بال آ چکا تھا تو ساتھ رہنے میں مزید خرابیاں ہی تھیں اور جس دن

اسے شہر روانہ ہونا تھا وہ پھپھو قدسیہ کے کمرے میں ان سے ملنے گیا لیکن انہوں نے بالآخر اپنی زندگی میں اس کے جانے کو روک ہی دیا تھا۔ وہ خود ابدی سفر پہ روانہ ہو چکی تھی۔ بیٹوں کی نا اتفاقی ان کی جان لے گئی تھی۔

مدثر غم اور صدمے سے منجمد ہو گیا لیکن بیوی نے جلد ہی اس برف کے تودے کو پگھلا دیا۔ سوا مہینہ پورا ہوتے ہی وہ خاموشی سے شہر روانہ ہو گیا۔

مبشر کو دلی صدمہ لگا تھا۔ اسے امید تھی چھوٹا بھائی اسے منا لے گا معافی تلافی کے بعد وہ بھی اسے سینے سے لگا لے گا لیکن مدثر کی انا کا پرچم بلند ہی رہا اور وہ بھی شہر میں جا کر بس گیا۔ اتنی بڑی حویلی لکھاں میں مبشر اور اس کی بیوی دو بچوں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ قاسم نے اپنے حصے کا کام شروع کیا اور اسے ذہنی دباؤ کا شکار کرنے کے لیے اس کی زمینوں پہ باہر کے بندوں سے نقصان کروانے لگا۔ فصلیں خراب ہو جاتیں تو کبھی مال بازار میں پہنچ کر لٹ جاتا۔ اچھی بھلی کھڑی فصل کو آگ لگی تو مبشر کے ہوش اڑ گئے۔ حیات نے جڑ تو پکڑ لی تھی۔ اسے مکمل اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سب کے پیچھے قاسم کا ہاتھ ہے۔ وہ اس کے گرد شکنجہ کسنا چاہتا تھا لیکن اس بار قاسم اکیلا نہیں تھا۔ چوہدری حاکم جو حیات اور قاسم دونوں کا مشترکہ دور پار کا رشتہ دار تھا اس کا قاسم سے گہرا یارانہ ہو چکا تھا۔ قاسم کی ہر چال کو کامیاب بنانے اور حیات کو اس تک پہنچنے میں ناکام کرنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ مبشر زیادہ وقت ان حالات کی مار نہیں سہہ سکا تھا اور اس نے بھی اپنی زمینیں بیچ کر شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور اس بار حیات بھی اسے روک نہیں پایا۔ پھپھو قدسیہ کی حویلی دنوں میں ویران ہو گئی یوں جیسے کوئی ہوا پھر گئی ہو جو سب کچھ اپنے ساتھ اڑا لے گئی تھی۔ خالی حویلی ہولناک منظر پیش کرتی تھی۔

حیات آتے جاتے نمناک نگاہوں سے اسے تکتا تو ماضی کی محفلیں رونقیں اور یاریاں دل کو تڑپاتی تھیں۔ پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ وہاں قاسم نے نیا رنگ و روغن کروانا شروع کیا تھا۔ حیرت میں گھرے حیات نے اس بارے میں کرید کی تو معلوم ہوا کہ وہ اس حویلی کو خرید چکا ہے۔ تینوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے کر اسے قاسم کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے اور حیات کو خبر تک نہ ہوئی تھی۔ اس بات کا

رنج حیات کو برسوں نہ جا سکا۔ مبشر اسے اعتماد میں لیتا تو یقیناً وہی اسے خرید کر محفوظ کر لیتا لیکن وہ نہیں جانتا تھا قاسم اور سنہری نے اس حویلی کو خریدنے کے لیے تینوں بھائیوں کو کس طرح گھیرا تھا۔ حویلی بکی اور وہاں قاسم نے اپنا سکہ جمانا شروع کیا۔

کشور اس تمام صورت حال سے الگ پریشان اور خائف تھی۔ اسے سنہری جیسے حویلی لکھاں کے ہر کونے پہ چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ وڈی چوہدرائن ضرور تھی لیکن اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا یہ اختیار اور منصب دھیرے دھیرے سنہری کے پاس منتقل ہونے جا رہا تھا۔ بہت طریقے اور اہتمام سے وہ ہر کام کیے جا رہی تھی۔ پنڈ کی عورتوں نے صلاح مشورے کے لیے اس کے پاس آنا شروع کیا تو کشور کو خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ لیکن حویلی لکھاں گردش ایام کی لپیٹ میں تھی، ہر طرف سے پریشانیوں نے گھیر سا لیا تھا۔ پھپھو قدسیہ کو دلاسے دینے کے لیے دن کا کافی وقت ان کے پاس گزارتی تھی، ان کی بہوؤں کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔ انہی کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پھپھو قدسیہ کے آنگن میں لگی آگ کی چنگاری سنہری کی بھڑکائی ہوئی ہے لیکن معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ ان کو سمجھانے سے عاجز آئی تو واپس اپنے معاملات پر دھیان دیتے محسوس ہوا کہ سنہری تو ہر جگہ قابض تھی۔ پنڈ کی عورتیں پہلے اسی کے پاس آتی تھیں لیکن اب بظاہر اس کے پاس اگر آتیں بھی تو کچھ ہی دیر میں اس سے اجازت لے کر سنہری کے پاس بیٹھی دکھائی دیتیں۔ اس بات کا شکوہ بھی وہ نہیں کر سکتی تھی کہ کن الفاظ میں آخر جتایا جاتا۔ حیات سے بھی ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ خود بھی آج کل حویلی اور ڈیرے کے معاملات کو لے کر پریشان رہا کرتا تھا۔ یوں بے حد آہستگی سے سنہری کا شکنجہ حویلی لکھاں کے گرد تنگ ہوتا سب ہی محسوس کر رہے تھے لیکن کسی کے بس میں یہ نہ تھا کہ اس شکنجے کا توڑ کر پائیں۔ اس بار سنہری کا ہر قدم ان کی سوچ سے آگے پڑتا تھا۔ وہ جو کرتی تھی اس ڈھب سے کرتی تھی کہ اس پر انگلی اٹھانا محال تھا۔ پنڈ کی عورتوں میں اس کی دھاک بیٹھتی جا رہی تھی۔ اس نے تسبیح تھام کر دم کرنے کا کام بھی اسی عرصے میں شروع کیا تھا۔ کچے ذہنوں کی عورتیں ہر دوسرے دن اس سے دم کروانے آنے لگیں اور یوں سنہری کا حلقہ ارادت بھی بڑھنے لگا۔ اس آڑ میں وہ سفلی عملیات بھی کرنے لگی تھی جس کا علم

سب کو تھا مگر ثبوت کسی کے پاس نہ تھا۔

کشور کو اب اس سے ویسا ہی خوف محسوس ہوتا تھا جیسا کسی وقت خانم بتایا کرتی تھی۔ مہریار اور اس سے چھوٹا شہریار سارا دن حویلی میں کھیلتے تھے لیکن کشور نے انہیں بھی محدود کر دیا تھا۔ اپنی حویلی کے اندر چھوڑ کر باہر صحن میں بھی سنہری کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی۔ ایک سوچے سمجھے طریقہ کار سے اس نے کشور اور اس کے بچوں کو ان کی حویلی کے اندر تک محدود کر دیا تھا۔ بچے اپنی ہی حویلی میں کھیلنے سے کتراتے کیونکہ اکثر سنہری انہیں ڈانٹ دیا کرتی یا پھر دونوں سنہری کے کیے بدعملیات کے اثرات کے تحت بیمار ہو جاتے۔ سخت تکلیف اور مصیبت کے دن تھے۔ کشور کا کوئی دم ساز اور غم خوار نہ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب ہی تتر بتر ہو گئے تھے یا وفات پا گئے تھے اور انہی دنوں ایک دن تڑکے ہی قاسم کی حویلی میں شور اٹھا کہ حمیدہ چاچی فوت ہو گئیں۔ اتنے سالوں سے بستر پہ لاچار پڑیں حمیدہ بالآخر اپنی ہی پنیویں کے ہاتھوں اگلے جہان سدھاری تھیں۔ پنڈ کی عورتیں اکٹھی ہوئیں تو کشور بھی حویلی میں حمیدہ چاچی کا چہرہ دیکھنے گئی جہاں ہلکی ہلکی چہ مگوئیاں اس کے کانوں میں بھی پڑیں۔ حمیدہ چاچی کا چہرہ نیلا پڑا تھا اور ہاتھ پیر جان کنی کی تکلیف کے باعث مڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں گویا پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب تھیں۔ سنہری نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماسی کو غسل خود دے گی اور اس نے دیا بھی۔ سوائے اس کے بھروسے کی ملازمہ کے کوئی بھی شریک نہ ہو سکا اور یوں اگلے چند ہی گھنٹوں میں حمیدہ چاچی کفنائی ہوئی سب کے سامنے سے اٹھالی گئیں اور دفنا دی گئیں۔

قاسم جیسے سدھ بدھ کھوئے سنہری کی انگلیوں کے اشارے ناچتا تھا۔ اس کی ماں مری تھی اور اسے جیسے بھار ہی نہیں تھا۔ کشور سارا وقت اپنے پنڈ اور دوسرے پنڈوں سے آئی عورتوں کا سنہری کی جانب التفات دیکھتی رہی تھی جو غیر معمولی تھا۔ اس کا حلیہ پہلے سے تبدیل ہو چکا تھا۔ ہاتھوں میں تین تین موٹے اور بڑے نگینوں والی انگوٹھیاں پہنے وہ تسبیح گھما کر پھونکیں مارتی جیسے سب ہی کی مسیحا بن چکی تھی۔ کشور واپس اپنی حویلی کے اندر گھسی تو دوبارہ وہاں نہیں گئی تھی۔ مہریار اور شہریار بھی سارا دن باپ کے ساتھ رہے تھے اس لیے اسے ان کی فکر نہیں تھی لیکن اس کا دل اس قدر گھبرا رہا تھا جیسے حویلی لکھاں کو

آسیبوں نے لپیٹ میں لے لیا ہو۔ بظاہر بس رہی تھی لیکن درحقیقت اجاڑ بیابان......!

اور یہ بات تو صرف سنہری جانتی تھی کہ حمیدہ سے جان چھڑانے میں اسے کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ بس یونہی کمرے میں بیٹھی تھی اپنے، ہاتھ میں تسبیح تھی اور چادر کو سر کے اوپر سے یوں اوڑھ رکھا تھا کہ وہ نیچے پیروں تک کو چھپا رہی تھی۔ کمرے کی تمام بتیاں بند تھیں سوائے سرخ رنگ کے زیرو واٹ کے بلب کے۔ جس چوکی پہ وہ بیٹھی تھی اس کے بالکل سامنے آئینہ رکھا تھا جس میں اس کی مکمل پرچھائی صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ کچھ پڑھتی اور چادر سے منہ نکال کر اپنے ہی عکس پر پھونک مار دیتی۔ اس عمل کو کرتے ابھی اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور مزید ابھی اسے وقت درکار تھا۔ قاسم کے آنے سے پہلے اسے کمرے کو سابقہ حالت میں بھی لانا تھا۔ تب ہی اچانک اسٹیل کا گلاس فرش پر دے مارنے کی زوردار آواز اس کی پڑھائی میں مخل ہوئی تو اس کی پیشانی پہ شکنیں پڑیں۔ اس نے اپنا ارتکاز ٹوٹنے نہ دیا اور واپس مشغول ہو گئی لیکن حمیدہ اسے یقیناً کسی بہت ضروری حاجت کے لیے بلا رہی تھی تب ہی ایک بار پھر اسٹیل کا برتن فرش پہ پھینکا گیا تھا جس کی چھناکے دار آواز رات کی خاموشی میں کانوں کو چیرتی ہوئی پھیلی تھی۔ اس کا دھیان بٹا اور جو الفاظ وہ ادا کر رہی تھی ان میں گڑبڑ ہونے سے اچانک سامنے رکھا آئینہ زوردار آواز کے ساتھ چٹخ گیا۔ اس کی پڑھائی بنا کسی نتیجے کے نقصان کی صورت میں ختم ہوئی تھی۔ غم و غصے نے اس کی حالت اس قدر غیر کی کہ وہ ایک جھٹکے سے چادر الٹتی کھڑی ہوئی اور سرخ موٹے اور بڑے دانوں والی مالا نما تسبیح چوکی پر پٹخی۔ کھڑی ہوئی اور آئینے کو افسوس اور اشتعال سے دیکھتی اپنی الماری کی جانب بڑھی۔ غصہ اس قدر تھا کہ اس کا پورا جسم تھرا رہا تھا۔ اس کا عمل بیچ میں سے پلٹ گیا تھا اور اس کے بداثرات اس کو کئی دن برداشت کرنا پڑنے تھے۔

الماری کھول کر اس نے اندرونی خانے کے پیچھے بنے ایک گہرے ڈبا نما دراز کا ڈھکن اٹھایا اور اندر سے ایک شیشے کا چھوٹا مرتبان نکالا۔ اس مرتبان کو اپنی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے عجیب پرلطف انداز میں مسکرائی۔ اس مرتبان میں تین چھوٹے سائز کے انتہائی زہریلے بچھو تھے جن کی دمیں یوں کھڑی تھیں گویا زہر کو بطور تمغہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ اس مرتبان کو لیے وہ دبے پیر چلتی حمیدہ کے

کمرے کی جانب گئی جہاں سے ایک بار پھر کچھ گرانے کی آواز ابھری تھی۔ ملازمائیں سو چکی تھیں اور ویسے بھی رات کے اس پہر سنہری نے کسی کو اجازت نہیں دے رکھی تھی کہ یہاں کا رخ کرتا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو حمیدہ سرہانے سے سر ڈھلکائے اپنا فالج زدہ دھڑ لٹکائے ہوئے تھی۔ فرش پر اس کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اسٹیل کا جگ اور گلاس دونوں گرے تھے۔ یقیناً وہ پانی مانگ رہی تھی کیونکہ جگ خالی تھا۔ سنہری کا دماغ بری طرح کھولا۔ وہ اس سے قریب ہوئی اور بولی۔

''ماسی! پانی چاہیے تجھے؟ کیا کرے گی پی کر۔ ساری عمر خون پیا ہے کیا اس سے پیٹ نہیں بھرا تیرا۔ اب پانی تجھے کیا فائدہ دے گا۔ تو پانی پیے گی۔ بستر بھرے گی تو اسے دھوئے گا کون؟ تیرا پیو......؟ بول......؟''

وہ جھک کر اس سے اپنی مکروہ آواز میں کہتی حمیدہ کو تکلیف میں مبتلا کر گئی۔ زبان کام نہیں کرتی تھی، حواس تو کرتے تھے۔ گزرے سالوں میں اپنی پنیویں کی اصلیت اس بری طرح آشکار ہوئی تھی کہ ہاتھ میں وقت نہ آتا تھا نہ موقع کہ سب سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتیں۔ سکینہ بھرجائی کے مرنے پر وہ بے حد تڑپی تھیں۔ رقیہ رہ رہ کر یاد آتی تھی اور اپنی کی گئی زیادتیاں رلاتی تھیں۔ ٹیڑھے منہ سے اور قفل لگی زبان سے وہ خود کو کوستی تھیں کہ سنہری جیسی بلا کو اس حویلی میں کیوں لائیں۔ وہ جس دن حویلی لکھاں سے بھرپور اکڑ کے ساتھ نکلی تھیں اس دن کی اگلی صبح نے ان پر سنہری کی اصلیت عیاں کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ جسے اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی تھیں درحقیقت وہ انہی کی دشمنی میں سب سے پہلے سامنے آئی تھی۔ چند ہی دنوں میں پوری حویلی کا انتظام و انصرام سنہری نے سنبھال لیا تھا۔ یہ حویلی ان کے مرحوم شوہر مہتاب کی تھی جس پر بلاشبہ ان کا پورا حق تھا لیکن سنہری نے اس طور انہیں کونے سے لگایا تھا کہ وہ اف بھی نہ کر سکی تھیں۔ قاسم کا دن اور رات حویلی سے باہر تھا اور پیچھے سنہری نے انہیں ذہنی اور جسمانی تکلیف اس انداز سے دینی شروع کی کہ وہ کسی کو بیان نہیں کر سکتی تھیں بس سہہ ہی سکتی تھیں۔ ان کے پاس بھی آج وہ الفاظ ہی نہیں تھے جن کے ذریعے وہ سب کو بتاتیں کہ سنہری ان کے ساتھ کیا کرتی ہے کیونکہ بظاہر وہ ان کا خیال کرتی تھی مگر درپردہ وہ انہیں مفلوج کر رہی تھی۔

ایک دن حقیقتاً انہیں فالج ہو گیا تھا۔ وہ جو خوراک کھاتی تھیں سنہری بناتی تھی۔ وہ جو پانی پیتی تھیں، اسے سنہری پوری دیدہ دلیری سے ان ہی کے سامنے بیٹھ کر دم کر کے دیتی تھی اور وہ پینے پر مجبور ہوتی تھیں کیونکہ ان کا چلنا پھرنا محض اپنے کمرے کی حد تک رہ گیا تھا۔ انہیں دوائیں کھلاتی تھی جو وہ نہ کھاتیں تو سنہری ایک طویل سانس خارج کرتی اور یوں کھڑی ہوتی جیسے بے حد تھک چکی ہو اور پھر ایک دم ان کا حلق جکڑتی جیسے ہی وہ دم گھٹنے پر منہ کھولتیں، سنہری وہ تمام گولیاں ان کے منہ میں جھونک دیتی۔ کبھی کوئی سفوف انہیں گھول کر پلا دیتی تو کبھی کسی مٹیالے رنگ کا محلول حمیدہ کو حلق سے نیچے اتارنا پڑتا اور پھر انہوں نے ایک صبح اپنے بستر پر آنکھیں کھولیں تو وہ نہ ہل سکتی تھیں، نہ بول سکتی تھیں، نہ فریاد کر سکتی تھیں۔ وہ بے کار لوتھڑا اپنے پلنگ کا بوجھ بن چکی تھیں۔

قاسم نے ڈاکٹروں کو دکھایا، چند دن بھاگ دوڑ کر کے علاج معالجہ کروایا لیکن بے سود اور پھر وہ اپنی مصروفیت میں ماں کو سنہری جیسی خون آشام بلا کے سپرد کر کے ڈیرے کا ہو کر رہ گیا۔ حمیدہ دل سے دعا کرتی تھیں کہ کسی دن سکینہ یا قدسیہ اچانک انہیں منانے آجائیں یا ملنے آجائیں تو ان کی حالت دیکھ کر انہیں ساتھ لے جائیں لیکن وہاں سے سکینہ کے فوت ہونے کی خبر آئی تو قدسیہ کی طرف سے امید خود بخود دم توڑ گئی۔ انہیں اپنی ماضی کی کی ہوئی تمام حرکتیں پلٹ پلٹ کر ظلم کا احساس دلاتی تھیں لیکن وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں سوائے اپنے ہولناک انجام کے انتظار کے......!

اور آج ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ حمیدہ انتہائی تکلیف کے عالم میں سنہری کو اپنے پاس آتے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں شدید پیاس اور بھوک تھی لیکن سنہری اکثر ہی انہیں سارا سارا دن بھوکا رکھتی تھی۔ بھوک سہنے کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں لیکن پیاس ان کے کمزور اور بیمار جسم کو بہت تکلیف دیتی تھی۔ سنہری دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ان کے قریب آئی تھی اور انہیں سخت ترین الفاظ میں کوس رہی تھی۔ بے ساختہ حمیدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"پانی نکل تو رہا ہے تیری آنکھوں سے، اسے ہی چاٹ لے نا، میرا دماغ کیوں چاٹتی رہتی ہے سارا دن۔ ایک تیرا وہ نکما بیٹا کافی نہیں ہے کیا؟"

حمیدہ رونا بھولتے بیٹے کے لیے اس کے الفاظ سن کر ماتھے پر تیوریاں لے آئیں۔ سنہری نے ان کی پیشانی کو انگلیوں سے ٹھوکا دیا اور بولی۔

”ان کے بل کسے دکھا رہی ہے ذلیل عورت۔ تو نے بہت عیش کر لی ماسی ساری عمر...... اب یوں کر کہ تُو سو جا۔“

سنہری کی بات سن کر حمیدہ کی غوں غاں میں ایک دم اضافہ ہوا۔ وہ مفلوج وجود کو پھڑ پھڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”تُو خود کیوں جان مارتی ہے ماسی۔ میں کس لیے ہوں۔ اپنی طاقت بچا کر رکھ، جان نکلتے وقت جو تکلیف اور درد سہنا ہے اس کے لیے نہیں چاہیے کیا؟ لے دیکھ تیرے لیے میں کچھ لائی ہوں تاکہ تجھے اس سیاپے سے نکالوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنی چادر کے نیچے سے وہ جار نکالا اور اسے حمیدہ کے سامنے لہرایا۔ وہ ادھ مری مزید پیلی پڑیں اور بلک بلک کر روتے کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”دیکھ ماسی! میرا وقت آ گیا ہے کہ اب میں حویلی لکھاں میں راج کروں، اس لیے مجھے پورا دھیان دینا پڑے گا۔ اور تیرا وقت آ گیا ہے کہ تو اپنی قبر کی سیر کرے۔ اتنا جی کے کرنا کیا ہے تو نے؟ ویسے بھی تو میری جان کو پھاہ بنی ہوئی ہے۔ نہ تیرا بیمار کا فائدہ اور نہ اچھی بھلی کا۔ دونوں صورتوں میں اب تو فارغ ہے ماسی، اس لیے اپنی قبر میں جا کر لیٹ سکون سے۔ وہاں کی ہی تیاری کروانے لگی ہوں تجھے۔ دیکھ ان بچھوؤں کو یہاں سہہ گئی تو سمجھ وہاں آسانی ہو جائے گی کیونکہ کب کوئی اچھے تو نہیں کیے نا ساری عمر تو نے۔ کس کس کو کیسے کیسے نہیں ستایا تو اب بسم اللہ کر اور نکل لے شاوا......!“

اتنا کہہ کر اس نے جار کھولا اور سرعت سے حمیدہ کے لحاف کے اندر الٹ دیا۔ خود سکون سے اٹھی اور چلتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ یہ دھند بھی کمال شے تھی، بڑے بڑے پردے رہ جاتے تھے اس میں۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کیے باغیچے کے فلک بوس درختوں کے سرے کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی اور پیچھے حمیدہ کے بستر میں اس

قدر ہلچل تھی جیسے مرغی کے گلے پر چھری پھیر کر قصائی نے اسے ڈرم میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ یہ ہلچل کتنی دیر جاری رہی سنہری نے اس کا اندازہ نہیں کیا لیکن اس نے درخت کے سرے پہ موجود دھند کو چھٹتے دیکھا تھا اور جب درخت مکمل طور پر واضح ہو گیا تو حمیدہ کے بستر پہ اتری قیامت بھی گزر گئی تھی۔ وہ لحاف میں جامنی سی ہوتے ہراس میں ڈوبی، کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتے، منہ کھولے ادھوری فریاد کے ساتھ لقمہ اجل بن چکی تھیں۔ سنہری کھڑکی میں کھڑی مسکرا مسکرا کر درخت کو ہوا سے جھولتا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

جس وقت حسنات اور خانم کا جہاز پاکستان میں اترا، حمیدہ کی موت کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ سنہری پہلے سے زیادہ پُر اعتماد نظر آتی تھی۔ ان دو ہفتوں میں کشور نے اسے زیادہ تر اپنی حویلی کے ہال کمرے میں چوہدری شہاب الدین کے پاس بیٹھے ہی دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا لاتی تھی اور پھر کتنی ہی دیر ان سے باتیں کیا کرتی۔ چوہدری شہاب جیسے اس کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ماضی میں سنہری کے ساتھ رکھے اپنے رویے پہ بھی افسوس ہوتا تھا۔ وہ برملا کہنے لگے تھے سنہری نے ان کی نمرہ کی کمی پوری کر دی تھی اور کشور بس دل مسوس کر حویلی کی ذمہ داریاں نبٹاتی تھی۔ ملازمائیں جیسے اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھیں۔ اس کی حویلی کی نوکرانیاں اکثر سنہری کی حویلی میں پائی جاتی تھیں۔ مجبوراً اسے حیات کو مکمل صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا تھا۔ اسے بتانا پڑا تھا کہ سنہری نے دن کے بیشتر حصے میں یہیں ڈیرے جما لیے تھے۔

حیات فکر مند بھی ہوا تھا اور ناراض بھی۔ اس کے خیال میں پہلے دن ہی کشور کو اسے بتا دینا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کا تدارک فوری طور پر کرتا۔ اسے دل میں اب محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اکیلا ہو گیا ہے۔ حسنات گیا تھا تو مبشر وغیرہ کے ہونے سے بہت حوصلہ رہا کرتا تھا لیکن جب سے پھپھو قدسیہ کی حویلی اجڑی تھی اور قاسم نے اسے خریدا تھا، تب سے اسے حسنات کی یاد شدت سے آنے لگی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حیات نے ہی حسنات کو پاکستان بلوایا تھا۔ خانم یہی سمجھتی تھی کہ حسنات نے اس کی استدعا کو قبول کر کے اسے پاکستان کا چکر لگوانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن درپردہ وہ حیات کے بلاوے پر

پاکستان پہنچا تھا۔ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ جس بھائی نے اس کے مشکل وقت میں راتوں رات اس کے اور خانم کے باہر جانے کا بندوبست کیا تھا جب اسے ضرورت پڑی تو وہ نہ آتا۔ وگرنہ خانم منتیں کرتی یا التجائیں، وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اب اس کی جھلک بھی دشمنوں کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی خانم کی آنکھیں بھیگی تھیں اور حسنات کی تشویش سے بھر گئی تھیں۔ ذہانت اور حالات کی سنگینی کو بھانپ لینے کا ہنر اسے ودیعت تھا اسی لیے دل کو عجیب ہی اٹھک بیٹھک نے جکڑ رکھا تھا۔اس نے سوچ رکھا تھا کہ جتنی جلدی ہوگا وہ واپسی کرے گا۔ کچھ سن گن تو اسے ٹیلی فون پر حیات نے دی تھی کہ حویلی کے حالات اچھے نہیں ہیں اور وہ کیوں اچھے نہ تھے بھلا وہ کیسے نہ سمجھتا۔آخر جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اپنے پیچھے سنہری اور قاسم کو چھوڑ کر گیا تھا اور بھیڑیے حویلی سے باہر نہیں، حویلی کے اندر آن بیٹھے تھے۔تو ان کی خون آشامی سے کیونکہ کوئی محفوظ رہتا۔

وہ پنڈ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور تب ہی اس کا موبائل تھرتھرایا۔نئی صدی کی شروعات ہو چکی تھی اور دنیا نت نئی ایجادات سے آشنا ہوتی جارہی تھی۔ ہر خاص و عام عورت کے پاس تو نہیں لیکن اب کوئی مرد ایسا نہیں تھا جس کے پاس موبائل فون نہ ہو۔حویلی لکھاں میں بھی وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ زمانے کے تغیرات نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔جدید سہولتوں نے پنڈ کا منہ بھی کرلیا تھا۔ حیات اپنے موبائل سے اس کے ساتھ مستقل رابطے میں تھا اور اب جب کہ حویلی لکھاں قریب آرہی تھی تو فطری طور پر بھائی باپ سے ملنے کی خوشی اور جوش نے آنکھوں کو نم کردیا تھا۔ جیسے ہی گاڑی نے پھاٹک پار کیا سامنے برآمدے میں حیات اپنے بچوں کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔اس سے دو قدم پیچھے کشور بھی موجود تھی۔ سب کے چہروں پہ موجود خوشی اس قدر تھی جو دور سے بھی نمایاں ہو کر اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

خانم باقاعدہ رونے لگی تھی۔اس کا ہاتھ گاڑی کے دروازے کے ہولڈر پر تھا جیسے ہی گاڑی رکتی وہ دروازہ کھول کر اتر جاتی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ابھی گاڑی ٹھیک سے رکی بھی نہ تھی اور وہ دروازہ کھول گئی۔ حسنات نے تنبیہاً اسے دیکھا مگر اس کا دھیان ہی کب تھا۔چھوٹی سی پانچ سالہ زل کو باپ کی

گود میں تھما کر وہ بے تابانہ کشور کی جانب لپکی لیکن اچانک سے مہریار نے شرارتاً اس کے سامنے آ کر راستہ روک دیا۔ جیسے اسے ستانا چاہتا ہو۔ خانم نے پورے جوش سے سب سے پہلے بھانجے کو ہی گلے سے لگا لیا۔ چھوٹا سا بچہ اب لڑکپن کی حدود میں داخل ہونے کو تھا۔ اس کا منہ ماتھا چوم کر وہ اس سے چھوٹے شہریار کی جانب لپکی اور اسے گود میں اٹھا کر لپٹا لیا۔

حیات نے خود آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار دیا تو وہ عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر پیشانی سے لگا گئی۔ باپ سے بڑھ کر محبت کرنے اور خیال رکھنے والا یہ شخص ہر مشکل وقت میں اس کے آگے کھڑا رہا تھا۔ حیات سے ملنے کے بعد وہ بچوں کی طرح با آواز روتی بہن سے لپٹی تو کونے کھدروں میں کھڑی ملازماؤں کی آنکھیں بھی نیر بہانے لگیں۔ ان کے پیچھے حیات اور حسنات ایک دوسرے کے گلے لگے جیسے اپنے سینے ایک دوسرے میں پیوست کر دینے کے درپے تھے۔ حیات بار بار بھائی کا ماتھا چومتا تھا جو پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور خوب رو ہو گیا تھا۔ باہر کی آب و ہوا اسے خوب راس آئی تھی۔ یہ جذباتی منظر جیسے فضائیں قید کرنے کو بادل کھینچ لائیں اور پورا آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔

چوہدری شہاب یہاں موجود نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اعلانیہ حسنات سے ناراضی کا اظہار برقرار رکھا تھا۔ حسنات کو معلوم تھا کہ وہ انہیں منا لے گا اس لیے فکر نہیں کی تھی۔ ہوا تیز ہونے لگی تو بارش کی موٹی موٹی بوندیں حویلی کے کھلے وسیع صحن میں ٹپاٹپ برسنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیسے موسم نے اپنے آثار بدلے تھے۔ حیات سب کو اندر لے جانے لگا۔ یکدم حویلی لکھاں کی سونی فضائیں گنگنا اٹھی تھیں۔

وہ سب اندر جانے لگے تو دوسری طرف اپنی حویلی کے برآمدے کے جالی دار دروازے کے پار کھڑی سنہری نے زمانے بھر کی نفرت نگاہوں میں سمو کر خانم اور حیات کو دیکھا تھا۔ اتنے سوہنے ایسے بانکے اور ایسے سر سے پیر تک سجے سنورے تو اس نے تصور نہیں کیے تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ خانم زیادہ حسین ہو گئی تھی یا حسنات زیادہ خوب رو...... جو بھی تھا سنہری کا سینہ جل اٹھا تھا۔ اس کے حلق میں پھن پھیلائے بیٹھے سانپ کا زہر جوش مارنے لگا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں خود کو کہتے سنا تھا۔

''حویلی لکھاں آئی ہو خانم...... واپسی کا دروازہ تم پر بند ہے۔''

باہر بارش نے بہت زور پکڑ لیا تھا۔ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ تیز ہوائیں کھڑکیاں بجانے لگی تھیں۔ یکدم موسم کی خوب صورتی میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں کی رونقیں اچانک سے جاگ اٹھی تھیں۔ حسنات نے خود جا کر مبشر اور اس سے چھوٹے دونوں بھائیوں کو منایا اور کچھ دن کے لیے مبشر اور مدثر کو حویلی لے آیا کیونکہ پھپھو قدسیہ کا منجھلا بیٹا ملک سے باہر سیٹل ہو چکا تھا لہٰذا اس کا آنا ممکن تو نہیں تھا لیکن حسنات نے اس کی مبشر اور مدثر سے صلح ضرور کروادی تھی۔ کشور نے خانم کے ساتھ مل کر ان دونوں کی بیویوں کے دماغ صاف کیے۔ مکمل طور پر نہ سہی، لیکن کافی حد تک غلط فہمیوں کے بادل چھٹے تو ایک بار پھر کشادہ اور وسیع صحن میں لگنے والی رونقیں ماضی کی یاد دلانے لگیں۔ حالات اور وقت نے کردار بدل دیے تھے، ورنہ وہی چارپائی تھی، وہی پیڑھے کرسیاں تھیں، وہی مسلسل آتی چائے اور ساتھ پکوڑے، سموسے، جلیبیاں اور وہی قہقہے جن میں آج بھی حسبِ ماضی قاسم شامل نہیں تھا بلکہ اب تو اسے کہا جاتا ہی نہیں تھا۔ وقت بیت ضرور گیا تھا لیکن حسنات کے دل سے قاسم اور اس کی بیوی کی نفرت نہیں جا سکی تھی۔ ویسے بھی قاسم کا زیادہ وقت شہر گزرا کرتا یا پھر اپنے ڈیرے پر۔ بچا کھچا وقت وہ ہوٹل کو دیا کرتا تھا جس نے گزشتہ سالوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا اور قاسم نے وہاں سے خوب پیسہ......!

حیات اس معاملے کو تھانے کچہریوں تک لے جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ زمین ہتھیائی گئی تھی مگر کشور نے سختی سے منع کر دیا۔ اول وہ چوہدری شہاب الدین کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتی تھی اور دوسرے وہ جانتی تھی کہ قاسم کے شیطانی دماغ سے کچھ بعید نہیں جس کا پتا سنہری کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سنہری سے کس حد تک خوف کھا چکی تھی اس کا اندازہ حیات کو ہو چلا تھا اور کشور کو اپنا سہاگ عزیز تھا۔ صحن میں سب ہی کے بچے کھیل رہے تھے جن میں گڑیا سی زمل کو پلکوں پہ بٹھایا جا رہا تھا کیونکہ وہ سب ہی کے لیے خاص تھی۔ مبشر اور مدثر کے بچے اس چینی کی گڑیا کو یوں دیکھتے جیسے اس کے عقیدت مند ہوں۔ شہریار کی وہ ہم عمر تھی اس لیے وہ اس کو مسلسل اپنے ساتھ پورے استحقاق سے کھلانا چاہتا تھا جبکہ مہریار کی اس میں

دلچسپی اس قدر تھی کہ وہ ہر ہر پل اس کا بڑا ابنا اس کی دیکھ بھال میں لگا رہتا تھا۔ وہ کہیں گر نہ جائے، اسے چوٹ نہ لگے۔ اس کے سفید چاک سے بنے ہاتھ گندے نہ ہوں اور پیروں کی سینڈل تو وہ اترنے ہی نہ دیتا تھا کہ کہیں اس کے سفید بدلی سے حسین پیر خراب نہ ہوں۔ وہ سب کو کھلاتا لیکن زحل کی چوکیداری پہ متعین تھا۔

اس تمام منظر کو اپنی حویلی کے جالی دار دروازے کے پار سے دیکھتی سنہری کے لیے ہضم کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ بھلا جس خانم کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ وہ اس کے آگے نگاہ اٹھا پاتی، وہی خانم آج بے نظیر بنی سب کے درمیان تھی۔ سب اس کے لاڈ اٹھا رہے تھے اور محبتیں نچھاور کر رہے تھے۔ اس کی نزاکت اور خوب صورتی مبشر اور مدثر کی بیویوں کو گرویدہ کیے ہوئے تھی۔ اس کا لب و لہجہ اور خلوص دونوں کو اس کی جانب کھینچتا تھا۔ تب ہی سنہری کے کانوں میں مردوں کے درمیان ہونے والی گفتگو پڑی تو جیسے اس کا رواں رواں تیزاب میں جھلس گیا۔

پھپھو قدسیہ کے تینوں بیٹوں کی صلح ہوئی تو دل پرانی چاہتوں کے درمیان واپس آنے کو ہمکنے لگے تھے۔ پھپھو قدسیہ کی حویلی بکنے کا افسوس سب ہی کے دلوں میں سر اٹھانے لگا۔ اسی وقت حسنات نے رائے دی کہ پھپھو قدسیہ کی حویلی کو قاسم سے دوبارہ خریدا جائے تاکہ مبشر اور مدثر اسے آباد کر سکیں اور پرانے دنوں کی رونقیں پلٹ آئیں۔

سنہری نے اپنی سانپ سی گول اور چھوٹی آنکھیں مزید سکیڑ کر سب کے چہروں کو جانچا تو سب سے زیادہ اس بات کی حامی جو دکھائی دیں وہ مبشر اور مدثر کی گھر والیاں تھیں جنہیں کن جتنوں سے اس نے ایک دوسرے سے متنفر کر کے یہاں سے نکالا تھا۔

مہر یار بارہ تیرہ سالہ لڑکا تھا اور باپ کے بعد حسنات سے بے حد قریب ہو چکا تھا کیونکہ موبائل فون کی سہولت نے اسے کسی بھی قریبی رشتے سے انجان نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ امریکا میں رہتے بھی مسلسل اپنے چاچو سے رابطے اور گفتگو میں رہا کرتا تھا۔ حسنات کو اس میں اپنا بچپن دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھی بالکل ایسا ہی لاابالی اور بیک وقت سب کا خیال رکھنے والا تھا۔ اپنے چچا کے ساتھ اس کا لگاؤ بھی ایسا

ہی تھا۔ مہریار کے کان میں جیسے ہی بڑوں کی باتوں کا متن پہنچا وہ فوری طور پر زل کا ہاتھ تھامے وہیں آ گیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ سب کا ارادہ پھپھو قدسیہ کی حویلی دوبارہ آباد کرنے کا ہے تو اس کے چہرے کی چمک دیدنی تھی۔ وہ حسنات کی پشت پر آ کر اس کی گردن کے گرد بازو لپیٹ کر بولا۔

"مجھے یقین تھا چاچو کہ آپ آئیں گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تھوڑا جلدی آ جاتے تو یہ سب ہوا ہی نہ ہوتا۔"

ایک بڑھتی عمر کے بچے کے منہ سے ایسی سمجھداری کی بات سن کر سب ہی ایک پل کو گنگ ہو گئے۔ مبشر اور مدثر کا سر شرمندگی سے جھک سا گیا۔

ملال زدہ لہجے میں مبشر بولا۔

"میں آج ہی قاسم سے بات کروں گا کہ حویلی ہم واپس خرید رہے ہیں، ہمیں نہیں راس آئی شہر کی ہوا۔"

خوشی اور شادمانی سب ہی کے چہروں پہ دمک اٹھی تھی۔ اور یہی چمک سنہری کے دل کی سیاہی اس کے چہرے پر لے آئی۔ اس نے شاطرانہ مسکراہٹ سے سب ہی کو خوش گپیوں میں مشغول دیکھا اور خود اندر بڑھ گئی۔ اسے جلد از جلد قاسم سے رابطہ کرنا تھا۔ شام سے پہلے پھپھو قدسیہ کی حویلی کو آباد کرنا لازمی تھا۔

☆......☆......☆

آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں موجود خانم اور حسنات کو بات کرنے کا کھل کر موقع ملا۔ خانم اس قدر خوش تھی کہ حسنات کو اس پہ غصہ آنے لگا تھا۔ وہ کچھ کچھ اکھڑا ہوا اور بےزار سا بھی تھا۔ واش روم سے وضو کر کے نکلتی خانم نے اسے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھے کسی سوچ میں گم پایا تو رہ نہ سکی۔

"حسنات! کیا کوئی مسئلہ ہے۔ دو دن سے دیکھ رہی ہوں کہ کچھ پریشان سے ہیں بلکہ جس دن کے مبشر لالہ اور مدثر لالہ آئے ہیں، آپ چپ چپ سے ہیں۔ کیا ان کا آنا نہیں پسند آیا، حالانکہ آپ تو خود شوق سے منا کر لائے تھے۔"

وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی اور کندھے پہ ہاتھ رکھے پوچھنے لگی۔ تازے وضو کے قطرے اس کے چہرے پر کہیں کہیں چمک رہے تھے اور اس کی دل ربائی میں اضافہ کر رہے تھے۔ حسنات نے بغور اسے دیکھا اور دل میں مخاطب ہوا۔

''کاش! تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا پری کہ تمہاری خوشی مجھے کتنی عزیز ہے۔ تم سے کس قدر محبت ہے مجھے کہ تمہیں کوئی تکلیف آئے، یہ سوچ ہی میرے لیے ڈراؤنا خواب ہے۔ تم ہنستی رہو، اس جتن میں میں اپنی ساری عمر گزار سکتا ہوں۔ لیکن اس دل کا کیا کروں جسے تمہاری طرف سے لگے دھڑکے جاتے ہی نہیں۔ وہم پیچھا ہی نہیں چھوڑتے میرا۔''

''کیا سوچنے لگے ہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟'' خانم اکتا کر دوبارہ بولی تو وہ چونکا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے واپسی کی جلدی ہے پری۔ واپس جا کر جوائننگ دینی ہے۔ میری پڑھائی بھی دو ماہ بعد شروع ہونے والی ہے اور زمل کا اسکول بھی شروع ہونے والا ہے۔''

اس کے کہنے کی دیر تھی خانم کا منہ اتر گیا تھا۔ اس کا دل ایک دم اداس ہوا تھا۔ وہ تو شاید واپسی والی بات بھولی ہوئی تھی، تب ہی ڈرتے ڈرتے بولی۔

''حسنات! ہم...... میرا مطلب ہے ہم اب یہیں نہ رہ جائیں۔ دیکھیں نا، زمل کتنا خوش ہے۔ اس کے کزنز ہیں یہاں۔ پھر اب تو مبشر لالہ بھی واپس آنے والے ہیں۔ زمل اپنوں میں بڑی ہوگی تو رشتوں کی پہچان پیدا ہوگی نا اس میں۔''

''مجھے سبق پڑھا رہی ہو؟'' وہ تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ خانم ایک دم سہم گئی۔ وہ اب بھی اس کی ایک گھوری یا گہری نگاہ سے خائف رہا کرتی تھی۔ حسنات نے گہری سانس بھرتے اس کا ہاتھ تھاما اور رسان سے بولا۔

''مبشر بھائی واپس آجائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ کم از کم حیات لالہ کے اکیلے ہونے کی پریشانی تو ختم ہو جائے گی لیکن ہم یہاں مستقل نہیں آئے پری، ہمیں واپس جانا ہے اور یہ بات حیات لالہ کو اچھے

سے پتا ہے۔ تم گزرا وقت بھول چکی ہوگی، میں نہیں۔ میرے لیے قاسم اور اس کی بیوی اب بھی یاجوج ماجوج کی طرح ہیں جو ایک آڑ کے پار اپنی کارگزاری میں مصروف ہیں۔ جس دن ان کا داؤ چلے گا وہ اپنے وار میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"لیکن سنہری تو بہت اچھے سے ملی ہے مجھے...... بلکہ وہ تو کہہ رہی تھی کہ......"

"اس کا اچھے سے ملنا ہی اصل خوف کی علامت ہے پری۔ وہ دنیا کا آخری شخص بھی ہو تب بھی کبھی اس پر بھروسا نہ کرنا، بھلے اپنے دائرے میں جان دے دینا لیکن اس کے حصار میں داخل ہونے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔"

"آپ مجھے ڈرائیں تو نا......"

("کاش! تمہیں بتا سکتا کہ سنہری کس طرح حویلی پر قابض ہو چکی ہے اور اسی کی آپا کشور کو تقریباً کونے سے لگا چکی ہے۔ اب بھی بدستور وہ چالوں پر چالیں چلتی چلی جارہی ہے۔")

اس نے حیات سے درخواست کی تھی کہ کشور کو منع کردے کہ وہ خانم کو سنہری کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے گریز کرے تاکہ اس کی خوشی میں کسی خوف کی ملاوٹ نہ ہو۔ اسے اتنا ہی دھیان رہا کرتا تھا اس کا۔ اسی لیے خانم کو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی محسوس ہورہا تھا۔ سنہری اس سے روزانہ کسی نہ کسی وقت مل رہی ہوتی تھی اور بہت عاجزی سے پیش آرہی تھی۔ نگاہیں جھکا کر کلام کرتی اور آواز میں نرمی اور ٹھہراؤ ہوتا۔ اس نے جتنی بار بھی اس سے ملاقات کی تھی اکیلے کی تھی، پھر بھی خانم کو اس سے خوف محسوس نہیں ہوسکا تھا اس لیے اس نے ذہن بنالیا تھا کہ حسنات کو کسی طرح پاکستان میں رہنے کے لیے قائل کرلے گی۔ لیکن اس کے تیور خلاف توقع زیادہ خراب تھے۔

"آپ نے مہریار کو دیکھا ہے کتنا لاڈلا ہے ناوہ تایاجی کا...... بڑا بیٹا ہے نا حویلی کا۔ ایسے ہی ہماری زمل بھی حویلی کی بڑی بیٹی ہوگی تو اسے بھی تایاجی کتنا چاہیں گے۔ دادا کو اپنی پوتی سے تو محبت لازمی ہوگی۔" اس نے آخری حربے کے طور پر جذبات کا سہارا لیا تھا۔ حسنات نے اس کی جانب طنز سے دیکھا اور گویا ہوا۔

"اباجی نے زل کو گود میں بھرنا تو دور کی بات، اسے ٹھیک سے دیکھنا گوارا نہیں کیا تم بات کرتی ہو محبت کی۔ ان کی نظر میں وہ بس تمہاری بیٹی ہے اور آفتاب چاچا کی نواسی۔ اس سے آگے ان کی سوچ کبھی نہیں جائے گی۔ حیات لالہ نے بتایا تھا مجھے پری کہ اباجی ایک بار پھر مکمل طور پر قاسم کے زیر اثر ہیں اور ایسی صورت حال کو ہم ماضی میں بھگت چکے ہیں۔ اس لیے اپنا سامان ان پیک نہ کرنا ورنہ دوبارہ پیک کرنے میں مشکل ہوگی۔ سمجھیں......؟ اب اٹھو اور نماز پڑھو، میں بھی وضو کرلوں۔"

وہ دوٹوک انداز میں بات مکمل کر کے واش روم چلا گیا تھا۔ پیچھے خانم جلتی کلستی منہ بسورتی بند دروازے کو گھورتی رہی اور پھر غصے سے اٹھی اور جائے نماز بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی۔ آج اس نے زوروشور سے اللہ سے دعا کرنی تھی کہ وہ یہیں رہ جائیں۔

کچھ دعائیں قبول ہو جاتی ہیں لیکن ان کی قبولیت کا ڈھب ایسا ہوتا ہے کہ وہ انسان کو حسرت میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ کاش اس نے یہ خواہش کی ہی نہ ہوتی!

☆......☆......☆

حویلی لکھاں میں شام ہوئی اور ایک بار پھر سب صحن میں اکٹھے ہونا شروع ہوئے۔ مردوں کی بیٹھک لگ گئی اور خواتین ملازماؤں کے ساتھ شام کی چائے تیار کر کے باہر لانے لگیں۔ ماحول بہت خوش گوار تھا۔

کچھ ہی دیر میں چوہدری شہاب الدین ڈیرے سے آنے والے تھے۔ مبشر اور مدثر کو بے چینی سے ان کا انتظار تھا۔ ان کی پرملال نظریں بار بار اپنی حویلی کی جانب اٹھتیں تو دل مسلا جاتا۔ ایک ذرا جلد بازی نے ان کے ہاتھ سے ورثہ ضائع کرا دیا تھا۔ خیر دل کو پوری امید تھی کہ چوہدری شہاب کو جب مدعا بیان کیا جائے گا تو وہ قاسم کو اپنے بھانجوں کی خاطر قائل کرلیں گے۔ آخر وہ ان کی مرحومہ بہن کے بچے تھے۔ کچھ ہی دیر میں حویلی کا پھاٹک کھلا اور یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں حویلی کے اندر داخل ہوئیں اور ایک ترتیب سے کھڑی ہوگئیں۔ سب ہی اچنبھے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سنہری بھی ایک دم سے اپنی کچھار سے باہر نکلی اور صحن میں پورے طمطراق سے آ کھڑی ہوئی۔

خانم نے کشور کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور کشور نے حیات کی جانب جس نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے اور دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ سب ہی خواتین سروں کو ڈھکتے ایک جانب کھڑی ہو چکی تھیں۔ چوہدری شہاب اور قاسم ایک ہی گاڑی سے اترے اور چلتے ہوئے ان تک پہنچے۔ ان کے پیچھے دوسری گاڑی سے سب سے پہلے چوہدری حاکم نکلا تھا اور ساتھ اس کے گھر کی خواتین اور بچے تھے۔ سب ہی خراماں خراماں چلتے ان تک آئے تھے۔ چوہدری حاکم اور اس کے گھر کی عورتوں کی نظریں ہر شے کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ انہوں نے وہاں پہلے سے موجود خواتین سے سلام لینے میں پہل بھی نہیں کی تھی۔ کشور چونکہ حویلی کی بڑی مانی جاتی تھی لہٰذا اسے آگے ہونا پڑا تھا اور انہیں خوش آمدید کہنا پڑا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی بھی باری باری آگے بڑھیں لیکن صورت حال بہت عجیب اور گھٹن زدہ تھی۔

چوہدری شہاب نے اپنی مخصوص جگہ سنبھالی اور سب کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چوہدری حاکم پورے استحقاق سے چلتا ہوا کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر یوں بیٹھا جیسے مالکانہ حقوق محفوظ رکھتا ہو۔ حیات اور حسنات دونوں نے اس کے رویے کا برا منایا تھا اور باپ کو تادیبی نگاہوں سے دیکھا تھا لیکن ان کا دھیان قاسم کی جانب تھا جو ان کے کان میں گھسا کچھ کہہ رہا تھا۔

"او بھئی، بیٹھ بھی جاؤ یا کھلوتے پنڈ سے آئے ہو۔" چوہدری شہاب تمسخرانہ سب سے مخاطب ہوئے۔ سب ہی بے آرام سے بیٹھ گئے تھے لیکن الجھن شدید تھی۔

"دیکھو منڈیو......!" وہ ایک بار پھر سب پہ نظر دوڑاتے ہوئے بولے۔ "یہ حویلی بہت خالی خالی ہو گئی ہے۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ حویلی لکھاں کے اندر کی چھوٹی حویلیوں میں سے کوئی خالی ہو۔ جب سے میری بہن گئی ہے میرا سجا (دایاں) پاسا تو جیسے اجڑ ہی گیا ہے۔"

انہوں نے ایک سوکھی سانس خارج کرتے ہوئے پھپھو قدسیہ کی حویلی کی جانب دیکھا جس کی وجہ سے مبشر اور مدثر کے چہروں پہ امید افزا مسکراہٹ رینگ گئی لیکن ایسی مسکراہٹ حیات اور حسنات دونوں کے ہونٹوں پہ نہ ابھر سکی۔

"اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھ سے سونی حویلی دیکھی نہیں جاتی۔ قاسم میرے پتر نے اسے خرید تو لیا ہے لیکن وچارہ ادھر وسے (بسے) کیسے۔ لیکن حویلی تو اب اسی کی ہے نا کیونکہ وارث تو ادھر سے مک مکا کر کے ٹُر گئے تھے۔"

وہی طنزیہ نگاہ بھانجوں کی جانب اچھلی تو دونوں چیں بہ چیں ہوئے لیکن ضبط نہیں کھو سکتے تھے۔

"اب معاملہ یہ ہے کہ حویلی خالی تو رکھنی نہیں اس لیے قاسم یہ اپنا حاکم اور اس کے ٹبر کو یہاں لے آیا ہے۔ اب سے وہ ادھر رہیں گے۔ بہت چھیتی (جلدی) قاسم اپنے یار کو یہ حویلی بیچ دے گا۔ تب تک تم لوگ ان کی خاطریں کرو تا کہ ان کا دل لگے یہاں۔ پھر جب یہ حویلی ان کی ہو جائے گی تب آپے اپنا دل پے لگائیں۔ کیوں جی؟"

اتنا کہہ کر وہ قاسم اور حاکم کو دیکھ کر ہنسے۔ جواباً ان دونوں کا قہقہہ جیسے ساری فضا کو مکروہ کر گیا تھا۔

چوہدری شہاب الدین نے سب کے سروں پہ بم پھوڑا تھا۔ حویلی کے چار مرد تنتنا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مبشر اور مدثر کے چہرے اہانت اور طیش سے سرخ تھے جبکہ حیات نے انہیں آنکھ کے اشارے سے پیش قدمی کرنے سے روکا۔ اس معاملے کو بات چیت سے سلجھانا ہی واحد حل تھا۔

"ابا جی! اگر یہ مذاق ہے تو کچھ جچا نہیں آپ کو اور اگر سچ ہے تو ایسا ہرگز ممکن نہیں۔" حیات نے سبھاؤ سے بات شروع کی۔

قاسم اور حاکم کی تیوریاں چڑھیں، ساتھ ہی چوہدری شہاب بھی غصے میں آتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

"کیوں جی...... اب تو مجھے پچ سکھائے گا۔ پہلے باپ سے بات کرنے کا چج تو سیکھ۔ اور کیوں نہیں ممکن...... قاسم لایا ہے حاکم کو۔ اس کی حویلی ہے۔"

"آپ ایک پرائے مرد کو حویلی میں رہنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ اس حویلی میں ہماری عورتیں ہوتی ہیں۔ حاکم کوئی ہمارا قریبی رشتے دار نہیں۔ مامے پھپھی کا پتر نہیں ہے ابا جی۔ ہم ایک نامحرم اور غیر اپنی عورتوں کے درمیان اس حویلی میں گھسنے کیسے دیں؟"

حسنات کا صبر جواب دے گیا تو وہ بلا لحاظ بولا۔ ساتھ ہی کینہ توز نگاہیں قاسم اور حاکم پر ڈالیں۔

حاکم کے گھر والے الگ انہیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہیں ان کے حق سے محروم کیا جانے والا ہو۔ اس قدر حقارت اور نفرت۔ الامان الحفیظ!

''اچھا......'' قاسم دو قدم آگے آتا بولا۔ ''پرائے کی بات تو ایسے کر رہے ہو جیسے اب سے پہلے حویلی لکھاں میں سب ہی دودھ شریک بہن بھائی رہتے رہے ہیں۔ کیا تب محرم نامحرم یاد نہیں تھے۔ تم لوگوں کی بیویاں تم ہی لوگوں کے ساتھ ہاسے کھیڈیں (ہنسنا کھیلنا) کرتی رہی ہیں تب اس بات کی ہوش نہیں تھی آئی کیا۔ حساب تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ تب مبشر لوگ تھے اب حاکم ہے۔ رشتہ کی نزدیکی کی گل نہ ہی چھیڑو حیات باؤ۔ اگلا پچھلا بہت کچھ کھل جائے گا۔''

''او تو کھول اوئے کیا کھولنا ہے تو نے۔ بہت سن لی تیری بک بک!'' مبشر ایک دم غصے میں آپے سے باہر ہوتا ہوا بولا۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تھا تو لحاظ کیسا!

''کیوں چبھی ہے نا زور کی......؟'' قاسم دانت پیستا غرایا۔ ''اپنی حویلی بیچتے وقت سوچنا تھا اب یہ میری ہے تو میں جس کو مرضی بیچوں اور جسے مرضی یہاں رکھوں۔ اگر کسی کو بہت مسئلہ ہے تو اپنی بیویوں کو برقعے پہنا لے۔ حاکم تو اب یہیں رہے گا اپنے ٹبر کے ساتھ!''

قاسم نے اپنی چادر کا پلو جھٹک کر دوٹوک بات ختم کی۔

چوہدری حاکم نے پشت پہ کھڑے مونچھوں کو تاؤ دیتے فاتحانہ ان سب پہ نگاہ ڈالی۔ وہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ لطف اٹھا رہا تھا صورت حال کا۔ مدثر اور مبشر ایک دم اسے مارنے کو آگے بڑھے تب ہی درمیان میں قاسم آ گیا۔ بات ہاتھا پائی پہ اتر آئی۔ حیات نے بے حد دکھ اور تاسف سے باپ کو دیکھا جس کی عقل گویا قاسم کے ہاتھوں میں گروی رکھی جا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھتی حیات اور حسنات نے درمیان میں پڑ کر لڑائی کو روکا لیکن یہ ایک ایسی خاموش جنگ کی ابتدا تھی جس کی انتہا اگلی نسلوں تک جانے والی تھی۔ مبشر اور مدثر کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں حویلی ملتی نہ ملتی لیکن چوہدری حاکم ان لوگوں کے درمیان کس حیثیت سے گھس سکتا تھا۔ حویلی لکھاں کی چار دیواری میں حویلی کے بیٹے اور بیٹی کو بسایا گیا تھا، آگے ان کی اولادوں نے یہاں آنکھ کھولی تھی اور جوان ہوئے تھے۔

قرابت داری تھی، دکھ سکھ سانجھا تھا تو ان سب کا تھانہ کہ کوئی برادری کا دور پار کا رشتے داران کی حویلی میں آ کر اسی حیثیت سے رہنا شروع کر دیتا جو ان سب کو وہاں حاصل تھی۔ ماحول مزید گرم ہوتا، اس سے پہلے چوہدری شہاب کی آواز گونجی۔

''بند کراوئے تماشے اپنے۔ ایسے کسب (کرتوت) ہی نہیں کرنے تھے نا کہ تھاں (جگہ) نیچنی پڑ جاتی۔ پہلے ایک دوسرے کو وڈتے پھر رہے تھے اب جب شہر کی لوگی ہے تو واپسی کے ہڑ کے جاگ گئے ہیں۔''

مبشر اور مدثر تو ششدر تھے ہی، حیات اور حسنات بھی باپ کی ایسی گفتگو وہ بھی سگے بھانجوں کے لیے، سن کر دنگ رہ گئے۔ یہ تو صاف صاف ان سب کو قاسم اور حاکم کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دینے والی باتیں کی تھیں۔

''ماما جی......! بھائیوں میں سو اوچی نیوی (اونچ نیچ) ہو جاتی ہے۔ ایسی کون سی ماڑی گل ہو گئی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ باہر کے لوگوں کے سامنے آپ کچھ بھی کہہ دیں۔ ایسا ہے تو آپ نے ساری عمر اپنے کون سے بھائی کے ساتھ لگا کر کھائی ہے۔ ماما مہتاب تو مر گیا لیکن آفتاب ماموں کے ساتھ جو آپ کرتے رہے ہیں، اب کیا ہم یاد کراتے اچھے لگتے ہیں۔''

مبشر اب اپنے گھرانے کا بڑا تھا اس لیے اسی نے چوہدری شہاب کو آئینہ دکھا کر ٹھیک ٹھاک سنا دی تھیں۔ چوہدری شہاب کا رنگ متغیر ہوا اور انہوں نے اشتعال میں دونوں بھائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بوہتی گل نہیں کرنی میں نے۔ یہاں رہو، کھاؤ پیو، اور پھر اگلی واری آنے کے لیے واپس گھروں کو جاؤ۔ اور کوئی خیال ہے تو بھول جاؤ کیونکہ قاسم اس حویلی کا مالک ہے اور اس کا فیصلہ وہی کرے گا۔ میں ہور کوئی گل نہیں کرنی اب۔''

وہ بات مکمل کر کے اندر جانے لگے تھے۔ انہیں لگا کہ اب کوئی نہیں بولے گا پر معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا۔ ان کے سامنے وہ چاروں ہی سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر کھڑی مسکراہٹ دباتی سنہری کو اس مکالمے نے خوب لطف دیا تھا۔ اس کے چسکے کا سامان ختم ہوا اور وہ اپنا پراندہ جھلاتی

ایک ہاتھ میں تسبیح رولتی واپس اندر کی طرف مڑ گئی۔ قاسم نے اس کی سوچ سے زیادہ جلدی اس کے مشورے پہ عمل کیا تھا۔

بات یہاں آ کر رکی تھی کہ حویلی قاسم کی تھی سو دفعہ ہوتی لیکن اس حویلی کا منہ اب اندر کی باقی حویلیوں کی جانب نہیں کھلے گا کیونکہ ان کی بیویاں چوہدری حاکم کی موجودگی میں ہرگز مطمئن نہیں تھیں۔ اب بات پہ خوب لے دے ہو کر معاملہ یوں نبٹا کہ پھپھو قدسیہ کے حویلی کے صحن میں کھلنے والے سب دروازے بند کر دیے جائیں گے اور حویلی کے دوسری طرف ان کے لیے داخلی دروازہ اور پھاٹک بنایا جائے گا۔ یوں حویلی لکھاں پہلی بار بٹوارے کا شکار ہو گئی۔ پھپھو قدسیہ کی حویلی جو پہلے متصل تھی اسے الگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دلوں میں چوہدری شہاب کی طرف سے انتہا کی رنجشیں اور ملال لیے مبشر اور مدثر واپس چلے گئے۔ کشور کا دل بری طرح سہم گیا۔ خانم تو جلد ہی چلی جاتی، پیچھے وہ اکیلی ان لوگوں میں کس طرح رہتی۔ اپنی ہی حویلی یکدم پرائی لگنے لگی۔ حیات اور حسنات دونوں اس صورت حال سے انتہائی دل شکستہ تھے لیکن چوہدری شہاب کا حل ان کے پاس نہیں تھا۔ پوری حویلی پہ قاسم کی اجارہ داری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ آنے والا وقت مشکل ترین دکھائی دینے لگا تھا۔ قاسم کو اس حویلی کے اندر داخلہ دینے کا خمیازہ وہ سب بھگت رہے تھے اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ دونوں جانتے تھے کہ ان سب کے پیچھے قاسم کا اکیلا ذہن نہیں ہے بلکہ وہ سانپ ہے جو حویلی کے بل میں پلا ہے۔ وہ شاطر عورت ہے جس کے مکر و فریب سے شیطان بھی پناہ مانگے۔ سنہری ہی اس سب کے پیچھے بیٹھی مہرے چل رہی تھی۔ اس کی چال کی بدولت آج حویلی لکھاں کٹ پھٹ چکی تھی۔

☆......☆......☆

آدھی رات کا سماں تھا۔ حویلی لکھاں کی چھت پہ رات کے اس پہر سنہری کھڑی دور دور سے دکھائی دیتی پیلی بتیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کا حوصلہ اب اس قدر بلند ہو چکا تھا کہ اسے تنہا کسی بھی وقت کسی بھی جگہ جاتے ڈر نہیں لگا کرتا تھا۔ جس قسم کے عملیات وہ کرتی تھی انہوں نے بھی اس کی بے باکی کو تقویت دے رکھی تھی۔

شیطان جس وقت کسی کو گمراہ کر دے تو اس کے رستے وہ خود سنوارتا ہے۔ اس کے پیروں کو مضبوطی سے جمنے کے لیے زمین ہموار کر کے دیتا ہے۔ انسان کو لگنے لگتا ہے کہ جس رستے پر وہ چل رہا ہے سچا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو کامیابی کیوں ملتی۔ غلط ہوتا تو گرفت ہوتے وقت نہ لگتا۔ اپنے اعمال اچھے دکھائی دینے لگتے ہیں اور نتیجے میں ظلم، بد دیانتی، تکبر اس کی سرشت میں شامل ہو کر اس کی پوری زندگی کی عمارت کو جھوٹ پر مستحکم کر دیتا ہے۔ سنہری کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے یہی ٹھیک ہے اور اس کا حق ہے کہ یہاں اسی کا راج چلے۔ اس کی مانی اور سنی جائے کیونکہ اس نے بہت سہا ہے۔ اس نے یہ دن دیکھنے کے لیے قربانیاں دی ہیں اور اب اسے اس رستے پہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا۔

ایک بڑی جسامت کا الو یکدم پھڑ پھڑاتا ہوا بس چند فٹ اوپر سے اڑتا ہوا نکلا تو وہ چونکی۔ وہ مسکرائی اور منڈیر سے نیچے جھانک کر سب حویلیوں کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے چوہدری شہاب الدین کی حویلی جو بالکل وسط میں واقع تھی اور جس کا بیرونی حصہ سب سے بلند اور اونچا تھا۔ اوپر چھت تک آتے آتے ایک کنگرہ سا بن جاتا تھا۔ دور سے دیکھنے والوں کو فوراً پتا چل جاتا تھا کہ یہ حویلی یقیناً حویلی لکھاں کے سربراہ کی ہے اور اہم جز و ہے۔ اس سے پرے چوہدری آفتاب کی حویلی تھی جس کو ویران ہوئے عرصہ بیت گیا تھا لیکن کشور نے اسے استعمال میں کر رکھا تھا۔ وہ اسے صاف ستھرا کرتی رہتی تھی اور کبھی بھی بند نہیں رکھتی تھی۔ سنہری کو یہ حویلی بھی چاہیے تھی اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ اب اگلی باری اسی کی تھی۔ یہاں سے تھوڑا فاصلے پر باقی تین حویلیوں سے ذرا ہٹ کر پھپھو قدسیہ کی حویلی تھی جس میں اب چوہدری حاکم اپنے ٹبر کے ساتھ پورے طمطراق سے رہنے چلا آیا تھا۔ سنہری تمسخرانہ مسکرائی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے کب مکھن میں سے بال کی طرح باہر نکالے گی اور کب تک اسے یہاں ٹکنے دینا تھا۔ سب حویلیوں کو بنظر غائر دیکھتے اس نے اپنی آنکھوں کو میچا اور پھر کھولا تو ان میں وہی مکروہ سی چمک تھی۔ ہونٹوں پہ ویسی ہی مسکراہٹ جو اس کے چہرے کو مزید شاطر بناتی تھی۔

"بارہ سال...... کم وقت نہیں ہوتا چوہدری حسنات...... دنیا بدل جاتی ہے دس سال میں۔ حالات بدل جاتے ہیں۔ لوگوں کی جگہ بدل جاتی ہے لیکن میں نہیں بدلی۔ جس انتقام کی آگ کو تم نے

روشن کیا تھا اسے میں نے بجھنے نہیں دیا کبھی۔ میں وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی چوہدری حسنات جس رات تم نے مجھے ایک ایک پل تڑپایا تھا۔ کیسی اذیت بھری رات تھی وہ جب مجھ پر ترپال ڈالے تم نے میری بے بسی کا تماشا دیکھا تھا۔ مجھے ٹیکا لگانے کا جھانسا دیا، کتے کے ناکارہ بچے کو نیولا کہہ کر ڈرایا۔ مجھے گندگی میں لتھیڑ کر اپنی مرضی کا بیان دلوایا۔ اس رات کے نتیجے میں قاسم میرا مقدر رہا اور تم خانم کے۔ جبکہ سنہری نے اس سے الٹ طے کیا ہوا تھا پھر بھی تم نے سب بدل ڈالا۔ اب سنہری کی باری ہے سب کچھ بدل دینے کی۔ اور میں تمہاری اور خانم کی قسمت بدل ڈالوں گی۔ تم نے واپس آ کر غلطی کر دی حسنات۔ تم حویلی لکھاں میں واپس نہیں آئے بلکہ ایسے غار میں آ گھسے ہو جس کا دہانہ تو ایک ہے لیکن اندر سے کئی راستے نکلتے ہیں۔ ان ہی راستوں میں تمہیں گما دوں گی میں۔ خانم کھو جائے گی۔ تم سب الگ الگ ہو جاؤ گے۔ سب ایک دوسرے کو گنوا دو گے۔ یہ میرا تم سب سے وعدہ ہے۔ سنہری کے سیاہ انتقام کا وقت شروع ہو چکا۔ اب انتظار کرو اس کی لپیٹ میں آنے کا اور میری اذیت کا کفارہ ادا کرنے کا۔“

وہ سب ہی حویلیوں کو دیکھتی دو قدم پیچھے ہوئی اور بانہیں فضا میں پھیلائیے اپنے بائیں ہاتھ میں تھامی ارغوانی پتھر کی تسبیح کو زور زور سے جھلایا۔ یکدم جیسے فضا نامانوس شور سے بھر گئی۔ بہت سے پروں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں چھت پر پھیلنے لگیں۔ ہر طرف سے جیسے ان دیکھے پرندے اڑتے ہوئے اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ وہ اسی حالت میں کھڑی آنکھیں بند کیے آسمان کی جانب منہ کیے کچھ پڑھتی رہی پھر اس نے اوپر کی جانب پھونک مار دی۔ شور یکدم تھما۔ فضا خاموش ہو گئی اور وہ چہرہ سیدھا کرتے ہوئے بھرپور مسکرائی۔

نیچے اپنی حویلی کے کمرے میں سوئے حسنات اور خانم کے کمرے کی کھڑکی یکدم ہوا کے زور سے کھلی تھی اور حسنات جاگ گیا تھا۔ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھتے اس نے انتہائی بے چینی محسوس کی تھی۔ کمرے میں سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ان کے کمرے میں کوئی نادیدہ شخص موجود ہو۔ وہ اٹھا اور اس نے ہوا کے زور سے کھلنے والی کھڑکی کو بند کیا اور واپس بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جس کھڑکی کو اس نے بند کیا تھا اس کے ذریعے جدائی کی ہوا اس کے کمرے میں داخل ہو چکی

ہے۔ اس کی قسمت میں فراق رقم ہو چکا ہے۔ وہ بہت جلد سب کچھ گنوانے والا تھا۔

☆......☆......☆

حویلی لکھاں کے معاملات مکمل طور پر پراگندی کا شکار ہو چکے تھے۔ قاسم اور حیات میں سرد اور گرم جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ حیات نے بھی نہ جھکنے کی ٹھان لی تھی اور قاسم ویسے ہی مقابلے پہ پوری دیدہ دلیری سے اتر چکا تھا۔ لیکن حیات اور حسنات کے لیے یہ صورت حال مشکل اس لیے تھی کیونکہ چوہدری شہاب اس تمام معاملے میں تیسرے فریق کی حیثیت سے تھے جن کا واضح جھکاؤ قاسم کی جانب تھا۔ اس بات سے دونوں بھائی دل گرفتہ بھی تھے لیکن ہمت ہار دینے کا مطلب تھا قاسم کو شہہ دینا۔ کشور اس صورت حال سے سخت کشمکش کا شکار تھی۔ وہ پہلے ہی سنہری کی وجہ سے اپنے اختیارات کھوتی جا رہی تھی اور اب چوہدری حاکم کی بیوی اور اس کی ماں بہنیں اس کے لیے آزمائش بن رہی تھیں۔ اندرونی دروازے بند ہو جانے کے باوجود چوہدری حاکم کی سب ہی عورتیں اس باغیچے کی جانب جانکلتیں جو حیات کی حویلی کو لگتا تھا تو کبھی انہوں نے صحن میں قبضہ کیا ہوتا۔ ان کی زبان و کلام کشور کے مزاج سے الٹ ہونے کی وجہ سے قربت بھی پیدا ہونا محال ہو رہا تھا۔ ایسے میں سنہری کا ان کو مزید استحقاق دینا سب ہی کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔ خانم خود پریشان سی بوکھلائی پھرتی تھی۔ وہ جس امید اور آس میں پاکستان آئی تھی یہاں آ کر حالات بالکل متضاد تھے۔ اس کا دل لگنے کے بجائے اچاٹ ہو رہا تھا پھر بھی وہ اپنی بہن کو اس طرح چھوڑ کر واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف وہ زِل کو بھی دیکھ رہی تھی جو یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اس کے گلال گال مزید دہکنے لگے تھے۔ چھوٹی سی بچی اپنے کزنز کے بیچ خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی۔ امریکا میں اس کی اسکولنگ شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے اس کا کوئی دوست بھی نہیں تھا۔ اب جب یہاں اتنے کزن ملے تو وہ بہت بہل گئی تھی۔

دوسری طرف حسنات تھا جو جلد از جلد یہاں کے معاملات نبٹا کر نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی چھٹی حس مسلسل اسے خطرے کا احساس دلا رہی تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ حیات نے اسے بصد اصرار روک رکھا تھا اور وہ ایسا کم ظرف نہیں تھا کہ بڑے بھائی کو ضرورت کے وقت چھوڑ جاتا۔ امریکا میں اس کے کورس کی

لاسٹ ڈیٹ سر پر تھی۔ اسے جلد از جلد رپورٹ کرنا تھا ورنہ اس کا حرج ہوتا۔ عجیب کشمکش میں مبتلا دن نمودار ہوتا تھا جو بنا کسی جھگڑے کے چڑھتا نہیں تھا اور بنا کسی نتیجے کے گزر بھی جاتا تھا۔ چوہدری حاکم کی جسارتیں اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ اب وہ بھی پائیں باغ میں پایا جانے لگا تھا جہاں اس کے خاندان کی عورتیں پہلے سے موجود ہوتیں اور ان کے بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں دور و نزدیک سنائی دیتیں۔ اس بات پہ بھی حیات اور حاکم کی بدمزگی ہو چکی تھی کیونکہ حاکم کے لیے حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے بند کر دیے گئے تھے جنہیں اس نے عورتوں کے ذریعے کھلوا کر اپنی راہ ہموار کی تھی۔ حیات اس کے گھر کی عورتوں کے منہ تو نہیں لگ سکتا تھا یا انہیں باغ میں بیٹھنے سے منع تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا اس دوران چوہدری شہاب سے دو تین بار جھگڑا ہو چکا تھا جو اب بھی اپنے موقف پر ڈٹے ان دونوں بھائیوں کو غلط ثابت کرنے پر تلے رہتے تھے۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ حیات کا دل چاہنے لگا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے وہ یہ حویلی چھوڑ دے اور چھوٹی حویلی میں چلا جائے جسے اس نے دوبارہ سے سابقہ شاندار حالت میں سنوار لیا ہوا تھا۔ چوہدری آفتاب اور رقیہ کے جانے کے بعد اس حویلی کی دیواریں تک آگ کی سیاہی میں لپٹی دکھائی دیتی تھیں جو وحشت میں مبتلا کرتی تھیں اور حیات یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کشور کی اس حویلی پہ نگاہ پڑے تو اسے اپنے والدین کے آخری وقت کی اذیت رلاتی رہے۔ اس لیے اس نے وہاں نئے سرے سے رنگ و روغن کروا کر اس کی بہترین آرائش بھی کروائی تھی۔ اگر وہ کشور اور بچوں کو لیے وہاں چلا بھی جاتا تو سکون سے مخصوص عرصہ گزارا جا سکتا تھا مگر حسنات نے اسے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔

”اگر آپ بھی یہاں سے چلے گئے تو سمجھ لیں حویلی لکھاں کی بنیادیں ہل جائیں گی اور جب بنیادیں ہل جائیں تو عمارت زمین بوس ہوتے وقت نہیں لیتی۔“

”لیکن یہاں جو تماشا قاسم اور اس کی بیوی نے شروع کروا دیا ہے اس کا انت کیا ہے۔ ایک پرائے مرد اور اس کے بال بچوں کے بیچ اپنا آپ کرائے دار جیسا لگنے لگا ہے۔ مہریار اور شہریار پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔ وہ نہ سکون سے کھیل سکتے ہیں نہ گھوم سکتے ہیں۔ اپنی ہی حویلی میں حاکم کے گھر والے

الٹا میرے بچوں پہ روک ٹوک کرنے لگے ہیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو رہا حسنات......"

"تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ کل ہی مستری بلوائیں اور پھپھو قدسیہ کی حویلی کا جو راستہ اس طرف کھلتا ہے وہاں دیوار کھڑی کروا دیں۔ ایسے تو پھر ایسے سہی۔ اگر وہ چالاکی کر سکتے ہیں تو ہم بھی ان کو انہی کی زبان میں جواب دیں گے۔"

حیات کو یہ بات مناسب لگی تھی اور اگلے دن مستریوں نے آ کر وہاں دیوار تعمیر کرنی شروع کی تو قاسم اور سنہری نے ہنگامہ مچا دیا۔ بات اس قدر بڑھی کہ بندوقوں پستولوں پہ آ کر رکی۔ اس بار حیات بھی پیچھے نہیں رہا تھا اور اس نے بھی اسلحے کے دم پر قاسم کو دھمکانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ چوہدری حاکم بھی میدان میں نکل آیا۔ بات بڑھ کر حویلی کی دیواروں سے پنڈ کے گھروں میں جانے لگی۔ چوہدری شہاب الدین کو فوری طور پر اس سب کے بیچ کودنا پڑا اور یوں دیوار کی تعمیر شروع ہو گئی کیونکہ اگر پھپھو قدسیہ کی حویلی قاسم کی تھی اور وہ اس کے ساتھ جو بھی کرتا تو باقی کی دو حویلیوں کے مالکان اپنی حویلیوں کے ساتھ جو بھی کرتے ان کی مرضی تھی۔

سنہری تنفر سے ہاتھ مسلتی دیوار کو بنتا دیکھنے پر مجبور تھی کیونکہ اس معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ مبشر اور مدثر کو یہاں واپس آنے سے روکنے کی خاطر ہی تو اس نے قاسم کو اکسایا تھا کہ شام سے پہلے یہاں چوہدری حاکم کو بسا لائے کیونکہ جس اکیلے کو توڑنے کی خاطر اس نے اتنی محنت سے مبشر اور مدثر کی بیویوں کو ورغلا کر ایک دوسرے کے خلاف کیا تھا تا کہ حیات اور حسنات اکیلے رہ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ یہ چار یار حویلی میں اکٹھے ہو جائیں اور قاسم کے قدم اکھڑنے لگیں۔ اور قاسم کے قدم جمنے کا مطلب تھا سنہری کی اجارہ داری۔

آٹھ سال میں کئی بار حمل ٹھہرا تھا اسے لیکن ہر بار ضائع ہوتا رہا تھا۔ قاسم کو ایک بھی اولاد وہ نہیں دے سکی تھی۔ اب تو قاسم نے اس سے امید ہی چھوڑ دی تھی لیکن سنہری امید کیسے چھوڑتی۔ اسے جب محسوس ہوا کہ وہ اس پہلو سے کمزور پڑ رہی ہے تو اس نے دیگر حربے آزمانے شروع کیے تھے۔ اس نے حویلی لکھاں پہ دھیرے دھیرے تسلط جمانا شروع کیا تا کہ وقت آنے پر قاسم بھی اس سے کنی نہ کترا سکے۔

اب یہ عالم تھا کہ حویلی لکھاں کے تمام ملازم سنہری کے تابع تھے۔ پھپھو قدسیہ کی حویلی تو وہ قاسم کے ذریعے خرید چکی تھی۔ ہوٹل کی آمدن میں اس کا جو حصہ تھا وہ اسے باقاعدگی سے دینا قاسم کی مجبوری تھی اور وہ دیتا تھا۔ چوہدری شہاب الدین مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھے اور وہ انہیں نچاتی تھی۔ جو چاہے منواتی تھی۔ درمیان میں دو حویلیاں تھیں جو مرکزی تھیں اور جن پر اسے اپنا اختیار چاہیے تھا۔ شہاب الدین کی اور چوہدری آفتاب کی۔ کشور کی اس کے نزدیک حیثیت صفر تھی اور وہ اس نے ثابت بھی کر دیا تھا۔ وڈی چوہدرائن کا بس منصب رہ گیا تھا ورنہ اختیارات سب ہی سنہری کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔

حیات، چوہدری شہاب کا بڑا بیٹا ہونے کے باوجود قاسم کے مقابلے میں کمزور پڑ جاتا تھا کیونکہ تاج اسی کے سر پر سجتا ہے جس کے سر پر گھر کے سربراہ کا آشیرواد ہو اور بدقسمتی سے قاسم اس معاملے میں بازی لے گیا تھا۔ چوہدری شہاب نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ وہ نا صرف اپنے کاروباری معاملات کو خفیہ طور پر چلاتا تھا بلکہ ان کے معاملات میں پوری سینہ زوری سے دخل اندازی اپنا حق سمجھتا تھا۔ کیونکہ یہ حق اسے اس کے تایا نے تفویض کیا تھا۔ یہیں آ کر حیات اور قاسم میں نوبت مار پیٹ تک اتر آئی تھی۔ اب جب کہ دیوار بنی شروع ہو گئی تھی تو اسے فی الحال روکنا سنہری کے بس سے باہر تھا۔ لیکن وقت آنے پر وہ یہ دیوار خود پورے اہتمام سے گروائے گی یہ اس کا خود سے عہد تھا۔

دیوار مکمل ہوئی اور حویلی لکھاں اندر سے بیچ و بیچ بٹ کر رہ گئی۔ باغوں کو نظر لگ گئی۔ حسنات کے لگائے درختوں اور پودوں کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے حویلی لکھاں کے سبزے کو بٹوارا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ گھنا درختوں اور پودوں کا سلسلہ جو حسنات نے بہت شوق سے لگوایا تھا اور اس کے گھیرے میں چاروں حویلیاں آتی تھیں لیکن دیوار ان کی کٹائی کا سبب بن گئی تھی۔ حسنات کے لیے یہ تمام صورت حال بے حد تکلیف دہ تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ واپس جائے گا اور جلد ہی حیات اور اس کے بچوں کو بھی امریکا بلوا لے گا۔ اب یہاں رہ جانے کا مقصد کچھ بھی نہیں تھا۔

”لالے! میرا دل بے حد پریشان ہے۔ ابا جی ہمارے باپ کم اور اس قاسم کے تائے زیادہ رہ گئے ہیں۔ جب ہماری حیثیت نہیں تو ہم یہاں ذلیل کیوں ہوتے رہیں۔“

وہ دونوں پچھلے باغیچے میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ہی یاسیت بھری نگاہ اس بلند دیوار پر بھی ڈالتے جو اس سرے سے حویلی کے دوسرے سرے تک جا رہی تھی۔

حیات نے مسکرا کر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور رسان سے بولا۔

''اپنی جگہ چھوڑ دیں تو دیکھا کیا ہوتا ہے۔''

حسنات نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''وہی جو مبشر اور مدثر کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ قدم مضبوط رکھتے تو کس کی جرأت تھی کہ انہیں اس حویلی سے بے دخل کر دیتا۔ ان کی جلد بازی نے ان کے ہاتھ سے پرکھوں کی حویلی نکلوا دی۔ اور اب نتیجہ دیکھ لو۔ قاسم حویلی لکھاں کے آدھے حصے کا مالک بن بیٹھا ہے۔ وہ قاسم جسے ہم نے کن جتنوں سے یہاں سے نکلوایا تھا۔''

''تو اب ایک بار پھر نکلوا دیتے ہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا لالے......'' حسنات غصے سے دبا دبا غرایا۔

''اپنی ہی حویلی میں ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچے سہمے ہوئے ہیں، بھرجائی بولائی پھرتی ہے۔ اور آپ کا جیسے جوش و خروش تھم ہی گیا ہے۔ کوئی امنگ نہیں دکھائی دیتی۔ ورنہ لالے...... نکیل ڈالنا کون سا مسئلہ ہے اس قاسم کو۔''

''یہی تو اصل مسئلہ ہے۔ ابا جی نے ہمارے ہاتھ باندھ دیے ہیں حسنات۔ وہ اپنے تمام معاملات میں قاسم کو شریک کر چکے ہیں۔ وہ سیاہ کرے یا سفید...... ابا جی نہ خود باز پرس کرتے ہیں نہ کرنے دیتے ہیں۔ ابھی تو زمین کے معاملات پر میں نے مکمل کنٹرول کر رکھا ہے ورنہ قاسم تو ہمارے آڑھتیوں تک بھی پہنچ گیا تھا۔ یہ تمہارے آنے سے کوئی مہینہ سوا پہلے کی بات ہے۔ اس دن میرا خوب جھگڑا ہوا تھا قاسم سے بھی اور ابا جی سے بھی۔

دوسرے پنڈوں کے چوہدری بیچ میں پڑ گئے تھے اور انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ قاسم کی کھلم کھلا مخالفت ہوئی اس دن جس کی وجہ سے وہ خاموشی سے بیٹھ گیا لیکن مجھے پتا ہے جب جب اس کا داؤ

چلے گا وہ پھن پھیلائے گا۔ اسے چسکا پڑ گیا ہے پیسے کا، زمین جمع کرنے کا اور ظلم و زیادتی کرنے کا۔"

حسنات کھول ہی اٹھا۔ آگے کو جھک کر وہ غصے میں بھرے لہجے میں گویا ہوا یوں کہ اس کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔

"تو بھیا، آپ کب تک مقابلہ کریں گے۔ میری زمینیں بھی ہیں جن کو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ تو آپ پر بھی بوجھ ہے سراسر۔ اسی لیے میں کہتا ہوں باہر نکل چلیں۔ بیچیں سب کچھ اور چلیں یہاں سے۔ اپنی جان اور بچوں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالے رکھیں۔ چاچا آفتاب والا معاملہ اتنا پرانا نہیں ہوا ہے۔ گرد ضرور پڑ گئی ہے جمی نہیں ہے۔ انہیں جس بے دردی سے مروایا گیا ہے جب جب سوچتا ہوں خون کھول اٹھتا ہے۔ بچہ سمجھتا ہے ہمیں۔ بھلا پتا نہیں کس کا ہاتھ ہے ان سب میں۔ جس حادثے کا ثبوت حالات نہ دیں، وہ وقت فراہم کرتا ہے۔ اور وقت آئے گا جب ہر شے کھل کر سامنے آجائے گی اور پردے کے پیچھے چھپے سارے کردار آشکار ہو جائیں گے۔ ہمارے ابا جی سمیت......"

حسنات نے جی بھر کر بھڑاس نکالی تھی اور اتنا کچھ کہہ دینے کے باوجود حیات اسے کچھ نہیں بولا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے یہ تمام الفاظ اسی کے تھے جو حسنات کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

"چلیں بھیا۔ امریکا چلیں۔ مہریار اور شہریار کی اسکولنگ وہاں بہترین ہو جائے گی۔ مجھے بھی یہاں نہیں رہنا اور میں چاہتا ہوں کہ آپ راضی ہوں تو وہاں جاتے ہی آپ کو بھی بلوا لوں۔"

"چاہ کر بھی نہیں جا سکتا فی الحال......" حیات مسکرایا اور تھوڑا ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کشور ٹھیک نہیں ہے۔ خوش خبری ہے اس کے ہاں۔ تین ماہ ہو گئے اور ڈاکٹروں نے بہت احتیاط بتائی ہے ورنہ ماں بچے دونوں کو نقصان ہو گا۔"

حسنات یکدم جھاگ کی طرح بیٹھا یوں جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔ اتنی خوشی کی خبر اور کس موقعے پر پتا چل رہی تھی جب حویلی لکھاں کے اندر انتہائی سنگین قسم کی صورت حال تھی۔ وہ کیا کہتا، جواباً بس بے بسی سے مسکرا دیا۔

"مبارک ہو لالے...... اللہ خیر کرے گا۔ کوئی نہیں۔ نکل آئے گا کوئی راستہ...... لیکن مجھے جلدی

واپس جانا ہے لالے۔ خانم کو اور زل کو مزید یہاں نہیں رکھنا چاہتا۔''

''میں نہیں روکوں گا تجھے حسنات...... لیکن میں دل سے چاہتا ہوں کہ تو یہیں آ جا۔ اگر تو یہاں ہوگا تو قاسم کو حد میں رکھ لیں گے دونوں مل کر۔ اسے نکیل ڈالنا آسان ہو جائے گا۔''

''مجھے معلوم ہے بھیا۔ لیکن دو سال کا کورس ہے وہ مجھے لازمی کرنا ہے۔ اس کے بعد میرا ابھی ارادہ ہے کہ یہیں آ جاؤں گا لیکن ابھی فی الحال جانے دیں۔''

''چل میں ضد نہیں کرتا، جیسے تو راضی۔ پیچھے کی فکریں نہ پال...... تجھے بلایا تھا کہ اتنے سال ہو گئے شکل دیکھے، سینے سے لگائے۔ چل کسی بہانے سہی میرا اماں جایا میرے کلیجے سے تو لگے ورنہ اپنے لالے کو اتنا انڈر اسٹیمیٹ نہ کر۔ وہ ایک قاسم تو کیا دسیوں کو دھول چٹا سکتا ہے اور رہ گیا حاکم تو اس کا بندوبست بھی قاسم خود ہی کرے گا۔ دونوں میں ایک فساد پڑنے کی دیر ہے۔ قاسم اٹھا کر باہر مارے گا اسے۔ اور اس فساد کے لیے بس چاچے بخشو کو اشارہ کرنا ہے۔ پوری کاری گری دکھائے گا۔ تجھے فون پہ بتا دوں گا جلد ہی کہ یہاں کیا معاملہ چل رہا ہے۔ تو بے فکر ہو کر اپنی پڑھائی کر اور بیوی بچی کا دھیان رکھ!''

''بہت شکریہ بھیا۔ میں اپنی ماں کے بعد آپ کا مرتے دم تک مقروض رہوں گا۔ اماں کے بعد آپ نے جس طرح مجھے اپنے پروں میں لیا ہے وہ مجھ پر ہمیشہ کا قرض ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے محبت و عقیدت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

حسنات نہیں جانتا تھا کہ وہ واپس تو جائے گا لیکن اکیلا...... کیونکہ تقدیر مسکراتی ہوئی اس کا اکیلے جانا اور رہ جانا رقم کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

قاسم کی حویلی میں قاسم اور سنہری ہال کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ٹی وی کی اسکرین آن تھی جہاں پی ٹی وی پر شام سات بجے کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پنڈ میں جگہ جگہ ڈش، کیبل لگ چکی تھی۔ پنڈ اب پرانا پنڈ نہیں رہا تھا۔ میڈیا سے مانوس ہوتے لوگوں کی بول چال اور چال ڈھال میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ لڑکیاں اب فیشن کو سمجھنے لگی تھیں۔ گھر کے مردوں کے پاس چھوٹے بڑے

موبائل بھی تھے جن کا استعمال عورتوں کے لیے ابھی شجر ممنوعہ تھا مگر یہ شبکہ کم نہیں تھا کہ ہر گھر میں کسی نہ کسی مرد کے پاس ایسا فون تھا جو جیب میں پورا آ جاتا تھا۔ پہلے کسی کو شہر کال کرنی ہوتی تو ایک ہی بوتھ تھا پورے پنڈ میں جہاں بیٹھ کر انتظار کی کوفت اٹھانے کے بعد کال ملتی پھر کہیں بات ہوتی اور دکاندار کان الگ لگائے بیٹھا ہوتا۔ نہ رازداری سے بات ہو پاتی نہ پیغام پہنچ پاتا۔ ٹی وی تو کسی چھوت کی بیماری کی طرح عام ہوا تھا۔ عورتوں کے ہاتھ تفریح لگ گئی تھی اور گھر گھر گھومنے والیوں کے پیروں کے پہیوں سے ہوا نکل گئی تھی۔ جن عورتوں کو بات کرنے کی عقل نہیں تھی، ٹی وی ڈرامے انہیں لفظوں کا چناؤ اور استعمال سکھانے لگے تھے۔ اس لیے اب مالکوں کو جواب دینا عام ہونے لگا تھا۔ بزرگوں کا منہ بند کروانا بھی کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ گھروں کے کام بوجھ بنتے جا رہے تھے کیونکہ ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے اور پھر ری ٹیلی کاسٹ ہوتے اور یہ لازم تھا کہ ہر بار دیکھے جاتے۔ نتیجتاً کام دھرے رہتے یا مارے باندھے اس پھرتی سے کیے جاتے کہ جان چھڑالی جاتی۔

حویلی لکھاں بھی اس وبا سے بچی نہیں تھی۔ چوہدری حاکم کی حویلی سے ڈراموں کی آواز باقی سب کے کانوں میں کھلم کھلا پڑتی تھی اور سنہری کو کسی کا لحاظ بھلا کب تھا۔ وہ بھی سارا دن اسی دھیان میں لگی رہا کرتی جب تک کہ حویلی کے مرد واپس نہ لوٹ آتے۔ ان کا ابھی اس قدر لحاظ باقی تھا کہ ان کی موجودگی میں ٹی وی بند کر دیا جاتا۔ سنہری نہیں کرتی تھی لیکن احتیاطاً پی ٹی وی لگا لیا کرتی تھی جس پہ اس کے مطلب کا کچھ نہیں ہوا کرتا تھا۔

قاسم کی پیشانی کی شکنیں دیکھتے اس نے ریموٹ میز پر رکھا اور چائے کا مگ اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولی۔

"جن کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہو چوہدری، ان کو مجھ پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ حیات ہو یا اس کا بھرا۔ اب چوہدری قاسم کو کھڈے لائن نہیں لگا سکتے۔ بے فکر رہو۔"

"مجھے اس بات کی فکر نہیں ہے۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں حسنات یہیں نہ رہ جائے۔ کلے حیات کو میں دم سے دم نہ مارنے دوں لیکن حسنات یہیں رہ گیا تو تجھے نہیں پتا کہ اسے ایک سو ایک راہ آتے ہیں

بال کی کھال نکالنے کے۔"

"مجھے نہیں پتا ہوگا تو کسے ہوگا۔" سنہری بدبدائی۔ آنکھوں میں آج بھی اپنی تذلیل کا منظر تازہ تھا اور ترپال کی بدبو اب بھی اس کے نتھنے جلا ڈالتی تھی۔

اس کی بات پر قاسم استہزائیہ ہنسا۔

"تجھے واوا (خوب) پورا آیا تھا ویسے حسنات۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت تجھے دیکھ کر ہاسا روکے بندہ یا تاؤ کھائے ان لوگوں پر۔"

سنہری کے سر سے لگی، پیروں پہ بجھی۔ وہ کلس کر بولی۔

"تمہارا تو ویسے ہاسا ہی رک گیا چوہدری۔ کیونکہ اس بدبو کی گٹھڑی کو آدھے گھنٹے میں چوہدری قاسم کی بڈی (بیوی) بنا دیا اگلے نے۔"

اب کی بار کلسنے کی باری قاسم کی تھی۔ وہ وقت، وہ لمحات اور ان کی اذیت تو وہ بھی کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا اور ہو کیا گیا تھا۔ ان گھڑیوں میں جب وہ یقینی طور پر یہ سوچے ہوئے تھا کہ ابھی کے ابھی ایسا فساد ڈالے گا کہ خانم کو نکاح میں لے کر ہٹے گا عین انہی لمحات میں اس کا نکاح سنہری سے ہو جانا جان کنی کی کیفیت سے کم نہ تھا۔

"تیری بک بک پھر شروع ہونے لگی ہے تو میں جاتا ہوں ڈیرے پر۔ بندہ سکون سے کپ چائے کا بھی نہ پیے گھر پر!" وہ غصے سے تھوڑا سا اپنی جگہ سے ہلا جیسے اٹھنے لگا ہو، حالانکہ سنہری جانتی تھی کہ وہ اٹھے گا نہیں۔ ایسے ہلنے ہلانے وہ دن میں کئی بار دیکھتی تھی۔

"اک تو چوہدری، ہر وقت تتے سپاہی بنے رہتے ہو۔ مجھے دیکھو جو سارا دن ان حویلی والوں کو سہتی اور برداشت کرتی ہوں۔ صرف تمہاری تھاں اونچی رکھنے کی خاطر لیکن تمہیں میری قدر نہیں ہوئی۔"

"اولاد والیوں کی قدر ہوا کرتی ہے۔ شکر نہیں کرتی کہ تجھے رکھا ہوا ہے۔"

گزرے سالوں نے قاسم کو سنہری کے معاملے میں بے حد دوٹوک کر دیا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا بھلے نہ پا سکتا ہو لیکن لحاظ بھی نہیں کرتا تھا۔

''میرے بس میں ہوتا تو ست پتر جم کے دیتی چوہدری۔ نصیبوں کی بات ہے نا'' اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا اس بات سے۔ ''خیر گل بس اتنی سی ہے کہ حسنات واپس جائے گا اور جلدی جائے گا لیکن اکیلا۔ نہ اس کی بڈی جائے گی نہ وہ گِٹک (گٹھلی)۔'' اس کا اشارہ حسنات اور خانم کی بیٹی کی طرف تھا۔ یہ لقب اس ننھی بچی کے لیے تھا۔ قاسم چونکا اور چائے کا مگ منہ سے لگائے ہوئے سوالیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

''دیکھتے جاؤ چوہدری۔ سنہری نے کہا ہے نا تو بس اب یہی ہونا ہے۔ تم بس حیات سے ٹکر لینے کی تیاریاں کرو کیونکہ عن قریب تمہیں اس پوری حویلی لکھاں کو سنبھالنا ہے۔ بہت جلد اس حویلی کے اندر چار کے بجائے بس ایک حویلی ہوگی۔ چوہدری قاسم کی حویلی!''

اس کا پر اسرار لہجہ...... اس کی دو ٹوک گفتگو...... قاسم نہ چاہتے ہوئے بھی یقین کر گیا لیکن اسے سر نہیں چڑھاتا تھا تب ہی مگ ٹرے میں نیم پٹخنے کے انداز میں دھرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو اور تیری فریب کاریاں۔ جس دن چن چڑھے گا تو دکھائی بھی دے جائے گا۔ میں ایویں مفت میں آنکھیں نہیں پھوڑ سکتا۔ تھوڑی دیر لیٹنے لگا ہوں، تنگ نہ کرنا مجھے۔''

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا جبکہ سنہری نے اس کا مگ ہاتھ میں تھام کر اسے اچھے سے دیکھا اور مسکراتی ہوئی اس کمرے کی طرف چل دی جسے اس نے باقاعدہ اپنے پڑھنے پڑھانے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ یہیں پنڈ کی عورتیں آتیں اور اس سے دم کرواجاتیں۔ سنہری قاسم کو قابو میں رکھنے کے لیے اکثر اس کی جھوٹی چیزوں کو اسی کمرے میں لے جایا کرتی تھی۔ ویسے بھی آج کل اسے ضرورت تھی کہ قاسم اس کا فرمانبردار رہے۔ آنے والا وقت اس کا تھا اور اس کے لیے لازمی تھا کہ قاسم کا دماغ اس کے بس میں ہو۔

☆......☆......☆

ایک دھماکا تھا جو اس کے سر پہ ہوا تھا۔ وہ بے یقینی سے کبھی اسے تو کبھی اپنی بچی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی کسی بات کا اسے اندیشہ تک نہ ہوا تھا۔ کشور جو خانم کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس سے لے کر آئی تھی، خود حسنات کے تاثرات پر حیرت زدہ تھی۔

''ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ہے خانم بہت کمزور ہے۔ خون کی بے حد کمی ہے۔ سفر سے مکمل گریز کرے اور اگر کرے گی تو نتائج کے طور پر بچے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ میں ذرا باورچی خانے کی خبر لوں، خانم کے لیے کچھ بھیجتی ہوں کھانے کو۔''

وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی جبکہ حسنات ہونق بنا ابھی بھی اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس جس خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی وہ مجسم اس کے سامنے تھا۔ اسے جلد ہی امریکا واپس جانا تھا اور عین وقت پر اس تمام سلسلے کو خوش آئند گردانتا یا یہ آنے والے وقت کے لیے خطرے کا الارم تھا۔

ناول گنوا کے دل و جاں ہم کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔